یادِ ایّام

عالی جناب سعید الملک

نواب ڈاکٹر سر حافظ محمد احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری

یادِ ایّام

(خودنوشت سوانح حیات)

عالی جناب سعید الملک

نواب ڈاکٹر سر حافظ محمد احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری

جی بی ای، کے سی ایس آئی، کے سی آئی ای، ایل ایل ڈی

سابق گورنر صوبہ یوپی و وزیر اعظم حیدر آباد دکن

نام کتاب : **یادِ ایام**

مؤلف : احمد سعید خاں نواب چھتاری

سن اشاعت : ۲۰۱۳ء

تعداد بار اوّل : تین سو

قیمت : تین سو روپیہ

صفحات : ۶۴۰

پروف ریڈنگ : ابن سعید خاں آف چھتاری

کمپوزنگ اینڈ پرنٹنگ : مشکوٰۃ پرنٹرس، نزد اے ایم یو، علی گڑھ فون: 9897674550

ملنے کا پتہ

راحت منزل، میرس روڈ، علی گڑھ

پیش لفظ

میرے دادا حافظ احمد سعید خاں صاحب نواب آف چھتاری کی تین جلدوں پر مشتمل آپ بیتی "یادِ ایامِ خود نوشتہ" ان کی حیات میں شائع ہوئی تھیں۔ ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ سیاسی دنیا میں اس کی کماحقہٗ پذیرائی ہوئی۔ یو-پی اور ریاست حیدر آباد دور سلطنت آصفی کی اول نصف صدی کی سیاسی اور انتظامی امور کے بعض گوشوں میں اس کی دستاویزی اہمیت قرار پائی۔

نواب صاحب مرحوم کی زندگی میں اور پھر ان کے بعد جن کرم فرماؤں نے کتاب طلب کی ہم ان کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔ اب اس کے نسخے ختم ہو چکے ہیں مگر مانگ ہنوز جاری ہے۔

شیروڈ کالج نینی تال سے تعلیم پا کر جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذاکر حسین انجینیرنگ کالج میں میرے بھائی رفعت سعید اور میں نے داخلہ لیا تو ہمارا کل وقتی قیام دادا صاحب مرحوم کے زیر سایہ ہوا۔ کھانا پینا بھی انہی کے ساتھ اور سونا بھی انہی کے کمرہ میں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ گراں مایہ شفقت، رہنمائی اور توجہ مجھے اپنے والد محترم (جناب ابن سعید خاں صاحب) سے زیادہ حاصل ہوئی۔ زندگی کے نشیب و فراز وضع داری، خدمت خلق، اخلاق اور تہذیب کوئی عنوان ایسا نہ تھا جس کو اپنی فیض رسان زبان اور خود اپنے ذاتی عمل سے ہم پروانہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم جو کچھ بھی ہیں ان کے فیضان، تربیت اور مقبول بارگاہ دعاؤں کے طفیل ہیں۔ میری شادی دادا صاحب نے اپنی پسند سے دختر جناب کنور عمار احمد خاں صاحب مرحوم کی

صاحبزادی سے کی ۔ اخلاق کریما کی عظمت اور روایات عالی کی پاسداری یہ کہ میرا رشتہ مانگنے کے لیے خود تشریف لے گئے ۔ جب بھی میں ان کے متعلق سوچتا ہوں ان کا خوشی اور محبت سے بھرا چہرہ سامنے آجاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا صد شکر ہے کہ میں اور میری رفیقۂ حیات خوشی اور مسرت کی زندگی سے ہم کنار ہیں ۔

یادِ ایام کی مسلسل طلب اور فرمائش کے پیش نظر اور نوشتۂ جد کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے میں نے اسے دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ البتہ پڑھنے والوں کی سہولت کے واسطے تینوں جلدوں کو یکجا کر دیا ہے ۔ گزشتہ کی شان و عظمت سے واقفیت میں اضافہ ہو اور اس کی بصری تصدیق جستہ جستہ دستیاب ہو شاید اس اشاعت ثانی سے بہتر اپنے جذبات، عقیدت و تشکر کے اظہار کا کوئی دوسرا طریقہ میرے پاس نہیں تھا ۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

ناسپاسی اور تقلیل ادب ہو گی اگر میں اس ضمن میں اپنے والد محترم کی قربانیاں، تشویق اور حوصلہ افزائی کا جذبہ احسان مندی کے ساتھ اعتراف نہ کروں ۔

راقم الحروف
جاوید سعید

مقدمہ

۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء کا واقعہ ہے کہ میں نینی تال گیا تھا وہاں سر جیمس میسٹین (جو لفٹننٹ گورنر صوبہ کے تھے) نے کچھ لوگوں کو چاء نوشی کے لیے بلایا تھا۔ میں بھی اُس مجمع میں شریک تھا۔ سر جیمس میسٹین نے مجھ کو ایک نوعمر رئیس زادے سے ملایا اور کہا کہ یہ چھتاری کے رئیس ہیں۔ میں اس سے پہلے سے اُن سے واقف نہ تھا حالاں کہ اُس سے پہلے میں نے اُن کی ریاست کے ایک مقدمہ کی ہائی کورٹ میں پیروی کی تھی جس کو کہ کارکنانِ ریاست بہت اہم سمجھتے تھے میں اُس میں کامیاب ہوا۔ پریوی کونسل سے بھی فیصلہ بحال رہا۔ نواب صاحب سے قریب ڈیڑھ گھنٹہ کے گفتگو رہی۔ میرے دل پر یہ اثر ہوا کہ یہ بہت ہونہار ہیں۔ طریقۂ گفتگو نہایت سلجھا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ علم دوست ہیں۔ اُس کے بعد پانچ چھ مرتبہ الٰہ آباد یا لکھنؤ میں ملاقات سرسری طور پر ہوئی۔

جب میں ۱۹۲۱ء میں دہلی تھا اور گورنمنٹ آف انڈیا کا ممبر تھا۔ نواب صاحب کسی کام سے دہلی تشریف لائے اور مجھ سے ملنے بھی آئے۔ اُس وقت نواب صاحب نئی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ سیاسی معاملات میں بدرجۂ اتم دلچسپی لیتے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے غنیمت سمجھا کہ اس صوبہ کے رئیسوں میں ایک ایسا نوجوان تیار ہو رہا تھا۔ پھر چند سال بعد نواب صاحب وزیر صوبہ مقرر ہوئے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ چوں کہ سر ہارکورٹ بٹلر کی عنایت ان پر زیادہ تھی اور ایک بڑی ریاست کے مالک ہیں۔ اس وجہ سے گورنمنٹ نے انھیں مقرر کیا ہے۔ میرا یہ خیال ہرگز نہیں تھا۔ میں واقعی بہت خوش ہوا تھا اور اس خوشی کا اظہار مسٹر چنتامنی سے جو میرے خاص دوستوں میں تھے کیا۔ حالاں کہ وہ ان کی رائے سے اختلاف رکھتے تھے مگر ان کے طرز طریقہ اور سنجیدگی کے معترف تھے۔ منسٹر ہونے کے بعد یہ ہوم ممبر مقرر ہوئے اور اُس کے بعد اُن کا عروج بدرجۂ غایت جلد تر ہوا۔

نواب صاحب جب موم ممبر تھے تو دو مہینے کے لیے سر الیگزینڈر موڈیمین کی وفات کی وجہ سے اُن کے جانشیں ہوئے۔ سر الیگزینڈر موڈیمین کے متعلق جو کچھ بھی اس کتاب میں لکھا ہے اُس سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ میں خود سر الیگزینڈر موڈیمین سے واقف تھا۔ جب میں لا ممبر مقرر ہوا تو وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری لیجسلیٹیو ڈپارٹمنٹ ہوئے تھے۔ نواب صاحب چھتاری بعد گورنری کے گورنمنٹ آف انڈیا کے عارضی ممبر مقرر ہوئے۔ اُس کے بعد سر مالکم ہیلی کے بجائے نو ماہ کے لیے گورنر یو. پی. مقرر ہوئے۔ میں اُس زمانہ میں کئی مرتبہ ملا اور میرے دل پر اُن کا بہت اچھا اثر ہوا۔ یہ کہنا تو خلاف واقعہ ہوگا کہ اُن کی طرح اور لوگ نہ تھے مگر یہ میں بڑی خوشی سے لکھتا ہوں کہ گورنری کی حالت میں اُن کا برتاؤ اپنے ہم وطنوں سے بہت شریفانہ رہا۔ اُس کے بعد ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم مقرر ہوئے چوں کہ میں حیدرآباد اکثر بہ سلسلۂ مقدمات جاتا رہا اور اکثر ملاقات رہی۔ وہاں پر میں نے کسی سے اُن کی شکایت نہیں سنی بلکہ یہی سنا کہ بہت شریفانہ طریقہ پر حکومت کے کام کو کر رہے ہیں۔

اس صوبہ میں کیا بلکہ ہندوستان میں ایسے آدمی کم ملیں گے جن کا تجربہ اتنا وسیع ہو اور اتنے عرصہ تک اتنے بڑے عہدوں پر رہے ہوں اور نیک نام رہے ہوں۔ نواب صاحب کی طبیعت بہت سنجیدہ واقع ہوئی ہے اور صلح کل کے اصول پر عمل کرتے رہے ہیں۔

یہاں پر میں صرف اس قدر لکھوں گا کہ جوں جوں مدت گزرتی گئی آپ کا علمی شوق بڑھتا گیا اور خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ آخرکار راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں اُن کے ساتھ کام کرتا رہا۔ وہاں پر جو ہندو مسلمانوں کے جھگڑے ہو رہے تھے۔ میں صرف یہ کہوں گا کہ وہاں بجائے آگ لگانے کے ہمیشہ آگ بجھانے کی نواب صاحب نے کوشش کی۔ پچھلی مرتبہ مئی یا جون ۴۸ء میں حیدرآباد سے لوٹتے ہوئے مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ میں بیمار تھا مگر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے اُن سے گفتگو کرنے سے مجھے بڑا لطف آیا۔

نواب صاحب نے جو یہ کتاب لکھی ہے قابلِ قدر ہے اور جو جو واقعات لکھے ہیں اُن سے ہر وہ شخص جو صوبہ سے دلچسپی رکھتا ہو اُس کو واقفیت رکھنی چاہیے۔

انگلستان میں اور دیگر ممالک یورپ میں اس قسم کی کتاب لکھنے کا بہت شوق ہے۔ علاوہ اس کے کہ بڑے تجربہ کار آدمی کی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے ایسی کتابوں سے خاص فائدہ یہ ہے کہ اُس ملک کی ترقی و تنزلی کے اسباب معلوم ہوتے ہیں اور ایسی کتابوں سے تاریخ کا مواد تیار ہو جاتا ہے۔ مجھ کو بہت شوق رہا ہے۔ میں اکثر سوانح عمری کی کتابوں کو پڑھا کرتا تھا۔ مگر اب تو خواب و خیال ہے۔

ایک واقعہ اور لکھوں گا۔ میں جب ایک مرتبہ حیدرآباد گیا تھا تو انجمن ''روحِ ادب'' (کے لیے ترقی اُردو کے لیے ہے) نواب صاحب سے امداد چاہی۔ انھوں نے دو گھنٹہ کے اندر مبلغ دس ہزار روپیہ کا چک بھیج دیا جو بنک میں جمع کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں ریاست حیدرآباد سے مبلغ دو سو روپیہ ماہوار چند سال کے لیے واسطے امداد انجمن کے مقرر کیے۔

میں نواب صاحب کو نیک مزاج شریف۔ علم دوست اور ملک کا بہی خواہ سمجھتا ہوں اور میرے دل میں کبھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ وہ کبھی اپنے ذاتی مفاد کے لیے ملک کو ضرر پہنچائیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ کنسرویٹو مزاج کے آدمی ہیں مگر یہ اکثر پایا گیا ہے کہ کنسرویٹو آدمی بھی ملک کی اپنے طریقہ سے خدمت کر سکتے ہیں۔ میرے حلقۂ احباب میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جن کی اُن کے مقابلہ میں میں زیادہ عزت کرتا ہوں۔

میں ڈھائی برس سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ بیکار ہو گیا ہوں۔ برابر میری بیماری کا سلسلہ جاری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس دنیا میں بہت عرصہ نہیں رہنا ہے۔ بمشکل تمام یہ چند منتشر خیالات میں نے جمع کیے ہیں اور نواب صاحب کو دل سے دعا دیتا ہوں کہ وہ خوش و خرم رہیں اور اُن کا اثر زیادہ بڑھے۔ یہ بات اور لکھ دیتا ہوں کہ چاہتا ہوں میرے دل میں یہ بات کبھی نہیں پیدا ہوئی کہ میں ہندو ہوں اور وہ مسلمان ہیں اور ہم دونوں الگ الگ قوم کے ہیں۔ میں انکا مہمان بھی رہ چکا ہوں۔ مہمان نوازی اُن کا خاص حصہ ہے اور اپنی شیریں کلامی سے کوئی شخص ہو اس کا دل فوراً لبھا لیتے ہیں۔ اگر طاقت ہوتی تو علاوہ اُن واقعات کے جو کتاب میں لکھے ہیں کچھ اور واقعات لکھتا۔

نواب صاحب نے میرے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کی دوست نوازی ہے مگر میں اس کو ضرور مانتا ہوں کہ اُردو فارسی کا مجھ کو ہمیشہ شوق رہا ہے اور آجکل جو ہنگامہ اس صوبہ میں اُردو کے خلاف ہو رہا ہے اُس سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ بہت دنوں تک یہ یورش نہیں رہے گی۔ میں ہندی کے خلاف نہیں ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جو الفاظ فارسی، عربی یا سنسکرت اُردو زبان میں پیوست ہو گئے ہیں اُن کو کیوں علیحدہ کیا جاوے۔ میں نے کبھی اُردو کو مسلمانی زبان نہیں سمجھا۔ ہمیشہ یہی سمجھا کہ اُردو زبان کے بانی مبانی ہندو اور مسلمان دونوں ہیں اور یہ دونوں کی زبان ہے مگر یہ خیال آج کل کے زمانہ کی روش کے خلاف ہے اور مجھے سخت افسوس ہے کہ ہندوستان کو آزادی کے ملنے کے بعد ہمارا زیادہ تر وقت ان مباحثوں میں صرف ہوتا ہے۔

میں اس دعا پر اس مضمون کو ختم کرتا ہے کہ نواب صاحب کی عمر دراز ہو اور اُن کی وقعت و شہرت میں زیادتی ہو۔

راقم
تیج بہادر سپرو بقلم اجودھیا ناتھ

۷/جنوری ۱۹۴۹ء

تمہید

آج ۲۲ر جولائی ۱۹۴۶ء ہے، ۱۱ر جولائی کو حیدر آباد سے رخصت ہوکر بمبئی ہوتا ۱۷ر کو دہلی اور ۱۹ر کو علی گڑھ پہونچا۔ عرصہ سے یہ خیال بار بار دل میں آتا ہے کہ اپنے گذشتہ زمانے کے کچھ حالات لکھوں۔ میں نے اس پر بھی اکثر غور کیا کہ ایسا خیال کیوں آرہا ہے۔ ہر آدمی اپنے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور بہت کچھ نہیں بھی جانتا۔ لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ مجھ میں غرور نہیں ہے۔ غالباً میرے دوستوں کا بھی میرے بارے میں یہی خیال ہے لیکن ابھی ابھی میری رفیقۂ حیات ٹہلتی ہوئی آئیں اور ان سطور کو پڑھنے لگیں اور بہت ہنسیں اور اول تو یہ پیش گوئی کی کہ ''یہ شوق بھی دو ایک روز میں جاتا رہے گا'' اور پھر یہ کہا کہ ''کون کہتا ہے کہ تم مغرور نہیں ہو، مجھ سے پوچھو کہ تم کس قدر مغرور ہو۔'' رفیقۂ حیات کے اس فیصلہ سے میں ڈانواڈول ہوگیا، کچھ تو یوں بھی گویا مجھے اپنی سیرت کے ایک پہلو سے واقفیت نہ تھی اور کچھ اس لیے کہ مجھے موصوفہ کے بارے میں بھی پوری واقفیت نہ تھی۔ بہر حال میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ اس غرض سے نہیں ہے کہ کسی دوسرے کے لیے مفید ہوگا۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ ننانوے فیصدی حضرات اپنی ہی سے سبق حاصل کرتے ہیں، اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جو دوسروں کی غلطی سے خود کچھ سیکھتے ہیں۔ پھر یہ کہانی ایسی دلچسپ بھی نہیں ہوسکتی کہ پڑھنے والوں کے واسطے باعثِ تفریح ہوسکے۔ اس لیے میں آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ میری یہ خواہش دراصل اس بناء پر ہے کہ

میرا دل چاہتا ہے کہ عمر کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد ایک نگاہِ بازگشت ڈالی جائے اور ایامِ رفتہ کے تصور سے قلب میں ان جذبات اور محسوسات کو ٹٹولا جائے جن سے زمانہ گزشتہ میں میری زندگی متاثر رہی۔ زندگی میں ایسا موقع ضرور آتا ہے جب ہم اپنے بیتے ہوئے زمانہ کی دھوپ چھاؤں سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں، بغیر اس خیال کے کہ اس سیر سے حاصل کیا ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچپن اور خاندان

یادِ ایام:

میں ۱۱ر جنوری ۱۸۸۹ء کو باغپت ضلع میرٹھ میں پیدا ہوا۔ اسی سال میرے دادا نواب محمود علی خاں مرحوم نے ہجرت کا ارادہ کرلیا تھا۔ اور بمبئی میں جہاز کا انتظار کر رہے تھے جہاں میرے پیدا ہونے کا تار پہنچا۔ میں اپنے ماموں رداؤ خورشید علی خاں مرحوم کے گھر پیدا ہوا اور سات برس کی عمر تک انھیں کے سایۂ شفقت میں پرورش پائی۔ ماموں کو مجھ سے بڑی محبت تھی جس کو انھوں نے آخر دم تک نباہا۔

اس زمانہ کی باتیں مجھے خواب جیسی یاد ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں ایک گڈولنا (جس کی مدد سے چلنا سیکھتے ہیں) پکڑے کھڑا ہوں۔ میری انا مجھے اور گڈولنے کو پکڑے ہوئے مجھے چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرے پاؤں کام نہیں دیتے اور مجھے سخت ناگواری ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے گرد و پیش کی عمارت کا تصور بھی۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کس عمارت کی یاد ہے۔ اور آیا یہ واقعہ ہے یا فقط یوں ہی خیال بندھ گیا ہے۔ لیکن نواب سر جمشید علی خاں کی شادی کے سلسلے میں کلانور گیا تو میں نے وہاں کی حویلی کو دیکھ کر فوراً پہچان لیا کہ وہ عمارت جس کا خیال میرے ذہن میں تھا۔ یہی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ والدہ مرحومہ مجھے باغپت سے کلانور لے گئی تھیں اس لیے کہ میرے نانا کا اصلی گھر کلانور ہی تھا۔ باغپت تو جاگیر کے طور پر ملا تھا اور اب اس خاندان کی سکونت وہاں ہے بعض اوقات بچوں کے دل پر تھوڑی عمر میں کیسی کچھ چیزیں نقش ہو جاتی ہیں جو تمام عمر قائم رہتی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے بچوں کے سامنے ایسی

باتیں کرتے ہیں جو نہ کرنی چاہئیں اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں کہ یہ بچے کیا سمجھیں گے، انھیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ بعض اوقات یہ چیزیں عمر بھر یاد رہتی ہیں اور شاید بچے کے عادات واطوار پر بڑے پائدار نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔

مجھے یہ واقعہ شاید اس لیے یاد رہ گیا کہ مجھے انا چلا نا بڑا ناگوار گزر رہا تھا۔ اُس زمانہ کی اور بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں مثلاً ماسٹر کا انگریزی پڑھانے کی غرض سے بعد مغرب آنا اور میرا آنکھیں بند کر کے لیٹ جانا اور ماموں صاحب مرحوم کے تقاضے پر نانی صاحبہ کا کہنا ''ارے بندو (میرے کان میں بندہ تھا) تو سو گیا''۔ دو بار گھوڑے سے گرنا ایک دفعہ بھوں اور ایک بار سر کا پھٹ جانا لوگ آجکل تفریحاً گھر سے باہر کسی مقام پر جا کر کھانا پینا بہت پسند کرتے ہیں۔ میں چھ برس کی عمر ہی میں اس کا شائق تھا اور اکثر اپنی انا کے ساتھ اپنے باغ میں چلا جاتا۔ بیر کے درختوں کے نیچے یا کسی اور گھنی جھاڑی کے سایہ میں بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ اس کا موقع چھٹی ہی کے روز مل سکتا تھا۔ اس لیے دن کا اکثر حصہ وہیں گزارتا تھا۔ جتنی گھنی جھاڑی ہوتی اُتنا ہی میں اُسے پسند کرتا اور میری انا ناپسند کرتی تھی۔ میرا مرغوب کھانا، بیسنی روٹی، مرچوں کا اچار اور دہی تھا۔ یہ کھانا مجھے اب بھی بہت مرغوب ہے۔

میری انا:

جسے میں نے ہمیشہ ماں کی طرح سمجھا اور اُن کی آخر وقت تک کی دعائیں میرے ساتھ رہیں۔ ایک نو مسلم خاتون، میری والدہ کی خدمت میں تھیں۔ اُن کا ایک بیٹا کریما۔ اُس کی المناک موت نے انھیں میری انا بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کریما کی شادی طے ہوئی اور یہ بعض ہندوستانی خاندانوں کے قاعدہ کے مطابق ''مانجھے'' بیٹھا۔ اس دوران میں دستور ہے کہ دولہا دلہن کے اُبٹن ملتے ہیں اور کنگنا باندھتے ہیں۔ وہ اس حالت میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔ ہمسایہ کے گھر میں آگ لگی اور یہ نوجوان گھر سے نکل کر آگ بجھانے میں مشغول ہو گیا۔ سوء اتفاق سے خود جل گیا۔ دولہا بیٹے کا جنازہ دیکھ کر ماں پہ جو گذر گئی کون بیان کر سکتا ہے!!! ہمارے قلعہ کے سامنے جنازہ

رکھا تھا اور ماں رو رہی تھی۔ میرے والد عبدالعلی خاں صاحب مرحوم و مغفور اُدھر سے گزرے۔ بدنصیب ماں کو اس حال میں دیکھا۔ حویلی میں گئے، والدہ سے سارا قصہ بیان کیا اور ان کی اجازت سے مجھے باہر اٹھا لائے۔ میری عمر اس وقت کم و بیش ایک سال کی تھی۔ میری انّا کا نام لے کر کہا "اے نصیبن تیرا کریما یہ رہا اسے پال اور اس کا بیاہ کیجو"۔ اس کے بعد سے جب تک ۱۹۱۷ء میں نصیبن کا انتقال ہوا۔ اُن کو خاندان کا ایک رکن تصور کیا گیا۔ اور میرے لیے تو وہ میری ماں ہی تھیں۔ میں اپنے ماں باپ کی اس ہمدردی اور حوصلے کا خیال کرتا ہوں تو میرے دل میں اُن کی طرف سے طرح طرح کے حسین اور برگزیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے زندگی کی جاہ و منزلت سے میں کافی بہرہ ور ہوا ہوں۔ لیکن اپنے جس احساس کو میں سب سے زیادہ گرانمایا سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں ایسے والدین کا بیٹا ہوں جنھوں نے نصیبن کے جگر گوشہ کی تلافی میں اپنے جگر گوشہ کو پیش کر دیا۔

ماں کی ماتما:

دوسرا واقعہ مجھے بہت عرصہ کے بعد دو مختلف ذرائع سے معلوم ہوا۔ ایک تو میرے پھوپھی زاد بھائی عزیزی باسط علی خاں سلمہٗ نے اپنے والد صاحب قبلہ کا مقولہ بیان کیا اور ایک میرے والد کے دوست چودھری اشفاق حسین نے مجھ سے بیان کیا۔ چودھری صاحب کا خط آیا کہ وہ دہلی میں اسی کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں جس میں میرے والدین حج جانے کے وقت ٹھہرے تھے اور ایک قصہ اس زمانہ کا یاد آیا ہے جس سے وہ پریشان ہیں۔ میں نے حسب عادت انھیں تار دیا کہ آکر مجھ سے مل جائیے۔ چودھری اشفاق حسین مرحوم جب آئے تو میں نے پوچھا کہ کیا واقعہ تھا جس کی جانب آپ نے اپنے خط میں اشارہ کیا تھا تو وہ فرمانے لگے کہ جب "میاں" (چودھری صاحب میرے والد کو میاں ہی کہہ کر یاد کیا کرتے تھے) مکہ مکرمہ جانے لگے تو دہلی میں اسی مکان میں آکر ٹھہرے جہاں اب میں ٹھہرا ہوا ہوں اس روز آپ کی والدہ مرحومہ باغپت سے چل کر دہلی آئیں۔ وہ بھی حج کو جا رہی تھیں۔ قریب عصر "میاں" زنانے حصہ سے پریشان اور اشکبار برآمد ہوئے۔ میں نے دریافت حال

کیا تو ''میاں'' نے بتایا کہ اس وقت حویلی میں ایسا واقعہ سنا کہ جس سے میں بھی رونے لگا اور گھر میں تو بہت ہی مضطرب ہیں وہ کہتی ہیں کہ آج صبح جب میں باغپت سے دہلی سے آنے لگی تو علی الصباح اٹھی۔ گھر میں چہل پہل کی آواز سے بندو (راقم السطور) بھی اُٹھ بیٹھا۔ جس وقت میں اس کے پاس سے گذر رہی تھی تو ہمک کر میری گود میں آنا چاہا۔ مگر میں نے چلتے وقت اُسے گود میں نہ لیا کہ میں خدا کی راہ میں مکہ جا رہی ہوں تو بیٹے کی محبت کیوں ساتھ رہے۔ یہ تو میں نے کیا لیکن کیا کروں اب دل ہے کہ مسوستا اور اُمڈا چلا آتا ہے۔

محبت کی دنیا باغپت:

سات برس کی عمر تک میں باغپت میں رہا یہ زمانہ میرا بہت ہی مسرت اور خوشی کا تھا۔ نانا کے چار بیویاں تھیں جن میں سے دو (یعنی ایک میری حقیقی نانی اور دوسری جھجھر والی نانی، جن کے حصہ میں میری ماں آئی تھیں۔ نانا صاحب کی ان چار بیویوں میں سے ایک (یعنی میری حقیقی نانی) کے بطن سے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں اور ایک اور بیوی جن سے صرف ایک لڑکی تھی۔ ان چاروں بیویوں نے ان بچوں کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ ہر لڑکی الگ الگ حصہ میں آئی اور بیٹا سب میں رہا۔ والدہ مرحومہ جھجھر والی بیوی کے حصہ میں آئیں جو لاولد تھیں اور اس وجہ سے میں بھی اُن ہی کے حصہ میں آیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میری حقیقی نانی مجھے جھجھر والی بیوی کے سامنے پیار نہ کرتی تھیں اور اس طرح گذر جاتی تھیں گویا مجھے اُن سے کوئی متعلق ہی نہیں لیکن چھپ کر مجھے گود میں لیتیں اور پیار کرتی تھیں۔

والدین کا سفر حجاز اور وفات:

چھتاری اس وجہ سے نہ جا سکا کہ دادا صاحب نواب محمود علی خاں مرحوم جب ہجرت کر کے مکہ چلے گئے تو والد مرحوم کو گوارا نہ ہوا کہ باپ سے مفارقت ہو، لہٰذا کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی حج کو گئے۔ ارادہ یہ تھا کہ اپنے باپ کو جس طرح ہو واپس لائیں اس لیے میں اپنے ماموں کے گھر رہا۔ میرے والد اور دادا میں باہم غیر معمولی محبت تھی

اور یہی وجہ ہے کہ ہجرت سے قبل بجائے بڑے بیٹے نواب لطف علی خاں مرحوم کے میرے دادا نے چھتاری اور اس کے قریب کا حصہ میرے والد عبدالعلی خاں کو ہبہ کیا۔ میرے دادا بڑے باخدا اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اپنی زندگی ہی میں اپنی تمام جائداد اپنے چاروں بیٹوں اور دو بیٹیوں پر تقسیم کر کے راضی برضائے الٰہی ہو گئے تھے۔ یہاں ایک قصہ جو میں نے بھائی باسط علی خاں سے سنا ہے لکھتا ہوں۔ جس سے اُن باپ بیٹوں کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کو میرے دادا اور والد جا رہے تھے۔ اونٹ پر سفر تھا۔ شغدف میں سوار تھے۔ میرے دادا میرے والد کے سہارے سے لگ کر سو گئے۔ میرے والد کی ٹانگ کے نیچے شغدف میں لوہے کی کیل نکلی ہوئی تھی۔ رفتار کے ہچکولوں سے وہ کیل برابر چبھتی رہی اور یہ باپ کی نیند کا پاس کر کے خاموش بیٹھے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ظہر کے وقت میرے دادا اُٹھے تو میرے والد کی ٹانگ کے نیچے کا بستر خون سے شرابور ہو گیا تھا۔

مکہ مکرمہ پہونچنے کے بعد والد یہ کوشش کرتے رہے کہ میرے دادا واپس چلیں اور وہ چوں کہ ہجرت کر چکے تھے۔ راضی نہ ہوتے تھے۔ اس دوران میں میرے بڑے سوتیلے بھائی حافظ محمد سعید خاں مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ یہ نواب محمود علی خاں کے ساتھ گئے تھے اور مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔ ایک جوان بیٹے اور پوتے کا صدمہ جس قدر باپ اور دادا کو ہوا بیان سے باہر ہے۔ پھر یہاں (یعنی مدینہ منورہ ہی میں) رمضان کی آخری تاریخ میں میرا ایک بھائی پیدا ہوا، دوسرے روز میری والدہ کا انتقال ہو گیا اور پھر بچہ بھی مفارقت کر گیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا الیہ راجعون. عید کے روز روزۂ اطہر کے سامنے نماز جنازہ ہوئی اور جنت البقیع میں قبلۂ اہل بیت کے پائیں جگہ پائی۔

ان صبر آزما واقعات کے بعد والد مرحوم کو کوئی تمنا ہندوستان آنے کی نہ تھی۔ چودھری اشفاق حسین نے جو بحیثیت ایک رفیق ہمیشہ والد مرحوم کے ساتھ رہتے تھے۔ مجھ سے کہا کہ مکہ مکرمہ واپس آنے کے بعد انھوں نے یہ دیکھا کہ بعد نماز مغرب جب لوگ سنتیں پڑھتے ہیں تو والد کچھ دیر کو کہیں چلے جاتے تھے۔ انھیں اس کی تلاش رہی اور ایک روز وہ بھی ساتھ ہوئے تو دیکھا کہ والد غلاف کعبہ سے لپٹے ہوئے دعا

مانگ رہے ہیں۔ یہ خاموشی سے اُن کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تو انھوں نے سنا کہ والد یہ عرض کر رہے تھے "خداوندا" تو نے اپنے کرم سے میری تمام نذریں قبول فرمالیں اب مجھے واپس نہ کر دینا۔ اس نذر کو بھی قبول فرما۔" کچھ عرصہ کے بعد والد مرحوم کا بھی انتقال ہو گیا۔ جنت المعلی[1] میں دفن ہوئے۔ اب میرے ماں باپ بھائی بہن کوئی باقی نہ تھا۔ اس وجہ سے سات برس کی عمر تک میری پرورش کی ذمہ داری میرے ماموں پر رہی جسے انھوں نے انتہائی شفقت اور خلوص کے ساتھ انجام دیا۔ خدا ان کو اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمائے آمین۔

دادا صاحب کی حجاز سے واپسی:

میرے دادا کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی بیعت تھی اور میں نے سنا ہے کہ انھوں نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اب میرے دادا کی بہترین عبادت یہ ہے کہ ہندوستان واپس جا کر اپنے یتیم پوتے کی پرورش کریں۔ اِدھر تو مرشد کا حکم اُدھر مدینہ منورہ میں ایک بزرگ تھے جنھوں نے فرمایا کہ آپ کے واسطے یہی حکم ہوا ہے کہ واپس جا کر اپنے پوتے کی پرورش کریں۔

باغپت کو الوداع:

دادا صاحب مرحوم کی واپسی اور میرے قیام باغپت کا اختتام ساتھ ساتھ ہوا۔ مجھے اس زمانہ کی یاد کچھ واضح نہیں ہے۔ صرف ایک روز بہت صبح گھر سے کہیں کو چلنا یاد ہے۔ ممکن کہ وہ یہی سفر ہو۔ ہاں البتہ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک ریلوے اسٹیشن پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ جس وقت ٹرین پلیٹ فارم پر آئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بجائے ریل چلنے کے پلیٹ فارم سمت مخالف کو جارہا ہے۔ پھر ایک سفید ریش بزرگ کا سامنا ہونا یاد ہے۔ باقی جو لکھ رہا ہوں وہ میرے چچا نواب بہادر عبدالصمد خاں مرحوم کا بیان کردہ۔ حاجی عبدالکریم اور حاجی سلامت اللہ کی زبانی ہے کہ جب مجھے میرے دادا کے پاس لایا گیا تو میں فوراً اُن کی گود میں چلا گیا۔ لیکن بچپن

---

[1] یہ مکہ مکرمہ کے گورستان کا لقب ہے جس طرح مدینہ منورہ کے گورستان کا جنت البقیع۔

کی ناسمجھی میں مجھ سے ایک غلطی ہوگئی کہ جس نے نواب محمود علی خاں کے صبر وتحمل کو ڈگمگادیا اور وہ (جنھوں نے اپنے بیٹے اور ایسے محبوب بیٹے۔ (یعنی میرے والد کنور عبدالعلی خاں مرحوم) سے آخری رخصت دم واپسیں کے وقت فقط آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا ہو اور حاجی امداد اللہ خاں صاحب سے یہ کہا ہو کہ آپ گواہ رہیں کہ میں خدا کے واسطے صبر کرتا ہوں) زار وقطار رونے لگے۔

"باپو" کی یاد:

کہا یہ جاتا ہے کہ جب میں ان کی گود میں گیا تو یا تو میں نے یہ سوال کیا کہ "میرے باپو کہاں ہیں؟" یا یہ کہ "تم میرے باپو ہو"؟ میرے چچا نواب بہادر عبدالصمد خاں مرحوم کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں انھوں نے میرے چچا کی طرف اشارہ کیا اور میں ان کی گود میں چلا گیا۔ چچا مرحوم نے اپنے باپ کے اس اشارہ کو مرتے دم تک نبھایا اور ہمیشہ مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا۔ ان کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا اس روز مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں باپ کے سایہ سے محروم ہوگیا نواب محمود علی خاں مرحوم ہندوستان واپس آنے کے بعد ڈھائی یا تین برس زندہ رہے اور ۱۸۹۸ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

نواب محمود علی خاں کے معمولات:

نواب صاحب خلد آشیاں کو شکاری جانوروں کا بہت شوق تھا۔ مرحوم کی عمر ستّر اور اسّی کے درمیان تھی۔ میں نے اپنے بچپن میں انھیں باز یا جرے کے ساتھ گھوڑا دوڑاتے دیکھا تھا۔ انتہائی پابند سنت تھے اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شام کو مسافروں کو کھانا دیا جاتا کبھی کبھی وہی کھانا خود کھاتے اور کبھی کسی کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ اکثر چھتاری کے حفاظ عربی کے مدرسہ اور قرآن خوانی کے مدرسہ کے طلبا کو اپنے دسترخوان پر بلاکر کھانے میں شریک کرلیتے۔ ان کی سخاوت نہ صرف ان اطراف میں بلکہ عرب میں بھی مشہور تھی روزانہ صبح کو بعد نماز فجر مسافروں کو بطور رخصتانہ کچھ دیتے۔ ہر چاند کی پہلی تاریخ کو "چاند" تقسیم کیا جاتا اور ہر سال میں ایک باڑہ تقسیم ہوتا۔ جس

میں نقدی، اور رضائیاں موسم سرما کے واسطے مسافروں کو دی جاتیں۔ میں نے اس موقع پر ہزارہا آدمیوں کا مجمع دیکھا۔ نواب صاحب خلد آشیاں روزہ رکھ کر باڑہ تقسیم فرماتے تھے۔

دادا صاحب کے بعض نصائح:

دادا صاحب کا انتقال ہوا تو میری عمر نو سال کی تھی۔ لیکن بعض نصائح مجھے اب تک یاد ہیں۔ ایک بار ارشاد فرمایا کہ خیرات کرنا خدا سے تجارت کرنا ہے۔ کبھی مالی مشکلات میں گرفتار ہو تو خیرات کرو۔ بڑے ہونے پر معلوم ہوا کہ اس آیت کی طرف اشارہ تھا ''من یقرض اللّٰہ قرضاً حسناً فیضعفہ لہٗ''۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی سنت (کہ سالانہ باڑہ تقسیم ہو اور روزانہ مسافری کی تقسیم) اب تک جاری ہے۔ میرے چچا جن کے ہاتھوں میری پرورش ہوئی مقروض ہو گئے۔ نواب صاحب خلد آشیاں کو معلوم ہوا تو ایک روز فرمانے لگے کہ ''تم اپنے چچا کی عزت اور تابعداری کرنا مگر ان کی تقلید نہ کرنا وہ فضول خرچ ہیں۔ ہم پر ایک بار چار سو روپے قرض ہو گئے اس کو ادا کرنے کے بعد کبھی قرض ہم نے نہیں لیا۔'' خدا کا شکر ہے کہ میں نے بھی آج تک قرض نہیں دیا۔

مذہبی اعمال کی پابندی اور دیگر خصائل حمیدہ:

نواب صاحب خلد آشیاں کی نماز تہجد تا دم مرگ قضا نہیں ہوئی۔ جس صبح کو انتقال ہوا ہے اس روز بھی تہجد پڑھی۔ عبادت میں اس درجہ خلوص تھا کہ اس کا اثر ان کے ہر قول و فعل میں نظر آتا تھا۔ میں نے اکثر ایسی مثالیں دیکھی ہیں کہ باوجود اس کے کہ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر صحیح ہے۔ بعض لوگ نماز کے پابند ہیں، روزہ رکھتے ہیں وظیفہ بھی پڑھتے ہیں لیکن باہمہ فسق و فجور میں گرفتار رہتے ہیں۔ میں خود باوجود قرآن پڑھنے کے اکثر اعمال خلاف شریعت کرتا ہوں۔ لیکن نواب صاحب خلد آشیاں کا ہر قول و فعل شریعت کے دائرے کے اندر تھا۔ میں نے کبھی ان کو قہقہہ لگا کر ہنستے نہیں دیکھا۔ اکثر مسکراتے اور اگر زیادہ ہنسی آتی تو منہ کے سامنے رومال لگا کر مسکراتے۔ کتنا ہی صدمہ ہوتا اس کا اظہار شریعت اور سنت نبوی کے مطابق

کرتے تھے۔ جیسا کہ میرے والد کے انتقال پر ملال کے موقع پر کیا۔ ان کو انتہائی غصّہ کی حالت میں بھی اپنے آپ پر پوری قدرت حاصل رہتی۔ کوئی لفظ ایسا زبان پر نہ آتا نہ کوئی عمل سرزد ہوتا۔ جو مذہب و اخلاق کی رو سے قابل گرفت ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ موذی کہہ کر مخاطب کرتے۔

حال ہی میں حافظ حبیب اور شیخ عبدالعلی جو پرانے کاغذات کو چھانٹ کر ضایع کر رہے تھے نواب صاحب کا ایک دستخطی حکم لائے۔ کہ جس پر جملہ کارندگان و مختاران و منیجر کے دستخط اطلاع یابی ہیں جس کی عبارت ذیل میں درج ہے اور جسے میں نے فریم کرا کے رکھ لیا ہے:

"روب کار از پیش گاہ سرکار فیض آثار نواب مستطاب حاجی محمد محمود علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ دافع ۲۹ رشعبان ۱۳۰۱ھ مطابق ۲۲ رجون ۱۸۸۴ء ملاحظۂ کیفیات جملہ کارندگان ومختاران اضلاع سے پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ وقت فتحیابی مقدمات ویا اسلوبی کارہائے متعلقہ ریاست یہ الفاظ تحریر کیا کرتے ہیں کہ "فلاں مقدمہ بفضل الٰہی و باقبال سرکار فتح ہوگیا۔ و باقبال سرکار فلاں کام کی ہوجانے کی اُمید ہے"۔ لہٰذا تاریخ امروزہ سے ہدایت کی جاتی ہے کہ آیندہ کو لفظ اقبال سرکار یا اور کوئی کلمہ مثل اس کے تحریر نہ کیا کریں صرف لفظ فضل الٰہی کافی ہے۔ ہر کارندہ اور مختار اطلاع یابی اپنی لکھ کر بھیج دیوے بحالت عدم تعمیل حکم کے جواب طلب ہوگا اور تعمیل اس روب کار کی اس طرح کی جاوے کہ چھتاری سے جمعدار حکم ہذا پاس کارندہ احمد گڑھ کے پہنچا دیوے۔ کارندہ احمد گڑھ اپنی اطلاع یابی لکھ کر بذریعۂ ڈاک پاس مختار متعلقہ بلند شہر کے اور وہ پاس کارندہ مالا گڑھ کے اور وہ پاس مختار کول کے اور وہ پاس کارندہ مینڈو کے اور وہ پاس کارندہ ادوں کے اور وہ پاس کارندہ فتح گڑھی کے پہنچا دیوے اور وہ

تعمیل کر کے پاس کارندہ ہر دو گنج کے اور وہ صدر میں جلد تر
ارسال کرے اور تعمیل اس حکم کی جلد ہونی چاہیے۔ فقط
محمد محمود علی خاں''

چھتاری کا کوئی ملازم خواہ ہندو ہو یا مسلمان عادتاً اطلاع کے وقت یہی کہتا ہے کہ فضلہٖ یا خدا کے کرم سے یہ کامیابی ہوئی۔ نواب صاحب کا یہ فیضان تربیت اب بھی جاری ہے کہ چھتاری میں ہر مسلمان بجائے آداب وتسلیمات عرض کرنے کے بغیر سر جھکائے ہوئے السلام علیکم کہتا ہے۔ اسی طرح شادی و غمی کے مراسم میں دادا صاحب مرحوم نے بہت سی اصلاحیں کیں مثلاً پہلے ہمارے ہاں قبور پختہ یا پتھر کا تعویذ بناتے تھے۔ اب بالکل خام قبور ہیں۔ بیاہ شادیوں کے اکثر مراسم (جو ہمارے خاندان کے ہندو ہونے کے زمانے سے چلے آ رہے تھے۔ اور اسلام کے خلاف تھے) بند کر دیئے۔ نواب صاحب مرحوم اس اسلام کے پابند تھے جو سنت نبوی صلعم سے ثابت ہے وہ اس میں کمی یا بیشی ناپسند فرماتے تھے۔ نواب صاحب علماء اور فقراء کا بڑا ادب کرتے تھے اور بڑی سیر چشمی سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ ایک مولوی کا گاؤں موضع محل چند، خرید کر انھیں واپس دے دیا۔ اور اسی طرح بائیس ہزار روپے سے ان کی مدد کی۔ لیکن معاملات ریاست میں کسی کو دخل نہ تھا۔ سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر ان کے پیش نظر تھا۔

ہر کہ را جامہ پارسا بینی پارسا داں و نیک مرد انگار

تو دوسری طرف دوسرا شعر مولانائے روم بھی نظر انداز نہ ہوا تھا۔

اے بسا ابلیس آدم روئے نیست پس بہر دستے نہ باید داد دست

نواب صاحب میرے مستقبل کے متعلق میرے چچا سے بہت اچھی پیشین گوئیاں فرمایا کرتے تھے۔

نواب محمود علی خاں کی وفات:

جس صبح کو نواب صاحب کا انتقال ہوا اس سے پہلی شب میں حسب عادت تہجد کو اُٹھے اور چوں کہ مریض تھے نوکر کے سہارے سے باہر چوکیوں پر آ کر تہجد کی نماز

ادا کی۔ پھر درود وظائف میں مصروف رہے یہاں تک کہ صبح کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد میرے چچا ایک خط لے کر آئے۔ نواب صاحب تلاوت کی غرض سے قرآن شریف کھولے بیٹھے تھے۔ میرے چچا سے خط لے کر پڑھا اور خط واپس دینے کے واسطے ہاتھ بڑھایا تو شاید یکایک قلب کی حرکت بند ہوگئی اور دادا صاحب گاؤ تکیہ کے سہارے لیٹتے چلے گئے۔

دادا صاحب کے آغوشِ لحد میں جانے سے قبل ہی میرا نکاح:

میرا رشتہ میرے چچا کی لڑکی سے نواب صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں کر دیا تھا مگر نکاح نہیں ہونے پایا تھا۔ دادا کے انتقال معاً بعد میرے چچا نواب بہادر عبدالصمد خاں مرحوم کو یہ خیال ہوا کہ مبادا اُن کے دوسرے بھائی (نواب یوسف علی خاں صاحب مرحوم) اسی رشتہ میں مداخلت کریں اور میرا رشتہ کسی دوسری لڑکی سے کردیں۔ لہٰذا دادا مرحوم کے جنازہ کے دفن سے قبل ہی چچا صاحب نے مولانا ناظر حسن صاحب کو (جو ہمارے عربی مدرسہ کے مدرس اوّل تھے) بلایا اور کچہری والے برج میں میرا نکاح پڑھا دیا گیا۔ شہرت یہ کی گئی کہ دادا صاحب خلد آشیاں نے اپنی زندگی ہی میں نکاح کر دیا تھا۔ یہی سبق ہم نے بھی یاد کرلیا اور جب میرے دوسرے چچا صاحبان (نواب لطف علی خاں مرحوم اور نواب یوسف علی خاں مرحوم) تشریف لائے تو ان کے سامنے آموختہ دہرا دیا۔

میری زندگی کا نادور اور خاندانی معاملات:

دادا صاحب کی وفات کے وقت میری عمر نو سال کی تھی اور اب ایک نیا دور شروع ہوا۔ ماں باپ کے بعد جس دادا نے سرپرستی کی اُن کے سایہ سے بھی ۱۸۹۸ء میں محروم ہوگیا۔ حج سے آکر جو کچھ وہ میرے لیے کر سکتے تھے انھوں نے کیا۔ والد کے انتقال کے بعد شرعاً ۱/۶ حصہ میرے دادا کو ترکہ میں پہنچا۔ وہ تمام و کمال میرے حق میں ہبہ کردیا۔ غالباً کسی سہو سے بعض مواضعات کے کچھ حصص ان کے نام رہ گئے تھے جن میں کا کچھ چھوٹا سا جزو تو پیر جی سید محبت علی مرحوم مغفور کو میرے تایا اور چچوں

نے دیا اور سورج پور اور شیخو پور نواب لطف علی خاں صاحب مرحوم کے لیے رکھے گئے۔ اس واسطے کہ وہ سب سے بڑے بیٹے تھے اور موروثی خطاب نوابی کے حامل ہوئے تھے۔ نواب بہادر عبدالصمد خاں صاحب مرحوم کے پاس ہی میں رہتا تھا۔ اور ان کی شفقت میرے ساتھ ایسی ہی رہی جیسی شروع سے تھی۔ گو ان کے خود لڑکا پیدا ہو چکا تھا (نواب بہادر عبدالسمیع خاں سلمۂ) مگر میرے ساتھ وہ برابر ویسی ہی محبت کرتے رہے۔ میری ریاست گورنمنٹ کورٹ کرنا چاہتی تھی مگر نواب لطف علی خاں مرحوم کے اصرار پر کورٹ نہیں کی گئی اور اس کا انتظام میرے تایا اور چچوں کے سپرد کیا گیا۔ نواب لطف علی خاں مرحوم بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ میرے والد ان سے چھوٹے تھے۔ یہ پرانے کلچر کا بہترین نمونہ تھے۔ شعر بھی کہتے تھے اور مائل تخلص تھا۔ بہت سیر چشم تھے اور فخریہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی عمر میں روپیہ کو ہاتھ سے نہیں چھوا۔ ان کا دستر خوان بڑا وسیع تھا اور جتنے ان کے ملازموں کے بچے تھے سب ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

۱۹۰۱ء میں میرے تایا نواب لطف علی خاں صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور گو میرے چچا نواب یوسف علی خاں نے کوشش کی کہ ریاست کورٹ نہ ہو۔ مگر گورنمنٹ نے کسی طرح نہ مانا اور کورٹ ہو گئی۔

میرے دادا کے انتقال کے وقت میرے چچا نواب بہادر عبدالصمد خاں پر ساٹھ ہزار کے قریب قرضہ تھا جو میری ریاست سے ادا کر دیا گیا اور پھر اقساط کے ذریعہ مالا گڑھ سے وصول کر لیا گیا۔

نواب یوسف علی خاں صاحب کے تعلقات والد مرحوم کے ساتھ کچھ بہت خوشگوار نہ تھے لیکن مرحوم نے میری سرپرستی بہت ہمدردی سے کی۔ ان بھائیوں کے اختلاف کا ذکر اس موقع پر بالکل غیر ضروری ہے لیکن اس میں ایک انسانی نفسیاتی پہلو پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ اس لیے مختصراً اس کا ذکر کرتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ وجہ اختلاف ایک تو یہ ہوئی کہ دادا مرحوم کو اور بیٹوں کے مقابلہ میں میرے والد سے زیادہ اُنس تھا۔ اور ریاست ہبہ کرتے وقت اس کا اظہار ہوا۔ ممکن ہے کہ روزانہ کی زندگی

میں بھی اس کا اظہار ہوتا ہو۔ مگر بخلاف فطرت نہیں کہ اپنی اولاد میں کسی ایک سے زیادہ تعلق خاطر ہو لیکن اس کا اظہار اکثر اپنے ہی بچوں میں افتراق پیدا کرتا ہے۔ دوسری وجہ میں نے سنا ہے کہ چودھری اشفاق حسین کا وجود تھا وہ ایک ہوشیار شخص اور والد مرحوم کے بڑے دوست تھے اور معاملات میں دخیل تھے۔ ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ دوسرے بھائیوں کو یہ چیز ناگوار ہوئی اور رقابت کی سی کیفیت پیدا ہوگئی اور پھر اختلاف بڑھتے ہی چلے گئے۔

میں اسکول میں نویں جماعت میں تھا کہ میرے چچا نواب یوسف علی خاں صاحب مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ یہ شاید ۱۹۰۷ء کا واقعہ ہے۔ اطلاع پانے پر مینڈو گیا۔ مرحوم کی علالت بہت طویل ہوئی تھی انھیں ''سارکوما'' ہوگیا تھا۔ انتقال سے قبل انھوں نے اپنی جائداد سے ایک حصہ وقف بھی کیا۔ جس کی تولیت اپنی بڑی بیٹی کے نام رکھی اور وہ دونوں مواضعات (یعنی شیخو پور اور سورج پور) جو دادا مرحوم کے بعد نواب لطف علی خاں صاحب کے پاس گئے۔ اور پھر نواب صاحب مینڈو کے پاس آئے اب اپنے بھائی نواب عبدالصمد خاں کو ہبہ کر دیئے۔ یعنی بجائے اس کے کہ جو نواب ہو وہ اُنسے پائے اب انھیں کلیتہً دے دیئے اور نینی تال کی کوٹھی پر اسپکٹ لاج بھی انھیں دے دی۔ ان کے ورثاء میں دو بیٹیاں ایک باغپت میں میرے ماموں کو بیاہی تھیں۔ دوسری نواب لیاقت حسین خاں مرحوم کو جنھیں (خالی جگہ چھوڑیں) سے بلا کر میرے چچا نواب یوسف علی خاں صاحب مرحوم نے مینڈو ہی میں رکھ لیا تھا اور ایک بھائی نواب بہادر عبدالصمد خاں مرحوم تھے۔ گو میری عمر اس وقت صرف انیس، بیس سال کی تھی مگر نواب بہادر عبدالصمد خاں صاحب نے مجھ سے مشورہ کیا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم اپنا حصہ نہ لیں۔ میں نے اس سے اختلاف کیا اس واسطے کہ نواب بہادر مرحوم کا قیام اب تک چھتاری میں تھا لیکن اب میرے بڑے ہونے کے بعد قدرتاً ان کا خیال طالب نگر میں قیام کا تھا۔ اور طالب نگر آدھا آدھا دونوں بھائیوں کے حصہ میں تھا اور اس وجہ سے نواب بہادر مرحوم نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو، حصہ لینا ہی پڑے گا۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس قدر شرافت کے ساتھ وہ اس معاملہ کو طے کرنا چاہتے

تھے۔لیکن مآل کار کیا ہوا، آیندہ معلوم ہوگا۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ نصف طالب نگر تک نواب بہادر صاحب کو لینا چاہیے اور اگر اور کوئی حصہ بچے تو وہ چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے نواب لیاقت حسین خاں صاحب سے گفتگو کی۔ نواب لیاقت حسین خاں نہایت بزرگ اور عابد و زاہد شخص تھے۔ تہجد گزار تھے۔ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے اور میرا لحاظ کرتے تھے، گو میں عمر میں اُن سے بہت ہی چھوٹا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم بہت چھوٹے بچے تھے جب ہی مجھ کو تم سے محبت ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ جب میں نے اُن سے گفتگو کی تو انھوں نے نہایت خوشی سے میری تجویز کو قبول کیا۔ حالاں کہ قانوناً وہ دقتیں پیدا کر سکتے تھے اس لیے کہ طالب نگر بہترین گاؤں ہے اور تمام حصہ بہترین ہی گاؤں میں کیوں دیا جائے۔ بہر حال یہ لاکھوں روپیہ کا معاملہ نہایت خوش اسلوبی سے طے ہوا۔ اور جب حساب لگایا تو نصف طالب نگر میرے چچا مرحوم کے حصہ سے زیادہ ہوتا تھا۔ تو چودھری لیاقت حسین خاں مرحوم و مغفور نے اس کے بقدر موضع سناوٹین کا حصہ تبادلہ میں لے کر طالب نگر کو نواب عبدالصمد خاں صاحب کے لیے پورا کر دیا۔ یہ بڑا معاملہ یوں طے پایا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اور میری دوسری چچازاد بہن نے (جو میرے ماموں کو بیاہی تھیں) اپنے شرعی حصہ سے بھی کچھ کم لے کر معاملہ ختم کر دیا۔ اسی دوران میں میری طبیعت خراب ہوگئی اور میں مینڈو سے چلا آیا۔ اب جو ہفتہ عشرہ کے بعد مینڈو پہنچتا ہوں تو تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے۔ بعض حضرات نے میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور ایسی ایسی رکیک باتیں کیں کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر جھگڑا اور بدمزگی شروع ہوگئی اور اس قدر بڑھی کہ نواب بہادر مرحوم میرے چچا اور نواب لیاقت حسین خاں مرحوم کے تعلقات پھر کبھی صاف نہ ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نادان دوست:

اسی زمانہ میں چودھری اشفاق حسین (جو میرے والد کے بڑے دوست تھے اور جن کا ذکر میں نے اوپر کئی جگہ کیا ہے) تعزیت کے سلسلے میں بھراؤں سے

مینڈو آئے میرے ساتھ انھیں بڑی محبت تھی اور مجھے یقین ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا نیک نیتی سے کہا مگر رائے بڑی خطرناک تھی، فرمانے لگے کہ تمھیں ایسی ترکیب بتاؤں کہ کوڑی خرچ نہ ہو اور تین چار لاکھ کا فائدہ ہو جائے۔ میں نے کہا ضرور ارشاد ہو۔ کہنے لگے کہ اول تم اپنی ماں کا حصہ اپنے ماموں سے مانگو پچاس ساٹھ ہزار سے کم نہ ہوگا اور اس رقم سے اپنے چچا پر طالب نگر کے وقف کا دعویٰ کر دو (میرے دادا نے اخیر زمانہ میں طالب نگر کو وقف کر دیا تھا۔ اور متولی میرے والد اور ان کی اولاد کو ٹھہرایا تھا۔ میں چوں کہ نابالغ تھا اس لیے مجھے ایسے دعوے کا حق حاصل تھا) مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا جواب دیا۔ مگر میں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ ماموں مرحوم کے اصرار اور ان کی وفات کے بعد میری بہن اور نواب سر جمشید علی خاں کی والدہ کے اصرار کے باوجود میں نے حصہ لینا پسند نہیں کیا۔

میں نے صرف اس وجہ سے ان واقعات کو لکھا ہے کہ بعض نادان دوست دشمن سے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ ایسے دوستوں کی رائے بڑے بڑے سمجھدار قبول کر لیتے ہیں۔ دل میں ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے (اور ایسے لوگ خود بھی اکثر کہتے ہیں) ''اس میں ہمارا کیا نفع ہے ہم تو آپ کی ہمدردی سے کہہ رہے ہیں۔'' حالاں کہ یہ غلط ہے کہ ان کا کوئی نفع نہیں ہوتا ان کا یہ نفع ہوتا ہے کہ جب گھر میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے یگانے بیگانے بن جاتے ہیں تو جو صاحب ان کی غلط رائے پر عمل کرتے ہیں اُن کو سوائے ان دوستوں کے کوئی اور نظر نہ آتا تھا اور پھر ان کے قبضہ سے عمر بھر نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ایسے معاملات میں ہمیشہ اس پر غور کر لینا چاہیے کہ آیندہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ع

مراد آخربین مبارک بندہ ایست

ایک یادگار تحفہ:

اب حکومت نے یہ طے کیا کہ مجھے تعلیم چھوڑ کر گھر کا کام سنبھالنا چاہیے۔ ان دنوں میں دسمبر کے مہینہ میں باغپت گیا۔ نواب جمشید علی خاں بچہ تھے۔ مگر میرے تھوڑے ہی سے قیام میں مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ جب میں چلنے لگا تو بہت ہی

روئے۔ میں نے اپنی ایک چھڑی جس پر میرا نام کندہ تھا اُن کو تحفہ میں دی اور جلد ہی ملنے کے وعدہ پر رخصت ہوا۔ یہ چھڑی اب تک اُن کے پاس محفوظ ہے۔ باغپت میں ہی تار سے یہ معلوم ہوا کہ اب مجھے اسکول جانا نہیں، بلکہ ریاست کا کام سیکھنا ہے۔

تعلیم و تربیت

حفظ قرآن، مذہبی تربیت مشرقی طرز معاشرت:

قیام باغپت میں میری انگریزی تعلیم پرائمر سے شروع ہوگئی تھی۔ چھتاری آنے کے بعد انگریزی کی تعلیم کا سلسلہ فوراً روک دیا گیا۔ اور چوں کہ میرے دادا پر مذہبی رنگ بہت چڑھا ہوا تھا۔ میں نے حفظ قرآن پاک شروع کیا۔ دادا مرحوم انگریزی طرز معاشرت، انگریزی تعلیم اور مغربی کلچر سے بیزار تھے وہ غدر کے زمانہ میں موجود تھے انھوں نے بہادر شاہ کا قید ہونا۔ خاندان شاہی کا خاک و خون میں ملنا آبروریزی اور خانما بربادی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ انھوں نے وہ سب کچھ مٹتے دیکھا تھا جس کو وہ اخلاق تہذیب اور انسانیت کا حاصل سمجھتے تھے جن کے بغیر زندہ رہنے میں ان کو نہ لطف آتا تھا نہ عزت محسوس ہوتی تھی۔ اُن کو گوارا نہ تھا کہ میں انگریزی تعلیم یا انگریزی طور طریقے کوئی سروکار رکھوں۔ سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ اور انگریزی تعلیم پھیلی۔ میری تعلیم صرف حفظ قرآن تک محدود تھی اور طرز و بود ماند کلیتہً مشرقی اور ہندوستانی تھا۔ ایک بار میرے چچا نواب بہادر عبدالصمد خاں نے مجھے پمپ جوتا منگا دیا۔ میں پہن کر چلا تو پختہ فرش پر آواز ہوئی۔ نواب صاحب خلد آشیاں نے فرمایا کیا کوئی گھوڑا قلعہ کی چھت پر آ گیا۔ مجھے ایک چھوٹا گھوڑا اور ایک مادین ہاتھی کا بچہ خرید دیا تھا۔ ان کی زندگی میں میں نے بندوق تو کبھی نہیں چلائی مگر نجیب علی شکاری کو حکم تھا کہ ہر ہفتہ مجھے شکار کو لے جایا کرے۔ باز خانہ بھی میرے واسطے قائم کیا گیا اور باز، جرے، اور شکرے پائے جاتے تھے۔ مجھے شکاری جانوروں کا بہت شوق تھا۔

سحر خیزی کی عادت اور نماز کی پابندی:

مجھے سویرے اٹھنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی چاندنی میں جامع مسجد صبح کی نماز کے واسطے جانا یاد ہے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ اکثر نماز میں رکوع کے وقت ہاتھ پھیل جاتے اور زمین پر ہاتھ رکھ کر گرنے سے بچتا۔

میں ان کی زندگی ہی میں حافظ ہو گیا تھا جس کی انھیں بہت مسرت ہوئی۔ نواب صاحب خلد آشیاں بیمار تھے کہ میرا قرآن شریف ختم ہوا۔ تام جھام میں بیٹھ کر جامع مسجد جمع کی نماز کو گئے۔ وہاں مجھ سے مسلمانوں کے مجمع میں ایک رکوع سُنا اور نکتی کے بہت بڑے بڑے لڈو تقسیم کرائے دورانِ علالت میں نواب صاحب میرے چچا سے جوان کے پاس چھتاری میں رہتے تھے اکثر کہتے تھے کہ تم ہمیں لے کر سفر مکہ کو چلو زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نہ کہ موت آجائے گی۔ مگر اس سے بڑھ کر اور کون سی سعادت میسر آسکتی ہے۔

ایک عجیب واقعہ:

نواب صاحب نے دورانِ علالت میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا، ایک روز سہ پہر کے قریب نواب صاحب خلد آشیاں یکا یک بے ہوش ہو گئے۔ مجھے لوگوں کا گھبرایا گھبرایا پھرنا یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ کوئی چیز سنگھائی جا رہی تھی۔ جب نواب صاحب کو ہوش آیا تو میرے چچا مرحوم نے فرمانے لگے کہ ہم نے اس وقت ایک عجیب خواب دیکھا یعنی یہ کہ ہمارا انتقال ہو گیا ہے اور ہماری روح کو بارگاہ ایزدی میں پیش کیا گیا اور میزان پر ہماری نیکی اور بدی کا موازنہ کیا گیا تو بدی کا پلہ کچھ بھاری تھا یعنی گناہ زیادہ تھے۔ ہم یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے مگر ہمیں یہ آواز سنائی دی کہ ایک ہفتہ کی مہلت دو تا کہ اتنی ہم نیکیاں کرلائے۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کے ایک ہفتہ کے بعد رحلت فرمائی۔

نواب صاحب مرحوم نے گو میرا پورا کلام پاک نہیں سنا مگر چوبیس پارہ تک نوافل میں سنا تھا اور مجھے یاد ہے کہ جس روز اخیر پارہ پڑھنے کو تھا تو یہ حکم دیا کہ آج

تہجد کے وقت سنیں گے۔

سخت سردی کا زمانہ تھا اور نواب صاحب ان کمروں میں مقیم تھے جو دیوان خانہ کے قریب گرم حمام سے متصل ہیں۔ مجھے تین بجے اٹھایا گیا۔ وضوع کیا اور نفل شروع کیے۔ سنا ہے کہ تھوڑی دیر میں مجھے اتنی نیند آئی کہ کھڑے کھڑے ہی سو گیا نواب صاحب مرحوم نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر نیت توڑ کر آگے بڑھے تو امام صاحب آنکھیں بند کئے کھڑے سو رہے تھے۔ مجھے صرف یہ یاد ہے کہ میرا منہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر فرمایا کہ ''کتے نیند آ رہی ہے جا سو جا''۔

استاد وزیر خاں سے فارسی پڑھنا:

میں چھتاری میں رہتا تھا اور خوش قسمتی سے منشی وزیر خاں مرحوم ایک ایسے شفیق استاد مل گئے تھے جس کی مثال اس زمانہ میں تو ملنا مشکل ہے۔ وہ مجھے فارسی پڑھاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا کمال یہ تھا کہ لذت طالب علمی حاصل ہو جاتی تھی۔ مجھے انھوں نے فارسی پڑھائی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی سلسلہ کتب فارسی پڑھائیں اور فارسی کی دوسری کتابیں بھی۔ ان کی تعلیم کی خوبی یہ تھی کہ مجھے پرانی فارسی پر ایسا اچھا عبور ہو گیا کہ جامی، نظامی، فردوسی کے کلام کو بلا دقت پڑھ لیتا اور معانی و مطالب سمجھ لیتا تھا۔

یہاں مجھے ایک فرمودہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا یاد آ گیا۔ خاں صاحب امیر شاہ خاں مرحوم ایک صاحب تھے ان کے پھوپھا نواب ولی داد خاں کے ہاں ملازم تھے۔ نواب ولی داد خاں مالا گڑھ ضلع بلند شہر کے نواب تھے اور دہلی کے خاندان شاہی میں ان کی رشتہ داری تھی۔ جب غدر کے بعد دہلی ''اجاڑ دیار'' بن گیا اور نواب ولی داد خاں کو بھی اپنی جان بچانے کے واسطے روپوش ہونا پڑا تو میرے دادا نے ان کے اعزہ اقربا کی مدد کی اور یہ بزرگ چھتاری آ کر رہے۔ خاں صاحب! میر شاہ خاں صاحب فرماتے تھے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ ''طالب علمی لذتیست اگر حاصل شود خواند نہ خواندہ برابر است و اگر حاصل نہ شود خواندہ و نہ خواندہ برابر''۔ منشی وزیر خاں کی تعلیم میں لذت طالب علمی حاصل ہو جاتی تھی۔

کلام پاک تو پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ مگر میرے استاد حافظ حمید اللہ خاں مرحوم کا اسی زمانہ میں انتقال ہو گیا۔ میری عمر اس وقت دس گیارہ سال کی ہو گی۔ مجھے اب تک شرمندگی کے ساتھ یہ یاد ہے کہ ان کے انتقال کی خبر سے مجھے کتنی مسرت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مارتے بہت تھے۔ ایک چمڑے کا تسمہ گز یوں گز لمبا ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور میں قرآن حفظ سناتا تھا وہ پشت کی طرف ٹہلتے رہتے اور جہاں متشابہ لگا اگر مہربانی ہوئی تو ''ہونہہ'' کی آواز کان میں آئی اور میں نے سمجھ لیا کہ عبارت غلط ہے اور صحیح پڑھنا شروع کیا۔ لیکن اگر ناخوشی ہوئی تو سڑاک سے چمڑا کمر پر پڑا اور میں بلبلا اٹھا۔ بہر حال یہ تو گذر گیا۔ اب تو میں مرحوم کا شکر گزار ہوں کہ کلام پاک مجھے اب تک یاد ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ۱۸۹۸ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کوئی محراب ناغہ نہیں ہوئی۔ گو مجھے قرآن پاک اتنا اچھا یاد نہیں جیسا ہونا چاہیے لیکن میں تو اس کو کلام پاک کا اعجاز خیال کرتا ہوں کہ اس نے اپنے ایک غلام کو باوجود اس کی نا اہلی کے نہیں چھوڑا۔

عربی اور انگریزی تعلیم کا آغاز:

اس دوران میں کچھ عربی اور انگریزی شروع کی گئی۔ عربی تو اپنے ہی مدرسہ میں شروع کی اور میزان و منشعب کی گردانوں تک چلی پھر ختم ہو گئی۔ انگریزی کے اکثر استاد رکھے گئے جن میں مولوی انعام الحق مرحوم حکومت ہند کے پولٹیکل صیغہ میں ڈپٹی سکریٹری ہوئے اور خدا سلامت رکھے سلام الدین صاحب ریاست بھوپال میں وزیر عدالت ہیں لیکن میری تعلیم خیر کے ساتھ یوں ہی سی ہوئی۔ پڑھنے کا شوق مجھے کبھی نہ تھا اور کوشش اس کی ہوتی تھی کہ استادوں کو بھی کھیل میں لگا لیا جائے اور اس کوشش میں اکثر میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ سوائے منشی وزیر خاں مرحوم کے کہ وہ پڑھانے پر اتنے مصر رہے کہ کچھ نہ کچھ فارسی زبردستی آ گئی۔ لوگ اکثر کہتے ہیں کہ مکتب کی تعلیم جیسی ٹھوس ہوتی تھی اور لڑکے کے کردار پر جو اثر مکتبی تعلیم کا ہوتا ہے وہ اب اسکول کالجوں میں نہیں ہوتا لیکن جتنا وقت کہ مکتبی استادوں کو اپنے شاگردوں پر توجہ کرنے کا ملتا تھا اور جو تعلق قلبی انھیں اپنے شاگردوں سے ہوتا تھا وہ بھی تو اب مفقود ہو گیا ہے۔ منشی وزیر خاں

کو میرے ساتھ ایسا تعلق تھا کہ اگر میں ذرا بھی بیمار ہوتا تو وہ بے حد پریشان ہو جاتے۔ انتہا یہ ہے کہ جب میری منسوبہ کے انتقال کے میرے چچا نے اپنی دوسری بیٹی سے میری نسبت کرنی چاہی کہ جو عمر میں مجھ سے نو برس چھوٹی تھیں تو منشی جی نے اسے سن کر کہا کہ ہمارا لڑکا اتنا انتظار نہیں کر سکتا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسی وجہ سے ان کی علیحدگی عمل میں آئی۔

میرے ایک اتالیق ملا محبوب خاں تھے۔ بڑے ہمدرد اور نہایت سیدھے آدمی ہزاروں دعائیں انھیں از بر یاد تھیں۔ مثلاً وضو کی دعا، نہانے کی دعا، حتیٰ کہ بیت الخلاء جاتے وقت بھی دعا پڑھتے تھے۔ مجھے سب دعائیں یاد کرائیں مگر عملاً ہوتا یہ تھا کہ مثلاً میں غسل خانے گیا اور وہ دروازے پر کھڑے ہوئے بالجہر اللھم اعوذبک من الخبث والخبائث و من الشیطان الرجیم۔ پڑھ رہے ہیں۔

مجھے شکار کا بہت شوق تھا۔ گھوڑے پر بھی لد لیتا تھا۔ میں کبھی گھوڑے کا اچھا سوار نہ بن سکا۔ بندوق بھی چلانے لگا تھا مگر یہ مشق کبوتر اور فاختاؤں تک محدود تھی۔ اڑتے اور بھاگتے جانوروں کو مارنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔

علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخلہ:

آخر کار "کورٹ آف وارڈس" نے یہ طے کیا کہ مجھے علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ میرے چچا نواب بہادر مرحوم کی خصوصیت کے ساتھ اس کا صدمہ تھا۔ لیکن میرے دوسرے چچا نواب یوسف علی خاں مرحوم اس کی موافقت میں تھے۔ نواب یوسف علی خاں مرحوم اپنے بھائیوں میں نہایت دور اندیش اور ذہین تھے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ انگریزی تعلیم ضروری ہے۔

چھتاری کے اکثر لوگوں کو اس کا صدمہ ہوا مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم مغفور تو آب دیدہ ہوئے یہ بڑے قابل اور اچھے خطیب تھے۔ ان کے صاحبزادے ہنوز ریاست میں طبیب ہیں۔ چھوٹے بڑوں میں عزت ومحبت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میر اشفاق علی مرحوم کو بھی بہت افسوس ہوا۔ اس زمانہ میں میری چھتاری کی زندگی کچھ اچھی نہ تھی۔ تمام وقت باز، جرے، بہری اور شاہین کے بنانے اور ان کی ادویات

تیار کرنے میں صرف ہوتا۔ اکثر بیکار اور لفنگے لڑکے صحبت میں رہتے۔ تاش اور چوسر سے بھی شوق تھا۔ بٹیر بازی میں بھی کافی دست رس ہوگئی تھی۔ دو تین مرغ بھی پلے ہوئے تھے اور اس سب پر طرہ یہ تھا کہ ہماری ہر حرکت پر تحسین و آفریں ہوتی تھی۔ اس فضا میں میرا نہ رہنا ہی اچھا تھا۔ صرف اتنا غنیمت تھا کہ مجھے شکار اور بھاگ دوڑ کا بہت شوق تھا۔ موٹاپا اس قدر تھا کہ عرض مربع برابر چچا نے میرے لیے ایک گائے مخصوص کردی تھی جس کا دودھ شام کو پیتا تھا۔ میں جنوری ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ آیا۔ پرشین وارڈ نامی ایک پھونس کا بنگلہ تھا وہاں قیام ہوا کھانے کا انتظام ہمارا اپنا تھا۔ مولوی فصیح الدین مرحوم بطور اتالیق ساتھ رہتے اور حافظ عبدالرزاق مرحوم قرآن سنتے تھے۔ حافظ جی تو کچھ روز بعد چھتاری واپس ہوگئے اس لیے کہ قرآن سنانے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ لیکن مولوی فصیح الدین عرصہ تک رہے۔ مولوی صاحب نہایت مہذب، ذہین اور علم مجلس سے واقف تھے اور نہایت درجہ خوش نویس تھے۔ اس کے بعد میں میکڈانل بورڈنگ ہاؤس میں چلا گیا۔ اس کے بعد انگلش ہاؤس میں داخل ہوا اور پویلین میں رہنے لگا۔ انگلش ہاؤس اس زمانہ میں سرسید مرحوم کی کوٹھی میں تھا۔ کھانے پینے کا انتظام ہر جگہ میرا اپنا ہی رہتا اور بورڈنگ کے مقررہ کھانے سے اکتا کر اکثر بے تکلف دوست میرے ہی یہاں آجاتے تھے اور ساتھ کھانے کا جو لطف مجھے اس وقت نصیب ہوا وہ مجھ میں ہمیشہ کے لیے راسخ ہوگیا اور میرا تجربہ یہ ہے کہ بہت سے پیچیدہ معاملے اکثر ساتھ کھانے اور اٹھنے بیٹھنے سے سہولت سے طے پا جاتے ہیں۔

میرے زمانہ کا علی گڑھ:

استادوں میں اس زمانہ کے خاص لوگ علاوہ مسٹر ریس ہیڈ ماسٹر کے، میر ولایت حسین، ماسٹر نورالحسن، ماسٹر قیام الدین وغیرہ تھے۔ جب میں شروع شروع وارد ہوا تو میرا لباس وہی پرانی روش کا مثلاً سلما ستارہ کی کامدار ٹوپی۔ اچکن پرانی کاٹ کی (حیدرآبادی شیروانی سے مختلف) اس پر ریشمی یا مخمل کا پاجامہ پائینچہ میں بٹن لگے ہوئے۔ اس لباس پر نہایت موٹا جسم گویا فٹ بال لڑھکتی جا رہی ہے۔ چنانچہ لڑکوں کے دربار سے "گوٹے کی گڑیا" کا خطاب عطا ہوا۔ مجھے اس خطاب سے ناگواری ضرور ہوئی لیکن لڑکوں کی یہ بے

ساختہ پھبتی اپنی جگہ پر ٹھیک تھی کہیں ہوتا "گوٹے کی گڑیا" کی آواز سنائی دیتی۔ یہ حالت تین چار ماہ رہی پھر ہم بھی پرانے ہوگئے۔ لباس کا طرز بھی بدل گیا اور جو نئے لڑکے آئے انھیں پریشان کرنے میں ہم نے خود حصہ لینا شروع کیا۔ میں انگلش ہاؤس میں ایک صبح بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اتالیق مولوی فصیح الدین پلنگ پر بیٹھے کلام پاک پڑھ رہے تھے کہ یکا یک انھیں ایک دورہ ہوا۔ اس کے بعد سے مرگی کے دورے ہونے لگے اس لیے مولوی عثمان صاحب اسرائیلی ساکن علی گڑھ کو میرا اتالیق مقرر کیا گیا۔ یہ بہت نیک اور عالم شخص تھے مگر ان میں مولوی فصیح الدین صاحب کی ذہانت نہ تھی۔

زمانہ طالب علمی کے ساتھی:

اس زمانہ کے ساتھیوں اور دوستوں میں چند کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔

سر راس مسعود، یہ جماعت میں تو مجھ سے اونچے تھے مگر انگلش ہاؤس میں ہی ان کا زنانہ مکان بھی تھا اس لیے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ یہ بالعموم سلیپر پہنتے نہایت ہی موٹی آواز میں یہ گاتے ہوئے پویلین (جہاں میں رہتا تھا) کے پاس سے گذرتے تھے ع

"مطرب خوشنوا بگو، تازہ بتازہ نو بنو"

بچپن میں تو کچھ غیر معمولی ذہانت کا پتہ نہ چلتا تھا مگر جب بڑے ہوئے تو خوب ترقی کی۔ کے. ٹی (سر) ہوئے اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی۔

میرے ہم جماعت اور بورڈنگ فیلو سر سکندر حیات مرحوم بھی تھے۔ انھیں کھیلوں کا شوق بالکل نہ تھا اکثر کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ ذہین تھے اور انگریزی اچھی تھی۔ مرحوم نے بڑی ترقی کی اور دوبارہ پنجاب میں گورنری کا کام بھی کیا میرے ان کے تعلقات میں عمر بھر کوئی کدورت نہ آئی اور جس روز صبح حیدرآباد میں ان کے انتقال کی خبر سنی تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ گویا میرا بھائی مرگیا۔ بے اختیار آنسو نکل آئے۔ سر ناظم الدین بھی انگلش ہاؤس میں رہتے تھے اور میرے ہم جماعت تھے۔ خدا انھیں خوش رکھے بڑے شریف اور مخلص انسان ہیں۔ بنگال میں انھوں نے بڑی ترقی کی، کونسلر اور وزیر ہوئے اور آج کل مشرقی بنگال کے وزیر اعظم ہیں۔

اس وقت قلب کی عجیب حالت ہے۔ بیسیوں دوستوں کی تصاویر سامنے آرہی ہیں کچھ تو ان میں سے ہمیشہ کے واسطے بچھڑ گئے۔ کچھ ابھی زندہ ہیں مثلاً مصطفیٰ خاں خورجوی، مسعود الحسن ڈپٹی کلکٹر، واجد حسین ڈپٹی کلکٹر، صاحبزادہ ساجد علی خاں مرحوم، عبدالرشید خاں مرحوم پٹیالہ، عبدالواحد پٹیالہ، مسعود الزماں باندہ، میر محمود علی میسور، محمد جان خاں دادوں کے رئیس ہیں، نہایت خداترس اور صاحب نسبت بزرگ ہیں۔ میرے اوپر اب بھی خاص کرم فرماتے ہیں۔ خدا اول الذکر حضرات کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، اور جو زندہ ہیں انھیں خوش وخرم اور باعزت رکھے آمین۔

میری تعلیمی حالت:

میری تعلیمی حالت یہ تھی انگریزی میں سو میں پینتالیس اور پچاس سے زیادہ نمبر کبھی نہ ملے۔ حساب کے معاملہ میں بالکل صفر یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین کی ضد جتنی انھیں ریاضی سے نسبت ہے اتنی ہی میرے یہاں اس کی نفی ہے۔ امتحان حساب کا کیوں کر پاس ہوتا تھا اس کا جواب دینا مشکل ہے، شاید میرے پرائیویٹ ٹیوٹر زیادہ آسانی سے بتاسکیں، مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ ایک بار جب امتحان کا زمانہ قریب آیا تو روزانہ کی مشق میں، میں نے دیکھا کہ دو سوال ایسے ہیں کہ جو میرے پرائیویٹ ٹیوٹر تیسرے چوتھے دن مجھے نکالنے کو دیتے ہیں۔ جب امتحان کا روز آیا تو دیکھا کہ پرچہ میں دونوں سوال دھرے ہوئے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ کچھ یوں ہی سٹر پڑا آتا تھا۔ البتہ اُردو اور فارسی میں مجھے کلاس میں بہتر سمجھا جاتا تھا اور بارہا فارسی اور اُردو کے گھنٹہ میں میں نے کلاس کو خود پڑھایا ہے آٹھویں کلاس کے ساتھ امتحان میں واجد علی شیدا صاحب ممتحن تھے اور مجھے ۴۹/۵۰ نمبر دیئے اور میری کاپی اپنے پاس دوسرے لڑکوں کو دکھانے کے واسطے رکھ لی۔ میں کلاس میں فرسٹ کبھی نہیں آیا اور ایک بار ڈبل پرموموشن بھی ہوا۔ یعنی ششماہی امتحان ہی میں چھٹی جماعت سے ساتویں میں ترقی مل گئی اور سالانہ امتحان میں ساتویں بھی پاس کرلی۔ لیکن پہلے پانچ لڑکوں میں ہمیشہ آجاتا تھا۔

بچپن کی شرارتیں:

مجھے شرارت سوجھتی تو تھی مگر عملی حصہ لینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میں نے کبھی کسی شریک شرارت دوست کی شکایت نہیں کی، نہ ان کے خلاف گواہی دی۔ ہاں چھوٹی چھوٹی شرارتیں خود بھی کرتا تھا مثلاً کاغذ کی گولیاں بنا کر میں اور میرے دوست اپنی جیب میں رکھتے اور ایک تو دینیات کے مولوی صاحب کے گھنٹہ میں اور ایک اور ماسٹر صاحب جغرافیہ پڑھاتے تھے ان کے گھنٹہ میں برابر گولی باری ہوتی تھی۔ اگر استاد کا رُخ میری طرف ہے تو دوسرے دوست نے گولی چلائی ایک بار اس حسن خدمت کے صلے میں پچاس لائن لکھنے کا جرمانہ بھی ہوا۔ ایک یہ شرارت اکثر ہوا کرتی تھی کہ کرسی کی چاک پر الٹا ''اُلو'' لکھدیا اور جب ماسٹر صاحب نے کمر لگائی تو ''الو'' سیدھا ہو گیا۔ ایک بار میری کلاس کے چند لڑکوں نے کچھ چمگادڑیں بیٹھی ہوئی دیکھیں۔ تجویز یہ ٹھہری کہ انھیں پکڑ کر اس ڈیکس میں بند کر دیا جائے جس میں حاضری کا رجسٹر رہتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور دوسرے پریڈ میں جب ماسٹر صاحب استادی کی کرسی پر متمکن ہوئے اور حاضری لینے کے لیے رجسٹر نکالنا چاہا تو ایک چمگادڑ تڑپ کر ان کی گود میں جا بیٹھی۔ ماسٹر صاحب کے چہرے کے تغیرات جن میں ڈر، غصہ اور مسرت سب بیک وقت کارفرما تھے میری نظروں میں اب تک محفوظ ہیں۔

ایک اور واقعہ بھی بچپن کی شرارتوں میں قابل ذکر ہے۔ ہمارے ہاں ایک رائڈنگ اسکول ماسٹر تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے مصطفیٰ نامی میرے کلاس فیلو تھے۔ ایک روز انھیں یہ سوجھی کہ لنچ کے واسطے وقفہ ہوا تو چاقو سے کرسی کے بید کو جس پر بیٹھا جاتا ہے کچھ اس طرح کاٹا کہ بظاہر تو جڑا رہا مگر قریب کٹ چکا تھا۔ ان کی اس جدت طرازی کا علم لنچ سے آتے ہی ہمیں بھی ہو گیا۔ دو ایک اور لڑکوں کو بھی ہو گیا۔ اتنے میں ماسٹر صاحب تشریف لائے۔ ان کی عادت تھی کہ کتاب ڈیسک پر پٹخ کر زور سے کرسی پر بیٹھتے تھے۔ کرسی کا بید تو پہلے ہی مجروح تھا جوں ہی ماسٹر صاحب بیٹھے گلدستہ بن گئے۔ ہاتھ اور ٹانگیں باہر اور ماسٹر صاحب کرسی کے اندر، ادھر ماسٹر صاحب کا ادھر

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ صرف فرق یہ تھا کہ میرا ہنسی کے مارے اور ان کا غصہ سے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع ہوئی۔ مسٹر ریس بہت ہی اچھے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انھوں نے فوراً تحقیقات کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفیٰ پکڑے گئے اور ریس صاحب نے جسمانی سزا دی۔

زمانہ طالب علمی کے چند دلچسپ واقعات:

میرے ہی زمانہ میں پرنس آف ویلز کی حیثیت سے شہنشاہ جارج پنجم تشریف لائے، مجھے وہ نظارہ اب تک یاد ہے وہ انگلش ہاؤس آئے، سب لڑکے انتظار میں کھڑے تھے کہ مجھے یکا یک چکر آیا اور دھڑ سے گرا۔ خبر یہ ہوئی کہ پرنس اس وقت تک نہ آئے تھے خدا جانے یہ کیوں ہوا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بالکل تندرست ہو گیا اور جب پرنس آئے تو ان کے خیر مقدم میں شریک ہوا۔ اسی موقع پر شہزادہ کی تفریح کے واسطے فٹ بال اور ہاکی کی فیلڈ میں کچھ کھیل کئے گئے تھے وہاں میں بھی موجود تھا اور سر جیمس لاٹوش لفٹننٹ گورنر تھے اور میرے چچا نے مجھے لے کر اُن کے سامنے پیش کیا ان کی شکل اس وقت تک مجھے یاد ہے بڑے نیک اور رحمدل انسان معلوم ہوتے تھے۔ ہز ہائی نس آغا خاں بھی اسی زمانہ میں تشریف فرما ہوئے یہ اس وقت بالکل نوعمر تھے۔ شاید تیس بتیس کی عمر ہوگی۔ بہت خوبصورت جوان تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو بڑی دلکش اور جاذب تھی میں نے اسے بہت محسوس کیا۔ اسی موقع پر مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم نے ہز ہائی نس کو مخاطب کر کے برمحل یہ شعر پڑھا تھا جس کو سب نے بے حد پسند کیا اور ہز ہائی نس بھی بہت مسرور ہو گئے اور برسوں زبان زد عام رہا۔

آفاقہا گردیدم، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

کالج میں شاہ افغانستان کی آمد اور میرا دینیات میں امتحان:

شاہ کابل امیر حبیب اللہ خاں مرحوم بھی اسی زمانہ میں آئے۔ اُن کی آمد کی بڑی دھوم دھام رہی۔ مجھے کل کی سی بات یاد ہے کہ نواب محسن الملک بہادر آئے اور

مجھے اور چند اور لڑکوں کو جنھیں مذہبی ذوق تھا پکڑ کر آسمان منزل میں لے گئے۔ معلوم یہ ہوا کہ امیر چند لڑکوں سے مل کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انھیں اسلامی عقائد اور مسائل پر کیسا عبور ہے۔ علی الدین صاحب نے جو ابھی ڈپٹی کلکٹری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ قرآن شریف پڑھ سنایا اور خوب پڑھا۔ امیر صاحب مرحوم بہت ہی متاثر معلوم ہوئے۔ پھر مسائل شرعیہ کے متعلق استفسار ہوا تو قرعۂ فال ہمارے نام نکلا اور بچپن کی ''مالابد'' کی پڑھائی کام آئی۔ انھوں نے دو سوال کیے جن میں سے فقط ایک یاد رہ گیا ہے لیکن اتفاق سے دونوں کے جواب بالکل صحیح دیئے۔ جو سوال یاد ہے وہ یہ تھا کہ اگر کوئی بے وضو ہو یا غسل کی ضرورت ہو اور وہ بلا ارادہ دریا میں گر جائے یا بغیر نیت پاکی غسل یا وضو کرے تو اس کا غسل یا وضو ہوا یا نہیں۔ جس کا جواب میں نے اثبات میں دیا کہ بلا نیت کے بھی غسل اور وضو ہو جائے گا تو امیر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اگر ایسے ہی بلا نیت تیمّم کرے تو کیا وہ پاک ہو جائے گا اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس واسطے کہ تیمّم میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس پر امیر صاحب نے فرمایا کہ یہ فرق کیوں ہے؟ یہاں منشی وزیر خاں کی مکتبی پڑھائی کام آئی اور میں نے جواب دیا کہ پانی طاہر بھی ہے اور مطہر بھی لیکن خاک طاہر ہے مطہر نہیں اسے حکماً ضرورتاً مطہر بنا دیا ہے اور اسی واسطے بلا نیت کے وہ پاک نہیں کر سکتی۔ امیر صاحب بہت خوش ہوئے اور باہر نکلنے کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے مجھے بہت داد دی اور کہا کہ تم نے ہماری لاج رکھ لی۔

میں نویں جماعت میں تھا کہ سلسلۂ تعلیم ختم ہو گیا۔ مجھے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی کہ چھتاری رہنا ہوگا۔ وہ زمانہ بھی کیا تھا جب نہ سوچنا بھی ایک تفریح تھی۔

شکار اور کھیل کا شوق:

بابو امرت لال جو اب آگرہ میں وکالت کرتے ہیں اور پھر سلام الدین صاحب میرے پرائیویٹ ٹیوٹر رہے مگر اس ڈھائی برس میں میں نے خاک بھی نہ پڑھا سلام الدین صاحب نے ایک کتاب (Character) شروع کرائی تھی ڈیڑھ

سال میں فقط ۲۵ صفحے پڑھے۔ مجھے تعلیم اور ریاست کے کام دونوں سے رغبت نہ تھی۔ وقت زیادہ تر شکار، گھوڑے کی سواری اور کرکٹ میں گذرتا تھا۔ ٹینس بھی کھیلتا تھا۔ کرکٹ خاصہ کھیل سکتا تھا۔ اور بولنگ بھی کرتا تھا۔ اکثر درمیانی رفتار سے گیند پھینکتا تھا۔ اور جب کبھی لیگ یا آف سے بریک کرتا تو آہستہ آہستہ گیند پھینکتا تھا۔

ایک بار ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال جو اس وقت علی گڑھ میں تعلیم پارہے تھے اپنی ٹیم لے کر تشریف لے آئے۔ ایک روز چھتاری میں قیام فرمایا۔ ہماری ٹیم بالکل اتفاق سے جیت گئی۔ ہماری ٹیم میں سوائے اسلام الدین صاحب اور راحت اللہ اور ماسٹر یوسف کے اور سب چھتاری ہی کے لوگ تھے۔ کام کرنے کی حالت یہ تھی کہ لالہ رام چندری لال اور پیش کار اور لالہ گنگا سہائے یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ کام کے لیے میرے پیچھے پڑتے اور میں جان چراتا تھا۔

انتظام ریاست

ایک طرح یہ زمانہ بہت سبق آموز تھا۔ اپنا گھر اور دوسرے کا انتظام محمد تقی صاحب منیجر نہایت ایماندار اور ہمدرد تھے لیکن ہزاروں امور ایسے تھے جن پر نہ انھیں عبور ہوسکتا تھا اور نہ وہ اس کا انتظام کر سکتے تھے۔ غیر منقولہ ریاست تو دادا صاحب مرحوم میرے نام ہی کر چکے تھے، اس میں تو کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ لیکن منقولہ کا حساب کتاب میں نے اپنے سامنے اپنی آنکھوں سے کچھ کا کچھ ہوتے دیکھا اس پر مجھے تعجب بھی ہوتا تھا اور ناگواری اور مایوسی بھی ہوتی تھی۔ مختلف جذبات کا تلاطم مجھے اب بھی یاد ہے لیکن میں نے کبھی اپنے آپ کو بے اختیار نہ ہونے دیا۔ معلوم نہیں کیوں اس خیال نے میرا کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔ کہ شور مچانا یا سزا دینا مجھے تسکین نہیں دے سکتا۔ مجھے تسکین اسی میں ملتی تھی کہ اسے بھی جھیل جاؤں مطلع صاف ہوکر رہے گا ایک عرصہ کے بعد جب ریاست کورٹ سے واگذاشت ہو چکی تھی اور میں اپنے شفیق ماموں کے انتقال کے بعد باغپت گیا تھا تو خاں صاحب امیر شاہ خاں نے مجھ سے کہا کہ "میں تمہیں اس زمانہ میں بڑی حیرت سے دیکھتا تھا اور یہ خیال کرتا تھا کہ یا تو یہ لڑکا انتہائی

عقلمند ہے اور یا بے حد بے وقوف ہے کہا سے ان چیزوں کا احساس نہیں۔"

اب میں چھتاری میں رہنے لگا۔ میری خوش نصیبی تھی کہ محمد تقی صاحب ریاست کے منیجر تھے۔ اس زمانہ میں میں نے کام سیکھا مگر بہت سطحی طور پر دراصل میرا دل جزئیات میں نہیں لگتا تھا۔ گاؤں کا کاغذ کبھی میری سمجھ میں نہ آیا۔

ریاست کا واگذاشت ہونا:

دسمبر ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ میری ریاست کو واگذاشت کر دیا جائے میں معہ بھائی جان (راؤ اصغر علی خاں صاحب جنھیں میں بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتا ہوں) سلام الدین صاحب اور پیر جی بلند شہر جا کر مقیم ہوئے کورٹ میں زیادہ تر ہمارے پرانے ملازم تھے اور جو نئے رکھ لیے گئے تھے میں نے ان کی اسی تنخواہ اور انہی شرائط پر رکھ لیا جو ان کی پہلے سے نہیں اور انہی لوگوں نے میری طرف سے ریاست کے کاروبار کا چارج لیا۔ ان میں لالہ گنگا سہائے، منشی محمود خاں اور مولوی غلام السبطین خاص طور پر میرے معتمد علیہ تھے میں نے اپنا یہ اصول واضح کر دیا تھا کہ کسی چیز پر جھگڑا نہ کیا جائے اور کورٹ کے محکمے کے لوگ جو کہیں اسے مان لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بلا کسی دقت کے چارج ہو گیا۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہ بات تھی (اور میں اب بھی اس کا قائل ہوں) کہ مین میخ نکالنے اور بے ضرورت کدو کاوش سے کام الجھتا زیادہ ہے سلجھتا کم ہے۔

میری طبیعت بڑی حساس ہے اور میں لوگوں کے اچھے یا بُرے سلوک سے بہت متاثر ہوتا ہوں۔ لیکن میں نے اس کا اظہار بہت کم ہونے دیا ہے ریاست کے چھوٹنے کی مجھے بڑی خوشی تھی لیکن میں نے اپنے جذبات کو غلبہ پانے نہ دیا۔

ریاست کی حالت اور میرے کام کا طریقہ:

جس وقت ریاست کا چارج مجھے دیا گیا تو خزانہ میں نقد فقط پانچ ہزار روپیہ تھا۔ اور مال گذاری ادا کرنی تھی۔ میں نے فوراً کارندوں کو بھیجا کہ جلد از جلد روپیہ وصول کر کے مال گذاری داخل کریں۔ یہ طرز میرا اب تک ہے کہ جب تک مال

گذاری ادا نہ ہو آمدنی میں سے کچھ صرف نہ کیا جائے اور یہ اصول ہر زمیندار کے لیے ضروری ہے۔ اکثر زمیندار مقروض اسی طرح ہوتے ہیں کہ وقت پر مال گذاری ادا نہیں کرتے۔ روپیہ خرچ ہو جاتا ہے اور جب کلکٹر مال گذاری کا تقاضا کرتا ہے تو قرض لینا پڑتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ میں نے چھتاری آتے ہی اس کا اعلان کر دیا کہ میرا جو حکم کسی کو پسند نہ آئے وہ چچا کے یہاں اپیل کر سکتا ہے، مجھے انتظام ریاست کا بار بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا اور اس کا بہت خیال رہتا تھا کہ اگر اس زمانہ میں کوئی آواز میرے خلاف اٹھی تو آئندہ میری۔ ساکھ نہ رہ سکے گی۔ میں دادا مرحوم کے زمانہ میں ملازمین کے مشورہ سے کام کرتا تھا۔ مولوی ممتاز علی صاحب، لالہ گنگا سہائے جمعدار عبدالقادر، لالہ مچندری لال، مولوی غلام السبطین ان لوگوں میں سے تھے جن کے مشورے پر میں عمل کرتا تھا۔ ان حضرات کی وجہ سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔

روزمرّہ کا پروگرام:

میرا پروگرام یہ رہتا تھا کہ صبح نماز سے فارغ ہو کر بیٹھ جاتا اور یہ حضرات آجاتے ساڑھے نو بجے تک زمینداری کے کام میں مصروف رہتا۔ اس کے بعد میرے ہم عمر لوگ آجاتے اور ہنسی مذاق ہوتا یا جو اس زمانہ کا خبط ہو مثلاً بٹیر بازی وغیرہ ہوتی رہتی۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب پھر وہ لوگ آجاتے جو صبح کی نشست میں ہوتے۔ چار پانچ بجے تک میرے پاس رہتے۔ اس کے بعد میں کھیلنے یا شکار چلا جاتا مغرب کے بعد وہی ہم عمر لوگوں کا مجمع ہوتا اور لہو ولعب میں وقت کٹتا۔

مرنجان مرنج طرزِ عمل:

مجھے اس کی ہمیشہ خواہش رہتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے جھگڑے سے بچا جائے میرا خیال تھا کہ بات ٹھیک ہے تو دوسروں کی سمجھ میں آ کر رہے گی جھگڑنے اور اوقات تلخ کرنے سے کیا حاصل۔ میرے اس طریقہ کو اکثر دیرینہ ملازمین پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس درجہ مرنجان مرنج ہونا ریاست کے واسطے مفید نہیں۔ لیکن میری طبیعت کی افتاد ہی یہ تھی کہ آج کسی کو سزا دی تو چند ماہ کے بعد پھر بلا لیا اور معاف

کردیا۔ اضافۂ لگان اور اس قسم کے دوسرے معاملات میں بھی میں نے کاشتکاروں سے یہی سلوک کیا۔ اس زمانہ میں کاشتکاروں کے ہفت سالہ پٹے ہوتے تھے میرے دل میں یہ کہ اضافہ کا کام میں خود کاشتکاروں کی مرضی سے کروں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس زمانہ میں میری حالت وہی تھی جو ایک اوسط درجہ کے زمیندار کی ہوتی ہے گھر کا کام کرنا، بیوی بچوں میں خود رہنا اور حکام کی خوشنودی حاصل کرنا اس زمانہ میں جو جائداد میرے دادا نے اپنی چھوٹی لڑکی کو دی تھی وہ ان کے ورثاء کے ہاتھ میں قرضہ کی وجہ سے تباہی کے قریب جا لگی تھی میں نے اکثر اس کا حصہ خریدا تاکہ میرے پھوپی زاد بھائیوں کو کچھ تو بچ جائے مجھے افسوس ہے کہ جتنا میں چاہتا تھا اتنا کسی طرح نہ بچ سکا۔ اگرچہ جائداد بہت ہی گراں خریدی گئی اور لاکھوں روپیہ قیمت میں ادا کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میرے پھوپی زاد بھائیوں کو مجھ پر بھروسہ ہوتا تو شاید اس سے زیادہ انھیں بچ جاتا۔ میرے چار پھوپی زاد بھائی تھے۔ ان کے گرد و پیش ایسے لوگ جمع ہو گئے جو ہر روز حساب لگا کر ایک نیا سبز باغ دکھا دیا کرتے تھے۔ یہ قصے تو روز کے تھے البتہ سود کا بار بڑھتا رہا۔ میں یا میرے ملازم جو کچھ کہتے اس کو وہ جانبداری یا خود غرضی خیال کرتے مجھے یقین ہے کہ اگر سب سے چھوٹے بھائی حاجی کنور باسط علی خاں کی خدا نے رہنمائی نہ کی ہوتی تو آج ان حضرات کو کچھ بھی نہ بچا ہوتا۔

حکام رسی

میرے ساتھ کے کھیلنے والوں میں راؤ اصغر علی خاں، فیاض خاں، جعفر خاں، لیاقت خاں ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ یہ ہر کھیل اور شکار میں میرے ساتھ رہتے تھے خدا ان سب کو خوش رکھے انہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اس زمانہ کے سیاسی حالات کچھ عجیب و غریب تھے حکام کا اقتدار اتنا زیادہ تھا کہ بقول اکبر اگر بیوی اور کلکٹر صاحب خوش ہوں تو دنیا میں عافیت کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ یوں تو یہ حالت تمام ہندوستان ہی میں تھی۔ مگر ہمارے ضلع بلند شہر کی حالت خصوصیت کے ساتھ نمایاں تھی۔ میرے معاصرین میں ایک اور نوعمر رئیس زادے تھے۔ مجھ سے عمر میں تیرہ یا چودہ برس بڑے انھیں حکام سے دوستی بڑھانے کا اتنا شوق تھا کہ میں اس زمانہ کو بلند

شہر میں ڈپٹی پرستی کا زمانہ کہتا ہوں۔ دعوتیں بہت بڑے پیمانے پر ہوتی تھیں جن میں رقص وسرود کا ہونا لازمی تھا۔ طبعاً مجھے یہ پسند نہ تھا۔ لیکن کھلم کھلا کچھ نہ کہتا تھا۔ میں ان دعوتوں میں شریک ہوتا، لیکن رقص وسرود کی محفل سے پہلے ہی اٹھ آتا تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں بڑا متقی اور پرہیز گار تھا۔ میں اپنی نوعمری اور نوجوانی کو ان تمام واہیات سے لبریز پاتا تھا جن سے دوسرے دو چار تھے۔ البتہ مجھے اپنے گھر کی بدنامی کا خیال رہتا تھا اور میرے دل میں یہ کھٹکا رگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو انگشت نمائی کا باعث ہوا اور دادا صاحب کی روایات کے خلاف مجھے بھی اپنے ہاں ایسی محفل رقص سرود ان حضرات کے واسطے کرنی پڑیں چنانچہ دعوتیں میں بھی کرتا تھا اور خاصے تکلفات ہوتے تھے لیکن کسی کو صاف صاف مجھ سے یہ فرمائش کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ ناچ رنگ کا انتظام کیا جائے اور اگر کبھی اشارتاً ایسا کہا بھی گیا تو میں نے اسے کسی نہ کسی طرح ٹال ہی دیا۔

اس زمانہ میں میرے ایک دوست پیر جی سید محبوب علی شاہ تھے جو میرے ہمدم و ہمراز تھے۔ ان کے والد صاحب سے اور میرے دادا صاحب سے بڑی ہی پرخلوص دوستی تھی۔ اور ان کی نواب یوسف علی خاں سے بہت دوستی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا جس کا مجھے بے حد صدمہ ہوا ایسے مخلص دوست دنیا میں ناپید ہیں۔

نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک ہماری دوستی رہی لیکن کبھی اس کا خیال تک نہ آیا کہ غیریت کسے کہتے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی پیر جی محبوب علی اب قادری باغ میں رہتے ہیں اور چھتاری کے ساتھ انھیں خاص تعلق ہے۔ میں بالکل نوعمر تھا اور انتہائی نہ تجربہ کار، بہت آسانی سے ہر ایک بات کا یقین کر لیتا تھا۔ ریاست ابھی کورٹ ہی تھی اور پیر جی کی یہ کوشش رہتی تھی کہ ہر موقع پر میں حکام ضلع کی نظر میں پیش پیش رہوں۔

کلکٹروں کی بے دماغی ورعونت:

اس زمانہ میں کلکٹروں کو ضلع کا خدا سمجھا جاتا تھا اور وہ روزانہ کے میل جول میں بھی معزز سے معزز ہندوستانی کو یہ ضرور یاد دلاتے رہتے تھے۔ کہ وہ ''کالا آدمی''

ہے جب دورہ کے سلسلے میں کلکٹر کہیں جاتا تو خیر مقدم کرنے وہاں کا زمیندار کم از کم ایک میل گاؤں سے آگے جاتا اور یہ تو میری یاد کا ذکر ہے کہ جب دورہ میں کلکٹر صاحب آتے تو ان کے جائے مقام پر میں اور میرے چچا پہلے سے موجود رہتے۔ اس زمانہ میں کلکٹر اپنے ہاں چائے یا کھانے پر ہندوستانی رئیس کو بہت ہی کم بلاتے تھے۔ اور یہ واقعات اتنے شاذ و نادر ہوتے تھے کہ جسے بلایا جاتا وہ بطور تفاخر کسی نہ کسی حیلہ سے اظہار کرتا تھا کہ اسے یاد فرمایا گیا ہے۔

روساء کا ایٹ ہوم:

ان حالات سے میں خود بھی متاثر تھا۔ گھوڑ دوڑ کے موقع پر روساء کا ''ایٹ ہوم'' ہوتا تھا جس میں ایک پہاسو اور ایک چھتاری کی طرف سے ضرور ہوتا تھا۔ روساء بڑی کوشش کر کے یہ ایٹ ہوم کلکٹر سے قبول کراتے اور اس پر بہت خوش ہوتے تھے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ تین خیمے الگ الگ ہوتے ایک میں انگریز اور اینگلو انڈین ہوتے، دوسرے میں مسلمان، تیسرے میں ہندو، میزبان اور ایسے لوگوں کے علاوہ جنھیں موروثی خطابات حاصل تھے انگریزی ڈیرے میں کوئی ہندوستانی نہ ہوتا تھا۔ میں جب میزبان نہ ہوتا تو خاموشی سے مسلمانوں کے ڈیرے میں جاتا تھا اور جب تک کہ خدائے ضلع یا میرے میزبان انگریزی خیمہ میں نہ لے جاتے نہیں جاتا تھا۔ لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ میں منتظر رہتا تھا کہ مجھے کب کوئی بلاتا ہے اور جب وہ ''وقت مسعود'' آتا تو بہت خوش ہو کر اس خیمہ میں جاتا۔ کمزوری میرے اندر موجود تھی مگر میں طبعاً خود بخود آگے بڑھنے کو پسند کرتا تھا۔ اور میری عادت اب بھی ہے۔ آگے چل کر ہندو مسلمانوں کا خیمہ ایک ہو گیا گو کھانے کی چیزیں مختلف ہوتی تھیں انگریزی خیمہ بلند شہر میں اس وقت تک قائم رہا جب تک ۱۹۲۰ء کی اصلاحات کے بعد ہندوستانی منسٹر ہونے لگے اور جب ممبران گورنمنٹ خود ہندوستانی ہونے لگے تو پھر اس تفریق کا قائم رکھنا آسان نہ تھا۔ اس زمانہ میں پیر جی صاحب کی یہ کوشش ہوتی تھی مجھے حکام کی نظر میں آگے بڑھایا جائے۔ گو مجھے بھی حکام سے کوئی نفرت نہ تھی اور برابر والوں میں معزز کہلانے کا شوق تھا مگر خواہ مخواہ آگے بڑھنے سے جھجک ہوتی تھی۔

کلکٹروں سے ملاقات کے آداب:

اگر میں کلکٹر سے ملنے جاتا تو پیر جی صاحب مجھ سے کہتے کہ دیکھو دیر تک بیٹھے رہنا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو فرمایا کہ اوروں پر اثر پڑے کہ آپ کے تعلقات کلکٹر صاحب سے خاص ہیں۔ اس زمانہ میں ملاقاتیوں کو خواہ کوئی ہو ٹاؤن ہال میں بٹھایا جاتا تھا۔ ٹاؤن ہال کا فاصلہ کلکٹر صاحب کو کوٹھی سے سے کم از کم ساٹھ گز ہوگا اور چپراسی کوٹھی کے برآمدے سے کپڑا ہلا کر ملاقاتی کو آواز دیتا اور یہ صاحب کو ندا کی آواز پر افتاں وخیزاں چل پڑتے تھے اس قسم کی اکثر باتیں تھیں۔ جس نے ہندوستانیوں کے دل میں کدورت پیدا کر دی۔ اس کے برعکس کوئی یورپین یا اینگلو انڈین آ گیا تو بے تکلف کوٹھی میں چلا جاتا اور ملاقات ہو جاتی تھی۔ یہ اور دوسری ایسی باتیں تھیں جن سے ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ حکمراں قوم اپنی برتری اور دیسی باشندوں کی کمتری کا شدت کے ساتھ لحاظ رکھتی ہے۔

انگریزی حکام کی تنگ نظری اور خود بینی:

اس کے علاوہ وہ تمام اچھی اور اونچی ملازمتیں بدیسیوں کے لیے مخصوص تھیں ولایت سے پاس ہو کر ہندوستانی آ جاتا تو وہ ابنائے جنس سے غیریت برتتا۔ اور ستم ظریفی یہ تھی کہ انگریز بہر حال ہندوستانی ہی سمجھتے تھے۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اسی طرح تجارت وغیرہ کے مواقع اہل ملک کے لیے کم تھے جس کا مجموعی نتیجہ سیاسی ایجی ٹیشن کی صورت میں نمودار ہوا۔ بایں ہمہ اس میں شک نہیں کہ انگریز حکام کو انتظامی درو بست کا بڑا اچھا ملکہ تھا، مدرسوں، شفاخانوں سڑکوں کی حالت یقیناً بہتر تھی اور اسی طرح ضلع کے دوسرے انتظامات بھی اس وقت سے بہت بہتر تھے۔ بعض افسران بڑے انسان اور ہمدرد بھی ہوتے تھے لیکن نسلی تفوق کا اظہار ان کی طرف سے بھی کم وبیش ہوتا رہتا تھا۔

کلکٹر کا ڈنر اور ایک افسوس ناک واقعہ:

کورٹ واگذاشت ہونے کے بعد میں نے ایک ڈنر دیا T.W. Morris کلکٹر تھے۔ اس زمانہ کا رنگ یہ تھا کہ ڈنر سے پہلے کلکٹر نے مہمانوں کی فہرست طلب کی اور تمام ڈپٹی کلکٹروں کے نام کاٹ دیئے میں نے خاص طور پر یہ چاہا کہ کم از کم محمد تقی صاحب کو جو میری ریاست کے منیجر رہ چکے تھے بلانے کی اجازت ہو جائے مگر کلکٹر صاحب کو یہ بھی گوارہ نہ ہوا محمد تقی صاحب کو بجا طور پر اس کی ناگواری ہوئی اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں تمام حقیقت محمد تقی صاحب سے بیان کردوں اس پر بھی انھیں یقین نہ آیا اور ان کو اس پر اصرار ہوا کہ میں اس کی تصدیق کراؤں۔ میں بہت گھبرایا کہ اگر رئیس ہونے کی شروعات اس طرح کی تصدیقوں سے ہوئی تو آئندہ کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ لوگوں میں یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ یہ لڑکا چالاک اور جھوٹا ہے۔ لہٰذا میں نے کہا کہ چلئے میں تصدیق کراتا ہوں۔ چنانچہ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر چلے پیر جی غریب سخت پریشان تھے۔ خیر ٹاؤن ہال میں جا کر حسب دستوار بیٹھے۔ میں نے تقی صاحب سے کہا کہ میرے ساتھ ملنے چلئے تو فرمایا نہیں پہلے میں مل آوں اس کے بعد تم ملنا۔ وہ ملے اور واپسی میں یہ فرمایا کہ تصدیق کرنا مناسب نہیں ہے مجھے تمہارے کہنے کا یقین ہے۔ میں نے اسے غنیمت سمجھا۔ مجھے پہلی بار اپنے اندر ایک طرح کی اخلاقی قوت محسوس ہوئی اور میں نے خیال کیا کہ سچائی میں خطرہ ضرور ہے لیکن اس خطرہ کو جھیل لینے کے بعد کسی اور خطرہ کا اندیشہ باقی نہیں رہ جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ محمد تقی صاحب اس مسئلہ کو کلکٹر صاحب کے سامنے پیش کرنے کی جرأت نہ کر سکے اور تصدیق کا سوال فقط میرے امتحان کے واسطے تھا۔

ہندوستانی روساء کی حکام پرستی:

میں نے اپنی زندگی ایک زمیندار کی طرح شروع کردی۔ گھر کا کام دیکھنا (اور بیوی تو ابھی گھر میں آئی نہ تھی) کلکٹر کی خوشنودی کا خیال رکھنا البتہ ازبس ضروری تھا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس زمانہ میں یوروپین حکام کا سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ حاکمانہ نہ ہوتا اور عزت نفس کا لحاظ رکھا جاتا تو وہ بدگمانی اور شوریدگی نہ پیدا ہوتی

جو آگے چل کر دائمی بدمزگی بن گئی۔ لیکن میں یہاں اس امر کا بھی اعتراف کروں گا کہ اس زمانہ میں اگر حکام کسی ہندوستانی سے مساوات کا برتاؤ کرتے تھے تو خود ہم میں رشک و رقابت پیدا ہو جاتی تھی۔ حکام سے اس شخص کی برائیاں کرتے اور اس کا شکوہ کرتے کہ اُسے کیوں اتنا ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ ضلع بلند شہر میں حکام پرستی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ نمائش کے موقع پر روساء میں سے ایک صاحب نے یہ تجویز کی کلکٹر صاحب کا جلوس نکالا جائے کلکٹر صاحب اور درباری روساء ہاتھیوں پر سوار ہو کر دربار میں جائیں۔ اس کی بہت سے روساء نے تائید کی اور یہ طے ہو گیا۔ گو طبعاً مجھے یہ گوارا نہ تھا لیکن اختلاف بے سود تھا اور خلافِ مصلحت بھی۔ اختلاف کے معنی یہ ہوتے کہ میں کلکٹر صاحب کی عزت افزائی کو پسند نہیں کرتا۔ بہر حال میں بھی شریک ہوا۔ اس پر بھی صبر کیا جاتا تو غنیمت تھا مگر انھیں صاحب نے یہ کمال کیا کہ بازار میں پہونچ کر کلکٹر صاحب پر روپیوں کی بارش کی۔ یہ حرکت مجھے نہایت درجہ شاق گذری۔ دوسرے سال میں نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ تمام عمائد اگر ہاتھیوں پر ساتھ ہوں گے تو جو لوگ کلکٹر کا دربار ہال کے دروازے پر خیر مقدم کرتے ہیں انھیں کمتری کا احساس ہوگا اگر ان کے ساتھ میں بھی ہوں گا تو یہ احساس نہ ہوگا۔ کلکٹر نے اسے بخوشی مان لیا اور میرا پیچھا چھوٹا۔ جب کورٹ واگذاشت ہوئی تو یورپین کلکٹر ضلع نے میرے بارے میں ایک چھوڑا جسے میں نے اپنے لیے ایسا طرۂ امتیاز سمجھا کہ وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

"The ward has received an education, which I think, will enable him to take his place as one of the leading Raeeses of the district".

"(زیر ولایت وارڈ) کی ایسی تعلیم و تربیت ہوئی ہے کہ اس کی بناء پر میرا خیال ہے کہ وہ ضلع کے چوٹی کے رئیسوں میں اپنی جگہ لے سکے گا"۔

آنریری مجسٹریٹ مقرر ہونا:

غالباً ۱۹۱۰ء میں مجھے تیسرے درجہ کا بلند شہر کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جب مجسٹریٹی کا اجلاس ہوتا تو مجھے ۴۵ میل موٹر سے جانا پڑتا تھا۔ مگر میں نے اسے خوشی سے قبول کر لیا۔ میرے ساتھی ٹھاکر راستی سنگھ رائے بہادر

تھے۔ یہ بہت ہی بھلے آدمی تھے۔ ہم دونوں درجہ سوم کی مجسٹریٹی کا کام کرتے تھے۔ اس زمانہ کے مجسٹریٹ ہتھیاروں سے مستثنیٰ ہوتے تھے اور اس کی مجھے خوشی ہوئی تھی۔

ٹھاکر راستی سنگھ کی شاعری:

میرے ساتھی ٹھاکر راستی سنگھ کے سیدھے اور بھولے بھالے ہونے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ مسٹر ہوپکنسن (Hopkinson) کمشنر بلند شہر، نمائش کے دربار میں آئے مجھے اور راستی سنگھ کو خیر مقدم کرنا تھا۔ میں نے تو چند الفاظ خیر مقدم کے کہے اور ''اے آمدنت باعث آبادی ما'' پر ختم کیا۔ رائے بہادر صاحب نے خود ایک چھوٹی سی نظم لکھی تھی اُسے پڑھ کر سنایا۔ میری اور نواب بہادر عبدالسمیع خاں کی ہنسی سے بری حالت تھی۔ مگر ضبط کے سوا چارہ کیا تھا وہ اشعار یہ تھے۔

ہر گھر میں ہمیشہ ہی پسر ہوتے ہیں پیدا
اور آسماں پہ شمس و قمر ہوتے ہیں پیدا
پر جسم میں جان آتی ہے مذکور سے جن کے
وہ ہیں ہوپکنسن نور کے پتلے

اس کو پڑھنے کے بعد رائے بہادر صاحب داد طلب انداز سے میرے پاس آئے اور میری داد پر فرمانے لگے کہ اخیر کے مصرعے میں چاہے ''مسٹر'' کا لفظ بڑھا دیجئے۔ یا نہ بڑھایئے، میں نے کہا کہ جی اور کیا؟

ایک ناخوشگوار مقدمہ:

مورس صاحب کے جانے کے بعد ہمفریز صاحب کلکٹر ہو کر تشریف لائے۔ ان میں سوجھ بوجھ کی کمی تھی شاید کمشنر بھی نہ ہو سکے اور پنشن پر چلے گئے۔ بڑی جلدی غضبناک ہو جاتے اور غور و فکر سے کام نہ لیتے تھے۔ ان کے زمانہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے مہینوں پریشان رکھا اور مجھے اس وقت کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید میرا مستقبل ہمیشہ کے واسطے تباہ ہو جائے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک روز دوپہر کے کھانے کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا کہ منشی وزیر خاں مرحوم آئے۔ میں نے حسب عادت کہا کہ ''خیریت''، منشی جی نے کہا کہ ''خیریت کہاں، تھانہ دار بغرض تلاشی موضع

برکات پور میں گیا تھا اور خاکروبوں کے مکان کی تلاشی لی. وہاں کچھ مال مسروقہ برآمد ہوا خاکروبوں نے تھانہ دار کو مارا اور بندوق اور مال چھین لیا۔" میں نے کہا کہ جوڑی میں بٹھا کر تھانہ دار کو اوّل ڈپٹی صاحب کے پاس روانہ کر دیجیے جو بہ بسلسلۂ دورہ چھتاری ہی میں مقیم تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد خاکروب اور اس کی بیوی آئی معہ ایک مردہ بچہ کے کہ تھانیدار کے ہاتھ سے بچہ مر گیا۔ میں نے اُسے بھی ڈپٹی صاحب کے ہاں بھجوا دیا۔ شام کو ٹینس کے لیے میں ڈپٹی صاحب کے ہاں گیا۔ وہ ہمارے ہی مہمان خانہ (باغ کوٹھی) میں مقیم تھے۔ اس واقعہ کے سلسلے میں میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ موقع پر چلنا چاہیں تو میں بھی ساتھ چلوں۔ لیکن ان کی رائے یہ ہوئی کہ ہمیں اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں میں خاموش ہو گیا۔ مقدمہ کی تفتیش ہوئی اور چالان ہو گیا۔ پولیس کا استدلال تھا کہ سرکار میں مزاحمت کی گئی اور خاکروب نے اپنا بچہ خود مار ڈالا۔ ملزمین کی جواب دہی یہ تھا کہ چوں کہ اتفاق سے تھانیدار کے ہاتھ سے بچہ مر گیا اس لیے حالت اشتعال میں ایسا واقعہ ہوا۔ ہم نے پولیس کا ساتھ دیا اور کلکٹر کی عدالت میں مقدمہ پہنچا وہاں جا کر یہ گل کھلا کہ کلکٹر صاحب کے استفسار پر تھانیدار نے یہ کہا کہ ریاست چھتاری کے ایما سے ایسا ہوا۔ کلکٹر صاحب نے بغیر کسی پس و پیش کے سیشن کو مقدمہ بھیجتے ہوئے یہ فیصلہ میں لکھ دیا کہ انھیں بھی ایسا ہی شبہ ہے۔ مجھے اس سے بہت پریشانی ہوئی اور رنج اس کا تھا کہ واقعہ بالکل بے بنیاد تھا۔ پھر یہ اندیشہ کہ گورنمنٹ کی نظر میں میری وقعت اور اعتبار ختم ہو جائے گا۔ بہر حال مقدمہ کی پیروی شروع کی گئی اور جج صاحب کے ہاں سے نہ صرف ملزمان بری ہوئے بلکہ تھانیدار پر مقدمہ چلانے کی تجویز ہوئی اور تھانیدار کو ہائی کورٹ سے چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس مصیبت سے نجات ملی۔

تھانیدار پر جب مقدمہ چلا تو شہادت میں مجھے بھی مظفر نگر جانا پڑا سر راس آسٹن گورنمنٹ کی طرف سے تھانیدار کے خلاف پیروی کر رہے تھے۔ میری وحشت اور پریشانی کا یہ عالم تھا کہ گویا خود میں ہی مقدمہ میں ماخوذ ہوں۔ مگر میری شہادت سر ر کی رائے میں بہت اچھی ہوئی اور میری کامل صفائی ہو گئی۔ سر جون ہیوٹ اس زمانہ میں لفٹنٹ گورنر تھے اور ہمفریز صاحب نے مجھ سے خود کہا کہ گورنر نے انھیں بہت سخت سست کہا۔

آج کچھ پرانے روزنامچہ نظر سے گذرے جو انھیں سنین کے متعلق ہیں ان سے مدد لیتا ہوں۔ بعض چیزوں کی تکرار ضرور ہوگی لیکن بجائے حافظے پر بھروسہ کرنے کے یہ زیادہ قابلِ اعتبار ہیں۔

محرم کا انتظام کالج کی ٹرسٹی شپ:

جنوری ۱۹۱۱ء کلکٹر علی گڑھ نے مجھے لکھا کہ محرم کے انتظامات میں آیندہ میں اپنے چچا کی مدد کروں چنانچہ میں اپنے چچا کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اس زمانہ میں نواب وقار الملک مدرسۃ العلوم (ایم۔اے۔او کالج) کے سکریٹری تھے اور مجھ پر بہت ہی کرم فرماتے تھے۔ میرے روزنامچہ میں اکثر ان سے ملاقات کا ذکر ہے۔ اُن کی کوششوں سے میں ٹرسٹی منتخب ہوا۔ اس زمانہ میں محرم کی بعض تاریخوں میں مدار دروازہ کی پولیس کی چوکی پر میرے چچا اور علی گڑھ کے کلکٹر اور میں جایا کرتے تھے اور ہاتھیوں پر سوار ہوکر جلوس دیکھا کرتے تھے۔ ان دنوں مسٹر میرس یہاں کلکٹر تھے جو آیندہ چل کر اس صوبہ کے گورنر ہوئے۔ مجھ پر بہت عنایت کرتے تھے۔ ۱۹رجنوری میں لکھا ہے ''میرے چہرے پر کریکٹ کی گیند لگی جس سے داہنا گال پھٹ گیا اور ناک سے بہت خون جاری ہوگیا۔'' اس کے بعد چچا صاحب نے کبھی کریکٹ نہ کھیلنے دیا اور میں نے ٹینس شروع کی۔ ۳۱رجنوری میں لکھا ہے ''میں کالج کا ٹرسٹی منتخب ہوگیا۔ اور یونیورسٹی فنڈ میں پانچ ہزار چندہ کا دیا'' ۔ مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی۔ ۶رفروری کی نمائش علی گڑھ میں آگ لگی اور غضب کی آگ لگی۔ میں موٹر لے کر کوٹھی چندنیا پر آیا۔ اور اپنے چچا کو ساتھ لے گیا۔ مسٹر میرس بھی آگئے تھے۔ ہم دو بجے تک آگ بجھاتے رہے۔

مجھے یاد ہے راؤ بہادر رگھوراج سنگھ برہنہ تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے آگ بجھانے کی کوشش کررہے تھے۔ بلند شہر میں اس زمانہ میں جگدیش پرشاد جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ ان کی ٹیم سے ایک کریکٹ میچ ہوا اور ہم لوگ ہارے۔ میری دوستی ان سے اُسی زمانہ میں ہوئی جو اب تک قائم ہے۔ وہ اکثر اس میچ کا ذکر میرے چھیڑنے کو کیا کرتے ہیں۔ یہ زمانہ بلند شہر میں حکام پرستی کا تھا۔ میرے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ ۷ارمارچ ۱۹۱۱ء کو مورس گئے۔ ہمفریز کلکٹر ہوکر آئے، تو ہم نے گوٹے کے پھول جانے والے کلکٹر پر بکھیرے۔

راجپوتوں کی انجمن:

کرنل عبدالمجید خاں سی آئی ای پٹیالہ میں وزیر خارجہ تھے اور میرے مشورہ سے انھوں نے راجپوت انجمن کا جلسہ ہماری کوٹھی پر کیا۔ (یہ انجمن انہی کے ساتھ ختم ہوگئی) ۱۴ر اپریل میں لکھا ہے "پہلا جلسہ انجمن کا ہوا۔ ہم نے اس کا پریسیڈنٹ اکرام علی خاں کو اس وجہ سے کیا تھا کہ ان سے کچھ روپیہ وصول ہو۔ مگر انھوں نے صرف ۱۲۰ دیئے ۱۵ر اپریل "میں نے جلسہ کی صدارت کی اور میرے خطبے کے وقت مسٹر میرس، نواب وقار الملک نواب مزمل اللہ خاں اور راجہ صاحب محمود آباد موجود تھے۔ میں نے تین ہزار کا چندہ دیا۔"

اسپیشل مجسٹریٹ مقرر ہونا:

۲۹ر مئی میں لکھا ہے "میں اسپیشل مجسٹریٹ ہوگیا" مجھے یاد ہے کہ میں اس سے بہت خوش ہوا ۱۹۱۱ء کی جو میں شہنشاہ جارج پنجم کی تخت نشینی کے سلسلے میں جلسے اور روشنی وغیرہ ہوئی۔ سر جون ہیوٹ جو مستقبل لفٹنٹ گورنر تھے۔ دہلی دربار کے انتظام کی غرض سے بھیجے گئے اور مسٹر پورٹران کی جگہ کام کر رہے تھے۔ یہ میاں بیوی مجھ پر بہت عنایت کرتے تھے مجھ میں اور اکرام علی خاں مرحوم میں ایک قسم کا تقابل رہتا تھا۔ چنانچہ پیر جی صاحب مرحوم نے نینی تال کی مسجد میں ایک جلسہ بادشاہ کی دعا کے سلسلے میں کرایا جو میری صدارت میں ہوا۔ روزنامچہ میں لکھا ہے۔ ۲۲ر جون "آج ایک جلسہ بادشاہ کی دعا کے سلسلے میں مسجد میں ہوا۔ میں نے وفاداری کی تقریر کی جس کا بہت اچھا اثر پڑا"۔ اکرام علی خاں نے بھی ایک چھوٹی سی تقریر پڑھی" خط کشیدہ الفاظ سے میرے محسوسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسٹر میرس سے میرے تعلقات بہت ہو گئے تھے جس کا علم مجھے نہ تھا۔ اور اس کا علم بھی مجھے ایک روز ۱۹۲۵ء میں ان کے بیان سے ہوا۔ لیکن میں اُن سے بے تکلف ضرور تھا کہ روزنامچہ میں لکھا ہے۔ ۲۷ر جولائی کو میں نے اُن سے کہا کہ میرے چچا کو کوئی خطاب دیا جائے۔ جس تھانے دار اور خاکروب کی لڑکی کے مرنے کا ذکر میں نے لکھا ہے اس کی تاریخ ۱۱ر اگست میرے روزنامچہ میں

درج ہے۔ روزنامچہ کو پڑھنے سے بالکل یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ایک خواب دیکھ رہا ہوں نوجوانی کی ایک کمزوری کا میں بھی شکار تھا۔ ۲۲ر دسمبر کی تاریخ میں میں نے کسی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے میرے ساتھ عشق معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ اور بھی میں نے لکھا ہے کہ ایک یورپین خاتون مجھ پر خاص عنایت کرتی ہیں۔ یہ کمزوری اکثر مردوں اور عورتوں میں ہوتی ہے اور جیسا کہ ہر کمزوری کا خاصہ ہے وہ وقت کے اکثر بعد ہی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے حسن، اپنی عقل اور اپنی بڑائی کے فریب میں کون نہیں مبتلا ہوا۔ پھر جوانی میں جب ہم اکثر یہ محسوس کرتے ہیں (اور کبھی کبھی اس کا یقین بھی کرتے ہیں) کہ جوانی ہی وہ عہد ہے جب ہم غلطی نہیں کر سکتے۔ یلدرم مرحوم کا یہ شعر اکثر یاد آتا ہے۔

وہ جنون انگیزیاں رخصت ہوئیں
عقل سے وہ شرمساری اب کہاں!

موجود شہریار دکن کا اولین شرف دید:

۱۳ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو میں دہلی دربار میں شریک ہوا۔ اول گورنر جنرل آئے پھر بادشاہ۔ اور بادشاہ بیگم چوکڑی میں آئے۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی کے لال قلعہ میں گارڈن پارٹی تھی۔ میں نے کس ارمان اور ولولہ سے بادشاہ اور بادشاہ بیگم کو دیکھا تھا! موجودہ شہریار دکن اسی کے قریب زمانہ میں تخت نشین ہوئے تھے اعلیٰ حضرت کا تصور اب تک میرے ذہن میں واضح طور پر ہے۔ اعلیٰ حضرت ایک بید ہاتھ میں لیے ہوئے اسٹاف کے جھرمٹ میں دیوان خاص کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ بات تصویر میں بھی نہ آسکتی تھی کہ وہ زمانہ بھی آئے گا جب مجھے اُن سے بہت ہی قریب ہونے کا موقع ملے گا۔

یہ صورت سے نہایت ذکی اور کسی قدر تیز مزاج معلوم ہوتے تھے۔ اسی دربار میں نواب فیاض علی خاں رئیس پہاسو کو K.C.V.O۔ ملا تھا میں نے اس پارٹی میں انھیں مبارکباد دی۔ نواب صاحب نے مجھے اپنے راجہ سے ملایا۔ یہ اس زمانہ میں جے پور میں دیوان تھے۔ مجھے مہاراجہ جے پور آنجہانی کی سفید داڑھی بہت ہی اچھی معلوم ہوئی۔ یہ صورت سے نہایت شریف اور رحمدل معلوم ہوتے تھے۔

۸ر اپریل ۱۹۱۲ء کو میری بارات طالب نگر گئی اور بڑے اہتمام سے میرے

چچا نے شادی کی۔ ۱۹راپریل کو میرٹھ میں مجھے کمشنر نے دربار میڈل دیا۔ ۲۱رجولائی ۱۹۱۴ء کو ٹرسٹیز کی میٹنگ تھی اور نواب اسحاق خاں مرحوم کالج کے سکریٹری ہوئے۔ میں اس جلسہ میں شریک تھا۔ ۲۵رجولائی کو خاں صاحب رحم علی خاں کا (جو رشتہ کے دادا ہوتے تھے) انتقال ہوگیا۔ چھتاری کے لیے یہ ایک بڑا واقعہ تھا۔ ریاست کے انتظامات میں اُن سے بڑی مدد ملتی تھی اور وہ میرے اور میری ریاست کے سچے بہی خواہ تھے۔ خدا مغفرت فرمائے مجھے اُن کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔

۱۸رجنوری ۱۹۱۲ء کو مجھے گورنمنٹ سے ایک سرٹیفکٹ دیا گیا جسے میں نے بڑی مسرت سے لیا اور اسے ایک نعمت سمجھا۔ جولائی ۱۹۱۲ء کو الٰہ آباد جانا ہوا۔ اور میں تربینی دیکھنے گیا لیکن مسلمان ہونے کی وجہ سے پنڈت ہماری طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ایک پنڈے کو ہم نے خوب دکھچڑاں دی اسے خدا جانے کیوں یہ خیال ہوا کہ کوئی بہت خوش عقیدہ ہندو ہیں چنانچہ اس نے ہمیں اچھی طرح دکھایا اور جہاں جہاں اُس نے ہم سے پھول وغیرہ ڈلوائے ہم نے ڈالے، احمد نور مرحوم جو میرے ساتھ گئے ہوئے تھے میرے سکریٹری تھے۔ افسوس اسی سال ہیضہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مجھے بہت صدمہ ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک گاؤں موضع پڑھا کا کچھ حصہ میں نے خریدا۔ مجھے اس کی بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے ریاست کے بڑھانے کی خواہش بہت تھی۔ میں نینی تال گرمیوں میں ضرور جاتا تھا، چاہے چند ہی روز کو ہو مشغلہ یہ ہوتا کہ صبح اٹھے اور بلا کشان محبت کی طرح کوئے یار کی بجائے کوچۂ حکامان میں گھومنا شروع کردیا۔ لطف یہ کہ اسی دریوزہ گری کو میں خود بھی اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا اور مذاق سے کہتا تھا کہ ''آج اتنے گھر بھیک مانگی۔''

ایک اتفاقیہ مگر اندوہناک حادثہ:

۹رنومبر ۱۹۱۲ء کو ایک بڑا افسوسناک حادثہ طالب نگر میں پیش آیا۔ میں نثار حسین صاحب (ڈپٹی مجسٹریٹ نہر) اور اُن کے صاحبزادے وقار حسین (جو پولیس میں ملازم تھے) مچھلی کا شکار جال سے کھیل رہے تھے میں بھی کنارہ پر کھڑا تھا اور اکثر لوگ نہر کی پٹری پر بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی مہاشیر مچھلی جال سے

بچ کر کو دنکلنا چاہتی ہے میں نے خلیل مرحوم سے (جو میرا بہت ہی عزیز خدمت گار تھا) پیچھے کو ہاتھ بڑھا کر کہا کہ بندوق لا۔ لیکن بجائے بندوق میرے ہاتھ میں آنے کے بندوق کا فائر ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ خلیل پریشان کھڑا اور بندوق کی ایک نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ ارے یہ مرگیا پانچ چھ گز پر طالب نگر کا ایک نوجوان بیٹھا تھا چھرّے اس کے سر میں لگے اور وہ وہیں بے ہوش ہوگیا۔ ہم لوگ پریشان گھر آئے ڈاکٹر کو بلایا اور لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اور رات تک انتقال ہوگیا۔ اس کی بیوی کا چھتاری سے مقررہ ہے۔

میری ایک اسکوچ ہاؤنڈ کتیا تھی جو میرے پاس رہتی تھی وہ دیوانی ہوگئی اور اس زمانہ میں صرف کسولی ہی میں اس کا شفاخانہ تھا۔ گو مجھے کاٹا نہ تھا مگر احتیاطاً جانا پڑا۔

۲۴؍دسمبر ۱۹۱۲ء کی تاریخ تھی علی گڑھ کے اسٹیشن پر حیدر رضا صاحب سب انسپکٹر نے مجھ سے کہا کہ اس روز دہلی میں لارڈ ہارڈنگ ویسرائے پر بم پڑا۔ جب ہماری ریل دہلی پہنچی تو عجیب وحشت تھی۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوتی ہے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہماری سیاسی کشمکش کا یہ کتنا عجیب پہلو ہے کہ ہمارے ہاتھ سے اُن افسروں کو زیادہ نقصان پہنچا جو ہندوستان اور ہندوستانی لوگوں کے ہمدرد تھے۔ مثلاً لارڈ کرزن، ریڈنگ ولنگڈن نے سختی سے قومی تحریکوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن انھیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ لیکن لارڈ ہارڈنگ منٹو اور اروِن، ان کا شکار بنے۔

گھریلو زندگی کے چند واقعات:

میری زندگی اس زمانہ میں بہت پرسکون تھی۔ میں اس کا خیال رکھتا تھا کہ آمدنی اور خرچ میں صحیح تناسب قائم رہے اور میرے تعلقات حکام اور میری رعایا سے اچھے رہیں۔ میری بیوی بہت سیدھی اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ ہم دونوں اپنے بچوں پر دیوانہ تھے۔ انھیں گھرداری نہیں آتی تھی۔ مگر اس میں ان کا قصور نہیں تھا۔ اس لیے کہ میرے چچا کو ان سے اتنی محبت تھی کہ سوائے اس زمانہ کے جب ان کے بچہ ہونے کا وقت قریب آتا تھا وہ اکثر طالب نگر رہتی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ وہاں گھر کے انتظامات سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں ہوسکتی تھی۔ ان کے اولادیں تو بہت ہوئیں لیکن خدا کے فضل

سے تین لڑکے اور ایک لڑکی زندہ ہیں، میری بڑی اولاد بیٹی ہے جس کا نام ہاجرہ ہے۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو جب یہ پیدا ہوئی تو میرے چچا اور چچی کو اصرار ہوا کہ عقیقہ بہت دھوم سے کیا جائے۔ چنانچہ یہ ہی ہوا یہ لڑکی میرے چچا کو بہت عزیز تھی اور مجھے بھائی جی کہتی ہے۔ ماشاءاللہ صاحب اولاد ہے اور اپنی ماں کی طرح اپنے بچوں سے بہت محبت کرتی ہے۔

نوابی کا خطاب:

گورنمنٹ کی طرف سے سونے کا سگریٹ کیس، چھڑیاں، سندیں کثرت سے ملیں۔ سر جیمس مسٹن (لفٹننٹ گورنر) نے میرٹھ کے دربار میں خاص طور پر اپنی تقریر میں میرا ذکر کیا۔ اس زمانہ میں (اور تھوڑا بہت آجکل بھی) چندہ دینے والے (بالخصوص روساء) اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ حریف یا مدمقابل سے کسی طرح پیچھے نہ رہیں۔ مثلاً فلاں نے سو دیا تو ہم سوا سو دیں گے۔ مقابلہ کی اسپرٹ اچھی ہوتی ہے لیکن یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ مقابلہ کا مقصد کیا ہے؟ کار خیر اور چندہ دینے میں امتیاز رکھنا چاہیے۔ یوں اپنے آپ ہی اپنا روپیہ صرف کرنے کے ہزار حیلے ہیں۔

۳ر جون ۱۹۱۵ء کو طالب نگر گیا تھا کہ امتیاز علی خاں گھوڑے پر سوار ایک اُردو اخبار لیے ہوئے پہنچے جس میں خطابات کی فہرست میں میرا نام نواب کے خطاب کے ساتھ تھا۔ میری بیوی مرحومہ کو اس کی بڑی مسرت ہوئی ان کی مسکراہٹ اس وقت تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ میرے چچا مرحوم اور مجھے خود تعجب سا تھا اس واسطے کہ خطاب دیتے وقت سن و سال کا بھی خیال کرتے ہیں۔ لیکن اس موقع پر غالباً صورت یہ تھی کہ چھتاری کا موروثی خطاب تو میرے چچا کے پاس تھا اور میں باوجود اس کے کہ چھتاری پر قابض تھا خطاب سے مخاطب نہیں کیا جا سکتا تھا گورنمنٹ کے نزدیک یہی وجہ جواز تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی اور گو عادتاً میں مسرت یا ملال کا بے محابا اظہار نہ کرتا تھا پھر بھی مجھے یاد ہے کہ میں دل میں بہت مسرور تھا۔

احباب سے لطف صحبت

پیر جی محبت علی شاہ صاحب سے میں مذاق بھی بہت کرتا تھا اور ان کی

موجودگی میں کوئی واقعہ ہو مذاق بن جاتا اور ناگواری اور تکلیف کا احساس بہت کم ہو جاتا تھا۔ ایک روز میں پیر جی اور بھائی جان، صبح کے ناشتہ کی دعوت میں سید ابوالحسن مرحوم رجسٹرار کے ہاں گئے۔ چار پہیئے کی گاڑی تھی اور میں خود ہانک رہا تھا۔ جاتے میں تو ایک موڑ پر گھوڑے کی تیزی کا اثر فقط یہ ہوا کہ بھائی جان جو ایک کنارے پر بیٹھے تھے باہر جا پڑے لیکن آدمی ہیں ہلکے پھلکے بھاگے چلے گئے اور سامنے ایک دوکان تھی زور میں اس کے برآمدہ پر جا چڑھے۔ ویسے تو تنبیہ کسی عقل سلیم کے آدمی کے واسطے کافی تھی۔ مگر اس عمر میں عقل سلیم کہاں؟ مجھے بڑا لطف آیا۔ آگے چل کر گاڑی روکی بھائی جان پھر بیٹھ گئے۔ میزبان کا مکان اوپر کوٹ تھا، خیریت سے وہاں پہنچے اور ناشتہ سے فارغ ہو کر جب واپس ہونے لگے تو پیر جی مرحوم نے کہا کہ یہاں سے جانا ہے اس گاڑی میں، نہ جایئے لیکن میں نے اپنی حماقت سے نہ مانا اور کہا کہ یہ گھوڑا کوئی شیر ہے جو کھا جائے گا۔ چنانچہ ایک کنارہ پر میں اور دوسرے پر پیر جی صاحب اور بھائی جان درمیان میں۔ اس طرح چلے۔ اُتار کا راستہ گھوڑا نہایت تیز اور منہ زور، ایک موڑ پر تیزی سے مڑا۔ میری استادی کام نہ آئی اور گاڑی لوٹ گئی۔ پیر جی مرحوم جس کنارے پر تھے اس جانب کو لوٹی۔ میں تو چونکہ مخالف کنارے پر تھا ذرا دور کچے میں جا پڑا اور ایک ٹانگ میں زخم اور کچھ خراشیں آئیں اور بھائی جان کے مجھ سے کچھ زیادہ چوٹ آئی پھر بھی کچھ ایسی نہیں۔ لیکن پیر جی کے دو دانت ہل گئے اوپر کے لب پر سے بال اڑ گئے اور چہرہ لہولہان ہو گیا۔ تکلیف سب کو تھی۔ مگر پیر جی صاحب کی باتوں سے بے ساختہ ہنسی آتی تھی۔ ہم مجروحین گھر پہنچے تو سلام الدین صاحب پیر جی کو دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئے پیر جی نے سلام الدین صاحب کو پھر کبھی معاف نہیں کیا۔

دوسری شادی

اپریل ۱۹۱۲ء میں میری دوسری شادی کر دی گئی اور چوں کہ میرے چچا مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ اہتمام سے ہو۔ لہٰذا بہت اہتمام سے کی گئی اور تمام پرانے رسوم ادا کیے مجھے دولہا بننے کا کچھ زیادہ لطف نہ آیا ایک تو اس وجہ سے کہ گو میرے چچا مرحوم بہ

حیثیت میرے باپ کے چھتاری آ گئے تھے لیکن درحقیقت ہر چیز کی ذمہ داری میری ہی تھی۔ خدا غریق رحمت کرے۔ منشی وزیر خاں کو وہ بہت کچھ اپنی ذمہ داری پر کرتے تھے لیکن خاص خاص باتوں میں مجھے حکم دینا ہی پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ مجھے یاد ہے کہ اس نئی ذمہ داری کا مجھ پر کافی اثر تھا۔ مجھے اس کا احساس تھا کہ اب دوسری زندگی شروع ہورہی ہے۔ اور میری آزادی ختم ہورہی تھی۔ میں یہ جانتا تھا کہ اس وقت تک جو میں چاہتا تھا وہی ہوتا تھا۔ اب ایک دوسرے کی مرضی کو بھی دخل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص ایک جگہ آسائش سے نہیں رہ سکتے جب تک خوشی سے ایک دوسرے کے محسوسات کا احترام نہ کریں۔ سہرا بندھا اور میں اصرار کر کے سدھ پور اپنے دادا کی قبر پر حاضر ہوا۔ میں اپنی ان مرحومہ بیوی کی قبر کو دیکھ کر بہت رویا (جن سے کہ جیسا میں نے اوپر ذکر کیا ہے) میرا صرف نکاح ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک حماقت بھی ہوئی۔

میرے ایک نہایت مخلص دوست پیر جی محبّ علی شاہ صاحب آئے اور ایک سفوف لائے کہنے لگے کہ یہ خاص آپ کے واسطے لایا ہوں۔ اسے کھایئے اور زندگی کا لطف اُٹھایئے۔ ہم نے بڑی خوشی سے قبول کیا اور وعدہ کیا کہ حسب ہدایت آدھ سیر دودھ کے ساتھ ضرور استعمال کروں گا۔ میں بچپن ہی سے ذرا دواؤں سے گھبراتا ہوں اور یہ گھبراہٹ اب تک جوں کی توں قائم ہے۔ معالج سے اکثر یہی جھگڑا رہتا ہے کہ پوری خوراک کیوں نہ استعمال کی چنانچہ سوچا کہ ایک خوراک کا چوتھائی حصہ کھا کر دیکھیں چنانچہ شب میں جس کے دوسرے روز بارات جانے والی چوتھائی حصہ کھالیا۔ اب جو صبح آنکھ کھلتی ہے تو دردسر، بخار، کرب دبے چینی کی بدولت سر رنج بالیں اور تن بار بستر بن گیا تھا ادھر مہندی اور سہرے کی رسموں کا ہونا ضروری اور پھر بارات کا جانا۔ ادھر ۱۰۳ بخار۔ پھر لطف یہ کہ کسی سے صاف صاف بات بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ آخر کار میں نے حکیم احسان الحق مرحوم سے جو میرے بہت بے تکلف دوست اور طبیب حاذق تھے سارا واقعہ کہہ دیا انھوں نے دوا منگا کر دیکھی اور کہا کہ یہ چیزیں پچاس سال کی عمر سے پہلے کھانا گویا مرض کو مدعو کرتا ہے۔ غرض غذا بند کی گئی اور فواکہات کے عرق پر مجھے ۲۴ گھنٹے رکھا۔ بخار اتر گیا میں نے ایسی لطف زندگی بڑھانے والی دواؤں کی قسم کھائی۔

میری بیوی بہت سیدھی اور مخلص قسم کی خاتون تھیں۔ میرے چچا کو ان سے بے حد محبت تھی اور اس لیے میں بھی اکثر طالب نگر رہتا تھا۔

دہلی کا دربار

۱۹۱۱ء میں دہلی کا دربار ہوا۔ اس سے پہلا دربار ۱۹۰۱ء کا مجھے یونہی خواب وخیال سا یاد ہے۔ ہاتھیوں کا جلوس چاندنی چوک سے بیٹھ کر دیکھا تھا۔ یہ یاد ہے نمائش میں گھومتے ہوئے لیڈی کرزن کو دیکھنا یاد ہے۔ یہ بہت ہی حسین خاتون تھیں لیکن ۱۹۱۱ء کا دربار اچھی طرح یاد ہے۔ میں چچا نواب بہادر طالب نگرو دلی تشریف لے گئے تھے۔ اس بار جلوس گاڑیوں میں نکلا تھا۔ بادشاہ گھوڑے پر تھے اور بادشاہ بیگم گاڑی میں تھیں۔ گو بادشاہ خود موجود تھے لیکن وہ شان جو کرزن کے جلوس کی تھی اس میں نہ تھی۔ دربار میں میں بھی گیا تھا۔ مہاراجہ بڑودہ کا بادشاہ کے سامنے نہ جھکنا بلکہ لکڑی ہلاتے جانا مجھے یاد ہے۔ ان کے اس طرز کو میں نے بھی خاص طور پر محسوس کیا انہیں یہ کہتے ہوئے معافی مانگنی پڑی کہ شاہی موجودگی سے میں گھبرا گیا لیکن اس واقعہ کے بعد سے انگریزی حکومت انھیں مشکوک نظروں ہی سے دیکھتی رہی۔ دربار میں بادشاہ کی زبان سے تقسیم بنگال کو مسترد کرنے کا اعلان کرایا گیا اور بجائے کلکتہ کے دہلی کو پایۂ تخت بنانے کا اعلان ہوا۔ مسلمانوں پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا برا اثر پڑا۔ یہ شاید پہلا واقع تھا کہ انگریزی حکومت نے ایجی ٹیشن سے گھبرا کر اپنی رائے کو بدلا اور مجھے یاد ہے کہ اس کے کچھ روز بعد لارڈ کرزن نے (جنھوں نے بنگال کو تقسیم کیا تھا۔ کسی موقع پر اسے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے کی ایک زبردست غلطی بتایا تھا جن کے مشورے سے گورنمنٹ نے اسی تقسیم بنگال کو مسترد کیا جسے سالہا سال تک ''طے شدہ واقعہ'' بتایا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کو اس کا یقین ہو گیا کہ ایجی ٹیشن کا حربہ ایسا ہے کہ جس کی تاب برٹش حکومت نہیں لاسکتی اور یہ واقعہ برٹش اقتدار کے خاتمہ کی شروعات بن گیا۔ بنگال میں اس زمانہ میں دہشت ناکی کی تحریک نے بڑا زور پکڑا اور اکثر انگریز اور بعض ہندوستانی اس کی نذر ہوئے مسلمان جواب تک

انگریزوں کی حمایت پر تکیہ کیے بیٹھے تھے چونکے۔ اور نواب وقار الملک مرحوم نے ایک تعلیمی کالج کا سکریٹری ہونے کے باوجود کالج کے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایسا مضمون لکھا جس سے ایوان حکومت میں زلزلہ آ گیا۔

دہلی کو پایۂ تخت بنانا مسلمانوں کو پسند نہ آیا۔ دہلی میں اغیار کی حکومت دیکھ کر ممکن ہے۔ لوگ انگریزوں سے مرعوب ہوئے ہوں لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ اپنی گزشتہ عظمت کو یاد کر کے وہ انگریز اور انگریزی حکومت سے متنفر ہوتے رہیں لوگوں نے اسے فال بد سمجھا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ سے یہ کہاں تک ثابت ہے لیکن ہندوستان میں یہ ایک توہم ہے کہ جب کوئی سلطنت زوال پذیر ہونے کو ہوتی ہے تو دہلی اُسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ عام طور پر لوگ یہ کہنے لگے تھے کہ دہلی انگریزوں کو بھی کردے گی۔ مجھے اس دربار میں ایک سند دی گئی جو اس پُل کے متعلق تھی کہ جو میرے دادا نے کالی ندی پر بنایا تھا اور ایک تمغہ درباری بھی ملا۔ مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی۔

نیل کی تجارت

میری زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوئیں جنھیں سوائے تقدیر الٰہی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ میں نے ارادتاً کچھ نہ کیا نہ میں ان کے نتائج سے واقف تھا۔ لیکن کامیابی کے بعد خواہ مخواہ سہرا میرے سر بندھا۔ ۱۹۱۲ء میں پیر جی صاحب مرحوم نے کہا کہ لائیے دیکھیں کہ نیل کا رنگ بنانے میں کوئی نفع اب بھی ہے یا نہیں۔ ہم نے ۱۹۱۳ء میں چھتاری کے کارخانہ کو زندہ کیا جب مال بیچا تو نفع ..... نہ نقصان ۱۹۱۴ء میں پھر ہم نے کارخانہ چلایا۔ اسی زمانہ میں پہلی جنگ جرمنی سے شروع ہوگئی۔ لہٰذا مصنوعی رنگ جس نے ہندوستان کی اس تجارت کو ختم کر دیا تھا نہ آسکا اس لیے معقول نفع رہا۔ پھر کیا تھا چار پرانے کارخانے پھر سے چلا دیئے اور کاشتکاروں کو زیادہ قیمت دینی شروع کی تا کہ وہ نیل کی تخم ریزی زیادہ کریں اور اس طرح آمدنی میں بہت اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۲۵ء تک یہ کارخانے جاری رہے اور اس زمانہ میں پندرہ لاکھ کا مجھے نفع ہوا۔ اس تجارت میں خاں صاحب جعفر خاں نے بڑا کام کیا خود ایک کارخانہ چلاتے تھے جس کا اوسط سب کارخانوں سے بہتر ہوتا تھا نیل کی کاشت کاری میں بڑی کوشش

کرتے تھے۔ خاں صاحب رحم علی خاں صاحب کے بیٹوں میں یہ تین صاحبان میرے ساتھ کے کھیلے ہیں۔ فیاض خاں، جعفر خاں اور لیاقت خاں، جعفر خاں اور لیاقت خاں عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر تعلق قلبی نے یہ تفریق مٹادی۔

اس رقم کو کارخانے بنانے یا دوسری تجارت میں لگایا ہوتا تو آج زمینداری کے ختم پر یہ سراسیمگی نہ ہوتی۔ لیکن اس زمانہ میں تو مواضعات خریدنے کا خبط تھا اور یہ دیکھ کر ریاست کا رقبہ بڑھ رہا ہے ایسی مسرت ہوتی تھی کہ تمام روپیہ اسی میں خرچ ہو۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ میں نے بڑی دانشمندی سے کام لیا۔ سر جیمس (اب لارڈ) مسٹن اس زمانہ میں لفٹنٹ گورنر تھے۔ ایک روز ڈنر پر مذاقاً کہنے لگے کہ تم نے جو ایک سال قبل رنگ بنانا شروع کیا تھا تم سے اور قیصر سے سمجھوتہ تھا۔

وابستگان و ملازمین

حضرت مولانا عابد حسین صاحب دیوبندی سفر حج کے ارادے سے چلے رخصت ہونے کو علی گڑھ آئے میرے چچا ان سے مرید تھے۔ مجھے اور میری بیوی کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی۔ اس زمانہ میں سید اعجاز حسین حیدر میرے پرائیویٹ سکریٹری تھے ناحق شناسی ہوگی اگر ان کا ذکر نہ کروں شرافت خودداری اور وفا شعاری کا بہترین نمونہ تھے ان کے چھوٹے بھائی سید سجاد حیدر مرحوم سے تو ہندوستان میں اُردو ادب کے شائق اچھی طرح سے واقف ہیں۔ اعجاز حیدر مرحوم کی خودداری اس درجہ تھی کہ گو یہ خود اس وقت جب میرے یہاں ملازم ہوئے گورنمنٹ سے پنشن پاتے تھے اور ان کی ماہوار آمدنی بہ مشکل ان کے اخراجات کی کفیل ہوسکتی تھی اسے پسند نہ کرتے تھے کہ تین چھوٹے بھائیوں پر اپنا بار ڈالیں۔ اسی زمانہ میں ان کے دو بھائی ڈپٹی کلکٹر تھے اور ایک بھائی سول سرجن یہ حضرات اصرار کرتے تھے کہ وہ ترک ملازمت کے بعد آرام کریں اور یہ ان کا بار اٹھائیں۔ لیکن انھوں نے اسے گوارا نہ کیا ایک سال مزاحاً انھوں نے سال نو کے خطابات بنائے۔ مجھے یاد ہے کہ نواب بہادر عبدالسمیع خاں اسکول میں پڑھتے تھے ان کے خطاب میں منجملہ اور فقرات کے ایک یہ بھی تھا۔ ''اسکول کا تالا کبھی نہ پڑھنے والا''۔ میرے خطاب کا ایک حصہ ''دانائے مروت نادان ست'' بھی

تھا۔ فرض شناسی کا معیار اتنا بلند تھا کہ وہ استسقا میں مبتلا ہوئے تو رخصت لے کر بریلی اپنے بھائی کے پاس چلے گئے۔ میں نینی تال جا رہا تھا میں نے اپنی ناسمجھی سے یہ بھی لکھ دیا کہ میں نینی تال جا رہا ہوں اور بابو سدھاری لال (میرے چچا کے پرائیویٹ سکریٹری) کو ساتھ لے لیا ہے نینی تال پہنچنے کے دوسرے تیسرے روز اعجاز حیدر مرحوم تشریف لے آئے میں نے بڑی حیرت کے ساتھ ان سے کہا کہ یہ آپ نے کیا۔ کیا سفر کی صعوبت اور علالت کی حالت میں کتنی تکلیف ہوئی ہوگی فرمانے لگے کہ ''دل نے گوارا نہ کیا کہ میری زندگی میں کوئی اور شخص آپ کا کام کرے''۔ آج ایسے لوگ مفقود ہیں۔ کبھی کبھی شعر کہتے تھے گو شاعر نہ تھے۔ ان کا ایک مطلع مجھے یاد ہے۔

آپ ہی سوچئے یہ آپ نے کیا کچھ نہ کہا
ہم نے سو ظلم سہے، صبر کیا کچھ نہ کہا

اولاد:

میرے گھر میں مسلسل تین لڑکیاں ہو چکی تھیں اور ہم دونو میاں بیوی کا دل یہ چاہتا تھا کہ خدا بیٹا دے گو کبھی ایک دوسرے کے سامنے زبان سے نہ کہتے تھے لیکن ہمارے دل کا حال ایک دوسرے سے پوشیدہ نہ تھا۔ اسی زمانہ میں اتفاق سے میری بیوی مرحومہ ایک تعزیت کے سلسلے میں موضع سمیرہ گئیں وہاں اس زمانے میں مولوی شیرازی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا قیام تھا وہ ان کی بیوی سے ملنے بھی گئیں۔ ان کا بیان ہے کہ جب وہ واپس ہو رہی تھیں تو مولوی صاحب چھپڑے میں سے ہو کر اور رتھ کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا ''بی بی تم ایک فقیر کے گھر آئی ہو میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں، مگر انشاء اللہ آئندہ تمہارے بیٹے ہوا کریں گے''۔ مرحومہ نے یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ ''آج یہ واقعہ پیش آیا'' اس کا خیال بھی دل میں نہ رہا کہ اس کے دس گیارہ ماہ کے بعد راحت سلمہ، جنوری ۱۹۱۸ء آٹھ اور نو کی شب میں پیدا ہوئے موجودہ زمانے میں اس طرح کی باتوں پر یقین کرنا مضحکہ خیز کیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ پھر کبھی میری بیوی کے بیٹی پیدا نہیں ہوئی اور چار لڑکے ہوئے۔ راحت سلمہ، کے پیدا ہونے کی نہ صرف ہم لوگوں کو بلکہ پورے خاندان کو بڑی مسرت ہوئی۔ چھتاری میں تمام لوگوں نے چراغاں کیا۔ میرے چچا چچی اور میرے بھائی (چچا زاد) عبدالسمیع خاں خوشی

سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اس زمانہ میں کاشتکاروں سے کچھ غلہ نرخ بازار سے زیادہ ریاست کے خرچ کے واسطے لیا جاتا تھا اس خوشی میں اس رسم کو میں نے ترک کر دیا۔

اس لڑکے کو بڑے لاڈ سے پالا گیا۔ خان صاحب لیاقت خاں کو اس بچہ سے بہت محبت ہے اور اس کے پالنے اور خدمت کرنے میں وہ شروع سے حصہ لیتے تھے میں یہ کہنا بھول گیا کہ اپریل ۱۹۱۵ء میں نواب بہادر عبدالسمیع خاں کی شادی باغبپت میں ہوئی۔

۱۹۱۹ء تک میری زندگی اور میں بالکل قانع اور مسرور تھا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں فرحت سلمہ، پیدا ہوئے ان کی پیدائش میں کچھ ایسی خرابی پیدا ہوئی کہ ڈاکٹر کہتے تھے کہ بچہ فوراً پیدا کرایا جائے ورنہ زچہ کی جان کو خطرہ ہے میری مرحومہ بیوی کو اس پر اصرار تھا کہ جب تک بچہ کی جانب سے پورا اطمینان ڈاکٹر نہ دلائیں گے کہ یوں پیدا کرانے میں بچہ کو خطرہ نہ ہوگا میں رضامند نہ ہوں گی۔ سرجن اور مس گل (حال مس نیوس) لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ غرض جب میری بیوی راضی نہ ہوئی تو سول سرجن علی گڑھ واپس ہو گئے اور مجھ سے کہہ گئے کہ تمہاری بیوی آتش فشاں پہاڑ پر ہیں جس وقت کوئی رگ پھٹی خون بند نہ ہوگا۔ میری اب تک یہ عادت ہے کہ پریشانی کی حالت میں سدھ پور جاتا ہوں اور وہاں اپنے دادا مرحوم اور میاں صاحب غلام رسول مرحوم اور ٹھاکر مردان علی خاں مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر مجھے بڑا سکون ہوتا ہے۔ جمعہ کا روز تھا میں نے فاتحہ کے بعد دعا مانگی کہ میرے رب جو بچہ اور ماں کے واسطے بہتر صورت ہو وہ پیدا ہو۔ میں واپس ہوا تو میری بیوی نے کہا کہ اچھی بات ہے بچہ پیدا کرا دیجئے۔ مس نیوس موجود تھیں ان ہی نے بچہ پیدا کرایا اور خیریت کے ساتھ فرحت میاں پیدا ہو گئے۔ میں سر جانماز پر تھا کہ مجھے اس خبر سے خدا نے مطمئن کیا۔ ان کے پیدا ہونے کے موقع پر گھی تیل، پھوس وغیرہ کی خریداری رعایا سے بند کر دی گئی۔

موروثی خطاب

۱۹۱۸ء میں مجھے کنگس کمیشن دیا گیا اور میں سکنڈ لفٹنٹ (Second Lt.) ہو گیا وردی پہن کر میں خوش ہوا اس زمانہ کی تصویر اب تک موجود ہے۔

اور ۱۹۱۸ء کی جون میں مجھے M.B.E. کا خطاب ملا۔ میں اس زمانہ میں نینی تال میں تھا۔ اس خطاب کے متعلق میرے دوستوں نے کہا کہ بہت مناسب نہ تھا لیکن مجھے اس سے بھی تفریح ہوئی۔

۱۹۱۸ء کے اخیر یا ۱۹۱۹ء کے شروع میں گورنمنٹ کی طرف سے مجھے بصیغہ راز یہ پوچھا گیا تھا کہ اپنی جنگی خدمات کا کیا صلہ چاہتا ہوں میں نے جواب میں یہ لکھا کہ میرے خطاب نوابی کو موروثی کر دیا جائے۔ صورت یہ تھی کہ چونکہ میرے چچا نواب چھتاری تو انھوں نے اپنے جانشین کے خانہ میں میرا نام لکھا تھا اور میں یہ چاہتا تھا کہ مجھے اپنے بھائی عبدالسمیع خاں سے لینا نہ پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جون ۱۹۱۹ء میں میرا یہ نوابی کا خطاب موروثی ہو گیا۔

صوبہ کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ

اسی سال ستمبر کی ۱۵ ؍ کو سرجون ہیوٹ نے اس صوبہ کی زمامِ حکومت سرجیمس مسٹن کو دی میرے چچا عبدالصمد خاں نواب بہادر اور میں ان سے بمقام بریلی ملنے گئے۔

سرجیمس مسٹن اور واقعۂ کانپور:

ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور جنت مکان سرجون کو رخصت کرنے بریلی کے اسٹیشن پر آئے اور دم وداع اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ میں متحیر رہ گیا۔ سرجیمس اور سرجوان دونوں بڑے شان کے گورنر ہوئے۔ سرجون میں انتظامی قابلیت بہت زیادہ تھی اور دوستوں کے بڑے اچھے دوست تھے اور دشمن کے بڑے دشمن۔ سرجیمس بڑے خلیق تھے۔ اردو بہت اچھی اور صاف بولتے تھے اور اردو میں تقریر بھی کر لیتے تھے۔ مالیات کے بڑے ماہر تھے دوست کے کچھ کام نہیں آتے تھے اور دشمن کو ان سے نقصان بھی زیادہ نہیں پہنچتا تھا۔ مقرر بہت اچھے تھے لیکن انتظامی قابلیت سرجون ہیوٹ میں ان سے بہت زیادہ تھی۔ ان کے شروع ہی کے زمانہ میں کانپور کی مسجد کا مشہور واقعہ ہوا۔ اس زمانہ میں پولیس کا گولی چلانا اور چھ آدمیوں کا مارا جانا بڑا سنگین حادثہ تھا جس نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہلچل پیدا

کردی۔ راجہ صاحب محمود آباد نے اس شورش کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا اور بہت خرچ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ ہارڈنگ کو مداخلت کرنی پڑی اور سرجیمس کی غیر موجودگی میں جب وہ ولایت گئے ہوئے تھے اس طرح اسے طے کیا کہ مسلمان مطمئن ہوگئے۔ اس شورش کی تہہ میں کیا تھا اس کے متعلق تو بہت سی افواہیں مشہور تھیں جو مصدقہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ آج آئے دن لوگ گولیوں کا شکار ہوتے ہیں اور کوئی پرواتک نہیں کرتا۔ اس زمانہ میں تمام شمالی ہندوستان میں ہلچل مچ گئی تھی اور صورت حال اس درجہ نازک ہوگئی تھی کہ وائسرائے کو کان پور آکر بڑی دشواریوں اور تدبر کے ساتھ اس معاملہ کو طے کرنا پڑا اس جلسے میں شریک تھا۔

سرجیمس دارالعلوم دیوبند میں:

سرجیمس مسٹن ولایت سے واپس آئے تو مجھے یہ خیال ہوا کہ کان پور کے واقعہ کے بعد یہ ضرور اس کے متمنی ہوں گے کہ مسلمانوں کی تالیف قلب کی جائے۔ میں نے اپنے چچا سے کہا کہ ان کو دیوبند کے مدرسہ جانا چاہیے دیوبند کے دارالعلوم سے میرے خاندان کے بہت پرانے تعلقات ہیں اور بانیان مدرسہ (خاص کر مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ سے) میرے دادا صاحب مرحوم کو بہت عقیدت تھی۔ چنانچہ حافظ احمد صاحب اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مرحومین سے میں نے گفتگو کی ادھر دار الحدیث کی توسیع کے سلسلہ میں کچھ زمین کا جھگڑا بھی تھا۔ طے یہ پایا کہ ہم لوگ انھیں مدعو کریں مدرسہ کی جانب سے سرجیمس کو ہم لوگوں نے مدعو کیا۔ آخر ۱۹۱۴ء یا شروع ۱۹۱۵ء میں وہ وہاں آئے ان کا آنا بہت کامیاب ہوا۔ زمین کا جھگڑا بھی طے ہوگیا۔ سرجیمس بھی بہت ممنون ہوئے کہ کان پور کے واقعہ کے بعد انھیں دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ سے پھر مسلمانوں سے قریب ہونے کا موقع ملا مجھے یہ یاد نہیں کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اس جلسہ میں شریک ہوئے یا نہیں۔ لیکن یہ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اس ترکیب کو کچھ زیادہ پسند نہیں کیا۔

دارالعلوم دیوبند کا گورنمنٹ کی مالی امداد لینے سے انکار:

سرجیمس مسٹن کی یہ خواہش تھی کہ مدرسہ کو مالی امداد یک مشت یا سالانہ جو بھی

اہل مدرسہ چاہیں دی جائے لیکن مدرسہ کی روایات یہ رہی ہیں کہ حکومت سے کبھی کوئی امداد نہیں لی، اس لیے مولوی محمد احمد صاحب مرحوم اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے اسے گوارا نہ کیا۔ یہ اس دارالعلوم کی خصوصیت ہے کہ اب تک فقط توکل پر مسلمانوں کی مدد سے چلا ہے۔ مجھے وہ دن کل کی طرح یاد ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا گویا سرجیمس کی جان و آبرو کی سلامتی کا بوجھ میرے کاندھوں پر ہے۔ اس موقع پر میں نے اس طرح کا کورٹ پہن رکھا تھا کہ اب اس کا تصور کر کے ہنسی آتی ہے۔ سیاہ مخمل کی ایک شیروانی سلمہ ستارے سے مغرق اس پر ایک سنہری تلوار۔ میرے چچا بھی اس موقع پر دیوبند گئے تھے۔

پہلی جنگ عالمگیر اگست ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی۔ ہم نے بھی چندہ قرضہ، اور رنگروٹوں سے مدد دینی شروع کی اور جتنا ہو سکا کیا۔

تحریک ترک موالات اور اس کے نتائج و اثرات:

اس زمانہ میں خلافتِ تحریک کا بڑا زور تھا اور ترکِ موالات کا ہر جگہ چرچہ تھا۔ رولٹ ایکٹ کی بدولت یہ شروع ہوا مہاتما گاندھی نے اپنے خاص طریقہ پر اس ایجی ٹیشن کی بنیاد ڈالی۔ خدا جانے آیندہ کے مورخین اس تحریک کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ بعض امور میں اس سے بے حد نفع اور بعض چیزوں میں بے حد نقصان ہوا۔ اس کے منافع میں میرے نزدیک یہ باتیں بہت اہم ہیں۔

۱- اس تحریک نے ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا کیا جس کا اس سے پہلے سوائے چند حضرات کے عام طور پر فقدان تھا۔ اس سیاسی شعور سے ہندوستان میں خود داری آئی۔

۲- اس تحریک نے انگریزوں کے دماغ سے دعوےٰ خدائی کو بڑی حد تک دور کر دیا اور ان کے مزاج میں اسی تحریک نے اعتدال پیدا کیا۔

۳- ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی چیزوں کے استعمال کی طرف مائل کیا۔ اور اس تحریک سے جو نقصانات ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

(ا) جو عارضی اتحاد ہندو اور مسلمانوں میں پیدا ہوا تھا چوں کہ اس کی بنیاد صرف

انگریز کے ساتھ نفرت پر تھی اور کوئی اصلی فیصلہ یا سمجھوتہ نہیں ہوا تھا اس لیے اس تحریک کی گرما گرمی ختم ہونے کے بعد اس کا ردِعمل بھی اسی تیزی سے شروع ہوا جس کے اثرات سے آج تک ہندوستان نجات نہ پا سکا۔ سوامی شردھانند کو دہلی کی جامع مسجد کے مکبّر پر جگہ دی گئی اور اس واقعہ کے چند سال بعد دہلی ہی میں ایک مسلمان نے انھیں قتل کیا۔

(۲) نوجوانوں میں خودداری اور خیرہ سری کی ایسی ہوا چلی کہ بڑے سے بڑے رشتوں اور بڑی سے بڑی قدروں کا احترام دل سے نکل گیا۔ سیاست کے جن پہلوانوں نے یہ داؤ بتایا تھا آج وہ خود اس کے شکار ہیں۔

(۳) سرکاری ملازمین میں نہ ڈسلپن باقی رہی نہ خود اعتمادی۔

(۴) ہر پیشہ ور جماعت ہڑتال کی عادی ہوگئی اور گو اب انگریزی حکومت باقی نہیں مگر یہ اپنا سبق برابر دہراتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کی سیاسی تحریکات کے مدد جزر بہت بڑی حد تک انگریزوں کی غلطیوں کے ممنون ہیں ایک زمانہ دراز تک ہندوستانیوں کو اعلیٰ ذمہ داریوں کے کاموں سے محروم رکھا گیا۔ اول تو آئی سی ایس، اور آئی پی ایس، نیز دوسری آل انڈیا ملازمتوں میں ہندوستانی یونہی بہت کم آتے تھے اور اگر کوئی آ بھی جاتا تو اس کو چھوٹے اضلاع اور کم ذمہ داری کے کاموں میں لگایا جاتا تھا۔ مجھے اپنی سرکاری زندگی میں ایسے مواقع آئے جہاں یورپین ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ نے ایک جونیئر انگریز کی ترقی کی سفارش کی۔ اور لائق ہندوستانی کو جو سینئر تھا نظر انداز کیا۔ میں نے اختلاف کیا تو گورنر نے مجھ سے اتفاق کیا اور ہندوستانی کو ترقی ملی۔ اس قسم کی حرکتیں حکومت کے ہر شعبہ میں ہوئی تھیں اور ہر ہندوستانی کو یہ احساس ہوتا تھا کہ جو اعتبار سروس کے معاملہ میں یورپین پر ہے وہ اس پر نہیں۔ پھر سوشل تعلقات میں فرق کیا جاتا تھا اور اس بری طرح کہ معتدل سے معتدل ذہن و دماغ بھی متزلزل ہو جاتا تھا۔

حکومت کی غلط کاری اور نا تجربہ کار قائد:

ان غلطیوں نے اعتدال پسندوں کو یا تو گمنامی کے غار میں ڈال دیا یا انھیں مجبور کر دیا کہ وہ انتہا پسند ہو جائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک کا منشاء اصلاح نہ رہا انقلاب

ہو گیا۔ قائد وہ لوگ ہوئے جو انقلاب چاہتے تھے نہ کہ وہ لوگ جن میں حکومت چلانے کی اہلیت تھی۔ چنانچہ ہر وہ شورش جو انقلاب کی حامی ہو پروگرام میں شامل کر لی گئی اور اس کی طرف توجہ نہ کی کہ ہم کیسا خطرناک سبق اہل ملک کو دے رہے ہیں۔ انگلستان میں انتظامی تجربہ ہر پارٹی کو ہوتا ہے چاہے اس کی حکومت ہو یا وہ مخالف میں ہو لیکن ہندوستان میں جنھیں حکومت کا تجربہ ہے وہ عوام کے قائدین میں سے نہیں ہیں اور جن پر عوام کو بھروسہ ہے انھیں انتظامی تجربہ نہیں۔ یہ باتیں میں نے بطور منطقی نتائج کے پیش کی ہیں۔ گو میرا خیال یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی بہت سی تحریکیں ان حالات وحوادث سے بھی متاثر ہوئیں جو بیرون ہند میں آئے یا آتے رہے۔

تحریک کا ایک تاریک رُخ:

مجھے اس تحریک سے اختلاف تھا اور یہ اس زمانہ میں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ ہم لوگوں کے اختلاف کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم انگریزوں سے مرعوب تھے یوں تو اپنی رائے قائم کرنے میں ہر شخص آزاد ہے۔ لیکن آج ٢٥ سال کے بعد یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جو خدشے ان لوگوں کے دل میں تھے جو اس تحریک کو نامناسب خیال کرتے تھے ایک ایک کر کے پورے ہوئے ملک میں بدامنی اور بے چینی پھیل گئی۔ کلکتہ، مشرقی بنگال۔ بہار، بمبئی، الہ آباد، آگرہ، احمد آباد، مغربی یوپی۔ دلی اور مشرقی پنجاب کے مقتولین ہمارے سامنے ہیں اور مجروحین کے نالہ وشیون مہینوں سے ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ ہندوستان کے تعلقات میں اس درجہ برہمی اور تلخی پیدا ہوئی کہ ١٩١٩ء کے بہت سے علمبرداران اتحاد وحریت آج ایک دوسرے کے مقابلہ صف آراء ہیں اور اس زمانہ کے اختلاف مثلاً جداگانہ اور مشترکہ انتخاب پر جھگڑا نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان کی تقسیم پر جھگڑا ہے۔

وزیر ہند کی آمد اور زمینداروں کا وفد:

مسٹر مونٹیگ نے شاید ١٩١٩ء میں ہندوستان کا عزم کیا۔ بہت سے لوگ ان سے ملنے زمینداروں کی طرف سے جو وفد گیا اس میں میرے چچا کو بھی سر جیمس میسٹن لفٹننٹ گورنر یوپی نے رکھا تھا اور میں اس کے ساتھ بطور ترجمان گیا تھا۔ زمینداروں نے اپنے تحفظ کا ذکر کیا مجھے یاد ہے وزیر ہند کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ آپ کو اگر اپنے ملک

کے لوگوں پر بھروسا نہیں ہے تو پھر سیاسی حقوق کا مطالبہ بے معنی ہے۔ اس روز وائسرائے کے مکان میں مجھے دہلی کے شاہی خاندان کے ایک رکن سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ یہ حضرت اب بنارس میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنا یہ واقعہ سنایا کہ دورانِ جنگ ۱۸-۱۹۱۴ء میں لفٹنٹ گورنر سر جیمس مسٹن نے ان سے پوچھا کہ ''اگر قیصر جرمنی ہندوستان آجائے تو آپ کیا کریں گے؟'' تو شہزادہ صاحب نے برجستہ کہا کہ ''حضور ایڈریس پیش کریں گے، اس واسطے کہ اس کے سوا ہمیں آتا ہی کیا ہے۔''

مسٹر مونٹیگ وزیر ہند اور لارڈ چیمسفورڈ ویسرائے دونوں ہمارے وفد سے ملے تھے۔ میرے تاثرات یہ تھے کہ وزیر ہند حقیقتاً اس کے خواہش مند ہیں کہ ہندوستانیوں کو حقوق دیئے جائیں وہ بڑی زبردست شخصیت کے مالک اور نہایت ذہین تھے۔ ویسرائے وزیر ہند کی رائے سے کلیتہً متاثر تھے اور ان کا وجود اس سلسلے میں برائے نام تھا۔

۱۹۲۰ء کی اصلاحات اور کانگریس:

۱۹۲۰ء میں اصلاحات کے تحت انتخابات کی گرما گرمی شروع ہوئی کانگریس نے اصلاحات میں حصہ لینے سے احتراز کیا اور مسلم لیگ اس زمانہ میں ایسی حالت میں نہ تھی کہ انتخابات میں کامیاب حصہ لے سکتی۔ خلافت کمیٹی نے کانگریس کی حمایت میں اصلاحات میں حصہ لینے سے انکار کیا اور جو حصہ لینا چاہتے تھے انھیں ٹوڈی اور انگریزوں کا غلام کہا گیا۔ میں نے اس سال کی فروری میں نواب جمشید علی خاں سے یہ طے کیا کہ ہم لوگ ضرور کھڑے ہوں گے وہ میرٹھ سے اور میں بلند شہر سے کھڑا ہوا میرے اس نتیجہ پر پہنچنے میں کہ انتخابات کے واسطے کھڑا ہونا ہی چاہیے۔ سر جگدلیش سے بڑی مدد ملی ورنہ مجھے خود بھی تذبذب تھا۔ مجھے یاد ہے کہ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم سے جب میں نے اس کا ذکر کیا تو مرحوم نے یہ فرمایا کہ ''میں ایسی خچر پنچایت میں شرکت نہیں کرتا۔'' بہر حال میں بلند شہر سے کھڑا ہوا۔ وہاں کی برہمن پارٹی نے ایک شخص کو میرے مقابل کھڑا کیا لیکن وہ درحقیقت پریشان کرنا تھا۔ پیر جی سید محب علی شاہ مرحوم اور راؤ اصغر علی خاں نے کوشش کر کے اس کا نام واپس کرا دیا اور میں بغیر مقابلہ ہو گیا۔

مجلس مقننہ میں میری پہلی تقریر:

اصلاحات کے تحت مقننہ کا پہلا جلسہ ہوا۔ جلسہ کی تاریخ مقرر ہوئی تو مجھے یہ فکر ہوئی کہ پہلی تقریر کیا ہو؟ میں نے ایک انگریزی کی تقریر لکھی وہ تقریر کیا تھی ایک چھوٹا سا وعظ تھا جس میں ممبروں کے فرائض بتائے گئے تھے مگر خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں مسٹر فورڈ (جو ملازمت سے سے پینشن پر سبکدوش ہو چکے تھے ہندوستان آئے ہوئے تھے) وہ مجھ سے ملنے چھتاری آئے میں نے انھیں اپنی تقریر دکھائی انھوں نے ہنس کر کہا کہ پارلیمنٹی جماعتوں میں اس قسم کی تقریر نہیں کیا کرتے بلکہ جو مسئلہ زیرِ بحث ہو اسی پر تقریر ہوتی ہے۔ میں اس حماقت سے باز رہا۔ اور اس کے بعد میں نے مسٹر گوکھلے کی تقاریر کا مجموعہ منگا کر پڑھنا شروع کیا۔ یوں تو میں نے ۱۹۱۳ء ہی سے انگریزی زبان سیکھنے کے واسطے کتب بینی شروع کردی تھی مگر زیادہ تر ناول یا اخبار پڑھا کرتا تھا اور اسی زمانہ کی یہ عادت کچھ راسخ ہوئی کہ میرے پلنگ پر کوئی نہ کوئی کتاب ضرور رہتی ہے۔ ابتداء میں ناول اور سوانح پڑھتا تھا کونسل کی ممبری کے بعد سے تقاریر اور تذکرے پڑھنا شروع کئے۔ اسی کے ساتھ گورنمنٹ کے مختلف انتظامی صیغہ جات پر کتابیں پڑھنا شروع کیں مجھے سب سے زیادہ فائدہ مسٹر گوکھلے کی تقاریر سے پہنچا۔ میرا یہ یقین ہے کہ گوکھلے اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب ہندوستان اتنا بیدار نہ تھا اس لئے قائدین کی فہرست میں شاید ان کا پایہ تخت اتنا بلند نہ سمجھا جائے جتنا کہ موجوہ قائدین کا۔ لیکن ان کی تقاریر کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس پایہ کے آدمی تھے۔ آجکل ہم لوگ فقط اعتراض کرتے ہیں مسٹر گوکھلے یہ بھی بتاتے تھے کہ صحیح راستہ کیا ہے؟ ان کی تقاریر میں تعمیری پہلو بہت ہوتا تھا وہ انتظامی مشکلات کو سامنے رکھ کر رہنمائی کرتے تھے اور فقط عوام الناس کو مشتعل کر کے اپنی طرف لانا ان کا مقصد نہ ہوتا تھا۔

ارکان حکومت کی نمایاں شخصیتیں:

آخر کار وہ روز آیا کہ میں پہلی کونسل میں حلف وفاداری کے واسطے بلایا گیا۔ سر ہارکورٹ بٹلر گورنر تھے۔ حسب ذیل حضرات کو گورنمنٹ کا ممبر مقرر گیا تھا۔ سر لوڈ

وک پورٹر ممبر فنانس، راجہ صاحب محمود آباد ہوم ممبر، پنڈت جگت نارائن وزیر لوکل سلیف گورنمنٹ، مسٹر سی وائی چنتامنی وزیر تعلیمات وصنعت وحرفت۔ آخر الذکر حضرات لبرل پارٹی کے ممبر تھے گو لبرل ممبروں کی اکثریت نہ تھی۔ کانگریس نے انتخابات کی شرکت سے گریز کیا۔ اس وجہ سے زیادہ لوگ زمیندار آئے تھے جو کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہ تھے لیکن سر ہارکورٹ نے ایک تعلقہ دار کو ہوم ممبر مقرر کیا اور لبرل پارٹی کی وزارت مقرر کی۔

سر ہارکورٹ بٹلر:

سر ہارکورٹ بٹلر اپنے زمانہ کے قابل ترین آئی۔سی ایس، افسروں میں سے تھے وہ فائل پر طویل نوٹ نہیں لکھتے تھے۔ ان میں انسانی کمزوریاں بھی تھیں مگر انسانی خوبیاں غالب تھیں ہمدرد اور نہایت فیاض مزاج۔ لکھنؤ سے انھیں بڑی محبت تھی اور زمیندار طبقہ سے بالخصوص انھیں الفت تھی مجھ پر بہت عنایت کرتے تھے۔ ان کا مزاج بڑا رئیسانہ تھا۔ سر لوڈوک پورٹر اوسط درجہ کی قابلیت کے آئی سی ایس تھے۔ مزاج بہت رئیسانہ نہایت شاہ خرچ دوست کے بڑے سچے دوست تھے۔ مزاج بہت صلح پسند تھا۔ اور گورنر کے بڑے وفادار تھے مجھ سے اور نواب صاحب باغپت سے انھیں خاص تعلق تھا۔ مقرر اچھے نہ تھے مگر ان کی سیدھی سادی باتیں کونسل کو بہت پسند تھیں۔

راجہ صاحب محمود آباد:

راجہ صاحب محمود آباد سے اس صوبہ میں کون واقف نہ ہوگا۔ بڑی زبردست شخصیت تھی بے انتہا فیاض کسی بات کا ارادہ کر لیتے تھے تو کر کے ہی مانتے تھے۔ انگریزی کمزوری تھی مگر اردو کی تقریر مؤثر ہوتی تھی۔ مجھے انکی خدمت میں خاندانی طور پر اور ذاتی طور پر بھی نیاز حاصل تھا۔

پنڈت جگت نرائن:

پنڈت جگت نرائن بہت سیدھے اور سچے آدمی تھے۔ مزاج تیز تھا حکمت عملی سے کوسوں دور تھے۔ معمولی تقریر کرتے تھے مجھے وزارت کے بعد ان سے تعارف کا موقع ملا۔

مسٹر چنتامنی:

مسٹر سی. وائی. چنتامنی اس گورنمنٹ میں سب سے قابل شخص تھے تقریر بڑی زبردست ہوتی تھی۔ گو تلفظ مدراسی تھا مگر انگریزی زبان پر بڑا عبور تھا حکمت عملی اور سوجھ بوجھ اچھی تھی۔ کونسل میں ان کی تقاریر سننے کے قابل ہوتی تھیں۔ مسٹر چنتامنی میں ایک بڑی صفت تھی جو بہت کم لوگوں میں دیکھی گئی ہے۔ ان سے اگر بصیغہ راز کوئی بات کہی جائے تو چاہے اس کا اظہار کسی معاملہ کے واسطے کتنا ہی مفید ہو۔ وہ ہرگز اس پرائیویٹ علم سے پبلک میں فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔ ان کی وزارت سے پہلے مجھے ان سے تعارف نہ تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ میں اور وہ ہمیشہ مخالف پارٹی میں رہے مجھ سے بہت اخلاص برتتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے۔

کنور جگدیش پرشاد:

کنور جگدیش پرشاد یوپی گورنمنٹ میں غالباً دوسرے ہندوستانی تھے جو سکریٹری ہوئے تھے۔ ان سے پہلے چٹرجی بھی سکریٹری ہوئے تھے۔ یہ نہایت دور بین اور سمجھدار شخص ہیں۔ انتظامی قابلیت غیر معمولی ہے۔ میرے ان کے خاص تعلقات ہیں۔

تقریر بہت اچھی کرتے ہیں۔ اور ان کے نوٹ بہت مکمل ہوتے تھے۔ مزاج ذرا تیز ہے۔ میں طبعاً ٹھنڈے مزاج واقع ہوا ہوں اس واسطے گورنمنٹ کا ممبر میں جب تک رہا ہم ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے رہے۔

مونٹ فورڈ:

اصلاحات کے زمانہ میں یوپی گورنمنٹ میں ان کا بڑا اثر رہا۔ جس روز میں کونسل کے کمرہ میں داخل ہوا تو میں نے بہت غور سے ممبران گورنمنٹ کو دیکھا۔ مسٹر چنتامنی کرسی پر ایک کتاب لئے بیٹھے تھے میں نے ان حضرات کو بالکل اس نظر سے دیکھا کہ یہ لوگ گویا مافوق الفطرت خاص کر چنتامنی کو تو میں نے یہ سمجھا کہ اس صوبہ کے قابل ترین شخص کو دیکھ رہا ہوں میں خود مخالف سمت میں پچھلی کرسیوں پر جا بیٹھا۔ کونسل کا جلسہ اس ہال میں ہوتا تھا جہاں اب موسیقی کا مدرسہ ہے۔ میری پبلک زندگی

کی یہ شروعات تھی نواب سر جمشید علی خاں میرے دست راست تھے اور خدا انھیں زندہ رکھے آج تک ہیں۔

وزیروں کی تنخواہوں کا مسئلہ:

سب سے پہلا مسئلہ جس میں اختلاف آراء کا جوش و خروش تھا۔ وزراء کی تنخواہ کے متعلق کونسل میں آیا۔ وزراء اور گورنر چاہتے تھے کہ ان کی تنخواہیں پانچ ہزار ہوں جو کونسلر کی تنخواہیں تھیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس سے اختلاف تھا جب میں وزیر ہوا تو میں نے اور راجہ پرمانند آنجہانی نے اپنی تنخواہیں کم کردیں۔ کنور جگدیش پرشاد نے سب سے پہلے مجھ سے پوچھا کہ میری کیا رائے ہے اور جب معلوم ہوا کہ مجھے اتنی بڑی تنخواہ سے اختلاف ہے تو پھر دلائل کا سلسلہ شروع ہوا۔ سر لوڈوک پورٹر نے بھی بہت زور دیا کہ کنور صاحب نے لیجا کر مجھے وزراء سے ملایا۔ گو وزراء نے اپنی تنخواہ کے متعلق کچھ نہ کہا۔ آخرکار میں نے مان لیا کہ میں مخالفت نہ کروں گا۔ میں نے موافقت میں تقریر بھی کی۔ میری یہ تقریر اردو میں تھی۔ تقریر کے خاتمے پر مجھے بے انتہا تشنگی تھی جو غالباً گھبراہٹ کی وجہ سے تھی۔

سر مائیکل کا مشورہ:

سر مائیکل کین صدارت کر رہے تھے۔ میری تقریر کے ختم ہونے کے کچھ بعد سر مائیکل اپنے کمرہ میں چلے گئے اور وہاں جا کر مجھے بلوایا۔ جب میں گیا تو مجھے مبارکباد دی کہ تمہاری پہلی تقریر بہت اچھی تھی۔ لیکن آئندہ تمہیں انگریزی میں تقریر کرنی ہوگی میں نے عذر کیا اور انگریزی زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار مجبوری کیا مگر انھوں نے اصرار کیا اور کہا کہ میں تم کو اردو میں بولنے کی اجازت نہ دوں گا۔ تم اپنی تقریر انگریزی میں تیار کرلیا کرو۔ قانوناً وہ مجھے مجبور نہ کرسکتے تھے۔ لیکن دوستانہ دباؤ مجھے اکثر مجبور کردیتا تھا۔ چنانچہ میں نے انگریزی میں بولنا شروع کردیا۔ جب ۱۹۲۳ء میں مجھے گورنر نے وزیر مقرر کیا ہے تو سر مائیکل نے اپنے مبارکباد کے خط میں مجھے لکھا کہ یہ وجہ تھی کہ درآں حالیکہ اوروں کو اردو میں تقریر کی اجازت تھی مجھے کیوں اجازت نہ دیتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ انھیں اس کا یقین تھا کہ میں کبھی

گورنمنٹ کا ایک رکن بنوں گا اور اس وجہ سے انگریزی میں تقریر کی عادت ضروری تھی۔ مجھ پر ان کے اس خط کا بہت اثر ہوا۔

مسٹر چنتامنی کی نظر انتخاب:

کونسل میں آنے کے کچھ روز بعد میجر رنجیت سنگھ مرحوم (مرحوم قصداً لکھتا ہوں) نے مجھ سے کہا کہ مسٹر چنتامنی چاہتے ہیں کہ میں ان کا پارلیمنٹری سکریٹری ہو جاؤں اس حد تک تو مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ مسٹر چنتامنی کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی لیکن اس کے قبول کرنے میں مجھ پس و پیش تھا۔ میں نے کنور سر جگدیش پرشاد سے مشورہ کیا انھوں نے رائے دی کہ سر ہار کورٹ سے مشورہ کرلو۔

چنانچہ ایسا ہی کیا۔ سر ہار کورٹ نے کہا کہ ابھی تو تم نئے ممبر ہو۔ اپنی آزادی رائے اور تقریر کو کیوں پابند کرتے ہو تذبذب تو مجھے پہلے ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے میجر رنجیت سنگھ سے کہدیا کہ ابھی تو مجھے معاف رکھا جائے وزیر صاحب سے میرا شکریہ ادا کر دینا۔ گو میں نے عہدہ قبول نہیں کیا لیکن مسٹر چنتامنی کے اس ارادہ نے میرے دل میں ان کی محبت بڑھا دی۔

پرانی کونسل اور موجودہ اسمبلی میں امتیاز:

اس کونسل اور آج کل کی اسمبلی میں جہاں اور باتیں مابہ الامتیاز ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس کونسل میں زیادہ تر وہی حضرات تھے جو اپنے اضلاع میں درحقیقت با اثر تھے۔ اور ان کا اثر کسی سیاسی جماعت یا جماعتی تنظیم یا پروپیگنڈے کا مرہون منت نہ تھا۔ بلکہ خود ممبروں اور ان کے بزرگوں کے کردار، اخلاق اور انسانی ہمدردی سے پیدا ہوا تھا یا ذاتی قابلیت اور اہلیت کے اعتبار سے انھیں سب سے ممتاز حیثیت دی جاتی تھی۔

اس کونسل میں ایسی ممتاز ہستیاں موجود تھیں جیسے مسٹر سی وائی چنتامنی، پنڈت جگت نرائن، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، سر سیتارام منشی نرائن پرشاد سنہا، پنڈت گوکرن ناتھ مصرا، سید آل نبی مسٹر جسٹس اسماعیل پنڈت اقبال نرائن گرٹو، سید رضا علی نواب جمشید علی خاں یہ سب حضرات ایسے تھے کہ جو ملک کی سیاسی خدمت کر چکے تھے اور پبلک لائف میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ باقی ممبران بھی اپنے اپنے اضلاع میں

اہم درجہ رکھتے تھے۔ مباحث کا معیار بہت اونچا تھا۔ تقاریر ہر اعتبار سے پر مغز اور مدلل ہوتی تھیں لیکن اب حالت یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کی کونسل میں تو بیس بائیس حضرات ناخواندہ تھے۔ اور موجودہ کونسل کا مجھے ذاتی علم تو کچھ نہیں لیکن سننے میں یہی آیا ہے کہ مباحثہ کا معیار گر گیا ہے ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں ایک روز پنڈت گوبند بلب پنتھ سے ملنے گیا تو وہ خود اس کے شاکی تھے کہ، مباحثہ کا معیار بہت گر گیا ہے اور فرمانے لگے کہ اب تو دونوں جانب سے گالیاں دی جاتی ہیں۔ پارٹی بندی میں اس سے مفر نہیں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں یہ نقص ضرور ہے کہ بسا اوقات بہترین لوگ نہیں آسکتے۔ پہلے ذاتی اثر سے کام چلتا تھا اور ذاتی اثر کے واسطے ایک حد تک کردار اور اچھے اطوار کی بہت ضرورت ہے بعض موقعوں پر دولت کی وجہ سے بھی انتخاب جیتا گیا۔ لیکن باوجود دولت مندی کے لوگ انتخاب میں ہارے بھی ہیں۔

انتخاب کا معیار:

اب انتخابات کا تمامتر انحصار سیاسی نعروں پر ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ منتخب کون ہو رہا ہے۔ ممبر کے ذاتی کردار قابلیت یا اہلیت سے سروکار نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ ہر سیاسی جماعت اس کی مدعی ہے کہ افراد کو آزادی تقریر، آزادی ضمیر، اور آزادی عمل اس درجہ تک کہ جس سے دوسرے کی آزادی میں خلل نہ ہو حاصل ہونی چاہیے لیکن اس پر یہ جماعتیں خود عامل نہیں ہیں۔ کسی پارٹی کے ممبر کی یہ مجال نہیں کہ لیڈر کی رائے کے خلاف لب کشائی کرے۔ اگر کسی نے اس کی جرأت کی تو پھر پارٹی تنظیم پوری طاقت سے اسے پامال کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ مجھ سے بارہا مخالف پارٹی کے اپنی اس معذوری اور مجبوری کا اظہار کیا ہے اس طرح کے طور طریقوں کو میں جمہوری نہیں سمجھتا۔ یہ تو آمریت ہوئی۔

تقریر کی تیاری:

میں تقریر کا نہ عادی تھا نہ شائق اس کی نوبت آتی تھی تو میں پہلے سے اپنی تقاریر اور اعداد و شمار تیار کر لیتا تھا۔ اس میں مجھے مولوی غلام مصطفیٰ صاحب سے (جو میرے پرائیویٹ سکریٹری تھے) بڑی مدد ملتی تھی میں سول ملٹری ہوٹل میں (جسے اب

برلنگٹن ہوٹل کہتے ہیں) ٹھہرا کرتا تھا نواب جمشید علی خاں بھی وہیں ٹھہرتے تھے اور چائے اور ڈنر پر وہیں ممبروں کو مدعو کرتا۔ کونسل کے مسائل پر مباحثہ اور مشاورت ہوتی تھی۔ زمیندار پارٹی کی ابتداء بھی یہیں سے ہوئی۔

سر ہار کورٹ کے ڈنر کا ایک دلچسپ واقعہ:

پہلا بجٹ پاس ہونے کے بعد سر ہار کورٹ نے کونسل کے ممبران کو ایک ڈنر دیا۔ میجر رنجیت سنگھ مرحوم اور مجھے تقریر کرنے کے لئے پہلے سے مامور کر دیا گیا تھا۔ ہم نے مناسب تقاریر کیں۔ اس کے بعد ایک ممبر (مسعود الزماں) خود کھڑے ہوگئے اور اپنی انگریزی کی تقریر میں انھوں نے کونسل اور گورنر کی تشبیہ ناچ کے ساتھیوں سے دی۔ یہاں تک بھی سر ہار کورٹ نے برداشت کیا لیکن جب انھوں نے گورنر کی ستائش میں انھیں شمپین کی بوتل سے تشبیہ دی تو سر ہار کورٹ نے بالکنی کی طرف دیکھ کر بینڈ ماسٹر کو اشارہ کیا۔ ان کی باقی تقریر بینڈ کی آواز میں غائب ہوگئی۔

میری تقریر:

میں نے وزراء کی تنخواہ کے علاوہ ایک مختصر تقریر بجٹ پر کی جس میں محکمۂ صنعت وحرفت کے واسطے زیادہ روپیہ دینے پر زور دیا۔ میں اکثر کمیٹیوں کا ممبر تھا اور بڑے شوق ومحنت سے کام کرتا تھا۔ میں نے اسی سال ایک رزولیوشن بھی پیش کیا جس کا منشا یہ تھا کہ پٹواریوں کو قابل تبادلہ کر دیا جائے۔ گورنمنٹ نے اسے اس حد تک مان لیا کہ کلکٹر کو اختیار دیا جائے کہ وہ چاہے تو تبادلہ کر دے۔

ارکانِ حکومت کے باہمی تعلقات:

شروع شروع میں وزراء کے تعلقات گورنر سے بڑے خوشگوار تھے وہ اپنی پبلک تقاریر میں گورنر کی تعریف کرتے تھے اور گورنر کونسل کے معاملات اور ان کی تنخواہ متعین کرنے میں ممبران کو وزراء، کا ساتھ دینے کی ترغیب دیتے تھے اس سلسلہ میں سر ہار کورٹ نے میرا شکریہ متعدد بار ادا کیا کہ وزراء کے پیش کردہ قوانین کے پاس کرانے میں ان کا معین ہوا۔ بایں ہمہ مجھے اس کا احساس بھی ہونے لگا تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد ہوم ممبر اور مسٹر چنتا منی کے تعلقات شگفتہ نہ تھے اور در پردہ ایک

دوسرے کی دشواریاں بڑھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

کاشتکاروں کی تحریک:

اسی سال اودھ کے بعض اضلاع مثلاً رائے بریلی پرتاپ گڈھ فیض آباد اور سلطان پور میں کاشتکاروں کی ایک تحریک رونما ہوئی جس نے اس قدر طاقت اختیار کی کہ اکثر تعلقہ دار اپنے تعلقہ سے بھاگ کر لکھنؤ آ گئے۔ اور منشی گنج ضلع رائے بریلی میں پولیس کو گولیاں چلانا پڑیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کی تحریک نے اودھ میں سر اٹھایا اور تعلقہ دار صاحبان گورنر کے پاس آ کر مدد کے طالب ہوئے سر ہار کورٹ کو اس سے تعلقہ دار طبقہ کی طرف سے بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ لوگ اپنے کاشتکاروں کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف حکومت نے مضبوط ہاتھوں سے اس فتنہ کو دبایا دوسری طرف اودھ کے قانون میں تبدیلی کی گئی جس میں کاشتکاروں کو حین حیاتی حق زمین پر دیا گیا۔

کونسل چیمبر کی تعمیر کا مسئلہ:

ایک زمانہ سے الٰہ آباد اور لکھنؤ میں یہ رقابت چلی آ رہی تھی کہ کونسل چیمبر کی تعمیر کہاں ہو؟ ۲۲، ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ نے ڈیڑھ لاکھ کی رقم اس کی تیاری کے سلسلے میں ضمنی میزانیہ میں رکھی۔ گورنر کے پاس حامیانِ الٰہ آباد کا ڈیپوٹیشن گیا جس کا یہ معقول جواب دیا گیا کہ یہ کونسل کو اختیار ہے کہ وہ چیمبر جہاں مناسب سمجھے بنائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ گورنر اور گورنمنٹ سوائے مسٹر چنتامنی کے سب یہ چاہتے تھے کہ چیمبر لکھنؤ میں تعمیر ہو۔ اس سلسلے میں ہندو محسوسات کو جگایا گیا کہ الٰہ آباد ایک مذہبی مقدس مقام ہے اور اس تجویز کا نتیجہ الٰہ آباد کی بربادی ہوگا۔ میں لکھنؤ کا طرفدار تھا میں نے اس مباحثہ میں ایک تقریر کی تھی۔ الٰہ آباد کے ایک طرفدار نے یہ کہا تھا کہ نصف گورنمنٹ لکھنؤ کی ہے۔ اشارہ راجہ محمود آباد اور پنڈت جگت نرائن کی طرف تھا۔ میں نے جواباً یہ کہا کہ:

"In like manner the other half is the Government of England because the Governer and H.F.M// are English. I do Know.... what part of the Government it would be which

would ve called Allahabad-cum Madras.

''اسی طرح دوسری نصف انگلینڈ کی گورنمنٹ ہے کیوں کہ گورنر اور فنانس ممبر انگریز ہیں میں یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ گورنمنٹ کا کونسا حصہ الہ آبادی کم مدراسی ہوگا''؟

کونسل کا فیصلہ کثرت رائے سے لکھنؤ ہی کے حق میں ہوا۔ باایں ہمہ یہ قضیہ ختم نہ ہوا جب تک کہ کونسل چیمبر کی نیو لکھنؤ میں رکھدی گئی۔ گورنمنٹ نے اگست ۱۹۲۱ء میں اودھ کے لگان کی ترمیم پیش کی گو تعلقہ دار قلباً اسے پسند نہ کرتے تھے لیکن سرہارکررٹ کا اثر اس طبقہ پر اتنا تھا کہ تعلقہ داران نے اسے مان لیا۔ چوں کہ تعلقہ دار موروثی حق کے خلاف تھے اس واسطے حین حیاتی حق کاشتکاروں کو دیا گیا۔ گو سرکاری طور پر یہ بات پردۂ خفا ہی میں رہی لیکن مجھے معلوم ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے ایسا اشارہ ہوا تھا کہ کیوں نہ کاشتکاروں کو موروثی حقوق دیئے جائیں سرہارکورٹ بٹلر نے نہ صرف اس سے اختلاف کیا بلکہ اس کی دھمکی بھی دی کہ اگر انھیں اس پر مجبور کیا گیا تو وہ گورنری سے مستعفی ہو جائیں گے۔

زمینداروں اور تعلقہ داروں کی ذہنیت:

مجھے اس کا احساس اس زمانہ میں ہوا جو بعد کے تجربوں کی روشنی میں یقین سے بدل گیا کہ زمینداروں میں بالعموم اور تعلقہ دار صاحبان میں بالخصوص یہ کمزوری ہے کہ زمانہ کی نبض پہچاننے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ اس کا فیصلہ بھی نہیں کرپاتے کہ کس قدر حصہ اپنے حقوق کا قربان کر دیا جائے اور کیا بچا لیا جائے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اگر صلح نہیں کرسکتے تو لڑیں لیکن ان سے یہ بھی نہیں ہوسکتا میرا طرز عمل یہ رہا کہ میں اپنی تقاریر اور پرائیویٹ جلسوں میں تو تعلقہ دار صاحبان کو اس کی ترغیب دیتا تھا کہ کاشتکاروں کو حقوق فیاضی سے دیئے جائیں لیکن کونسل میں رائے ہمیشہ ان کے ساتھ دی اور اس زمانہ میں برابر کونسل میں حاضر رہا۔

ڈسٹرکٹ بورڈ بل:

اسی سال ۳ر دسمبر کو پنڈت جگن نرائن نے (D.B Bill) ڈسٹرکٹ بورڈ بل

کونسل میں پیش کردیا زمینداروں کو اس سے مخالفت اس وجہ سے تھی کہ یہ قانون ڈسٹرکٹ بورڈ کو یہ اختیار دیتا تھا کہ زمیندار پر ابواب میں اضافہ کیا جاسکے راجہ صاحب جہاں گیرآباد کے یہاں جلسہ ہوا اور اس میں زمینداروں نے بڑے بڑے منصوبے اس کو مسترد کرنے کے بنائے۔ گورنر اور وزراء کے درمیان ہنی مون کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور کم ازکم مجھے معلوم تھا کہ گورنر غیر جانبدار سے ہیں خود گورنمنٹ میں بھی اس مسئلہ خاص پر اتفاق نہ تھا۔

گورنمنٹ کے ایک ممبر کا خط:

میرے پرانے کاغذات میں ایک خط میری نظر سے گذرا جو اس زمانہ کے ممبر گورنمنٹ نے مجھے لکھا تھا اس میں کوئی تاریخ تو درج نہیں ہے لیکن مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں تاریخوں کا ہے جب کونسل چیمبر کے لکھنؤ میں بننے کا سوال اور ڈسٹرکٹ بورڈ بل کونسل کے سامنے تھا۔

MY DEAR NAWAB SAHIB,

The D.B. bill can be postponed if any non-offical member moves in the Legislative Council for the postponement. Now you may better try to secure as many votes in favour of Council Chamber question as you can.... it is quite clear that you cannot get these two points without the majority of votes on you side. I am sure the Government votes will go with you on the D.B bill if you promise to secure votes on Council Chamber question.

محبی نواب صاحب!

''ڈسٹرکٹ بورڈ بل ملتوی ہوسکتا ہے اگر کوئی غیر سرکاری ممبر لیجسلیٹیو کونسل میں اس کے التواء کی تحریک کردے۔ اندریں حالات یہ بہتر ہوگا کہ آپ کونسل چیمبر کے مسئلہ پر زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کریں کیوں کہ یہ بالکل واضح ہے کہ اپنی طرف سے ووٹوں کی اکثریت کے بغیر آپ دونوں مسئلوں میں کامیابی حاصل کرسکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو ڈسٹرکٹ بورڈ کے معاملہ سرکاری ووٹ مل جائیں گے۔ اگر آپ کونسل چیمبر کے مسئلہ میں ووٹ حاصل کرنے کا وعدہ کریں۔''

ڈسٹرکٹ بورڈ:

میں نے پہلی ریڈنگ میں ایک طویل تقریر اپنی عادت کے خلاف کی میں نے اس کی مخالفت کی کہ عورتوں کو حق رائے دیا جائے میری رائے یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کو یہ اختیار ہو کہ وہ جب چاہیں عورتوں کو یہ حق دے دیں مگر ہم اسے لازمی نہ کریں۔ مگر اب میرا یہ خیال ہے کہ میرے اندیشے غلط تھے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔

دوسری بات جس پر میں نے زور دیا تھا وہ بالکل وہی ہے جس پر آج کانگریس اور مسلم لیگ میں اس درجہ ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے یعنی اگر کوئی مسئلہ کسی ایک کمیونٹی پر اثر انداز ہو اور اس کمیٹی کے تین چوتھائی ممبر اس کے مخالف ہوں تو اسے پیش نہ کیا جائے۔ میں نے اس سلسلہ میں یہ بھی کہا تھا۔

"I may assure the house that the proposal will serve a very useful purpose of bringing home to the two communities that their salvation lies is mutual confidence and co-operation and that without mutual co-operation they cannot live in this country."

''میں ہاؤس کو یقین دلاتا ہوں کہ اس تجویز سے یہ فائدہ ہوگا کہ دونوں قوموں کو اس امر کا بخوبی احساس ہو جائے گا کہ باہمی اعتماد و عمل میں ان کی نجات ہے اور باہمی اتحاد و عمل کے بغیر وہ اس ملک میں نہیں رہ سکتے۔

میں نے مہاتما گاندھی کی تقریر کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے کہا تھا۔

"Without Muslim conciliation swaraj is inconceivable."

''کہ مسلمانوں کو رضا کے بغیر سوراج کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

تیسرے میں نے اس سے اتفاق کیا تھا کہ بورڈ کو ٹیکس لگانے کا اختیار ہو لیکن اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا تھا کہ ہندوستان کا افلاس مزید ٹیکس برداشت نہیں کر سکتا یہ بل مجلس منتخبہ کو بھیج دیا گیا۔

لکھنؤ میں پرنس آف ویلز کی آمد:

۹ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز لکھنؤ آئے اور کونسل چیمبر

میں تشریف فرما ہوئے ستیاگرہ کی تحریک جو ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی تھی اس نے عام بے چینی پیدا کردی تھی۔ اس لئے ارباب حل وعقد کو یہ خیال ہوا کہ اگر پرنس اس موقعہ پر ہندوستان آئیں تو ہندوستان کی روایات کے مطابق لوگوں میں وفاداری کا جوش ہوگا اور سیاسی بے چینی کا خاتمہ کردے گا لیکن نتیجہ بالکل خلاف توقع ہوا بمبئی میں اس درجہ طوفان برپا ہوا کہ بہت سے لوگوں کی جانیں گئیں اور پولیس کو گولیاں چلانی پڑیں۔

اب لکھنؤ اور الٰہ آباد کا نمبر آیا۔ سرہارکورٹ نے لکھنؤ کے واسطے خاص اہتمام کیا تاکہ پرنس اور گورنمنٹ آف انڈیا کو یہ نہ معلوم ہو کہ اہل لکھنؤ بھی اس تحریک میں شریک ہیں چنانچہ تعلقہ داروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے کاشتکاروں کو لاریوں میں بھر بھر کر لکھنؤ پہنچائیں اور یہی ہوا لکھنؤ کی سڑک پر دورویہ کافی لوگ موجود تھے۔ گویہ لوگ لکھنؤ کے نہ تھے تعلقہ دار صاحبان نے بھی بارہ دری میں بڑا شاندار جلسہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خیال کیا گیا کہ اہل لکھنؤ وفا شعار ہیں لیکن الٰہ آباد کے متعلق کوئی ایسا اہتمام نہیں کیا گیا تھا وہاں کے لوگوں کو گورنمنٹ کی نظر میں مخالفین کے طبقہ میں تصور کیا گیا۔ میں دونوں جگہ موجود تھا اور الٰہ آباد میں پرنس سے گفتگو کا بھی موقع ملا یہ بہت سادہ مزاج شہزادے تھے اور اگر بادشاہ رہے تو بہت اچھے بادشاہ ہوتے ان میں ایک خاص کشش تھی جو لوگوں کو انکی طرف متوجہ کرتی تھی۔

چنتامنی کی ہجو:

چنتامنی کی وزارت کے موقع پر کسی صاحب نے ایک مسدس کا بند لکھا تھا کہ جو مجھے خان بہادر عنایت علی خاں مرحوم نے سنایا۔ مجھے وہ اس درجہ دلچسپ معلوم ہوا کہ میں نے سر ہارکورٹ کو سنایا اور اس کا ترجمہ کرکے سمجھایا سرہارکورٹ بہت ہنسے وہ مسدس یہ تھا۔

کیا بٹلر نے مدراسی پر احساں — وزارت کا دیا اس کو قلمداں
وہ دھوکا کھا گیا، آخر تھا انسان — نہیں اس نے سنا سعدی فرماں
نکوئی بابداں کردن چناں است — کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

عنایت خاں مرحوم کی شخصیت بڑی دلچسپ تھی۔ تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی لیکن علم مجلس میں طاق، بڑے لطیفہ گو، بذلہ سنج اور باغ و بہار انسان تھے تاؤ میں آجاتے تو پیچ

اونچ نہ دیکھتے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کی چیرمینی کے انتخاب میں اتنے لٹھ بند ساتھ لے گئے کہ ان کے حریف کو کھڑے ہونے تک کی جرأت نہ ہوئی۔

پچھلے زمانہ کی سیاست اور کانگریس کا نقطۂ نظر:

اس زمانہ کی سیاسیات کا رنگ موجودہ رنگ سے بالکل مختلف تھا۔ برٹش گورنمنٹ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی تھی اور بین الاقوامی تعلقات اور دنیا کے سیاسی حالات نے انھیں اس پر مجبور نہیں کیا تھا کہ ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں جہاں تک مجھے یاد ہے خود کانگریس کا نقطۂ نظر بھی اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ برطانوی سایہ سلطنت میں ہندوستان کو خود مختاری مل جائے۔ ستیا گرہ نے توقع سے زیادہ زور پکڑا۔ جو لوگ اس سے علیحدہ تھے ان پر بری طرح سے دباؤ ڈالا جاتا تھا اور سوشل بائیکاٹ کیا جاتا کہیں کہیں تو مردہ کے دفن میں بھی رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ مثلاً خان بہادر مولوی عبدالاحد دہلوی کے انتقال کے سلسلے میں نتیجہ یہ ہوا کہ یوپی کی حکومت نے کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ اس صوبہ میں نافذ کیا تا کہ اس شورش کو پھیلنے سے روکا جائے۔ اور جو لوگ اس میں شریک نہ ہونا چاہیں ان کو مدد دی جا سکے۔ اس سے صوبہ میں بڑی ہلچل ہوئی۔ ظفر حسین صاحب نے (جو کانپور کے ممبر تھے) ایک رزولیوشن بھیجا کہ اسے فوراً ہٹا لیا جائے مجھے دسمبر کے مہینہ میں کنور سر جگدیش پرشاد کا خط یا تار ملا کہ وہ چھتاری تشریف لائیں گے جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں میرے تعلقات ان سے بہت ہی مخلصانہ تھے اور ہیں مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی۔ کھانے کے فوراً بعد دوران گفتگو وہیں کونسل کے اس رزولیوشن کا حال معلوم ہوا۔ گورنمنٹ قدرتاً یہ چاہتی تھی کہ یہ رزولیوشن کامیاب نہ ہو۔ لیکن اس زمانہ کی سیاسی فضا ایسی تھی کہ کسی کو ایسے رزولیوشن کی مخالفت کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اُس زمانہ میں ہندو مسلمانوں میں اتنی کبیدگی نہ تھی اور اس خواہش میں ہر شخص شریک تھا کہ برٹش گورنمنٹ کے خلاف شورش ہو۔ بہت سے لوگ ستیا گرہ کے حامی نہ تھے۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس سے نظم و نسق اس درجہ درہم برہم ہو سکتا تھا کہ لوگوں کی عزت آبرو، جان و مال خطرے میں پڑ جائے۔ ایسے واقعات جا بجا ہو بھی رہے تھے، میں نے اور کنور صاحب نے یہ

فیصلہ کیا اس رزولیوشن کو ناکام بنانا تو ٹھیک نہ ہوگا۔ لیکن اس میں ایسی ترمیم کی جائے جو اس وقت حکومت کو فوراً کرمنل لا امنڈمنیٹ ایکٹ کو ہٹانے پر مجبور نہ کردے بلکہ یہ سفارش ہو کہ جہاں نظم ونسق کو خطرہ نہ ہو وہاں سے ہٹالیا جائے۔ چنانچہ ٹھاکر مشعل سنگھ نے مجوزہ ترمیم کی پیش کی اور میں نے ایک طویل تقریر میں اس کی تائید کی۔ میری تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ حکومت کا مقصد نظم ونسق کو قائم رکھنا ہے اور نان کوآپریٹر حکومت کو بہر حال برباد کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ اعتدال پسند حضرات کی دشواری ہے ان کو سیاسی آزادی اور تحریک خلافت کے مقاصد سے اتفاق ہے لیکن ستیا گرہ کی تحریک کو ملک کے واسطے مخدوش خیال کرتے ہیں۔ اور اس بنا پر بجائے اصل رزولیشن کے ترمیم سے اتفاق ہے یہ ترمیم پاس ہوگئی میری یہ تقریر عام طور پر پسند کی گئی۔ سر لوڈوک پورٹ ممبر فنانس نے گورنر سے میری شکایت کی کہ چھتاری نے اتنی سخت تقریر کی لیکن سر ہار کورٹ نے فقط یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ یاد رکھو وہ پبلک کا نمایدہ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک پر لطف بات یہ ہوئی کہ جب اس کا نفاذ کیا گیا تو وزراء نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

ایکٹ نافذ کیا گیا لیکن جب اس کے خلاف شورش ہوئی تو وزراء نے قانونی دلائل سے کام لیا کہ یہ تو رزرو ڈپارٹمنٹ کے احکامات ہیں۔ قانوناً وزراء کا بیان درست تھا۔ لیکن اس حالت میں انھیں نفاذ کے وقت بھی اتفاق نہ کرنا تھا۔ بہر حال بہ حیثیت ایک غیر سرکاری ممبر کے مجھے یہ کہنے کا موقع ملا تھا کہ گورنمنٹ کی پوزیشن صاف کی جائے کہ وزراء کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔ لہذا سر ہار کورٹ نے اپنی ایک تقریر میں یہ الفاظ کہے کہ

"The Government decided, and decided unanimouly, to apply the C.L.A Act to the whole province at once."

''گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا تھا (اور بالاتفاق فیصلہ کیا تھا) کہ ایکٹ پورے صوبہ میں نافذ کیا جائے'' میں نے اپنی تقریر میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ وزراء اس فیصلے میں شریک تھے اور جب ہندوستانی ممبران گورنمنٹ اس سے متفق ہیں تو پھر اس کو یک قلم ہٹانا مناسب نہ ہوگا۔

راجہ شمبو دیال کے لطیفے:

کونسل کے ممبروں میں راجہ شمبو دیال آنجہانی بھی تھے۔ افسوس ہے کہ ان تقاریر روداد کی کتاب میں نہیں ہیں۔ اس زمانہ میں اردو کے زود نویس نہیں تھے۔ لیکن بڑی ناقدردانی ہوگی اگر میں اس کا ذکر نہ کروں کہ ان کی اردو کی تقریر بڑی شستہ اور لطائف وظرائف سے لبریز ہوتی تھی۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے بل پر مباحثہ کرتے ہوئے ایک بار انھوں نے اپنی تقریر میں یہ شعر پڑھا۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملاّ ست

کار طفلاں تمام خواہد شد

لطف کی بات یہ تھی کہ پنڈت جگت نرائن کا کشمیری خاندانی ''ملا'' ہے جیسے سپرو، نہرو، گورٹو ہیں۔

۲۳ رجنوری ۲۲ء گورنمنٹ نے قانون مال گزاری میں ایک ترمیم کی میرے اس رزولیوشن کی تائید میں تھی جس میں ٹپواریوں کی جگہ کو تبادلہ کے قابل بنانے کی شفارش کی تھی۔ میں نے اس کی بڑے شوق سے تائید کی۔

راجہ شمبھو دیال آنجہانی کی اسی زمانہ کی ایک اور تقریر یاد آ گئی قصہ یہ ہے اخبار لیڈر کے مدیر خصوصی مسٹر چنتامنی تھے اور گو قلمدان وزارت ہاتھ میں لینے کے بعد انھوں نے ایڈیٹری سے استعفیٰ دیدیا تھا اور ان کا جانشیں وہاں کام کرتا تھا لیکن درحقیقت تمام پالیسی انھیں کی تھی اور وہی رہنمائی کرتے تھے یہ طرز چنتامنی صاحب کا کوئی خاص نہ تھا بلکہ ہندوستان میں اس سے بدتر مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ مثلاً ایک صاحب کسی کمپنی کے ڈائریکٹر تھے اور ہو گئے گورنمنٹ کے ممبر تو انھوں نے خود ڈائریکٹری سے استعفیٰ دیدیا لیکن بیوی یا بیٹے کو ڈائریکٹر کرادیا۔ یہ سچ ہے کہ ایسا کرنے سے قانون کے الفاظ کی تو تعمیل ہوگئی لیکن بات جہاں کی تہاں رہی۔

ہاں تو لیڈر میں کونسل کے اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے مختلف ممبروں کی تقریر پر رائے زنی کرنے میں کچھ اس قسم کا فقرہ لکھ دیا گیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ راجہ صاحب کونسل کو ہنسانے والوں میں سے ہیں۔ راجہ صاحب انگریزی نہ جانتے تھے لوگوں نے

انھیں ترجمہ کرتے ہوئے یہ کہدیا کہ ایڈیٹر اخبار نے آپ کو کونسل کا مسخرہ قرار دیا ہے۔ راجہ صاحب نے دوسرے ہی دن اپنی تقریر میں مسٹر چنتامنی کی خبر لی مسٹر چنتامنی کی یہ کمزوری تھی کہ سالہا سال اس صوبہ میں رہنے کے باوجود انھوں نے اس صوبہ کی زبان سیکھنے کی کوشش نہ کی۔ لہٰذا اس موقع پر چنتامنی صاحب نے پاس کے بیٹھنے والے سے پوچھا اور ساتھ ہی ہاتھ سے اشارہ کیا کہ راجہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں، راجہ صاحب نے دیکھ لیا اور فوراً کہا۔

''بھینس کے آگے بین بجائے، بھینس کھڑی اگلائے''

مسٹر چنتامنی کا رنگ تیرگی مائل تھا، اور مسلسل پان کھاتے رہتے تھے۔ لہٰذا اس نہایت چست پھبتی پر کونسل کا جو عالم ہوا ہوگا، ظاہر ہے۔

لگان آراضی کا مسئلہ:

۳۱ر جنوری ۲۲ء کو میں نے ایک رزولیوشن پیش کیا اور پیش کرنے سے پہلے گورنمنٹ سے مشورہ کرلیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر کنور سر جگدیش پرشاد کی ان مساعی کا ذکر نہ کروں جن کی بدولت حکومت کا تعاون مجھے حاصل ہوسکا۔ اس رزولیوشن کا منشاء یہ تھا کہ حکومت کی اس پالیسی پر نظر ثانی کی جائے جو اس صوبہ میں لگان اراضی کے متعلق تھی۔ چنانچہ گورنمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کی اور اسی بناء پر آیندہ چل کر بندوبست کی میعاد تیس سے چالیس برس کردی گئی اور مال گذاری کے تناسب کو بھی بجائے ۴۵٪ کے ۳۵٪ سے لے کر خاص حالات میں ۴۵ تک کردیا گیا۔ زمیندار کے ساتھ دوسری مزید رعایات بھی کی گئیں۔ میں نے پہلی مارچ کو ایک رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے (جس میں بندوبست کی میعاد بڑھانے کی تجویز تھی) سر ہارکورٹ کی ضلع کھیری کی بندوبست کی رپورٹ کا اقتباس دیا تھا جہاں ۱۹۰۱ء کے بندوبست میں وہ مہتمم بندوبست تھے۔ اس سے سر ہارکورٹ کی ہمدردی اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ گو سر ہارکورٹ نے فقط ۲۲ فیصدی کا اضافہ کیا تھا مگر اپنی رپورٹ میں یہ اصول لکھا تھا۔

"The Principle on which the settlement was made to put away theories and work close to the soil, to see things with the people's eyes, to do things in a way that the people did

understand, to avoid raising disputes, in a word to adjust the settlement to the people and not to attempt the prodigious task of adjusting the people to the settlement, has been my studied aim."

اس تحریر کا آخر حصہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اگر اس زمانہ میں انگریزوں میں سر ہار کورٹ کے دل و دماغ کے لوگ زیادہ ہوتے تو شاید انگریز قوم سے ہندوستانیوں کو اتنی بیزاری نہ ہوتی۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ اس زمانہ میں زمینداروں کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا اور آج زمینداری ہی کو سرے سے ختم کرنے کا عزم کرلیا گیا ہے۔

میری پالیسی اس زمانہ میں نئے محاصل لگانے کے بالکل ہی خلاف تھی اور جب کبھی کوئی ایسی تجویز حکومت کی طرف سے آتی تو میں اس سے اختلاف کرتا تھا اور اسراف کی کمی کی طرف حکومت کو متوجہ کرتا تھا۔ ایسی تقاریر سے میرا منشاء عام لوگوں کی واہ واہ حاصل کرنا نہ تھا۔ گو اس کمزوری کا میں بھی شکار تھا۔ چنانچہ جب گورنمنٹ نے کورٹ فیس میں اضافہ کا مسئلہ پیش کیا تو میں نے اپنی تقریر میں ہندوستان کے افلاس کا رونا رو کر اس کے خلاف رائے دی اور وہ بل مسترد ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۲۲ء میں کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کو ہٹانے کا رزولیوشن کونسل کے سامنے آیا۔ اب صوبہ میں سکون پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے بڑے شد و مد سے اس کی تائید کی اور کونسل نے اسے منظور کرلیا۔

۱۳را کتوبر ۱۹۲۲ء کو میں نے ایک بل قانون لگان میں ترمیم کا بھیجا تھا جو سلیکٹ کمیٹی کو بھیجا گیا۔ گورنمنٹ کے اکثر ممبروں نے اس کی مخالفت کی نومبر ۱۹۲۲ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ بل سلیکٹ کمیٹی سے ہو کر پھر کونسل کے روبرو آیا۔ اس کی دفعہ میں مسلمانوں کے تناسب کو مقرر کیا گیا تھا بل میں مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فی صدی تھا جو ایک کمیٹی (رول ۱۳ کی کمیٹی) کی سفارش کی بنا پر تھا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ ۳۰ فیصدی ہو (جیسا کہ کونسل میں دیا گیا) اس پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی کونسل کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کی تقاریر کا معیار کتنا بلند ہوتا تھا۔ اور مخالفت کرتے ہوئے بھی

ہندو مسلمان ایک دوسرے کی دل شکنی سے کتنا گریز کرتے تھے۔ میری اپنی تقریر صفحہ ۶۷ پر ہے جو اس ترمیم کی تائید میں کی گئی تھی کہ جس نے مسلمانوں کو ۳۰ فیصدی دینا تجویز کیا تھا۔ اس تقریر میں ایک لفظ بھی کسی ہندو کے واسطے دل شکن نہیں۔ لطف یہ ہے کہ ہندو صاحبان میں ایسے وسیع خیال لوگ موجود تھے جو اس ترمیم کو اپنے نام سے پیش کرنے پر آمادہ تھے۔ چنانچہ پرتاب گڑھ کے ممبر بابو شنکر دیال آنجہانی نے اس ترمیم کو پیش کیا تھا اور تقسیم آراء کے وقت ہندوؤں نے ایک طرف اور مسلمانوں نے دوسری طرف رائیں دیں۔ تاہم بابو شنکر دیال، راجہ پرمانند آنجہانی اور کنور سر جگدیش پرشاد نے مسلمانوں کے ساتھ رائے دی سرکاری ممبروں میں سوائے فری منٹل اور وزراء کے اور سب نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ تاہم تین رائے سے ترمیم پاس نہ ہوسکی۔ تین مسلمانوں ممبر بھی حاضر نہ ہوسکے۔ قاضی محمد ہاشم، خان بہادر سردار رحیم داد خاں بریلی اور راجہ سر سید ابو جعفر اس روز شریک نہ ہوسکے حالاں کہ یہ حضرات ہماری ہی پارٹی تھے اور ان کی غیر موجودگی نے ترمیم دلا دی۔ دوسرا مسئلہ ٹیکس کا تھا جس پر زمیندار پارٹی کو انتہائی اختلاف تھا لیکن وہاں بھی زمیندار ٹوٹ گئے اور کچھ مفید ترمیمات کے ساتھ وہ بھی پاس ہوگیا۔

مجھے اور کنور صاحب کو یہ یقین ہوگیا کہ زمینداروں میں سیاسی شعور کی اتنی کمی ہے کہ ان کی جماعت پر بہ حیثیت ایک پولیٹکل پارٹی کے بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ سر ہار کورٹ کے تعلقات ان کے وزراء سے خاصے کبیدہ ہو گئے تھے اور زمینداروں کو وہ ٹوٹا پھٹیرا کہنے لگے تھے۔ سر ہارکورٹ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے۔

"I was never let down by an. Indian whom I trusted."

''مجھے کبھی کسی ایسے ہندوستانی نے دھوکا نہ دیا جس پر میں نے اعتماد کیا۔''

لیکن آخر کار زمانہ میں ''باستثنائے ایک'' کا جملہ اس میں اضافہ کردیا کرتے تھے۔ سر ہارکوٹ کا بالکل آخری زمانہ تھا۔

سر ولیم میرس:

جنوری ۱۹۲۳ء میں سر ولیم میرس ان کے جانشین ہوئے اسی زمانہ میں کونسل

میں ایک رزولیوشن آیا کہ گورنر کونسل چیمبر کا بنیادی پتھر نہ رکھیں لیکن کونسل نے اسے مسترد کردیا اور کونسل چیمبر کی بنیاد کا پتھر لکھنؤ میں سر ہارکورٹ نے رکھا۔ اس کے دو ہی ایک روز بعد وہ برما کی گورنری پر چلے گئے اور سر ہارکورٹ کے بعد انھوں نے بھی رہنا پسند نہ کیا۔ سر ہارکورٹ نے اس کی بھی کوشش کی تھی کہ سر لوڈوک ان کے جانشین ہوں۔ لیکن گورنمنٹ آف انڈیا نے سر ولیم ریں کو (جو آسام کے گورنر تھے) یہاں مقرر کیا سر ہارکورٹ کے جانے اور سر ولیم کے آنے میں دو یا تین روز کا وقفہ تھا اس دوران میں سر لوڈوک گورنر بھی رہے۔ گو سر ولیم میرس سے میرے پرانے تعلقات تھے۔ لیکن سر ہارکورٹ کے جانے کا بہت افسوس ہوا۔ میرے خیال میں اس قدر دلی جذبات کے ساتھ شاید ہی کسی گورنر کو لکھنؤ سے رخصت کیا گیا ہوگا۔ اسٹیشن پر رخصت کرنے والے اور خود سر ہارکورٹ بھی آب دیدہ تھے۔ یہ ایک ایسے گورنر کے زمانہ ختم ہوا تھا ہندوستانیوں سے بہت محبت کرتے تھے اور بڑے شریف نواز تھے۔ وہ ہندوستانیوں کا اتنا خیال کرتے تھے کہ اکثر آئی سی ایس انگریز ان سے ناخوش تھے۔ ان کی دوستی میں رنگ ونسل کا امتیاز نہ تھا۔ ان کا تدبر بے مثل تھا بڑی تجاویز اور اہم منصوبے ان کے ذہن میں آتے تھے۔ مثلاً لکھنؤ یونیورسٹی کا وجود ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور ولایت میں پھر آخر وقت تک وہ اپنے دوستوں کو نہیں بھولے۔

سر ہارکورٹ کی وداعی تقریر:

۱۵ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو سر ہارکورٹ کونسل میں الوداع کہنے آئے ان کی تقریر کا ایک حصہ مجھے عمر بھر یاد رہے گا۔ انھوں نے کہا۔

"I have observed when shooting over old ground that while I remember and note places where I killed, the shikaries generally remember and note places where I missed. To me it is where I shot a tiger. To them it is where I missed the bear."

نہایت حسن بیان کے ساتھ سر ہارکورٹ نے اپنے اور اپنے ناقدین کے زاویہ نظر کا فرق بتایا ہے۔ ہوتا بھی دنیا میں یہی ہے انسان اپنی خوبیاں یاد رکھتا ہے اور دوسروں کی برائیاں کاش اس کے برعکس ہوتا۔ اس تقریر میں سر ہارکورٹ نے ایک لفظ

بھی اپنے وزراء کے متعلق خصوصیت کے ساتھ نہیں کہا۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو چنتامنی نے امپائر اگزیبیشن کے واسطے کچھ روپیہ منظور کرایا اور اس میں نے بھی تقریر کی جس کا منشا صرف یہ تھا کہ کیا اس شرکت سے واقعی ہماری صنعت کو نفع پہونچے گا۔ لیکن تجویز سے اختلاف نہیں کیا۔

کونسل میں سرولیم کی پہلی تقریر:

۲۹ر جنوری ۱۹۲۳ء کو سرولیم میرس نے کونسل کو پہلی بار آ کر مخاطب کیا۔ ان کی تقریر میں کوئی خاص بات اس کے سوا نہ تھی کہ صوبہ کی مالی حالت بہت نازک ہوگئی تھی۔ سرہارکورٹ اور سرلوڈوک کے ساتھ اخراجات کا زمانہ ختم ہوگیا تھا اور اب کفایت شعاری کا دور شروع ہوا۔ اسی سال ۲ر فروری کو میں نے کونسل میں ایک رزولیوشن پیش کیا تھا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ سود کی تعداد کو زراعت پیشہ لوگوں کے قرضوں پر کم کیا جائے۔ میں نے اسے واپس لے لیا کیوں کہ گورنمنٹ اسے ماننے پر تیار نہ تھی۔ میں چند ہی سال کے بعد جب میں ہوم ممبر تھا، گورنمنٹ کو یہ کرنا پڑا۔

اسی سال مہاراجہ محمود آباد نے ایک سال تک اپنی تنخواہ نہ لی اور وزراء نے شاید ایک ہزار یا اس سے کچھ زیادہ اپنی تنخواہوں میں کمی کی (C.L.A) ایکٹ کو اس صوبہ سے ہٹالیا گیا اور جو سیاسی قیدی جیل میں تھے انھیں رہائی دیدی گئی۔

کونسل میں زمینداروں کی نمایندگی کا مسئلہ:

۲۲ر مارچ ۱۹۲۳ء کو میں نے کونسل میں ایک رزولیوشن پیش کیا جس میں یہ سفارش تھی کہ صوبہ آگرہ کے زمینداروں کو بجائے دو کے چار نشستیں کونسل میں دی جائیں لیکن اودھ کی چار نشستوں میں کمی نہ کی جائے۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے میرے رزولیوشن کو اپنی تقریر میں غیر ضروری خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔

"But this resolution which seeks to make a change in the existing state of things should first show why a change has become necessary. If the zamindars had not been returned in adequate number to the Council, if there had been such a feeling of hostility to them in the country that they had found

it difficult or impossible to make their views known and to make their voice heard effictivley in regard to questions concerning their affairs, then the case for a change might have been strong. But what is the state of things now? Let anyone who looks at the faces of honourable members tell us impartially as to whether it is a fact that the present distribution of seats has resulted in any injustice to the land-holding community."

میں نے اپنی تقریر میں منجملہ اور باتوں کے یہ صاف طور پر کہا تھا کہ زمیندار مستقبل میں زیادہ عرصہ تک کونسل کے انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ میرے الفاظ یہ تھے۔

"It may be urged that there is no need of further protection for the zamindars because they are already in a majority in this House; but he would be a bold man who could say that the present predominant position of the zamindars in this house is likely to last long. And therefore it is not astonishing that I am anxious to safeguard their position against the time when they would find it very difficult, almost impossible, to secure a seat through the general electorate. Such times are bound to come - nobody can doubt it."

آج یوپی کونسل میں سوائے ان چھ ممبروں کے کہ جن کا انتخاب زمیندار اور تعلقہ دار کرتے ہیں زمینداروں کی تعداد بہت ہی کم ہے اور جو ہیں وہ بھی سیاسی جماعتوں کی بدولت منتخب ہوئے ہیں اور چاہے انھیں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو ان کے لئے سیاسی جماعت کے خلاف زمینداروں کے حقوق کی حفاظت میں لب کشائی ناممکن ہے۔ اس کا حال ہی میں مظاہرہ ہوا۔ جب زمینداری کو ختم کرنے کا رزولیوشن کونسل میں پیش ہوا۔

ڈسٹرکٹ بورڈ کی چیرمینی:

اسی سال اپریل میں سر میں یہ سودا سمایا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا چیرمین ہو جاؤں۔ میں نے ارادتاً اس پامال جملہ کا استعمال اس موقع پر نہیں کیا کہ "دوستوں نے

مجبور کیا کہ میں یہ خدمت قبول کرلوں۔'' مجھے اس فقرہ پر ہمیشہ ہنسی آئی۔ اس طرح کے مواقع پر دوست غریب مجبور کرتے نہیں بلکہ کئے جاتے ہیں وہ بالکل بے گناہ ہوتے ہیں اور اکثر اس آفت میں مبتلا ہونے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں اس انتخاب میں کھڑا ہوا۔ میرے مقابل ایک ہندو تھے۔ بورڈ میں ہندوؤں کی کثرت آرا تھی لیکن ۱۸ اور ۱۴ رایوں کے فرق سے میں چیرمین ہوگیا اس زمانہ میں فرقہ وارانہ زہر اس درجہ نہیں پھیلا تھا اور ایک مسلمان اس کی امید کرسکتا تھا کہ باوجود ہندو اکثریت کے منتخب ہوجائے اب یہ صورت ناممکن ہوگئی ہے۔

۱۹۲۳ء میں زندگی کی بعض بڑی اہم تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ اس سال جنوری میں سر ولیم میرس گورنر ہوکر آئے میرے تعلقات ان سے پرانے تھے اس لئے ان کے آنے کی مسرت تھی لیکن سر ہارکورٹ کے اخلاق اور وسیع النظری کا مجھ پر بڑا اثر تھا۔

وزارت

تاریخ یاد نہیں انہیں دنوں صوبہ کی حکومت میں ایک بڑا مرحلہ پیش آگیا شروعات یوں ہوئی کہ الٰہ آباد میں کھانے کی تقریب تھی جس میں پنڈت اقبال نرائن گرٹو جو کچھ روز پالیمنٹری سکریٹری بھی رہے تھے شریک تھے کہا جاتا ہے کہ دوران گفتگو میں پنڈت جی کی زبان سے ڈی-لا-فوس کے متعلق کچھ ایسے الفاظ نکلے جو ازالۂ حیثیت عرفی کے قانون کے تحت آسکتے تھے۔ ڈی-لافوس الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے کسی نے ان سے کہدیا انھوں نے براہ راست گورنر کو خط لکھا کہ ان کو مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دی جائے۔ سر ولیم میرس نے اجازت دے دی۔ اس پر وزراء نے اعتراض کیا کہ گورنر کو براہ راست خط و کتابت کرنی تھی اور نہ وزراء کے علم و اطلاع بغیر مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دینی چاہیئے تھی۔ وزراء نے استعفیٰ دے دیا اور گورنمنٹ کو ایک اہم ضغطہ کا سامنا ہوگیا۔ استعفیٰ دینے کے بعد مسٹر چنتامنی نے ان سے ملاقات کی خواہش بھی کی۔ لیکن گورنر نے ٹالدیا۔

یہ اپریل کا مہینہ تھا گورنر پہاڑ پر چلے گئے۔ میں اس زمانہ میں چھتاری میں تھا۔ استعفیٰ کی خبر اخبار میں دیکھی میرے ذہن میں اپنی وزارت کا وہم و گمان بھی نہ تھا

اوّل تو دو ہندو وزراء کے بجائے ہندو ہونا قرین قیاس تھا دوسرے یہ کہ میں اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن تقدیر کا کچھ فیصلہ اور تھا اور جیسا میں کہیں اور لکھ چکا ہوں میری عمر میں اکثر ایسے واقعات پیش آئے جب تقدیر نے مجھے خواہ مخواہ آگے بڑھایا اس موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔

قلمدانِ وزارت کی گردش:

گورنر نے نینی تال پہنچ کر پنڈت گوکرن ناتھ مصرا کر بلایا وہ نینی تال پہنچے۔ اس زمانہ میں ایک عمارت ممبران کے قیام کے واسطے گورنمنٹ نے مخصوص کردی تھی وہاں جاکر مقیم ہوئے۔ ''دروغ برگردن راوی'' سنا یہ ہے کہ وہاں پنڈت ہردے ناتھ کنزرو پہلے سے مقیم تھے انھوں نے پنڈت گوکرن ناتھ مصرا سے صاف صاف یہ کہدیا کہ اگر آپ نے وزارت قبول کی تو میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے انکار کردیا۔ اب سیتارام صاحب کو بلایا گیا کہا جاتا ہے کہ بجنسہٖ یہی واقعہ انھیں بھی پیش آیا۔ اور انھوں نے بھی انکار کردیا۔ سر ولیم کو تشویش تھی اس لئے کہ روزانہ اخبارات میں یہ شایع ہوتا تھا کہ فلاں نے انکار کردیا، آخر کار مجھے گورنر کا طلبی کا تار چھتاری میں ملا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ ۱۴ ارمئی کی تاریخ تھی۔ ۱۶ ریا ۱۷ ارکو میں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی پہلی میٹنگ مقرر کی تھی۔ میں نے اسے ملتوی کیا اور نینی تال روانہ ہوگیا۔

پنڈت موتی لال نہرو سے اتفاقیہ ملاقات:

بریلی پہنچا تو دیکھا کہ چھوٹی لین کی گاڑی میں جس درجہ میں میرا اسباب تھا اسی میں ایک اور صاحب کا اسباب رکھا تھا تھوڑی ہی دیر میں پنڈت موتی لال نہرو تشریف لائے اور حسب عادت بزرگانہ شفقت سے ملے۔ پنڈت جی کی خدمت میں مجھے پہلے سے نیاز حاصل تھا اور جب کبھی الہ آباد جاتا تھا تو پنڈت جی سے ملنے جانا میری معمولات میں سے تھا۔ اور اکثر چائے نوشی میں شریک ہوتا۔ بعض خوبیاں پنڈت جی میں ایسی مخصوص جن کا سیاسی زندگی میں اب بالکل فقدان ہے۔ آج کل سیاسی اختلافات مخالفت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، آپس کے تعلقات ختم ہوجاتے ہیں اور اچھی خاصی دشمنی ہوجاتی ہے۔ پنڈت جی کا طرز یہ نہ تھا میں نہ کبھی کانگریس میں تھا

اور نہ سوراج پارٹی میں لیکن اس اختلاف کا اثر نہ میری خوردانہ عقیدت پر تھا اور نہ ان کی بزرگانہ شفقت پر۔ اس زمانہ میں کسی پر تنقید کی جاتی تھی تو سلیقہ شرافت اور سنجیدگی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ آج کل کی طرح آبرو ریزی کی نوبت نہ آتی تھی میں نے کبھی پنڈت جی کی تحریر یا تقریر میں بازاری رنگ نہیں دیکھا موجودہ سیاسیات میں جو بیزاری اور تلخ کامی پیدا ہوئی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم اپنی تحریر و تقریر میں وہ رکھ رکھاؤ نہیں ملحوظ رکھتے جو خواص کو عوام سے ممتاز کرتا ہے اور رکھتا ہے۔ موتی لال جی اور اس زمانہ کے لوگ تلخ تجربات بھی گوارا انداز سے کہتے تھے۔

جب ریل گاڑی چل دی تو پنڈت جی نے کہا کیا نینی تال جا رہے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا خود جا رہے ہو یا بلائے ہوئے۔ میں نے عرض کیا جا تو رہا ہوں بلایا ہی ہوا البتہ یہ نہیں معلوم کہ کیوں بلایا گیا ہوں ایک آدھ منٹ خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا کیوں پنڈت جی اگر وہ مجھے وزیر بنانا چاہیں تو میں قبول کروں یا نہیں۔ پنڈت جی نے فرمایا کیوں تم ہماری طرح تارک موالات تو نہیں اور پھر کچھ ایسے الفاظ فرمائے جس کا مفہوم یہ تھا کہ موجودہ وزراء سے تو اچھے ہی ثابت ہو گے پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں معلوم ہوا کہ پنڈت جی گھوڑا کھال جا رہے تھے آرام کرنا مقصود تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک قصہ یاد آ گیا جو کئی سال بعد کا ہے۔ شاید ۱۹۲۶ء کے الیکشن کا ہے میں اور کنور سر جگدیش پرشاد الہ آباد گئے اور پنڈت جی کے ہاں حسب معمول پہونچے۔ اس الیکشن میں سوراجسٹ شاید پہلی تعداد سے کم آئے تھے الیکشن کا ذکر ہوا تو فرمانے لگے کہ اس بار تو گئو ماتا نے ہمیں پچھاڑ دیا۔ انھوں نے فلورڈ (Floord) کا لفظ استعمال کیا۔ پھر فرمایا کہ مجھے ضلع کا نام یاد نہیں رہا۔ الیکشن کے سلسلہ میں پنڈت جی تقریر فرما رہے تھے دورانِ تقریر میں ''گئو'' کا لفظ پنڈت جی نے استعمال کیا تو سامعین میں سے آواز آئی کہ ''گئو ماتا'' کہئے پنڈت جی نے برجستہ کہا کہ میں گائے کو پوجنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اپنا سلسلہ بچھڑے سے ملانے کو تیار نہیں۔'' پنڈت جی کو برجستہ جواب دینے پر جو عبور تھا اس سے ان کے دوست دشمن دونوں ڈرتے تھے۔

گورنر سے ملاقات اور وزارت:

میں نینی تال پہونچ کر (P.L) میں ٹھہرا۔ گذشتہ سال (Oak Over) کوٹھی

میں نے خریدلی تھی۔ لیکن خدا جانے کیوں وہاں نہیں ٹھہرا۔ تھوڑی دیر میں کنور سرجگدیش پرشاد آئے تو معلوم ہوا کہ مجھے وزارت ہی کے سلسلہ میں بلایا گیا ہے میں نے کنور صاحب سے کہا کہ مجھ سے کام کیسے ہو سکے گا مجھے تو کوئی تجربہ نہیں ہے کنور صاحب نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ انکار نہ کرنا۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا میرے دوسرے ساتھی راجہ پر مانند صاحب ہیں۔ میں عجیب پس وپیش میں تھا۔ ایک طرف تو اسکی مسرت تھی کہ اس صوبہ کہ وزراء میں ہمارا بھی نام ہوگا۔ دوسری طرف یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر کام نہ چلا تو بدنامی ہوگی اور مذاق اڑے گا۔ بہرحال میں دوسرے روز تین بجے کے قریب گورنمنٹ ہاؤس گیا۔ لانج کی برابر ہی جو تاش کھیلنے کا کمرہ ہے اس میں بیٹھ گیا۔ میرس صاحب گورنر پنجاب کو رخصت کررہے تھے جو ان کے گھر مہمان تھے۔ مجھ پر تشویش وتذبذب کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کی انگلیاں سرد ہوگئی تھیں اور رہ رہ کر دل میں آتا تھا کہ کسی طرح اس ذمہ داری یا جاہ ومنزلت سے نجات مل جائے تو بہتر مجھے کم ازکم ۲۰ منٹ یا آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا اخلجان بڑھتا ہی رہا کہ اتنے میں چپراسی نے کواڑ کھولے۔ اور اے، ڈی، سی، نے مجھے گورنر کے دفتر میں پہنچادیا۔

میرس صاحب نے دیکھتے ہی کہا ''میں چاہتا ہوں کہ تم وزیر ہوجاؤ۔ انکے الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں۔

"I want You to become a Minister"

میں نے جواباً کہا کہ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے آپ سن لیں میری تعلیم بہت نامکمل ہے میں نے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ پبلک زندگی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اگر کونسل کے اندر یا انتظامی معاملات میں میری رائے یا تقاریر معیار سے گری ہوئی ہوئیں تو آپ کی اور میری بدنامی ہوگی۔ اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ ان وجود کی بنا پر اپنی رائے بدل دیں تو میں اس کا ہرگز اظہار نہ کروں گا کہ آپ نے مجھے وزارت کی دعوت دی تھی اور میں نے انکار کیا، سرولیم میرس نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تم ضرور کامیاب ہوگے اور میں چاہتا ہوں کہ کل اعلان ہوجائے میں نے کہا کہ میں نے اپنے بارے میں سب کچھ عرض کردیا۔ اگر آپ میرا تقرر کرتے ہیں تو ذمہ داری آپ کی ہے۔

دو وزیروں کے تقرر کا اعلان:

انھوں نے فوراً سر سیم اوڈ انلڈ کو جو پورٹر صاحب کے بجائے فنانس ممبر ہوئے تھے فون کیا اور کہدیا کہ راجہ پر مانند اور میرے نام کا اعلان کر دیا جائے یہ وہ مجھ سے پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ راجہ پر مانند میرے رفیق کار ہوں گے۔ فون کے بعد پوچھنے لگے کہ کون سے صیغہ جات لو گے میں نے کہا کہ سوائے تعلیمات کے کوئی بھی صیغہ جات ہوں۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ لوگ کہیں کہ:

"Here comes an uneducated minister of education"

''یہ ہے تعلیم کا غیر تعلیم یافتہ وزیر'' میرس صاحب اس پر ہنسے پھر صیغہ جات طے کر کے چلا آیا۔ راستہ بھر اور کوٹھی پر پہونچ کر یہ بات ذہن میں بار بار آتی رہی کہ اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔ وہ تو میرا سارا حال جانتا ہی ہے مجھے یاد ہے کہ بار بار یہ شعر پڑھتا تھا۔

نہ گلم، نہ برگ سبزم، نہ درخت سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کا کشت مارا

اور جب تک چھتاری نہ آ گیا مجھ پر یہ ہی کیفیت طاری رہی آخر کار اس خیال نے مجھے بڑی تسلی دی کہ میں نے خود کوئی کوشش نہیں کی مشیت نے خود بخود وزارت میرے اوپر ڈالی ہے تو اسے کامیاب بنانے کی ذمہ داری میری نہیں، اسی کی ہے، اور اس خیال سے مجھے بہت تقویت پہنچی اور سکون حاصل ہوا۔

وزارت کے بعد:

سب سے پہلی بات ہم دونوں وزراء نے یہ کی کہ اپنی تنخواہ بجائے پانچ ہزار کے تین ہزار مقرر کی۔ میں نے مسٹر چنتامنی کے اسٹاف میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ نرسمہم، لیڈی چنتامنی کے حقیقی بھائی میرے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور سندرم ایک دوسرے مدراسی ٹائپ کرتے تھے۔ میں نے دونوں کو بحال رکھا۔ غالباً ۷ ارمئی کی شام کو عید کرنے چھتاری روانہ ہوا۔ راستہ میں نواب بہادر عبدالسمیع خاں سکندرہ راؤ کے اسٹیشن پر گاڑی میں آ گئے اور انہی کی آواز سے آنکھ کھلی۔ یہ روز عید کا تھا اور ہاتھرس

سے بذریعہ موٹر میں چھتاری پہنچا جس وقت میں حویلی گیا ہوں تو میں نے اپنی بیوی مرحومہ کو بہت ہی خوش پایا۔ ان کی وہ صورت اس وقت تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے وہ دروازہ میں سامنے کھڑی تھیں۔ سبز انگوری رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے فرط مسرت سے ان کے چہرے پر کچھ ایسی رونق آ گئی تھی کہ بالکل تندرست معلوم ہوتی تھیں۔ انھیں اس درجہ خوش دیکھ کر میری خوشی میں بھی بہت اضافہ ہو گیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ چار ماہ بعد یہ صورت میری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ جائے گی۔

یہ عید ہمارے گھر میں بڑی مسرت بھری عید تھی۔ چھتاری کے لوگوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ خاندان کے چھوٹے بڑے جمع ہو گئے۔ دور و نزدیک کے دوستوں اور عزیزوں نے طرح طرح سے اپنی محبت و مسرت کا اظہار کیا۔ میں نے مبارکباد کے ہر تار اور خط کا جواب اپنے دستخط سے بھیجا۔ اور حتی الوسع اپنے ہاتھ سے شکریہ کے خطوط لکھے۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا لیکن میرا دل نہ چاہا کہ میں جوابات کو رسمی بنا دوں۔ میں دوستوں، بزرگوں اور عزیزوں کے اظہار مسرت پر خود بہت مسرور ہوتا ہوں اور فخر کرتا ہوں اس لئے میرا دل یہی چاہتا ہے کہ میں بھی اپنے جذبات کا خلوص سے اظہار کروں۔

میں متعلقین کو لے کر نینی تال چلا گیا اور سرکاری کام میں مشغول ہو گیا۔ آبکاری کے صیغہ میں میرے سکریٹری مسٹر بنت تھے جو بعد میں فنانس ممبر اور سر ای جی بلنٹ ہو گئے۔ باقی محکموں میں میرے سکریٹری سر جگدیش پرشاد تھے اور ان سے بھی مجھے بہت مدد ملی۔

ایک ممبر گورنمنٹ کا ناخوش گوار تبصرہ:

ایک ہی دو روز بعد میں ایک ممبر گورنمنٹ کے یہاں گیا سر جگدیش میرے ساتھ تھے۔ موصوف کا برک ہل میں قیام تھا۔ باتوں باتوں میں موصوف فرمانے لگے کہ ہاں بھئی وزارت کے واسطے اور کوئی راضی نہیں ہوا تو تم نے یہ گو کا ٹوکرا لے لیا۔ ان کے تعلقات میرے بزرگوں سے تھے میں نے ادباً خاموشی اختیار کی اور یہ تعلقات نہ بھی ہوتے تب بھی میں کچھ نہ کہتا اس لئے کہ خود میری زبان سے اس قسم کا کلمہ کبھی نہیں نکل سکتا تھا پھر جواب کیسے دیتا۔ میں اب تک نہ سمجھ سکا کہ موصوف نے ایسا

کیوں فرمایا اگر اسکا منشاء یہ تھا کہ اس طرح گورنمنٹ سے تعاون ہوتا تھا تو کونسلر ہوتا بھی تعاون سے خالی نہیں۔ اگر یہ مطلب تھا کہ دو اور حضرات نے انکار کیا کہ اور میں نے قبول کرلیا تو وہ حضرات وزراء کی پارٹی کے ممبر تھے یا کم ازکم ان کے معین ومددگار تھے اور میں مخالف جماعت کا شخص تھا اسی ملاقات میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ تم نے اپنے اسٹاف میں کسے رکھا میں نے کہا کہ میں نے چنتامنی ہی کے لوگوں کو رکھا ہے تو موصوف کی یہ نصیحت اصولاً غلط نہ تھی لیکن میرا اصولِ زندگی یہ رہا ہے کہ ہر شخص کو یہ سمجھو کہ وہ دوست ہے جب تک وہ اپنے آپ کو دشمن ثابت نہ کردے میں نے اس اصولِ زندگی کو برٹش انڈیا میں غلط یا مضر نہیں پایا۔ سوائے ایک شخص کے جس نے باوجود میرے اعتماد کے مجھ سے دغا کی۔

اب نہ دنیا میں چنتامنی موجود ہیں اور نہ نرسمہم نہ سندرم۔ اس واسطے ناشکر گزاری ہوگی اگر میں اسے صاف نہ کردوں کہ مئی ۲۳ء سے لے کر نومبر ۳۳ء تک ایک بھی موقع ایسا نہ ہوا کہ مجھے یہ شبہ ہوتا کہ میرا راز افشا ہوگیا چنتامنی سیاسی طور پر میرے مخالف اور مخالف پارٹی کے لیڈر تھے میں منسٹر اور ساڑھے سات سال تک ہوم ممبر رہا۔ لیکن کبھی مجھے احساس نہیں ہوا کہ سری وائی چنتامنی کا برادر نسبتی میرا پرسنل اسسٹنٹ اور اس وجہ سے احتیاط کی ضرورت ہے۔

سوارج پارٹی کا الیکشن:

ان ہی گرمیوں میں مجھے گھوڑا کھال جانے کا بھی اتفاق ہوا وہاں پنڈت جی کے پاس حکیم اجمل خاں مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی مقیم تھے۔ پنڈت جی سوراج پارٹی کو آنے والے انتخاب کے واسطے تیار کررہے تھے۔ میں قدرتاً یہ چاہتا تھا کہ لبرل پارٹی نہ آئے۔ سوراج پارٹی انھیں شکست دے سکتی تھی چنانچہ میں نے پنڈت جی سے کہا کہ لبرل امیدوار کے مقابلہ میں زمیندار سوراج پارٹی کی مخالفت نہ کریں گے اور آپ زمیندار امیدواروں کی مخالفت نہ کریں۔ میں نے اس کا بھی وعدہ کیا کہ سوراج پارٹی کے الیکشن فنڈ میں بھی میری شرکت ہوگی۔ زمیندار اور سوراج پارٹی الیکش میں دوستانہ غیر طرفدار رہیں گے۔ چنانچہ اس الیکشن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بھی

لبرل امیدوار کامیاب نہ ہوسکا۔ میں نے اس ملاقات میں مزاحاً پنڈت جی سے یہ بھی کہا کہ "میں نے تو آپ کے مشورہ سے وزارت کا کام سنبھالا ہے، آپ میرے خلاف اب نہیں ہوسکتے اس پر پنڈت جی ہنسے۔

اس الیکشن کے سلسلہ میں ایک تھوڑی سی رقم (یاد نہیں شاید پانچ یا چھ ہزار) میں نے پنڈت جی کو بھیجی مگر انھوں نے واپس کردی ان کا خط میرے پاس موجود ہے اس کا اقتباس فقط اس غرض سے دے رہا ہوں کہ اس سے پنڈت جی کے بلند کردار اور سوشل اور کلچرل پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ چوں کہ پنڈت جی کو یہ معلوم نہ تھا کہ پارٹی کا طرز عمل زمینداروں کے ساتھ کیا ہوگا اس لئے انھوں نے کوئی مالی مدد زمیندار پارٹی کے ایک رکن سے لینا مناسب نہ سمجھا۔ سیاسی اختلافات ان کے دوستانہ تعلقات میں حائل نہ ہوتے تھے اور وہ اپنے نیاز مندوں پر اعتبار کرتے تھے۔

پنڈت موتی لال نہرو کا ایک دلچسپ خط:

۱۰ دسمبر ۲۳ء مخدومی تسلیم والا نامہ لکھنؤ میں ایسے وقت ملا کہ میں نہایت عجلت میں تھا۔ لہٰذا حامل والا نامہ سے جواب از عقب بھیجے جانے کا وعدہ کر کے میں فوراً پنڈت گوکرن ناتھ مصرا کی خدمت کے لئے ضلع لکھنؤ کے دیہات کی طرف روانہ ہوگیا۔ والا نامہ اور نیز ان پرچہ جات کا کو جو اس کے ساتھ میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے آدمی کو میرے پیچھے پیچھے چند مقامات پر جانا پڑا اور بالآخر میں اس وقت ملا کر جب ان پرچہ جات کی ضرورت کسی نہ کسی طرح پر رفع ہوچکی تھی۔ بنارس، گورکھپور ڈویژن کے لئے سخت ضرورت تھی مگر اس وقت وہاں کا کام ختم ہوچکا تھا۔ لہٰذا ان پرچہ جات پر قبضہ رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور نہ ان سے وزن میں معقول کمی آتی ہے کہ جو اٹھایا جاچکا تھا۔ اس لئے پرچہ جات معہ شکریہ ہم دست حامل ابلاغ خدمت ہیں۔ علاوہ اس کے ابھی تو بہت کچھ چھیڑ چھاڑ باقی ہے نہ معلوم آپ کے طبقہ کے متعلق کیا پالیسی اختیار کی جائے۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
نہ سہی عشق عداوت ہی سہی

ایسی حالت میں پرجات کا رکھنا اخلاقی اصول کے خلاف سمجھتا ہوں۔ زمینداروں کے خلاف تو میں نے ایک لفظ نہیں کہا اور نہ کبھی ان کا مقابلہ کیا۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ زمینداروں کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ لبرلوں کی قونسل ختم کردی، ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ سوراج کے جھنڈے جہاں جہاں نصب کیے گئے ہیں۔ ہر مقام پر زوروں سے لہرا رہے ہیں۔

آپ کا مخلص - موتی لال نہرو

سر ولیم اور میرے رفقاء کار:

سر ولیم میرس ایماندار اور دل کے صاف گو تھے۔ انگریزی ادب پر بڑا عبور تھا۔ ان کی نوکری ہی میں لارڈ کرزن ان کی ادبی لیاقت اور زور قلم سے بہت متاثر ہوئے تھے ہومر کی نظموں کا ترجمہ لاطینی زبان سے انگریزی میں کیا ہے جو انگریزی ادب میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مقرر اچھے نہ تھے۔ مسٹر مونٹیگو وزیر ہند جب اس ملک میں آئے تو ریفارم اسکیم تیار کرنے کے لئے انھیں خاص طور پر منتخب کیا وہ معاملات میں بہت بے لوث تھے اور اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ کسی فعل سے طرفداری کی بو نہ آئے۔

حسب ذیل دو قصوں سے ان کی طبیعت کی پرداخت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نواب ابوبکر خاں مرحوم رئیس دادوں ضلع علی گڑھ سر ولیم کے خاص دوستوں میں سے تھے، اور جب سر ولیم علی گڑھ میں کلکٹر تھے تو ان سے بے تکلفانہ دوستی تھی۔ میں نے ایک روز سر ولیم سے سفارش کی کہ خان بہادر ابوبکر خاں کو ''نواب'' کا خطاب دیا جائے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے ''دنیا یہ تو نہ کہے گی کہ تمام خطابات سر ولیم ہی کے دوستوں کو دیئے جاتے ہیں۔'' میں اس جواب پر ذرا جل گیا۔ میں نے کہا کہ اگر لوگوں کے ایسی بات ذہن نشیں ہو تو ضرور برا ہے۔ مگر اس زمانے میں تو اس سے بدتر احساس لوگوں کو ہو رہا ہے۔'' سر ولیم: ''وہ کیا''؟ میں نے کہا اس وقت لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ''سر ولیم کے دوست ہمیشہ ٹوٹے میں رہتے ہیں۔''

("Sir William's friends are always left in the cold.")

میرے ان الفاظ پر سر ولیم بہت ہنسے اور سفارش منظور کر لی۔

راجہ مان سنگھ رئیس لکھنؤ ضلع علی گڑھ نے بیس ہزار روپیہ ہاتھرس کے شفاخانہ کو بطور چندہ دیا۔ میں نے ان کی اس فیاضی کے صلے میں سفارش کی کہ انھیں راجہ کا خطاب دیا جائے سر ولیم کہنے لگے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ یہ چندہ مان سنگھ نے خطاب کی غرض سے دیا ہے یا رفاہ عام کی نیت سے۔ میں نے کہا اس معیار سے اگر آپ لوگوں کو جانچیں گے تو بہت ہی کم لوگ اس جانچ میں پورے اتریں گے ہمیں تو اس شخص کی فیاضی کی داد دینی چاہئے اس کی نیت کیا تھی خدا بہتر جانتا ہے۔ اس کے بعد میری سفارش منظور کر لی۔

صوبہ میں عام خیال تھا کہ سر ولیم اپنے ہم قوم لوگوں کے بہت طرفدار تھے اور یہ سچ بھی تھا لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ بیجا طور پر انگریز نوازی کرتے تھے۔ میں نے کم وبیش پانچ برس تک بہت قریب سے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اکثر انگریز اکثر ہندوستانیوں سے زیادہ بے لوث طریقہ پر کام کر سکتے ہیں اور شخصی طور پر ہندوستانیوں سے زیادہ فرض شناس ہوتے ہیں۔ لیکن جب انھیں یہ یقین ہو جاتا تھا کہ کوئی ہندوستانی اس معیار کے مطابق ہے تو پھر مطلق فرق نہیں کرتے تھے۔ کنور سر جگدیش پرشاد کو انھوں نے چیف سکریٹری بنایا حالانکہ ان سے سینیر انگریز موجود تھے۔ میں نے اپنے زمانہ میں اکثر انگریزوں کو جزا و سزا دی لیکن سر ولیم نے کبھی دخل نہ دیا۔

سموئل اوڈانل کو ہم لوگ ''اوڈی'' کہا کرتے تھے یہ آئرلینڈ کے باشندے تھے اور بڑے اچھے مقرر تھے۔ انکی تقریر میں میں روانی اور بہت اچھے دلائل ہوتے تھے۔ لیکن بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اعلان یا گورنمنٹ کا کوئی مراسلہ پڑھا جا رہا ہے۔ جذبات سے یکسر خالی۔ ان کی تقریر میں فقط منطق ہوتی تھی۔ بڑے اعصابی مزاج تھے جس روز کونسل میں ان پر تنقید زیادہ ہوتی تھی۔ تو برابر رومال دانتوں سے پھاڑتے رہتے تھے۔ ان کی رائے صائب نہیں ہوتی تھی مگر سر ولیم کو ان پر بے حد اعتماد تھا۔ ٹینس بہت اچھی کھیلتے تھے۔ اور اگر کچھ انسان معلوم ہوتے تھے تو ٹینس کے وقت ورنہ ایک زندہ مشین تھے جس میں انسانی محسوسات اور جذبات کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ انگریز افسروں کے بڑے طرفدار تھے اور ہندوستانی افسروں پر سخت گیری ان کی پالیسی تھی۔

راجہ پرمانند:

کنور جگدیش پرشاد کے چچا تھے بڑے بامروت انسان تھے باوجود معمر اور ضعیف ہونے کے بہت محنت کرتے تھے۔ چونکہ چند ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اس لئے ان کی انتظامی قابلیت کے دیکھنے کا زیادہ موقعہ نہ ملا۔ مگر بہ حیثیت انسان کے پرانے مکتب کے خیالات کا بہترین نمونہ تھے۔

میرا پہلا دورہ:

اگست کے مہینے میں میں نے پہلا دورہ کیا اور بریلی گیا اس دورہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ دسمبر میں کونسل کے انتخابات ہونے والے تھے اور سرولیم کی قدرتاً یہ خواہش تھی کہ وزراء انتخاب میں اپنی پارٹی لاسکیں۔ مجھے اول اول تقاریر کرنے میں خاصی جھجک ہوتی تھی مگر تھوڑے ہی روز میں گاتے گاتے گلا موت ہو گیا۔ میرے پیش رو وزراء کے نقش قدم گو ایک حد تک میری رہبری کرتے تھے۔ لیکن اتنا محسوس ضرور ہوتا تھا کہ وزراء سوائے اپنے صیغہ جات کے انتظام کے عام انتظامی فضا کو زیادہ متاثر نہ کر سکے تھے۔ رزروڈ پارٹمنٹس بالکل اسی طرح چل رہے تھے گویا اصلاحات آئی ہی نہ تھی اور وزراء کا وجود عام انتظام پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایک ممبر گورنمنٹ کے واسطے یہ کافی نہیں کہ وہ صرف اپنے محکموں کی نگرانی کرے بلکہ جب گورنمنٹ کی میٹنگ ہو تو اس کا کام ہے کہ بنیادی اصولوں کو اپنے روبرو رکھ کر اس کی کوشش کرنے کہ گورنمنٹ بہ حیثیت ایک واحد ہستی کے ہر محکمہ میں اس طرف برابر گامزن رہے جو اس وقت ہمارا گول یا مطمح نظر ہو۔

ارکان کابینہ کا اتحاد عمل:

جمہوری اصولوں پر پارلیمنٹری طرز حکومت اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا۔ جب تک جملہ ممبران کابینہ یکجہت ہو کر کام نہ کریں۔ میں نے محسوس کیا کہ صورت حال یہ نہ تھی۔ منتقلہ اور غیر منتقلہ صیغہ جات دو الگ حکومتیں تھیں نہ صرف یہ کہ ان میں آپس میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی بلکہ ایک طرح کی باہمی رقابت کی سی کیفیت تھی جس کی وجہ سے وزراء غیر منتقلہ صیغہ جات کی پالیسی پر مطلقاً اثر انداز نہ ہو سکتے

تھے راجہ پر مانند اور میں نے یہ کوشش کی کہ ہم دنوون ایک ٹیم کی حیثیت سے کام کریں اور غیر منتقلہ صیغہ جات میں بھی اگر کوئی حکم ہمارے اتفاق سے نافذ ہوا ہے تو منظر عام پر کھڑے ہو کر اسکی تائید کریں اور اس طرح ان محکموں کو بھی اپنی پالیسی سے متاثر کر سکیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں اگزکٹیو کونسل کی میٹنگ میں طے پاتے تھے، اگر چہ سر ولیم کا طبعاً رجحان خاطر اس کے خلاف تھا۔ حسب ذیل اصول میرے نزدیک بنیادی تھے:

۱- ہندو اور مسلمانوں میں حتی الوسیع تفریق نہ ہونے دی جائے۔

۲- مسلمانوں کی اس صوبہ میں اقلیت ہے ان کے حقوق کی پوری حفاظت کی جائے تاکہ ان میں مایوسی اور بے اطمینانی نہ ہو۔

۳- ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھائی جائے اور وزراء کے ماتحت جو ملازم ہوں انھیں ان پر کامل اقتدار ہو۔

۴- صوبہ کی صنعت کی ترقی دینے کے لئے گورنمنٹ کے محکموں میں دیسی مصنوعات استعمال میں آئیں۔

۵- میں اس حد تک انگریزی اقتدار کا حامی تھا کہ فرقہ وارانہ کش مکش میں وہ ہر فریق کو اس کے جائز حدود میں رکھ سکے۔

۶- وزراء کے محکموں میں گورنر کی مداخلت کا میں سختی سے مخالف تھا۔

آج ہندوستان میں جو بے چینی اور بیزاری نظر آرہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے مجھے ان اصولوں کی صداقت کا اور بھی یقین ہو گیا ہے۔

کونسل کا پہلا اجلاس:

چونکہ میرا استعفیٰ کہ جو اپنی پہلی رفیقہ حیات کے انتقال سے متاثر ہو کر دیا تھا منظور نہ ہوا تھا اور آخر ماہ اکتوبر میں کونسل کا اجلاس تھا۔ اس لئے مجھے جانا ہی پڑا۔ یہ اجلاس میری وزارت کے زمانہ کا پہلا اجلاس تھا۔ سر ولیم نے کنور جگدیش پرشاد سے کہا کہ مجھے امید ہے کہ کونسل کو اس کا احساس ہو گا کہ نواب صاحب کتنا بڑا صدمہ پہنچ چکا ہے۔ (یہ میری بیوی کی رحلت کی طرف اشارہ تھا جس کا مجھ پر بڑا اثر تھا)۔

۱۴ر اکتوبر کا اجلاس تھا۔ میں ۲۰ر اکتوبر کو اپنے بچوں کو خدا کے سپرد کر کے

اور عالم اسباب میں ان کے نانا اور نانی کی سایہ شفقت میں چھوڑ کر لکھنؤ روانہ ہوا۔ مجھے تشویش اس لئے تھی کہ دو ہندو وزراء کے بجائے ایک مسلمان اور ایک ہندو وزیر مقرر ہوئے تھے۔ ہوم ممبر پہلے ہی سے مسلمان تھے اس لئے پوری گورنمنٹ میں مسلمانوں کا تناسب نصف تھا اور انگریز ممبر کو اگر الگ کر دیا جائے تو پھر وہ دو تہائی مسلمانوں کا تناسب تھا۔

کونسل کے ممبران میں مسلمانوں کی تعداد سو میں تیس تھی۔ اگر سرکاری ممبران کو شامل بھی کر لیا جائے تب بھی اکثریت ہندو حضرات کی ہوتی تھی۔ مجھے یہ خیال تھا کہ اگر ہندو مقرر حضرات نے فرقہ وارانہ نظر سے میری تقرری کو دیکھا تو پہلا ہی اجلاس کونسل میری وزارت میں آخری اجلاس کونسل ہوگا۔ میں کونسل میں شکست نہیں چاہتا تھا، گو خود استعفیٰ دینے کو تیار تھا۔

اجلاس میں سب سے پہلے مسٹر چنتا منی کا ایک تار پڑھا گیا جس میں علالت کی بنا پر انہوں نے اپنی غیر حاضری پر افسوس کیا تھا۔ پنڈت جگت نرائن بھی یاد نہیں کہ کس وجہ سے تشریف نہیں لائے۔ مجھے اپنے اندیشہ کے خلاف کونسل میں سوالات کے جوابات دینے یا مباحثہ میں حصہ لینے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اس اجلاس میں دو رزولیوشن ایسے تھے جن کا میرے صیغہ جات سے تعلق تھا۔ ایک میں تو مجھے خود کونسل سے اتفاق تھا، لیکن دوسرے میں امپائر اگزی بیشن کی شرکت کے خلاف تھا۔ گورنمنٹ کو اختلاف تھا۔ گو رزولیوشن میں ایک لفظ بھی ایسا نہ تھا جسے تحریک غیر اعتماد سے تعبیر کیا جائے اور نہ تقاریر میں اشارتاً بھی اس کا اظہار کیا گیا۔ لیکن چونکہ مخالف پارٹی کی طرف سے تحریک آئی تھی عام فضا دورانِ مباحثہ میں ایسی ہوگئی تھی جسے وزارت پر حملہ سے تعبیر کیا جائے۔ لیکن جس وقت رائے شماری کی گئی تو سولہ رائیں رزولیوشن کے ساتھ، ستاون وزارت کے ساتھ ہوئیں۔ اس جلسہ کے بعد کونسل کا خاتمہ ہوگیا اور دوسرے انتخاب کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

کونسل میں زمینداروں کی اکثریت:

کونسل میں اس کامیابی سے مجھے بڑی مسرت ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ

ہاؤس میں زمینداروں کی اکثریت تھی اور وہ بجائے اس خیال کے کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون ہے اس نظر سے دیکھتے تھے کہ زمیندار وزارت ہے اور ان کی پارٹی برسر اقتدار آئی ہے۔ یہ واقعہ ایک ایسی کونسل میں جہاں ہندو اکثریت تھی اور ان حالات میں کہ ہندو وزراء کے بجائے ایک ہندو اور ایک مسلمان وزیر تھا۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے میں ہندو مسلمان ایک دوسرے سے بہت دور نہ جا چکے تھے۔

جداگانہ انتخاب کا اثر:

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جداگانہ انتخاب اس کشیدگی کا سبب ہے۔ اگر صرف یہ کہا جائے کہ جداگانہ انتخاب سے اس میں اضافہ ہوگیا تو میں مان لوں گا۔ لیکن یہ کشیدگی جداگانہ انتخاب نے پیدا نہیں کی۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ہی کیوں کیا۔ اس کا جواب فقط ایک ہی ہوسکتا ہے۔ کہ وہ اکثریت کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ جداگانہ انتخاب کا مطالبہ نتیجہ تھا اس بے اعتمادی کا جو اقلیت کے دل میں تھی۔ لیکن یہ بحث بے معنی ہے۔ اگر بحث کی جاسکتی ہے تو اس پر کہ اب کس طرح اس کشمکش کو رفع کیا جائے۔ اس کا کوئی ایک مداوا نہیں ہوسکتا۔ اس کا مداوا تو میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ فریقین ایک دوسرے پر اعتماد کریں اور یہ اعتماد پیدا یوں ہوگا کہ ایک دوسرے کے حلیف بنیں، حریف نہیں۔

میرا خیال ہے کہ انتخاب کے وقت چونکہ تقسیم فقط اس بنا پر ہوتی ہے کہ یہ ہندو ہے اور وہ مسلم تو ایسے انتخابات دو صفحوں میں ممبران کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس کے بجائے اگر افادی اصول پر انتخاب ہو تو تقسیم مفاد کی بنیاد پر ہوگی نہ کہ مذہب پر۔ اس طور پر مذہبی تفریق بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔

ملک کی فضا کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ اس اصول سے شاید ہی کسی کو اتفاق ہو لیکن اس امر کو سمجھ لینے میں کیا قباحت ہے کہ یہ تقسیم کوئی انوکھی تقسیم نہ ہوگی۔ یورپ کی ترقی پسند حکومتوں میں یہ اصول کارفرما ہے۔ اس سے مذہب کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اور نہ مذہب اس میں حارج ہے۔ ہم کو اپنے ملک کی مخصوص حالت کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے طبقاتی کشاکش شروع ہو جائے گی اور مختلف مفاد آپس میں ٹکرانے لگیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب کیا کاشتکار اور زمیندار دو مخالف پارٹیوں میں تقسیم نہیں ہو چکے ہیں۔ کیا مزدور اور سرمایہ دار کی کش مکش کے مظاہرے ہر روز نہیں ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ طبقاتی کشاکش اتنی مضر نہیں ہوتی جتنی کہ مذہبی جنگ۔

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد میں نے اس پر ایک نوٹ لکھا تھا اور بعض ریاستوں کو بھیجا تھا۔ جس میں حیدر آباد بھی تھا۔ میرا اس تحریر سے مدعا نہیں کہ حیدر آباد کا طرز انتخاب میرا رہین منت ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ حیدر آباد کے مفکرین خود اس نتیجہ پر آئے اور اب اس کی آزمائش در پیش ہے۔ البتہ میرا دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس کا تجربہ اور مقامات پر بھی کیا جائے۔

لکھنؤ میں لارڈ ریڈنگ کی آمد:

اسی زمانہ میں لارڈ ریڈنگ (اس زمانہ کے ویسرائے صوبہ یوپی میں آئے جہاں تک مجھے یاد ہے انہی تاریخوں میں وہ لکھنؤ تشریف لائے جب کونسل کا جلسہ ہوا۔ ڈنر پر میں لیڈی ریڈنگ کے برابر بیٹھا تھا۔ لیڈی ریڈنگ بہت اونچا سنتی تھیں اور آلہ سماعت کی مدد سے بھی سننے میں دقت ہوتی تھی۔ سر ولیم کا یہ دل چاہتا تھا کہ میں ایک منٹ خاموش نہ ہوں اور لیڈی ریڈنگ سے مسلسل باتیں کرتا رہوں۔ جب ذرا خاموش ہوتا تھا تو گورنر سامنے سے اشارہ کرتے کہ باتیں کرو۔ فرمائش سے گفتگو کرنا آسان نہیں سنگ آمد و سخت آمد۔ بہر حال نیپال کے شیر کے شکار سے لے کر گلیڈسٹن اور ملکہ وکٹوریہ کے مناقشے سبھی پر گفتگو رہی۔ ڈنر کے بعد لارڈ ریڈنگ کے پاس بٹھا کر میری اس تقریر کی سر ولیم نے بہت تعریف کی جو کونسل میں امپائر کی نمائش کی شرکت کے سلسلہ میں کی گئی تھی۔

یہاں سے لارڈ ریڈنگ الہ آباد گئے۔ وہاں ان کو میں نے خسرو باغ میں ایٹ ہوم دیا اور دن کی آتش بازی بھی دکھائی۔

دوسرا انتخاب اور بلا مقابلہ کامیابی:

اب ہم لوگ دوسرے انتخاب کی تیاریاں کرنے لگے اور اضلاع کا دورہ

شروع ہوا اس زمانہ کے انتخابات میں کش مکش کا یہ رنگ نہ تھا اور فریقین ایک دوسرے کو سخت سست کہنے کی تفریح کے خوگر نہ تھے۔ انتخاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ لبرل حضرات اس انتخاب میں بالکل نہ آ سکے اور ۲۰، ۲۲ سوراجسٹ آ گئے۔ میں اور راجہ پر مانند دونوں بغیر مقابلہ منتخب ہو گئے سر ولیم کو اس سے بڑی مسرت تھی کہ ان کے کئے لاج رہ گئی۔ میں نے اپنے خط میں انھیں جب اپنے انتخاب کی اطلاع دی تو یہ بھی لکھا کہ راجہ پر مانند ضرور اس کے مستحق ہیں کہ انھیں دوبارہ مقرر کیا جائے۔ لیکن میرے بجائے اگر گورنر کسی دوسرے کا تقرر کریں تو مجھے شکایت نہ ہوگی سر ولیم نے جواب میں حسب ذیل خط بھیجا۔

GOVERNOR'S CAMP,
UNITED PROVINCES
November 9, 1923

My Dear Nawab Sahib,

I was delighted to hear of your unopposed election. The fact that both Ministers were returned unopposed would in a more-politically practised country be taken as very singnificant of the strength of their position with the electorate. Also you will both be free to carry help wherever needed during the remaining weeks.

Thank you very much for your generous letter. I will tell you with entire frankness what is in my mind. I want you to stay on as Minister till the election returns are in; and then for both Ministers to put their resignations formally in my hands; then, if, as I hope the composition of the new Council justifies such a course, I shall ask you both to reasume office; and if you should have any doubts about doing so I hope you will come and talk them over and I trust that I may be able to dispose of them.

With all good wishes,

Yours sincerely,
(Sd,) W. MARRIS

انتخاب کے نتائج نکلنے سے پہلے بعض اخبارات میں یہ بھی شائع ہوا کہ کونسل میں زمینداروں کی اکثریت نہیں ہوگی۔ اور سر جگدیش پرشاد نے جب اس کی تفتیش کی تو پتہ لگا کہ بعض سرکاری ذرائع سے ہی اس کی شہرت کرائی گئی۔ الیکشن سے فارغ ہو کر میں لکھنؤ گیا اور راجہ پر ماناند اور میں گورنر سے بعد مغرب ملے انہوں نے الیکشن کی کامیابی پر مبارک باد دی اور قاعدہ کے مطابق ہمارے استعفے مانگے چنانچہ میں نے اور راجہ صاحب نے اپنے استعفیٰ دینے کے ایک دو روز بعد ہی راجہ پر ماناند صاحب بیمار ہو گئے اور چند روز بعارضہ نمونیہ علیل رہ کر رحلت فرما گئے۔

ان کے انتقال کا مجھے بہت صدمہ ہوا۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے مجھے پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ اور ایک رفیق کار کی حیثیت سے مجھ پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ اور ایک رفیق کار کی حیثیت سے بے حد اعتماد کرتے تھے ایسے رفقاء کار مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ مجھے اتنا مخلص رفیق کار کبھی نصیب نہ ہوا۔

راجیشور بلی کی وزارت:

اب یہ عقدہ مشکل سامنے تھا کہ وزیر کسے منتخب کیا جائے۔ ایسے انتخابات ہمیشہ پارٹی میں بے چینی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک سے زیادہ حضرات متمنی ہوتے ہیں اور جن کو نہ لیا جائے۔ وہی آزردہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر رشک کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ لیکن اب سیاسی جماعتوں کو عوام کی نظر میں اتنا اقتدار حاصل ہو گیا ہے کہ پارٹی کے خلاف کسی کو علم بغاوت بلند کرنے کی جراءت نہیں ہوتی اور اگر کوئی ایسا کرے تو پارٹی کے قائدین اعظم اس کی سیاسی زندگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، لیکن زمیندار پارٹی میں لوگ اپنے ذاتی اثرات منتخب ہو کر آئے تھے پارٹی کی تنظیم اضلاع میں کچھ بھی نہ تھی ایسی جماعتوں کی شیرازہ بندی میں ذاتی خواہشات کی بنا پر بہت دشواریاں ہوتی ہیں اور ان سب سے مجھے دوچار ہونا پڑا۔

میرے نزدیک دو اشخاص موزوں ترین تھے ایک رائے بہادر سر سیتا رام اور دوسرے رائے راجیشور بلی۔ مگر میں سر سیتا رام کو ترجیح دیتا تھا چنانچہ جمشید علی خاں کے مشورہ کے بعد میں نے ان کے پاس میرٹھ پیام بھیجا کہ مجھ سے مل جائیں لیکن وہ

میرٹھ سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے خود ان کے گھر کے لوگوں کو بھی پتہ نہ تھا اگر وہ آ جاتے تو یقیناً وہی وزیر ہوتے۔

گورنر نے مجھے دہرادون بلایا کہ دوسرے وزیر کے نام پر غور کیا جائے میں پہلی جنوری ۲۴ءکو دہرادون پہنچا اس روز گورنر سے ملاقات کے بعد روزنامچہ میں یہ اندراج ہے۔

"Had a talk about a new minister. Sita Ram or Rajeshwar Bali likely to get it. I am for the former."

"نئے وزیر کے بارے میں گفتگو ہوئی سیتارام یا راجیشور بلی کو (وزارت) ملنے کا امکان ہے میں اول الذکر کے حق میں ہوں۔" اسی روز گورنر سے یہ معلوم ہوا کہ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کو کے سی، آئی، ای اور راجہ صاحب یہ جہانگیر آباد کو سی۔ ایس۔ آئی۔ ملا۔ آخر الذکر کا خطاب چونکہ میری سفارش کا نتیجہ تھا مجھے مسرت ہوئی اس زمانے میں ان چیزوں کی بڑی قدر تھی۔ اسی سال عبدالسمیع خان بہادر کیا گیا۔ مجھے اپنی اس سفارش کی کامیابی پر بہت مسرت تھی۔

میں لکھنؤ پہنچا اپنے عزیز دوست کنور جگدیش پرشاد سے مشورہ کیا جن کی رائے کی میرے دل میں بڑی وقعت تھی اور اب تک ہے وہ راجیشور بلی کی طرفدار تھے ۴ر جنوری کے روزنامچہ میں یہ الفاظ ہیں۔

"Had a long talk about the second minister. K. is in favour of R. I like S."

"دوسرے وزیر کے بارے میں طویل گفتگو ہوئی "کے" راجیشور بلی کے حق میں ہیں اور انہوں نے مجھ سے بھی اصرار کیا۔ میں خود سیتارام کو پسند کرتا ہوں۔" اسی روز راجہ صاحب محمودہ آباد تشریف لائے بڑی شفقت سے ملے ان کا خیال تھا کہ راجہ جگناتھ بخش سنگھ کو لیا جائے۔

پھر فنانس ممبر سر سیم اوڈانل سے ملا انہیں میری رائے سے اتفاق تھا۔ کہ سر سیتارام یا راجیشور بلی مناسب ہوں گے۔ ۵ر جنوری کو جگناتھ بخش سنگھ میرے پاس اپنی وزارت کے سلسلہ میں آئے میرے روزنامچہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"Had a talk with J."

راجہ جگناتھ بخش سنگھ سے گفتگو ہوئی۔

اسی روز رائے بہادر مشعل سنگھ سے ملا کونسل کے ایک با اثر ممبر تھے۔ اور شاید ہردوئی ضلع سے منتخب ہوئے تھے انھوں نے بہت وضاحت سے یہ کہا کہ وہ جگناتھ سنگھ کے سوا زمیندار پارٹی کے ہر ممبر کا ساتھ دیں گے۔

اسی شام کو راجہ رام پال سنگھ آئے وہ راجیشور بلی کے طرفدار تھے راجہ سر رام پال سنگھ کا ہندو تعلقہ داران پر بہت اثر تھا۔ اور ان کی قیادت اس طبقہ میں مسلّم تھی۔ ان کے تعلقات راجہ صاحب محمود آباد سے بہت کشیدہ تھے۔ اس کش مکش میں میری کیا حالت تھی محتاج بیان نہیں۔ ۶ر جنوری کے روز نامچہ میں لکھا ہے اسلم سیفی آئے اور کہا کہ ''س'' (سرسیتارام) راضی ہے اور آنا چاہتا ہے میں نے گول جواب دیا سوائے اس کے چارہ ہی کیا تھا۔ جنوری کو پھر راجہ صاحب محمود آباد تشریف لائے۔ روز نامچہ کے الفاظ یہ ہیں۔

کھانے کے بعد یکا یک راجہ صاحب آ گئے وہی وزارت کا جھگڑا وہ ''ج'' (جگناتھ بخش سنگھ) پر زور دیتے ہیں اور راضی ہیں۔ ''س'' (سرسیتارام) پر بھی مگر ''ر'' (راجیشور بلی) کے نام سے بہت گھبراتے ہیں اسی روز شام کو ہز ایکسیلنسی کے یہاں گیا میں نے اپنی رائے ''ر'' کے واسطے دے دی شاید میری رائے ''س'' کے متعلق ٹھیک تھی اور ''ک'' (کنور جگدیش پرشاد) کی رائے ''ر'' کے متعلق غلط تھی میرے اس فعل کا یہ اثر ہونا لازمی تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد مرحوم کچھ مکدر ہو گئے۔

میں نے راجیشور بلی کو ترجیح اس وجہ سے دی تھی کہ پوری گورنمنٹ میں ایک ہی ہندو ممبر تھا۔ لہٰذا اسے پوری طرح ہندو اعتماد کا حامل ہونا چاہئے۔ اگر میں جگناتھ بخش سنگھ کو لیتا تو ہندو ممبران میں یہ احساس ہوتا کہ ہندو ممبر بھی وہ لیا ہے جو ایک مسلمان کے زیر اثر ہے نتیجہ یہ ہوتا کہ وزارت بہت روز نہ چل سکتی تھی نیز ۲۸ء میں یہ ثابت بھی ہو گیا۔ جب راجہ صاحب کو وزیر کیا گیا تو پہلے ہی کونسل کے اجلاس میں ان پر عدم اعتماد کا روز ولیوشن پاس ہو گیا۔ ۸ر تاریخ کو گورنر نے راجیشور بلی کو مقرر کر کے ۹ر کو کونسل میں اس کا اعلان کر دیا۔

انتخاب کے آئینی کونسل:

اس کونسل میں لبرل تو ایک بھی نہ تھا لیکن ۲۲،۲۰ کے قریب سوراجسٹ تھے۔ یہ ایک

نہایت ہی منظم پارٹی تھی اور پارٹی کے احکام کے خلاف کسی ممبر کو لب کشائی کی اجازت نہ تھی۔

پنڈت گوبند بلب پنتھ:

پنڈت گوبند بلب پنتھ اس کونسل میں پہلی بار منتخب ہو کر آئے مجھے یاد ہے عاشق مرزا صاحب انھیں مجھ سے ملانے لائے تھے۔ یہ بے حد خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ کونسل میں آئے تو سب سے پچھلی کرسیوں پر بیٹھے لیکن ان کی پہلی تقریر سننے کے بعد لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس جماعت میں ستارۂ بلندی کس کی پیشانی پر درخشاں ہے۔ تھوڑے ہی روز میں یہ پارٹی کے لیڈر مقرر ہو گئے۔ سیاسی عقائد کے اختلاف کے باوجود میرے ان کے تعلقات نہایت دوستانہ ہیں مقرر بہت ہی اچھے ہیں۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں بڑی پر اثر تقریر کرتے ہیں۔ تقریروں میں جذبات کی جھلک سنجیدگی کی شان اور زبان کی سلاست و روانی مل کر بڑا اچھا اور گہرا اثر پیدا کرتی ہیں۔

راجیشور بلی آنجہانی:

میرے نئے رفیق کار شروع میں تو تقریر کرنے کے عادی نہ تھے اور کونسل میں ذرا دقت ہوئی۔ مگر بہت جلد خاصی تقریر کرنے لگے۔ بہت با اصول اور محنتی شخص تھے۔ قوت فیصلہ کی ذرا کمی تھی۔ اور کثرت سے فائل جمع ہو جاتے تھے جنھیں میں سر سر جگدیش کوشش کر کے طے کراتے تھے۔

تین ڈاکٹر:

کہتے ہیں ”دو ملاؤں میں مرغی حرام“ مگر یہاں تین ڈاکٹر بیک وقت کونسل میں آ گئے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر گنیش پرشاد اور ڈاکٹر شفاعت احمد آخر الذکر حضرت بڑی طویل تقاریر فرماتے تھے جو بہت بلند بانگ ہوتی تھیں۔ لیکن اگر ممبران اس سے نفع اندوز نہ ہوتے تھے تو اس میں مقرر کا کیا قصور ممبران ہی کی بدنصیبی خیال کی جائے۔

بابو چھیل بہاری کپور کا لطیفہ:

یہاں ایک قصہ یاد آ گیا بابو چھیل بہاری کپور بریلی کے ممبر تھے اور بہت طویل تقریر کرتے تھے۔ پھر اس قدر رک رک کر بولتے کہ ہر لفظ کے بعد گمان ہوتا تھا

کہ فقرہ ختم ہو گیا ایک روز بابو صاحب شام کو تقریر کرنے کھڑے ہو گئے ہاؤس میں کورم باقی نہ رہا۔ بابو صاحب نے پریسیڈینٹ سے شکایت کی تو سر لوڈوک پورٹر نے فوراً کھڑے ہو کر کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ معزز ممبران میں یہ خبر مشہور ہو گئی ہے کہ معزز ممبر بریلی تقریر فرمائیں گے۔"

وزارت کے خلاف سازش:

اس زمانہ میں بعض سازشیں بھی وزارت کے خلاف شروع ہو گئیں۔ لوگوں سے عجیب عجیب روایتیں سننے میں آئیں۔ خدا جانے ان میں کتنا سچ تھا ۱۰، ۱۱ جنوری کے میرے روزنامچہ میں یہ عبارت ہے۔

آج کا روز بہت دلچسپ ہے ایک ممبر گورنمنٹ اور ان کی پارٹی کے مشورہ سے سوراج والوں نے وزراء پر عدم اعتماد کا روزولیوشن بھیجا ہے۔ غریب جمشید مرزا اور اسلم چکر لگاتے پھرتے ہیں کہ کیا ترکیب کی جائے۔" اس کے مقابلے کی......ظہور کو چور کی طرح لایا گیا۔ اس سے سب کچا حال معلوم ہوا کہ جگنا تھ اور وہی بزرگ سب کارروائی کر رہے ہیں۔ ۱۱ رجنوری آج صبح پنڈت جگت نرائن آئے تھے اور صرف یہ کہنے آئے تھے کہ وہی محترم یہ سب کام کر رہے ہیں۔ اور ایک اور حضرت ان کے مشیر خاص ہیں۔ میں نے اس زمانے میں ایک خط سر ہارکورٹ کو برما لکھا اور اس پر اظہار تاسف کیا کہ خود زمیندار اور تعلقہ دار صاحبان اپنی ہی جماعت کی وزارت کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ سر ہارکورٹ نے حسب ذیل خط جواب میں لکھا۔

No. 4669

Private

My Dear Nawab Sahib.

Very many thanks for your letter. I am sorry that you have been so much troubled by a personal clique. It is very distressing to me to feel that the land- owners are so divided among themselves and allow personal feelings to come before public interests. You will have the satisfaction of having done your duty. I hope also that you will not be disheartened. It is

the penalty that you are paying for success. Success always makes others envious and unreasonable, but if you persevere, I am sure you will pull through and the people will come round.

With all good wishes for 1924, and begging you earnestly again not to be disheartened.

I am,
Yours very sincerely,
(SD.) HARCOURT BUTLER,

رامپور کا دورہ:

۱۵ر جنوری کی شب کو ہم لوگ یعنی پوری گورنمنٹ اور گورنر رامپور کو روانہ ہوئے اسپیشل میں آرام وآسائش کا پورا انتظام تھا۔ ہز ہائی نس رام پور جنت مکان کی سی مہمان نوازی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ ذرا ذرا سی ضروریات پہلے سے سوچ کر مہمان کے واسطے مہیا کی جاتی تھیں۔ ہر مہمان سے ہز ہائی نس کا ملنا اور گفتگو کرنا۔ مہمان نوازی میں چار چاند لگا دیتا۔ ہز ہائی نس نے شکایت رنگیں کے طور پر کہا کہ بغیر بلائے نہ آئے اور تم نے یہ شعر پڑھا۔

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بن بلائے ہوئے

یہ شعر میں نے سر عبدالصمد مرحوم کے سامنے ایک بار پڑھا تھا جب انہوں نے ہز ہائی نس کی طرف سے شکوہ کیا تھا کہ رام پور نہیں آتے۔

عدم اعتماد کی تحریک:

جو سازشیں وزراء کے خلاف ہو رہی تھیں وہ رنگ لائیں اور سوراج پارٹی کی طرف سے عدم اعتماد کا روزولیوشن آ گیا انھیں یہ باور کرایا گیا تھا کہ سوراج پارٹی کے علاوہ اور لوگ بھی ساتھ رہیں گے اور اکثریت وزراء کے خلاف ہو جائے۔ لیکن صورت حال اس کے برعکس ہوئی۔ اور وہ لوگ بھی جن پر ہمارے خلاف رائے دینے کے سلسلہ میں بانیان سازش بھروسہ کر رہے تھے ہمارے ساتھ آ کر مل گئے۔ مثلاً کنور

راجندر سنگھ آنجہانی پوری طرح ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی وجہ سے ہمیں ہر بات معلوم ہو جاتی تھی۔ مزید برآں ہم نے بھی اپنے ساتھیوں کو جمع کرنا شروع کیا۔ ۲۸، ۲۹ جنوری کو یہ تحریک کونسل میں آنے کو تھیں۔ ۲۴ رجنوری کو ایسوسی ایٹیڈ پریس کے حوالہ سے خبر مشہور ہوئی کہ عدم اعتماد کا رزولیوشن نہیں آئے گا۔ کنور سر جگدیش پرشاد نے اسے مخالف پارٹی کی چال تصور کیا۔ اور ہماری طرف سے اپنے طرفدار ممبروں نے تار دیئے گئے کہ اس خبر کو باور نہ کریں۔

آخر کار ۲۸ رجنوری آئی کونسل شروع ہونے سے کچھ پہلے میں ہاؤس میں گیا تو ہاؤس بھرا ہوا تھا اور ایک صاحب کمبل میں لپٹے ہوئے کرسی پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پاس جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک نئے ممبر شوراج سنگھ تھے۔ جو شدید بخار کی حالت میں چلے آئے۔ اس اظہار خلوص پر میں تڑپ اٹھا اور شوراج سنگھ سے خواہش کی کہ میری کوٹھی پر چل کر آرام کیجئے۔ مگر انہوں نے صاف انکار کیا کہ بغیر رائے دیئے نہ جاؤں گا۔ بڑی خوشامد کے بعد اس پر راضی ہوئے کہ میرے دفتر میں جا کر لیٹ جائیں اور رائے دینے کے وقت انھیں بلا لیا جائے۔ کونسل شروع ہوئی اور محرک سنجیت سنگھ راٹھور نے یہ کہہ دیا کہ "چونکہ کل بھی یہ رزولیوشن آ رہا ہے، میں آج پیش نہ کروں گا۔"

مزہ دار بغل گیری:

سب سے پہلی فکر مجھے شوراج سنگھ کی تھی انھیں فوراً موٹر میں کوٹھی روانہ کیا اور ڈاکٹر بلانے کا انتظام کیا اسی روز میں دفتر سے اٹھ کر ممبران کی نشست کے کمرہ میں گیا تو دیکھتا ہوں کہ بھائی تصدق احمد خاں شروانی (مرحوم) ممبران کو مخاطب کر رہے ہیں۔ جدھر سے میں آیا انکی اس دروازہ کی جانب پشت تھی۔ میں خاموشی سے آگے بڑھا لبوں پر انگلی رکھے ہوئے۔ ممبران جن کا رخ میری طرف تھا میرے اشارہ کو سمجھ گئے اور خاموش کھڑے رہے میں تصدق مرحوم کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مشکل سے دو تین انچ کا فاصلہ ہوگا۔ وہ بڑے روز سے وزراء کے خلاف تقریر کر رہے تھے۔ یا تو ممبران کے چہرہ کا تبسم یا غالباً میری ہنسی کی آواز سے وہ یکا یک پلٹے اور ہم دونوں بغل گیر تھے، اور ممبران ہنسی سے بیتاب۔

پنڈت موتی لال نہرو کی شرافت وفراخدلی:

اس سلسلہ میں مجھے ایک قصہ یاد آ گیا اور شاید اسی عدم اعتماد کے رزولیوشن کے سلسلہ میں پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے سرلنگ ٹن ہوٹل میں قیام تھا۔ راجہ پرتھوی پال سنگھ (جو وزراء کے بڑے طرف دار اور حامی تھے) شام کو میرے پاس آئے رخصت ہوتے ہوئے کہا میں پنڈت جی سے ملنے جارہا ہوں میں نے کہا کہ میرا آداب عرض کر دیجئے گا اور یہ پرچہ پنڈت جی کی خدمت میں پیش کر دیجئے گا۔ میں نے ایک پرچہ پر یہ شعر لکھ کر راجہ صاحب کو دیا۔

نشود نصیب دشمن کہ بود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

راجہ صاحب تھوڑی ہی دیر میں واپس آئے اور کہنے لگے کہ پنڈت جی پرچہ دیکھ کر بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ میرا سلام کہنا اور کہنا میں تو اس وقت کی گاڑی سے الہ آباد جارہا ہوں۔

یہ دونوں واقعات اس کی شاہد ہیں کہ اس زمانہ میں سیاسی اختلافات کا اثر ایسی شکل اختیار نہ کرتا تھا جو ذاتی اور باہمی تعلقات کو بھی تلخ کر دے۔

تحریک عدم اعتماد کی ناکامی:

دوسرے روز پھر کونسل میں بڑا اجتماع تھا۔ تمام ممبر موجود تھے اور تماشا دیکھنے والوں کی گیلری میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ لیکن ان کو کس درجہ ناامیدی ہوگی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہ ممبر غیر حاضر ہیں جن کے نام سے یہ رزولیوشن بھیجا گیا تھا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

شیوراج سنگھ کی علالت نے طوالت اختیار کی۔ کرنل ہنٹر معالج تھے اور ڈبل نمونیہ تشخیص ہوا تھا۔ مجھے بے حد تردد تھا۔ اور میں اس لئے اپنی ذمہ داری زیادہ محسوس کرتا تھا کہ وہ میرے بلائے ہوئے آئے تھے خدا کا شکر ہے کہ ۲۰، ۲۵ روز میں وہ تندرست ہو گئے۔

اب انتخاب کے سلسلہ میں ٹھاکر مانگ سنگھ سوار جسٹ ممبر نے ایک الیکشن

پٹیشن دی جس کا منشا یہ تھا کہ میں نے ان کے مخالف امیدواروں میں سے ایک امیدوار کو روپیہ دے کر بٹھایا۔ اس درخواست سے مجھے بھی تردد تھا، اور کنور جگدیش پرشاد اور نواب صاحب باغپت کی پریشانی کی تو حد ہی نہ تھی نواب صاحب باغپت تو قانونی اور غیر قانونی ہر حرکت کرنے کو تیار تھے۔ آخر کار مقدمہ ہوا اور ہمارا ممبر بابو لال جیتا۔

سوراجسٹ پارٹی کا حلقہ وزارت کی پالیسی:

گو کونسل میں وزارت کے دوستوں اور معاونین کی اتنی اکثریت تھی کہ اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وزارت کو شکست ہو جائے گی لیکن ہم لوگوں کی پالیسی یہ تھی۔ کہ جہاں تک ممکن ہو مخالف پارٹی کو مطمئن کیا جائے۔ یہ اتنا آسان نہ تھا جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ سوراجسٹ پارٹی کی پالیسی یہ تھی کہ اس گورنمنٹ کو جس طرح ہو ختم کر دیا جائے۔ سوائے ایسی تجاویز کے جن کا مقصد اصلاح نہیں بلکہ حکومت کی مشین کو تباہ کرنا ہوتا تھا۔ دوسری تمام تجاویز میں ان کے محسوسات کا خیال وزراء کی طرف سے رکھا جاتا تھا ثبوت میں ہم لوگوں کی تقاریر اور روئداد کونسل میں موجود ہیں۔

اس کونسل میں بائیس سوراجسٹ تھے اور چند ایسے حضرات تھے جن کو انڈپینڈنٹ کہا جائے۔ ان میں بکرما جیت سنگھ آنجہانی، ہنومان سنگھ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں وغیرہ تھے اس طرح بیس بائیس سرکاری ممبران کے غیر سرکاری ممبران میں ہماری بڑی اکثریت تھی۔ ''انڈپینڈنٹ'' ان کی بہترین تعریف یہ ہے کہ جس پر کوئی ''ڈپنڈ'' نہ کر سکے لہٰذا ان پر نہ ہم بھروسہ کر سکتے تھے اور نہ سوراجسٹ۔ باوجود اس اکثریت کے وزارت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کوئی پارٹی ہو گورنمنٹ بنانے کے بعد ملک اور پوری قوم کی گورنمنٹ ہے۔ اور ملک میں ہر طبقہ کو مطمئن کرنا میرے خیال میں ایسا اصول تھا جو اس وقت بھی اتنا درست تھا جتنا آج۔ اب ماننا ان کے ہاتھوں ہے جو برسر اقتدار ہوں۔ ہر وزیر کو اس کی قسم کھانا پڑتی ہے کہ وہ بلاخوف اور بغیر رعایت بلا محبت اور بغیر تکدر خاطر انتظام کو چلائے گا۔

حافظ ہدایت حسین مرحوم:

اس سال کونسل میں ایک صاحب حافظ ہدایت حسین کان پور سے آئے

تھے۔ نہایت قابل معاملہ فہم اوراس کے ساتھ مخلص اور بے ریا انسان تھے۔ اس طرح کی خوبیوں کا اجتماع کم ہوتا ہے۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کہنے کے قابل بھی ہیں اوران کا کہنا بھی مشکل بد قسمتی سے میرا تجربہ اس دنیا میں اس طرح کا ہوا ہے کہ اکثر سیدھے وہ ہوتے ہیں جنہیں چالاکی نہیں آتی مقدین اکثر وبیشتر وہ ہوتے ہیں۔ جن میں خیانت کرنے کی استعداد نہیں ہوتی۔ اور ایسے لوگ جن میں جملہ قسم کی صلاحیت ہو اور وہ راہ مستقیم سے قدم نہ ہٹائیں بہت کم ہے۔ حافظ ہدایت حسین مرحوم میں یہ صفت تھی۔ وہ نہایت ذکی اور ذہین تھے اور کبھی جادہ حق کو نہ چھوڑتے تھے۔ تین بار گول میز کانفرنس میں گئے اور میرے ہی زمانہ میں خان بہادر اور سی آئی ای ہوئے۔

منسٹری پارٹی کونوازنے کی کوشش:

اسی زمانے میں ایک کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کو ہماری پارٹی سے توڑ کر ایک الگ پارٹی بنائی جائے۔ اس تحریک کے قائد ڈاکٹر شفاعت احمد مرحوم تھے۔

ایک روز ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ کونسلر میں رزیڈنس میں تنہا دل نہیں لگتا۔ میں نے اپنے یہاں مدعو کرلیا۔ جب کونسل کا اجلاس ختم ہوا تو بعض ممبران نے مجھ سے کہا کہ مرحوم نے اس پارٹی کی بنیاد میرے ہی گھر میں ڈالی تھی میں سناٹے میں آ گیا۔ ہفتہ عشرہ سے زیادہ یہ پارٹی نہ چلی۔ ۷/ مارچ کے میرے روزنامچے میں لکھا ہے۔ ''اب خدا خدا کر کے ان مسلمان ممبروں جو اُدھر مل گئے تھے ادھر لائے''۔

پہلا بجٹ آبکاری:

میں نے آب کاری کا بجٹ کونسل میں پیش کیا۔ میرے دوستوں نے مجھے پوری طرح مدد دی۔ سوراجسٹ پارٹی نے اپنے اصول کے مطابق اختلاف کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ محکمہ کو کلیتاً ختم کیا جائے اور شراب نوشی کو قانوناً روکا جائے میں اس پالیسی کو نا قابل عمل خیال کرتا تھا۔ اور اب بھی میری یہی رائے ہے لیکن اس زمانے میں اس کا لوگوں کو تجربہ نہ تھا۔ اور اکثر حضرات اسے قابل عمل تصور کرتے تھے۔ امریکہ میں یہ پالیسی ناکام ہوئی۔ بمبئی میں پہلی کانگریس گورنمنٹ نے اسے جاری کیا اور ناکام ہوئی۔ اب بھی جہاں جہاں انسداد کی کوشش کی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بُری قسم کی

شراب تازہ کشید گھر بنا کر پیتے ہیں اوران کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ایسے قوانین بنانا جن کو لوگ نا قابل عمل سمجھیں قانون شکنی کو دعوت دیتا ہے۔

مجھے مسٹر چنتامنی کی پالیسی سے (جو میرے پیش رو تھے) اتفاق تھا کہ شراب اور دیگر مسکرات کے حصول میں دشواریاں پیدا کی جائیں۔ان کی قیمت کو زیادہ کیا جائے تا کہ آہستہ آہستہ یہ خبیث عادت اس وجہ سے ختم ہو جائے کہ مسکرات کا حصول دشوار ہوتا ہے اور نہایت گراں پڑتا ہے۔میں نے بجٹ کے تقاریر میں یہ کہا تھا:۔

بہر حال جہاں تک ترک منشیات کا تعلق ہے ہم بھی اسی مقصد کے حصول کی کوشش کر رہے ہیں۔آنریبل ممبران یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ ہماری کوششوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ منشی اشیاء کے استعمال میں حسب ذیل کمی ہوئی ہے۔

However so far as temperance is concerned we are trying to the same end.Honourable members will be pleased to know that the cumulative effect of all our efforts is the fall in consumption which has resulted in 52.8 per cent in the case of country spirit,25.1 per cent in the case of opium, 14.8 per cent in the case of charas 35 per cent in case of ganja and 39.6 per cent in the case of bhang"

کچی شراب	۵۲.۸	فیصدی
افیون	۲۵.۱	"
چرس	۱۴.۸	"
گانجہ	۳۵.۰	"
بھنگ	۳۹.۶	"

ایک دوسرے موقع پر میں نے حسب ذیل الفاظ اپنی تقریر میں کہے:

گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ ہم منشی اشیاء کے زیادہ استعمال سے آمدنی میں اضافہ نہیں چاہتے بلکہ ہماری پالیسی ہے کہ کم سے کم استعمال سے زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو"۔

The policy of the Government is this, we do not want any increase in our revenue by increasing the consumption,

but our policy is to get the maximum of revenue out of a minimum consumption."

محکمہ زراعت کا بجٹ پیش کرتے وقت میں نے دو امور پر خاص زور دیا

(۱) اس زمانہ میں تقریباً تمام گورنمنٹ کے فارم نقصان سے چلتے تھے۔ گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ جو فارم کہ تجربات کی غرض سے ہوں وہ اگر نقصان سے چلیں تو چنداں مضائقہ نہیں لیکن جو فارم بطور نمونہ قائم کئے جائیں انھیں ضرور نفع سے چلنا چاہئے ورنہ نقصان کا مظاہرہ بے معنی بات ہے۔

(۲) تجربہ کے بعد جو تخم اچھے ثابت ہوں انھیں کاشتکار تک پہنچایا جائے اور اس غرض سے مزید تخیم کے گودام کھولے جائیں"۔

غرض مختلف بجٹ تو پاس ہوتے رہے بعض حضرات وزارت کی مخالفت ضرور کرتے رہے مگر خود سوراجسٹ بعض حضرات وزارت کی مخالف ضرور کرتے رہے مگر خود سوراجسٹ بعض اوقات ان کا ساتھ نہ دیتے تھے۔ چنانچہ روئداد میں اکثر ایسی مثالیں ہیں ایک بار زراعت کے بجٹ کے دوران میں راجہ جگناتھ سنگھ صاحب نے ہاؤس کی تقسیم کرائی اور فقط سات رائیں ملیں۔

ضمیمہ بجٹ کے موقع پر پھر ایک ایسی کوشش کی گئی لیکن مخالفین کو تین اور گورنمنٹ کو ۷۲ رائے ملیں اور اس بار بھی سوراجسٹ غیر جانبدار رہے۔ سوراجسٹ حضرات اصولاً گورنمنٹ کے ساتھ کبھی رائے نہ دیتے تھے۔ اور ان کی غیر جانبداری تائید کے مرادف ہوتی تھی۔

یہ سب نئے وزیر کے تقرر کے اثرات تھے بجٹ کی کش مکش ختم ہوتے ہی میں چھتاری کو بھاگا۔ اس زمانہ میں مسٹر جے. سی. بھدوار آئی. سی. ایس علی گڑھ میں جج تھے اور میرا ان سے اور ان کے خاندان سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ بہت مخلص لوگ ہیں آج تک دوستی قائم ہے۔

انجینئروں کا قبضہ:

اس زمانہ میں پی ڈبلیوڈی میں قصہ پیش آیا کہ مسٹر چھوٹے لال اور مسٹر

وڈ دو ایگزیکٹیو انجینئر تھے مسٹر چھوٹے لال سینئر تھے۔ لیکن چیف انجینئر کی یہ خواہش تھی کہ مسٹر وڈ کو ترقی دے کر سپرنٹنڈنٹ انجینئر کیا جائے۔ ان چیف انجینئر سے عام طور پر ہندوستانی خوش نہ تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ قابلیت فنی اور اعمال نامہ کے لحاظ سے مسٹر وڈ اس جگہ کے تقرر میں گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ قابلیت کے لحاظ سے جسے چاہے مقرر کر دے۔ میں نے جو اعمال نامے منگا کر دیکھے تو مجھے محسوس ہوا (اور اپنی سرکاری زندگی میں اور مثالیں بھی میری نظر سے ایسی گزری ہیں) کہ ایک ہندوستانی افسر کی شروع ملازمت سے اعمالنامے میں بہت تعریف کی گئی اور وہ برابر ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ وہ ایسے عہدہ پر پہنچا جہاں اس سے زیادہ ترقی دینا بعض یورپین نظماء کو پالیسی کے لحاض سے پسند دیدہ نہیں تو اس کے اعمالنامہ میں ''لیکن اور اگر'' بڑھنا شروع ہوا مثلاً ایسی عبارت درج ہونے لگی ''شہرت اچھی ہے، فنی قابلیت اوسط ہے لیکن انتظامی قابلیت اچھی نہیں'' اور ترقی کے وقت یہی سدراہ ہو جاتا تھا۔ اس طرح کی صورت یہاں بھی تھی میرا استدلال یہ تھا کہ چھوٹے لال میں ایگزیکٹیو انجینئر ہونے تک تو تمام خوبیاں موجود تھیں پھر یہ کیا ہوا کہ ان میں خرابیاں محسوس ہونے لگیں۔

روز نامچہ ۱۲ رمئی ۱۹۲۴ء وزیر ہند کو مزدور پارٹی کے ہیں۔ مگر ہر معاملہ میں دخل دیتے ہیں۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ مسٹر وڈ کو چھوٹے لال پر ترجیح دے کر سپرنٹنڈنٹ انجینئر کر دیا جائے۔ میں نے تو اپنا نوٹ اس کے خلاف لکھا ہے۔

۱۶ رمئی آج پیشی کا دن تھا اور مسٹر وڈ اور چھوٹے لال کا فائل پیش تھا۔ چیف انجینئر چھوٹے لال کے خلاف اور میں اس کی موافقت میں۔ کوشاں رہے بہرحال ضابطہ میں تو میں جیتا اور وزیر ہند کو جواب میری رائے کے موافق دیا جائے گا مگر لاٹ صاحب کو تھا بہت پس و پیش''

آخر کار وزیر ہند کو میری سفارش ماننی پڑی اور چھوٹے لال ہو گئے۔

۲۲ رمئی کو گورنمنٹ ہاوس میں ڈنر تھا۔ میرے روز نامچہ میں حسب ذیل اندراج ہے کھانے کے بعد گورنر نے فرمایا۔ ''بادشاہ نے مجھے بتایا میرا بیٹا کہتا ہے کہ مانٹیگو کا نام ہی ہندوستان کے انگریزوں کے نتھنوں میں چبھن پیدا کرتا ہے حالانکہ

غریب کی نیت بخیر تھی۔

The king told me my boy tells me that the very name of Montague stings into the nostrils of Englishmen in India. Poor fellow,he meant well"

مولانا محمد علی کا لطیفہ:

اسی زمانہ میں مولانا محمد علی مرحوم جیل سے چھٹ کر نینی تال آئے ہوئے تھے۔میں نے کھانے پر بلایا۔کنور صاحب بھی تھے۔محمد علی اس پر خوش تھے کہ سر ولیم نے مسٹر چنتامنی کا استعفیٰ منظور کرلیا۔اور یہ قصہ سنایا کہ سندیلہ کے جنگل میں ایک نہایت خوں خوار بھیڑیا رہتا تھا جب وہ مرا تو کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ وہ جنت میں ٹہل رہا ہے۔اس نے پوچھا کہ تمہیں یہ مرتبہ کیونکر نصیب ہوا تو بھیڑیا بولا کہ ایک روز علی الصبح سندیلہ کے قریب کھیتوں میں پھر رہا تھا کہ ایک اجل رسیدہ چودھری اس طرف آنکلے میں نے ان کا ناشتہ کرلیا اور اس کے صلہ میں میرے تمام گناہ معاف کردئے گئے اور جنت میں جگہ ملی اسی طرح میں نے بھی سر ولیم کے تمام گناہ معاف کردئے پھر ڈاکٹر شفاعت احمد مرحوم کا ذکر رہا۔اس سلسلہ میں روزنامچہ کے الفاظ یہ ہیں:

۲۵رمئی ۵۲ء مسلمانوں کے متعلق ان کی (مولینا محمد علی کی) رائے ہے کہ سوراج میں ان کے حقوق کی ضرور حفاظت کی جائے۔چنتامنی سے بہت خفا ہیں اور کہتے ہیں کہ میرسن نے اسے نکال کر ایک ایسا کام کیا ہے کہ تمام شکوے جاتے رہے۔''ایس'' سے بھی خفا ہیں۔اور کہتے ہیں انھیں قابلیت میں مغالطہ ہے۔ان کی شادی کے سلسلہ میں اکبر کا ایک شعر سنایا۔

دلہن لگائیں گی عینک بجائے سرمے کے
تو چاکلیٹ بٹیں گے بجائے خرمے کے

مزید اصلاحات پر غور:

اس زمانے میں مزید اصلاحات پر غور شروع ہوگیا اور مڈی میں کمیٹی مقرر ہوئی۔سر ولیم نے مجھ سے ایک نوٹ جداگانہ انتخاب پر مانگا۔اس کی نقل اب تک میرے پاس ہے۔میں نے جداگانہ انتخاب کی طرفداری کی تھی اور یہ کہا تھا کہ جداگانہ

انتخاب فرقہ داری کش مکش کی وجہ نہیں بلکہ فرقہ داری بے اعتمادی کا نتیجہ ہے۔ایک دوسرا نوٹ مزید اصلاحات کے متعلق بھی دیا تھا۔اس کی نقل تو مجھے نہیں ملی؟ لیکن میرے روز نامچہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں صوبہ جات میں خودمختار گورنمنٹ کے موافق تھا۔لیکن لا اور آرڈر کو منتقل کرنے میں مجھے شبہ تھا۔یہ رائے سائمن کمیشن کے زمانے میں بدل گئی اور میں پوری خودمختار حکومت کا طرف دار ہو گیا۔

۱۶رجون:- آج صبح ہاؤس گیا اور اصلاحات کے متعلق اپنے نوٹ پر گفتگو ہوئی ہز ایکسی لینسی صوبہ جات کی خودمختار گورنمنٹ کے خلاف ہیں اور میں بہ حیثیت وزیر کے اپنا نوٹ اس کی موافقت میں دینے پر مجبور......اوڈی سے ملا اور اسی نوٹ پر گفتگو ہوتی رہی۔اسے میری رائے سے اتفاق ہے صرف یہ چاہتا ہے کہ محکمہ مال کے متعلق یہ لکھا جائے کہ وہ وزراء کو دیا جائے۔

گورنر نے وزراء کے نوٹ کو بھیج دیا لیکن اپنے نوٹ میں انھوں نے مزید اصلاحات کی کچھ موافقت نہ کی آفیشل پریسیڈنٹ چار سال کے واسطے مقرر ہوا تھا اور سال آئندہ غیر سرکاری پریسیڈنٹ کا انتخاب ہونے والا تھا۔روز نامچہ میں حسب ذیل اندراج ہے۔

۳رجولائی ۔رائے بہادر سیتارام میرے پاس آئے تھے وہ کونسل کے پریسیڈنٹ ہونا چاہتے ہیں اور مجھ سے مدد کے طالب ہیں میں نے ان سے مدد کا وعدہ کیا ہے جولائی کے وسط میں نینی تال سے واپس ہوا اور دورہ پر میرٹھ گیا۔

۲۲رکو نواب صاحب باغپت نے بڑے اہتمام سے پارٹی دی اور زمینداروں کی طرف سے ایڈریس دیا گیا۔رائے بہادر سیتارام، نواب اسمٰعیل خاں صاحب اور دیگر حضرات نے بھی مدعو فرمایا۔سرکاری کام سے جو وقت بچتا تھا وہ ملاقاتوں یا دعوتوں میں صرف ہوتا تھا،میرے خیال میں ایسے دورے بہت مفید ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ممبران گورنمنٹ لوگوں سے آزادانہ گفتگو کریں اور ان کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

کونسل میں مسٹر مانٹیگو کی تعزیت:

۲۵ردسمبر ۱۹۲۴ء کو کونسل میں مسٹر مانٹیگو کی موت پر اظہار افسوس کیا گیا میں

نے اور دوسرے حضرات نے تقاریر کیں مجھے یقین ہے کہ آج کسی انگریز کو بھی اس طرح نہ سراہا جائے گا جیسا کہ مسٹر مونٹیگو کو سراہا گیا۔ آج کے حالات اور ہیں۔ لیکن اس زمانے میں مسٹر مونٹیگو کی مساعی ہندوستان کے حق میں قابل تھیں۔

۲۷ رفروری کو میں نے کونسل کے سامنے سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ پیش کی جو چنڈو خانوں کو ممنوع بنانے کے متعلق تھی۔

کونسل کے ہنگامے:

۱۸ مارچ ۲۵ء کو خبر ایڈ منسٹریشن پیش تھا پنڈت گو بند بلب پنتھ نے بڑے شدومد سے وزراء پر حملہ کیا، انھوں نے ہمارے پیش رو حضرات کا ذکر کرتے ہوئے ہم لوگوں کو مورد الزام ٹھہرایا۔ پنتھ جی مقرر تو اچھے ہیں ہی خوب بولے۔ اس تقریر کے بعد کونسل کی بحث میں گرمی پیدا ہوگئی۔ سب سے قبل راجہ جگناتھ بخش نے وزراء کی طرفداری میں تقریر کی۔ پھر حافظ ہدایت حسین مرحوم اور دوسرے حضرات بولے اور کونسل میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے رفیق کار راجیشور بلی نے نہایت نرم اور صلح جو تقریر کی۔ میری بھی تقریر کچھ سخت نہ تھی لیکن شروع اور آخر میں ذرا چٹ پٹی ہوگئی تھی میں نے اس پر دوران تقریر میں زور دیا۔ کہ جب آپ ہمارے پیشرو حضرات کے کام سے خوش تھے تو انتخاب میں ان کا مقابلہ کیوں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بغیر تقسیم آرا اس تحریک کو کونسل نے مسترد کر دیا میری تقریر کا کچھ حصہ یہ ہے۔

The leader of the Opposition in opening his speech said that he is not aware whether we are dark horses or elephants. First of all at the very outset, I would like to tell him that we are neither dark horses nor white elephants. We belong to a genus which may to him it is called home .....

This reminds me of a little story. There was a small boat. A cock and a cat were travelling together in it. After some time the cat began to think that some excuse should be found to eat the cock. It so happend that the innocent cock was crowing,and in so doing was flapping his wings.The cat said to the cock that he was raising a lot of dust. The cock said

:"Aunty, if you wish to eat me up you are at libarty to do so, but so far as the dust is concerned there is no dust in the boat" This is the position of the Ministers.

Pandit Govind Ballabh Pant; What was the end of the story?

The Ho'ble Lieut. Nawab Mohammad Ahmad Said Khan :

Perhaps the leader of the Opposition means to suggest that the cat had eaten up the cock. I may say that our position is not like the cock which said: "Aunty,if you wish to eat me up,you are at liberty to do so" I would say to the leader of the opposition that if he can he is at liberty to do so.

۲۴/۲۵/مارچ کو جیل کا صیغہ زیر بحث تھا کہ پنتھ جی نے ایک بے پناہ حملہ مہاراجہ مرحوم پر یوں دیا پنتھ جی کی یہ تقریر مجھے ہمیشہ یاد رہے گی اس میں انھوں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ میں اس کو منشور (علامت) کی طرح پیش کر رہا ہوں۔ دو امور ایسے بیان کئے کہ جن کا جواب گورنمنٹ کے پاس نہ تھا۔

(۱) ٹونڈلہ میں ایک اینگلو انڈین نے زنا بالجبر کیا اور ہائی کورٹ نے بید لگانے کی سزا تجویز کی۔ کرنل گڈنی نے یو پی کی گورنمنٹ کو لکھا کہ بید لگانے والا کوئی ہندوستانی نہ ہو، اینگلو انڈین ہو اور گورنمنٹ نے اسے مان لیا۔

(۲) موسم گرما میں انگریز قیدیوں کا پنکھا جیل میں ہندوستانی قیدی کھینچتے تھے مجھے یاد ہے کہ میں نے کنور سر جگدیش پرشاد سے کہا کہ اس میں گورنمنٹ کے ساتھ کیسے رائے دوں مگر ان کا یہ جواب کہ مہاراجہ مرحوم کو غلط فہمی ہو جائے گی۔ بہت وزنی تھا تمام غیر سرکاری ممبروں نے گورنمنٹ کے خلاف رائے دی پنتھ جی کی تقریر کا اقتباس یہ ہے۔

I defintely state that I propose a vote of censure against the jail department.......and I will confine myself to two specific illustrations....... I put it to Government, to the Hon'ble Finance Member to place himself in our position and to say whether he is prepared to accept that even the lowlies of lowly persons who have been found guilty of offences like rape

should be treaed in such a manner that even in the matter of whipping, ordered by the court, the Government should go out of their way to say "The untouchable Indian can not touch the white flesh of these criminals"?... I put the question to the Government that if an Anglo-Indian even guilty of rape convicted by the highest tribunal established by themselves has the privilege that he will not be whipped by an Indian but by a person who is an Anglo-Indian and that at the instance of a member of that community, then what right has an Ango-Indian or European to sit in those benches and to adminiser this country, what right have you to be in this country and say we will teach in your schools, we will preside over your courts, we will collect your revenue, we will determine your policy? You are entirely out of court and have no business to be there.

مہاراجہ محمود آباد کے ڈنر کا لطیفہ:

بجٹ کے اجلاس کے اختتام پر مہاراجہ صاحب محمود آباد نے گورنر کو ایک ڈنر بٹلر پیلس میں دیا۔ گرمی آچکی تھی اور مہمان باہر سنگ مرمر کے چبوترے پر بیٹھے تھے سرولیم کی یہ عادت تھی کہ ڈنر کے بعد ذرا پورٹ زیادہ پی لیتے تھے جب سر ولیم رخصت ہونے کے واسطے اٹھے تو تمام مہمان ایک حلقہ میں کھڑے ہو گئے ہیں اور کنور سر جگدیش پرشاد جو ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے پاس پاس کھڑے ہو گئے۔ سر ولیم جب رخصت ہوئے میرے پاس آئے اور ہاتھ ملایا تو میرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر ایک تقریر شروع کر دی۔ یہ ایک عجیب نظارہ تھا وہ چیخ کر بول رہے تھے اور تمام مہمان اور میزبان تماشائی تھے۔ میری پریشانی کی انتہا نہ تھی میں خود تماشہ بنا ہوا تھا۔ مجھے جب ذرا موقع ملتا تو کہتا یور ایکسیلینسی کا موٹر تیار ہے۔ مگر وہ برابر تقریر کئے جا رہے تھے اور ایک ایک فقرہ کی تکرار نہایت بلند آواز میں کرتے تھے ان کی تقریر کے الفاظ تقریباً یہ تھے۔ تم اور سیم تم اور سیم میری گورنمنٹ کو چلا رہے ہو۔ مجھے تم سے کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا تمہیں یاد ہے کہ ہم ایک دفعہ ٹینس کھیل رہے تھے۔

میں:- جی ہاں (حالانکہ مجھے کچھ بھی یاد نہ تھا) لیکن میں گفتگو ختم کرنا چاہتا تھا۔
گورنر:- وہ کورٹ کچھ اچھا نہ تھا۔
گورنر:- تمہاری ریاست کورٹ تھی۔
میں:- جی ہاں
گورنر:- میں نے اس وقت خیال کیا کہ آئندہ یہ لڑکا میرے ساتھ کام کرے گا۔
تماشائی ہونے میں تو لطف آتا ہے لیکن تماشہ بننا کسی گوارا نہیں ہوتا۔ تیس چالیس حضرات حلقہ بنائے ہوئے تماشائی اور ہم دونوں تماشہ بنے ہوئے۔ ایسا منظر تھا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ختم ہو بہتر اس کے علاوہ میرے ہاتھ میں کافی تکلیف ہو رہی تھی میں نے اپنا ہاتھ بالکل بے خیالی میں ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور گورنر نے اتنی طاقت سے اسے دبایا کہ انگوٹھی کی وجہ سے میری دو انگلیوں میں نیل ہو گیا۔ خیر گورنر سوار ہوئے میں نے زراعت اور صنعت و حرفت کے صیغہ جات پیش کرتے ہوئے پنتھ جی کے اعتراضات کے جواب دیئے، مگر کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہوئی۔ صرف آبکاری کے محکمہ میں ایک کانفرنس کی سفارش کی بناء پر جس میں پنتھ جی بھی تھے۔ ایک اصولی تبدیلی ہوئی۔ اب تک گورنمنٹ کا مطمح نظر یہ تھا کہ کم از کم شراب خوری سے زیادہ سے زیادہ آمدنی کی جائے۔ اب ہمارا مطمح نظر ترک منشیات (برضا ترک منشیات) ہو گیا۔ مجھے پرسوں کے اخبار میں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یوپی کے وزیر آب کاری نے اپنی تقریر میں یہ مانا ہے کہ عادت بد جب تک نہ جائے گی۔ جب ترک منشیات نہ ہو۔ کاش وہ اس کی کوشش کریں اور قانونی ممانعت کے اصول کو خیر باد کہدیں اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ پینے والوں کو بہت سستی اور خراب شراب پینے کو ملتی ہے جس سے ان کی صحت پر خطرناک اثرات ہوتے ہیں اور جو غریب نہیں پیتے ان پر نئے محاصل کی بھرمار ہوتی ہے شاید اس قصور میں کہ وہ نہیں پیتے اور ظاہر ہے کہ زیادتی ٹیکس کا اثر دل و دماغ پر اچھا مرتب نہیں ہوتا۔
میں پھر ۱۹۲۳ء کی طرف جا رہا ہوں میں وزیر ہونے کے بعد مع متعلقین نینی تال آ گیا۔

میری دوسری اہلیہ کی وفات:

میری خانگی زندگی بدستور تھی لیکن اک تاریک ابر کا ٹکڑا آنے والے طوفان سے ڈرا رہا تھا۔ میری بیوی پھر امید سے تھیں مجھے بڑی تشویش تھی کہ کہیں زچگی میں مرض سل کا اعادہ نہ ہو انھیں اطمینان تھا اور میری پریشانی پر ہنستی تھیں۔ انھیں یہ یقین تھا کہ اس مرض سے نجات کامل حاصل ہوگئی ہے اور اس وجہ سے باوجود میرے اصرار کے گذشتہ سال وہ پہاڑ نہ گئی تھیں۔

میں اگست ۱۹۲۳ء کی سات یا آٹھ تاریخ کو واپس نینی تال پہنچا اور گیارہ تاریخ کو بعد مغرب ابن سعید سلمہٗ پیدا ہوا۔ بچہ کی پیدائش کے تیسرے روز سے بخار بڑھنا شروع ہوگیا یہ مرحومہ کے پرانے مرض کا اعادہ تھا جس نے میری خانگی زندگی کو تہ بالا کر دیا۔

بھوالی کے ڈاکٹر سے ان کا علاج شروع کرایا لیکن مرض بڑھتا ہی گیا ادھر سر ولیم اور راجہ پرمانند دونوں چاہتے تھے کہ اور دورہ کیا جائے اور میں قدرتاً دورہ پر جانے سے گھبراتا تھا۔ آخر کار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے استعفیٰ دیدینا چاہئے لیکن جب اس کی اطلاع میری مرحومہ رفیق حیات کو ہوئی تو انہوں نے بہت سختی سے اختلاف کیا۔ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں کہ استعفیٰ ہرگز مت دو اور دورہ پر جاؤ۔

میں دورہ پر آٹھ دس روز کے واسطے گیا اور شاید ۲۴ یا ۲۵ ستمبر تک واپس نینی تال آگیا۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی اور ڈاکٹروں کے مشورے سے میں انھیں علی گڑھ لے کر روانہ ہوگیا میں اور ان کے بھائی عبدالسمیع خاں راستہ میں انھیں ہاتھوں میں اٹھا کر نقل وحرکت کراتے تھے اور وہ جب ہم دونوں کی طرف دیکھ کر یہ کہتی تھیں۔ تم جیتے رہو تو ان کی نگاہ میں میرے دل میں نشتر کی طرح تیر جاتی تھی۔

اس دوران میں انھیں کھانسی کے بیتاب کر دینے والے دورہ ہوتے تھے۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا تھا مگر فقط کھانسی سکون اس حالت میں ہوتا تھا جب میں ان کی کمر پر ہاتھ رکھتا تھا اور آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتا۔ چنانچہ رات میں اکثر میں یہی کرتا اور وہ سو جاتیں۔

۲۹ ستمبر کو علی گڑھ میں صبح ہی مجھے بلایا اور جب میں اٹھ جاتا تو پھر بلاتیں بعد عصر مجھے اس کا احساس ہو گیا کہ مفارقت کا وقت قریب ہے بردا طراف شروع ہو گیا تھا لیکن ہوش بجا تھے۔ اور مجھ سے باتیں کر رہی تھیں میں چاہتا تھا کہ کسی طرح انھیں نزاکت حال بتا سکوں تا کہ وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جائیں لیکن کسی طرح مجھے ہمت نہ ہوئی۔ یکا یک مغرب کی اذان کوٹھی کی مسجد میں ہوئی مرحومہ نے حسب عادت ہاتھ اٹھا کر توبہ استغفار شروع کر دی اور دو چار منٹ ہی کے بعد میرے بچوں پر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔

کیا بتاؤں مجھ پر کیا گذری، ابن سعید سلمہٗ کی عمر صرف سوا مہینہ کی تھی فرحت کی عمر تین سال راحت کے پانچ سال اور ہاجرہ سلمہا کی نو سال کی عمر تھی۔

اللہ ان سب کو زندہ اور مسرور رکھے ان کو کیا معلوم ان کی یاد کے ساتھ کسی کی مفارقت میرے دل میں تہلکہ برپا کیے تھی۔

راحت اور فرحت میرے کمرے میں سو رہے تھے ایک طرف یہ کرب والم دوسری طرف یہ فکر کی صبح کو راحت اور فرحت کو کیا جواب دوں گا۔ ابن سلمہٗ کو اپنی مصیبت کا ہوش کہاں۔ ہاجرہ اپنی نانی کے پاس تھی اور اسے پورا احساس تھا مگر یہ دو بچے بے خبر سو رہے تھے میں چاہتا تھا کہ انھیں اس کی خبر نہ ہو کہ وہ شفقت مادری سے ہمیشہ کے واسطے محروم ہو گئے ہیں میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جب صبح وہ حسب عادت اپنی ماں کے پاس جانا چاہیں گے تو میں کیا کہوں گا۔

میں نے خان بہادر محمد یوسف صاحب مرحوم کی دوکان کھلوا کر رات کے بارہ بجے بہت سے کھلونے منگائے اور ان بچوں کے پلنگ کے چاروں طرف رکھوا دیے وہ صبح اٹھتے ہی ان سے خوش خوش کھیلنے لگتے جب مجھے اپنے کھلونے لا کر دکھاتے تو میں ان کی طرف دیکھ کر مسکراتا لیکن دل امنڈنے لگتا تھا۔ یہ عالم بھی خدا نہ دکھائے جب دل خون ہو رہا ہو اور لب مسکرانے پر مجبور ہوں۔ بڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔

اب میں نے یہ خیال کیا کہ ان بدلے ہوئے حالات میں وزارت کا بوجھ اٹھانا میرے لیے ناممکن ہوگا۔ میں نے سر ویلیم کو اس حادثہ کی اطلاع دیتے ہوئے یہ

لکھا کہ چونکہ میرا فرض اولین اپنے بچوں کی خدمت ہے لہٰذا مجھے سبکدوش کر دیا جائے۔ ان کا بہت ہی ہمدردی کا جواب آیا وہ بھی اسی طرح زخم خوردہ تھے اور اپنی رفیقہ حیات کو کھو چکے تھے میری حالت کا پورا احساس کر سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ جب تک دل چاہے نہ آؤ لیکن استعفیٰ منظور کرنے سے انکار کیا۔

تعزیت کی تکلیف دہ رسم:

ہم لوگ چھتاری چلے گئے اور تعزیت کا مرحلہ شروع ہوا۔ ہم لوگوں میں تعزیت اور عبادت کے رسوم میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ موت اور تعزیت میں صرف ایک فرق ہے۔ موت تو مرنے والے کی ہوتی ہے۔ تعزیت پسماندہ کی موت ہے وہ بھی موت مسلسل۔ میرے دوست اقربا آتے تھے اور اتنے مفصل واقعات پر استفسار ہوتا تھا کہ قانون قدرت کے تحت جو زخم اندمال کے طرف مائل ہوتے تھے وہ ان دوستوں عزیزوں کے کریدنے سے ہرے ہو جاتے تھے مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا ناخون سے کھرچ کر زخموں کو خونچکاں بنایا جا رہا ہے۔ کس وقت انتقال ہوا؟ کتنے بچے چھوڑے؟ کیا عمریں ہیں؟ مرتے وقت آپ سے کیا کہا؟ بچے تو یاد نہیں کرتے وغیرہ؟ ان سوالات سے عہدہ برآمد ہونا درکنار یہ سوالات خود ایسے کرب آمیز ہوتے تھے کہ میرا دل جانتا ہے۔ تعزیت کے سلسلہ میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے گو وہ مجھ پر منطبق نہ ہوتا تھا کہ غریب پسماندہ علاج معالجہ کے سلسلہ میں بہت کچھ زیر بار ہو چکا ہے۔ تعزیت کے سلسلہ میں چالیسویں تک اس کو مہمانداری کرنے میں جن مصائب اور زیر باری کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

انگریزی قاعدہ تو یہ ہے کہ آئے اور بغیر کسی تفصیل کے فقط اظہار ہمدردی کی دس بارہ منٹ سے زیادہ نہ ٹھہرنا۔ کسی سے بہت قرابت یا دوستی ہے تو مغموم خاندان کے ایک ایک دو دو افراد کو اپنے گھروں پر بلا لیتے ہیں تا کہ تبدیلِ مقام سے غم بہل جائے۔

ہندو حضرات میں جہاں تک مجھے معلوم ہے موت کے گھر کا کھانا مذہباً درست نہیں۔ اس لئے اظہار ہمدردی کے بعد قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی عیادت تو میرا بارہا کا تجربہ یہ ہے کہ دوست نہایت اخلاص اور ہمدردی سے آتے

ہیں لیکن نادانستہ طور پر مریض کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مریض تکلیف کراہ تک نہیں سکتا کروٹ نہیں لے سکتا اور دوست ہیں کہ اطمینان سے بیٹھے ہوئے مرض اور مریض دونوں پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ معالج حکیم یا ڈاکٹر پر تنقید ہو رہی ہے بعض حضرات نسخہ بتانے اور اسے برتنے پر اصرار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب باتیں الگ تیمارداروں سے کرنے کی ہیں نہ کہ مریض سے یا اس کی موجودگی میں۔

ایک بار مارچ کے مہینے میں میرے لکھنؤ میں خسرہ نکل آئی۔ ڈاکٹر کا حکم تھا کہ میرے پاس کوئی نہ آئے۔ لیکن بیک وقت دس دس بارہ بارہ دوست پلنگ کے گرد بیٹھے رہتے تھے۔ اس زمانے میں سائمن کمیشن کی تجویز پر اخباروں میں بحث ہو رہی تھی۔ میرے ایک دوست عیادت کو آئے اور فرمانے لگے کہ کہئے آپ کی رائے میں اس صوبہ میں ایک ایوان کی گورنمنٹ ہونی چاہئے یا دو کی۔ میرے حواس پر مرض کی قہربانی تھی میں کہتا یا سنتا۔ باہمہ مجھے ہنسی آگئی میں نے کہا میری کوشش تو فی الحال یہ ہے کہ خسرے کا تسلط نہ ہونے پائے اس کے بعد اس کی فکر کروں گا کہ کس کا تسلط ہو۔

خانگی معاملات کا اثر:

خانگی واقعات نے مجھے کچھ اتنا متاثر کر دیا تھا کہ وزارت کی خواہش دل میں کچھ زیادہ نہ تھی بلکہ تقرر نہ ہونے کی صورت میں یکسوئی محسوس ہوتی۔ میرے بچے چھوٹے تھے اور میری محبت دیوانگی کی حد تک تھی میری بڑی بچی اور ابن سلمہ، تو اپنی نانی نانا کے پاس رہتے تھے لیکن راحت اور فرحت اکثر میرے پاس رہتے تھے اور شب کو میرے ہی کمرے میں سوتے تھے۔ میں رات کو برابر اٹھ اٹھ کر انھیں دیکھا کرتا تھا۔ شاید کھل گئے ہوں سردی لگتی ہو مجھے وہ راتیں خوب یاد ہیں جب شب کی تنہائی میں بچوں کے پلنگ پر بیٹھ کر اپنی تنہائی پر مرحومہ کو یاد کر کے بے اختیار ہو جاتا تھا۔

۲۸ / جنوری ۱۹۲۴ء کو تار سے معلوم ہوا کہ راجہ اصغر علی خان پنڈراول کا انتقال ہو گیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ خدا مغفرت فرمائے۔

میری زندگی کا طرز یہ ہو گیا کہ سرکاری اغراض و ضروریات سے جب فرصت ہوتی تو اپنے بچوں کے پاس چلا آتا تھا ان سے مل کر سکون قلب نصیب ہوتا تھا۔

۶ رفروری کے روز نامچہ میں لکھا ہے:-

طالب نگر آیا بچوں کو بہ عافیت پایا۔ خدا کا شکر ہے۔ راحت فرحت کو یہاں لے آیا ہوں۔ آج ہاجرہ کو میں نے ایک زیور دیا ہے اس کا قرآن ختم ہوا ہے۔ اس کا انعام ہے۔ کاش آج ننی (میں اپنی بیوی کو ننی کہتا تھا) زندہ ہوتیں۔ راحت کے تین دانت ٹوٹے ہیں خدا انھیں جلد جوان کرے"۔

۱۵ فروری:-

ابن میاں کو دیکھنے طالب نگر گیا...... بفضلہ اسے تندرست پایا...... نئی دودھ پلانے والی کی ضرورت ہے۔

میں فرائض منصبی کی ادائیگی میں دورہ بھی کرتا تھا عصرانہ اور دعوتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایڈریس بھی ہوتے تھے جوابات بھی دیئے جاتے تھے مگر گھر اور بچوں کی کشش میرے لیے سب سے بڑی کشش تھی کسی چھوٹے بڑے کام میں میرا جی اس لیے نہیں لگتا تھا کہ میرا جی اپنے بچوں میں لگا رہتا تھا جن کو بعافیت اور خوش وخرم پا کر میں نے صرف تمام مصائب ومکروہات بھول جاتا تھا۔ بلکہ مصائب اور مکروہات سے عہد برآ ہونے کا ولولہ اپنے دل میں موجزن پاتا۔

میں نے ۱۷ رفروری کو لکھا ہے: نو بجے لکھنؤ پہنچا ؏

"پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر"

راجہ حکیم تیج پرتاپ:

میری کہانی نامکمل رہے گی اگر میں اپنے دوستوں میں راجہ حکیم تیج پرتاپ آنجہانی راجہ پرتاپ بیر ضلع ایٹہ کا ذکر نہ کروں۔ یہ پرتھوی راج کے خاندان میں تھے اور شرافت اور محبت کا بہترین نمونہ تھے میرے ساتھ برادرانہ خلوص کا برتاؤ کرتے تھے میری سفارش پر انھیں راجہ بہادر کیا گیا تھا۔ افسوس عمر نے وفا نہ کی کچھ روز بعد انتقال ہو گیا مجھے اس کا افسوس رہا کہ انھیں وزارت میں کیوں نہ میں نے لیا۔

اسی فروری میں گورنر بلند شہر گئے تھے میں اور میرے چچا نواب بہادر عبدالصمد خاں مرحوم بلند شہر کی کوٹھی میں برآمدہ میں بیٹھے تھے کہ نواب سر مزمل اللہ خاں

مرحوم تشریف لائے اور آتے ہی میرے چچا کی طرف دیکھ کر بولے۔
''اوہو۔ راجہ اندر بیٹھے ہیں''۔
میرے چچا نے فوراً کہا۔ جی ہاں اب پریوں کی آمد آمد ہے'' بلند شہر کے اسپتال کے ایک وارڈ کو گورنر کے نام سے موسوم کیا اور اس میں گیارہ ہزار کا چندہ میں نے دیا۔ گورنر کے آنے کے موقع پر ایسا اکثر ہوتا تھا۔

میری تیسری شادی:

۶/ اپریل کو بچوں سے ملنے طالب نگر گیا جن کا ختنہ ہوا تھا اس لیے وہ چھتاری نہ آسکتے تھے اللہ داد خاں مرحوم (جو راحت سلمۂ کے اتالیق قسم کے ملازم تھے) مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کو شادی کر لینی چاہیے میری مرحومہ بیوی کی بہن کہ جواب میری اور اس گھر کی مالکہ ہیں ان کا نام لیا میری بیوی کا نام فاطمہ ہے۔
یہ تو میں خیال کرتا تھا کہ مجھے شادی کرنی ہوگی۔ مگر یہ خیال کہ میرے بچوں کو سوتیلی ماں سے تکلیف ہوگی مجھے تذبذب کر دیتا تھا پھر اس خاص رشتہ میں مجھے یہ خرابی بھی نظر آتی کہ میری اور فاطمہ کی عمر میں تیس یا چوبیس سال کا فرق تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ داد خاں مرحوم کی یہ تحریک بغیر نواب بہادر اور میری چچی کے حکم کے نہ تھی۔
یہ مجھے قبل سے معلوم ہو چکا تھا کہ میرا چچا اور چچی صاحبہ یہ خیال کر رہے ہیں اور یہ بھی معلوم تھا کہ ایسا خیال اتنی جلدی کیوں ہوا۔ کسی نے نواب بہادر مرحوم اور میری چچی صاحبہ سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں لکھنؤ میں فلاں صاحب کی کسی صاحب زادی سے شادی کرنا چاہتا ہوں حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ دوستانہ طور پر ان کے گھر جاتا تھا اور ان کی صاحبزادی تعلیم یافتہ جمیل اور شریف خواتین تھیں۔
اسی زمانہ میں میرے دوستانہ مراسم ایک اور خاتون سے تھے جو بڑی خوش اطوار، تعلیم یافتہ ذہین وزیرک تھیں اور میرا بڑا لحاظ کرتیں۔ اس باہمی ارتباط و موانست کا انجام اگر وہی ہوتا جو ازل سے چلا آتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن اس رشتہ میں وہی مواقع بھی پیش آئے جو ازل سے چلے آتے ہیں۔
پہلی دشواری تو اختلاف مذہب تھا، دوسری یہ کہ میرے بچوں کا کیا حشر

ہوگا اور یہ وہ مسئلہ تھا جہاں میں اکثر بڑی سنجیدگی سے اس پر بھی غور کرنے لگتا کہ مجھے دوبارہ شادی کرنی بھی چاہیے یا نہیں تیسرے یہ کہ فریقین ہم قوم بھی نہ تھے ہم لوگ راجپوتوں ہی میں کرتے ہیں۔

حکیم احسان الحق مرحوم مجھ سے پہلے ہی کئی مرتبہ کہہ چکے تھے اور ۱۲ اپریل کو پھر کہا عمر کا تفاوت مجھے اس رشتہ سے روکتا تھا۔ لیکن یہ خیال کہ اگر غیر گھر کی بیوی آئی تو خدا جانے ان بچوں سے کیا تعلقات ہوں اور انھیں پھر بھی ان بچوں سے محبت ہے اور خاص کر ابن سلمۂ کی تو پرورش ہی ان کے ہاتھ میں ہوئی اس کا معاون تھا کہ شادی یا فاطمہ سے کروں یا پھر اپنے بچوں کے واسطے ایک خطرہ پیدا کرلوں غرض یہ زمانہ میرے لیے انتہائی خلجان کا تھا۔ بچوں کا مستقبل اور اپنی تنہائی ان دونوں کو نباہنا انتہائی دشوار تھا۔

میں نے عمر کے تفاوت کو حکیم احسان الحق اور عبدالسمیع خاں پر واضح کیا اور نواب بہادر کے گوش گزار کرایا۔ لیکن مقدر یوں ہی ہو چکا تھا آخر کار میں نے اس شرط سے مان لیا کہ اگر یہی منشاء ہے تو رخصت بھی جلد کر دیا جائے تاکہ تعلیم و تربیت میری آنکھوں کے سامنے ہو اس فیصلہ سے پرانے ملازمین میں اللہ داد خاں اور نجو جو ایک پرانی ملازمہ تھیں بہت مسرور تھیں اس زمانے میں ایسے ملازم پائے جاتے تھے جنھیں آقا کے خاندان سے مثل اپنے خاندان کے تعلق ہوتا تھا۔

میں نے اللہ داد خاں مرحوم کے متعلق اوپر لکھا کہ وہ اتالیق قسم کے ملازم تھے اس سے یہ منشاء نہیں کہ وہ اتالیق تھے بلکہ یہ خدمت گاروں میں پائی جاتی ہے جو کسی خاندان میں نسلاً بعد نسل موروثی خدمت گار رہے ہوں۔ ایسے خدمت گار چار اقسام پر تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) خدمت گار (۲) اتالیق خدمت گار
(۳) نجومی خدمت گار اور (۴) میخ درگل

(۱) بس خدمتگار ہوتا ہے جو محتاج وضاحت نہیں۔

(۲) بغیر طلب مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ کبھی اس لیے کہ آقا ان کے گزشتہ کام

کا جائزہ نہ لے کبھی اس لیے ان کو مشورہ دیدینے کے بعد آقا اخلاقاً اس کا پابند ہو جائے کہ آئندہ ان سے کام نہ لے۔

(۳) بغیر علم فقط انداز سے سوالات کے جوابات دیتا ہے اور اس قدر وثوق کے ساتھ کہ آئندہ جتنے سوالات ہوں گے وہ ان کے بھی جوابات دے رہا ہے۔

(۴) نوکر کو اگر آواز دے کر بلایا جائے تو آواز دے گا اور جواب دینے میں اتنی مستعدی اور خلوص کا اظہار کرے گا آپ خود آواز دینے میں اتنے مستعد اور مخلص نہ ہوں گے۔ البتہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے گا اس کو اس کا یقین ہوتا ہے کہ آپ بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کریں گے۔

میں اس زمانے میں چھتاری رہتا تھا۔ میری تمام مسرتوں اور تفکرات کا مرکز راحت و فرحت تھے دونوں کی ذرا ذرا سی باتیں مجھے مسرور او مغموم بنا دیتی تھیں۔

۱۹۲۴ء کے بعض واقعات:

۱۹۲۴ء کے روزنامچہ سے چندحصوں کا اقتباس دینا غالباً بے محل نہ ہوگا۔

۸/اپریل آج سدھ پور حاضر ہوا تھا مجھ پر رقت طاری ہوگئی اس سبب سے کہ فاتحہ پڑھنے میں میری آنکھیں بند تھیں جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ فرحت جو راحت برابر کھڑا ہے (خدا انھیں زندہ رکھے) مرحومہ کی قبر کی طرف ہاتھ جوڑ رہا ہے واپسی میں چاند کو دیکھ کر فرحت بولا اللہ میاں چاند میں بیٹھے ہیں۔

"میں"۔ہاں

فرحت۔وہ بیٹھے ہیں آلتی پالتی مارے۔

غرض تھوڑی دیر میں مجھے رُلا بھی دیا اور ہنسا بھی دیا۔

۹/اپریل: آج پھر سدھ پور گیا راحت مجھ سے پوچھتا تھا کہ دوسری قبر کس کی ہے۔جس پر فاتحہ پڑھتے ہو کیا دوادا تھے۔

میں اس بچہ سے کیا کہوں کہ یہ اُس کی قبر ہے جس کی زندہ نشانی تو ہے آج سمیع کے خط سے معلوم ہوا اور احسان الحق کا خط بھی تھا کہ ۲۵/تاریخ میری شادی کی ٹھہری ہے اب خدا مالک ہے۔

۲۴ر اپریل : راحت سلمہ کو میں نے ایک اردو کا رسالہ ”نونہال“ دکھایا اور مجھے مسرت ہوئی کہ محض قرآن شریف پڑھنے کی بدولت وہ اردو پڑھنے لگا۔

جمعہ ۲۵ر اپریل: آج بعد نماز فرحت اس کی شکایت کرتا تھا کہ نی کیوں نہیں آتی۔اس کے الفاظ یہ تھے کہ نی سے کہوں گا کہ تم دو دن تک کیوں نہیں آئیں ”خدایا ان یتیموں پر رحم فرما اور انھیں صبر دے“۔

۳۰ر اپریل: آج کا روز بھی میری تقدیر کے ان روزون سے ایک ثابت ہوگا جس کے کیفر کردار یا جزائے اعمال کا نتیجہ نہ صرف مجھے تمام عمر بھگتنا ہے بلکہ میری آئندہ نسلوں کو اور ریاست چھتاری کے مستقبل کو اس سے متاثر ہونا ضروری ہے تقدیر کا زبردست ہاتھ کیا چیز ہے؟

کوئی مجھ سے پوچھے...... فاطمہ سے میرا نکاح ہو گیا۔خدا میرے بچوں پر رحم فرمائے...... اب خدا بہتر کرے اور میرا بچے خدا کرے کہ میری اس حکمت کے نتیجہ پر مجھے مردود اور ملعون نہ کہیں۔

خدا جانے میرے جذبات و محسوسات کیا تھے اب اتنے برس کے بعد تو یاد نہیں رہا لیکن میرے روزنامچہ میں یہ دو شعر لکھے ہوئے ہیں۔

پوچھتے کیا ہو فراق یار کا تم ماجرا | آسماں دیکھا تو پہروں آسماں دیکھا کیے
نزع کا عالم بہر صورت اثر انگیز تھا | مہرباں رویا کیے نامہرباں دیکھا کیے

میری اس رفیقہ حیات کے تعلقات میرے بچوں سے نہایت خوشگوار رہے ماشاء اللہ یہ بچے جوان ہو گئے ہیں مگر ہرگز یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ان کی سوتیلی ماں ہیں۔ یہ ہمیشہ ان بچوں کی طرفداری کرتی ہیں اور بسا اوقات خود مجھ سے ان بچوں کی جانب داری کے سلسلہ میں برسر پیکار ہو جاتی ہیں اور اگر الفاظ سے ہڈی ٹوٹ سکتی تو یقیناً یہ دفعہ ۳۲۵ تعزیرات ہند کی مرتکب ہوگئی ہوتیں یہ سب کچھ تو پیشگی بیان ہو گیا۔روزنامچہ کے چند اور اندراجات لکھتا ہوں۔

۵ر مئی: آج دوپہر کو مولوی احمد سعید اور مولوی عرفان صاحبان آئے تحریک ترک موالات تو ختم ہوئی اب تبلیغ کی فکر ہے۔بہرحال آج وہ اس غلطی کو تسلیم کر رہے

تھے جس کی وجہ سے ہم لوگ دو سال ہوئے کافر کہے جاتے تھے...... شب کو سمیع خاں آ گئے۔ فاطمہ کی تعریف کر رہے تھے خدا ایسا ہی کرے اور اسے ان بچوں سے ایسی ہی محبت ہو جیسی کہی جاتی ہے۔

۶ رمئی: آج عید ہے خدا کا شکر ہے۔ صبح جس وقت آنکھ کھلی تو میرا خیال ایک سال پیچھے چلا گیا۔

.... پارسال اسی وقت میری ریل ہاتھرس پر آئی تھی رضا سمیع خاں اور بھائی جان پہنچے تھے وہ عید میری عمر میں سب سے زیادہ مسرت خیز عید تھی میں قبول وزارت کے بعد گھر آ رہا تھا مجھے یاد ہے مرحومہ کس قدر خوش خوش پھر رہی تھی ایک آج عید ہے۔

"وتلك الايام وتداولها بين الناس"

میں ۹ رمئی ۱۹۲۴ء کو نینی تال پہنچا روزنامچہ میں حسب ذیل اندراج ہے:

تین بجے تک نینی تال پہنچ گیا۔ بہت مغموم ہوں۔ فرحت سلمہٗ اپنی مرحومہ ماں کو یاد کرتا ہے اور پوچھتا ہے وہ کس کی کوٹھی میں ہیں۔ راحت سلمہٗ چپ ہے وہ شاید جانتا ہے۔ میں کسی جذبے سے بے خود ہو کر پرانی کوٹھی پراسپیکٹ لاج گیا۔ نئی کوٹھی گھر سا معلوم نہیں ہوتی وہاں برآمدہ میں کھڑا رہا کمروں کو دیکھتا رہا اور خدا جانے کیا کیا یاد کرتا رہا ع

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اسی سال ماہ اگست میں میری موجودہ بیوی میرے گھر آ گئیں۔ گویا بالکل نوعمر تھیں لیکن اس کی ہمیشہ کوشش کرتی تھیں کہ میرے خیالات اور رائے کو سمجھیں اور ان پر اعتماد کرتی تھیں اس لیے بہت جلد میرے خیالات پر انہیں عبور ہو گیا۔ اپنی مرحومہ بہن کے بچوں سے انھیں محبت تھی اور اگر میں کبھی ان بچوں پر خفا ہوتا تو وہ ہمیشہ آڑے آتی تھیں اور اس وقت وہ ان بچوں کی طرف داری کرتی ہیں۔ میری خانگی زندگی پھر پُرسکون طور پر شروع ہوئی سرکاری زندگی میں بھی مجھے اطمینان حاصل تھا اور گھر کی زندگی بھی پرسکون تھی۔

میرا تجربہ ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف پہلو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اگر کسی کو کاروباری یا سرکاری زندگی میں تفکر ہوں تو گھر کی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی اور اگر خانگی زندگی بے لطف اور مکدر ہو جائے تو باہر کے کاروبار میں بھی خرابی رونما ہوتی ہے۔

گڑیا کا لطیفہ:

یوں تو ازدواجی زندگی کی فضا میں دھوپ میں چھاؤں آتی رہتی ہے لیکن ایک بار میری رفیقہ حیات کا مقیاس الحرارت خدا جانے کتنی ڈگری یکا یک اونچا ہو گیا، میں کہیں سفر سے آیا تھا مختلف تحائف کے ساتھ میں نے مذاقاً ایک گڑیا بھی دی اور جب سب چیزیں دکھا چکا تو گڑیا پیش کی۔

پوچھا۔ یہ گڑیا کس کے لیے لائے ہو۔

میں۔ تمہارے واسطے!

پھر کیا تھا غصہ سے منہ سرخ ہو گیا اور میری نیت تو مذاق ہی کی تھی لیکن معافی بڑے خلوص سے مانگنی پڑی!

بجٹ کا اجلاس ختم ہوتے ہی گھر کو روانہ ہوا بچوں کی اور بیوی کی کشش مجھے فوراً چھتاری لے گئی اور وہاں سے نینی تال روانہ ہو گئے۔ مجھے نینی تال بہت ہی پسند ہے۔ اب بھی مجھے جو سکون نینی تال میں نصیب ہوتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ وہاں کا حسین تال۔ سر بفلک پہاڑی چوٹیاں۔ ہرے بھرے درخت مجھے مانوس معلوم ہوتے ہیں۔

نینی تال میں میرا پروگرام یہ ہوتا تھا کہ صبح جلدی کھانا کھا کر دفتر چلا جاتا اور ایک بجے تک لوٹ آتا پھر گھر کی زندگی کے لطائف میں گم ہو جاتا۔

میرے روزنامچہ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۵ء میں یہ درج ہے۔

آج سالانہ باڑہ کی تقسیم تھی۔ بہت آدمی تھے۔ نو سو رضائی اور تین ہزار کے قریب روپیہ تقسیم ہوا۔ باڑہ کی تقسیم دادا صاحب غفران مآب کی سنت ہے ہر سال جاڑوں میں اس کی تقسیم ہوتی ہے میں نے کبھی ناغہ نہ کیا تھا لیکن سال ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ خونریزی نے ایک طرف تو کچھ ایسا پریشان کیا اور اطراف و جوانب کے لوگوں

کے مجمع سے دل گھبرانے لگا اور دوسری جانب حکومت کی قیود نے کپڑا تو در کنار سوت کا ملنا بھی مشکل کر دیا اس سب سے تقریباً پچاس برس کے بعد ناغہ ہوا۔ خدا کرے یہ بدامنی اور بے چینی دور ہو جائے اور مہر و مروت کا دور لوٹ آئے تو اس روایات کو از سر نو تازہ کروں جس سے میں اپنے گھرانے کی بڑی برکتیں وابستہ سمجھتا ہوں۔

یاران باصفا:

اس زمانہ میں خان بہادر عنایت علی خاں (جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج شخص تھے) چھتاری آئے انھیں نے ایک قصہ سنایا۔ ایک روز سر ولیم میرس سے ملنے گئے گورنر کو اس روز فرصت کم تھی بیٹھتے ہی بولے۔

گورنر: خان بہادر صاحب آج مجھے فرصت کم ہے۔ جو کچھ کہنا ہے جلدی ختم کیجئے۔

خان بہادر: تو حضور مجھے صرف ایک چھوٹا سا قصہ سنانے کی اجازت ہو۔

گورنر: کہئے۔

خان بہادر: ایک روز ایک بادشاہ ہاتھی پر سوار کہیں جا رہا تھا راہ میں ایک بڑھیا نے ہاتھ اٹھا کر روکا بادشاہ نے کہا اس وقت ہمیں فرصت نہیں ہے پھر عرض کرنا۔ بڑھیا نے جواب میں کہا کہ بیٹا جب تجھے فرصت ہو جائے گی تو مجھے تیرے پاس آنے کی کیا ضرورت رہے گی۔ گورنر بہت متاثر ہوئے اور آدھ گھنٹے تک ان کی ملاقات رہی اور پورا حال سنا۔

میں نینی تال کے ارادہ سے ۸ر مئی کو روانہ ہو کر ۹ر کو بریلی پہنچا۔ وہاں احقاد مرحوم کے انتقال پر تعزیت کی۔ مرحوم میرے پرائیوٹ سکریٹری تھے اور نہایت ہونہار نوجوان تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں خوب لکھتے تھے عمر نے وفا نہ کی ورنہ بہت نام پیدا کرتے۔

اسی سال ان کے جانشین صغیر احمد صاحب عباسی ہوئے۔ اب بھی میرے پاس ہیں۔ اردو بہت اچھی لکھتے ہیں انتہائی وفا شعار اور اعلیٰ کردار کے حامل ہیں ان کی صحت اچھی نہیں رہتی خدا تندرست کر دے قابل تقلید سیرت اور کردار ہے۔

مجھے دعوتیں دینے اور کھانے کا بہت شوق تھا۔ یا میرے گھر مہمان ہوتے تھے

یا میں کسی کے گھر مدعو ہوتا تھا۔ اور یہ مرض مزمنہ مجھے اس وقت تک رہا جب تک کہ راشنگ کے ذریعہ سے اس کا علاج نہ کر دیا گیا ایک روز پنڈت موتی لال صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ بھائی میں گورنمنٹ کی مشین گن سے اتنا نہیں گھبراتا جتنا تمہاری پلاؤ کی رکابی سے اشارہ اس طرف تھا کہ اس وجہ سے تمہیں کونسل میں شکست نہیں ہوتی۔

ٹینس کا شوق:

مجھے ٹینس کا بہت شوق ہے لیکن اب چند ماہ سے بہت کم کھیلتا ہوں۔ ڈاکٹر میرے قلب کے واسطے اسے مضر بتاتے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں روزانہ کھیلتا تھا۔

ہفتہ میں ایک دن سر سیم کے ہاں کھیل ہوتا تھا اور ایک روز میرے ہاں یہ ٹینس سوشل ٹینس نہ ہوتی بلکہ واقعی ٹینس ہوتی سر سیم، جگدیش، میجر لتھ روس اور میں ان دنوں روز کھیلتے تھے اور اگر کوئی اچھا کھیلنے والا آجاتا تھا اسے بلا لیتے تھے۔ سال میں دو بار ٹورنامنٹ ہوتے۔ اس میں ہم لوگ ضرور کھیلتے۔ اس زمانے کے کھیلنے والوں میں جسبیر سنگھ آنجہانی بہت اچھی ٹینس کھیلتے تھے۔ ان کی سروس اور اور ہیڈ بے مثل تھا۔ ڈرائیو بھی بہت اچھے ہوتے تھے۔ سر سیم اور جگدیش بھی بہت اچھا کھیلتے۔ اس زمانے میں احد حسین قدوائی کا بھی صوبہ کی ٹینس میں ایک خاص مقام تھا۔ تمام نوعمر کھیلنے والے جن میں بعض مثلاً غوث، افتخار، ارشاد ہندوستان کے بہترین کھلاڑی بنے انھیں استاد کہتے تھے چنانچہ ان کا نام ہی استاد ہو گیا تھا۔ وہ اور دوسرے ٹینس کے کھلاڑی اکثر میرے پاس ٹھہرتے تھے یوں تو احد ٹینس اچھی کھیلتے ہی تھے لیکن ان کے کھیل سے زیادہ ان کی ٹینس کی تیاریاں دلچسپ ہوتی تھیں۔ جس وقت وہ ٹینس کے مختلف اسٹروکس اور مواقع کی تشریح و توضیح سامعین کے روبرو کرتے ہوئے کھیل کا چہرہ باندھتے اور تیور اور پینترے کا رنگ دکھاتے تو بالکل ایسا محسوس ہونے لگتا کہ میر انیس کو ٹینس سے دلچسپی ہوتی تو وہ بھی اتنا ہی دکھا سکتے تھے۔ ٹورنامنٹ کے زمانے میں صبح اٹھ کر غسل پھر ناشتہ میں دو انڈے دوپہر کے کھانے میں کچھ ترکاری اور سلاد کھیلنے کے بعد شام کو مالش بھی ضروری آئٹم ہوتا تھا۔ ٹینس کھیلنے میں کبھی امپائر سے اختلاف رائے گیند اٹھانے والے لڑکے کے اکثر مورد عتاب ہو جاتے تھے۔

رشید احمد صدیقی:

ٹینس کے سلسلہ میں یوں تو بہت دوست ملے لیکن میرے عزیز بھائی رشید احمد صدیقی صاحب سے بھی سب سے پہلی ملاقات اسی کی بدولت ہوئی یہ اردو کے پروفیسر اور اردو ادب کے آسمان کے بہت ہی درخشاں ستارہ ہیں ادبی دنیا میں ان کا پایہ جتنا بلند ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن میں تو ٹینس کا ذکر کر رہا تھا۔ رشید صاحب ٹینس نہایت نستعلیق قسم کی کھیلتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نہایت سلامت روی کے ساتھ لطیف و نازک اسٹروک بیس لائن سے کرتے تھے اور حریف کی دلجوئی اتنی مدنظر ہوتی تھی کہ کبھی "والی" یا ڈروپ شوٹ سے اسے زحمت نہ دیتے۔ اگر "نستعلیق ٹینس" کے لفظ کی اور تشریح درکار ہے تو پھر خیال فرمائے کہ رشید صاحب کا کھیل بجائے ڈبل کے مکسڈ (Mixcod) کے واسطے زیادہ موزوں ہے بہرنوع ٹینس میں ان کا کھیل کیسا ہی ہو لیکن ایک مخلص دوست ہونے میں فرد فرید ہیں۔

پروفیسر محمد حیدر خاں:

ایک اور دوست کی یاد بھی اس سلسلہ میں آگئی۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ کمسٹری کے پروفیسر کرنل محمد حیدر خاں تفریحی ورزشوں کے بڑے شائق، ٹینس بہت اچھی کھیلتے تھے اور ہر طرح کے اسٹروک پر قدرت تھی کھیل میں خفا ہو جائے تو کسی کو خاطر میں لاتے نہ ساتھ کو نہ مخالف کو۔ انجام اکثر و بیشتر بلے کی شہادت پر ہوتا زندگی اور زمانے سے متعلق میرا ان کا نظریہ مختلف رہا میں پرانی چال کا وہ نئی چال کے لیکن ہم دونوں میں کبھی بدمزگی کی نوبت نہ آئی اور اب تک ایک دوسرے بڑے مخلصانہ تعلقات چلے آتے ہیں۔

نینی تال میں لیڈی ٹینس کے کھیلنے والیوں میں دو کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مسز اسمیتھی یہ چیف کنسرویٹر کی بیوی تھیں اور اب ان کے خاوند نیپال میں ملازم ہیں۔ میں نے اپنی عمر میں ایسی صفات یکجا بہت ہی کم دیکھی ہیں۔ ایک جانب تو یہ بہت پرانی قسم کی خاتون ہیں اور زمانہ حال کی آزادی۔ اطوار و گفتار ولباس کو بڑی نفرت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوائے عریانی

کے اور کوئی صفت قابل تقلید ہی نہیں گفتار عریاں ۔تحریر عریاں ۔لباس تو اس کا مصرف اتنا رہ گیا ہے کہ جہاں تہاں وہ عریانی کا چمکا دے یہ اپنے خاوند کی بڑی اچھی بیوی اور اپنے بچوں کی بہت اچھی ماں ہیں ۔ یہ تو ایک پہلوان کی زندگی کا ہے جسے زمانہ حال کی خواتین شاید دقیانوسی کہیں لیکن دوسری جانب یہ اس قدر بہادر ہیں کہ باجود خود مدعی نہ ہونے کے بہت کم مردان کا بہادری میں مقابلہ کر سکتے ہیں۔

ایک بار شیر کے شکار میں انہیں ایک عجیب واقعہ پیش آیا یہ اور ان کے شوہر دو مچانوں پر الگ الگ بیٹھے تھے شیر نکلا صاحب کی بندوق چلی اور خالی گئی۔شیر آگے بڑھا ان کی گولی چلی وہ گرا یہ مچان پر جوش میں کھڑی ہوگئیں شیر نے انہیں دیکھ لیا اور سیدھے درخت پر چڑھنا شروع کیا ان کے صاحب جو گھبرا کر کھڑے ہوئے تو کارتوس نیچے جا پڑے۔شیر نے اوپر پہنچ کر مچان کی پٹی اپنی دانتوں سے چور چور کر دی اس بہاد رخاتون نے شیر کے منہ میں نال ڈال کر دونوں فیر چلائے مگر مس فائر ہو گئے آخر کار یہ مچان سے گریں اور گر کر بھاگیں۔شیر برابر مچان چباتا رہا اس وقت ان کے خاوند نے گولی چلائی جو لگی اور شیر گر گیا ان کے پاس صرف یہی کارتوس باقی رہ گیا تھا یہ مچان ان کے پاس اب تک ہے اور یہ قصہ میں نے خود ان سے سنا تھا ٹائیگر کا درخت پر چڑھنا نہایت عجیب بات ہے۔

آٹھ نو برس تک نینی تال کے ٹورنامنٹ میں یہ میری ساتھی ہوتی تھیں۔کئی بار ہم لوگ جیتے بھی بڑی سچی دوست اور بہت اچھی ٹینس کی ساتھی ہیں ہارتے وقت بھی ہنستی رہتی ہیں۔رنگ و نسل کی تفریق ان کے یہاں بالکل نہ تھی۔

لیڈی فریمنٹل:

لیڈی فریمنٹل دوسرے لیڈی کھیلنے والی قابل ذکر ہیں یہ بڑی بھلی مانس اور رنگ و نسل میں تفریق نہ کرنے والی خاتون تھیں۔ٹینس کی بیحد شوقین اور جیتنے کی بے حد خواہشمند۔بعض اوقات بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتی تھیں۔مثلاً اگر ہارتیں تو اکثر یہ کہتیں ”ہائے اللہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا“۔یا اسی قسم کے دوسرے فقرے زبان سے نکل جاتے۔

ایک بار میز ہاؤس میں شام کو میں چائے اور ٹینس کی غرض سے گیا۔ جگدیش اور میجر اور مسز کوکس (جو میز بان تھے) سر سیلون اور لیڈی فریمینٹل سر جگدیش اور میجر کوکس تو چائے پیتے رہے اور میں معہ مسز کوکس کے جانب اور وہ میاں بیوی اور دوسری جانب کھیل رہے تھے۔ لیڈی فریمنٹل نے سروس کی میں نے فور ہینڈ سے ایک لمبا ڈرائیو کیا جو بیس لائن کے قریب گرا۔ لیڈی صاحب نے واپس کیا میں نے آگے بڑھ کر جال کے قریب پین کے ساتھ ڈال دیا وہ زور سے دوڑیں اور گو اس کو واپس کرنا ناممکن تھا لیکن وہ غصہ میں جال تک دوڑتی آئیں واپسی میں کورٹ کے باہر ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھ گئیں میں سمجھا کہ شاید لباس کے کسی حصہ کو درست کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا جب وہ پھر کورٹ پر واپس آئیں تو کھیل شروع ہوا تو قضا کار میں نے اسی طرح دونوں اسٹروک پھر کیے یعنی اول گہر اڈرائیو اور پھر چوپ انھوں نے پھر اسے لینے کی کوشش ناکام کی اور پھر ایک بار وہ کورٹ سے باہر جا کر ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھیں۔ مجھے پھر غلط فہمی ہوئی کہ لباس کے کسی حصہ کی درستی مقصود ہے اور صنف نازک کے احترام میں منہ پھیر کر کھڑا ہونا ہی میں نے مناسب سمجھا۔ اصل وجہ نہ میری سمجھ میں آسکتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ جو صاحب بھی اسے پڑھ رہے ہوں نہ ان کی سمجھ میں آسکتی ہے جب پھر کھیل شروع ہوا تو شومئی تقدیر سے مجھ سے پھر وہی قصور ہوا اور گیند تک پہنچنے میں ان کی کوشش اسی طرح ناکام رہی اس بار ایک ہاتھ میں گیند اور دوسرے میں بلّہ لیکر مجھ پر حملہ آور ہوئیں اور میرے کورٹ میں بھاگی چلی آئیں خیر ہوئی پٹتے پٹتے بچا۔ میرے قریب آ کر انھوں نے گیند کو بڑے زور سے زمین پر مارا اور واپس ہو گئیں خاوند کے شرمندگی محتاج بیان نہیں اور سر جگدیش اور میجر کوکس ہنسی سے بے تاب تھے جب کھیل ختم پر واپس آیا تو جگدیش پرشاد نے کہا کہ دوبارہ لیڈی فریمنٹل نے گھٹنہ ٹیک کر خدا سے معافی مانگی تم وہی اسٹروک کرتے رہے اور نہ مانے۔

بھدوار بہنیں:

ٹینس کھیلنے والی خواتین میں دو (۲) بہنیں۔ بھدوار جواب مسٹر باترجی کمشنر

کی بیوی ہیں اور مس بھدوار اس صوبہ کی ٹینس میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ بھدوار خاندان سے میرے بڑے دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات ہیں، مسز بانر جی بڑی خوبیوں کی خاتون ہیں ان کی چھوٹی بہن کی سب سے نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ کھیلنے میں وہ ہارتی ہوتیں جب بھی اپنی خلقی شگفتہ مزاجی کو ہاتھ سے نہ دیتیں۔ میں دونوں بہنوں کے اخلاق واخلاص کا معترف رہا۔

اس زمانہ کے کھیلنے والوں میں کنور جبیر سنگھ آنجہانی، ای۔ وی۔ بوب احد حسین ہندوستان کے اچھے کھیلنے والے خیال کیے جاتے تھے۔ آج کل رفتار پر ہی بھروسہ کیا جاتا ہے لیکن جبیر سنگھ اور احد جتنے قسم کے اسٹروکس لگاتے تھے موجودہ کھلاڑیوں میں شاید ہی کوئی لگا سکتا ہے۔

جیسے بعض اوقات بات میں بات نکل آتی ہے ایسے ہی کبھی کوئی نئی بات پرانی یاد کو تازہ کر دیتی ہے۔ رشید صاحب نے اپنے کرم خاص سے اپنی کتاب ''گنج ہائے گرانمایہ'' مجھے دی اول ایسے حضرات کا تذکرہ جو میدان عمل میں ایسے نقوش قدم چھوڑ گئے ہیں جو برسوں آنے والوں کے لیے چراغ ہدایت ثابت ہونگے یا بعد مرگ بھی ایسے دوستوں کے قلوب میں ان کی یاد بعد مرگ بھی ایسے دوستوں کے قلوب میں ان کی یاد زندہ ہے پھر رشید صاحب کی تحریر کتاب جو ہاتھ میں لی تو پھر جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔

اکبر الٰہ آبادی:

رشید صاحب نے اس میں اصغر گونڈوی مرحوم کا حال لکھا ہے اس کو پڑھ کر مجھے ایک بہت ہی پرانا قصہ جو شاید ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء کا ہے یاد آ گیا۔ میں ایک بار الہ آباد گیا اکبر مرحوم زندہ تھے بے اختیار دل چاہا کہ دیکھ آؤں۔ حاضر ہوا اکبر مرحوم بہت ضعیف ہو گئے تھے ایک آرام کرسی پر بیٹھے تھے جہاں تک مجھے یاد ہے بینائی بھی کچھ جواب دینے لگی تھی۔

مجھ سے پوچھا کیا نام ہے؟

میں۔ احمد سعید

اکبر۔ کہاں سے آئے ہو۔
میں۔ علی گڑھ سے آیا ہوں چھتاری کا باشندہ ہوں۔
اکبر۔ (ذرا چونک کر) چھتاری! نواب لطف علی خاں کو جانتے ہو۔
میں۔ مرحوم میرے چچا تھے۔
یہ سن کر حضرت اکبر مرحوم کھڑے ہو گئے اور بغل گیر ہو کر مجھے بہت پیار کیا اور فرمایا کہ نواب لطف علی خاں میرے بڑے دوست تھے میں نے عرض کیا کہ تمنا یہ ہے کہ آپ کا کوئی تازہ کلام آپ کی زبان سے سنوں۔ مرحوم نے ایک پرچہ سے ایک غزل سنائی جن کے چند اشعار یاد رہ گئے ہیں۔

ہوں میں پروانہ مگر شمع تو ہو رات تو ہو
جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو
گفتنی ہے دل پُر درد کا قصہ لیکن
کس سے کہیے کوئی مستفسر حالات تو ہو
داستان غم دل کون کہے کون سنے
بزم میں موقعہ اظہار خیالات تو ہو
نظر اللہ میں رکھ، ہو نہ پریشاں اکبر
لے مصلے کو ذرا صرف مناجات تو ہو

ایک نام نہاد روحانی تجربہ:

ایک بار سی. وائی. چنتامنی آئے میں اور سر جگدیش بیٹھے تھے روحانیت پر بحث ہوتے ہوتے سی. وائی. آنجہانی نے کہا کہ لاؤ میز پر ہاتھ رکھ کر روحوں کو بلائیں۔ ایک چھوٹی میز کے گرد ہم سب بیٹھ گئے اور اس پر ہاتھ رکھ لیے۔ تھوڑی دیر کے بعد حرکت ہوئی چنتامنی صاحب نے نہایت متانت کے ساتھ کہا۔ براہ مہربانی بیٹھ جائے اور جو کرسی خالی تھی اس طرف اشارہ کیا یہ مسٹر ہیوم کی روح بتائی گئی ہم لوگ سوال کرتے تھے اور سی، وائی کاغذ پر جواب بہت تیزی سے لکھتے تھے۔ بعض سوالات کے جوابات بڑے دلچسپ تھے۔

میرے متعلق ایک جواب یہ تھا کہ آئندہ جنم میں مجھے دہلی کے ایک بڑے سوداگر کے یہاں پیدا ہونا ہے۔ اور جوتوں کی تجارت کیا کروں گا میرے ایک سوال کا جواب کہ عالم برزخ میں اخبارات ہوتے ہیں اور ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اردو کے اخبار بھی ہیں تو جواب نفی میں تھا چند اور جوابات یہ تھے دوسرا منسٹر سیتارام ہوگا۔ پریسیڈنٹ کوئی مسلمان ہوگا دوسرا گورنر اوڈائل ہوگا میں ہوم ممبری کے بعد کونسل آف اسٹیٹ میں جاؤں گا۔ ۱۹۲۹ء میں پروشنل حکومت یوپی میں ہو جائے گی اور ۱۹۴۵ء میں سوراج ہو جائیگا۔

۲۰ر دسمبر کے روزنامچہ میں سر جگدیش کے گھر لڑکا ماشاءاللہ بہت خوبصورت جوان ہوا ہے۔ خدا زندہ رکھے اسی سال دسمبر کی ۲۹ر کو مہاراجہ الور آنجہانی علی گڑھ آئے۔ میں نے ان کی تقریر کے متعلق حسب ذیل ریمارک روزنامچہ میں لکھا۔ تقریر اتنی بے نظیر تھی کہ میں نے اپنی عمر میں ایسی تقریر نہیں سنی مجھے ذاتی طور پر مہاراجہ سے چنداں واقفیت نہ تھی لیکن ان میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اجتماع ضدین کیا تھا جو یوں تو محال ہے مگر یہاں ممکن ہو گیا ہے۔

علی برادران:

مسلم لیگ کا جلسہ اس سال علی گڑھ میں ہوا تھا اور سر عبدالرحیم پریسیڈینٹ تھے۔ اُن کا خطبۂ صدارت بہت پرزور تھا۔ علی برادران نے اسے پسند نہیں کیا۔ دوسرے روز جلسہ میں ایک ریزولیشن مسٹر جناح نے پیش کیا۔ علی برادران نے اس کی بھی مخالفت کی لیکن انھیں پانچ روز سے زیادہ رائیں نہ ملیں۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ نہیں کہ ان بھائیوں کا اثر مسلمانوں پر اس زمانے کے دوسرے قائدین کے مقابلہ میں کم تھا یہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ کس لائحہ عمل کو قوم کس وقت قابل قبول سمجھتی ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم بڑی شخصیت کے حامل تھے اپنے سیاسی مسلک کی خاطر انھوں نے بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ یوں تو کتاب سیاست میں ان کے ہم سبق اب بھی موجود ہیں لیکن ان کی طرح نہ کسی نے صحرانوردی کی اور نہ رسوائے کوچہ و بازار ہوا۔ پہلی گول میز کانفرنس میں ان کی تقریر مجھے یاد ہے قلب کی شکایت انھیں پہلے سے

تھی غالباً اس تقریر نے انھیں ختم کر دیا۔ مجھے یاد ہے ہوٹل میں ان سے ملنے گیا بستر مرگ پر لیٹتے تھے اپنی تقریر کے متعلق کہنے لگے یہ میرا (Swan Song) تھا دو تین روز کے بعد انتقال ہو گیا۔

ہوم ممبری

یہ سال مہاراجہ (محمود آباد) کی ہوم ممبری کا پانچواں سال تھا تو اخباروں نے خود قیاس آرائیاں شروع کیں اور کچھ حسب قاعدہ قیاس آرائیاں کرالی گئیں بہت سے نام اخبار میں آنے لگے۔ میرا بھی لیا جاتا تھا نواب محمد یوسف کی تصویر "پانیر" کے ماہوار رسالہ میں (جواب اب نہیں نکلتا) چھاپی گئی۔ ایک طرف بجا طور پر اس کی کوشش ہو رہی تھی کہ اس بار کسی ہندو کو ہوم ممبر کیا جائے۔ پنڈت مدن موہن مالوجی اور راجہ سر رام پال سنگھ نے اس کے متعلق سر ولیم میرس سے زبانی کہا کہ اس پر کسی ہندو کو مقرر کیا جائے۔ راجہ سر رام پال سنگھ کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ نواب محمد یوسف بھی اس سال نینی تال آئے تھے۔ اور گرمیوں بھر رہے۔ بہر حال ہر چار طرف دوڑ دھوپ ہو رہی تھی۔ کنور جگدیش پرشاد کا خیال تھا کہ مہاراجہ کے ڈنر پر بٹلر پیلس میں سر ولیم کی تقریر (جو اوپر نقل کر چکا ہوں) کا منشا یہ تھا کہ میں ہوم ممبر ہوں گا اخباروں میں نت نئے شگوفے کھلتے اور کھلائے جاتے۔

ستمبر کے آخر میں نینی تال کا موسم ختم ہوا اور میں چھتاری چلا گیا چھتاری ہی میں گورنر کا تار ملا روزنامچہ کے الفاظ یہ ہیں۔

۱۴ر اکتوبر ۲۵ء آج گورنر کا ایک تار آیا جس کے معنی میں یہ سمجھ سکا مگر شام تک کے تاروں سے معلوم ہوا کہ میں ہوم ممبر ہو گیا۔

اعلان کے بعد جیسا ہوتا ہے تاروں اور خطوط کی بھرمار اور مبارک باد کا زور رہا۔ چوں کہ وزارت میں جگہ خالی ہو گئی تھی اس لیے اب دوسرا بڑا مرحلہ میری جگہ دوسرے وزیر کے تقرر کا تھا۔

میں ۲۰ر اکتوبر کو علی گڑھ آیا ڈاکٹر ضیاء الدین بھی وزارت کے خواہاں تھے

لیکن مجھے ان کی تقرر کی کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ گورنر پھر یہ کوشش کریں گے کہ گورنمنٹ میں اگر ایک مسلمان ہو تو وہ دو ہندو ممبر ہوں اور میرے تقرر کے بعد جو یہ تناسب اُلٹ گیا ہے اُسے پھر اصل حالت پر لایا جائے گا دوسرے سر ولیم میریس ڈاکٹر صاحب سے کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہتے تھے اور قلباً ان کو پسند نہ کرتے تھے۔یہ دوسری وجہ ایسی تھی کہ جسے میں کسی سے بیان نہیں کرسکتا تھا۔آج جب کہ یہ داستان ماضی بن گئی ہے۔تو میں نے سپرد قلم کردیا۔۲۰/اکتوبر کے روزنامچہ میں لکھا ہے۔

"ڈاکٹر ضیاء الدین بھی وزارت کے خواہش مند ہیں مگر ڈر یہ ہے کہ ممکن معلوم نہیں ہوتا"۔

وزیر کی تلاش:

میں علی گڑھ سے لکھنؤ پہنچا۔رائے راجیشور بلی سے ملا اور دوسرے وزیر کے متعلق گفتگو رہی ان کی رائے تھی کہ راجہ سر رام پال سنگھ کو وزیر بنایا جائے اس تقرر میں چنداں عجلت تھی اس وجہ سے کہ مجھے مہاراجہ مرحوم سے جنوری میں جائزہ لینا تھا۔جنوری تک میں خود وزیر تھا راجہ سر رام پال سنگھ کے تقرر میں ایک وقت یہ تھی کہ کونسل کے ممبر نہ تھے دوسری وقت یہ بھی تھی کہ مسلمان ممبران عام طور پر اور مہاراجہ مرحوم بالخصوص اُن کے مخالف تھے مسلمان ممبران کی اہمیت سوراجسٹ کی موجودگی کی وجہ سے بہت زیادہ تھی اس واسطے کو سوراجسٹ کی مدد پر تو کوئی بھروسہ ہونا ممکن نہ تھا اور تیس مسلمانوں کا اختلاف غیر سرکاری آرا کی اکثریت وزارت کے خلاف کردیتی تھی۔ایک دقت اور بھی تھی جس کا علم اس وقت صوبہ میں سوائے میرے اور جگدیش کے شاید کسی کو نہ ہوگا وہ یہ کہ میرے ہوم ممبر ہونے کے سلسلے میں سر ولیم اور راجہ سر رام پال سنگھ آنجہانی کے درمیان کچھ گرم گفتگو ہوگئی اور سر ولیم نے راجہ صاحب سے یہ کہا کہ تمہیں تو چھتاری کے تقرر سے اس بنا پر اختلاف ہے کہ تم خود ہونا چاہتے تھے۔علاوہ راجہ رام پال سنگھ کے سر سیتا رام اور جگناتھ بخش سنگھ کے نام بھی زیر بحث آئے۔

۲۵/اکتوبر کے روزنامچہ میں یہ عبارت ہے۔

.... پھر کنوار صاحب کے ہاں رائے راجیشور بلی سے بات چیت

ہوئی وہ رام پال سنگھ کو چاہتے تھے جگناتھ بخش کے خلاف ہیں اور سیتارام کے واسطے مذبذب ہیں میرے خیال میں سیتارام سب سے اچھے ہیں"۔

اور ہر ایک ہندو وزیر کی تلاش تھی ادھر مسلمان ممبروں میں یہ خیال تھا کہ ایک مسلمان وزیر بھی ہو۔ حافظ ہدایت حسین صاحب مرحوم نے اس کے متعلق ۲۶ ر اکتوبر کو مجھ سے ذکر کیا اور اُس سے معلوم ہوا کہ سر شفاعت کی یہ تجویز تھی۔ رائے یہ تھی کہ مسلمان ممبروں کو ایک محضر نامہ تیار کرایا جائے۔ میں نے اس محضر نامہ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا غرض اس زمانہ میں لکھنؤ کی سیاست میں ایک طرف تو ایک مسلمان وزیر کا چرچا تھا اور دوسری طرف میرے تقرر پر ہندو سبھا اور راجہ سر رام پال سنگھ ایجی ٹیشن کر رہے تھے، میری یہ خواہش تھی کہ اگر ممکن ہو تو کچھ روز ہوم ممبر ہونے سے پہلے آرام کر لوں لیکن وزراء کا تقرر ہونا سد راہ تھا۔

۳۰ ر اکتوبر کے روزنامچہ میں لکھا ہے۔

.... گورنر اس پر بھی آج راضی نہ ہوئے کہ مجھے استعفیٰ کی اجازت دیں ڈاکٹر ضیاءالدین کے متعلق عجیب سوال کیا "کیا وہ قوم کے واسطے کام کرتے ہیں یا اپنی ذات کے واسطے"............

جگناتھ بخش اپنی وزرات کے متعلق باتیں کرتے ہوئے یہ کہنے لگے کہ "اگر راجہ رام پال سنگھ کی خوشامد سے وزارت ملے تو مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں"

۳۱ ر اکتوبر "آج نواب محمد یوسف آئے ہیں اپنے متعلق تمام ممبران کے تار روانہ کرنے کا ذکر کر رہے تھے بڑا دوست آدمی ہے" پھر کچھ ان کے بھولے پن کا ذکر ہے۔ اسی روز پنڈت جگت نرائن سے معلوم ہوا کہ دوسرے روز ہندو سبھا کی میٹنگ ہونے والی ہے۔ جس میں میرے تقرر کے خلاف اظہار ناراضی کیا گیا۔

اس زمانہ میں تین چار ہفتے کے واسطے گورنر موسم سرما میں الہ آباد جایا کرتے تھے چنانچہ ہم لوگ الہ آباد پہنچے۔ ۱۲ ر اکتوبر کو الہ آباد کا قلعہ میں نے دیکھا مجھے اس کی جائے وقوع بہت پسند آئی۔ لیکن عمارتیں تمام ویران ہو گئی ہیں میرے روزنامچہ میں اس سلسلے میں یہ شعر درج ہے۔

پردہ داری میکند برقصر کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت میزند برگنبد افراسیاب

سرتیج بہادر سپرو:

اس روز شام کو سرتیج کے یہاں ڈنر تھا۔ بعد کھانے کے سرتیج نے کہا کہ سرولیم کورائے عامہ کی بالکل پروا نہیں ہے وہ اس کی کوشش نہیں کرتے کہ ہندوستان کی رائے عامہ انھیں معلوم ہو کر ان کے واسطے چراغ راہ بنے۔

میں نے دوسرے روز سرولیم میرس سے پوچھا کہ جب سے الٰہ آباد آئے ہیں سرتیج سے کوئی ملاقات ہوئی تو جواب نفی میں تھا۔ میں نے سرولیم کو اس طرف متوجہ اوران کے اسٹاف کو تنبہ کی گئی کہ کیوں گورنمنٹ ہاؤس میں انھیں مدعو نہیں کیا گیا۔ ارباب حل وعقد کا یہ فرض اولین ہے کہ بغیر امتیاز مذہب وملت اور بلاتفریق عقائد سیاسی مفکرین سے خود ملاقات کی کوشش کریں۔ اوران کی تنقید سے مستفید ہوں۔

مجھے سرتیج بہادر سے بڑی عقیدت ہے۔ میں ان کو ہندوستان کے چند اُن بہترین اشخاص میں سمجھتا ہوں جن سے میں آشنا ہوں۔ سرتیج آج بھی جب کہ فرقہ وارانہ کشمکش نے سیاسی افق کو نہ صرف مکدر بلکہ بے حد تاریک بنا دیا ہے۔ انصاف پسندی اور رواداری کے ماہ منیر کہلانے کے مستحق ہیں۔ خلوص ومروت اور اخلاق اور وضعداری کو جو ہمارے اسلاف کی تہذیب کا طرۂ امتیاز تھا ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں ان کی زبان اظہار حق میں بڑی بے دھڑک ہے۔ جو نہ طبل وعلم کی چاہ سے مرعوب ہوتی ہے۔ نہ سیاسی قیادت کے جلال سے متاثر۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ سرتیج اپنے عقائد کے اظہار میں باوجود بے حد اور سنجیدہ ہونے کے بدرجہ تم بے باک ہیں۔ سرتیج اُردو ادب کے بڑے دلدادہ ہیں۔ ہندی اور اُردو کی کشمکش شروع ہوئی اور اس ملک کی بدنصیبی سے اس نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا۔ لیکن سرتیج بہادر نے بلالحاظ اس کے اکثر ہم مذہب وملت ہندی کی طرف ہیں، اردو کی حمایت کی اور اس درجہ جرأت سے اس کی حمایت کی کہ اس صوبہ میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جن کی اُردو زبان اتنی رہین منت ہو جتنی سرتیج کی انھوں نے مضامین لکھے، تقریریں کیں اور الٰہ آباد میں ایک ادارہ ''روحِ ادب'' قائم کیا، جس نے اردو کے احیاء کے

لیے تریاق کا کام کیا۔ کل ہند انجمن ترقی اُردو کے سرپرست اور صدر ہیں۔

اسی سلسلہ میں مجھے دو واقعات راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے یاد آگئے۔ ایک بار مسٹر رمزے میکڈانلڈ نے چند ممبران کانفرنس کو بلایا اور مقصد وہی تھا جواب تک مرہون کامیابی نہ ہوا۔ یعنی ہندو مسلم کی کشمکش کا فیصلہ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر مونجے مسلمانوں کے مطالبات کے خلاف تھے مجھے یاد ہے کہ سرتیج نے کہا ''مجھے معلوم ہے گوشت خور ہیں لیکن مردم خور نہیں''۔

I know the muslims are meat eaters, but they are not man eaters."

ایک بار لندن ہی میں، ہاؤس آف کامنس، کی عمارت میں وزیر اعظم نے پھر کچھ مخصوص ممبران کانفرنس کو یاد کیا۔ یہ شاید وزیر اعظم کا کمیٹی کرنے کا کمرہ تھا میں اس میں بھی موجود تھا۔ مجھے اس وقت صحیح یاد نہیں شاید ڈاکٹر مونجے یا راجہ نریندر ناتھ آنجہانی نے یہ کہا کہ وہ مسلمانوں کو اس سے زیادہ دینے کو تیار نہیں کہ جو نہرو کمیٹی کی رپورٹ میں دیا گیا ہے۔ اس سے قبل کہ کوئی مسلم ممبر اس کا جواب دے سرتیج کھڑے ہوگئے اور کہا ''آج جب کہ خود کانگریس نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں، ڈبو دیا تو پھر مسلمانوں سے یہ امید کرنا کہ وہ اسے قبول کریں ناانصافی ہے''۔

دریائے راوی سے سرتیج کا اشارہ کانگریس کے اس جلسہ کی طرف تھا جو لاہور میں ہوا اور نہرو رپورٹ اس میں منظور نہ ہوئی۔ سرتیج بڑے مخلص دوست ہیں۔ ان کا طرز بیان اتنا دلکش ہوتا ہے کہ گھنٹوں باتیں کرتے رہیے اور دل نہیں گھبراتا جتنی دیر ان کے پاس بیٹھیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نئی چیزیں معلوم ہو رہی ہیں، جس سے ذہن اور دماغی آسودگی پیدا ہوتی ہے۔ لباس بہت اچھا پہنتے ہیں کھانے کا بہت شوق ہے اور اس سے زیادہ کھلانے کا۔ پرانے کاغذات میں موصوف کا ایک خط مل گیا جو بجنسہٖ درج ذیل ہے۔ اس سے آپ کے ذہنی اور تہذیبی سرچشموں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خدا انھیں تادیر زندہ رکھے۔

۶ ردسمبر

مخدوم و محترم بندہ، آداب و نیاز

آج ہی ایک عریضہ انگریزی میں خدمت والا میں بھیجا ہے۔اس وقت کچہری سے آکر ایک نئی کتاب جس میں مجموعہ شعرا ایران عصر حاضر کا ہے میں مطالعہ کررہا تھا۔ایک شاعر فرات کے چند اشعار نظر سے گزرے۔وہ خدمت عالی میں تحریر کر کے بھیجتا ہوں۔

اس کے سوائے کیا لکھوں کہ ہندوستان کی حالت کا ایک نقشہ ہیں غالباً پسند خاطر ہونگے۔

بندہ عاصی
سرتیج بہادر سپرو

اشعار حسب ذیل ہیں

در مردما نشانہ، از مہر و داد نیست
در ہیچ فرقہ اثر از اتحاد و نیست
دلہا پر از نفاق دورو نہا پر از شقاق
زنیر و بددستی کسے اعتماد نیست
جملہ مردے ہمہ خوشروی و خوش بیاں
امادر آنمیانہ یکے خود نہاد نیست
صدق وصفا چہ شد و کجارفت اتفاق
در بیں جمع خستہ دلے گفت بافرات
خلوت گزیں کہ ہیچ بہ از انفراد نیست
میں آخر شعر پر عمل کررہا ہوں

تیج بہادر سپرو

الہ آباد پہنچ کر بھی وزارت کی کشمکش سوہان روح رہی ہے۔
۲۴ر نومبر ۲۵ء کے روزنامچہ میں درج ہے "گورنر کے ہاں گیا بہت دیر تک دوسرے وزیر کے متعلق گفتگو رہی کسی نتیجہ پر نہ پہونچے میں چلنے لگا تو بولے شاید غلطی ہوئی کہ تمہیں ہوم ممبر کیا گیا اور مشکل پیش آئی۔

"میں" اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میں راضی ہوں کہ ہوم ممبری سے انکار کر دوں اور بحیثیت وزیر کام کروں۔

"وہ" نہیں شکریہ۔

۲۴ر نومبر کے روزنامچہ میں ایک خاص صحت کا ذکر ہے۔

اس زمانہ میں مسلمان ممبران کو یہ شکایت ہوگئی تھی کہ راجیشور بلی کچھ متعصب ہیں اور یہ میرے واسطے باعث تردد تھی۔ ۹ر دسمبر کو راجیشور بلی آنجہانی نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے راجہ پرتھوی پال سنگھ کا نام دوسری وزارت کے واسطے پیش کیا ہے۔

میں لکھنؤ واپس آگیا۔ یہاں حافظ ہدایت حسین صاحب مرحوم سے ۱۵ر دسمبر کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر شفاعت احمد یہ کہتے ہیں کہ

گورنر مسلمان کو وزیر کرنا چاہتے ہیں .... چھتاری مسلمان وزیر ہونے کے خلاف ہیں۔ لیکن اسی شام کو میں نے جب ڈاکٹر صاحب سے تصدیق کی تو انھوں نے انکار کیا کہ کسی سے ایسی گفتگو ہوئی۔

آخر کار راجہ پرتھوی پال سنگھ نے وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا راجیشور بلی کو پھر پریشانی ہوئی۔ وزارت کا قصہ جال کا جنجال ہو گیا تھا۔ ادھر دسمبر کے دس روز باقی تھے اور پھر مجھے ہوم ممبری کا چارج لینا تھا۔ میں نے کنور راجندر سنگھ کے واسطے رائے دیدی کہ انھیں وزیر کیا جائے۔

یہ پورے تین سال کی وزارت کے تجربہ کا خاتمہ تھا جب میں ایک نگاہ بازگشت ڈالتا ہوں تو دیکھ کر کہ بلا تفریق مذہب وملت اس کونسل کے ممبروں نے مجھے کس طرح اپنایا۔

میرا دل جذبہ تشکر سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اس عرصہ میں ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ مجھے کونسل میں غیر سرکاری ممبروں کی کثرت رائے نہ ملی ہو۔

وزیروں کی دشواریاں:

اس زمانہ کے وزراء کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جو اختیارات کے موجودہ قانون کے تحت وزراء کو حاصل ہیں وہ انھیں حاصل نہ تھے۔ سب سے پہلی دشواری تو یہ تھی کہ برطانیہ کی یہ پالیسی نہ تھی کہ ہندوستان کو چھوڑ دیا جائے اور اس کلیہ کی

جزئیات جن اقسام وانواع کی ہو سکتے ہیں وہ تمام ہی موجود تھیں۔ مثلاً وزیر ہند کے زیر فرمان جتنی ملازمتیں تھیں ان پر وزراء کا اقتدار برائے نام تھا۔ گورنر کے اختیارات وسیع تھے موجودہ زمانے کے برعکس وہ اُن اختیارات کو برتنے میں ذرا پس و پیش نہ کرتے تھے۔ خود ہمارے ملک کے لوگوں میں آزادی کی اس درجہ طلب صادق نہ تھی جو آج ہے۔ تاہم اس زمانہ میں بہت سا مفید کام ہوا۔ وزراء کے وجود سے عوام میں سیاسی خودداری اور سیاسی شعور پیدا ہوا۔

وزیروں کی خدمات:

میرا مقصد سیاسی تاریخ لکھنا نہیں ہے۔ لیکن ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک اگر سال بسال دیکھا جائے تو وزراء کے محکمہ جات میں کافی ترقی ہوئی۔ مثلاً صنعت وحرفت کے محکمہ میں، مدرسوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا اور ہر ضلع میں مختلف صنائع بدائع کے مدارس قائم ہوئے۔ خریداری سامان کے واسطے ایک محکمہ خاص بنایا گیا اور ہر صیغہ اس سے اپنی سالانہ ضروریات کا اظہار کرتا تھا اور جو چیز ہندوستان میں نہ مل سکے فقط ان کی خریداری باہر سے ہوتی تھی۔ ان مدارس کی بدولت اکثر نئی چیزیں اس صوبہ میں تیار ہونے لگیں۔ محکمۂ زراعت میں تخم کی تقسیم اور عمدہ تخم کو کاشتکار تک پہنچانے میں کامیاب کوشش کی گئی۔ جہاں تک نیشکر کا تعلق ہے پرانی شکر جسے ''پونڈا'' کہتے ہیں بالکل مفقود ہوگئی۔ اور اس طرح کاشتکار کی فی بیگہ پیداوار میں دُگنا اور تگنا اضافہ ہو گیا۔

وزیر کے تقرر کا پیچیدہ مسئلہ:

میں نے ۳ر جنوری ۲۶ء کو بذریعہ تار چھتاری میں ہوم ممبری کا چارج لیا۔ لیکن وزارت کا قصہ ابھی تک طے نہ ہوا تھا۔ مسلمانوں کو اس پر اصرار تھا کہ ایک وزیر مسلمان بھی ہو اور سوراج پارٹی کی پالیسی کسی کی تائید میں نہ تھی۔ اس لئے مسلمان آرا فیصلہ کن ہو جاتی تھیں۔ ایک روز سرولیم اسی پر گفتگو کر رہے تھے میں نے تجویز پیش کی کہ بجائے دو وزیروں کے تین ہوں جس میں ایک مسلمان ہو۔ میرے دلائل یہ تھے کہ میرا وجود گورنمنٹ میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں تھا اور نہ میں کونسل کے سامنے جواب دہ تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بیجا نہیں کہ ہمارا نمائندہ اس

حصہ گورنمنٹ میں ہونا ضروری ہے جو کونسل کے سامنے جواب دہ ہو۔ یہ پوائنٹ سر ولیم کو بہت پسند آیا۔

رائے راجیشور بلی کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا کہ:

۱۔ مسلمان ممبروں میں اکثر ان پر اطمینان کامل نہیں رکھتے۔

۲۔ سوراجسٹوں کی پالیسی چوں کہ ہر گورنمنٹ کے خلاف تھی لہٰذا بغیر مسلمانوں کی تائید کے وزارت مضبوط نہ ہو گی۔

رائے صاحب انجہانی کی یہ عادت تھی کہ آخری وقت تک مذبذب رہتے اب تین وزیروں کے تقرر کی رائے جب قائم ہوئی تو ۸ر جنوری کو مجھے اوڈی سے معلوم ہوا کہ رائے راجیشور بلی اب راجندر کے بجائے ٹھاکر ہنومان سنگ آنجہانی کو وزیر بنوانا چاہتے ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف تھا۔

نواب محمد یوسف اور راجندر سنگ کا انتخاب:

ایک روز سر ولیم نے مجھے اور راجیشور بلی کو ساتھ ساتھ بلایا۔ میں نے مسلمان وزیر کے واسطے ہدایت حسین مرحوم کا نام پیش کیا۔ لیکن رائے صاحب نے کہا کہ ہندو اسے پسند نہ کریں گے لیکن نواب سر محمد یوسف کے نام پر انھیں اعتراض نہ تھا۔ چنانچہ یہی طے ہوا کہ راجندر اور یوسف وزیر ہوں گے۔

۱۱ر جنوری ۱۹۲۶ء کے روزنامچہ میں درج ہے! ''آج یوسف صاحب سے معلوم ہوا کہ گورنر نے انھیں بلایا اور کہ دیا کہ وہ اور راجندر دو نئے وزیر ہوں گے۔ خدا راس لائے''۔

خدا خدا کر کے وزارت کا قصہ طے ہوا۔ لیکن ہندو حضرات میں یہ خیال تھا کہ گورنر نے یہ مسلمانوں کے دباؤ کی وجہ سے کیا'' ۱۷ر جنوری کو پنڈت جگت نرائن نے یہ مجھ سے خود کہا۔

میرے خیال میں اس میں کوئی ناانصافی نہ تھی جس آئین کے تحت یہ تقرر ہوئے تھے اس میں ہوم ممبر کسی فریق کا نمائندہ ہو سکتا تھا اور نہ کونسل کو جواب دہ ہوتا تھا۔

میں اپنے نئے صیغہ جات کی طرف متوجہ ہوا۔ خاص کر جیل اور پولیس میں

توجہ کی ضرورت تھی جیل میں بہت سی ایسی اصلاحات شروع ہو گئیں جن کا منشاء جیل کی زندگی کو انسانی زندگی بنانا تھا۔ اور قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کو ختم کرنا تھا۔

چند عجیب خواب:

اس سلسلے میں چند خوابوں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا ممکن ہے کہ اسے میری توہم پرستی پر محمول کیا جائے لیکن میرا تو یہ خیال ہے کہ بعض اوقات انسان کے قلب پر خود اپنے یا اپنے کسی عزیز و اقارب کے متعلق آنے والے واقعات کا عکس پڑتا ہے اور قبل از وقت چیزوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنی عمر میں ایسے کئی واقعات یاد ہیں۔

گورنر کا تار مجھے ۱۲/ اکتوبر کو ملا۔ لیکن اس سے دو تین روز قبل میں نے ایک خواب دیکھا کہ بانسوں کا بنا ہوا ایک پنڈال ہے جس پر سبز رنگ تھا اور اندر کی جانب سے پردے لگا کر سجایا گیا ہے۔ میں سفید انگرکھا پہنے بیٹھا ہوں۔ سامنے سے مہاراجہ صاحب مرحوم آ رہے ہیں اور بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ مجمع میرے پاس آیا کسی شخص نے ایک طشت مہاراجہ کے سامنے پیش کیا جو سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کپڑا ہٹایا تو اس میں ایک سنہری ہار تھا جو مہاراجہ نے اٹھا کر میری گردن میں ڈال دیا اور مجھے خواب میں ہی یہ محسوس ہو گیا کہ میں ان کا جانشین ہوں گا۔

اسی سلسلہ میں کچھ روز قبل صغیر احمد صاحب نے ایک خواب نینی تال میں دیکھا تھا انھوں نے دیکھا کہ وہ اور بھائی جان (راؤ اصغر علی خاں) اوک اور (Oak Over) سے جہاں میں رہتا تھا بازار جا رہے ہیں اور بروک ہل کے (جو ہوم ممبر کی سرکاری قیام گاہ تھی) کمپونڈ سے گزر رہے ہیں۔ نیچے سے اسی سڑک پر مجھے آتے دیکھا۔ صغیر صاحب کا بیان ہے کہ میں کسی قسم کا فوجی سا لباس پہنے گھوڑے پر آ رہا ہوں۔ یہ مجھے اور میں انھیں دیکھ کر مسکرائے اور میں اوپر کو گذرتا چلا گیا۔ علی الصباح یہ واقعہ انھوں نے بھائی جان سے بیان کیا اور چوں کہ جدید ہوم ممبر کے تقرر کا چرچہ تھا نتیجہ یہ نکلا کہ میں ہوم ممبر ہوں گا۔ اسی روز میں نینی تال سے واپس ہوا اور ریل میں بھائی جان اور صغیر صاحب نے مجھے مفصل سنایا۔ چند ہفتہ بعد میری ہوم ممبری کا اعلان ہو گیا۔

خوابوں کے سلسلہ میں صغیر صاحب کے چند اور خوابوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

میری ہوم ممبری کی پنچ سالہ معیاد ۱۹۳۰ء میں ختم ہوگئی تھی لیکن مجھے توسیع مل گئی تھی۔ جنوری ۳۳ء میں میری توسیع کا زمانہ ختم ہوتا تھا۔ صغیر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ لکھنؤ میں میری جائے مقام پر سالانہ ایٹ ہوم ہو رہا ہے (میری عادت تھی کہ بجٹ کے اجلاس کے ختم پر میں ہر سال بہت بڑے پیمانہ پر ایٹ ہوم دیا کرتا تھا) انھوں نے دیکھا کہ میرے اور گورنر کے گرد عمائد شہر پارٹی لیڈر اور وزراء موجود ہیں۔ لیکن وزراء میں سے مہاراج کنور منچیت سنگھ موجود نہیں ہیں۔ لوگ میرے ساتھ غیر معمولی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں صغیر صاحب میری طرف بڑھے اور میرے نزدیک آ کر بولے ع

"درخراباتِ مغاں نورِ خدا مے بینم"

اس پر میں نے ان کی طرف دیکھا اور سر سے اونچی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی صبح کو یہ خواب نواب بہادر عبدالسمیع خاں سے اس کی تعبیر کے ساتھ بیان کیا کہ مجھے پھر توسیع ملے گی لیکن مہاراج کنور (کہ جو بیمار تھے) جانبر نہ ہوسکیں گے خدا کی شان ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ میری توسیع کا اعلان چند روز بعد ہوا اور مہاراج کنور کا انتقال ہوگیا۔

۳۲ء میں ایک اور دلچسپ خواب صغیر صاحب نے دیکھا۔ میں نینی تال سے چھتاری واپس آیا تھا کہ دو تین ہی روز کے بعد سر مالکم ہیلی کا تار آیا جس میں مجھے بلایا تھا۔ صغیر صاحب سکندرہ آباد چلے گئے تھے انھوں نے وہیں اور اسی روز (جس روز کہ مجھے تار ملا تھا) یہ خواب دیکھا کہ میں سفر کے ارادہ سے بمبئی گیا ہوں۔ وہ بھی ہمراہ ہیں۔ سمندر کے کنارہ تک پہونچنے پائے ہی تھے کہ جہاز میں آگ لگ گئی اور سمندر میں تلاطم پیدا ہوگیا۔

میں نے نینی تال واپسی کی غرض سے صغیر صاحب کو تار دیا۔ وہ اس خواب سے پریشان ہو گئے تھے۔ فوراً روانہ ہوئے اور ہم دونوں نینی تال چل دیئے۔ ہم دونوں یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ بلانے کی وجہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے یا پھر میری توسیع

کا مسئلہ ہے۔ صغیر صاحب نے کہا کہ اس بار آپ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس نہیں جا رہے ہیں اور پھر اپنا خواب بیان کیا اور کہا کہ اگر یہ خواب نہ دیکھا ہوتا تو یوں فوراً چھتاری نہ آتا۔ صغیر صاحب کی یہ عادت بھی ہے کہ اگر میرے پاس آ گئے تو پھر گھر سے بے نیاز اور اگر گھر پہونچ گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے۔

چنانچہ انھیں دو مسائل پر ہیلی صاحب نے گفتگو کی اور میں نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس جانے سے مجبوری کا اظہار کیا اور حافظ ہدایت حسین سی. آئی. بی. کو اپنے بجائے بھجوا دیا۔

اسی سلسلہ میں ایک دو خواب میں اور بھی لکھ دوں۔ میرے دادا زندہ تھے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں۔ طاؤسی نیلے رنگ کا انگرکھا پہنے ہوئے ہوں جس پر سنہرے پھول ہیں اور سفید چمڑے کا ہندوستانی جوتا ہے جس پر سنہرا کار چوبی کام ہے۔ صبح اٹھ کر یہ خواب میں نے مولوی محمد شاہ مرحوم سے بیان کیا جو مجھے کلام پاک حفظ کرا رہے تھے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تمہاری شادی ہوگی چند روز کے بعد میرے داد نے میرا نکاح کرنا چاہا اور نکاح کے روز جو کپڑے میں نے پہنے تو وہ وہی تھے۔ جو اب میں نے خواب میں دیکھے تھے سر مو تفاوت نہ تھا۔ وہی طاؤسی رنگ۔ وہی سنہرے پھول۔ ویسا ہی جوتا میں نے اس لباس کو فوراً شناخت کر لیا کہ یہ وہی لباس ہے جو خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے ایسے خواب بھی دیکھے ہیں کہ جن میں تنبیہ کی گئی تھی۔ یہ خواب انگلستان جا کر دیکھے تھے۔

۳۰ء میں پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ولایت گیا اور وہاں ایک لڑکی کو ملازم رکھ لیا۔ تھوڑے ہی روز میں وہ لڑکی پورے گھر پر چھا گئی جملہ خرید و فروخت وہی کرتی میرے جتنے دعوت نامہ آتے ان میں کسے مسترد اور کسے منظور کیا جائے خود ہی کرتی۔ اگر میں بازار جاتا تو اصرار کر کے ساتھ جاتی میں دعوت کرتا تو مہمانوں کی فہرست وہی تیار کرتی۔ غرض میرے گھر کا سارا کام اس نے اپنے سر لے لیا تھا اور قوت تمیزی اتنی اچھی تھی کہ شاذ مواقع پر مجھے اختلاف ہوتا تھا میں اس سے قدرتاً بہت مانوس ہو چلا تھا کہ میں نے ایک روز خواب میں دیکھا کہ میں ایک عجائب خانہ کی سیر کر رہا ہوں اور

میرے سامنے لوہے کی سلاخوں کے اس طرف ایک شیرنی ٹہل رہی ہے۔ اور وہ شیرنی ٹہل رہی ہے۔ میری ذرا آنکھ بچی کو لہے کا دروازہ کھل گیا اور وہ شیرنی نکل کر میری طرف آئی۔ میں خوف سے گر گیا اور مجھے اپنی پشت کی جانب گردن پر اس کے ہونٹ لگتے محسوس ہوئے اور اس کے سانس کا لگنا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ اب اس نے میری گردن توڑی میری آنکھیں خوف سے بند ہو گئیں میرے کان میں آواز آئی کہ جو لڑکی تیرے سامنے کھڑی ہے وہ یہی شیرنی ہے۔ اور میں نے دیکھا کہ وہی لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو خوف سے میرے تمام کپڑے پسینہ سے تر ہو گئے تھے اور اس درجہ تر تھے کہ میں نے لیاقت خاں کو اٹھا کر اسی وقت کپڑے بدلے تب سویا۔

باردگر جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن گیا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں اپنے معمولات میں مشغول تھا اور جانماز پر بیٹھا تھا کہ میرے دادا صاحب رحمتہ اللہ علیہ آئے اور جانماز پر بیٹھ گئے میں نے دیکھا کہ جانماز پر ایک جگہ کچھ میلا سا دھبہ ہے اور میں ہاتھ سے اسے مٹانا چاہتا ہوں یکا یک داد صاحب نے فرمایا کہ کلام پاک پڑھوں میں نے (افحسبتم انما خلقنا کم عبثا) پڑھی۔ اس آیۃ کریم کا مفہوم یہ ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے اور تمہیں لوٹ کر ہماری جانب آنا نہیں ہے۔ جب قرآن ختم کر چکا تو دادا صاحب نے فرمایا کہ اس کا خیال رکھنا کہ جانماز کو پیشاب کا دھبہ نہ لگ جائے۔ میری آنکھ کھل گئی۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کر دوں۔ اسے خواب تو نہیں کہہ سکتے اس واسطے کہ حالت بیداری میں پیش آیا۔

۳۳ء میں تنویر فاطمہ پیدا ہوئی یہ کوئی ایک ہفتہ کی تھی اس کی والدہ چھتاری تھیں اس کا عقیقہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے نام نہیں رکھا تھا۔ اس کی ایک ہمشیر تسنیم فاطمہ سلمہا اور ایک بھائی عشرت مرحوم بھی چھتاری ہی تھے۔ میں نینی تال کے گورنمنٹ ہاؤس میں سوتے سے اٹھا لیکن ابھی پلنگ ہی پر تھا مگر جاگ رہا تھا۔ میرا ملازم سامنے کھڑا تھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرے داہنے کان کے قریب آ کر کہا کہ تسنیم اور عشرت بیمار ہیں۔ میں نے فوراً اٹھ کر ملازم سے کہا کہ چھتاری کو تار دو اور

خیریت معلوم کراؤ شام تک جواب آیا کہ عشرت مرحوم اور چھوٹی بچی (جس کا نام اس وقت تک ابھی نہیں رکھا تھا) بیمار ہیں۔ میں اس کی وجہ کہ تسنیم کا نام کیوں لیا جب کہ وہ بیمار نہ تھی یہ سمجھتا ہوں کہ دوسری بچی کا نام نہیں رکھا گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا میں نے جانتا لیکن ایسا ہوا یہ واقعہ ہے۔

۱۸ر مارچ ۳۳ء کو راجہ صاحب نان پارہ کے ہاں ڈنر تھا میں اور نواب صاحب باغپت تو کچھ دیر سے آئے لیکن صغیر صاحب جلد چلے آئے تھے۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ انھیں رات بھر نیند نہیں آئی اور ساڑھے پانچ بجے صبح کو خلاف معمول مگر دفع الوقتی کی غرض سے نماز صبح ادا کی اور پھر دیوان حافظ کھولا۔ صغیر صاحب کا بیان ہے کہ بار اوّل یہ غزل نکلی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

بغرض توبہ سحر گفتم استخارہ کنم | بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم
سخن درست بگویم نمے توانم دید | کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم
زروئے دوست مراچوں گل مراد شگفت | حوالہ سردشمن بہ سنگ خارہ کنم
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں | کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

زبادہ خوردن پنہاں ملول شد حافظ
ببانگ بربط و مے رازش آشکارہ کنم

صغیر صاحب کا بیان ہے کہ انھیں اس سے اطمینان نہ ہوا پھر ایک بار لسان الغیب کی طرف توجہ کی جو غزل نکلی اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

صبا بہ تہنیت پیر مے فروش آمد | کہ موسم طرب و عیش و ناز و نوش آمد
ز خانقاہ بہ میخانہ می رود حافظ | مگر زمستی زہد و یا بہ ہوش آمد
بگویمت سخن خوش بیاو بادہ بنوش | کہ زاہد از بر مارفت و بادہ نوش آمد

اس کے بعد صغیر صاحب سو گئے۔ صبح اٹھتے ہی نواب صاحب باغپت سے سارا قصہ سنا کر کہا میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہے لیکن آج آپ کو کسی بہت بڑی خوش خبری کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

میں گیارہ بجے اسمبلی میں پہنچا اور وہیں صغیر کمشنر لکھنؤ مسٹر ڈارلنگ کا خط

مبارک باد لے کر پہنچے جس میں انھوں نے مجھے گورنر ہونے پر مبارک باد دیتے ہوئے ملازمین سرکار کی طرف سے پر خلوص تعاون پیش کیا تھا۔ میں بالکل خالی الذہن تھا اور اس وجہ سے اور یقین نہ آتا تھا کہ گورنر نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی مجھ سے اس وقت تک نہ کہا تھا چوں کہ یہ خط بصیغۂ راز لکھا گیا تھا تو کسی سے دریافت بھی نہ کر سکتا تھا۔ جمشید میرے رازداں بھی تھے اور رازدار بھی۔ انھیں صغیر صاحب چائے پی رہے تھے کہ جمشید اور میرے بھانجے نواب زادہ مسعود علی خاں پی.سی.ایس. آ گئے اور مجھے مبارک باد دی میں نے ہنس کر صغیر صاحب سے کہا جناب اس بار آپ نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ صغیر صاحب فوراً فرمانے لگے "آپ عروج کی جانب کوئی قدم اٹھائیں اور میرے کانوں میں اس کی آہٹ نہ پہنچے یہ کیسے ممکن ہے۔" آپ پر ساڑھے گیارہ بجے جو راز ظاہر ہوا وہ مجھ پر ساڑھے پانچ بجے صبح آشکار ہو چکا تھا۔ نواب صاحب باغپت گواہ ہیں اس پر نواب صاحب نے صبح کی گفتگو جو صغیر صاحب سے ہوئی تھی سنائی اور صغیر صاحب دیوان حافظ اٹھا لائے اور فاتحانہ انداز سے ان غزلوں کو پڑھنا شروع کر دیا جن کا اقتباس اوپر دے چکا ہوں۔

دن گزرتے دیر نہیں لگتی اب ۱۹۴۱ء تھا کہ صغیر صاحب نے پھر ایک خواب آخیر فروری میں دیکھا اور صبح ہی مجھے مبارکباد دی۔ خواب یہ تھا کہ انھوں نے دیکھا کہ چھتاری میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف مبارک باد کے تار اور خطوط بکھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے اسٹنٹ "الفت رائے" کو بلا کر سختی سے کہا کہ تم نے مبارک باد کے تاروں کے فائل کو سنبھال کر نہیں رکھا۔ صغیر صاحب کو یاد ہے کہ ان میں ہز ہائنس بھوپال سر تیج بہادر سپرو سری۔ پی راما سوامی آیر کے تار بھی تھے اور لیڈر اخبار بھی تھا جس میں میرا فوٹو تھا اور لیڈنگ آرٹیکل کے حسب ذیل الفاظ انھیں یاد تھے۔

"یہ بہت اچھا ہوا کہ چھتاری کو یہ موقع ملا"۔

اس کے کچھ روز بعد شاید ۴ر مارچ کو مجھے حضور نظام حیدرآباد و برار کا افتخار نامہ صادر ہوا کہ جس میں اعلیٰ حضرت نے مجھ سے دریافت فرمایا تھا کہ آیا میں حیدر آباد میں آ کر صدارت عظمیٰ کی فرائض انجام دینے کو تیار ہوں؟

ہوم ممبری کا چارج لینے کے بعد میں ۲۵ ر جنوری ۲۶ء کو دورے کے سلسلہ میں مراد آباد گیا۔ اسٹیشن پر حسب دستور ضلع کے حکام اور اکابر جمع تھے۔ شوکت باغ میں قاضی شوکت حسین مرحوم کا مہمان ہوا۔

قاضی شوکت حسین مرحوم:

مرحوم پرانی تہذیب کے شیدائی تھے بڑے مہذب بااخلاق، ذی مروت جنٹلمین کی تعریف یہ بھی بتائی گئی ہے کہ ایسا شخص جس سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ قاضی صاحب پر یہ تعریف پورے طور پر صادق آتی تھی۔ ایک بار دانت میں درد ہوا۔ ڈاکٹر کو بلایا دانت نکلوا دینا مناسب خیال کیا گیا۔ ڈاکٹر نے غلطی سے بجائے اس دانت کے جس میں درد تھا۔ اس کی برابر کا دانت نکال دیا لیکن قاضی صاحب نے اس کا احساس ڈاکٹر کو نہ ہونے دیا اس کی فیس دی اور شکریہ ادا کیا مراد آباد کی نمائش کا افتتاح کیا تقاریر جلسے دعوتیں ہوئیں ایک تصویر اس نمائش میں بہت دلچسپ تھی جس کا ذکر میرے روزنامچہ میں ہے اور جس کا تصور آج تک میرے ذہن سے محو نہیں ہوا۔

یہ تصویر کرشن جی کے بچپن کی تھی جس میں ان کی ماں جنھوں نے ان کو پالا تھا دودھ کاڑھ رہی ہیں اور کرشن دودھ چرانے کی کوشش کر رہے ہیں چہرہ پر بچپن کی شوخی اور شرارت کو اس خوبی سے دکھایا تھا کہ تعریف نہیں کی جا سکتی میں نے مصور کو سونے کا تمغہ دیا۔

۲۸ ر جنوری ۲۶ء کو علی گڑھ دورہ پر آیا اسٹیشن پر اس قدر مجمع تھا کہ ہاتھ ملانا ناممکن ہو گیا اور بلا ارادہ مجمع کے ریلے میں چوکڑی تک پہنچ گیا۔ پھولوں کے ہار آنکھوں تک آجاتے تھے اور بار بار اتارنا پڑتے تھے اسی دورے کے سلسلہ میں چھتاری گیا لوگوں نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا بھائی جان واجد خاں وغیرہ نے دعوتیں کیں۔

علی گڑھ کی نمائش کا دربار:

۱۰ ر فروری ۲۶ء کو نمائش علی گڑھ کا دربار میں نے کیا اس زمانے میں دربار تو انگریز ہی کیا کرتے تھے۔ اس واسطے اسے عجیب سمجھا گیا۔ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم راجہ دت پرشاد سنگھ مرسان اور راجہ مان سنگ لاکھنو حسب دستور استقبال کو آئے

نواب لیاقت حسین خاں رئیس مینڈو دربار کے بعد میرے پاس آئے فرط شادمانی سے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جھڑنے لگے۔ مرحوم کے علاوہ قرابت کے میرے ساتھ بہت ہی خلوص تھا۔ خدا مغفرت فرمائے ایسے مخلص اب کہاں؟

رائے راجیشور بلی کا مخالفانہ طرز عمل:

فروری ۲۶ء کے آخر سے یہ خبر مشہور ہوئی کہ پولس کے بجٹ پر حملہ ہوگا ۲۰ر فروری کے روزنامچہ میں یہ لکھا ہے کہ نواب یوسف (نواب) کا یہ خیال تھا کہ وہ خود اس سازش میں شریک ہیں۔

مجھے اس خبر سے تردد سے زیادہ افسوس ہوا۔ اس لئے کہ رائے راجیشور بلی میرے ہی بنائے منسٹر تھے۔ میرے خیال میں اس طرزِ حکومت (دوعملی) کا یہ لازمی نتیجہ تھا کونسلرس اور منسٹرس کے تعلقات میں کہیں نہ کہیں کشیدگی پیدا ہو ہی جاتی تھی اور غلط فہمی کے مواقع آجاتے تھے۔ راجیشور بلی صاحب نے ایک بل لازمی تعلیم کا پیش کیا مسلمانوں کو اس کے بعض حصص سے اختلاف تھا سر جگدیش نے بعض ترمیمات مسلمانوں کی موافقت میں منظور بھی کرائیں لیکن مسلمان ممبران کونسل چھوڑ کر چلے گئے۔ اس نے راجیشور بلی آنجہانی کو میری طرف سے بدگمان کردیا۔

۲۵ر فروری ۲۶ء کو روزنامچہ میں یہ تحریر ہے آج کونسل میں کنور جگدیش پرشاد نے بے انتہا کوشش کر کے اور ہندوؤں کے مزاج کے خلاف راجیشور بلی کو مجبور کر کے مسلمانوں کے موافق ایک تجویز لازمی تعلیم کے بل میں پاس کرائی مگر افسوس کہ باوجود اس کے مسلمان نہ مانے اور کونسل چھوڑ کر چلے گئے۔

۲۶ر فروری راجیشور بلی نے مجھ سے آج اس کا شکوہ کیا کہ میں نے مسلمانوں کو کیوں نہیں روکا حالانکہ خدا جانتا ہے میں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مگر اس کا انھیں یقین کیسے آسکتا ہے۔ اس طرح میرے اور راجیشور بلی کے درمیان غلط فہمی پیدا ہوگئی۔

ار مارچ کو سر ولیم میرس کے ساتھ شکار کو رام چھوتی گیا اور اسنائپ کا شکار کھیلا۔ شکار کے بعد لنچ پر گورنر سے گفتگو ہوئی۔ میں نے بھی کنور جگدیش پرشاد کی تعریف کی اور وہ خود بھی مانتے تھے کہ فرقہ وارانہ ذہنیت ان کی نہیں ہے۔ ان کی چیف

سیکریٹری ہونے کی بنیاد اسی دن رکھی گئی۔

۱۱ر مارچ ۲۶ء کو سوراجسٹ نے کانگریس کی ایک قرارداد کی تعمیل میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ کونسل سے باہر چلے جائیں گوبند بلب پنتھ صاحب نے بہ حیثیت لیڈر ایک بیان دیا اور چلے گئے یوں تو ان کے چلے جانے سے ایک طرح کا سکون ہوا کہ روزانہ کی ردوقدح بند ہوئی اور جو لوگ حکومت کے خلاف سازشیں کرتے تھے ان کی ہمت بھی ٹوٹ گئی لیکن ان کے چلے جانے سے یہ نقصان بھی ہوا کہ ممبران حکومت اور سیکریٹری صاحبان اتنے تیار ہو کر نہ آئے تھے جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ تنقید ہوتی رہے تو حکومت محتاط اور مستعد رہتی ہے ایسا نہ ہو تو ابتری کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

وزارت کے خلاف رجحانات:

اس اجلاس کونسل میں وزراء کے خلاف رجحانات زور پکڑ رہے تھے۔ ہر ممکن کوشش کی وزراء کی مخالفت نہ ہو اگر سوراجسٹ ہوتے تو ممکن ہے دشواری زیادہ ہو جاتی بہر حال بجٹ پر مباحثہ بخیر وخوبی ختم ہوا گو میں ہوم ممبر ہو چکا تھا۔ لیکن وزارت کے زمانہ میں صیغے میرے سپرد رہے تھے ان پر وزراء کی حمایت میں میں نے تقریریں کیں میرے اپنے صیغہ جات میں کوئی دقت واقع نہیں ہوئی اور کونسل کا طرز عمل بہت دوستانہ رہا۔

قانون لگان ۲۹ء:

پہلی مئی ۲۶ء کو نینی تال پہنچا سر سیم نے صوبہ آگرہ کے واسطے قانون لگان ترتیب دیا تھا یہ اس سال کا سب سے زیادہ مختلف فیہ مسئلہ تھا اور وہ کے قانون لگان کی مانند اس میں بھی کاشتکاروں کو تین حیاتی حق دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور ترمیمات بھی تھیں جو زمینداروں کو ناپسند تھیں ۲۹ر مارچ کو یہ بل کونسل میں پیش کیا گیا ساتھ ہی ساتھ زمینداروں کو ناپسند تھیں ۲۹ر مارچ کو یہ کونسل میں پیش کیا گیا ساتھ ہی ساتھ زمینداروں کی اشک شوئی کے لئے قانون بندوبست بھی کونسل میں پیش کیا گیا جس میں زمینداروں کے ساتھ تھوڑی بہت رعایت کرنا مقصود تھا۔

نینی تال میں ان قوانین پر کونسل میں بحث کرنا تجویز پایا۔ سرہیم اس مسودہ کے محرک تھے یہ چاہتے تھے کہ زمیندار ممبران کے مخالفت نہ کریں لیکن زمینداروں کے ساتھ کوئی خاص رعایت کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

میری قدرتی خواہش تھی کہ جہاں تک ہو سکے زمینداروں کو نقصان سے بچایا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی احساس تھا کہ کاشتکار کو مزید حقوق دئے جائیں۔ بغیر اس کے چارہ نہیں۔ اس واسطے میری یہ کوشش تھی کہ زمینداروں سے معاملہ خوش اسلوبی سے طے پائے۔ سر جگدیش کی بھی یہی پالیسی تھی جو اس زمانہ میں چیف سکریٹری اور زمینداروں کے سچے اور دانا دوست تھے۔

وزراء میں رائے راجیشور بلی آنجہانی اور راجیند رسنگھ صاحب نے صفائی سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ زمیندار پارٹی کا ساتھ دیں گے اور وزراء کے لئے یہی صحیح راستہ تھا۔ جب کہ ان کا وجود بہ حیثیت وزیر اس پارٹی کا ممنون احسان تھا۔ لیکن نواب محمد یوسف اس کے بھی کوشاں تھے کہ سرہیم اور گورنر کو یہ خیال ہو کہ انھوں نے بل کے پاس ہونے میں گورنمنٹ کو مدد دی اس لئے "گاہے چنیں گاہے چناں" پالیسی ہوگئی تھی گو دل سے وہ بھی زمینداروں کے ساتھ تھے۔

۲۸ ؍جون ۲۶ء کو اس قانون سے متعلق نتیجہ کمیٹی کی رپورٹ پر مباحثہ شروع ہوا۔ گو کونسل میں زمینداروں کی بڑی اکثریت تھی۔ لیکن وہ تمام غلطیاں پیہم کی گئیں جن کی بدولت آج زمیندار کا کوئی اثر باقی نہیں رہا اور قانون ان کی منشاء اور مقصد کے خلاف بن گیا میں نے بھی ایک بڑی غلطی کی جس کا آئندہ ذکر کروں گا۔

زمینداروں کی پوزیشن یہ تھی کہ زمیندار اور حکومت جب ساتھ رائے دیتے تو ایک بار زمینداروں کی موافقت میں ۴۷ اور خلاف رائے آئیں لیکن زمینداروں کی اکثریت اتنی زیادہ تھی کہ گورنمنٹ کے سرکاری ممبر اور سوراجسٹ مل کر بھی انھیں شکست نہ دے سکتے تھے۔

اس سال کے چند اقتباسات اپنے روزنامچہ سے لکھتا ہوں جس سے سرہیم کی پالیسی اور زمینداروں کی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۰؍مئی ۲۶ء او ڈان کے یہاں

ٹینس تھا اوڈی بہت پریشان تھا کہ زمیندار اور سوراجسٹ آپس میں ملتے ہیں مجھ سے اور کنور صاحب سے کہا کہ انھیں سمجھاؤں۔ ۱۳رمئی آج میں اور جگدیش اوڈی کے ہاں گئے تھے۔ میں نے ہر چند سمجھایا کہ دفعہ ۴۰ میں زمیندار کو اس کا موقع دیجیے کہ وہ واقعی زمین لے سکیں مگر انہوں نے ایک نہ مانی آج تو دماغ آسمان پر تھا۔ آخر میں یہ کہا کہ میں خود طے کروں گا۔ آپ زمینداروں سے اب کچھ نہ کہیں۔"

۱۵رمئی آج سرسیم نے دفتر میں بلایا اور کئی روز کے بعد پھر اس حقیر کو حکم دیا۔ "میں پریشان ہوں زمینداروں سے من سمجھوتہ کی کوئی ترکیب کی جائے۔" اوپر کے اقتباسات سے سرسیم کی طبعیت کے مدو جزر کا پتہ چلتا ہے مندرجہ ذیل اقتباسات بھی قابل مطالعہ ہیں۔

۷رجون آج کمشنرس کانفرنس تھی ..... مسجد کے سامنے باجے کا سوال ہوا، گورنر کی رائے یہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے ایک مراسلہ شائع ہو جس میں منجملہ اور باتوں کے کلکٹر کو یہ ہدایت ہو کہ جو فریق زبردست ہو اس کے موافق فیصلہ کریں میں نے اس سے اختلاف کیا۔" ایسے احکامات سے لوگوں کے ذہن میں شبہ ہونے لگا کہ انگریز ہندوستانیوں کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔

لگان کے قانون کو سرسیم نے بغیر گورنمنٹ کی اطلاح کے کونسل میں پیش کر دیا میں نے اس پر اعتراض کیا ذیل کے اقتباسات سے اس ڈرامے کے بہت سے پردوں پر روشنی پڑتی ہے ۲۷رجون کے روزنامچہ میں لکھا ہے۔

آج زمیندار ممبروں اور سرسیم سے گفتگو ہوئی نواب یوسف نے (سر) شفاعت کو تیار کر لیا تھا کہ وہ گورنمنٹ کا ساتھ دیں۔ چنانچہ انہوں نے خوب ساتھ دیا۔ مگر سرسیم نے ان کی تجاویز بھی نہ مانیں اس کے بعد میں نے سرسیم سے کہا کہ یہ قانون گورنمنٹ کے سامنے کیوں نہیں پیش کیا گیا۔ جس پر وہ بہت گھبرائے۔ میں نے کہا کہ آپ گورنر سے میری طرف سے کہدیں۔ شام کو گورنمنٹ کی میٹنگ (اس قانون کے متعلق) ہوئی۔ ہم نے اور وزرا نے ہر چند کہا مگر کسی نے نہ مانا اور نہ ہمیں اس کا اختیار دیا گیا کہ ہم کوئی تسلی بخش پیغام زمینداروں کو دے سکیں۔ واپسی پر میں نے سر شفاعت اور فصیح الدین

وغیرہ سے یہ کہہ دیا کہ ہم گورنمنٹ کو کسی معاملہ میں پابند نہیں کر سکتے۔

۲۸ رجون آج کونسل ہوئی مگر ملتوی ہوگئی۔ سوراجسٹ اور زمیندار مل گئے۔ اس کے بعد نواب یوسف نے سر شفاعت وغیرہ کو سر سیم کے پاس بھیجا ہدایت (حافظ ہدایت حسین صاحب سی۔آئی۔ڈی) بھی تھے۔ سر شفاعت نے انھیں منع کیا کہ اسمٰعیل (خان بہادر مسٹر جسٹس محمد اسمٰعیل) کو مت بلاؤ۔ مگر اسمٰعیل کو ہدایت نے بلا لیا۔

اس تاریخ کو مسٹر جسٹس اسمٰعیل کی کوششوں سے سوراجسٹ اور زمینداروں میں سمجھوتہ ہونے کو تھا سر شفاعت مرحوم اور نواب یوسف اس کے خواہشمند تھے کہ ایسا سمجھوتہ نہ ہو۔ اس موقع پر مجھ سے بھی یہ انتہائی غلطی ہوئی کہ جب زمیندار ممبران نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی یہی کہا کہ گورنمنٹ سے صلح کرو، سوراجسٹ سے صلح بیکار ہے کاش یہ مشورہ میں نے دیا ہوتا۔ اس کے دوسرے روز سر سیم زمینداروں سے ملنے کو تھے مگر عبید الرحمٰن خاں صاحب پیام لائے کہ زمیندار نہ آسکیں گے سر سیم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ لیکن اس کا اثر چنداں برا نہ ہوا۔ نواب سر محمد یوسف زمیندار ممبروں سے وعدہ ایسا کرتے تھے جس کے متعلق گورنمنٹ سے کوئی چیز طے نہیں ہوتی تھی اور دیگر وزراء اور میں یہ نہیں چاہتے تھے کہ زمیندار کسی غلط فہمی کی بنا پر گورنمنٹ سے اتفاق کریں۔ چنانچہ میرے روزنامچہ جون ۳۰ رمیں حسب ذیل درج ہے۔

پھر میں یوسف سے ملا تو انھوں نے اثناء گفتگو میں مجھ سے کہا کہ تمام مشکلات آپ کے دوستوں سے پیدا ہوتی ہیں مجھے بہت ناگوار ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمیندار کچھ یوسف سے بدگمان ہو گئے زمینداروں کی اکثریت اتنی تھی کہ اگر وہ چاہتے تو سرکاری ممبران اور سوراجسٹ مل کر بھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

زمینداروں کی جیت:

روزنامچہ ۲ رجولائی ۲۶ء آج کونسل میں زمینداروں نے کمال کر دیا یعنی سوراجسٹ اور گورنمنٹ کو ملا کر شکست دی۔ دفعہ ۱۱۴ ای پر بحث تھی اور ۵۱ اور ۴۷ رائے ہیں۔ یعنی گورنمنٹ ۴۷ اور زمینداروں کی ۵۱ یوسف (نواب) کا عجب رنگ تھا زمیندار ممبران کو مبارک دیتے پھرتے تھے تاکہ لوگوں کے دل سے پہلا اثر جاتا رہے۔

اسی سلسلہ میں یوسف صاحب رائے بہادر مشعل سنگھ کو مبارکباد دے رہے تھے اور چونکہ رائے بہادر نواب محمد یوسف سے بدگمان تھے اس لئے غالباً زمینداروں کی حمایت میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں سرسیم آ گئے سرسیم نے رائے بہادر مشعل سنگھ سے کہا کہ جو ترمیمات ضروری نہ ہوں انھیں ہٹا لیا جائے۔ نواب محمد یوسف نے سرسیم کی تائید کی۔ مشعل سنگھ نواب صاحب سے تو پہلے بدگمان سے تھے اس موقع پر ایک خاص انداز سے نواب صاحب کی طرف دیکھ کر انہوں نے کہا "مجھے حیرت ہے کہ آپ یہ فرماتے ہیں" اس سے سرسیم کو سخت بدگمانی ہوئی سرسیم نے مجھ سے اور سر جگدیش سے نواب محمد یوسف کی شکایت کی کہ یہ دونوں طرف ملے ہیں اور گورنر سے بھی شکایت کی۔

کونسل کا التواء اور اسکا نتیجہ:

بر حال قانون پر مباحث خاصے چل رہے تھے کہ راجہ صاحب سلیم پور کو یہ اصرار ہوا کہ محرم کی وجہ سے کونسل کے اجلاس کو ملتوی کر دیا جائے۔ میں نے راجہ صاحب سے بہت کہا کہ اس وقت سب لوگ آ گئے ہیں اٹھی بیٹھ بار بار نہیں لگتی۔ عشرہ کے قریب اجلاس کو تین چار روز کے واسطے بند کرنا کافی ہوگا۔ لیکن راجہ صاحب کو اصرار ہی رہا۔ اور ان کے مذہبی جذبات کے احترام کی وجہ سے میں نے اس کی مخالفت نہ کی زمینداروں کے نقطۂ نظر سے یہ بہت بڑی غلطی ہوئی۔ ۱۰ر جولائی سے ۲۴ر جولائی تک کونسل ملتوی ہو گئی ۲۴ کے بعد جیسا مجھے اندیشہ تھا زمینداروں کی حاضری بہت کم ہو گئی کہا تو یہ بھی گیا تھا کہ بعض کلکٹروں نے اودھ کے بعض تعلقہ داروں کو آنے سے روکا۔ بہر حال کچھ ہی ہو یہ ظاہر ہے کہ جس جماعت کے نمائندے ایسے اہم قانون بنانے کے وقت غائب ہو جائیں جن پر ان کے وجود کا مدار ہو اور اپنی اکثریت سے کام لینے کے بجائے چودہ روز کونسل کا اجلاس ملتوی کرا دیں اس کا انجام وہی ہونا چاہئے جو بالآخر ہوا۔

ولادت تسنیم:

۲۰ر جولائی کو تین اور چار بجے شام کے درمیان میرے خاندان میں ایک

اضافہ ہوا اور تسنیم سلمہا پیدا ہوئی یہ میری دوسری رفیقۂ حیات کی پہلی بچی ہے۔ مجھے اس کی پیدائش کی بہت خوشی ہوئی خدا خوش رکھے میرے واسطے وہ ہمیشہ باعث مسرت ہی ثابت ہوئی اپنی ماں کو بھی بہت پیاری ہے۔

زمینداروں کی خودکشی:

۲۴/جولائی کو پھر کونسل شروع ہوئی اور میرا اندیشہ حرف بحرف درست نکلا۔ صبح کو صرف ۷ امبر زمیندار حاضر تھے اور شام تک وہ بھی فقط ۱۰ رہ گئے روزنامچہ میں یہ درج ہے۔

آج کونسل ہوئی شامتِ نصیب زمیندار بہت ہی کم آئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسیم نے سوراجیوں سے مل کر ان کی گلوتراشی شروع کردی۔ چنانچہ ایک نئی دفعہ ۱۴۳ داخل کی گئی جس کا نتیجہ زمیندار کے واسطے زہر قاتل ہے تعلق داران اودھ تشریف نہ لانے میں خاص طور پر ممتاز تھے۔

زمینداروں کی غیر حاضری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۸/جولائی سے گورنر نے بلا کر یہ کہا کہ چار ترمیمات جو کونسل نے زمینداروں کی موافقت میں پاس کردی تھیں انھیں غور مکرر کے واسطے گورنر کونسل میں روانہ کریں گے میں نے اس کی مخالفت کی مگر گورنر نہ مانے یوں تو گورنر کو آئین نافذہ کے تحت اس کا اختیار تھا کہ وہ جس قانون کی دفعہ کو چاہیں غور مکرر کے واسطے کونسل میں روانہ کردیں لیکن مجھے اس پر اعتراض تھا کہ یہ دفعات اسی وقت کیوں غور مکرر کے لئے واپس کی جائیں جب زمیندار کونسل سے غیر حاضر ہوں۔

۲۹/جولائی کو گورنر کا پیام کونسل میں آیا اور ۳۰ کو بحث کرنے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ ۳۰/جولائی کے روزنامچہ میں درج ہے۔

آج کا روز بھی زمینداران آگرہ کے واسطے انتہائی بدنصیبی کا روز تھا کونسل میں شروع سے آخر تک سارے اودھ کے لوگوں میں سوائے مشعل سنگھ اور راور صدیق کے سب غائب تھے اور یہی وجہ ان کے ہارنے کی ہوئی۔ سرسیم کا یہ حال ہوا وہ برابر سوراجسٹ سے کہہ رہے تھے کہ ہمارے ساتھ رائے دو مجھے سب سے زیادہ ملال اس بات کا تھا شب گذشتہ میں نے مسٹر جسٹس اسماعیل کو غلط رائے دی۔ اگر زمیندار

سوراجسٹ سے بگاڑ نہ کرتے تو یہ روز بد اس بری طرح پیش نہ آتا۔

آگرہ قانون لگان کا تو یوں خاتمہ ہوا لیکن اس کے بعد زمیندار ممبر موجود ہوئے کسی آگرہ کے زمیندار نے بہت ہی سنبھل کر ایک روز مہاراجہ جہانگیر آباد سے اس کا شکوہ کیا کہ تعلقہ داران اودھ نے ہمیں تباہ کرادیا۔

مہاراجہ مرحوم میرے پاس آئے اور اس کی شکایت کی کہ نواب صاحب میں نے کیا کیا جو زمینداران آگرہ مجھے الزام دیتے ہیں۔ گو میرے دل میں بھی شکوہ تھا لیکن ممبر گورنمنٹ ہونے کی وجہ سے زیادہ کہنا مناسب خیال نہ کیا۔ ''مہاراجہ صاحب فضول کا الزام ہے۔ آپ تو ایکٹ لگان کے مباحثہ کے دوران میں یہاں رہے بھی نہیں۔'' معلوم نہیں میرے جواب مہاراجہ صاحب مرحوم سمجھے بھی یا نہیں۔

آخری تقسیم آرا جب اس قانون پر ہوئی تو زمیندار ۲۸ اور گورنمنٹ کی آرا ۴۰ ہوئیں لیکن دو زمیندار ممبروں یعنی بابو لال اور بیج ناتھ مصرا نے گورنمنٹ کے ساتھ رائے دی اور آٹھ زمیندار ممبروں نے باوجود موجود ہونے کے کسی طرف رائے نہ دی جن کے نام حسب ذیل ہیں۔ ہنومان سنگھ راجہ جگناتھ بخش، رائے بہار جگدیش پرشاد، اسلم سیفی، عاشق مرزا، رام ناتھ بھارگو، کھڑک جیت مصرا، اعجاز علی خاں، راجہ ملاجنی۔ اگر یہ سب حضرات اپنی پارٹی کے ساتھ رائے دیتے تو ۳۸، ۳۹ رائیں ہوتیں۔ میں نے یہ تفصیل یوں دی ہے کہ اس سے یہ پتہ لگ جائے کہ اس زمانے میں حکومت کا اثر کتنا کام کرتا تھا اور زمینداروں کی بے حسی کہاں تک پہنچ چکی تھی۔

ایک نواب زادہ کا لطیفہ:

یہاں مجھے نواب زادہ اعجاز علی خاں کا واقعہ یاد آ گیا۔ ایک روز کونسل میں ایک اہم مباحثہ ہو رہا تھا۔ تقسیم آراء سے پہلے تمام ممبروں کو جمع کرنے کے واسطے نواب صاحب باغپت سے کہا گیا۔ انہوں نے فوراً موٹر روانہ کئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک موٹر میں ایک اجنبی بزرگ تشریف لائے۔ نواب صاحب باغپت نے ان کا تعارف کرایا کہ آپ نواب زادہ اعجاز علی خاں کے مختار عام ہیں۔ اور ان بزرگ نے فرمایا کہ ''نواب زادے صاحب تو اس وقت آرام میں ہیں میں ان کا مختار عام ہوں

جو حکم ہو میں اس کی تعمیل کردوں۔" مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور جمشید علی خاں بہت ہی لطف اندوز ہوئے۔

متھرا کا دورہ:

۱۴راگست کو سر سیم گورنر ہو گئے۔ سر ولیم چار ماہ کے واسطے ولایت گئے تھے۔ ۱۸ر اکتوبر کے روزنامچہ میں متھرا کے دورے کے واقعات درج ہیں۔ اس زمانے کے حالات کو آج کل کے حالات کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے اور تکلیف بھی کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔

رائے بہادر رام ناتھ بھارگو کا مہمان تھا شام کو جمنا کی سیر کی غرض سے کشتی میں سوار ہوئے دو مندروں کے سامنے کشتی روکی گئی۔ عقیدت مند مراسم پرستش بجالا رہے تھے سماں بڑا دلکش اور فرحناک تھا۔ ہندو مسلمان دونوں پر سرخوشی سی طاری تھی۔ میں نے ہر مندر کے لئے کچھ نقدی پیش کی جو بڑی مسرت اور عزت سے قبول کی گئی لطف و محبت کی اس پیشکش میں نہ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ میں کون اور کیا ہوں نہ ان لوگوں کے ذہن میں جن کی خدمت میں یہ پیش کی گئی تھی۔ البتہ دونوں بے اختیار یہ محسوس کر رہے تھے کہ موقع کا احترام بڑی بے ساختگی اور خلوص سے کیا گیا۔

آج ہندو مسلمان میں ایک دوسرے سے جو بیزاری اور بدگمانی ہے۔ اس کا اندازہ کرتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا دونوں کے خدا تک بدل گئے ہیں۔

وزیروں میں اختلاف:

ایکٹ لگان کے زمانہ میں وزراء باہمی اتفاق سے کام نہیں کر رہے تھے تھوڑے ہی روز بعد ان میں ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ ۱۵ دسمبر کے روزنامچہ میں درج ہے۔

گورنر نے مجھ سے کہا کہ "راجیشور بلی کہتا ہے کہ دوسرے دو وزیروں سے کام نہیں چلے گا۔ ان میں کوئی قابلیت نہیں ہے۔" یہ تو راجیشور بلی آنجہانی کی رائے اپنے رفقاء کار کے متعلق تھی جو گورنر سے بیان کی گئی۔ دوسری جانب نواب محمد یوسف

بھی غافل نہ تھے۔ اسی تاریخ کے روزنامچہ میں یہ درج ہے۔

''دسر سیم کہتے ہیں کہ یوسف نے ان سے کہا کہ تواری (وِنکٹیشن نرائن) میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ کی تو مضبوط حالت ہے مگر راجندر بہت کمزور ہے جو اس کے بجائے سیتارام یا چنتامنی ہو تو اچھا۔ شام کو یوسف بڑی دیر تک میرے کمرے میں بیٹھے رہے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ طے ہو جائے کہ کونسل میں شکست ہونے پر بھی انھیں کو مقرر کیا جائے۔

غرض وزراء میں کھینچ تان شروع ہو گئی۔ میں نے گورنر کو یہ رائے دی کہ آپ کسی ایک کی نہ سنیں اور ان پر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ اگر کسی ایک وزیر کو بھی کونسل میں شکست ہوئی تو سب کو ہٹا دیا جائے گا اور از سر نو نئی وزارت بنے گی۔'' اس طرح وزراء کی آپس کی سازشیں ختم ہوئیں ورنہ یہ وزارت ۲۶ء ہی میں ختم ہو جاتی ان واقعات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ زمیندار وزراء میں تعاون کا فقدان اور ''اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ'' پر عمل تھا۔ بدگمانی تو وزراء میں پہلے ہی سے تھی سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ جس طرح نواب سر محمد یوسف نے مجھ سے کہا تھا حقیقت اخبار ۱۸ جنوری ۲۷ء میں شائع ہوا کہ اگر وزارت کو شکست بھی ہو جائے تب بھی نواب صاحب ہی کو مقرر کیا جائے۔ دیگر وزراء کے ساتھی کونسل میں بہت کم ہیں۔ اس غلطی یا سوئے اتفاق نے وزراء کی کشیدگی کو اور بھی بڑھا دیا۔

مسٹر چنتامنی کی پارٹی:

۲۶ء کے آخر میں دوبارہ انتخابات ہوئے اور مسٹر چنتامنی پرتاب گڑھ سے منتخب ہو گئے۔ اکثریت اب بھی زمینداروں ہی کی رہی لیکن چند زمیندار ممبر ایک جماعت بنا کر چنتامنی کی پارٹی میں شریک ہو گئے اب کونسل میں سوراجسٹ پارٹی تھی جس کے لیڈر پنڈت جی. بی. پنتھ تھے۔ چنتامنی کی پارٹی تھی اور وزراء کی زمیندار پارٹی تھی۔ رائے راجیشور بلی آنجہانی اور راجندر سنگھ کچھ تو مسٹر چنتامنی سے خائف اور کچھ طبیعت کا رجحان بھی اسی طرح تھا۔ اس وجہ سے بعض ہندو ممبر مسٹر چنتامنی کی

پارٹی میں مل گئے۔ اس زمانہ میں انگریز کا وجود بھی کمزوری کا باعث اس لحاظ سے ہوتا تھا کہ جو لوگ وزارت میں ہوں انھیں بدیشی حکومت کا غلام خیال کیا جاتا تھا۔ اور جو حکومت کی مخالفت کریں وہ محبِ وطن سمجھے جاتے تھے۔

کاکوری ڈکیتی کیس:

اس زمانے میں ایک مقدمہ کاکوری ڈکیتی کیس' کے نام سے چلا جس میں اکثر تعلیم یافتہ چالان ہوئے۔ اس میں قتل بھی ہوا تھا اور ریل کو روک کر لوٹا بھی گیا تھا ان لوگوں میں سے بعض کو سزائے موت بھی ہوئی۔ مجھے مسٹر تصدق حسین سی۔ آئی۔ ای۔ سے جو اس مقدمہ کے انچارج تھے دوران گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ ان جرائم کے مرتکب ہوئے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ چونکہ یہ جرم بدیشی حکومت کو نقصان پہنچانے کی نیت سے کیا گیا تھا اور کوئی ذاتی منفعت مقصود نہ تھی اس لئے یہ لوگ ان جرائم کو جرم نہیں خیال کرتے تھے۔

میرے خیال میں یہ نظریہ بڑا خطرناک ہے۔ آج ہم اپنے اردگرد جو بدامنی اور بے چینی دیکھ رہے ہیں وہ بڑی حد تک اس نظریہ کی بھی رہین منت ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں تعلیم یافتہ اور صاحبِ عقل و شعور حضرات نے قانون شکنی بھی بھی مع تشدد کے اختیار کی۔ عوام پر اس کا اثر پڑا کہ سرے سے قانون کی وقعت ہی ان کی نظر میں باقی نہ رہی اور آج گو قومی حکومت ہے لیکن لوگ قانون کا احترام نہیں کرتے میرا تجربہ تو یہی رہا ہے کہ حصول مقصد میں وسیلہ کی خوبی یا خرابی کو نظرانداز کر دینا ناواجب ہے۔ معقول مقصد کا حصول معقول ہی ذریعہ سے ہونا چاہئے حصول مقصد میں غلط ذرائع استعمال کئے جائیں تو خود وہ مقصد حسن مستحسن نہیں رہ جاتا۔

سیٹھ دامودر سروپ کی رہائی:

اسی مقدمہ کے سلسلہ میں سیٹھ دامودر سروپ کو بریلی جیل میں مقید کیا گیا اب یہ پراونشل کانگریس کے صدر ہیں اس زمانہ میں بھی اونچے درجہ کے کانگریسی خیال کئے جاتے تھے۔ سیٹھ جی نے بھوک ہڑتال شروع کر دی سیٹھ جی کہتے تھے کہ وہ بیمار ہیں

سول سرجن ان کے مرض کو حیلہ بتاتا تھا۔ میں نے میڈیکل بورڈ کے ذریعہ ایک سے زیادہ ڈاکٹروں کی رائے لی لیکن مسئلہ کچھ صاف نہ ہوا سیٹھ دامودر سروپ کی صحت گرتی جاتی تھی وزن کم ہو رہا تھا۔ سیٹھ جی کہتے تھے کہ یہ مرض کا نتیجہ ہے اور ڈاکٹر کہتے تھے کہ یہ فاقہ کشی کا اثر ہے میں چاہتا تھا کہ ضمانت پر چھوڑ دوں۔ گورنر کو اعتراض تھا۔ آخر کار میں نے یہ ارادہ کیا کہ خود بریلی جیل میں جا کر سیٹھ جی کو دیکھوں۔ ایک دن صبح میں بریلی پہنچا۔ جب میں اس کمرہ میں داخل ہوا جس میں سیٹھ دامودر سروپ لیٹے تھے تو پہلی نظر میں مجھے یہ خیال ہوا کہ پلنگ خالی ہے پھر میں نے دیکھا۔ کہ ایک شخص آنکھیں بند کیے لیٹا ہے۔ میں نے اپنی عمر میں ایسی ضعیف اور بدلی صورت بہت ہی کم دیکھی تھی۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ کوئی انگریز ڈاکٹر تھا (نام صحیح یاد نہیں) جو میرے ساتھ تھا اس نے آواز دی" دامودر سروپ ہوم ممبر آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔" سیٹھ دامودر سروپ نے آنکھیں کھولیں ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ بات نہ کر سکے مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ انھیں ضمانت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا یہی خیال تھا کہ قیدی کو کوئی مرض نہیں ہے بلکہ یہ فاقہ کشی کا اثر ہے۔ واپسی لکھنؤ پر میں نے گورنر کو اس پر راضی کر لیا کہ انھیں ضمانت پر رہائی دی جائے۔

روزنامچہ ۱۷ر جنوری ۱۹۴۷ء مجھے مسرت ہے کہ سیٹھ دامودر سروپ کو آج عدالت نے ضمانت پر رہا کر دیا، اس زمانہ میں گورنر کا اختیار اتنا تھا کہ ایسے امور میں بھی جہاں گورنر چاہتا تھا دخل دے سکتا تھا۔ چنانچہ میرے پرانے کاغذات میں وہ اصل خط اور گورنر کا حکم موجود ہے۔ جو سیٹھ دامودر سروپ کے متعلق لکھا گیا تھا۔ قصہ یوں تھا کہ میں نے ایک نوٹ بریلی سے واپسی پر لکھا اور گورنر کو بھیجا۔ پنڈت جگت نرائن آنجہانی گورنمنٹ کی طرف سے کاکوری ڈکیتی کے مقدمہ میں وکیل تھے۔ انہیں اس نوٹ کی کاپی روانہ کی گئی۔

تصدیق حسین سی۔آئی۔ای۔ مرحوم نے جو بہ حیثیت پولیس افسر اس مقدمہ کے انچارج تھے ایک خط پنڈت جگت نرائن کو لکھا جس میں یہ فقرہ تھا۔ "ہز ایکسی لینسی نے یہ حکم دیا ہے کہ تم سے کہا جائے کہ جج سے یہ خواہش کرو کہ سیٹھ دامودر سروپ

کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔"

فائل پر گورنر کا حکم رہائی کے متعلق اتنا صاف نہ تھا۔ پنڈت جی اسے مشیر قانونی کے علم میں لائے اور اس درجہ فضیحتا ہوا کہ بالآخر مجھے خود گورنر سے گفتگو کر کے اسے رفع دفع کرانا پڑا اور نہ بیچارہ تصدق مرحوم مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ گورنر نے میرے کہنے پر آخری حکم یہ دیا: "مقررہ ہوم ممبر نے مجھے خان بہادر تصدق حسین کا خط بنام پنڈت جگت نرائن دکھایا مجھے یہ غیر صحیح غلط اور مبہم معلوم ہوتا ہے اور مجھے معزز ہوم ممبر نے یقین دلایا ہے کہ وہ عجلت میں لکھا گیا تھا۔ جس سے کوئی دشواری پیدا کرنا مقصود نہ تھا۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں اور معاملہ کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا۔

بٹلر پیلس میں نواب صاحب رامپور کی دعوت:

۳۰ر جنوری ۲۷ء کے روزنامچہ میں لکھا تھا۔

کہ ہز ہائی نس رام پور جنت مکاں کا لنچ مہاراجہ محمود آباد مرحوم کے ہاں بٹلر پیلس میں تھا۔ کھانے اتنے انواع و اقسام کے تھے کہ اگر ایک ایک نوالہ بھی کھا لیا جائے تو بقول کسی خان کے "مرض مبارک" ہو جائے۔ مرض مبارک کا قصہ یہ ہے کہ کوئی تازہ ولایت خاں ہندوستان کے کسی شہر میں پہنچے۔ طالب علم تھے۔ مسجد کی روٹیوں پر تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی ایک جنازہ سامنے سے نکلا خان نے پوچھا بائی یہ شخص کیسے مر گیا؟

جواب- خان! یہ ہیضہ سے مر گیا۔

خان- بائی ہیضہ کیا ہوتا ہے؟

جواب- زیادہ کھنا کھا لینے سے یہ مرض ہو جاتا ہے۔

خان- (حسرت سے) بار خدایا! یہ مرض مبارک ہم کو کبھی نہ ہوا!

آج کل راشننگ کے زمانے میں تو اس قسم کی دعوتوں کا ذکر بھی شاید ترغیب جرم کی زد میں آ جائے۔ ہز ہائی نس نے اس لنچ میں ایک قصہ سنایا کہ ایک ہز ہائی نس نے اپنی کتیا کی شادی میں تین لاکھ روپے صرف کیے۔ تمام ریاست کے کتے مدعو کیے گئے! ہم سب دم بخود ہو گئے۔ آج بیس برس پہلے کا یہ واقعہ یاد آتا ہے۔ اور والیان

ریاست کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا ہے اس کا اندازہ کرتا ہوں تو نہ تاسف ہوتا ہے نہ تعجب۔ بعض دلچسپیاں بھی کتنی عبرت خیز ہوتی ہیں اور بعض عبرتیں کتنی دلچسپ!

۵رفروری کو حکومت یوپی زراعتی کمیشن سے لکھنؤ میں ملی۔ اس کے صدر لارڈ لن لنلتھگو تھے جو بعد میں وائسرائے ہند ہو کر آئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وزراء اور ہندوستانی ممبران حکومت تبادلہ خیالات کرتے لیکن تقریباً ساری گفتگو سر ولیم میرین نے خود ہی کی۔

مسلم یونیورسٹی کا معاملہ:

اس کے بعد سر ولیم مجھے اپنے دفتر میں لے گئے اور ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال فردوس مکاں کا وہ خط دکھایا جس میں انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اصلاح کے واسطے تین آدمیوں کی کمیٹی بٹھائی جائے گورنر نے میری رائے دریافت کی میں نے کہا کہ علی گڑھ سے مجھے اتنا تعلق ہے کہ میری رائے علی گڑھ کے متعلق غیر جانبدارانہ نہیں ہوسکتی مجھے تو علی گڑھ میں برائی نظر ہی نہیں آتی گورنر نے پھر استفسار کیا کہ آخر ہز ہائی نس کا (جو اس زمانہ میں چانسلر تھیں) منشا کیا تھا۔ میں نے کہا منشاء یہ ہے کہ ہز ہائی نس ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے خلاف صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کو ترجیح دیتی ہیں۔ گورنر نے ہز ہائی نس کی رائے سے اتفاق کیا اور حکومت ہند نے ایک کمیٹی کا تقرر کیا جس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ تھے۔ یہ کمیٹی علی گڑھ میں میرے مکان راحت منزل میں آ کر قیام پذیر ہوئی اور اس کی رپورٹ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کے انتظام کے بہت ہی خلاف تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس زمانہ میں وائس چانسلر تھے اس رپورٹ کے بعد ڈاکٹر صاحب مستعفی ہو گئے۔ سر راس مسعود وائس چانسلر ہوئے۔ ایک پمفلٹ لکھا جس میں سر ضیاء الدین کے انتظام پر حملہ کیا گیا تھا اس طرح چانسلر نے مداخلت کی اور کمیٹی بیٹھی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اس سے بہت صدمہ ہوا۔ مگر انھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور اپنی رائے کے مطابق برابر کام کرتے رہے۔ اور مسلمانوں کی خدمت اپنا بہترین مشغلہ خیال کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے بعد بیس برس تک زندہ

رہے اور بہت سی ترقیاں کیں پھر وائس چانسلر ہوئے اور سر ہوئے۔ ان کے بہت دوست تھے اور اتنے ہی مخالف بھی۔ میری رائے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ تا حد امکان ہر شخص کو خوش کرنا چاہتے اور نتیجۃً اگر ایک خوش ہوتا تو دس ناراض ہو جاتے۔ بہر حال اس دنیا میں کمزوری سے تو کوئی بھی خالی نہیں لیکن مرحوم کو علی گڑھ سے بڑا شغف تھا۔ تمام عمر علی گڑھ کے لئے وقف رہے۔ سرسید مرحوم کے بعد شاید ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم سے زیادہ علی گڑھ یونیورسٹی کی کسی شخص نے اتنی مسلسل خدمت نہیں کی۔

شراب کی بوتل کا لطیفہ:

۹ر فروری ۲۷ء کو چودھری لیاقت حسین خاں صاحب مرحوم کی سفارش سر ولیم سے کی کہ انہیں نواب کر دیا جائے۔ اسی روز شام کو میں محمود آباد پہنچا۔ موجودہ راجا صاحب کی شادی تھی۔ بہت خوب اہتمام کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں تو ایسی شادیاں کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ بعد مغرب میں بیٹھا تھا اور سوڈا پی رہا تھا کہ شفیق صاحب مرحوم (جو اس زمانہ میں بریلی کے کوتوال تھے) آئے اور بہت غور سے میرے گلاس کو دیکھتے رہے۔ مجھے بھی ان کے اس فعل پر تعجب تھا لیکن استفسار نہ میں نے کیا نہ انہوں نے تیسرے روز لکھنؤ میں تصدق حسین سی۔ آئی۔ ای مرحوم سے ملا تو معلوم ہوا کہ نواب سر محمد یوسف کا ایک ملازم میرے نام سے شراب کی بوتل لے آیا تھا اور شفیق مرحوم یہ دیکھنے آئے تھے کہ خلوت میں سوڈا ترقی کر کے آتش سیال تو نہیں بن جاتا۔

پولیس کا بجٹ:

۱۳ر مارچ ۲۷ء کو میں نے پولیس کا بجٹ پیش کیا مسٹر چنتامنی نے میری تقریر کی داد دی۔ یہ ان کا مزاج تھا کہ باوجود ہمارے مخالفت ہونے کے اگر گورنمنٹ کوئی ایسی بات کرتی جو انہیں پسند ہو تو وہ اس کی داد بھی دیتے تھے میری تقریر ۳۶۹ صفحہ پر روداد کونسل میں ہے۔ مسٹر چنتامنی کی تقریر کا صفحہ ۳۹۱ کا اقتباس یہ ہے۔

"I desire, with your permission, in the first instance to congratulate the Hon'ble Home Member upon the speech which he made in presenting the demand. I congratulate him further upon the excellent spirit which he has shown in meeting the wishes of the Council when a complaint was made against certain observations of the Inspector-General of Police in his report. One of the complaints of Indian public men against the Government is that when criticisms are uttered on any of their officers they attach more inportance to prestige than to justice and do not make any public admission of their mistake. On this point a former Secretary of State, Lord Morley, said: "I do not believe that it is for the good of prestige to tack up every official whether he does right or wrong". The Hon'ble the Home Member has conformed to the spirit of this observation in his attitude towards the critism that was made, and I think that we must be indebted to him for that".

جس کی شکایت کی طرف مسٹر چنتامنی نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا وہ یہ تھی کہ انسپکٹر جنرل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں کچھ ایسے الفاظ لکھے تھے۔ جس کا یہ منشاء ہوسکتا تھا کہ ممبران کونسل کی تنقید پر انھیں اعتراض ہے۔ پنڈت گوبند بلب پنتھ نے اس کو ہاؤس کے سامنے پیش کیا میں نے انسپکٹر جنرل سے کہا کہ آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔ انسپکٹر جنرل کا اپنے الفاظ واپس لینا بڑی فتح خیال کی جاتی تھی۔

وزراء سے سیاسی تعلقات کی ناخوشگواری:

وزراء کے اور میرے سیاسی تعلقات میں تکدر تو جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں ہو ہی گیا تھا۔ لیکن سوشل تعلقات اتنے ہی خوشگوار تھے۔ شاید اسی سال مجھے رائے راجیشور بلی آنجہانی نے ہولی کے روز شام کی چائے پر بلایا۔ میں پہنچا تو رائے صاحب کے پاس دو ایک مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ رائے صاحب بالکل میری کرسی

کے سامنے بیٹھ گئے اور میں ہمہ تن گفتگو میں مشغول ہو گیا۔ یکا یک پشت کی جانب سے کسی نے زور سے پکڑ کر میرے سر اور منہ پر کچھ ملنا شروع کیا۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مسٹر چنتامنی اور چند احباب نیلی پڑیا اور گلال سے میرے چہرے کے رنگ میں کچھ اصلاح کر رہے ہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے بھی کیا نیلا رنگ اس درجہ پختہ تھا کہ تین چار بار غسل کے بعد بھی اس کی جھلک موجود تھی۔

چنتامنی کا رنگ سیاہ تھا، ساتھیوں میں سے کسی نے کہا نواب صاحب آپ خواہ مخواہ کوشش کر رہے ہیں چنتامنی کا آپ کچھ بگاڑ نہیں سکتے میں نے کہا ہرج ہی کیا ہے۔ بلو بلیک بھی تو ایک چیز ہوتی ہے۔

آہستہ آہستہ ہماری پارٹی کے ہندو ممبران اب چنتامنی کی پارٹی میں شریک ہونے لگے چنانچہ مارچ کے روزنامچہ میں گورنر سے گفتگو یوں درج ہے۔!

...... پھر میں نے کہا کہ کونسل میں فرقہ وارانہ ذہنیت کا بڑا زور ہے اور مجھے ڈر ہے کہ ہندو اور مسلمان پارٹی الگ الگ ہو جائیں گی انھیں بھی اس سے اتفاق تھا۔...... اور تعجب کرتے تھے کہ اتنے ہندو بھی میرے ساتھ کیونکر ہیں۔ خدا خدا کر کے کونسل ختم ہوئی۔ شام کو سرولیم میرس سے ملنے گیا۔ تو چنتامنی کے بڑے شاکی تھے اور کہتے تھے ایسے شخص کے ساتھ کون کام کر سکتا ہے۔ اس کا طرز اتنا برا ہے کہ کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں دورے کے واسطے جون پور، الہ آباد اور جھانسی گیا۔

اس اجلاس میں گورنمنٹ کو یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مسٹر چنتامنی کی وجہ سے ہندو ممبران آہستہ آہستہ ہماری پارٹی کو چھوڑ کر چنتامنی کی پارٹی میں شریک ہوتے جاتے ہیں۔ میرے روزنامچہ مورخہ ۳ر اپریل میں یہ درج ہے۔

میں نے رائے راجیشور بلی کو اس طرف توجہ دلائی کہ مسٹر چنتامنی کی پارٹی ترقی کر رہی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ رک سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں سے میں چھ سات آدمیوں کو ضرور توڑ سکتا ہوں۔ لیکن اس شکل میں چنتامنی میرا مخالف ہو جائے گا۔''

۱؍اپریل کے روزنامچہ میں لکھا ہے:

منجملہ اور باتوں کے وزیروں کی مشترکہ ذمہ داری کا ذکر آیا۔ گورنر یہ کہنے لگے کہ گورنر اور وزیروں کے درمیان اس کا کوئی اثر نہیں ہے اور گورنر کو اختیار ہے جب چاہے جس وزیر کو الگ کر دے۔ صورت حال یہ تھی کہ سر ہیم نے سر ولیم میرس کو اس پر راضی کر لیا تھا۔ کہ نواب یوسف کو برخاست کر دیا جائے۔ جب میں نے وزراء کی مشترکہ ذمہ داری کا سوال اٹھایا تو گورنر نے کہا کہ اس کا کوئی اثر گورنر کے اور وزیروں کے درمیان نہیں ہے۔ بہرحال اس کی نوبت نہ آئی، اس واسطے کہ سر ولیم کا زمانہ خود بھی اسی سال کے آخر میں ختم ہو رہا ہے۔

۴؍اپریل کو میں چھتاری آیا۔ عید کا روز تھا فرحت سلمہٗ بہت دبلا تھا میں نے اس تاریخ کے روزنامچہ میں اظہار تشویش کیا ہے۔ اس زمانہ میں مجھے بھی کچھ بخار رہنے لگا تھا۔ نینانوے یا ساڑھے نینانوے شام کو ہو جاتا تھا وزن بھی تیرہ اسٹون سے گھٹ کو گیارہ اسٹون ۲ پونڈرہ گیا تھا۔ لیکن دو ڈیڑھ ماہ کے بعد بخار جاتا رہا۔

رونامچہ ۲۱؍اپریل:

''آج بفضلہٖ موضع پلوز دولاکھ بائیس ہزار کو خریدا گیا۔ خدا برکت دے۔''

عبارت بالا سے پتہ لگتا ہے کہ مستقبل سے بے خبر ہیں کس قدر۔ مواضعات کی خرید سے خوش ہوتا تھا۔ یہ مئی کا مہینہ تھا اور مع متعلقین نینی تال چلا گیا تھا۔

نواب مزمل اللہ خاں کو یونیورسٹی کے متعلق ایک خط:

ایک روز میکنزی سے علی گڑھ کا ذکر آیا تو یہ معلوم ہو کر قلق ہوا کہ ان کی رائے میں علی گڑھ کے لڑکوں کا معیار لیاقت بہت ہی کم تھا۔ یہ حضرت یوپی گورنمنٹ کے ناظم تعلیمات تھے۔ اور ملازمتوں کے امتحانات کے موقع پر یہ یا ان کا نمائندہ ہر بورڈ پر ہوتا تھا میں نے اس گفتگو سے متاثر ہو کر ایک نوٹ وائس چانسلر کو بھیجا نواب مزمل اللہ مرحوم اس زمانے میں عارضی وائس چانسلر تھے۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میٹرک کے بعد اساتذہ کا ایک بورڈ مقرر ہو جو طلباء اور ان کے والدین کو مشورہ دے کہ لڑکے کی آئندہ تعلیم

کس نوعیت کی ہو آیا اسے کسی خاص شعبہ کے واسطے تیار کرنا مناسب ہو گا یا لڑکے میں مقابلے کے امتحانات میں بیٹھنے کی صلاحیت ہے یا نہیں وغیرہ۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ ایسا کرنا مفید ہو گا تا کہ لڑکے اپنی اہلیت اور صلاحیت کے مطابق ایسی تعلیم پا سکیں جوان کے مستقبل کی ضمانت کر سکے ورنہ بہ حالت موجودہ کسی تین مضامین میں بی اے کرنے کے بعد بے روزگاری کا شکار ہوتے ہیں اور مولانا حالی مرحوم کے اس شعر کا مصداق بن جاتے ہیں ۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر،

اب یہ کافی نہیں ہے کہ تعلیم دی جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ تعلیم ملکی ضروریات کے لحاظ سے ایک منظم پروگرام کے مطابق ہو۔ اس طرح کی منصوبہ بندی کی ہر شعبہ میں ضرورت ہے مثلاً یہ کافی نہیں کہ زراعت کو ترقی دی جائے بلکہ یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ نیشکر کتنی ہو اور گیہوں کتنا روئی کتنی ہو اور تمباکو کتنا۔ اسی طرح صنعت وحرفت میں یہ کافی نہیں کہ صنعت کو ترقی دی جائے بلکہ کپڑے کے کارخانے اتنے اور جوتہ بنانے کے اس قدر ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی منصوبہ بندی تعلیم کے واسطے بھی ضروری ہے کہ ہر شعبہ کے واسطے منتخب اور موزوں نوجوان دستیاب ہو سکیں۔

اسی سال گورنمنٹ کی ایک میٹنگ میں یہ طے پایا کہ ایکٹ مال گذاری کو پھر کونسل میں لایا جائے اور ایک دوسرا بل بھی لایا جائے تا کہ الہ آباد زمیندار ایسوسی ایشن کا چندہ مال گذاری کے ساتھ وصول کر لیا جایا کرے۔

گورنر نے اپنی تقریر میں زمینداروں کے ساتھ بڑی ہمدردی کی اور گوسر سیم جہاں تہاں زمینداروں کے خلاف بولتے رہے مگر فیصلہ وہی ہوا جو میں اور کنور سر جگدیش پرشاد چاہتے تھے اس روز تقریر میں نے بھی کی تھی مگر سر جگدیش پرشاد کی تقریر زمینداروں کی تائید میں بہترین تھی۔

چند انتظامی معاملات:

۲۸ رمئی ۲۷ء کو کمشنروں کی کانفرنس تھی اس میں مختلف امور پر بحث ہوا کرتی تھی میرے خیال میں بہت مفید طریقہ ہے افسران کو گورنمنٹ کی پالیسی کا کامل اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو خط و کتاب اور رسل و رسائل سے اتنی اچھی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس طرح حکومت کو بھی یہ پتہ لگتا رہتا ہے کہ افسران کو حکومت کی کسی پالیسی کو روبراہ لانے میں کیا کیا دقتیں ہو رہی ہیں۔ باہمی گفتگو کا بدل خط و کتابت نہیں ہوتی۔ مجھے جب بھی کسی اہم مسئلہ میں اختلاف ہوا تو میں نے ہمیشہ فائل پر نوٹ لکھنے کے بجائے باہمی گفتگو کو ترجیح دی۔

اس کانفرنس میں اس تجویز کو میں نے پیش کیا کہ ایسی جماعتیں پیدا کی جائیں کہ جو قیدیوں کو رہائی کے بعد حصول روزگار میں مدد دیں اس کے متعلق احکامات بھی جاری ہوئے۔

چونکہ اب گورنر اور فنانس ممبر کے جانے کا وقت قریب تھا ۳۱ رمئی کو گورنر نے مجھ سے پوچھا کہ جیسا کہ فریمنٹل کا رجحان چتنامنی کی طرف تھا اگر مسٹر پم کو فنانس ممبر کیا جائے تو کیا ان کا رجحان بھی ہوگا؟ میں نے کہا کہ ممکن ہے۔ پھر کہنے لگے کہ تم مسٹر پم کو پسند کرتے ہو یا کین (سر مائیکل) کو میں نے کہا کہ میں سر مائیکل کین کو پسند کرتا ہوں سر مائیکل کین میرے خیال میں دونوں میں بہتر تھے۔

گذشتہ زمانے کے تحریک ترک موالات کا اثر اور اسی تحریک کی تکرار کی آئندہ خبریں اس کی مقتضی ہوئیں کہ مسلح پولس میں کچھ اضافہ کیا جائے میں نو سو آدمیوں کا اضافہ کرنا چاہتا تھا یہ مسئلہ ۲۲ رجون کی کونسل میں پیش ہوا اور بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی گئی صورت حال اب یہ ہے کہ پولیس کا بجٹ آج کل اس زمانے سے کہیں زیادہ ہے اور ابھی گذشتہ چند ماہ میں پانچ ہزار مزید آدمیوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں اکثر ممبران اس کو اپنی آزاد خیالی تصور کرتے تھے کہ پولیس کی مخالفت کی جائے وجہ دراصل یہ تھی کہ چونکہ حکومت بدیسی تھی اس واسطے اس سے قطع نظر کہ حقیقت حال کیا ہے۔ اکثر ممبران مخالفت کو دلیل حریت خیال کرتے تھے چنانچہ ایسے

ایسے لوگوں نے بھی جیسے کہ راجہ صاحب سلیم پور، خان بہادر اسماعیل، شیخ حبیب اللہ تھے انھوں نے بھی خلاف رائے دی اور میں فقط چار رایوں کی اکثریت سے اسے پاس کراسکا۔ مسٹر چنتامنی بہت خفا تھے وہ کہنے لگے کہ "میں فقط بھونکتا ہوں مگر تم کاٹتے ہو"۔

یوپی پولیس کا بجٹ اس زمانہ میں ۱،۵۲،۷۱،۶۹۳ روپئے کا تھا۔ کل ہی بجٹ پیش ہوا تو معلوم ہوا کہ اس سال پولیس کا خرچ چھ کروڑ ستانوے لاکھ تھے۔

سرولیم کو اس کا یقین نہ تھا کہ کونسل اسے مان لے گی۔ وہ سرٹیفائی کرنے کو تیار تھے لیکن مجھے گوارہ نہ تھا کہ میرے کسی محکمہ میں کوئی رقم سرٹیفائی کی جائے اس لئے سرولیم کو اس پر بڑی مسرت ہوئی اور بڑی گرم جوشی سے مبارک باد کا خط بھیجا۔ ۶/ جولائی کے روزنامچہ میں سرولیم سے ایک گفتگو کا ذکر ہے۔

"پھر ویسرائے کی ملاقات کا ذکر کرنے لگے کہ ویسرائے نے جداگانہ انتخاب کے متعلق میرے نوٹ کو پسند کیا۔ پھر کہنے لگے کہ ویسرائے کا خیال یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں مصالحت کرادی جائے وہ اس کے متعلق ایک تقریر بھی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہایت مناسب ہے وہ شروع کریں اور ہم لوگ شہر شہر جلسے کرائیں۔ کونسل کے متعلق گفتگو ہوئی سر سیم بھی آگئے میری رائے تھی کہ آگرہ اور فرخ آباد کے انتخابات کے واسطے وزراء جائیں اور گورنر ان سے کہیں یہ شاید کوئی ہائی الیکشن تھا۔ سر سیم اس پر راضی نہ ہوئے کہ گورنر کہیں اور بولے ان میں سے ایک قابل بھروسہ نہیں۔" اس اقتباس سے وزراء کے متعلق جو محسوسات تھے ان پر روشنی پڑتی ہے۔ ۶/ اگست ۲۷ء گورنر نے محکمہ صنعت و حرفت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ڈیوک اگر ڈپٹی ڈائرکٹر ہوجائے تو بہتر ہوگا میں نے کہا کہ میں راجندر (وزیر صنعت) سے ذکر کروں گا۔ وزراء میں سے ایک شخص کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بہت فلاں سے ناامیدی سی ہوئی۔ نہ اس میں ہمت ہے نہ قابلیت۔ اگر اسے برخاست کردوں تو کیا اثر ہوگا۔ میں نے کہا مناسب ہوگا کہ راجیشور بلی سے اول مشورہ کیا جائے۔ گورنر نے اس سے اتفاق کیا۔" مجھ سے پوچھا کہ اگر ایسی رد و بدل ہو تو دوسرا وزیر کون ہو۔ میں نے ہدایت حسین مرحوم اور خان بہادر اسمٰعیل کے نام لئے۔

سائمن کمیشن:

کامیاب حکمرانی کے واسطے ہمدردانہ تصویر بڑی ہی ضروری چیز ہے۔ اگر حکومت میں باوجود بہت سی دوسری خوبیوں کے یہ ایک بڑی کمزوری یا نقص تھا کہ ان میں ہمدردانہ تصور کی بہت کمی تھی۔

احکام نافذ کرنے سے قبل انھیں اس کا احساس نہ ہوتا تھا کہ ان کا ردعمل مختلف جماعتوں پر کیا ہوگا۔ اس زمانہ میں ایسے احساس کی کمی کا ایک بڑا ثبوت حکومت انگلستان نے دیا۔ برٹش پارلیمنٹ نے ہندوستان کے واسطے مزید اصلاحات کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا جس کے صدر سر جون سائمن۔ (جواب لارڈ ہو گئے ہیں) مقرر کیے گئے۔ اس کمیشن میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا۔ ہندوستان میں اس کے خلاف بڑی شورش ہوئی جو بالکل لازمی تھی۔

گورنر نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے ان سے کہا کہ یہ غلطی ہوگی اور گو خود سر ولیم نے مجھ سے کبھی نہیں کہا لیکن سر تیج بہادر سپرو کی ایک گفتگو سے اس کا صاف اظہار ہوا۔ کہ نہ صرف گورنر بلکہ ویسرائے نے بھی حکومت انگلستان کو اس طرف توجہ دلائی۔

۷ نومبر کے روزنامچہ میں درج ہے:

''سر تیج سے یہ عجیب بات معلوم ہوئی کہ لارڈ ارون نے میرا نام رائل کمیشن کے واسطے بھیجا تھا۔ اگر اس میں ہندوستانی ہوں تو انہیں بھی لیا جائے۔ بہر حال کسی ہندوستانی کو مقرر نہیں کیا گیا۔ اور جب شورش بہت زیادہ ہوئی (جس میں لبرل بھی شریک تھے) تو یہ طے کیا کہ جب کمیشن ہندوستان پہنچے تو صوبہ کے نمائندے ان کے شریک کار ہو جائیں اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور شورش بڑھتی گئی۔ اس شورش نے وزراء کی دشواریاں بڑھا دیں۔

۱۴ مئی کے روزنامچہ میں یوں درج ہے:

میں صبح کی گاڑی سے الہ آباد پہنچا...... مجھے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کی میٹنگ میں راجیشور بلی نے یہ کہا کہ اگر ہم لوگوں پر (یعنی وزراء پر) زور دیا جائے کہ تم شاہی کمیشن کے سامنے اظہار نہ دو تو ہم کیا کریں۔ گورنر نے کہا'' حضرات اگر آپ کے

خیالات کا یہ اندازہ ہے تو آپ کو استعفیٰ داخل کر دینا چاہئے۔"

۱۶ر نومبر کو میں گورنر سے ملنے گیا تو گورنر کہنے لگے کہ اگر وہ مخالفت پارٹی کے اگر وزراء کمیشن سے تعاون کرنا چاہئیں تو ان پر غیر اعتماد کی قرار داد پاس کرائی جائے اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر ولیم کے دل میں وزراء کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اگر وزراء تعاون نہ کریں تو خود استعفیٰ مانگنے کو تیار اور اگر کریں تو سر ولیم کا دل چاہتا تھا کہ کونسل انھیں نکالدے!۔

پھر دریافت کرتے رہے کہ میری ہوم ممبری کا زمانہ کب ختم ہوگا اور سر حبیب اللہ کا زمانہ کب ختم ہوگا (یہ گورنمنٹ آف انڈیا میں ممبر تھے) پھر یکا یک بولے "تم گورنمنٹ آف انڈیا میں جا کر رہو گے" میں نے کہا کہ کون جانتا ہے کیا ہو، تو فرمایا، "میری آرزو یہی ہے کہ یہ واقعہ قبل از وقت نہ پیش آجائے"۔!

نایک لڑکیوں کی حفاظت کا قانون:

اسی سال میں نے ایک بل کونسل میں پیش کیا جس کا منشاء یہ تھا کہ نایک قوم کی لڑکیوں کی حفاظت کی جائے۔ اس صوبہ کے بعض پہاڑی حصص رام نگر وغیرہ میں کچھ لوگ آباد ہیں جن کو نایک کہتے ہیں ان کے یہاں صدیوں سے یہ رواج چلا آتا ہے کہ یہ لوگ اپنی لڑکیوں کو چراغ خانہ "بنانے کے بجائے شمع محفل" بنایا کرتے تھے۔ دس گیارہ برس کی عمر ہی سے انھیں ناچ گانا سکھایا جاتا ہے چودہ پندرہ برس کی عمر تک وہ موسیقی کی ماہر اور آداب محفل سے واقف ہو جاتی تھیں۔ پہاڑی علاقوں میں سیاسی بیداری کے ساتھ اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی جس کا نتیجہ یہ بل تھا۔ اس بل کا منشاء یہ تھا کہ کوئی شخص کسی لڑکی کو اس نوعیت کی تربیت نہ دے جب تک کہ اس کی عمر اٹھارہ سال کی نہ ہو جائے۔ تاکہ وہ خود اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کے قابل ہو۔ میرا یہ خیال تھا کہ اس مسودۂ قانون کی مخالفت کسی طرف سے نہ ہوگی لیکن مخالفت ہوئی اور خوب ہوئی بعض کہتے تھے کہ جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں وہ ناکافی ہیں بعض اس کے برعکس خیال کرتے تھے لیکن کسی کو کھلم کھلا اس سے اختلاف نہ تھا۔

راجہ شمبھو دیال صاحب آنجہانی نے ایک پر مذاق تقریر کی جس کی ابتدا یوں کی

گئی تھی۔ میرا ان شریف اس امر کا مقتضی ہے کہ آنکھ بند کر کے اس بل کی تائید کر دوں۔

پنڈت گوبند پنتھ گورنمنٹ پر کچھ اعتراض کرتے ہوئے (جو اس زمانہ میں سوراجسٹ پارٹی کا دستور تھا) بل سے اختلاف نہیں کیا۔ اور بل منتخبہ کمیٹی میں بھیج دیا گیا۔

انتظامی اور عدالتی اختیارات کی علیحدگی:

پہلی نومبر ۲۷ء کو سوراجسٹ پارٹی کی طرف سے ایک قرارداد آئی کہ عدالتی اور انتظامی اختیارات کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا جائے پنڈت ڈکٹیشن نرائن تواری نے اسے پیش کیا اور بڑی زوردار تقریر کی میں خود اس اصلاح کے خلاف نہ تھا۔ میں اس کمیٹی میں غیر سرکاری ممبر تھا۔ جس نے اس علیحدگی کی سفارش کی تھی۔ یوپی حکومت نے حکومت ہند کو اس سفارش کی موافقت میں لکھا تھا اور یہی میں نے گورنمنٹ کی طرف سے جواب دیا۔ تقدیر کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ اب جب کہ کانگریس کہ پورے۔ اختیارات حاصل ہیں اس جانب کوئی توجہ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ جب ایسی قرار داد کسی مقننہ میں آئی تو کانگریس کی حکومت نے اسے ٹال ہی دیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ذمہ داری پڑنے پر خیالات میں بڑی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ نت نئی دشواریاں سامنے آتی ہیں جو نظریہ خیالی دنیا میں بے عیب نظر آتا ہے۔ وہ میدان عمل میں بعض اوقات سراسر غلط ثابت ہوتا ہے۔ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ انتظامی اور عدالتی اختیارات کو الگ الگ کرنا بہتر ہے۔ اور ہر طرح قابل عمل ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پارٹی پولٹکس کے زمانے میں یہ نہایت ضروری ہے۔ ورنہ عدالتوں کی آزادی سلب ہو جائے گی۔

سر ہارٹ بٹلر کا وداع:

سر ہارکورٹ بٹلر (جو یوپی سے برما کی گورنری پر چلے گئے تھے) وہاں اپنا زمانہ ختم کر کے ایک آخری نظر ڈالنے لکھنؤ اور رام پور آئے۔

میں رام پور بھی ان سے جا کر ۲۷ دسمبر ۲۷ء کو ملا اور لکھنؤ میں بھی ان کی دعوت میں شریک ہوا۔ لکھنؤ میں ان کی آؤ بھگت جس خلوص سے لوگوں نے کی اس کی

مثالیں مشکل سے ملیں گی جس خلوص سے اس جانے والے گورنر کو وداع کیا گیا۔ شاید ہی کسی آنے والے گورنر کا ایسا پرخلوص خیر مقدم کبھی ہوا ہو۔

سر ولیم کا زمانہ اب بالکل قریب ختم تھا انہوں نے بہت کوشش کی کہ ان کے جانشین سر سیم اوڈائل ہوں لیکن وزیر ہند اور حکومت ہند نے اسے منظور نہ کیا۔

سر ولیم کا آخری عہد گورنری اور نئے گورنر کے تقرر کا مسئلہ:

شاید اس کی وجہ یہ تھی ۲۶ء میں جب وہ چار ماہ کے لئے گورنر ہوئے تو انھیں کامیاب گورنر تصور نہیں کیا گیا۔ جب یہ عارضی گورنر تھے تو ان کی بدنصیبی سے ان کی بہن مخدوش علالت کی خبریں ولایت سے آئیں اور یہ کچھ ایسے پریشان ہوئے کہ انہوں نے دعوتیں حتیٰ کہ ملاقاتیں تک بند کر دیں۔ میں نے اور سر جگدیش پرشاد نے لیڈی اوڈائل کو اس طرف توجہ دلائی اور ان ہی کے کہنے سے میں نے سر سیم سے بھی ذکر کیا۔ وہ یہ کہنے لگے کہ طبعیت فکر مند ہو تو اظہارِ مسرت کیونکر ہو۔ میں نے کہا کہ جب اتنی بڑی ذمہ داری آپ نے قبول کی ہے تو پھر خانگی تردد اور تفکر کی وجہ سے (خواہ وہ کتنا ہی روح فرسا کیوں نہ ہو) آپ پبلک ذمہ داریوں کو ملتوی نہیں کر سکتے۔" اس سے بے بنیاد افواہیں پھیلتی ہیں۔ سر سیم نے شکریہ تو ادا کیا لیکن حالت جوں کی توں ہی رہی۔

اسی زمانے میں شملہ اور خود صوبہ میں یہ مشہور ہو گیا کہ سر سیم کو کچھ دماغی خلل ہو گیا ہے اور انہیں گورنمنٹ ہاؤس میں بند کر دیا گیا ہے۔ اور ہم لوگ اسے چھپا رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ واقعہ ان کے مستقبل گورنری میں مانع ہوا۔ اور ٹھیک ہوا۔ وہ طبعاً بہت جلد گھبرا جاتے تھے۔

سر الگز نڈر رنڈیمین (جو حکومت ہند کے ہوم ممبر تھے) گورنر مقرر ہوئے۔ سر ولیم نے اپنے جانے سے قبل ایک دربار الٰہ آباد میں کیا۔ اس دربار کی تقریر ان کی الوداعی تقریر تھی۔ انہوں نے اس پنج سالہ حکومت کا ایک مختصر مگر جامع تبصرہ کیا (میں نے اسے اپنے Appendix میں دے دیا ہے) اور ممبرانِ گورنمنٹ کے متعلق حسب ذیل فقرے اپنی تصویر میں کہے۔

They have found out how to combine loyalty to the

legislature with such measure of co-operation and forbearance as is essential if Diarchic Government is to endure for a week. I hope, and I believe, that they recognize that the Governor in Council has endeavoured to show them equal consideration. To the Nawab Sahib of Chhatari I owe more than I can easily say. He is wise and generous, and thinks no evil. Of my indebtedness to Sir Sim O'Donnel I know that he would not wish me to speak at length. When we took office we had been friends for over twenty-seven years, and five years under fire together has only cemented our friendship. To Sir Sam O' Donnell more than to any one the province is indebted for the Agra Tenancy Act. He shaped the scheme originally; he watched over it and nursed it at all its stages; and it is due mainly to his patience and skill that the Bill came safely through the Council. The Bill was the biggest piece of constructive legislation in these provinces for a generation; and on that ground alone its author's name will, I believe, be gratefully remembered here for many years to come.

چھ یا سات جنوری ۲۸ء کو میں سر ولیم کے آخری دربار کے سلسلہ میں الہ آباد گیا تھا۔ شام کو گورنر نے بلایا۔ بارش ہو رہی تھی۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی فضا بڑی نمناک افسردہ اور فرسودہ تھی جیسے نہ صرف سردی آپ کو چھو رہی ہو بلکہ آپ بھی سردی کو چھو سکتے تھے۔ سر ولیم نے اپنے دفتر کے کمرہ میں بیٹھے تھے۔ میرے پہنچنے پر آتش خانہ کے سامنے آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے بڑے ملول اور بجھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے جانے میں ہفتہ عشرہ ہی باقی تھا اس لئے گفتگو کا انداز اور لہجہ الوداعی تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر بولے میرا دل چاہتا تھا کہ تمہارے سینے پر ایک ستارہ آویزاں دیکھوں۔ مگر اس بار حکومت ہند نہ دے سکی۔ جون میں ضرور مل جائے گا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ کچھ ایسے الفاظ کہے جو ایسے موقع پر کچھ سوچ کر اور بہت کچھ بغیر سمجھے لوگ کہدیا کرتے ہیں۔ پھر مسٹر چنتامنی کا ذکر آیا، حسب معمول ان کے شاکی تھے کہنے لگے "گورنر ہونے کے بعد جو بات میں نے سب سے اچھی کی وہ یہ تھی کہ مسٹر

چنتامنی کا استعفیٰ منظور کر کے تمہیں مقرر کیا۔"

پھر ہندوستان کی عام حالت کا ذکر کرتے رہے۔ وہ اس کے قائل تھے کہ ہندوستان خود مختار حکومت کے واسطے تیار نہیں ہے، اور اس جانب رفتار کی تیزی اندرونی انتظامات پراگندگی پیدا کرے گی اور حکومت کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔

اس کے بعد لکھنؤ آ گیا، میرے پاس کچھ عرصہ سے ایک مقدمہ رکھا تھا جس میں گورنر کی رضامندی کے بغیر حکم جاری نہیں کر سکتا تھا، یہ ایک ڈپٹی کلکٹر کا معاملہ تھا جنھیں دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی۔ پانچ چھ ماہ قید میں گزر چکے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ بقیہ سزا کو مراحم خسروانہ کے تحت معاف کر دیا جائے اگر یہ ڈپٹی کلکٹر نہ ہوتے تو میں خود انھیں چھوڑ دیتا، لیکن ان کی ڈپٹی کلکٹری ان کے واسطے وبالِ جان ہو رہی تھی اور رہائی سے پہلے گورنر کی رضا ضروری تھی سر ولیم ایسے معاملات میں بڑے سخت تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ راضی نہ ہوں گے چنانچہ میں نے اس فائل کو روک رکھا تھا یہاں تک کہ سر ولیم کی پیشی میں کاغذات لیجانے کا آخری روز آ گیا۔

میں ہر بدھ کی پیشی نے کاغذات لیجایا کرتا تھا۔ تمام دوسرے کاغذات پیش کرنے کے بعد میں نے سب سے آخر میں اسی مقدمہ کا ذکر کر کیا۔ اور اسی زور دیا کہ یہ ڈپٹی کلکٹر ایک شریف خاندان کا رکن ہے اور چھ ماہ کی قید میں جسمانی تکلیف کے علاوہ روحانی اور دماغی تکلیف اس درجہ ہو چکی تھی کہ سزا کا مقصد بڑی حد تک پورا ہو چکا تھا۔ میں نے اس پر زور دیا کہ جرائم پیشہ اشخاص کو جسمانی تکلیف اور سلبِ آزادی کی سزا ہوتی ہے۔ لیکن ایک شریف اور تعلیم یافتہ شخص مشقت جسمانی اور سلب آزادی سے کہیں زیادہ روحانی اور دماغی اذیت اٹھاتا ہے۔ پھر اس شخص کی ملازمت بھی ہاتھ سے گئی اسے بھی سزا کا جزو سمجھنا چاہئے گورنر نے اس کے جواب میں کہا کہ ایک شریف خاندان کا فرد اگر ایسی حرکت کرے تو اور بھی زیادہ سزا کا مستحق ہے اس لئے کہ اس نے تو تعلیم و تربیت کا کوئی اثر قبول کیا اور نہ خاندانی روایات کا کوئی احترام ملحوظ رکھا۔

جب میں نے دیکھا کہ سر ولیم کسی طرح قابو میں نہیں آتے تو میں نے اس شعر کی پناہ پکڑی جو شاید غالب کا ہے۔

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے

میں نے کہا آج میری پیشی کا آخری دن ہے اور میرا ارمان یہ ہے کہ آج آپ کا آخری حکم ایک گنہگار کی بخشایش ہو۔ یہ کہہ کر میں نے فائل اُن کے سامنے رکھدی وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ میں بڑے غور سے ان کے چہرہ کا مطالعہ کرتا رہا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس دن کا سماں بھی کچھ عجیب سا تھا۔ ہر چیز اور ہر بات اداسی اور ویرانی میں چھائی سی معلوم ہوتی تھی۔ سر ولیم کے چہرہ بشرہ پر کوئی شکن کہیں ڈھیلی پڑتی نظر نہ آتی تھی۔ لیکن ان کے تنفس میں ہلکی سی ناہمواری آ گئی تھی۔ فائل پر حکم لکھدیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ گو وہ خود قبل از وقت رہائی کے خلاف تھے لیکن میرے اصرار سے مجبور ہو گئے۔ میں نے شکریہ کے ساتھ فائل اٹھالیا اور رخصت ہونے کے لئے اٹھا تو میں نے دیکھا جیسے سر ولیم پر کچھ تھکن سی طاری ہو گئی ہو۔

یہ ایک ایسے گورنر کا زمانہ ختم ہوا جن سے سیاسیات میں مجھے اکثر اختلاف رہا مگر بحیثیت انسان کے وہ بڑے اعلیٰ کردار کے حامل تھے۔ اختلافات اصولی تھے مثلاً اس زمانہ میں بعض محکمات وزیروں کے ہاتھ میں تھے اور بعض کونسلر کے پاس جو وزیر ہند کے ماتحت تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ باوجود اس اصولی فرقہ کے غیر متعلقہ محکموں میں بھی وہی روح کارفرما ہے جو متعلقہ محکموں میں تھی۔ سر ولیم حکومت کی دونوں شاخوں کو بالکل جدا جدا رکھنا چاہتے تھے۔ بایں ہمہ وہ بڑے ایماندار اور صاحب کردار انسان تھے۔ ان میں ریاکاری نام کو بھی نہ تھی۔ ظاہر اور باطن میں یکساں تھے۔ مستحکم ہاتھوں اور مستقیم ذہن سے حکومت کرنے کے قائل تھے۔

سر الگزینڈر موڈی مین:

۱۵ر جنوری کا سر الگزینڈر موڈی مین نے چارج لیا۔ سر ولیم لکھنؤ کے اسٹیشن سے سوار ہوئے۔ ان کی رخصتی سرکاری تھی۔ ہم سب لوگ معہ نئے گورنر کے موجود تھے۔ خاصہ بڑا مجمع تھا۔ سر ولیم بہت متاثر تھے اور سوائے ہاتھ ملانے کے گفتگو نہ کرتے تھے۔ مجھے بھی ان کے جانے کا بہت افسوس تھا۔

اب میں اور سر جگدیش پرشاد اس پر گفتگو کیا کرتے تھے کہ نئے گورنر کے ساتھ کیسے کام چلے گا اوران کی کیا پالیسی ہوگی۔

سر الگزینڈر نے اپنے فنانس ممبر لیمبرٹ کو کیا جو چیف سکریٹری تھے مگر وہ چارج لینے سے پہلے چار ماہ کی چھٹی لیکر ولایت چلے گئے۔

چارج لینے کے تیسرے روز سر الگزینڈر نے مجھے یاد کیا، جہاں تک مجھے یاد ہے اس طرح کی تقریر کی ''نواب صاحب میں حکومت ہند میں ہوم ممبر تھا میرے چیف نے کبھی مجھ سے کوئی راز نہ رکھا اور نہ میں نے ان سے کچھ چھپایا۔ آپ میرے ہوم ممبر ہیں میرا یہی طرز آپ کے ساتھ ہوگا۔ ہمارے درمیان کوئی راز نہیں ہونا چاہئے۔'' میں نے اس طرز کار سے اتفاق کیا اور ان سے کہا ''میں خود ٹیم کی حیثیت سے کام کرنا پسند کرتا ہوں۔ آپ اسے جلد محسوس کرلیں گے کہ میں آپ سے نہ کوئی راز رکھتا ہوں اور نہ گفتگو کے وقت کسی قسم کا ''دماغی تحفظ'' ملحوظ رکھتا ہوں۔ اس تمہید کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ اسمبلیوں میں مختلف پارٹیوں کی کیا طاقت ہے، میں نے بتانا شروع کیا کہ سوراجسٹ اس قدر ہیں اور مسٹر چنتامنی کی پارٹی میں یہ لوگ ہیں۔ میں نے یہیں تک کہا تھا کہ بولے کہ پہلے یہ بتایئے کہ آپ کی پارٹی میں کتنے لوگ ہیں (وہ فہرست میں ہر نام پر نشان لگا رہے تھے) ہیں: ''ہوں گے ۱۳ یا ۱۴ آدمی''۔ چونک کر بولے ''میں نے تو یہ سنا ہے کہ سب سے بڑی پارٹی آپ کی ہے، آپ ۱۲-۱۴ کیسے کہتے ہیں۔'' میرے ساتھی تو فقط وہ ہیں کہ اگر میں مخالف ہوجاؤں تو وہ سب حکومت کی مخالفت کریں۔ رہی وہ اکثریت جو آج میرے ساتھ ہے وہ درحقیقت حکومت کے پیرو ہیں اگر کوئی دوسرا ہوم ممبر ہوگا تو وہ اس کا ساتھ دیں گے۔'' اس طرح ہماری پہلی ملاقات سے یہ نیا دور شروع ہوا۔

انگریز کی عام پالیسی تو یہ تھی کہ جب تک ہوسکے انگریزی اقتدار کو قائم رکھا جائے ہر افسر کو اس پر عامل ہونا پڑتا تھا۔ لیکن الگزینڈر ان انگریزوں میں تھے جو ہندوستانیوں کے ساتھ دوستی اور مساوات کا برتاؤ کرتے تھے انکی طبعیت کا رنگ سر ہار کورٹ بٹلر کا سا تھا۔ بڑے مہمان نواز، خوش لباس، زندہ دل اور شوقین مزاج تھے۔

تعلقات میں رنگ و نسل کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ شادی کبھی کی ہی نہ تھی۔ مزاج قدرتاً آزادی کا خوگر ہو گیا تھا۔ گورنر ہونے کے بعد فقط پانچ ماہ زندہ رہے لیکن اسی دوران میں جن لوگوں سے ملے ان پر اچھا اثر چھوڑا مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئے تھے۔ ہفتہ میں ایک روز شام میرے گھر ٹینس کو ضرور آتے تھے۔ ان صحبتوں پر بڑے باغ و بہار رہتے۔ ایک بار نینی تال میں چاد کے لئے گورنمنٹ ہاؤس گیا۔ ایک میز پر، جو اس میز سے زرا دور تھی جہاں گورنر خود بیٹھے تھے۔ میں نے بیٹھنے کا ارادہ کیا۔ اس میز پر ایک نوعمر خاتون بھی بیٹھی تھیں۔ A-D-C مجھے اٹھانے لگا کہ میں گورنر کی میز پر بیٹھ سکوں۔ سر الگزینڈر نے دیکھا تو بولے "کتنا ناسمجھ اے. ڈی. سی ہے یہ نہیں دیکھتا کہ نواب صاحب وہاں کیوں بیٹھے ہیں۔" پھر اس خاتون کو بھی اپنی ہی میز پر بلا لیا اور کہنے لگے "اب تو آپ خوش ہیں۔"

ان کی یہ بھی عادت تھی کہ ہفتہ بھر کی وہ تمام خط و کتابت جو سرکاری معاملات میں ان سے اور وزیر ہند یا وائسرائے سے ہوتی تھی پیشی کے روز مجھے دکھا کر اس پر بحث کرتے تھے اور پھر جواب دیتے تھے۔

ان کو محفل آرائی اور طرب گستری کا شوق تھا۔ پہلی سرکاری تقریب جو ان کو زمانہ میں ہوئی، وہ موجودہ کونسل چیمبر کا افتتاح تھا ایسے بڑے اہتمام سے کیا گیا۔ کونسل چیمبر کی مہتابی کے سامنے جو میدان ہے وہاں جلسہ ہوا اور وہاں سے جا کر افتتاح کیا گیا۔ وہ کچھ غیر معمولی مقرر نہ تھے۔ ان کی تحریر میں بھی کوئی خاص بات نہ ہوتی مگر ان کا طرز ادا کچھ ایسا سیدھا سادا اور گھریلو سا ہوتا تھا کہ لوگوں پر اثر اچھا خاصا ہو جاتا۔

کونسل میں سائمن کمیشن پر بحث:

انکے برسرکار آتے ہی سائمن کمیشن کا مسئلہ پیش ہوا۔ مجھ سے مشورہ ہوا میں نے کہا کہ حکومت انگلستان سے بڑی چوک ہوئی۔ مجھے یقین نہیں کہ کونسل حکومت کا ساتھ دے۔ انھیں معلوم تھا کہ نواب یوسف ان کے ساتھ ہیں۔ مگر رائے راجیشور بلی اور کنور راجندر سنگھ مذبذب ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ایک بڑا ایٹ ہوم کیا گیا اور بعض بعض ممبران کونسل سے گورنر نے اسی مسئلہ پر گفتگو بھی کر لی۔

آخر کار ۲۴؍فروری کو ایک قرارداد کندی لال صاحب (سوراجسٹ) کی طرف سے کونسل میں آئی جس کا منشا یہ تھا کہ یہ کونسل سائمن کمیشن کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کرنا چاہتی۔

بڑی گرما گرمی رہی پریسڈنٹ کو ممبران سے یہ کہنا پڑا کہ ہر ممبر رائے دینے کے بعد سیدھا اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ جائے تا کہ کسی دوسرے ممبر پر رائے کے واسطے زور نہ دیا جا سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مکندی لال صاحب کی یہ قرارداد ایک رائے کی اکثریت سے پاس ہوگئی نواب محمد یوسف نے اس قرارداد کے خلاف رائے دی۔ لیکن دوسرے دو وزیر ناطرفدار رہے۔

اس مباحثہ کے بعد کونسل کا جو اجلاس ہوا اس میں چنتامنی صاحب نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں حسب ذیل الفاظ کہے۔

''آج صبح میں کونسل آ رہا تھا تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آیا کہ گذشتہ موقع پر جو فیصلہ کونسل نے کیا ہے اس کے ہوتے ہوئے وزیر لوکل سلف گورنمنٹ اپنی کرسی پر متمکن نظر آئیں گے یا نہیں۔ بہر حال یہ بات دور از حقیقت نہ ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وزیر ممدوح یہ تمامی فر وفرحی اپنی جگہ پر رونق افروز ہیں۔''

مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جو وزراء ناطرفدار رہے تھے انھیں آخر کار استعفیٰ دینا پڑا۔

گورنر اس واقعہ کے بعد دو تین ماہ تو خاموش رہے، لیکن آخری یا شروع جون میں جب اس کا وقت آیا کہ کمیشن کے روبرو پیش کرنے کا مواد ہر ایک صیغہ سے بھیجا جائے تو گورنر نے رائے راجیشور بلی اور کنور راجندر سنگھ سے بذریعہ تحریر دریافت کیا کہ وہ اس میں تعاون کریں گے یا نہیں۔ ان کا جواب گورنر کے نزدیک شافی نہ تھا۔ چنانچہ گورنر نے ان سے استعفیٰ مانگا۔ قدرے پس و پیش کے بعد یہ مستعفی ہو گئے۔

آنریری مجسٹریٹ:

اس کونسل کے اجلاس میں ایک قرارداد آنریری مجسٹریٹوں سے متعلق بھی آئی تھی۔ یوں تو ایسی تجاویز اس سے قبل بھی آئی تھیں لیکن اس بار اس پر بہت زور دیا گیا کہ ایک غیر سرکاری کمیٹی مقرر کی جائے جو آنریری افسران کے تقرر اور تنزل وغیرہ

کے متعلق قواعد بنائے۔

میں نے اپنے جواب میں اس سے تو اتفاق کیا کہ حکومت کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے کہ بہترین لوگوں کا تقرر ہو لیکن مجھے اس سے اختلاف تھا کہ کسی غیر سرکاری کمیٹی کو ایسے اختیارات دیئے جائیں جو ان کے تقرر اور برطرفی میں دخل دے۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ ایسا کیا گیا تو یہ تقررات بھی پارٹی پالٹکس سے مسموم ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔

بھلے ہر جماعت میں موجود ہیں اور رہیں گے۔ غلط انتخاب پہلے بھی ہوئے اور اب بھی ہوں گے۔ من حیثیت الجماعت وہ آنریری۔ یا فسر جو پہلے تھے یا جواب مقرر ہوئے ہیں ان کے درمیان امتیاز کرنا بھی مشکل ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ یہ پارٹی سرداروں یا اسمبلی کے ممبروں کی سفارش پر مقرر ہوتے ہیں اور وہ کلکٹر کی رائے سے ہوتے تھے۔

موجودہ حکومت کا یہ خیال ہے کہ منتخب شدہ پنچایتوں کو فوجداری اور دیوانی کے کچھ اختیارات دیئے جائیں۔ اور گذشتہ آنریری افسران کی جگہ یہ جماعتیں کام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ غلط قدم اٹھایا جا رہا ہے۔

منتخب شدہ پنچایتیں اور عدالتی اختیارات:

پنچایتی عدالتوں کا انتخاب انصاف کے حق میں مضر ہوگا۔ امریکہ میں ایک زمانہ میں ججوں کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ لیکن تجربہ سے مجبور ہو کر اسے بالآخر ترک کرنا پڑا۔ اگر عدالتیں اپنے وجود کے لئے رائے دہندگان کی آراء کی مرہون منت ہوں تو بے لوث انصاف ناممکن ہو جائے گا۔ اوّل تو ایسے لوگ جو اس کی پروا کئے بغیر فیصلہ کریں کہ فریقین میں سے کون ان کا طرفدار تھا اور کون مخالف اگر بالکل نایاب نہیں تو بہت ہی کمیاب ہیں۔ لیکن اگر اس کردار کا کوئی شخص ہو بھی تو بھی اس فریق کا جس نے انتخاب کے وقت مخالفت کی تھی یہ اطمینان نہیں ہوسکتا کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ عدالتوں کو سیاسی ملوثات سے قطعات وقاطبتاً پاک ہونا چاہیئے!

پنچایتوں کو عدالتی اختیارات دنیا دیہاتوں میں فتنے کا بیج بونا ہے۔ پنچ اور پنچایت کے بعض بڑے دلکش افسانے سب نے سنے ہیں لیکن زمانہ منقلب ہو چکا ہے۔ اب جو پنچایتیں بننے لگیں وہ رائے دہندگان کی مصنوعی تنظیم سے بنیں گے اور

ان میں اور دوسری سیاسی جماعتوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔
بتایا یہ جاتا ہے کہ ہندوستان میں پنچایت کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن گزشتہ ہندوستان کی پنچایتیں الکشن سے نہیں بنتی تھیں بلکہ قوم یا گاؤں میں جو شخص سب سے زیادہ متدین اور مستند ہوتا تھا اسے رائے عامہ خود سردار یا سرپنچ بنا لیتی تھی۔ لیکن آجکل الکشن اور پارٹی بندی مترادف الفاظ ہیں۔ پارٹی کے ہاتھ میں انصاف دینے کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

محکمہ جیل:

اسی اجلاس کونسل میں جیلوں کے متعلق بھی ایک قرارداد پیش ہوئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جیل میں اصلاحات کے واسطے ایک کمیٹی بٹھائی جائے مجھے کمیٹی کی تجویز سے اتفاق تھا۔ اس واسطے یہ قرارداد واپس لے لی گئی۔
جیل کی اصلاحات کا ذکر آئندہ آئے گا۔ البتہ کانگریس کے لوگوں کے جیل جانے سے ان حضرات کو اندرونی انتظامات کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ اصلاح انتظام کے واسطے بہت کارآمد ہوئیں۔ ورنہ غریب قیدیوں کو اس کا موقع ملنا مشکل تھا کہ ان کا دکھ درد اس شدومد سے ملک کے روبرو پیش ہوتا ہے۔

پولیس بجٹ ۱۹۲۸ء:

اس سال پولیس کا بجٹ پیش کرتے ہوئے میں نے اپنی تقریر میں ٹھاکر حکم سنگھ کی ایک تحریک کی طرف اشارہ کیا جس کا منشاء یہ تھا کہ پولیس کا پورا بجٹ نامنظور کیا جائے میں نے کہا کہ اس تحریک کو سب سے پہلے لے لیا جائے اس لئے کہ اگر پورا بجٹ ہی نامنظور ہوگیا تو بحث مباحثہ فضول ہے قانوناً یہ آخری روز تھا جب کہ پانچ بجے تمام صیغوں پر فقط رائے زنی کرنا تھا۔ میرا منشا یہ تھا کہ اس طرح کوئی تخفیف پولیس کے صیغہ میں نہ ہوسکے گی۔ میں جانتا تھا کہ اکثریت ایسی بے سروپا تجویز کو ہرگز منظور نہ کرے گی۔ اور اگر اس میں کوئی ترمیم پیش کی گئی تو سوراجسٹ اپنے اصول کے مطابق منظور نہ کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سری. وائی. چنتامنی نے تجویز پیش کی کہ

بجائے پوری رقم نامنظور کرنے کے ۳ لاکھ کم کئے جائیں۔ پنڈت گوبند بلب پنتھ صاحب نے بجائے ترمیم سے اتفاق کرنے کے اصلی تحریک سے اتفاق کیا کہ پولیس کا پورا بجٹ حذف کردیا جائے۔ اب راستہ بالکل صاف تھا۔ نہ اصل تحریک کی تائید کونسل نے کی اور نہ ترمیم کی۔ پولیس کا میزانیہ بلاتخفیف پاس ہوگیا۔

انہی دنوں مجھے بخار نے آلیا۔ کم و بیش ہر وقت رہتا تھا۔ مسٹر لمبرٹ اسی سال فنانس ممبر ہونے تھے، انکی خواہش یہ تھی کہ میں کم از کم کونسل کے کمرہ میں موجود ضرور ہوں، مجھ پر ایک خاص طرح کی غنودگی رہتی تھی۔ بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ مگر لیمبرٹ کی خاطر آتا اور کرسی پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتا۔ اب میرے بدن پر دانے نمودار ہو گئے۔ لیکن ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح کے دانے ہیں۔ ایک دن ڈاکٹر میرے کمرے میں بیٹھے تھے کہ چھتاری سے تار آیا کہ میرے لڑکے راحت سلمہ کو کھسرہ نکل آئی۔ اس تار کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے یہ رائے قائم کی کہ مجھے بھی کھسرہ ہے۔ کیوں کہ میں بھی چھتاری سے لکھنؤ آیا۔ میرا مرض کچھ ہی ہو لیکن ڈاکٹر نے مجھے چلنے پھرنے کی ممانعت کردی۔ جو میرے لئے بڑے سکون کا باعث ہوئی۔ اسی علالت کے زمانہ میں وہ واقعہ ہوا جس کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں آیا ہے کہ میرے ایک دوست نے عیادت کے بعد دریافت کیا کہ میری رائے میں اس صوبہ کی حکومت میں ایک ہی اسمبلی ہو یا اس کے ساتھ ایک کونسل بھی ہو جس میں اس کے قوانین دوبارہ پیش ہوں یعنی اپر چیمبر بنایا جائے۔

پنڈت مدن موہن مالوی جی:

یہاں مجھے اپنے ایک بزرگ دوست کا خیال آ گیا۔ میرا منشا پنڈت مدن موہن مالوی جی سے ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ بنارس یونیورسٹی ہے۔ جس کے لئے ان کی پوری زندگی وقف تھی۔ انھوں نے ملک کی بڑی بے لوث و بیدریغ خدمت کی۔ مذہبی خیال کے اہل ہنود کے خصوصیت کے ساتھ یہ سب سے بڑے لیڈر تھے۔

ایک بار ان کے وائس چانسلری کے زمانہ میں بنارس یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں شاید وزیر صنعت و زراعت تھا پنڈت جی باوجود پیرانہ سالی کے ہر جگہ

میرے ساتھ ساتھ رہے۔ انجینئرنگ کالج کو بہت تفصیل سے دکھایا۔ پھر سائنس کے اس صیغہ کو دکھایا جہاں مختلف چیزیں بنانا سکھایا جاتا تھا (اپلائڈ کمیسٹری) ہر چیز کو اس طرح دکھاتے تھے جیسے ایک ماں اپنے لاڈلے بچوں کو فخر و محبت سے کھلونے دکھاتی ہے۔

پنڈت جی بڑے خلیق تھے، اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں پر عبور تھا۔ بڑی پرزور تقریر کرتے تھے۔ جب تک مہاتما جی کے اثر و اقتدار کا ستارہ طلوع نہیں ہوا تھا۔ یہ کانگریس کے محترم ترین قائدین میں سے تھے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے انھیں ترک مسوالات کی پالیسی سے چنداں اتفاق نہ تھا۔ اور یہیں سے ان کا اختلاف کانگریس سے شروع ہوا۔ کانگریس اس کی بھی خواہش مند تھی کہ مسلمانوں سے سمجھوتہ ہو جائے۔ پنڈت جی اس کے خلاف نہ تھے لیکن جتنی رعایت مہاتما جی یا پنڈت موتی لال جی مسلمانوں کے لئے روا رکھنا چاہتے تھے (تاکہ انھیں اکثریت سے ڈر نہ رہے اور قومی جدو جہد میں تن، من دھن سے شریک ہو جائیں۔) اتنی رعایت پنڈت جی کو گوارا نہ تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے ہندو مہا سبھا کی بنیاد ڈالی اور ان کے اور کانگریس کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل ہوگئی۔ مالوی جی کی شخصیت ہندوستان کو سالہا سال یاد رہے گی۔

وزراء کا استعفیٰ:

اصل قصہ ختم کئے بغیر میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ سائمن کمیشن کی قرارداد پر جب کونسل کا یہ فیصلہ ہو گیا کہ تعاون نہ کیا جائے تو راجہ جگناتھ بخش سنگھ نے (یہ چنتا منی کی پارٹی میں ڈپٹی لیڈر تھے) چند سوالات کونسل میں بھیجے، جس کا جواب ۳۱ر مارچ کو دیا گیا۔ ضمنی سوالات میں رائے راجیشور بلی کو اس پر پابند کرنا مقصود تھا کہ وہ در پردہ کمیشن سے تعاون نہ کریں۔ ان دونوں وزراء کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ حکومت ہند کو وہ تمام مواد فراہم کرنے کو تیار تھے جو سائمن کمیشن کو درکار تھا۔ لیکن براہ راست کمیشن سے تعاون کے خلاف تھے۔ راجہ جگناتھ بخش سنگھ اور رائے رجیشور بلی میں چونکہ ہمیشہ چشمک تھی اس لئے راجہ صاحب نے اسی موقع کو غنیمت سمجھ کر وزراء کو پابند کر دیا تاکہ گورنر سے جھگڑا ہو جائے۔

سرولیم کے متعلق تو وزراء کو یقین تھا کہ وہ ضرور استعفیٰ طلب کریں گے اسی اندیشہ سے سرولیم نے زمانہ میں اس مسئلہ کو کونسل میں نہیں لایا گیا۔ لیکن گورنر کے متعلق گمان تک نہ تھا کہ وہ اس حد تک چلے جائیں گے۔

حسب دستور گرمیوں میں حکومت نینی تال چلی گئی۔ نینی تال کی سوشل زندگی یوں ہی کیا کم دلچسپ تھی کہ سرالگزینڈر نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ ہر ہفتہ گورنر ایک روز میرے ہاں اور ایک روز فنانس ممبر کے ہاں ٹینس کھیلنے آتے۔ ہفتہ میں ایک دن گورنمنٹ ہاؤس جاتا رہے چار روز وہ بھی ہر شام کو کسی نہ کسی دوست کے گھر پر گزرتے تھے۔ بایں ہمہ گورنر کو یہ فکر ضرور تھی کہ دوسرے وزراء تجویز کیے جائیں اور وہ کون ہوں؟

اصولاً مجھے ان وزراء کے تقرر سے تعلق نہ تھا مگر دورانِ گفتگو میں سر جے پی سریواستوا کا نام میں نے لیا۔ گورنر نے اس سے سخت اختلاف کیا ان کا خیال تھا کہ کاروباری لوگ رکن حکومت بننے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ کہنے لگے کہ مزدوروں کا کوئی جھگڑا سامنے آیا تو انھیں ایسے ممبران حکومت پر بالکل اعتماد نہ ہوگا۔

نئے وزرا کا انتخاب:

مہاراج کنوار مہی جیت سنگھ آنجہانی کا نام گورنر نے خود لیا۔ مجھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مہاراجہ کپورتھلہ نے انھیں اس کے متعلق لکھا تھا۔ گورنر کہنے لگے کہ "ان کا تقرر مناسب ہوگا۔ ہندو ممبران مہاراجہ کے زیر اثر ان کی مدد کریں گے۔" چنانچہ ایک تو مہاراج کنور کا انتخاب ہوا' دوسرے وزیر کے انتخاب میں کنور سر جگدیش پرشاد، راجہ جگناتھ بخش سنگھ کو موزوں خیال کرتے تھے۔ مجھے پس و پیش تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مخالف پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ سائمن کمیشن کے مسئلہ پر سختی سے گورنمنٹ سے اختلاف کر چکے تھے۔ کونسل اور دوسرے جلسوں میں تقاریر کر چکے تھے ان حالات کے ماتحت رہ کر اس منصب کو کیوں کر قبول کر سکتے تھے۔ لیکن جب راجہ صاحب کا ایماء معلوم کیا گیا تو کچھ پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئے۔

ان کے تقرر کی اصل وجہ یہ تھی کہ آہستہ آہستہ وہ ممبران جو سوراجسٹ نہ تھے سرسی، وائی چنتا منی کی پارٹی میں شریک ہوتے جاتے تھے۔ اور وزراء کی پارٹی کی

اکثریت خطرہ میں تھی۔ راجہ کے سات ممبر اور بھی چنتامنی کی پارٹی سے الگ ہونے کو تیار تھے گورنر یہ چاہتے تھے کہ ایک رائے سے سائمن کمیشن کے خلاف قرارداد پاس ہوگئی تھی۔ وہ اس مسئلہ کو دوبارہ کونسل میں لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ جگناتھ بخش سنگھ وزیر مقرر ہوگئے۔

میرا اس وقت بھی نظریہ یہی تھا کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے راجہ صاحب کا وزارت قبول کر لینا پسندیدہ نہ تھا۔

سر الگزینڈر کا انتقال:

اسی زمانہ میں جون کا مہینہ تھا کہ سر الگزینڈر ریکا یک سخت بیمار ہو گئے قصہ یہ ہوا کہ ایک روز شام کو گورنر نے اسکواش کھیلا، اس کے بعد ٹینس شروع کر دی۔ ٹینس کے دوران میں انھیں چکر آیا اور سینہ میں درد اٹھا، اے، ڈی، سی، انھیں رکشا میں ڈال کر گورنمنٹ ہاؤس لے گئے۔ ڈاکٹر جمع ہوئے۔ ان کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ محنت کی وجہ سے قلب میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ چار پانچ روز میں طبیعت سنبھل گئی تو مجھے یاد کیا۔ وہ بہت بشاش تھے گو نقاہت خاص تھی مجھ سے اور فنانس ممبر سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ انھیں یقیناً آنے والے خطرہ کا احساس نہ تھا۔

ملاقات کے چوتھے روز میں بروک ہل کوٹھی میں بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی میں نے آلہ اٹھایا تو پرائیویٹ سکریٹری کرنل پیٹرسن تھے کہا "گورنر کا انتقال ہوگیا" میں دھک سے رہ گیا اور کچھ دیر کے لئے بالکل کھوسا گیا۔ فوراً گھوڑا منگایا اور گورنمنٹ ہاؤس پہنچا۔ مجھ پر یاس و اضطراب کا یہ عالم تھا کہ گرد و پیش کی موجودات پر بھی مجھے یہی کیفیت طاری نظر آنے لگی۔ اس امنڈتی ابلتی دنیا سے کسی کی امنڈتی ابلتی زندگی کا چشم زدن میں رشتہ منقطع ہو جانا دنیا کی بے ثباتی کا ایسا نقشہ تھا کہ روح تھرا گئی۔ پھر سر الگزینڈر رنڈی مین کا اٹھ جانا، جنھوں نے ہر چھوٹے بڑے کے دل میں جگہ کر لی تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس پہنچا تو سر جارج لیمبرٹ کو موجود پایا۔ پادری صاحب اور جنرل ایسٹ کمانڈ کے مشورے سے تجہیز و تکفین کا انتظام کر کے واپس ہوا۔

واپس ہونے لگا تو اے، ڈی، سی نے پوچھا چائے تیار ہے۔ طبیعت اور زیادہ بدحظ ہوئی اور میں جواب دیئے بغیر چلا آیا۔ ممکن ہے اے، ڈی، سی، کا فعل اس

درجہ قابل اعتراض نہ ہو جتنا کہ میں نے محسوس کیا، پھر بھی بات اپنی جگہ پر ہے۔ آداب کی پابندی ضرور اہم ہوتی ہے۔ لیکن آداب کی ایک حد بھی ضرور ہوتی ہے۔

راستہ بھر عجیب کیفیت دل پر رہی۔ وہ عقدۂ لاینحل جسے کوئی حل نہ کر سکا میرے روبرو تھا، جو ہر شخص کے روبرو رہا ہے، اور جاتی دنیا تک رہے گا۔

لائی حیات، آئی، قضائے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی گئے

پہلی بار گورنری:

انھیں خیالات میں ڈوبتا ابھرتا گھر واپس آیا اور ایک تھکن اور بے بسی کے ساتھ بغیر کسی ارادہ کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ سر نور محمد صاحب میرے گھر مہمان تھے (یہ پٹنہ کے باشندہ ہیں، عرصہ تک بہار اسمبلی کے اسپیکر، پھر ہائی کورٹ کے جج اور پبلک سروس کمیشن کے صدر رہے، میرے کمرے میں آئے اور مجھ سے کہا کہ وائسرائے کو تار دیجیے کہ آپ نے قانون کے تحت اس ذمہ داری کو سنبھال لیا ہے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور سر جگدیش پرشاد چیف سکریٹری سے فون پر کہا کہ حکومت ہند کو ضروری اطلاعات دیں۔ میں نے خود بھی لارڈ ارون کو ایک خط لکھا۔

محض قضا کے ایک کے ''تیر بے اماں و بے نشاں'' کی بدولت مجھے گورنر ہونے سے کلفت ہوئی اور اچانک کسی بڑی ذمہ داری کے عائد ہو جانے سے جو تشویش پیدا ہو جاتی ہے اس کا اثر مجھ پر ہوا اور کافی ہوا۔ میرے دوستوں اور گھر کے لوگوں کے محسوسات شاید بالکل مختلف تھے۔ آخر کار دوسرے روز صبح کو گھر ڈکٹیٹر (جسے عرف عام یا لطفِ خاص میں بیوی کہتے ہیں) سے برداشت نہ ہو سکا اور کہنے لگیں۔ ''مڈی مین صاحب کی موت کا ہم سب کو رنج ہے۔ ایسی موت بڑی دردناک ہوتی ہے۔ آپ کے دوست تھے آپ کو قدرتاً زیادہ افسوس ہوگا لیکن آخر ہم لوگ کیا کریں۔ آپ جو اس درجہ ملول اور مغموم ہیں اس کا نتیجہ کیا؟ میں اور بچے سب پریشان ہیں، آپ کی طبیعت کا یہی رنگ رہا تو میں بچوں کو لے کر چھتاری چلی جاؤں گی۔''

یہ رویہ اور یہ اعلان دنیا میں صرف بیوی کا ہی ہو سکتا تھا، اس کا اثر فائدہ سے

خالی نہ تھا۔ سب سے زیادہ مدد مجھے سر محمد نور صاحب کی موجودگی سے ملی۔ یہ نہایت ہمدرد دوست، شریف مزاج انسان اور سمجھدار مشیر ثابت ہوئے اسی زمانہ سے میری ان کی دوستی قائم ہوئی اور اب تک قائم ہے۔

دوسرے روز تین بجے سہ پہر کو گرجے میں نماز جنازہ ہوئی۔ میں اس میں شریک ہوا۔ اسکے بعد فوجی اعزاز کے ساتھ ان کا جنازہ اٹھا۔ سڑک پر دورویہ فوج کھڑی تھی، سپاہی اپنی رائفلوں کی نال جھکائے سرنگوں کھڑے تھے۔ یہ سماں نہایت غمناک اور دل کو متاثر کرنے والا تھا۔ جنازہ توپ کی ایک گاڑی پر تھا جسے سپاہی کھینچ رہے تھے۔ میں بحیثیت ''سوگوار خاص'' (چیف مورنر) جنازہ کے بالکل پیچھے تھا۔ پھر لیمبرٹ، وزراء اور دوسرے افسران تھے سب لوگ یونیفارم میں تھے۔ قبرستان پہنچ کر وہاں کے مراسم ادا کیے گئے۔ دفن کے بعد بگل بجانے والوں نے (لاسٹ پوسٹ) بجائی۔

یہ پہلا موقع تھا جب عیسائی تدفین کے مراسم میں نے ادا کیے۔ بہت سے طریقے مسلمانوں کے طریقوں سے مشابہ تھے مثلاً ہم سب لوگوں نے تین تین بار اسی طرح مٹی دی جس طرح مسلمانوں میں دی جاتی ہے اور اسی کے ہم معنی دعائیں پڑھی گئیں۔

ایک والدہ کے سوا جو ولایت میں تھیں اور کوئی عزیز و قریب سر الگزینڈر نے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ لارڈ ارون کا اور میرا فرض حزیں تھا کہ اس المناک حادثہ کی خبر غم نصیب ماں کو پہنچائیں۔

میری نئی ذمہ داریاں:

لارڈ ارون اور دوسرے اشخاص اور حکومتوں نے اظہار ہمدردی کے خطوط مجھے لکھے اور میں نے حکومت یوپی کی جانب سے ان کے مناسب جوابات دیئے۔ زمانہ کا دھارا کسی کو دھیان میں نہیں لاتا اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کی قہرمانی سے سرتابی کر سکے۔ ہماری زندگی کا بڑے سے بڑا سانحہ اس کے نزدیک قطعاً بے وقعت ہے۔ اس محفل کا رنگ ہی کچھ اور ہے ؏

ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رنگت ہے محفل کی

دوسرے روز سے معمولات کا پہیہ پھر چلنے لگا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بجائے آنجہانی کے میرے احکامات جاری ہو گئے۔

میں ۱۷ر جون سے ۹ر اگست تک بحیثیت گورنر کام کرتا رہا۔ ناسپاسی ہوگی اگر سب سے پہلے میں ان حضرات کا ذکر نہ کروں جن سے مجھے بے حد مدد ملی۔ سر جارج لیمبرٹ آنجہانی اور سر جگدیش پرشاد نے نہ صرف میرے ساتھ کامل تعاون کیا بلکہ برادرانہ خلوص کے ساتھ میری رفاقت کی۔

فرحت کا ایک لطیفہ:

انہی دنوں ایک روز میں دفتر سے گھوڑے پر آ رہا تھا جب بروک ہل کوٹھی پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ فرحت سلمہٗ (میرا دوسرا لڑکا) خاموش سرنگوں اپنی ہوائی بندوق کی نال بوٹ پر جھکائے کھڑے ہیں خلاف معمول یہ دوڑتے ہوئے اور "باپو۔ باپو" کہتے ہوئے میرے پاس نہ آئے تو میں اور زیادہ متعجب ہوا۔ آگے بڑھ کر ملازمین سے اس "آزردگی غیر سبب" کے معنی پوچھے تو معلوم ہوا کہ صبح ان کا لاڈلا بٹیر لقمۂ اجل ہو گیا تھا اور انھوں نے جس طرح سپاہیوں کو دو چار روز ہوئے سرنگوں دیکھا تھا، اسی کے اتباع میں بٹیری کی قبر پر سرنگوں کھڑے تھے۔ میں نے انھیں گود میں اٹھا کر زنانہ مکان کا رخ کیا اور دو بٹیر بازار سے منگا کر پیش کیے۔

اسٹاف:

سر الگزینڈر کا اسٹاف بہت اچھا تھا۔ میرے لیے ردو بدل کا تو موقع ہی نہ تھا، لیکن اگر ہوتا بھی تو بھی اس سے بہتر فرض شناس اور آزمودہ کار اسٹاف کا انتخاب آسان نہ ہوتا۔ کرنل پیٹرسن پرائیویٹ سکریٹری اور کیپٹن پیرا اور کیپٹن نیلسن اے، ڈی، سی، تھے۔

غالباً یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ لائق اسٹاف سے گورنر کو کتنی بیش بہا مدد پہنچتی ہے۔ جس روز کوئی ملاقات کو آتا اگر وہ پہلے بھی گورنروں سے مل چکا ہے تو کرنل پیٹرسن اس کا ذاتی نائل نکال کر صبح ہی میری میز پر رکھ دیتے اور ملاقاتی کے آنے سے پہلے میں اس کا مطالعہ کر لیتا، اس میں یہ صیغۂ راز مختلف گورنروں کی رائے اس شخص

کے متعلق لکھی ہوتی۔ اس میں بعض آرا نہایت دلچسپ اور اکثر صحیح ہوتیں۔ مثلاً میرے ایک دوست کے متعلق لکھا تھا ''بکّی بہت ہیں اور گفتگو میں مبالغہ کرتے ہیں'' یہ کمزوری ان میں تھی میں نے خود بارہا اس طرف ان کو متوجہ کیا تھا۔

ایک اور صاحب کے متعلق گورنر نے لکھا تھا ''غیر متوازن'' یا کڈ ہب! ایک دوسرے صاحب کے متعلق اندراج تھا ''جب سے دوسری شادی کی ہے دونوں بیویوں میں لڑائی رہتی ہے۔ مقروض ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

جو لوگ اس سے قبل گورنر سے نہ ملے ہوں ان کے متعلق ضلع سے پورے حالات منگا کر رکھدیئے جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں دل میں بار بار اور بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ گورنر کے دفتر میں میرا بھی ذاتی فائل ضرور ہوگا اسے منگا کر دیکھوں۔ ساتھ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ اپنے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہوگا کئی دن تک خواہش اور احساس کی زبردست کشاکش میں مبتلا رہا۔ آخرکار یہ خیال غالب آیا کہ لکھنے والوں کا یہ منشا نہ تھا کہ میں اپنے بارہ میں ان کے ریماک پڑھوں۔ اس وجہ سے میرا دیکھنا اور بے لاگ کھیل کے اصول (Sportsmanship) کے منافی ہوگا۔ میں نے اپنا فائل منگا کر نہیں دیکھا۔ لیکن آج کہ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں دل میں یہ کمزوری یا خواہش موجود ہے کہ کاش میں دیکھ سکتا۔

میں چھوٹے چھوٹے ڈنر یا لنچ دیتا تھا۔ جو مہمان آتے تھے اور جنھیں مخصوص طور پر میرے پاس جگہ دیجاتی تھی ان کے متعلق بھی ایک نوٹ ''امروزہ'' کے سلپ کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ اس نوٹ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ گورنر کو گفتگو کرنے میں آسانی ہو نوٹ میں یہ درج ہوتا کہ مہمان کو موسیقی، ٹینس، شکار یا اس قسم کی کن باتوں سے دلچسپی ہے۔ سیاسی رجحانات کیا ہیں وغیرہ۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ یاد نہیں رہتا کہ جس خاتون سے آپ گفتگو کر رہے ہیں وہ ٹینس کی شائق ہیں یا ناچ کی۔ اس حالت میں اگر گورنر کی سوجھ بوجھ کام نہ دے تو ظاہر ہے غریب اسٹاف یا آفس کی یادداشت کس کام کی۔

یوپی میں کسی ہندوستانی کا گورنر ہونا ان دنوں ایسی بات تھی جس کا احساس

صوبہ میں عام تھا۔ اس سے قبل صرف صوبہ بہار میں لارڈ سہنا ہندوستانی گورنر ہوئے۔
ہندوستانیوں کو اس سے تفریح اور تقویت ہوتی تھی کہ انھیں کا ہم قوم حکمراں ہے اور
انگریز افسران اس کے زیر فرماں ہیں، باہر نکلتا تو اکثر لوگ محبت اور مسرت کی نظر سے
دیکھتے تھے۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا تھا اور ذرا دیر کہیں کھڑا ہو جاتا تو گردو پیش مجمع اکھٹا
ہو جاتا۔ اور ہر شخص اپنے اپنے طور پر مسرت اور عقیدت کا اظہار کرتا۔ گورنری کچھ اب
اتنی یاد نہیں ہے جتنی وہ شادکامی جو اس زمانہ میں میرے دوستوں بزرگوں اور مخلصوں
کی دل میں موجزن تھی۔

تہنیت کے پیام:

مجھے عزیز اور خوش رکھنے والوں کی تعداد یوں بھی میرے قابو سے باہر ہے،
پھر قومی احساس کے باعث تہنیت کے تار اور خطوط کا سیلاب امنڈ آیا۔ بے شمار ایسے
دوستوں اور عزیزوں کے مبارکباد کے خطوط آئے جن کو میں جانتا تک نہ تھا۔ ایسے
پیامات خواہ وہ قومی جذبات کے تحت ہوں یا ذاتی تعلقات کی بناء پر میرے واسطے
باعث تشکر تھے اور ہمیشہ موجب تفاخر رہیں گے۔ لیکن میرے محسوسات قدرے مختلف
اور کچھ عجیب قسم کے تھے۔ مجھے یہ خیال ہوتا تھا "کیا کسی شے کا حصول جس کی بنیاد کسی
دوسرے شخص کی ناگہانی موت پر رکھی گئی ہو حقیقی کامیابی کہی جا سکتی ہے۔ یہ کیسا ستم تھا
کہ ایک حادثہ سے ایک جگہ تو خانہ بربادی ہو اور دوسری جگہ خانہ آرائی۔ سر الگزینڈر کی
موت اور اپنی گورنری میں جو رشتہ مجھے نظر آتا تھا وہ میرے لئے تکلیف دہ تھا۔ ممکن
ہے اس کا ایک سبب یہ رہا ہوں کہ سر الگزینڈر سے میرے تعلقات بڑے ہی خوشگوار
تھے اور میں ان کو بہت ہی عزیز رکھتا تھا۔ میرے سامنے سوال یہ تھا کہ ان پیامات کے
جواب کس طرح دیئے جائیں جو اخلاق و مروّت سے بھی دور نہ ہوں اور میرے
محسوسات کو بھی ٹھیس نہ لگے۔ یہ مرحلہ بھی کسی نہ کسی طرح طے ہوا اور سرکاری
معمولات کے لیل و نہار حسب معمول کروٹیں لینے لگے۔

کے،سی،آئی،ای۔K.C.I.E.:

مجھے تین جون کو K.C.I.E. کا خطاب ملا۔ سر الگزینڈر بہت خوش تھے۔ مجھے اس کی اور زیادہ خوشی تھی کہ میری رفیقۂ حیات اب لیڈی کہلائیں گی۔ انھیں مسرت ہوگی۔ انھیں خوش دیکھنا میری تمنا کا پورا ہونا تھا۔

لارڈ اروِن (وائسرائے) کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے گورنروں کو ہر پندرہ روز بعد خط لکھتے تھے۔ یہ خط وکتابت ایسی پیچیدگیوں کے سلجھانے میں جو پورے ہندوستان پر اثر انداز ہوتی ہوں بہت مفید ثابت ہوتی تھی۔ ان ہفتوں میں یہ خط وکتابت زیادہ تر سائمن کمیشن سے متعلق رہی۔ مثلاً وائسرائے نے مجھے ۵ر جولائی کو لکھا کہ سر جون سائمن کے اس اعلان کا اثر کہ وہ شہادت بصیغۂ راز بھی لیں تمہارے صوبہ پر کیا ہوا۔ مدراس میں لارڈ گوشن کا خیال تھا کہ جسٹس پارٹی اس اعلان سے مطمئن ہے۔

میں نے جواباً لکھا کہ بصیغۂ راز شہادت لینے کا اثر مخالفین سائمن کمیشن پر تو ہو نہیں سکتا۔ ان کی مخالفت تو قائم ہی رہے گی۔ البتہ جو تعاون کے حامی ہیں وہ ضرور اسے پسند کریں گے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ آیندہ اجلاس کونسل ایک ایسی کمیٹی بنانے کی قوی امید ہے جو سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرے۔ میں تقریباً ہر خط میں وائسرائے کو اسی طرف متوجہ کرتا تھا کہ مستقل گورنر کا اعلان جلد از جلد کیا جائے۔ وہ ہر بار اظہار تاسف کرتے تھے کہ گورنر کے اعلان میں تاخیر ہو رہی تھی۔ آخر کار میں نے ۲۲ر جولائی کو انھیں مطلع کیا کہ ۷ ادسمبر کو کونسل کا اجلاس ہوگا۔ مستقل گورنر کے تقرر کے اعلان کا انتظار زیادہ دنوں تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے جواب میں وائسرائے نے لکھا کہ بادشاہ نے سر مالکم ہیلی کا تقرر منظور کر لیا ہے، جس کا عنقریب اعلان ہوگا۔

دو تین روز کے بعد میں لنچ سے فارغ ہو کر پلنگ پر کمرے میں لیٹا تھا کہ چپراسی نے ایک خط دیا۔ میں نے پڑھا تو اس میں سر مالکم نے لکھا تھا کہ وہ ۹ر اگست کو الٰہ آباد میں آ کر چارج لیں گے۔ میں کیا کہوں مجھے اس خبر سے کتنی طمانیت پہنچی۔ ایک تو ہوم ممبری کے ساتھ گورنری کے کام کا بار بہت زیادہ تھا، دوسرے جن غمناک

حالات میں گورنر ہوا تھا ان کی وجہ سے طبیعت کا انبساط مفقود ہو گیا تھا۔ اس زمانہ کا گورنر آئینی حکمراں نہ ہوتا تھا بلکہ تقریباً خود مختار ہوتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ حکومت ہند اور وزیر ہند مرکزی صیغوں میں اسے حکم دیتے تھے اور بعض ایسے امور میں جو تمام ہندوستان پر اثر انداز ہوں حکومت ہند سے مشورہ کرنا پڑتا تھا۔ نیز حکومت ہند کو مداخلت کا بھی حق تھا لیکن ایسی مداخلت بہت ہی کم ہوتی ہے۔ روزانہ کے کاموں کی کلیتہً ذمہ داری خاص کر غیر منتقلہ صیغوں کی تمام تر گورنر ہی کے سر تھی۔ مجھے اس ذمہ داری کا بڑا خیال رہتا تھا جو کبھی کبھی تردد کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔

یوں تو ہر محکمہ کے متعلق مفروضہ نظریہ یہی ہے کہ وہ ایک شہری کی خوشحالی کے واسطے کام کر رہا ہے، لیکن بالراست ایک شہری کو اس سے تعلق نہیں کہ حکومت نے کن ممالک سے دوستی کے عہدنامہ کیے کتنی دور مار توپیں تیار ہوئیں یا کتنے بڑے جہاز بنائے گئے۔ ایک شہری سب سے پہلی ضرورت ملک میں قیام امن اسے یقین کامل ہونا چاہئے کہ اگر وہ عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹائے گا تو اسے انصاف ضرور نصیب ہوگا۔ بیمار ہو جائے گا تو علاج کے ذرائع میسّر ہوں گے۔ ان تمام امور کا انصرام صوبہ کی حکومت کے ذمہ ہے اور اس کا جواب وہ اس زمانہ میں گورنر تھا۔

علاوہ بریں مجھے یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ یو پی میں پہلی بار ہندوستانی گورنر ہوا تھا۔ میری ناکامی بڑی رسوائی کا موجب ہوگی اور کہا جائے گا کہ ہندوستانی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

سر مالکم ہیلی کی یہ تجویز کہ وہ الٰہ آباد میں چارج لیں گے ہم لوگوں پر شاق تھی۔ موسم کی سختی میں یکا یک نینی تال چھوڑ کر الٰہ آباد پہنچنا کسی کو گوارا نہ تھا۔ مگر یہ فیصلہ سر مالکم کے انداز طبیعت کے عین مطابق تھا۔ وہ شوکت و حشم اور ایسے رسوم و قواعد کے بڑے دلدادہ تھے جن کو انگریزی میں فورمیلٹیز کہتے ہیں۔

ہم لوگ ۸/ اگست کو الٰہ آباد پہنچے۔

یہاں پہنچ کر مجھے ایک نیا خلجان شروع ہوا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں میرا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا تھا کہ جب کبھی الٰہ آباد جاتا تو پنڈت موتی لال جی آنجہانی سے

ضرور ملتا۔ لیکن اب یہ دشواری تھی کہ پنڈت جی حکومت برطانیہ کی مخالفت پارٹی کے سردار، میں صوبہ میں تاج برطانیہ کا نمائندہ اس تضاد میں توازن کی صورت کیسے نکلے۔ اگر اس بار پنڈت جی کے ہاں نہ جاؤں تو آئین وفا سے دور جاؤں تو آئین حکومت سے بعید۔

۹ر اگست کی دوپہر میں ہم لوگ (الٰہ آباد اسٹیشن پہنچے۔ گرمی اور حبس کا یہ حال کہ حواس مختل ہوئے جا رہے تھے۔ ہیلی صاحب کو لے کر گورنمنٹ ہاؤس آیا۔ دفتر کے کمرہ میں چارج دے کر سبکدوش ہو گیا۔

شام کو سر جگدیش پرشاد اور میں حسب معمول پنڈت موتی لال جی کے ہاں پہنچے۔ چائے پی، ان کی نکتہ آفرینی، خوش گفتاری اور دلنوازی کے مزے اٹھائے اور شب کی گاڑی سے ہم لوگ نینی تال آ گئے۔

سر مالکم ہیلی ان آئی سی ایس افسروں میں سے تھے جو ملازمت کے سلسلہ میں ہندوستان نہ بھی آئے ہوتے تو بھی برطانیہ میں بلند ترین مقام حاصل کرتے بڑے اچھے مقرر تھے۔ نہایت جامع اور پر مغز نوٹ لکھتے تھے دشوار اور الجھے ہوئے مسائل کا اتنا صاف تجزیہ کرتے تھے جس کی مثال میری نظر سے نہیں گزری۔ دور تک کی سوچتے تھے اور غیر معمولی فراست کے حامل تھے۔ اصل اور نوع میں امتیاز کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ زمانہ کا رنگ خوب سمجھتے تھے۔ زمانہ سے لڑنے کے بجائے زمانہ سے کام نکالنا جانتے تھے۔ نہایت خلیق اور مہمان نواز تھے طبعاً بڑے شہنشاہیت پسند تھے لیکن اس کا اظہار وقت و زمانہ کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ اپنی غیر معمولی قابلیت کا انھیں احساس تھا کہ کم لوگ ایسے تھے جن کی قابلیت کے وہ قائل تھے لارڈ کرزن کے بڑے مداح تھے۔ مزاحیہ تقاریر کرتے تو سامعین ہنسی سے بیتاب ہو جاتے تھے۔ قواعد کے بڑے پابند، دنیا سازی خوب آتی تھی۔ آزادی کی تحریک کو قلباً برا جانتے تھے لیکن اس کا اظہار خاص ہی صورتوں میں ہوتا تھا۔ ان کی غیر معمولی قابلیت ابتدا ہی سے مسلم ہو چکی تھی چنانچہ ملازمت کا بڑا حصہ ان اہم ذمہ داریوں کے عہدوں پر گذارا جنھیں دوسرے افسران ترقی کا آخری زینہ سمجھتے تھے اور بڑے ہی خوش نصیب ہوئے تو پنشن کے قریب ان پر فائز ہوتے تھے۔ ان کی دماغی قابلیت کے سبھی دل سے

معترف تھے۔ لیکن بٹلر اور مڈی مین کی طرح دلوں پر ان کا اثر نہ تھا۔

دہلی میں چیف کمشنر ہوئے، حکومتِ ہند میں ہوم ممبر اور فنانس ممبر رہے پنجاب اور یوپی میں گورنر رہے۔ گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں جوائنٹ پارلیمینٹری کمیٹی کے موقع پر وزیر ہند کے دست راست تھے۔ لارڈ ارون ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ ملازمت سے الگ ہونے پر لارڈ ہوئے۔

لیڈی ہیلی آنجہانی کا دل بچوں کی طرح معصوم تھا۔ رنگ و نسل کا امتیاز ان کی مجلس میں مطلقاً نہ تھا۔ جب کبھی میری بیوی سے ملتیں تو گلے لگا کر ملتیں۔ جب سے ان کی لڑکی کا شملہ میں انتقال ہوا ان کا دماغی توازن کچھ بگڑ گیا تھا۔ اور اس کا کبھی کبھی اظہار ہو جاتا تھا۔

نینی تال واپس آ کر پھر وہی دفتری کام شروع ہو گئے پہلے دن جب میں فائل لے کر سر مالکم ہیلی کے پاس گیا تو حسب عادت مسائل و مقدمات کا خلاصہ زبانی بیان کر کے ان سے احکامات نافذ کرنے کے لیے پیش کیا۔ لیکن انھوں نے ہر فائل کے متعلق یہی کہا کہ "مہربانی کر کے چھوڑ جایئے" اخلاق اتنا برتا کہ بجائے دفتر کے دروازہ کے گورنمنٹ ہاؤس کی مہتابی تک چھوڑنے آئے۔ کوئی استفسار صوبہ کے حالات اور معاملات کے متعلق نہیں کیا۔ باوجود اس تمام اخلاق اور ظاہر داری کے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ان کے درمیان ایک ذہنی خلیج حائل ہے جسے عبور کرنے کی کوشش فریقین نہیں کرتے۔ میں نے بھی پیشقدمی نہیں کی۔ تین چار ماہ کے بعد سر مالکم نے یہ طرز بدلا اور میرے خلاصہ بیان کرنے پہ زبانی احکامات دینے لگے وہ آسانی سے کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ گذرنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان وہ رابطہ پیدا ہوا جو سر الگزینڈر کے ساتھ پہلے ہی روز پیدا ہو گیا۔

کونسل کے اجلاس کی تاریخ ۷ ار ستمبر بحیثیت گورنر میں مقرر کر چکا تھا۔ جن مسائل کا سامنا تھا ان میں بعض یہ تھے۔ مثلاً کونسل نئے وزراء کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ یا کونسل کوئی کمیٹی سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کو مقرر کرتی ہے یا نہیں۔ مؤخرالذکر کے متعلق تو تقریباً یقین تھا کہ کمیٹی مقرر ہو جائے گی لیکن اوّل الذکر

کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہوگا۔ سر مالکم کو کمیٹی کے مقرر ہو جانے میں تو دلچسپی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ وزراء کے متعلق انھیں چنداں فکر نہ تھی۔

ممبران کونسل میں ایک تحریک شروع ہوئی جس کے لیڈر سر، جے. پی. سریواستوا تھے۔ یہ سائمن کمیٹی سے تعاون کے موافق تھے۔ مگر جگناتھ بخش سنگھ کے تقرر کے خلاف تھے۔ اس تحریک نے چھ سات ممبروں کو خلاف کر دیا تھا اور راجہ صاحب کے وزارت میں آنے سے چند ممبر مخالف پارٹی سے الگ ہو کر ادھر آ گئے تھے۔ تقریباً اسی قدر ممبر سر جے۔ پی کے تحریک کی بدولت راجہ جگناتھ بخش سنگھ کی مخالفت کے لئے مخالف پارٹی کے ساتھ رائے دینے کو تیار تھا۔

راجہ جگناتھ سنگھ پر غیر اعتمادی کا ووٹ:

آخر کار کونسل کا اجلاس شروع ہوا۔ پہلے روز تو بعض متوفیان پر اظہار افسوس کیا گیا۔ سر الگزینڈر کے متعلق ہر پارٹی نے پرخلوص دلی جذبات کے ساتھ اظہار الم کیا۔

دوسرے روز فنانس ممبر اس کمیٹی کے تقرر کی تحریک پیش کرنے والے تھے جو اس صوبہ کی طرف سے سائمن کمیشن کے ساتھ شرکت عمل کرے۔

سورا جسٹ اور دوسرے مخالف قائدین کو یہ معلوم تھا کہ ان کی اکثریت نہیں ہے، چنانچہ مسٹر چنتا منی اور پنڈت گوبند بلب پنتھ نے تحریک کے پیش ہونے سے قبل ہی ایک ایک اور معہ اپنی پارٹی کے ہاؤس سے چلے گئے۔

مسٹر چنتا منی کی تقریر مختصر تھی۔ لیکن ہر لفظ سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ ان کی تقریر کے آخری الفاظ یہ تھے "درحقیقت یہ ایک چال ہے۔ اس کے متعلق میں اس حکومت سے وہی کہوں گا جو سر، ہنری کیمبل بنیر مین نے مسٹر بالفوڑ کی حکومت سے کہا تھا، چالیں، چالیں، تم چالوں پر زندہ ہو۔ اپنی چالوں ہی سے تباہ ہوئے۔

مخالف پارٹی کے ممبر موجود نہ تھے، کمیٹی کا تقرر ہو گیا۔ لیکن اصلی حملہ جو راجہ جگناتھ بخش سنگھ کے خلاف تھا۔ وہ مسٹر چنتا منی کی تحریک پر ۲۲ ستمبر کو آیا۔

اس روز کونسل میں بہت ہی سخت تقاریر ہوئیں اور ممبروں کو مخالف جانب سے توڑ کر اپنی طرف لانے کی انتہائی کوشش کی گئی پورے ہاؤس میں ایک سنسنی پھیلی

ہوئی تھی۔ تقاریر کیا ہوئیں اور جوابات کیا دیئے یہ تو روئیداد جلسہ میں موجود ہے۔ لیکن رائے شماری کا وقت جب قریب آیا تو مسٹر چنتامنی کی پارٹی کے ایک ممبر نے پریسڈنٹ (اسپیکر) سے کہا کہ "چیف سکریٹری (سر جگدیش پرشاد) نے ہماری پارٹی کے ایک ممبر کو مقفل و محبوس کر رکھا ہے۔" اسپیکر نے کہا کہ یہ "تو ایک اہم الزام ہے۔ فنانس ممبران اس پر کچھ کہیں گے۔" مسٹر لیمبرٹ نے پورے معاملہ سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسپیکر نے یہ کہہ کر اسے ختم کردیا کہ ہاؤس سے باہر مجھے کوئی ایسا اختیار حاصل نہیں ہے کہ ممبر کو یہاں لاسکوں۔

پھر یہ سوال اٹھایا گیا کہ جس وزیر پر بے اعتمادی کا اظہار کیا جا رہا ہے کیا اس کو بھی رائے دینے کا حق ہے۔

اسپیکر نے کہا کہ "قانوناً ایسے حق حاصل ہے لیکن یہ ان کے اختیار تمیزی پر ہے کہ وہ اس موقع پر رائے دیں یا نہ دیں۔"

جوں ہی رائے شماری کے اعلان کی گھنٹی بجی (سر) جگدیش پرشاد مسٹر گووند نرائن کو لے کر داخل ہوئے۔ اس پر بڑا شور و غل مچا مسٹر چنتامنی نے کہا کہ چیف سکریٹری اپنی حراست میں ممبر کو لائے ہیں۔ آخر کار ممبر متعلقہ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں اپنی رضامندی سے حکومت کے ساتھ رائے دے رہا ہوں۔ کچھ اور شور و شغب کے بعد رائے شماری ہوئی تو ہر دو جانب ستاون، ستاون رائے ہوئیں۔ اب اسپیکر کی رائے پر فیصلہ ٹھہرا اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے کہ چوں کہ گورنمنٹ کی موافقت میں جو رائے آئی ان میں انھیں وزیر متعلقہ کی رائے بھی شامل ہے لہٰذا میں اپنی رائے حکومت کے خلاف دیتا ہوں۔ اس طرح راجہ جگناتھ بخش سنگھ کی وزارت کا خاتمہ ہوگیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ راجہ صاحب کا اتنی سختی سے سائمن کمیشن کی مخالفت کرنے کے بعد موافق ہوجانا اور وزارت قبول کرلینا۔ ایسی صورت تھی کہ جس نے ان کی پوزیشن کو دوسروں کی نظروں میں کمزور کردیا تھا۔ لیکن انکی اس شکست میں ان کے عام طور پر ہر دل عزیز نہ ہونے کو بھی دخل تھا۔ اکثر اوقات بھلائی، برائی اور نیکی، بدی میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بات بظاہر انوکھی معلوم ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگ کبھی

کبھی بھلائی اور برائی کی حد فاصل کو محسوس نہیں کرتے اور دھوکا کھاتے ہیں۔ ہر جنیل اپنے آپ کو نجی سمجھا کرتا ہے۔ یہ تو صرف زمانہ ہی بتا سکتا ہے کہ اصلیت کیا تھی۔ راجہ صاحب بھی بعض ایسی ہی غلطیوں کا شکار تھے بہر حال راجہ صاحب کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا اور راجہ کشن پال سنگھ وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔

مجھے سر سیتا رام کے اس فعل سے اختلاف تھا، میرے خیال میں ان کی رائے وزیر کی موافقت میں ہونا چاہئے تھی۔ اسپیکر کا اپنی رائے ڈال کر وزارت کا عزل و نصب کرنا میری رائے میں درست نہیں ہے۔ صورت حال یہ تھی کہ کونسل نے اس سوال پر کہ جگناتھ بخش سنگھ وزیر رہیں یا نہ رہیں کوئی صاف فیصلہ نہیں دیا ہر دو جانب مساوی رائے تھیں تو اسپیکر کو چاہئے تھا کہ وہ اپنی رائے سے صورت کو علیٰ حالیہ قائم، رکھتے اور کونسل کو اپنی صاف رائے دینے کے دوسرے مواقع موجود تھے۔ مثلاً موازنہ کا پاس نہ کرنا۔ یا پھر چھ ماہ کے بعد ایسی ہی قرارداد دلانا۔ لیکن اسپیکر نے یہ رائے دے کر کونسل کا منہ ہمیشہ کے واسطے بند کر دیا۔

دوسرے ممالک میں ایسے اہم معاملات کی ذمہ داری کہ جہاں وزیر کے تقرر یا تنزل کا سوال ہو کوئی اسپیکر اپنے اوپر نہ لے گا۔

مجھے ایک قصہ یاد آ گیا۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر شاید ۲۸ء ہی کا ذکر ہے۔ میں نینی تال میں تھا۔ میرے ایک دوست ملنے آئے۔ میں نے یوں ہی باتوں میں کہا ''خدا آپ کو بیٹا دے جو ریاست کا وارث ہو۔'' انھوں نے اس کا جواب مجوب اور دل گرفتہ ہو کر کچھ اس انداز سے دیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ ان کے تعلقات اپنی بیوی سے اس طرح کے نہیں جو میری توقع پوری ہو سکے، میں متحیر رہ گیا۔ ان کی بیوی نہایت درجہ نفاست پسند پاکیزہ شمائل اور ستودہ خصائل خاتون تھیں۔ حسب دستور میں نے علاج وغیرہ کی طرف توجہ دلائی تو معلوم ہوا کہ انھیں مطلقاً کوئی مرض نہ تھا۔ صرف بیوی سے بے رغبتی ہو گئی تھی۔ میں اور زیادہ متعجب ہوا۔ مزید استفسار کے بعد یہ پتہ چلا کہ یہ ایک نفسیاتی کیفیت کے شکار تھے نہ کہ کسی مرض کے۔ بات یہ نکلی کہ ان کا مرجع التفات ہمیشہ سے کثیف اور رذیل طبقہ رہا جس نے ان کی دماغی مرکز خواہشات کو کچھ اس

طرح ماؤف کر دیا تھا کہ عطر، پھلیل، ریشمی پردہ، زرتار ملبوس، رنگنی و رعنائی اور اس قسم کی دوسری نفاستیں و لطافتیں بجائے محرک بننے کے ان کو مرعوب کر دیتی تھیں اور خواہشات بجائے برانگیختہ ہونے کے بجھ جاتی تھیں۔ کچھ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ یکایک میرے دل میں ایک بات آئی میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی نیز خواب گاہ کی تزئین و آرائش میں تبدیلی کریں، ممکن ہے نفسیاتی کیفیت بدل جائے اور رفتہ رفتہ وہ اپنی رفیقۂ حیات سے مانوس ہو کر ان وظائف زناشوئی پر قادر ہو جائیں جن سے وہ محروم ہو گئے تھے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ دونوں کی زندگی اولاد کی برکت سے معمور اور محبت و موانست کی خوشبو سے معطر ہو گئی۔ اس معاملہ میں ان کی بیوی نے پورا تعاون نہ کیا ہوتا تو یہ نتیجہ ہرگز برآمد نہ ہوتا۔

ایک واقعہ:

بات بھی کہاں سے جا پہنچتی ہے اسی زمانہ کی بات ہے۔ میرے پاس سیاہ بلیوں کا ایک جوڑا تھا۔ بلی نے چار سیاہ بچے دیئے تھے، عام طور پر نر، بچوں کی پرورش میں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ لیکن یہ بلا اپنی مادین کے ساتھ بچوں کی پرورش کرتا تھا اور جب بلی کہیں چلی جاتی تو خود بچوں کے پاس بیٹھا رہتا۔ ایک روز خان صاحب لیاقت خاں بیر پور سے آرہے تھے جنگل میں جنگلی بلی کا انھیں ایک چھوٹا بچہ ملا۔ یہ اسے لیتے آئے ذرا سا بچہ تھا۔ کتھئی رنگ پیٹ کے قریب ہلکا ہو کر زردی مائل تھا ان اطراف میں جنگلی بلیوں کا عموماً یہی رنگ ہوتا ہے، میں نے اس بچہ کو اپنی بلیوں کے نذر کیا اور ان دونوں نے اسے اپنے بچوں میں بے تکلف شامل کر لیا۔ زمانہ گذرتا گیا اور یہ سال بھر کا ہو گیا آدمیوں سے وحشت اور بدمزاجی اس میں ضرور تھی لیکن میری بلی کو یہ بچہ اپنے بچوں سے کہیں زیادہ عزیز تھا اور ہر وقت ساتھ رہتا تھا یہ بچہ خود بھی مادین بلی تھی۔ دوسری سال میری بلی نے بچے دیئے تو اس کا تمام بچوں کو سیاہ بالوں کے ساتھ ساتھ بیس یا پچیس فیصدی ایسے بال تھے جو بالکل اس جنگلی بچہ کے ہم رنگ تھے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ بچہ خود مادین تھا میں تو کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ جنگلی بچہ ہر وقت بلی کے پاس رہتا تھا اور اسے اس بچہ سے گہرا انس تھا۔ پیٹ کے بچوں نے اس کے بالوں کا

رنگ اختیار کرلیا۔ اب ڈاکٹر یا ماہرین نفسیات کچھ بھی کہیں۔ میرے نزدیک تو پرانہ نظریہ بے بنیاد نہیں کہ جو کچھ ماں کے پیش نظر رہتا ہے اس کا اثر جنین پر ضرور پڑتا ہے۔

راجہ کوشل پال سنگھ:

ہاں تو راجہ جگناتھ بخش سنگھ کے استعفیٰ تک پہنچ کر میں خیالات کی رو میں بہہ گیا۔ راجہ صاحب کے بعد قرعۂ فال راجہ کوشل پال سنگھ کے نام پڑا اور یہ وزیر مقرر ہو گئے۔ راجہ کوشل پال سنگھ ایم اے۔ ایل ایل بی ہیں۔ نوٹ اچھے لکھتے ہیں۔ اپنا مطلب وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ خلط مبحث نہیں ہوتا بظاہر اتنے ذہین نظر نہیں آتے جتنے کے واقعی ہیں۔ ان کی عمر بھر کی پالیسی یہ تھی کہ حکمراں طبقہ کے ساتھ بہر حال اشتراک عمل کیا جائے۔ سر مالکم ہیلی کی نظروں میں کھپ گئے۔ راجہ صاحب کی زائد ضرورت فروتنی ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں حائل رہی۔ انگریزوں سے گفتگو کرنے میں ان کا انداز ولب ولہجہ تکلیف دہ حد تک فدویانہ ہوتا۔ خود اپنے ہی سکریٹری سے دوران گفتگو میں "لیس سر" سے تخاطب کرتے تھے میں نے اس پر تمھی کبھی متوجہ بھی کیا تو وہی "لیس سر" کہہ دیتے۔ تقریباً دو برس وزیر رہے۔ الہٰ آباد ہائی کورٹ نے ۳۱ء کے آخر میں ان کے متعلق ایک فیصلہ میں کچھ ایسی باتیں لکھیں کہ گورنر کو انھیں سبکدوش کرنا پڑا۔

لارڈ ارون:

لارڈ ارون اس زمانہ میں وائسرائے تھے۔ ان کا دعوت نامہ گورنری کا چارج دینے پر مجھے ملا۔ جس میں شملہ آ کر مجھے مہمان بننے کی دعوت دی تھی۔ میں شملہ جا کر ان کا مہمان ہوا میں قلباً جتنا ان سے متاثر ہوا شاید کسی انگریز سے کبھی نہیں ہوا وہ اپنے مہمان سے خصوصی تعلقات برتتے تھے ان کی صحبت میں سچائی اور بے ریائی اتنی واضح طور پر محسوس ہوتی تھی کہ یہ بات ذہن میں کبھی نہ آتی کہ دغل فصل بھی کوئی چیز ہے۔ بڑی پاکیزہ سیرت اور اعلیٰ کردار کے انسان تھے۔ ان کی شرافتِ طبع کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ترکِ تعاون کے بعد ان میں اور مہاتما جی میں مصالحت ہو گئی تو میں ایک روز ان سے ملنے گیا وہ دریافت کرنے لگے کہ اس مصالحت کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے میں نے کہا کہ آپ نے اس مصالحت کے بعد انگلستان کو دنیا کی نظر میں بہت بلند

کر دیا۔ خوش ہوکر بولے اس تحریک کو دبا نا ممکن تھا لیکن میں اس کا قائل نہیں کہ ویرانے کا نام امن وسکون رکھا جائے۔

تین روز ان کا مہمان رہا صوبہ کے متعلق اشخاص اور سیاسی جماعتوں کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوئی لبرل پارٹی کے متعلق گفتگو آئی تو ہے ایک فقرہ جو شاید ڈزریلی نے لبرل انگلش پارٹی کے متعلق کہا تھا یاد آ گیا۔ میں نے اسے دہرایا۔ "یہ ایک ایسی جنس ہے جو نہ اپنے اسلاف پر فخر کر سکتے ہیں اور نہ آیندہ ترقی نسل کی امید" اس فقرہ کو میں نے لطیفہ ہی کے طور پر دہرادیا تھا لیکن میں اس کا یقیناً قائل ہوں کہ اس پارٹی میں بڑے اچھے دماغ اور قابلیت کے لوگ تھے اور ہیں جنھیں اپنے ملک سے سچی محبت رہی اور ان میں بعض ایسی شخصیتیں ہیں جو کسی ملک میں کسی سیاسی حالت کے لئے باعث فخر ہوتے، مثلاً سر تیج بہادر، سری نواس شاستری سر چمن لال ستلواو، سر سی۔ وائی۔ چنتامنی ان کا خلوص ان کی قابلیت اور ان کے وسعت نظر ہر حال اور ہر زمانہ میں مسلم رہی۔

برج کا کھیل:

مجھے برج کھیلنے کا نہ شوق ہے اور نہ یہ مجھے آتا ہے۔ شملہ کے زمانہ قیام میں پتہ چلا کہ اس کھیل میں مجھ سے بڑھ چڑھ کر نیاز مند موجود ہیں۔ انمیں ایک لارڈ ارون بھی تھے۔

برج کے متعلق میری قطعی رائے ہے کہ جس کو اچھی طرح نہ آتا ہو اسے شرط لگا کر کبھی نہ کھیلنا چاہیئے ورنہ نقصان مایہ شماتت ہمسایہ دونوں سے واسطہ پڑتا ہے، نقصان، یہ تو ظاہر ہے مگر بسا اوقات شماتت ہمسایہ نہایت درجہ تکلیف دہ بنجاتی ہے اور خواہ مخواہ دلوں میں کدورت آجاتی ہے یہاں ایک بات ضرور کہدینا چاہتا ہوں کھیل میں انسان کی طبیعت کا اصلی رنگ ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس اور اس قسم کے دوسرے تفریحی ورزشی کھیلوں کا سب سے بڑا نفع یہ ہے کہ ہم میں کھیل کی اسپرٹ پیدا ہوجاتی ہے یعنی کامیابی اور ناکامیابی مقصود نہیں ہوتی بلکہ دونوں حالتوں میں دماغی توازن اور عالی ظرفی کو ہاتھ سے نہ دینا ہوتا ہے ایسے کھیلنے والے دیکھے گئے ہیں جو جیتتے ہیں تو آپے میں نہیں رہتے۔ اور ہارتے ہیں جب بھی آپے میں نہیں۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے بے ایمانی پر اتر آتے ہیں ایسے لوگ کبھی قابل

تعریف نہیں سمجھے گئے میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو ہارتے ہوتے ہیں لیکن جیتنے والے سے کہیں زیادہ معزز اور پروقار نظر آتے ہیں۔

لکھنؤ میں سائمن کمیشن:

اب سائمن کمیشن کی آمد آمد شروع ہوئی ہندوستان کی مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے عقائد اور پروگرام سے متعلق تیاریاں شروع کیں جو تعاون کرنا چاہتے تھے وہ یادداشت اور میمورنڈم لکھنے میں مشغول ہوئے اور جو ترک تعاون کے قائل تھے وہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے۔ ۲۲-۲۰ء کی تحریک ترکِ تعاون کے بعد سیاسی گرمی بازار بہت کم ہوگئی تھی اس سال اس میں نئی زندگی پیدا ہوگئی ارباب کمیشن جہاں کہیں جاتے ان کے خلاف مظاہرے ہوتے پنجاب میں مظاہرہ ہوا لالہ لاجپت رائے کے چوٹ آئی جس کے کچھ روز بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ کہیں کہیں مثلاً خود کانپور میں ایک دو لکڑی یا اینٹ بھی ممبران کمیشن کے موٹر کو لگی سپرنٹنڈ پولیس کو اینٹ لگی۔ شاید ۳۰ نومبر کو ممبرانِ کمیشن لکھنؤ آئے میں اور چیف سکریٹری سر جگدیش دونوں متفکر تھے ایک تو اراکین کمیشن کی حفاظت ضروری ساتھ ساتھ یہ خیال کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی افسوس ناک صورت اپنے ان اہل ملک کے ساتھ پیدا ہوجائے کہ جو ان سے تعاون کے قائل نہ تھے۔ بائیکاٹ کرنے والوں کی پالیسی تشدد کے خلاف ضرور تھی لیکن جہاں ہزاروں لاکھوں کا ہجوم ہو وہاں یہ امید کہ ہر ایک عدم تشدد کے بنیادی اصولوں کا قائل رہے گا۔ محال نہیں تو بیحد مشکل ضرور ہے گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ پرامن مظاہرہ کی اجازت ہو لیکن اتنے فاصلہ سے کہ ممبران کمیشن کی حفاظت میں خلل نہ آئے میرا خیال ہے کہ حکومت کا فیصلہ اصولاً غلط نہ تھا۔

ممبران کمیشن کی حفاظت حکومت کا اولین فرض تھا۔ یہ اصول صحیح ہے۔ لیکن اس پر عمل اس طرح کیا گیا کہ مطمئن ہونا تو درکنار میں اچھا خاصا پریشان ہوگیا یہ موقع تفصیلات پر بحث کرنے کا نہیں ہے۔ کونسل میں اس پر جو مباحثہ ہوا وہ تفصیلات سے پر ہے۔ ایک روز پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت گوبند بلب پنتھ دونوں ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے کہ پولیس نے انھیں روکا اسی سلسلے میں کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آگئے ان

دونوں کی حیثیت اور شخصیت ایسی تھی کہ کوئی بھی ممبر گورنمنٹ اس کے لئے یہ باتیں تفکر و تکلیف کا موجب ہوتیں پنڈت جواہر لال نہرو کے متعلق کچھ نہ کہنا ہے سب کچھ کہہ ڈالنا ہے ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے کہ جو کامل طور پر منظر عام پر نہ آیا ہو۔

مہاتما گاندھی کا ہندوستان کے ہزار ہا معتقدین اور مقلدین میں سے صرف پنڈت جی کو اپنا جانشین منتخب کرنا کوئی معمولی فضیلت نہیں ہے ان کے گھرانے کی روایات ان کی تعلیم، ملک کے واسطے ان کی قربانیاں ان کی غیر معمولی سیاسی اور اخلاقی جرأت ان کا اعلیٰ کردار ان کی رواداری اور وسعت نظر ان کا علمی تبحر وہ صفات اور شہرتیں ہیں جو ہندوستان سے باہر بھی دور دور تک پہنچ چکی ہیں مجھے تو ذاتی طور پر پنڈت جی سے نیاز حاصل ہے۔ ان کے بزرگوں سے بھی عقیدت تھی۔ پنتھ جی آج صوبے کے وزیر اعظم ہیں اپنے اور ان کے تعلقات کے بارے میں کہیں لکھ چکا ہوں چنانچہ پنڈت جی اور پنتھ جی کو اس سلسلے میں جو کچھ پیش آیا اس سے میں بڑا بے قرار رہا ذہن و دماغ پر عجیب اضطراب تھا۔

سید عین الدین:

ان ہی دنوں ایک روز میں صبح بہت سویرے کوٹھی پر بیٹھا تھا کہ سید عین الدین صاحب جو لکھنؤ میں سٹی مجسٹریٹ تھے آئے میں نے ان سے کہا کہ مقامی حکام جس طرح اپنے اختیارات تمیزی کو کام میں لا رہے تھے وہ بہت غیر موزوں اور نا مناسب تھا۔ میرے الفاظ تقریباً یہ تھے ”کبھی اس کا خیال بھی کیا ہے کہ یہ لوگ ہمارے ہی ہیں اور ہمیں میں سے ہیں“ سید عین الدین صاحب نے اتفاق کیا اور آیندہ اس کا خیال بھی رکھا۔

سید عین الدین صاحب سے میں بخوبی واقف ہوں۔ میرے ساتھ انھوں نے برسوں کام کیا ہے اسے ان کی خوبی کہیے یا کمزوری کہ یہ جب کسی کام کو کرنا چاہتے ہیں تو بڑی تندہی اور بے جگری سے کرتے ہیں اکثر لوگ انھیں کانگریس کا دشمن خیال کرتے ہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اگر آج وہ ملازمت میں ہوتے تو اتنے ہی شد و مد کے ساتھ حکومت کانگریس کا ساتھ دیتے جیسا کہ برٹش گورنمنٹ کا ساتھ دیا تھا۔ ان

کے سچے دوست اور لائق افسر ہونے میں کلام نہیں۔

اسی زمانہ میں دو بار مہاراجہ صاحب محمود آباد مرحوم و مغفور کو بھی شکایت کا موقع ملا کہ انکے گھر پر بھی پولیس نے نگرانی کی میرے لئے یہ امر کچھ کم تکلیف دہ نہ تھا۔

پتنگوں کے ذریعہ مظاہرہ:

اسی سلسلے میں ایک روز تعلقہ دارانِ اودھ نے سائمن کمیشن کو قیصر باغ میں ایٹ ہوم دیا پولیس نے مہاراجہ محمود آباد کے گھر کے گرد کانسٹبل کھڑے کر دیئے، دوسرے روز جب مجھے معلوم ہوا تو پولیس سے باز پرس کی پولیس کا یہ خیال تھا کہ سائمن کمیشن کے خلاف کسی مظاہرہ کا مشورہ وہاں ہو رہا تھا لیکن میں پولیس کے اس بیان کو باور کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ میں نے خود جا کر مہاراجہ مرحوم سے معافی مانگی۔

تعلقہ داروں کی پارٹی کے روز مظاہرہ کرنے والوں کی طرف سے ایک جدت دکھائی گئی مظاہرہ کی یہ ترکیب صرف اہالیانِ لکھنؤ کی ذہن میں آ سکتی تھی۔ ہوا کا رخ دیکھ کر مختلف مقامات سے پتنگیں اڑائی گئیں، جن پر جلی قلم سے انگریزی میں لکھا تھا ''سائمن لوٹ جاؤ'' ان پتنگوں کو غوطہ دے کر دھاگے کو اس طرح توڑا کہ وہ پتنگ ٹھیک وہاں آ کر گرے جہاں سائمن کمیشن کا ''ایٹ ہوم'' ہو رہا تھا، پولیس کے لوگ دوڑ دوڑ کر انھیں پکڑ رہے تھے۔ اراکین پولیس کی خفت اور خفگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی! لیکن ہم سے بہتوں نے لکھنؤ والوں کی اس جدت طرازی پر جی کھولکر داد دی۔ برسوں اس کا پتہ نہ چلا کہ اس جدت کا سہرا کس کے سر تھا ۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن دہلی آیا تو حیدر آباد کی طرف سے میں سر والٹر مونکٹن کے ہمراہ دلی آیا۔ ایک روز چودھری خلیق الزماں صاحب کو میں نے شب کے کھانے پر دعوت دی میں فیروز شاہ روڈ ۲۰ نمبر پر ٹھہرا ہوا تھا۔ دورانِ گفتگو میں خلیق صاحب سے معلوم ہوا کہ مہاراجہ مرحوم قیصر باغ کے مکان میں یہ مشورہ ہوا تھا کہ اس طرح پتنگ اڑا کر مظاہرہ کیا جائے۔ اٹھارہ سال بعد میں نے اس لطیفہ کی داد خلیق صاحب کو دی. سائمن کمیشن آیا اور چلا گیا۔ لیکن ان واقعات کی آواز بازگشت ۱۳ رد سمبر کو کونسل میں سنی گئی مسٹر چنتامنی نے ''التواء کونسل'' کی تحریک پیش کی۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور تحریک پر مباحثہ ہوا۔

چونکہ میں خود پولیس کے رویہ سے مطمئن نہ تھا میں نے اپنی اکثریت سے اس تحریک کو ناکام بنانے کی کوشش نہیں کی۔ میں یہ بھی کرسکتا تھا کہ اپنی آخری تقریر کو تھوڑی سی طوالت دیدیتا اور دو گھنٹے ختم ہوجاتے قواعد کے مطابق یہ سمجھا جاتا کہ تحریک پر مباحثہ ہوکر رہ گیا جسے انگریزی اصطلاح میں Talked Out کہتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی دوسری تقریر کے حق کو استعمال نہیں کیا اور پولیس کے رویہ کے متعلق کونسل نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

میں نے اپنی تقریر میں ان واقعات پر افسوس کرتے ہوئے مہاراج سے معافی مانگی۔ شروع سرما میں حسبِ دستور گورنمنٹ الہٰ آباد گئی۔

جارج لیمبرٹ کی گورنری:

ایک روز صبح کو سر مالکم ہیلی نے ملاقات میں مجھ سے کہا کہ وہ چار ماہ کی رخصت پر ولایت جانا چاہتے ہیں اور ان کی جگہ لیمبرٹ کام کریں گے۔ جس کا امروز فردا میں اعلان ہوگا۔ یوں تو میں اس زمانے کی گورنری کی ذمہ داریوں پر کچھ فریفتہ نہ تھا۔ لیکن یہ خیال کہ پونے دو ماہ تک میں نے گورنری کے جو فرائض ادا کئے وہ قابل اطمینان نہ تھے یا لارڈ ارون نے میری گورنری کے کام کے متعلق جو ستائشی کلمات لکھے تھے وہ محض رسمی تھے ان تمام باتوں نے مجھے ایک ذہنی خلجان میں مبتلا کردیا تھا۔ گو سر مالکم نے اپنی طویل تقریر میں جو اسی روز مجھ سے کی تھی اسے بار بار دہرایا کہ اس کا ہرگز یہ منشاء نہیں کہ میرے کام سے وزیر ہند یا وائسرائے مطمئن نہ تھے پھر بھی یہ چیز میرے دل میں کھٹک رہی تھی سر مالکم کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ ''لیمبرٹ آپ سے عمر میں زیادہ اور ملازمت میں پرانے ہیں پھر مخصوص صوبوں میں گورنر کا تقرر سروس کے لوگوں کے لئے رزرو ہوتا ہے۔ اگر لیمبرٹ کو اسوقت موقع نہ دیا گیا تو آیندہ انھیں مستقل گورنر ہونے کا موقع نہ ملے گا۔

سیاسی لیڈروں کے لئے منسٹر یا کونسلر کے عہدے ہیں۔'' وغیرہ لارڈ ارون نے اپنی ملاقات میں جو وجہ بیان کی وہ یہ تھی ''اگر آپ کو دوبارہ گورنر کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ مستقل گورنر کیوں نہ ہوں۔ لیکن آئندہ آئین میں اقلیتوں کا تحفظ کلیتاً

گورنر کے ہاتھ میں ہوگا۔ ایسی حالت میں خود اقلیت کے ایک ممبر کو یہ حق تفویض کرنا اکثریت کی بے اطمینانی کا باعث ہوگا۔'' وائسرائے کے بیان میں جو منطق ہے، مجھے اس سے انکار نہیں مجھے یقین ہے کہ لارڈ ارون نے جو کچھ کیا وہ بدانست خود ایمانداری سے کیا مگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی ہندوستانی گورنری کے واسطے موزوں نہیں اور ہوا بھی تو اس سے کوئی نہ کوئی فریق ضرور غیر مطمئن رہے گا۔ رہا سر مالکم کا استدلال کہ سروس کا آدمی ہو تو سچ یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی یہ پالیسی تھی اور اسی وجہ سے پہلے کانگریس حکومت کے زمانہ میں جب ایک چیف سیکریٹری کو اس لئے صوبہ کا گورنر بنایا گیا تو کانگریسی حکومتوں کے احتجاج پر ایک دوسرا انگریز کسی اور صوبہ سے بھیج دیا گیا اور مقامی ہندوستانیوں میں سے کسی کو گورنری کا موقع نہ دیا گیا۔ لیمبرٹ کے اور میرے ایسے مخلصانہ تعلقات تھے کہ یہ تو میری خواہش ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ باہر سے کوئی انگریز آئے لیکن مجھے یہ برابر محسوس ہوتا رہا کہ اس طرح میری گورنری کے کام پر حرف آتا ہے۔

ایک طرف تو میں اس خلجان میں مبتلا تھا دوسری طرف ہماری پارٹی کے ممبروں نے آکر اس پر زور دیا کہ میں استعفیٰ نہ دوں کونسل میں زمیندار پارٹی کی یہ رائے اس وجہ سے تھی کہ انھیں اندیشہ تھا کہ شاید کوئی غیر زمیندار ہوم ممبر ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں مجھے ایک مرحوم دوست کی یاد آگئی مولوی سید طفیل احمد صاحب جو کونسل کے ممبر تھے گو یہ کانگریس پارٹی کے ممبر نہ تھے لیکن نہایت آزاد خیال اور قوم پرست بزرگ تھے بڑے مخلص متدین اور منکسر مزاج ان کے صاحبزادہ محمد احمد کاظمی صاحب آجکل مرکزی اسمبلی کے ممبر ہیں مرحوم مجھ پر بہت عنایت فرماتے تھے ایک روز تشریف لائے اور کہنے لگے کہ سنتا ہوں کہ آپ استعفیٰ دے رہے ہیں میں نے عرض کیا فیصلہ تو نہیں کیا ہے لیکن ایسا خیال ضرور کر رہا ہوں فرمایا استعفیٰ کے بعد کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کوئی خاص ارادہ نہیں ہے۔ فرمایا پھر استعفیٰ دینا بالکل عبث ہے۔ میں یہی کہنے آیا ہوں اگر استعفیٰ دیتے ہو تو پھر کانگریس میں شریک ہو کر ملک کی خدمت کرو اور اگر یہ ارادہ نہیں تو یہاں جو کچھ کام کر رہے ہو وہ بھی بہت مفید ہے بے کار رہنا بے معنی بات ہے مرحوم میری پارٹی کے ممبر نہ تھے لیکن ان کی یہ بزرگانہ بات میرے دل میں اتر گئی۔

راحت میاں سلمہٗ کا نکاح:

میری خانگی زندگی بہت ہی پر سکون اور پر مسرت تھی۔ میری نئی رفیقۂ حیات کو میرے گھر کی مالکہ بنے پانچ سال ہوئے تھے اس زمانہ میں انھوں نے اپنی طبعیت کو میرے مزاج کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا تھا کہ خیالات، گفتار اور طرز زندگی میں من وتو کی تفریق باقی نہیں رہی تھی اپنی بہن کے بچوں سے ان کا سلوک حقیقی ماں کا سا تھا۔ بچوں کو بھی ان سے غیر معمول شیفتگی تھی کچھ عرصہ سے میرے چچا نواب بہادر عبدالسمیع خاں مرحوم اور میری چچی کی یہ خواہش تھی کہ راحت سلمہٗ کا نکاح سلمٰی سلمہا سے کیا جائے اور میری بڑی لڑکی ہاجرہ کا نکاح سلمٰی کے بھائی عبد السلام سے ہو جائے۔ عزیزی عبدالسلام اور سلمٰی نواب بہادر عبدالسمیع خاں کے صاحبزادے اور صاحبزادی ہیں یوں تو ایسی چھوٹی عمر اور اس زمانہ میں شادی کر دینا میرے لیے بڑے پس وپیش کی بات تھی راحت سلمہٗ کے رشتہ کے متعلق میرا اندیشہ پس وپیش کی حد سے بھی آگے بڑھ گیا تھا جس نے مجھے مجبور کیا اور میں نے اپنی رفیقۂ حیات سے یہ خواہش کی کہ وہ اس اندیشہ کو میرے چچا مرحوم اور اپنے بھائی نواب بہادر عبدالسمیع خاں کے کانوں تک پہنچادیں، میری رائے یہ تھی کہ بجائے راحت کے سلمٰی کا رشتہ فرحت سے کیا جائے انھیں خود میری اس رائے سے اتفاق نہ تھا مگر میری رائے کا اس زمانہ میں انھیں اتنا احترام تھا کہ میرے اندیشہ کا اظہار بے کم وکاست کر دیا۔ چچا مرحوم مغفور نے اپنی رائے نہ بدلی اور چہارشنبہ ۲ رجنوری ۲۹ء کو راحت کا نکاح ہو گیا۔ اس روز کے میرے روزنامچہ میں حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"آج راحت کا نکاح سلمٰی سے ہوا خدا راس لائے مجھے اس میں بہت پس و پیش تھا اور ہے مگر مرضی مولا جو خدا چاہے۔"

اندھیرے میں جست:

شادی چاہے پرانے دستور کے مطابق کلیتاً والدین کی تجویز سے ہو چاہے نئی تہذیب کے زیر اثر اپنا اپنا انتخاب ہو یا والدین کی مرضی کے ساتھ خود بھی انتخاب کا موقع دیا گیا۔ بہر حال "اندھیرے میں جست ہے" جسے بھونڈے الفاظ میں جوا بھی

کہہ سکتے ہیں۔ ایسا جوا جس میں پوری زندگی کے تمام نشیب و فراز کی بازی لگائی جاتی ہے۔ نوعمروں کا یہ خیال ہے کہ اگر شادی میں جانبین کو کامل آزادیٔ انتخاب ہو تو شادی کلیتہً کامیاب ہوتی ہے یہ بات صحیح نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہر نوجوان مرد و عورت اس بات کو شادی کرنے سے پہلے سوچ سمجھ لے تو کچھ اور نہیں تو یہ نفع ضرور ہوگا کہ اس کی مایوسی اس کے لئے کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو قابل برداشت نہ رہے گی۔ انتخاب زوج کی جہاں جتنی آزادی ہے۔ وہیں طلاق اور فسخ نکاح کے حادثات بھی زیادہ ہیں۔ ہندوستان کے مقابلہ میں یورپ میں زیادہ طلاق کی کثرت ہے، روس کا حال مجھے نہیں معلوم یورپ سے کہیں زیادہ امریکہ میں طلاق ہوتی ہیں ان ممالک میں شادی سے قبل کئی مہینوں اکثر برسوں کورٹ شپ رہتی ہے اور خوب دیکھ پرکھ کر شادی کرتے ہیں۔ پھر نا کامیاب شادیوں کی اتنی کثرت کیوں ہے؟ جہاں شادی کلیتاً ماں باپ کی تجویز سے ہوتی ہے وہاں اس قسم کے حادثات سب سے کم پیش آتے ہیں۔

کشش جنسی سے کون انکار کر سکتا ہے اس کشش سے زیادہ قوی کشش شاید ہی کوئی اور ہوتی ہو، نوجوانوں میں یہ کشش قدرتی طور پر بہت زیادہ ہوتی ہے اور ہونا بھی چاہئے لیکن جہاں انسان کی اس حیوانی کشش کو بعض انسانی فضیلتوں سے قابو میں رکھنا پڑتا ہے تو جوان یہیں چوک جاتا ہے وہ قوت توالد و تناسل کے سامنے انسانی زندگی کے تمام دوسرے بڑے اور برتر مطالبات کو بھول جاتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے اور یہی سبب ہے کہ جہاں اور جب جنسی تشفی ہوئی اور طبیعت اکتائی ہنگامی تقاضوں کے ماتحت مرد یا عورت کا پالینا نسبتاً آسان ہے مشکل اور مبارک تو ایسے کا پانا ہوتا ہے جو زندگی کی مکروہات و مصائب میں ساتھ دے اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک مرد یا عورت یہ نہ سمجھ لے کہ ایک دوسرے سے لذت یابی اتنی اہم اور قیمتی نہیں ہے جتنا ایک دوسرے کی رفاقت اعتماد اور دل سوزی، بات یہ کتنی ہی دقیانوسی کیوں نہ ہو لیکن اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ مذہب، اخلاق اور روایات کا ازدواجی زندگی کے بنانے میں بڑا دخل ہوتا ہے، آرٹسٹ شعراء یا مصوّر اکثر اس دنیا میں یوں بھی ناکام و نامراد رہ جاتے ہیں کہاں کا شاعرانہ یا مصورانہ مطمح نظر اس درجہ بلند ہوتا ہے کہ

عملی دنیا میں نہ اس کی مثال ملتی ہے اور نہ وہ کبھی میسر آسکتی ہے۔

اکثر یہ ٹریجڈی بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ شوہر اور بیوی فرداً فرداً اپنی جگہ پر بڑی اچھی صفات کے حامل ہوتے ہیں لیکن ان کی ازدواجی زندگی ناساز گار ہوتی ہے۔ یہ صورت بالعموم وہاں ہوتی ہے جہاں عورت اور مرد دونوں (بالخصوص اول الذکر) دیر سے شادی کرتے ہیں جب ان کی انفرادیت میں لوچ لچک باقی نہیں رہتی۔ بہترین ازدواجی زندگی وہ ہوتی ہے جہاں فریقین ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کس نے کس کو دیا یا بلکہ کس نے کس کو اپنایا۔ ممکن ہے نوجوان میری ان باتوں پر ہنسیں لیکن جب اس پر غور کریں گے اور اس کو برتیں گے تو مجھے اس درجہ مضحکہ خیز نہ پائیں گے۔

نایک لڑکیوں کی حفاظت کا قانون:

نایک لڑکیوں کے متعلق بل جس کا ذکر اوپر آچکا ہے سلکٹ کمیٹی سے نکل کر اپنی آخری منزل پر پھر کونسل میں آیا گو اس قانون کے خلاف ایک طبقہ کے محسوسات تند و تلخ تھے لیکن اسکی کھلم کھلا مخالفت کی جراءت کسی کو نہ تھی۔ خود نایکوں کی طرف سے ایک محضر نامہ بہت سے دستخطوں سے موصول ہوا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ مذہباً اس کا جواز ہے۔ اس سلسلے میں دیوداسیوں کا بھی ذکر تھا اور حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر بھی درج تھا۔

در کوئی نیک نامی ما را گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

کونسل کے اندر فقط مسٹر بیدار (سوراجسٹ) نے کسی حد تک بچ بچ کر مخالفت کی، تقاریر میں مسٹر بیدار اور ان کے لیڈر پنڈت گوبند بلب پنتھ صاحب میں کچھ فقرہ بازی بھی ہوئی لیکن قانون پاس ہو گیا۔

میرے خیال میں یہ قانون سماجی سدھار کے سلسلے میں ایک اچھا اقدام تھا جس کی ایک عرصہ سے ضرورت تھی پنڈت گوبند بلب پنتھ نے بھی آخری تقریر میں میرے مساعی کی کچھ داد دی۔

میں ۱۶؍ جنوری کو بلرام پور گیا۔ مہاراجہ کی بہن کی شادی تھی۔ مہاراجہ تری پورہ دولہا تھے بڑی دھوم دھام رہی۔

سر راس مسعود کا تقرر وائس چانسلری پر:

رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ کے بعد سر ضیاء الدین مرحوم تو یونیورسٹی سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور عارضی طور پر نواب سر مزمل اللہ خاں بہ حیثیت وائس چانسلر کام کر رہے تھے۔ ممبرانِ کورٹ اور دیگر بہی خوان یونیورسٹی کو یہ فکر تھی کہ کس کو اس کام کے واسطے مستقل طور پر منتخب کیا جائے نواب صاحب مرحوم نے کورٹ کا یہ رجحان دیکھا تو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا کورٹ نے متفقہ طور پر سر راس مسعود مرحوم کا انتخاب کیا انھیں اختیارات کامل دیئے گئے اور ایکزیکیٹو کونسل کو ختم کر دیا گیا میرے اس تاریخ کے روزنامچہ کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

سنیچر ۹؍فروری ''سر راس مسعود صاحب کا تقرر ہوا ہے گو خود مجھے اس میں شبہ ہے کہ وہ کامیاب ثابت ہوں گے مگر مجبوری کہ کوئی اور بھی ملتا۔ خدا خیر کرے''

سر راس مسعود مرحوم میں بہت سی ایسی صفات تھیں کہ انھیں کامیاب ہونا چاہئے تھا علاوہ علمی تبحر اور تعلیمی تجربہ کے وہ بانی درسگاہ کے پوتے تھے اس کا ممبرانِ کورٹ پر خصوصاً اور مسلمانِ ہند پر عموماً بڑا اثر تھا پھر حکومت ہند پوری طور پر پشت پناہی کو تیار تھی ہز ہائی نس بھوپال خود اس جلسہ میں آئے تھے اور ان کے انتخاب کے حامی تھے کورٹ کے اراکین پر ہز ہائی نس کا بے حد اثر تھا۔ ہز ہائی نس اپنی والدہ محترمہ خلد آشیاں کے انتقال کے بعد چانسلر ہوئے تھے ان حالات میں سر راس مسعود کی ناکامی کا خیال آنا عجیب سا تھا لیکن یہاں کی گتھیاں کچھ ایسی تھیں جن کے سلجھانے کے لئے بڑے صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔ سر راس مسعود مرحوم بہت جلد مایوس و ملول ہو جاتے تھے ''بے محل اعتراض سنئے اور بے چوں و چرا کام کئے جایئے'' یہ ان سے ہو نہ سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال بعد وہ بھی کنارہ کش ہو گئے۔''

نواب زادہ لیاقت علی خاں:

میں ۱۲ر فروری کو کرنال پہنچا اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کا مہمان ہوا۔ نواب زادہ صاحب اب پاکستان کے وزیر اعظم ہیں۔ نہیں معلوم ان کی ریاست کا کیا حشر ہوا ان دنوں ضلع کرنال اور مظفر نگر میں ان کی بہت اچھی زمینداری تھی۔ نواب زادہ کونسل کے ممبر تھے اور ڈپٹی پریسیڈینٹ بھی ہو گئے تھے۔ بیرسٹر ہیں، تقریر کرتے ہیں سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے، بہت خوددار اور مہمان نواز ہیں۔

کونسل میں ان کا گروپ الگ رہتا تھا، لیکن اکثر میری تائید کرتے تھے، اس زمانہ میں جداگانہ انتخاب وغیرہ کے مخالف تھے کونسل میں قصبات کی کمیٹیوں کے متعلق بحث کرتے ہوئے مخلوط انتخاب کی تائید میں بڑی مدلل تقریر کی تھی جس کے جستہ جستہ اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

''میرے خیال میں کوئی اقلیت حقیقتاً جداگانہ انتخاب کو اپنے حقوق کا محافظ خیال نہیں کرسکتی میرے خیال میں اقلیت کے واسطے یہ نقصان دہ چیز جداگانہ انتخاب کی وجہ سے ہر شخص کا نقطۂ نظر تفریق پر مبنی ہو جاتا ہے ہندو ہندو کے واسطے مسلمان مسلمان کے واسطے عیسائی عیسائی کے واسطے اور سکھ سکھ کے واسطے''!

کرنال میں نواب زادہ صاحب نے ایسی مہمان نوازی کی کہ اب تک شکریہ کے ساتھ مجھے یاد ہے۔ نواب زادہ صاحب کے ساتھ کروک چھیتر اور تھانیسر بھی گیا تھا۔ شیخ چلی کے مزار پر بھی گیا تھا جو کرنال کے قریب ہے۔

سر الگزینڈر کا مدفن:

ایک روز نینی تال میں سوکھا تال کی طرف ٹہلنے نکل گیا راستہ میں سر الگزینڈر کا مدفن پڑتا تھا۔ قبر دیکھ کر بے اختیار دل امنڈ آیا، کس قدر زندہ دل خوش پوش، خوش مزاج ہنسنے اور ہنسانے والی ہستی صرف مٹی کا ایک ڈھیر تھی، تعجب ہوا کہ کسی نے ان کی قبر بنانے کی فکر نہ کی دوسری بے شمار قبور پر کم از کم پتھر کے تعویذ بھولے ہوؤں کا نام اور پتہ تو بتا رہے ہیں۔ سر الگزینڈر اس سے بھی محروم تھے! میں نے ان کی قبر بنانے کا ارادہ کرلیا۔ اور سر الگزینڈر کی والدہ سے اجازت لے کر تعمیر قبر کا کام

شروع کیا ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

۱۱ فروری کو میں لارڈ ارون سے ملا وہ علی گڑھ میں سر راس مسعود مرحوم کے تقرر اور مجلس انتظامیہ کے تعطل پر مطمئن تھے پھر لمبرٹ کے تقرر پر کچھ معذرت کے الفاظ کہتے رہے۔ ان کی دلیل جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں یہ تھی کہ آیندہ گورنر کے ہاتھ میں اقلیتوں کی حفاظت ہوگی اس لئے اس فرقے کے کسی فرد کا گورنر ہونا مناسب نہ تھا پھر الگزینڈر کی قبر کا نقشہ دیکھتے رہے انھیں آنجہانی سے بڑا تعلق تھا اور تعمیر قبر میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ پھر پوچھنے لگے تم ہیلی کو پسند کرتے ہو۔

میں وہ بہت لائق آدمی ہیں۔

وائسرائے۔ مگر تم کیا پسند کرتے ہو؟

میں۔ وہ گورنر میں سوال دراصل یہ ہے کہ وہ مجھے کیا پسند کرتے ہیں۔

وائسرائے ہیلی تو تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔

سائمن کمیشن کی رپورٹ کے متعلق گفتگو کرتے رہے وہ وزیر ہند کو یہ مشورہ دینا چاہتے تھے کہ پارلیمنٹ کے سامنے ایک بیان دیا جائے جس میں یہ بتایا جائے کہ برٹش گورنمنٹ سائمن کمیشن کی رپورٹ پر کس طرح عمل کرے گی تاکہ ہندوستان میں اس رپورٹ کی مخالفت میں کمی ہو جائے۔ لارڈ ارون کا یہی مشورہ دوسرے سال گول میز کانفرنس کی صورت میں رونما ہوا۔

وزراء کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک:

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں راجہ جگناتھ بخش سنگھ تو وزارت سے سبکدوش ہو گئے لیکن بقیہ وزراء کے خلاف مواد پک رہا تھا اور سرگرمیاں جاری تھیں۔ بجٹ کا اجلاس قریب تھا مخالف پارٹی نے وزراء پر حملے شروع کر دیئے۔ ۱۷ فروری کو پھر تحریک التوائے کونسل، بریلی کے چیئرمین کے تقرر کے خلاف ہوئی، گورنمنٹ کی طرف سے وزیر متعلقہ آخری وقت تک بولتے رہے اور رائے شماری کا موقع نہیں ملا۔

پہلی مارچ کو پنڈت گوبند بلب پنتھ صاحب نے محکمہ تعمیرات کا موازنہ کی صورت میں غیر اعتمادی کا اظہار کیا لیکن رائے شماری نہیں ہوئی آخر کار وزراء کی تنخواہ

کے سلسلہ میں سوراج پارٹی کے لیڈر نے عدم اعتماد کی تحریک صاف طور سے پیش کر دی پنتھ جی نے ایک طویل تقریر میں وزراء پر بڑے سخت حملے کیے گو حکومت جیت گئی لیکن جہاں تک دلائل کا تعلق تھا مخالف جانب کی تقاریر یقیناً بہتر اور زیادہ مدلل تھیں یوں تو اور بھی بہت سے اعتراضات تھے لیکن پنتھ جی کی تقریر کا وہ حصہ جس میں مہاراجہ صاحب محمود آباد مرحوم کے نوٹ اور میرے اور رائے راجیشور بلی کے نوٹ کا اقتباس دیتے ہوئے حملہ کیا تھا وزراء کولا جواب کیے دیتا تھا۔ پنتھ جی نے کہا۔

حضور والا! پانچ سال ہوئے مہاراجہ محمود آباد نے ہوم ممبر کی حیثیت سے مڈی مین کمیٹی کو یہ لکھا تھا۔

"میرے خیال میں ایسی مشین کے بنانے میں جو لوگوں کو مطمئن کر سکے اور ایسے طرز حکومت کی بنیاد ڈال سکے جو پبلک اور حکومت دونوں کو مفید ہو، مزید انتظار غلطی ہوگی۔"

میں یہ بھی بتا دوں کہ اس زمانہ کے وزراء آنریبل نواب محمد احمد سعید خاں اور رائے راجیشور بلی نے اپنے مشترکہ نوٹ میں ۲۰ رجون کو کیا کہا۔

"ہمارے خیال میں مرکزی حکومت میں بغیر قانون کے بدلے ہوئے کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے خیال میں ایسی ترقی حکومت خود اختیاری ان کو ایک مناسب وقت میں حاصل کرنے کے واسطے ضروری ہے صوبوں کے متعلق ان لوگوں نے کہا۔

یہ ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتے ہیں کہ صوبہ جات میں دوعملی کا فوراً خاتمہ کیا جائے اور صوبوں کو کامل خودمختاری دی جائے پھر پنتھ جی نے وزراء متعلقہ کے متعلق کہا کہ یہ وزراء نہ صرف دوعملی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ سرکاری نامزدشدہ ممبر بھی رہیں اور مزید برآں ایوانِ اعلیٰ بھی ہو۔

مسٹر چنتامنی کی تقریر بھی بہت زبردست ہوئی لیکن تقسیم آراء کے وقت وزراء کی اکثریت رہی۔ اس بار وزراء کی جانب سے اپنے بچانے میں اور مخالف پارٹی کی طرف سے وزراء کو شکست دینے میں بہت جدوجہد ہوئی۔ انتہا یہ ہے کہ اس کشمکش سے میں اور نواب صاحب باغپت بھی نہ بچ سکے۔

۱۹؍مارچ ۲۹ء کے روزنامچہ میں حسب ذیل عبارت ہے۔

''آج وزراء جیت گئے...... آج صبح متھرا پرشاد (مہرترا) اور وزرائے راجیشور بلی میرے یہاں آئے تھے اور جمشید (نواب صاحب باغپت) کو توڑنے کی کوشش کرتے رہے انھوں نے جمشید سے وعدہ کیا کہ اس کے بعد ہم لوگ تمھیں بہ حیثیت وزیر کے مدد دیں گے اور جب تک یہ کونسل ہے تمہارے خلاف نہ جائیں گے۔ مگر جمشید نے نہایت ہی شرافت سے کہا کہ میں وزیر ہونے کا متمنی نہیں ہوں متھرا پرشاد نے مجھ سے بھی اس کا ذکر کیا لیکن میں نے ان سے یہ کہا کہ ''اگر میں ایسا کروں (تو آپ خود آیندہ کہیں گے کہ ناقابل اعتبار شخص تھا بصورت دیگر کو آپ کو ناگوار ہو مگر آپ میری عزت کریں گے۔''

لارڈ گوشن:

اسی سال ۲۰؍اگست میں نینی تال سے شملہ گیا بھائی جان اور نواب بہادر عبد السمیع خاں بریلی کے اسٹیشن سے ہمسفر ہوئے۔ اس روز میری آنکھ بہت سویرے کھل گئی دھندلی روشنی میں ریل کا ہرے بھرے شاداب جنگلوں سے گذرنا بہت ہی اچھا معلوم ہوا۔ اس طرح کا نظارہ دہرہ دون کے قریب اس سے کہیں زیادہ دلکش ہوتا ہے۔

کالکا سے ریل موٹر کے ذریعہ سمرہل اسٹیشن پر پہنچا۔ مجھے چونکہ وائسرائے کے ہاں ٹھہرنا تھا میں وہیں اتر پڑا۔ بھائی جان اور عبد السمیع خان نسل ہوٹل چلے گئے اس زمانہ میں لارڈ اردن چار ماہ کی رخصت پر گئے تھے اور لارڈ گوشن ان کی بجائے وائسرائے تھے لارڈ گوشن مدراس میں گورنر تھے اور ان ہی دنوں ان کے وزراء اور ایک کونسلر نے استعفیٰ دیدیا تھا میں نے دورانِ گفتگو میں اس کا ذکر کیا کہ آپ نے اپنے وزراء سے کیوں استعفیٰ لیا۔ انکا جواب یہ تھا کہ چیف منسٹر سائمن کمیشن سے تعاون کے موافق تھے اور یہ دو وزراء خلاف تھے۔ لیکن چیف منسٹر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک آئی تو کونسل نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ کونسل دوسرے وزراء پر اعتماد نہ تھا۔ جب میں نے وزراء کے سامنے اس پہلو کو پیش کیا تو انھوں نے استعفیٰ دیدیا، میں نے خود انھیں برطرف نہیں کیا کہ پھر ان کے کونسلر کے استعفیٰ کا ذکر آیا تو کہنے

لگے'' کہ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ صیغۂ تحفظ امن وقانون کو کسی دوسرے ممبر کو دیدوں کونسلر متعلقہ نے اس سے اتفاق کرلیا تھا لیکن انکے بعض دوستوں نے ان کو یہ رائے دی کہ چوں کہ وہ جگہ برہمن کی تھی اس لئے گورنر کو کسی برہمن ہی کو مقرر کرنا ہوگا اور کوئی برہمن اس پر راضی نہ ہوگا کہ اس کونسلر کی جگہ لے لہٰذا اصرار کرنا چاہئے۔ چنانچہ انھوں نے آکر اصرار کیا ''میں نے استعفیٰ منظور کرلیا اور ایک غیر برہمن کو مقرر کردیا۔''

لارڈ گوشن صوبوں میں حکومت خود اختیاری دینے کو تیار تھے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ان کا خیال تھا کہ یوروپین سروس کو ہندوستانی برطرف نہ کریں گے اس واسطے کہ انھیں ایک غیر جانبدار شخص کی ضرورت ہے۔ مجھے اس میں شبہ ہے۔

رنبیر سنگھ جین صاحب نے شام کو ڈے دیکو میں ایک پارٹی دی تھی اس میں شامل ہوا۔ سر میاں محمد شفیع، سر فضل حسین سر بی، ایل متر وغیرہ سے ملا۔ سر میاں محمد شفیع مرحوم اور سر فضل حسین مرحوم میں کچھ چشمک رہتی تھی اور سر میاں محمد شفیع سر فضل حسین کے اکثر شاکی رہتے تھے۔

سر میاں محمد شفیع بڑے ہی خلیق۔ شاہ خرچ اور اچھے دوست تھے۔ مسٹر جناح سے اکثر ان بن سے اختلاف رہتا تھا۔ تقریر اوسط درجہ کی کرتے مگر صاف ہوتی تھی۔ وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ اپنے زمانہ کے اعتبار سے بڑی ترقی کی۔ انکے خاندان کے تمام افراد سے میرے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ سر فضل حسین کی جسمانی صحت اچھی نہ تھی لیکن بہت دور بین اور مآل اندیش دماغ پایا تھا۔ سر جارج شسٹر جو اس زمانہ میں فنانس ممبر تھے مجھ سے ایک بار کہتے تھے کہ ''سر فضل حسین نہ صرف بہت دور تک دیکھ سکتے ہیں بلکہ راستہ جہاں مڑتا ہے اس کے دوسری طرف بھی انکی نگاہ پہنچ جاتی ہے۔''

سر فضل حسین مرحوم:

مجھ سے اور سر فضل حسین مرحوم سے اکثر اختلاف رائے بھی رہا، لیکن میں نے یہ دیکھا کہ جب ایسے اختلافات ہوئے تو اکثر ان کی رائے صحیح نکلی۔ تقریر بہت کم

کرتے تھے اور کرتے بھی تو نہایت مختصر، فائل پر نوٹ بھی بہت مختصر ہوتا تھا، جس میں فقط حکم کے الفاظ ہوتے تھے۔ دلائل نہ ہوتے۔ قدرت نے بڑا رسا ذہن دیا تھا۔ اصل وفرع میں بڑی واضح تفریق کرتے تھے۔ پنجاب میں عرصہ تک منسٹر رہے۔ پھر محکمہ مال گذاری کے کونسلر رہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں کونسلر رہے۔ بڑی زبردست شخصیت کے حامل تھے جب تک پنجاب میں رہے وہاں کے نظم ونسق پر پورے طور پر حاوی رہے۔ جب مرکزی حکومت میں دہلی آئے تو یہاں چھا گئے۔ جب تک زندہ رہے پنجاب میں مسلم لیگ کی ایک نہ چلی۔ ۳۷ء کے انتخاب میں مسلم لیگ کو پنجاب اسمبلی میں شاید ایک ہی نشست مل سکی۔ مسٹر جناح اور ان کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔ دو اتنی طاقتور شخصیتوں میں اتفاق رائے مشکل تھا۔ مجھے اکثر یہ خیال آیا کہ اگر سر فضل حسین کی عمر نے وفا کی ہوتی تو پنجاب کی سیاسی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہے۔ اور پنجاب کے جن نامبارک اور ناگفتہ بہ اثرات نے ہندوستان کو تباہ کیا، بہت ممکن ہے ہندوستان ان سے محفوظ رہتا۔ سر فضل لارڈ ہیلی کے متعلق عجیب رائے رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سر مالکم کے اقوال وافعال موقع ومحل کے لحاظ سے ہوتے تھے۔

جیل کمیٹی:

سارے ملک بالخصوص اس صوبہ میں اس کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ جیل خانوں میں اصلاحات کی جائیں۔ قیدیوں کا غذاء، تعلیم روزانہ کی محنت اچھے چال چلن کے صلہ میں تخفیف سزا وغیرہ بہت سے مسائل تھے جو ترمیم اور اصلاح کے محتاج تھے۔

ستیہ گرہ کی تحریک نے ایک گتھی پیدا کردی، قید خانوں کی عمارتیں، رہن سہن، غذا قواعد، افسران اور ملازمین کی ذہنیت غرض کوئی چیز بھی نئے حالات کی مناسبت سے نہ تھی، وہاں ہر چیز کی بنیاد اس پر تھی کہ سوسائٹی کے بدترین افراد، ڈاکو، چور، اور قاتل آئیں گے اور ایسے لوگوں سے سابقہ ہوگا جو اخلاقی اعتبار سے ننگ انسانیت ہیں۔ ستیہ گرہ کی تحریک نے اس ملک کے نامور اور برگزیدہ اشخاص کو جیل

پہنچادیا۔ سوال یہ تھا کہ ان سے کس طرح عہدہ برہوں اور کس طرح اور کہاں تک اصلاح کی صورت نکالی جائے۔ یہ صیغہ ہنوز غیر متعلقہ صیغہ تھا۔ گورنر کو پورا اختیار اور اقتدار حاصل تھا۔ سر مالکم اس پر راضی تھے کہ ایک کمیٹی بٹھائی جائے۔ یہ صیغہ ہنوز غیر متعلقہ صیغہ تھا۔ گورنر کو پورا اختیار اور اقتدار حاصل تھا۔ سر مالکم اس پر تو راضی تھے کہ ایک کمیٹی بٹھائی جائے جو جیل کے متعلق اصلاحات کی تجاویز پیش کرے لیکن ان میں انھیں بہت پس وپیش تھا کہ اس کمیٹی میں اکثریت غیر سرکاری ممبران کی ہو، جو کونسل کا مطالبہ تھا برٹش سرکاری حلقوں میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اصلاح کے پردہ میں جیل کے انتظامی درو بست میں خلل ڈالنا مدنظر ہو۔ غرض بمشکل تمام میں نے گورنر کو اس پر راضی کیا کہ غیر سرکاری اکثریت کمیٹی میں ہو۔ میرے خواہش یہ تھی کہ کمیٹی ایسے اشخاص کی ہو جو نہ تو کسی سیاسی جماعت کے اعتقادات سے متاثر ہوں نہ دوسری طرف جیل کے حکام کی روایتی نظریہ کے قائل ہوں۔

سر لوئی اسٹوارٹ کو اس کا چیئر مین مقرر کیا گیا۔ جو چیف کورٹ کے چیف جج تھے۔ ممبران میں پنڈت جگت نرائن آنجہانی، حافظ ہدایت حسین مرحوم سی. آئی. ای. کو مقرر کیا گیا۔ پنڈت جی. سی. وائی. چنتامنی کے ساتھ وزیر رہے تھے ان کا اعلیٰ شخص کردار اور راست بازی مسلّم تھی۔ حافظ ہدایت حسین مرحوم بھی بڑے مخلص، صادق القول اور اچھی سیرت کے انسان تھے۔ کونسل میں مخالف پارٹی نے اس کمیٹی کو پسند نہیں کیا۔ لیکن جب اس کی رپورٹ آئی تو انھیں بھی ماننا پڑا کہ رپورٹ بہت اچھی تھی۔ اس رپورٹ میں اصلاحات کی بہت سی تجاویز تھیں۔ ان میں سب سے اہم اور قابل توجہ یہ تھی کہ عام قیدیوں اور سیاسی قیدیوں میں بنیادی فرق تھا۔

برٹش حکومت کے دل میں یہ وسوسہ تھا کہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کیا گیا تو سیاسی قانون شکنی میں اضافہ ہو جائیگا۔ لیکن جس پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ جرائم کی سزا میں فرق قرین انصاف نہ ہوگا۔ اگر دو شخص ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں تو یکساں برتاؤ ہونا چاہئے خاص کر ایسے جرائم میں جہاں تشدد کیا گیا ہو۔ یا مجرم اخلاقی گناہ کا مرتکب ہو۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا تھا کہ

یوروپین اور اینگلو انڈین قیدیوں کے ساتھ مختلف سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب برٹش حلقوں میں اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ چوں کہ یوروپین طبقہ کا طرز معاشرت مختلف ہے اس وجہ سے یہ فرق ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ایسے ہندوستانی ہوں جن کا طرز معاشرت مختلف ہو تو پھر انھیں بھی کیوں نہ اسی اعتبار سے مختلف سطح پر رکھا جائے۔

کمیٹی کی رپورٹ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے ان مسائل پر کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ دوسرے تمام قیدیوں کے علاوہ دو کلاسیں قیدیوں کی اور بنائی جائیں۔ کلاس الف میں فقط وہ قیدی ہوں جو کسی ایسے جرم کے مرتکب نہ ہوئے ہوں جس کے کرنے میں کسی کے ساتھ تشدد برتا گیا ہو یا جہاں اخلاقی لغزش ہوئی ہو اور ان کا طرز معاشرت بھی عام معیار زندگی سے اونچا ہو۔ ان کا کھانا مختلف ہوگا انھیں اخبار اور کتابیں مہیّا کی جائیں گی۔ لکھنے پڑھنے کی چیزیں دی جائیں گی اپنے کپڑے پہن سکیں گے۔ باہر سے بھی کھانا منگا سکیں گے ان کو عام قیدیوں سے علیحدہ رکھا جائے گا۔ ان کے علاوہ ہفتہ وار ملاقات وغیرہ کی دوسری رعایتیں بھی تھیں۔

ب۔ کلاس میں ایسے لوگوں کو رکھا جائے جو بلند طرز معاشرت کے عادی ہوں لیکن جرم ایسا ہو کہ اخلاقی لغزشیں ہوئی ہوں یا کسی پر تشدد کرنے کا الزام عائد ہو ان کا بھی کھانا مختلف تھا لیکن باہر سے کھانا منگانے کی اجازت نہ تھی۔ اخبار اور کتابیں انھیں بھی مل سکتی تھیں، انھیں بھی عام قیدیوں سے الگ رکھنا تجویز کیا گیا تھا۔

ان تجاویز کے ساتھ بہت سی اور تجاویز تھیں جن میں عام طور پر جیل کی اصلاح اور قیدیوں کی زندگی کو بہتر کرنا مقصود تھا یا ایسی مشقتوں کو روکنا جن کو وحشیانہ کہا جا سکتا ہے، مثلاً قیدیوں کا کنوئیں سے پانی کھینچنا، تیل کا کولھو چلانا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس رپورٹ کو کونسل میں پیش کیا تو اس پر دو یا تین روز تک برابر بحث ہوئی اور کونسل نے ان تجاویز کو پسند کر لیا، جہاں تک مجھے یاد ہے، مخالف جماعت کے بعض سربرآوردہ اراکین نے یہ بھی کہا کہ یہ اصلاحات ان کی سعی بلیغ کا نتیجہ تھیں اس لئے کہ عوام الناس حکومت وقت کے سر اس کا سہرا نہ سمجھیں۔ لیکن میں خوش تھا کہ مخالف پارٹی نے بھی ان تجاویز کو پسند کیا اور اپنا بنا لیا۔ حکومت نے اس رپورٹ کی

سفارشات کو مان لیا اور جیل میں ضروری اصلاحات ہو گئیں۔ قانون قاعدے اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی لیکن ان کی تمام تر کامیابی یا ناکامی کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ نافذ کس طرح کیے جاتے ہیں اور نافذ کرنے والے کیسے ہیں۔ اگر قانون کے الفاظ کی پابندی کرتے ہوئے بھی اس کے مقصد کو نظر انداز کر دیا جائے یا اس کے ساتھ بے پروائی برتی جائے تو مقصد کے فوت ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اچھا اور ہمدرد افسر ظالمانہ قانون کو بھی اس طرح فافذ کرتا ہے کہ اس کی سختی اور تلخی بہت کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک غیر ہمدرد شخص ایک اچھے قانون کو بھی ناقابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔

حکومت کی کتر بونت جس طرح چاہے کر لیجیے قدامت پسندی سے حکومت کی الفت جاتے ہی جاتے جاتی ہے۔ شاید نہیں بھی جاتی۔ کل کی حکومت اور آج کی حکومت کے قانون قاعدوں میں کتنی بڑی تبدیلی ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ ان قوانین کو نافذ کرنے والے بھی آسمان سے نہیں اترے ہیں۔ ہمیں آپ جب تھے الا ماشاءاللہ اور ہمیں آپ اب ہیں لیکن اکثر اعمال کی ناسمجھی یا غیر ذمہ داری نے قانون کی خوبیوں کو گھٹا دیا ہے۔ حکومتوں کی پائداری کا جتنا مدار اعمال کی تندہی، دانشمندی اور ہمدردی پر ہوتا ہے اتنا حکومت کے قاعدہ قانون پر نہیں رکھتا یا نہیں رکھ سکتا اس وقت تک حشر معلوم!

پہلی اکتوبر ۲۹ء کے روزنامچہ میں اس کا ذکر ہے کہ میں نے سر مالکم ہیلی سے اس کی خواہش کی کہ مجھے ہوم ممبری کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے سبکدوش کر دیا جائے۔ ۳۰ء میں انتخابات آ رہے تھے اور میں ان میں حصہ لینا چاہتا تھا لیکن انھیں اس سے اتفاق نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انتخابات ۳۱ء میں ہوں گے اور مجھے ۳۱ء کے انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔ اس سے قبل سبکدوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کو یقین تھا کہ کونسل کی عمر میں توسیع ضرور ہو گی۔

لارڈ اروِن سے ملاقات:

۱۳ر نومبر کو میں لارڈ اروِن کے لنچ پر گیا۔ منجملہ اور امور کے وہ اس پر

استفسار کرتے رہے کہ گول میز کانفرنس کی تشکیل کیوں کر ہو۔ میری رائے یہ تھی کہ گول میز کانفرنس میں فیصلے رائے شماری سے نہ ہوں۔ اس لئے ہر مکتبِ خیال کے لوگ وہاں ہوں تو مناسب ہوگا، انھیں اس سے اتفاق تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مختلف خیالات کے لوگ اکٹھا ہوتے ہیں تو اختلاف بڑھ جاتا ہے۔ اور نتیجہ خاطر خواہ نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے لیکن اچھا دستور العمل تو وہی ہوسکتا ہے جو اختلاف کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایسی تعمیر کی بنیاد رکھے جو کم و بیش ہر طبقہ کو مطمئن کر سکے، اطمینان کامل نہ ہو نہ سہی۔ کام چلانے بڑھانے کا موقع تو نکلتا ہے۔

پھر وہ یہ دریافت کرنے لگے لوگوں کا انتخاب گول میز کانفرنس کے لئے کس طرح کیا جائے۔ آیا کونسل اور اسمبلی منتخب کریں یا نامزدگی کا طریقہ اختیار کیا جائے اس میں سب سے آسان اصول تو یہی تھا کہ کونسل اور اسمبلی منتخب کریں لیکن ایک قباحت بھی تھی وہ یہ کہ سوراجسٹ اسمبلی سے باہر چلے گئے تھے۔ اس وقت یہی خیال مناسب سمجھا گیا کہ گو اسمبلی اور کونسل کے خاص خاص خیال کے لوگوں کو اس میں شامل کیا جائے مگر طریقہ نامزدگی ہی کا رہے۔ اور اس کی کوشش کی جائے کہ کانگریس بھی شامل ہو سکے۔

میں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اس زمانہ کی گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبران سیاسی رہنماؤں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ کم از کم ذاتی تعلقات تو دوستانہ ہونے چاہئیں تاکہ وہ اتنا تو کر سکیں کہ جب تک گول میز کانفرنس کوئی تصفیہ نہ کرے کوئی ایسا فعل نہ کیا جائے جو ولایت میں ان قدامت پسند لوگوں کے دلائل کو تقویت پہنچائے جو لارڈ ارون کی اس پالیسی کے مخالف تھے اور جس میں لارڈ ریڈنگ بہت حصہ لے رہے تھے۔ لارڈ ارون کو اس سے اتفاق تھا اور مجھ سے کہا کہ آپ بھی کوشش کیجئے۔

اسی روز میں نے نواب صاحب باغپت کو بھیجا کہ مولانا محمد علی مرحوم کو بلالیں مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی تندرستی بہت خراب ہوگئی تھی۔ گو گفتگو میں اب بھی وہی لطف تھا۔ طوالت بیان بھی لطف داستان بن جاتی تھی۔ صحت کی مسلسل خرابی سے زود حسی بہت بڑھ گئی تھی۔ نہ بنتے دیر لگتی تھی نہ بگڑتے۔ کانگریس سے شکوہ تھا اور ترک

سوالات کے خلاف تھے میں نے ان سے کہا کہ آپ کیوں نہ کانگریس کو اس طرف متوجہ کریں کہ جب تک گول میز کانفرنس ختم نہ ہو جائے کانگریس کوئی اعلان سول نافرمانی یا کامل خود مختاری کا نہ کرے۔ مرحوم اس پر راضی نہ ہوئے۔ لیکن یہ کہا کہ اگر ایسا ہوا تو ان کی کوشش یہ ہوگی کہ مسلمان اس تحریک میں شریک نہ ہوں۔

سائمن کمیشن کی رپورٹ:

اسی زمانہ میں سائمن کمیشن کی رپورٹ شایع ہوئی۔ یہ ایک ضخیم رپورٹ تھی جو دو حصّوں میں شائع کی گئی تھی زبان اور منطق کے اعتبار سے یہ ایک بلند پایہ تصنیف بن گئی تھی۔ واقعات کی ترتیب اور ان سے استدلال بڑی خوبی سے کیا تھا لیکن ہندوستان کے نقطۂ نظر سے اس کی تجاویز ہرگز قابل نہ تھیں۔ کانگریس تو درکنار یہ تجاویز اعتدال پسندوں کو بھی گوارا نہ تھیں۔

رپورٹ میں اس پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا کہ صوبوں میں حکومت خود اختیاری ہو لیکن تجاویز پر نظر ڈالئے تو اس خود مختاری کی وقعت طفل تسلی سے زیادہ نہ تھی اس پر یوپی کی حکومت نے اپنی رائے کا اظہار کیا، مجھے چونکہ حکومت کی رائے سے اکثر جگہ اختلاف تھا۔ اس لئے میں نے اپنا نوٹ علیحدہ مرتب کیا۔ میرے اعتراضات مختصراً حسب ذیل تھے۔

میں نے تمہید میں یہ بیان کیا تھا کہ ملک کی سیاسی جماعتوں میں جو اعتدال پسند لوگ ہیں ان کے نظریہ کے مطابق تجربہ کرنا میرا مقصد ہے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ انتہا پسند حضرات کا تو راضی کرنا ہی ناممکن ہے تو پھر محال کے واسطے کوشش بیکار ہے۔

صوبائی حکومت گورنر کو اختیار دیا گیا تھا کہ حسب ضرورت وہ وزراء کی رائے کو مسترد کر دے۔ میرا اعتراض یہ تھا کہ مونٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات میں تو صرف غیر متعلقہ محکمہ جات کے لئے یہ صورت تھی یعنی گورنر کونسل کی رائے کو مسترد کر سکتا تھا، اب صوبہ جات کی خود مختاری کو اس طرح مسخ یا مجروح کرنا کہاں تک درست تھا اور کونسل کے اختیارات میں گورنر کی یہ مداخلت کہاں تک حق بجانب تھی۔ یہ تو وزراء کی نہیں گورنر کی خود مختاری میں اضافہ ہوا۔

میں نے یہ بھی کہا کہ صورت حال کے یکلخت اور اچانک بدل جانے پر مثلاً صوبے کے امن وامان میں خلل آنے کا اندیشہ ہو یا اقلیتوں کے تحفظ کی ضرورت ہو یا قانون وقت غیر موثر یا ناکام ثابت ہو جائے تو گورنر کو مخصوص اختیارات دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میرے نوٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ خود کانسٹی ٹیوشن (آئین) کا جز ہونا چاہیے۔ گورنر کے ہاتھ میں رکھنا کافی نہ ہوگا وہ حفاظت نہ کر سکے گا اور اس کا یہ بھی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ہندوستانی گورنر نہ ہو کمیشن کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ وزراء میں سرکاری ممبر بھی وزیر ہو سکتے ہیں۔ منشاء یہ تھا کہ ضرورت ہو تو انگریز کو بھی وزارت میں جگہ دی جائے۔ ظاہر ہے یہ تجویز کس درجہ بے معنی اور ناقابل عمل تھی میں نے اس کی مخالفت کی۔ ذمہ دار حکومت کے ہوتے ہوئے کسی سرکاری ممبر کا وزیر ہونا، اصول ذمہ داری کے منافی ہے۔ ایسے وزیر کا وجود وزارت کی قوت کے بجائے کمزوری کا باعث ہوگا۔ مسلمانوں کے متعلق میں نے اس پر زور دیا تھا کہ (آئین) میں اسے لازمی قرار دیا جائے کہ صوبہ کی گورنمنٹ کسی ایک ہی فرقہ کے لوگوں پر مشتمل نہ ہوگی۔ ہر صوبہ کی وزارت میں مسلمان اور ہندو دونوں کا ہونا ضروری ہوگا۔

میں نے اس پر بھی زور دیا کہ ۱۶ء میں جو سمجھوتہ ہوا اس میں مسلمانوں کو ہر جگہ اقلیت میں کر دیا گیا تھا تاکہ جہاں ان کی تعداد کم ہے وہاں انھیں کچھ زیادہ مل جائے۔ یہ حالت اس وقت تک قابل عمل تھی جب تک سرکاری ممبر تھے۔ یہ تیسری پارٹی ناظر فدار تھی لیکن اب اکثریت کو اقلیت بنانا کہیں بھی مناسب نہ ہوگا۔ البتہ اس کی تلافی ہندوؤں کے لئے صوبہ سرحد میں کرنی پڑے گی۔

زمینداروں کے متعلق میں نے اس تجویز کی مخالفت کی تھی کہ ان کی خاص نشستیں ختم کر دی جائیں۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ مستقبل قریب میں زمیندار عام نشستوں سے انتخاب میں نہ آ سکیں گے۔ میری یہ بھی رائے تھی کہ ایوان اعلیٰ بھی ضرور بنایا جائے۔

میں جانتا ہوں کہ اکثر ہمارے رہنما ایوان اعلیٰ کو غیر ضروری یا رجعت پسندی کی علامت سمجھتے ہیں اس سلسلہ میں میں اپنے ایک نوٹ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔

"یہ تو کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت پسند بھی نہیں کہتا کہ اکثریت ہمیشہ حق

بجانب ہوتی ہے اور جو فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے وہ ہمیشہ بہترین فیصلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ زمانہ حاضرہ کے مفکرین و مدبرین جن کا خیال ہے کہ دارالعوام پر ایک بریک، ہونا چاہئے جو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یوان اعلیٰ ہونا ضروری ہے۔ فرانس، آسٹریلیا، امریکہ، انگلستان جیسے جمہوریت پسند ممالک میں بھی ایوان اعلیٰ ہے جو دار العوام کی ناہمواریوں کو ہموار کرتا رہتا ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس کا بھی جائزہ لیا جائے کہ منتخب شدہ ممبران کو اسمبلی میں کس درجہ آزادی رائے حاصل ہے۔

جمہوریت کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو آزاد رائے دینے کا حق اور موقع ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ممبروں پر پارٹی کی ایسی سخت گرفت ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنی سیاسی زندگی کو تباہ کرنے کو تیار نہ ہوں تو پارٹی کے حکم کے خلاف شمہ برابر ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔

ہندوستان کے جمہوری اداروں کا مجھے دونوں حیثیتوں سے تجربہ ہے یعنی مخالف پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی اور ممبر گورنمنٹ کی حیثیت سے بھی۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ منتخب شدہ ممبروں پر بڑا زور ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے حلقہٴ انتخاب کے اگر گھل مل کے کام نکالیں اور انھیں ملازمتیں دلائیں۔ وہ اپنے رائے دہندوں کو راضی رکھنے کے لئے اپنی پارٹی کے وزراء پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں وہی قباحتیں رونما ہوگئی ہیں جن سے دوسرے جمہوریت پسند ملکوں کو دور ہو جانا پڑا۔ اس کا علاج ان ملکوں نے یہ کیا کہ سینٹ کے ممبر ساری عمر کے واسطے مقرر کیے۔ چنانچہ فرانس میں سینٹ کا اس طرح آخری ممبر ۱۹۱۸ء میں فوت ہوا۔ اکثر جگہ سینٹ کے ممبر نو برس کے واسطے مقرر کیے گئے۔ امریکہ میں ان کی مدت چھ برس رکھی ہے۔ مگر کانگریس کے ممبروں کی عمر فقط دو برس ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے جمہوریت پسند ممالک نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی کہ ایک ایوان اعلیٰ ضرور بنایا جائے جو جنتا کے وقتی ہیجان یا سیاسی ہواؤں کی عارضی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر کام کر سکے۔

مرکزی حکومت کی تشکیل اور اختیارات کے متعلق بھی مجھے سائمن کمیشن کی رائے سے اختلاف تھا۔ وہ بالراست انتخاب کے خلاف تھے اور بالواسطہ انتخاب چاہتے

تھے۔ میری رائے میں انتخاب بالراست مناسب تھا۔ وہ مرکز میں ذمہ دار حکومت کے خلاف تھے۔ میرے خیال میں ذمہ داری کا عنصر پیدا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

میری رائے تھی کہ صوبہ جات کی ملازمتوں کا الگ الگ ہونا تو اپنی جگہ پر ہے۔ اس کے علاوہ ملازمتوں کا ایک صیغہ پورے ہندوستان کا بھی ہے لیکن اس کا تعلق تمام و کمال بجائے لندن کے دہلی سے ہو اور وزیر ہند کی اس میں کوئی مداخلت نہ ہو تنزل ترقی، انتخاب تمام تر حکومت ہندوستان کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔

دو خط:

اسی زمانے کے بعض پرانے کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا کہ میری نظر دو خطوط پر پڑی جو سی. وائی. چنتامنی آنجہانی اور پنڈت گوبند بلبھ پنت صاحب نے لکھے تھے۔

میں ان دنوں یو۔پی گورنمنٹ کا ہوم ممبر تھا۔ سی. وائی. چنتامنی مخالف پارٹی کے لیڈر تھے اور پنڈت جی سوراج پارٹی کے راہنما۔ دونوں خطوط ایک بار پھر پڑھ گیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ سوچتا ہوں جب کیا تھا اب کیا ہے لیکن اس سوچنے میں دھرا کیا ہے۔ اب تو اس کی فکر ہونا چاہئے کہ کیا ہوگا۔ کیسے ہوتے ہیں وہ لوگ جو اختلافات کو اپنی زندگی کا جزو لاینفک بنا دیتے ہیں! جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیاسی اختلاف کے مٹنے کا موقع بھی آ جاتا ہے۔ تو ذاتی کدورتیں راستے میں پہاڑ بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اب تک تو میں نے بھی یہی دیکھا کہ اختلافات مٹنے پر بھی غبار باقی رہتا ہے اور ایک دل و یک جہت ہو کر کام کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتا ہے۔ میں تو کچھ اس کا قائل ہو گیا ہوں کہ ہم سب اس وقت تک جمہوری نظام کو کامیابی سے چلانے کے قابل نہ ہوں گے جب تک یہ نہ سیکھیں کہ پارلیمنٹ کے اندر کتنا ہی شدید اختلاف کیوں نہ ہوا سکے باہر گلے ملنے میں وہ اختلاف حائل نہ ہو۔ یہ دونوں خطوط ان حضرات کی وسعت نظر، اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کا ثبوت ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کو ذاتی مخالفت اور مخاصمت کی صورت کبھی اختیار نہ کرنی چاہئے جس سے اختلاف رائے ہو۔ خود اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھئے اور اس کے محسوسات، اس کے جذبات، اور اس کے عقائد اور کیفیات ذہنی و دماغی کو

سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ اس نے کیسے ماحول میں تربیت پائی ہے مختلف فیہ مسئلہ اس پر کس درجہ اثر انداز ہوتا ہے اور کس درجہ آپ پر۔ اس اصول کی بنا پر اپنے اور دوسرے محسوسات اور عقائد کو جانچا جائے تو بہت سی تلخیاں اور غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کبھی وہ اپنے آپ کو اس نظر سے بھی دیکھیں جس نظر سے دوسرے ہم کو دیکھتے ہیں غرور خود پسندی اور پاسداری سے کوئی متنفس پاک نہیں ہوتا۔ لیکن اسے اپنی کمزوری کا بہانہ نہ بنانا چاہئے بلکہ دوسروں کی کمزوری کی ہمدردی سے سمجھنے کا وسیلہ بنانا چاہئے۔ زندگی کی اکثر ناکامیاں، اور بڑی دردناک اور ہولناک کامیابیاں اکثر اس وقت واقع ہوتی ہیں جب ہم نے اپنی کمزوری کو اپنی طاقت سمجھا۔

اس سلسلے میں ایک قصہ یاد آ گیا۔ ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے میری عارضی وزارت کے ختم ہونے پر کانگریس کی وزارت پہلی بار یو پی میں بنی۔ صوبائی مسلم لیگ کا جلسہ راجہ صاحب محمود آباد کے مکان پر ہو رہا تھا۔ میں ٹینس سے واپس آ کر کھیل ہی کے لباس میں جلسہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ مولانا حسرت موہانی بھی جلسہ میں موجود تھے۔ آزادی ملک کے واسطے جو مصائب مولانا اٹھائے ہیں۔ ان کا احاطہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ جن دنوں آجکل کے بہت سے رہنما اعتدال پسند خیال کئے جاتے تھے یا اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائے تھے اس زمانہ میں حسرت زندان محن میں آزادی کی دیوی کے حضور میں "چکی کی مشقت" اور "مشق سخن" کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔

مولانا کے تعلقات میرے ساتھ بہت ہی مخلصانہ تھے، بحمد اللہ اب تک رہے۔ اظہار رائے میں مولانا کی زبان کو نہ کبھی حکومت وقت روک سکی اور نہ کوئی لیڈر یا سیاسی جماعت قابو میں رکھ سکی۔ مجھے دیکھتے ہی مولانا نے تقریر شروع کر دی اور عارضی حکومت بنانے کی شدید مخالفت کی۔ تقریر ختم ہونے پر میں نے جواباً کچھ عرض کرنا ضروری سمجھا۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے مختصر الفاظ میں کہا اور مولانا ہی کے شعر پر تقریر ختم کی۔

نہ بولے جو ہم ناتوانی کے باعث
وہ بگڑے بہت بدگمانی کے باعث

مولانا ہنس پڑے جس میں تکدار اور تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔

(جون ۴۷ء میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کا فرمان صادر ہوا کہ میں حیدرآباد کی خدمت کے لئے پھر حاضر ہو جاؤں۔ یہ "خودکلامی" یک بیک ختم ہو گئی اور عمر رفتہ کے تصور کا خواب شیریں ناتمام رہ گیا۔ دیکھئے یہ سلسلہ اب کب شروع ہوتا ہے)

17, Hamilton Road
Allahabad
September 11, 1929

My Dear Nawab Sahib,

I have read your letter of September 9 with the greatest interest. But I was sorry to gather from it that you rather thought that your letters were not welcome to me. If any omission or expression of my own was responsible for such impression in your mind, I must hasten to express my sense of regret therefore, as I must have expressed myself badly or the feeling might be due to irregularity of correspondence on my side. To the latter I must plead guilty as there is in me a bad habit of dilatoriness and procrastination. To cut short this preface, allow me to assure you that far from ever having felt "bored", I have always been delighted with your letters as they reflect your acknowledged qualities of friendliness and courtesy. It has been my ungrateful duty frequently to criticise you in your public and official capacity, and to employ strong language too, and if still we are personally as good friends as ever, the credit for this excellent result is all yours as your dignity, urbanity, courtesy and hospitality make a disturbance of personal relations all but impossible. This is what I have been saying about you to friends at several places visited by me on *Leader* business. Your humble friend's best prayer for you is that your admirable personal qualities, united as they are to a quite extraordinary commonsense and shrewdness may be rendered more serviceable to your countrymen by being

supplemented by greater strength of purpose in the conduct of public affairs. I dare say you will not object to this prayeful wish of mine.

I am glad to have all the interesting information you have been at pains to collect and kindly furnished me with. This is excellent. May I know whether I have your permission to publish the figures - of course without disclosing your identity directly or indirectly? If I were in your place-pardon me for the arrogance of the very assumption-I should feel no hesitation on the point as there is nothing confidential about the subject matter and it will be a distinct advantage for the public to be placed in possession of correct facts.

I do not remember at the moment whether I wrote the paragraph in the *Leader* which provoked you into the collection of the information. In any case, it will give me an opportunity of making a suitable amende *honorable* if I can use the figures.

Re. the Jail Committee Report discussion in Council, I still think that it will not be out of place if a formal communication be addressed to Members in general such as I suggested in my last letter. I do not say it is indispensable, but I think it very desirable. It is good that within the limits of your power you are prepared to allow the Council more time for the discussion of this matter.

I am

Yours sincerely,

(Sd.) C.Y. Chintamani

Captain the Honourable
Nawab Sir Muhammad Ahmad Said
Khan Sahib, K.C.I.E., M.B.E.,

Haldwani,
April 2, 1930

My Dear Nawab Sahib,

Please accept my sincere thanks for your prompt reply to my telegram on behalf of the Kakori prisoners in the Bareilly Central Jail. I have since seen in the press that the Government has given them a place in class B. I do not know if these orders have reached them, and if so the strike has been given up or is still continuing. I wired to them on receipt of your telegram to discontinue the hunger-strike and have not received any intimation so far. However, I did not take up the pen to bother you further in this connection but only to thank you for your courtesy which has ever been extended to me in an ample measure. The Holi has come and gone but you did not get any pin pricks from me this year. I do not know how to make good this loss..... I may still be a source of embarrassement to you but only from a distance far removed from the arena of your winning smiles and never-failing manners and dignity.

I am **still** in the clutches of lumbago and find it difficult to write at any length. So I take leave in the hope that I will get an early opportunity to meet you in Naini Tal.

Trust you and yours are alright.

Yours sincerely,
(Sd.) G.B. Pant.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

میں ۴ر نومبر ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ واپس آ گیا۔
حیدر آباد سے کیوں واپس آیا وہاں میں کیا کرنا چاہتا تھا۔
صرف چار مہینے اکیس روز کی قلیل مدت کے بعد میں نے کیوں علیحدگی اختیار کی۔
یہ تمام باتیں اگر خدا کو منظور ہے تو اپنے موقع پر بیان ہوں گی۔
یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ پھر وہی فرصت کے رات دن شروع ہو گئے اور ایک بار پھر گذری ہوئی زندگی اور زمانہ کے اوراق پر نظر ڈالنے کا موقع مل گیا اور پھر عمر گذشتہ کی کہانی دہرانی شروع کر دی۔

سول نافرمانی ۱۹۳۰ء

۲۳-۲۱ء کی تحریکِ ترکِ موالات کے ختم ہونے کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا پرسکون ہو گئی تھی یوں کانگریس کا کام جاری تھا لیکن قانون کی خلاف ورزی کا پروگرام ترک کر دیا گیا تھا۔
۲۹ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو ہوئے۔ اسی اجلاس میں کانگریس نے خودمختاری کا ریزولیوشن کیا اور ۲۶ رجنوری مقرر کی گئی جس دن لوگ جمع ہو کر اس ریزولیوشن کو پڑھیں۔
اس اقدام نے میرے سکونِ قلب پر بجلی گرا دی۔ میں جانتا تھا کہ سول نافرمانی شروع ہو گی تو برٹش گورنمنٹ اسے روکنے کی کوشش کرے گی۔ بے شمار لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں گی۔ حکومت کی پالیسی بے جا سختی کے خلاف کتنی ہی کیوں

نہ ہو عمالِ حکومت سے جہاں تہاں زیادتی ضرور عمل میں آئے گی۔ دوسری جانب کہیں یہ تحریک تشدد کا پیرایہ اختیار کرے گی وہاں دشواریاں بہت بڑھ جائیں گی۔ میں جانتا تھا کہ جب کبھی ملک میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے خواہ وہ کسی جنگِ عظیم کا نتیجہ ہو یا اس قسم کی تحریک کا۔ لوگوں کے دل سے قانون کی وقعت جاتی رہتی ہے اور جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ برٹش حلقوں میں بڑا ہیجان تھا۔ حکومت نے یہ طے کیا کہ یوپی میں کوئی گرفتاں ۲۶ رجنوری کو محض اس وجہ سے نہ ہوں کہ خود مختاری کا رزولیوشن دہرایا گیا۔

حکومت کے حلقوں میں یہ خیال عام تھا کہ اس بار تحریک قانون شکنی اتنی کامیاب نہ ہوگی جتنی کہ ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔ وہ اس نتیجہ پر اس وجہ سے بھی آئے تھے کہ پہلی بار اس تحریک میں مسلمانوں نے بڑی سرگرمی دکھائی تھی۔ مسلمان پیش پیش تھے اور ہندو مسلمان دونوں یک جہت اور یک دل تھے۔ اس کے چند ہی روز بعد شدھی کی تحریک شروع ہوئی جس کے کرتا دھرتا سوامی شردھانند بتائے جاتے تھے۔ یہ بھی شہرت تھی کہ یہ تحریک سیاست فرنگ کا کارنامہ تھی۔ تصدق حسین سی۔ آئی۔ ای جو خفیہ پولیس کے ایک مفید رکن تھے مجھ سے کہتے تھے کہ اس تحریک کے بعض لیڈر تنخواہ دار تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو اس تحریک نے مسلمانوں کو برادران وطن سے مشکوک کر دیا۔ وہ کسی ایسی تحریک میں اب سرگرمی سے حصہ لینے کو تیار نہ تھے۔ میرا خود بھی یہی خیال تھا کہ تحریک قانون شکنی نسبتاً ناکام رہے گی لیکن یہ اندازہ قطعاً غلط ثابت ہوا۔

۲۶ رجنوری کو جب خود مختاری کی قرارداد کو دہرانا قرار پایا تو خیال سے زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے جس سے کانگریس کے قائدین کو یقین ہو گیا کہ اہل ملک نئے سرے سے جدوجہد کے لئے آمادہ ہیں۔ کانگریسی حلقوں میں یہی سوچا جا رہا تھا کہ سول نافرمانی شروع کیوں کر دی جائے کہ پبلک کے سب سے بڑے نبض شناس مہاتما جی نے کہا کہ نمک کا قانون توڑا جائے۔ نمک بنانے کے واسطے مہاتما جی نے ڈنڈی کا پا پیادہ سفر شروع کر دیا۔ انگریزی حلقوں میں مہاتما جی کے اس پروگرام پر سخت حیرت تھی۔ اس کے ناکام ہونے کا ان حلقوں میں اتنا یقین تھا کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ مجھے بھی اس پر تعجب ہوتا تھا کہ کسی قومی تحریک کو نمک کا قانون توڑ کر

کیونکر فروغ دیا جائے گا۔ لیکن میں اسے مذاق خیال نہیں کرتا تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ سوال یہ نہیں تھا کہ پروگرام کیا تھا، پبلک کی نظر میں سوال فقط یہ تھا کہ مہاتما جی نمک کا قانون توڑنا چاہتے تھے لہٰذا ان کے حکم کی تعمیل ہو۔ ہندوستان کے لوگوں کو جس قدر اعتماد مہاتما جی پر تھا اس کی مثال میری نظر سے تاریخ میں نہیں آئی وہ اعتقاد ایک طرح کا مذہبی جذبہ تھا جس نے مہاتما جی کی رہنمائی میں سیاسی صورت اختیار کر لی تھی سول نافرمانی کی لہر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔ گو مسلمانوں نے اس بار اس سرگرمی سے حصہ نہیں لیا جیسا پہلے لیا تھا۔ لیکن اس کی تلافی اس سے ہو گئی کہ ہندو صاحبان میں پڑھے لکھے لوگ کلیتاً کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔

یو۔پی گورنمنٹ کی پالیسی

یو۔پی میں میری پالیسی یہ تھی کہ زیادہ سختی نہ کی جائے۔ گو اس کا تعلق ہندوستان سے تھا اور اس کے متعلق ہر پالیسی دہلی میں طے ہوتی تھی لیکن صوبہ کی حکومتوں کو بھی مشورہ دینے کا موقع تھا جس سے میں فائدہ اٹھاتا تھا۔

اس سلسلہ میں میرے روزنامچہ مورخہ ۳ ر فروری کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"آج دو بجے گورنر کے پاس گیا تھا۔ بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے ان سے صاف کہا کہ اگر آپ نے سختی سے اس تحریک کو دبایا تو دو تین برس کے لئے دب جائے گی مگر پھر ابھرے گی۔ البتہ یہاں کے لوگوں نے اس کی مخالفت کی تو پھر یہ تحریک...... کبھی زندہ نہ ہو گی۔ انھوں نے اسے مانا۔ بہر حال آج ان کا رنگ اچھا تھا۔ شاید میرے نوٹ مورخہ ۱۵ ر جنوری کا اثر پڑا کہ میں نے ان کی سختی کی پالیسی سے اختلاف کیا تھا"۔

اس جگہ میں ۸ ر فروری کے روزنامچہ کا اقتباس دیتا ہوں۔

"لارڈ ارون سے ملاقات ہوئی تھی۔ سنیچر ۸ ر فروری...... اس کے بعد مجھ سے واقعات حاضرہ پر گفتگو کی۔ وہ "کہئے آپ کی کیا رائے ہے؟" میں ۲۶ ر کے واقعات کا اشارہ ۲۶ ر جنوری کے خود مختاری کے اعلان کی طرف ہے) گو آگرہ

اور بنارس میں زور تھا مگر عام طور پر لوگوں پر زیادہ اثر نہیں ہوا۔ میری رائے میں بہت سے لوگ حضور سے کہتے ہوں گے کہ سختی کی جائے۔ مگر میرے خیال میں سوائے اس حالت کے کہ جب لگان نہ دینے کی تحریک یا قانون شکنی کی ترغیب ہوتی ہو سختی نہ کی جائے۔ اس وجہ سے کہ ایسی سختی سے ممکن ہے کہ بالفعل تحریک رُک جائے لیکن جس وقت لوگ جیل سے واپس آئیں گے پھر یہی حال ہوگا۔ اور اگر یہ تحریک خود مٹ گئی اور لوگوں نے اس کی پروانہ کی تو پھر بہت روز کو مٹ جائے گی"۔

وہ "میں یہی ان لوگوں سے کہتا ہوں جو مجھے سختی کی رائے دیتے ہیں" پھر بولے۔

"you can create desert and call it peace but what is the use of it"

یہ پالیسی لارڈ اروِن کے زمانے تک تو کچھ چلتی رہی مگر لارڈ لنگڈن کے زمانے میں رنگ محفل مختلف تھا۔

لارڈ پیل سے مُلاقات

ان ہی دنوں لارڈ پیل سابق وزیر ہند سے گفتگو کا موقع ملا۔ یہ جنوری ۱۹۳۰ء میں لکھنو آئے تھے۔ قیافہ سے مستقل مزاج اور طاقتور طبیعت کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ڈنر کے بعد یہ اور میں ایک صوفہ پر بیٹھ گئے۔

میرے اس جنوری کے روزنامچہ میں حسب ذیل عبارت درج ہے۔

جمعہ ۱۰ر جنوری وہ "(لارڈ پیل) ایک زبردست آدمی معلوم ہوتے ہیں مگر ہندوستان کے خلاف ہیں۔ مجھے ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اصلاحات کے خلاف ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ پیچھے ہٹنا تو درکنار جہاں آپ ہیں وہاں بھی نہیں رُک سکتے بلکہ آگے بڑھنا ہوگا ورنہ اعتدال پسند بھی انتہا پسند ہو جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ اصلاحات میں گورنر کی کیا پوزیشن ہونی چاہیے۔ میں نے کہا وہ کونسٹی ٹیوشنل گورنر ہوگا۔ سوائے اس کے کہ جہاں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا سوال ہو وہاں اسے اختیار ہو یا جہاں اسے یقین ہو کہ نقض امن کا اندیشہ ہے۔ پھر سروس کے متعلق پوچھا میں نے کہا انھیں منتقل کرنے میں حرج نہیں ہے۔ منتقلہ صیغوں میں

جو انگریز ہیں انھیں کوئی شکوہ کا موقع ہنوز نہیں آیا اور آئندہ بھی کم از کم ہمارے وزراء کا خیال ہے کہ بیس فی صدی انگریز ملازمتوں میں ہوں"۔

سول نافرمانی میں بی بیوں کی شرکت

اس بار سول نافرمانی میں ہزار ہا کی تعداد میں لوگ جیل گئے۔ کیمپ جیل تک بنوانے پڑے۔ مہاتما جی کے ڈنڈی پا پیادہ سفر نے گویا ہندوستان کو سوتے سے جگا دیا۔ مگر میں سیاسی یا سول نافرمانی کی تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو اپنے قلب میں فقط ان نقوش کو اُبھار رہا ہوں جو امتداد زمانہ سے دھندلے پڑ گئے ہیں۔ میں ایک روز انھیں دنوں جیل کے معائنہ کے واسطے گیا شاید الہ آباد کا نینی جیل تھا۔ ایک دروازے سے داخل ہوا تو یکا یک میرے سامنے مسز پنڈت، مانہرو اور کئی معزز خواتین کھڑی نظر آئیں جن میں اکثر میری دوست بھی تھیں اور مادر ہند کی بہترین بیٹیاں تھیں۔ میں ان سے ڈرائنگ روم میں ملنے کا عادی تھا۔ ان کو اس ماحول میں پا کر دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ میں ہکا بکا سا رہ گیا۔ اس پر یہ طرہ اور ہوا کہ وہاں کرسیاں فقط اتنی ہی تھیں جتنی کی خواتین۔ میں نے ان سے بیٹھ جانے کی خواہش کی تو ان کا اخلاق اسے گوارا نہ کرتا تھا کہ میں کھڑا رہوں اور میں بیٹھ جاؤں اور ایک خاتون کھڑی رہے یہ مجھ سے ممکن نہ تھا۔ ٹھیک یاد نہیں مگر جہاں تک خیال پڑتا ہے میری التجا پر یہ بیٹھ گئیں۔ اس واقعہ نے میری تکلیف میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میری آنکھیں قلبی حالت کو ظاہر کرنے لگیں جلد رخصت ہو کر چلا آیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ میری اس روز کی قلبی حالت کو میرے سوا کوئی اور بھی جانتا تھا۔ برسوں کے بعد ۳۷ء یا ۳۸ء میں ایک روز مسز لکشمی پنڈت میرے ہاں کھانے پر مدعو تھیں۔ مجھے چھیڑتے ہوئے مذاقاً کہنے لگیں کہ "یہ ایسے ہوم ممبر تھے کہ اپنے قیدیوں کو دیکھ کر رونے لگتے تھے" اور اس واقعہ کی یاد دلائی۔

پہلی بار اس تحریک قانون شکنی میں فقط مردوں ہی نے حصہ لیا تھا۔ لیکن اس بار خواتین بھی حصہ لے رہی تھیں۔ ان کی شرکت نے اس تحریک میں بڑا جوش پیدا کر دیا۔ ایک جانب تو عوام میں اس سے بے انتہا ہیجان پیدا ہو گیا۔ دوسری جانب ملازمین

گورنمنٹ کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ جو اس تحریک میں شریک نہ تھے وہ بھی شریف گھروں کی بہو بیٹیاں کو اس طرح سختیاں جھیلتے اور جیل جاتے دیکھ کر پریشان تھے۔ اس سے نئی نئی انتظامی دشواریاں پیدا ہونے لگیں۔ مثلاً پولیس میں تمام مرد ملازم تھے، مکانات اس قابل نہ تھے کہ اس طبقہ کے مردوں کو بھی رکھا جائے بی بیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ کہیں کہیں اس کی کوشش بھی کی گئی کہ عمارت میں کچھ ردوبدل کر کے آرام دہ بنایا جائے۔

اس دوران میں جہاں کہیں دورہ پر جاتا جیل کا بالخصوص معائنہ کرتا۔ دشواری یہ تھی کہ ملازمین قواعد کا منشا سمجھنے میں غلطیاں کرتے تھے۔ ممکن ہے ان کے افسران غلطیاں کراتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ الفاظ کے معنی تنگ سے تنگ دائرہ میں مقید ہو جاتے تھے۔

ایک بار الہ آباد جیل میں معائنہ کو گیا۔ وہاں پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور پنڈت جواہر لال جی بھی تھے۔ شاید ڈاکٹر محمود بھی تھے۔ یہ ایک جیل کا علیحدہ حصہ تھا۔ ممکن ہے کہ اس جیل میں اس سے بہتر جگہ نہ ہو لیکن ان حضرات کے لئے یہ بالکل ناکافی اور غیر موزوں تھا۔ اس میں ایک برآمدہ بڑھایا گیا تاکہ کچھ رفع تکلیف ہو۔ پنڈت جی بہت ضعیف تھے۔ وہ ایک آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ گو ان کی صحت اچھی نہ تھی مگر گفتگو میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہی شگفتگی جو ہمیشہ میں نے ان میں پائی اس وقت بھی موجود تھی۔

جہاں تک یاد ہے چند ہی روز کے بعد بخیال صحت پنڈت جی کو رہا کر دیا گیا۔

یوں تو اکثر جگہ سے میرے پاس شکایتیں آتی تھیں مگر ایک کایستھ صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل تھے۔ وہ کچھ اس درجہ سخت مزاج واقع ہوئے تھے کہ جس جیل میں ان کی تعیناتی ہوتی وہاں سے شکایتیں ضرور آتیں۔ وہ ضلع گونڈہ کے جیل میں تھے۔ وہاں سے بہت شکایتیں آئیں۔ میں نے انسپکٹر جنرل سے پوچھا تو وہ اس سپرنٹنڈنٹ کی تعریف کے ایسے گیت گانے لگے کہ مجھے حیرت ہوئی اور اس کا یقین ہو گیا کہ میرا اور انسپکٹر جنرل کا زاویۂ نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ آخر کار میں نے ان سپرنٹنڈنٹ جیل کو نینی تال بلا کر فہمائش کی اس کے بعد ان کی سخت مزاجی میں کچھ کمی آئی۔

میرا عقیدہ ہے کہ قواعد کیسے ہی ہوں تمام تر مدار اس پر ہے کہ عمل کرنے والا

کون ہے۔ قواعد ایک ہی تھے لیکن ایک دوسرے سپرنٹنڈنٹ میجر سلامت اللہ کی شکایت کبھی میرے کانوں تک نہیں پہنچی اس زمانے کے قانون کے مطابق تمام سکریڑیوں اور محکموں کے افسرِ اعلیٰ یعنی انسپکٹر جنرل یا ڈائرکٹر جنرل کو یہ حق تھا کہ وہ گورنر سے نجی ملاقات کریں۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس سے قبل کہ ممبر حکومت کسی مسئلہ خاص کو گورنر کے سامنے پیش کرے یہ مسئلہ گورنر کے گوش گذار ہوجاتا تھا اور اس کے وہ پہلو گورنر کے ذہن نشین ہوجاتے تھے جنھیں سکریڑی یا انسپکٹر جنرل ذہن نشین کرانا چاہتے۔ اکثر یہ سب ممبر گورنمنٹ کے بغیر علم واطلاع ہوتا تھا۔ جب قاعدہ کے مطابق ممبر انچارج حکم آخر کی تجویز کو گورنر کے پاس لے جاتا تو اسے دشواریاں ہوتی تھیں۔ ردوقدح ہوتی اور جب تک یہ ثابت نہ ہوجاتا کہ محکمہ کی رائے غلط ہے گورنر کو اتفاق رائے نہ ہوتا تھا۔

مجھے فروری ۳۱ء کا ایک واقعہ یاد آگیا۔

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا تھا۔ اسمبلی کا اجلاس اس روز ہونے والا تھا۔ سر زوبرٹ ڈوڈ (انسپکٹر جنرل پولیس) نے آکر مجھ سے کہا کہ ایک جلوس خواتین کا کونسل چیمبر کی طرف آرہا تھا۔ ان کا منشا یہ تھا کہ کے سامنے آکر مظاہرہ کریں اور ممبران کو چیمبر کے اندر جانے سے روکیں۔ انسپکٹر جنرل نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے پولیس کے ذریعہ سے اس جلوس کو سڑک پر رکوادیا ہے۔ خواتین سڑک پر بیٹھ گئی ہیں۔ حکومت کی دشواری یہ تھی کہ نہ تو یہ ہی مناسب تھا کہ چیمبر کے دروازے پر مظاہر ہو اور اسمبلی کے جو ممبر آنا چاہیں انھیں پریشانی سے دوچار ہونا پڑے اور نہ یہ اچھا تھا کہ خواتین کو گرفتار کیا جائے۔

میں نے کہا کہ ان کے چند لیڈروں کو اجازت دی جائے کہ وہ کونسل چیمبر کے دروازے پر جو مظاہرہ کرنا چاہیں کرلیں۔ چنانچہ مسز مترا اور مسز بخشی آئیں۔ انھوں نے کچھ پرچے تقسیم کئے اور ایک تقریر کی۔ میں نے انسپکٹر جنرل سے کہا کہ انھیں میرے دفتر کے کمرے میں بلالیا جائے۔ ایک یورپین اے۔ ایس۔ پی انھیں بلانے گیا۔ لوٹ کر آیا تو اس نے کہا کہ "جناب وہ کہتی ہیں کہ ہم کیوں ہوم ممبر کے دفتر

جائیں ہمیں کیا غرض''۔

یہ انداز مجھے بھی ناگوار ہوا لیکن انسپکٹر جنرل کے چہرے سے ناگواری کا اظہار بہت ہی صاف طور پر عیاں تھا۔ میں نے تھوڑی سی خاموشی کے بعد ''سر روبرٹ سے کہا'' سر روبرٹ وہ بادشاہ کی رعایا ہیں اور میں ملازم، اگر وہ میرے پاس نہیں آتیں تو مجھے ان کے پاس جانا چاہئے'' یہ کہہ کر میں دفتر سے اُٹھا اور کونسل چیمبر کے بڑے دروازے پر پہنچا، وہاں یہ دونوں کھڑی تھیں اور مسز مترا کچھ تقریر کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی برہمی میں کچھ اضافہ ہو گیا اور روئے سخن میری طرف پھرا۔ میرے آنے کا منشا یہ تھا کہ اس قصہ کو بغیر ناگواری کے طے کر دیا جائے۔ لیکن جب مزاج کا پارہ اتنا اونچا ہو تو پھر کس امید پر بات کی جائے۔ میں مسز مترا سے خوب واقف تھا اور میری بیوی سے تو ان کی دوستی تھی۔

جوں ہی وہ رُکیں میں نے گفتگو شروع کر دی۔ اب الفاظ تو حرف بحرف یاد نہیں لیکن منشا یہ تھا کہ'' آپ کی شورش سے نپٹنا میرے لئے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میں نے کہا کہ گورنر سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آئندہ میں اور میری بیوی مشترکہ ہوم ممبر ہوں تو کام میں سہولت ہو۔ آپ کی پیدا کی ہوئی شورش کو تو وہ ہی سنبھال سکیں گی'' مسز مترا کا غصہ کچھ کم ہوا تو میں نے کہا کہ'' مجھے بتایئے کہ آپ کیا چاہتی ہیں'' آخر یہ قرار پایا کہ وہ اپنا جلوس لائیں۔ جب کونسل چیمبر کے سامنے آئیں اور اندر کی سڑک پر مڑنا چاہیں تو ہمارا ایک چپراسی یہ کہہ دے کہ'' یہ شاہراہ عام نہیں ہے'' جلوس آگے کو نکل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

میں یہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ ایک طرف تو یہ تحریک اس ملک کے لوگوں میں خود داری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ یہ بڑی صفات ہیں۔ لیکن دوسری جانب نوجوانوں میں ایسا رجحان پیدا کر دیا کہ وہ نہ کسی پابندی کو گوارا کر سکتے تھے اور نہ کسی حد پر رُکنا چاہتے تھے۔ تادیبِ نفس Desciplineسے بالکل منہ موڑ لیا اور تہذیبِ نفس کو بارگراں تصور کرنے لگے۔

مجھے ایک خلجان ہوتا تھا۔ مقصد کے درست ہونے میں تو کوئی شک نہ تھا مگر

حصول کا ذریعہ کہاں تک مناسب تھا۔ اس میں مجھے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو شک تھا۔ کیا نوجوان قانون شکنی کا عادی ہونے کے بعد قومی حکومت کے بھی قوانین کو توڑنا نہ چاہے گا۔ کیا ہڑتال کا حربہ وہ اتنی جلدی بھول جائے گا۔ کیا ہوا اگر قومی حکومت کو اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اگر یہ سچ ہے کہ نوجوان اس سبق کو نہ بھولے گا تو پھر اس کا نتیجہ ہندوستان کے واسطے بالعموم اور قومی حکومت کے واسطے بالخصوص کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

شاید ان اختلافات کی وجہ یہ تھی کہ بعض لوگ اصلاحی ذہنیت رکھتے تھے۔ اور بعض انقلابی خیالات کے پیرو تھے۔ اول الذکر کا خیال تھا کہ قانونی اور آئینی جدوجہد کے ذریعہ سے ملک کی آزادی حاصل کی جائے ان کا مقصد ملک کو بدیشی حکومت سے آزاد کرانا تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن دوسرے حضرات ملک کو انقلاب کے واسطے تیار کر رہے تھے کہ جس کا مقصد ملک کی سیاست کے ہر پہلو پر پڑتا تھا خواہ داخلی ہو یا خارجی۔

۱۹۳۰ء میں پھر نینی تال گیا اور وہی پروگرام شروع ہو گیا جو ہر سال ہوتا تھا۔ فائل۔ ملاقاتی دفتر۔ شام کو ٹینس۔ لیکن سول نافرمانی اور حکومت کی کش مکش نے سخت متردد کر رکھا تھا۔

۱۸؍ جون کے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ پونے چھ بجے شام کے گورنمنٹ ہاؤس میں گورنمنٹ کی میٹنگ تھی۔

ٹینس کھیلنے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس پہنچا۔ زیر بحث یہ امر تھا کہ باوجود اس کے کہ گورنمنٹ کہہ چکی تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو خلاف قانون قرار نہ دیا جائے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کا منشا تھا کہ اسے خلافِ قانون قرار دیا جائے۔ میں نے جواب میں لکھوا دیا تھا کہ میرے نزدیک یہ انتہائی غلطی ہوگی۔ میرے اس خیال کی بذریعہ تار انھیں اطلاع دی گئی"۔

ایک صوبہ کے ہوم ممبر کی آواز کی حقیقت ہی کیا تھی۔ حکومت ہند نے کانگریس کمیٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔

سائمن کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق تو میں کہیں لکھ چکا ہوں۔ یہ رپورٹ کسی فریق کو بھی پسند نہ آئی۔ میرے خیال میں اس رپورٹ کا کارنامہ یہی تھا کہ اس کو رد کرنے پر سارے ہندوستان کو اتفاق تھا۔ ۲۹ اگست کو بحیثیت ہوم ممبر ایک سال کی توسیع کا گزٹ ہوا۔

عشرت کی پیدائش

۴ ستمبر کو مجھے چھتاری سے تار ملا۔ میں فوراً روانہ ہوا۔ اترولی کے اسٹیشن پر عشرت کے پیدا ہونے کی اطلاع ملی۔

گول میز کانفرنس

اب گول میز کانفرنس کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ برٹش حکومت کی یہ خواہش تھی کہ جس طرح ہو کانگریس کو اس میں ضرور شریک کیا جائے۔ لیکن کانگریس کی طرف سے مہاتماجی سے شرائط طے نہ ہو پائے اور کانگریس شریک نہ ہوئی۔

۱۵ جون ۳۰ء کو سر مالکم ہیلی نے مجھ سے کہا کہ میں بھی گول میز کانفرنس میں بلایا گیا ہوں۔

میرے واسطے یہ خبر خالی از دلچسپی نہ تھی۔ میں نے کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا تھا۔ یورپ دیکھنے کا شوق تھا۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ چار ماہ کی چھٹی لے کر یورپ کے بعض ممالک کو دیکھتا ہوا لندن جاؤں۔

ہندوستان کے مسئلہ کا حل خود بہت دل چسپ تھا۔ بعض حصص میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ باقی ملک میں ہندو اکثریت۔

اکثریت حکومت خود مختاری چاہتی تھی اور اقلیت تحفظات پر زور دیتی تھی۔

کانگریس نے کچھ اپنے شرائط پیش کئے جو حسب ذیل تھے۔

(۱) گول میز کانفرنس میں گفت و شنید اور مباحثہ کامل ''ڈومینین اسٹیٹس'' کی بنا پر ہوگا۔

(۲) منتخب شدہ لوگوں میں کانگریس کی اکثریت۔

(۳) سیاسی قیدیوں کی رہائی۔

(۴) اور جہاں تک ممکن ہو سکے گورنمنٹ اسی وقت سے ڈومنین کی حکومت کے لائن پر چلائی جائے۔

اس سلسلہ میں لارڈ ارون نے ایک کانفرنس بھی کی جس میں مہاتما جی پنڈت موتی لال نہرو صاحب، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر جناح شریک ہوئے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ باہمی شکوک اس درجہ پیدا ہو گئے تھے کہ ہر فقرے میں جانبین کو بہت ایسے معنی نظر آتے تھے جو دشواریاں بڑھا دیتے تھے کانگریس پہلی گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوئی۔

۱۱؍ستمبر کو وایسرائے کی طرف سے گول میز کانفرنس کا دعوت نامہ مجھے موصول ہوا۔ میں نے قبول کر لیا۔ اس روز کے روزنامچہ میں حافظ کا مشہور شعر میں نے لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور فرقہ وارانہ مشکلات مجھے متفکر اور متردد کرتی تھیں۔

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مُرساہا

یورپ جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ کچھ دشواریاں محسوس ہوئیں، خیال ہوا کہ ایسا شخص ساتھ ہو جو فرنچ اور اطالوی جانتا ہو۔ مسٹر اسکوٹ اوگونر پولیس میں ڈی۔ آئی۔ جی تھے۔ وہ رخصت پر جانے والے تھے انھیں ہمراہ لیا، اطالوی لائن سے جانے کا انتظام کیا گیا۔

۲۶؍یا ۲۷؍ستمبر کو نینی تال سے چل کر چھتاری آیا۔ ۲۸؍کو سدھ پور حاضر ہو کر طالب نگر چلا گیا اور اپنے چچا اور چچی سے رخصت ہو کر چھتاری آ گیا۔ بہت سے کاشتکار اور چھتاری اور اطراف کے لوگ کثرت سے جمع تھے۔ میں نے ایک رخصتی تقریر کی۔ بہت سے لوگ رو رہے تھے۔ میں بھی رنجیدہ تھا۔ ہماری نظروں میں یورپ کے سفر کا تصور کچھ ایسا انوکھا تھا کہ میں نے ایک وصیت نامہ بھی عدالت ججی میں داخل کر دیا۔ رخصت کے وقت فاطمہ رونے لگی۔ ہمارا بچہ پچیس روز کا تھا اس کی مفارقت مجھے بہت گراں تھی۔ میں بھی رنجیدہ تھا ان سب کو خدا کے سپرد کیا۔ اسٹیشن اور راحت منزل پر بڑا مجمع تھا۔ نواب سر مزل اللہ خاں میرے بجائے ہوم ممبر مقرر ہوئے تھے اور بھی ملنے آئے۔

۲۸؍ستمبر ~~۳۰~~ء کو پونے پانچ بجے شام کی گاڑی سے دہلی روانہ ہوا۔ اسٹیشن

پر راحت بہت رویا جس کی وجہ سے دہلی تک بے قراری سی رہی۔ دہلی میں پہلی بار Talkies (بولنے والا سنیما) دیکھا بہت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔ اسی شب کو مسعود علی خاں جو میری چچا زاد بہن کے بیٹے ہیں آ گئے۔ نواب صاحب باغپت اور ان کے چھوٹے بھائی راؤ عبدالحمید خاں مرحوم بھی آ گئے۔ ان حضرات نے بھی یورپ کے سفر کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے واسطے ایسے ہم سفر باعث تفریح و مسرت تھے۔

۲۹ ستمبر کو صبح آٹھ بجے دہلی سے روانہ ہوئے۔ اسکوٹ او کونز بھی آ گئے۔ کچھ اور دوست بھی بمبئی تک ساتھ چلے جن میں نواب بہادر طالب نگر، بھائی جان پیر جی صاحب مرحوم، عزیزم باسط علی خاں بھی تھے۔

علی الصباح بمبئی کے قریب آنکھ کھلی۔ صبح کا سہانا وقت، ہلکی ہلکی روشنی میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سیاہ تاڑ اور کھجور کے درخت بہت ہی بھلے معلوم ہوئے۔ میں بمبئی تاج ہوٹل میں ٹھہرا۔ دن میں ٹومس اینڈ کوک سے ٹکٹ اور روپیہ کے تبادلہ کا انتظام کیا۔ کچھ خرید و فروخت کی۔ فاطمہ اور راحت کو خط لکھے۔ دوسرے روز جہاز جانے کو تھا سویرے سے سو رہے۔ تین بجے شب کو میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ لیاقت علی خاں جو اس سفر میں میرے ساتھ رہے تھے کھانسی سے پریشان ہیں۔ میں نے بجلی کا پنکھا بند کر دیا اور ان کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن آخر حصہ ستمبر کا موسم بمبئی میں ذرا بھی خوش گوار نہیں ہوتا۔ موسم سرما تو ابھی شروع ہوا نہ تھا مگر برساتی ہوائیں سمندر سے آنا بند ہو چکی تھیں مجھے کسی طرح نیند نہ آئی۔ میں ایک کرسی پر سمندر کی جانب کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے رات کو ختم ہوتے اور صبح کو نمودار ہوتے سمندر پر دیکھا۔ موجوں کا سناٹا تھوڑے تھوڑے سے توقف سے ان کا کنارہ سے ٹکرانے کی آواز بڑی عجیب اور دل کش تھی۔ آہستہ آہستہ اندھیرا کم ہوتا گیا۔ سامنے کی پہاڑیوں کے سیاہ خاکے نظر آنے لگے نیچے سمندر کے کنارے سڑک پر کچھ چہل پہل شروع ہو گئی۔ میں نے کرسی سے اُٹھ کر صبح کی نماز کا اہتمام شروع کر دیا۔ یکم اکتوبر کو گیارہ بجے ہم لوگ جہاز پر سوار ہوئے۔ اس جہاز کا نام پلسنا تھا رخصت کا وقت بہر حال مغموم اور محزون بنا دیتا ہے۔ جس وقت عبدالسمیع خاں اور دوسرے رفقاء جہاز سے کنارے جانے لگے تو خاصی تکلیف ہوئی۔ ہماری پارٹی میں نواب صاحب

باغپت، مسعود علی خاں لیاقت، اسکوٹ اوکونزا اور راؤ عبدالحمید خاں مرحوم تھے۔

جہاز کا سفر

جہاز روانہ ہوا اور دیر تک ساحل اور اہل ساحل نظر کے سامنے رہے۔ ہم لوگ اپنے اپنے کمروں یا کیبن میں گئے۔ میں نے کیبن ڈی لوکس لیا تھا جس میں لیاقت علی خاں اور میں دونوں تھے۔ کمرہ بہت آرام دہ تھا۔ لنچ کے بعد سمندر کو دیکھتا رہا۔ میرے واسطے یہ سمندر کا پہلا سفر تھا۔ ہر چیز نئی اور دل چسپ معلوم ہوتی تھی۔ اڑنے والی مچھلیاں موجوں سے نکل کر اڑتی ہوئی بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے راحت پہنچانے کی ذمہ داری تو لیاقت خاں پر تھی جسے انھوں نے نہایت محنت اور محبت سے انجام دینا شروع کیا۔ اور میں صبح سے شام تک یا کوئی کھیل کھیلتا خاص کر ڈیک ٹینس یا کرسی پر لیٹا ہوا کتاب پڑھتا رہتا۔ ۲۳ / اکتوبر کو مجھے یکا یک پریشانی اور گھبراہٹ شروع ہوئی۔ میں نے اپنی نبض دیکھی تو میرا دل پانچ چھ بار چل کر ایک حرکت (بیٹ) غائب کرتا تھا۔

یہ شکایت مجھے ایک بار لکھنؤ میں بھی ہو چکی تھی۔ میرے ساتھ دواؤں کا بکس تھا۔ میں نے دوائیں استعمال کرنا شروع کر دیں۔

اپنے ہم سفر حضرات سے میں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ پریشان ہوں گے اور چارہ سوائے جہاز کے ڈاکٹر کے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن میں تھا متفکر مرزا غالب کو اس کی تمنا ہوگی۔ مگر مجھے یہ آرزو نہ تھی کہ نہ کہیں جنازہ اٹھے اور نہ کہیں مزار ہو۔ مگر چوبیس گھنٹہ کے اندر میری یہ حالت جاتی رہی۔

میں گھر پر تسنیم فاطمہ کو چھوڑ آیا تھا۔ اس کی عمر چار ساڑھے چار برس کی تھی۔ اس کی یاد اکثر آتی تھی مجھے جہاز پر ایک لڑکی تسنیم کی ہم عمر مل گئی۔ یہ اپنی بہن اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔

مجھے اول تو بچوں سے یوں ہی بہت دل چسپی ہوتی ہے اور اس زمانے میں تسنیم کی یاد بے قرار کر رہی تھی۔ مجھے اس بچی سے بڑی وابستگی ہوگئی تھی۔ وہ بھی اس درجہ مانوس ہوگئی کہ دن کو اکثر میرے ہی پاس رہتی تھی۔ اس کا نام خدیجہ تھا اور اسے

"بیوٹی" پیار میں کہتے تھے۔

یہ بچی جہاز پر اکثر میرے ساتھ رہتی اور لوگ مجھ سے دریافت کرتے تھے کہ کیا وہ میری بیٹی ہے۔ سفر ختم ہوا اور یہ واقعہ بھی یاد سے محو ہو گیا۔

تقریباً بیس سال بعد جب میں حیدرآباد میں صدر اعظم ہو کر گیا تو اپنے دوست نواب زین یار جنگ سے ملنے گیا۔ اس لڑکی کی بڑی بہن نے مجھے چق میں سے دیکھا اور پہچانا۔ نواب زین یار جنگ سے ذکر کیا۔ انھوں نے اس لڑکی کو مجھ سے ملایا مجھے اس لڑکی سے دوبارہ مل کر بڑی ہی مسرت ہوئی۔ جب تک میں حیدرآباد میں رہا وہ ہمارے گھر بالکل بیٹیوں کی طرح آتی تھی۔ میری بیوی کو بھی اس سے بہت تعلق ہو گیا تھا۔

باوجودیکہ سمندر کا سفر بہت ہی خوشگوار تھا لیکن ۶ر اکتوبر کو یہ معلوم ہو کر کہ عدن پہنچیں گے مسرت ہوئی۔ بحر ہند کی موجوں کو دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا۔ ساحل کی طرف بے تابانہ نظر اُٹھنے لگی۔ لیکن ہمارا جہاز بجائے چھ بجے شام کے ساڑھے دس بجے کو عدن پہنچا۔ میرے خیال میں تو اب کنارے پر جانے کا کوئی وقت نہ تھا لیکن میرے ہم سفر حضرات کی خواہش تھی اور مجھے اندیشہ تھا کہ میرے انکار پر شاید وہ حضرات بھی کنارے نہ جائیں، میں کنارے پر اُترا۔ موٹر کرایہ کر کے عدن کا چکر لگایا گیا۔ اول تو وہاں دیکھنے کو تھا ہی کیا۔ پھر رات کے بارہ بجے نظر بھی کیا آتا چاندنی رات میں موٹر کی سواری کا لطف اُٹھا کر آ گئے۔

ارادہ تھا کہ عدن سے کچھ پان خریدیں لیکن اس کا موقع نہ ملا۔ تیسرے درجہ میں بعض ہم سفر بمبئی سے عدن تک آئے تھے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا تو جتنے پان ان کے پاس بچے تھے سب ہم لوگوں کو دیدیے۔ ہم نے اس عنایت کو تشکر سے قبول کر لیا۔

میں انسانی محبت کے اس پہلو سے اس درجہ متاثر ہوا کہ مجھے اس کی مسرت تھی عدن میں پان نہ مل سکے۔

دوسرے روز عدن سے روانہ ہوئے۔ چونکہ یہ میرا سمندر کا سفر تھا ہر چیز جاذب توجہ معلوم ہوتی تھی۔ سمندر کے کنارے چھوٹی خشک پہاڑیاں تھیں جن پر درخت اور سبزے کا نام تک نہ تھا۔ یہ پہاڑیاں ماضی بعید میں ممکن ہے آتش فشاں رہی ہوں۔

سمندری پرند (سی گل) دن بھر جہاز کے ساتھ رہے۔ سمندر میں اگر کوئی کھانے کی چیز ڈالی جاتی تھی تو یہ فوراً حصہ بخرہ کر لیتے تھے۔ ہمارا جہاز بحر احمر (ریڈسی) میں جا رہا تھا۔

یہاں گرمی بہت سخت ہوتی ہے اور بڑی ہی بے لطف ہوتی ہے۔ حبس رہتا ہے۔ پسینہ خشک نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ سمندر تنگ ہے جہاز برابر نظر آتے رہتے ہیں۔ اس سمندر میں شارک مچھلیاں اور پورپس اکثر نظر آتی ہیں۔ پورپس تیزی سے تیرتی ہیں۔ کبھی کبھی دور تک جہاز کے ساتھ کودلی چلی جاتی تھیں۔

اس جہاز پر ایک انگریز لڑکی ہماری ہم سفر تھی۔ یہ لبرل پارٹی کے ایک ممبر پارلیمنٹ کی بیٹی تھی ہندوستان کی آزادی کی طرفدار تھی اور یہ بھی کہتی تھی میں پردہ پسند کرتی ہوں۔ ہندوستان کے بعض والیان ملک سے بھی واقف تھی۔ حسین و جمیل تھی۔ ناچتی بہت اچھا تھی۔ جب جہاز جدہ کے سامنے سے گزرا تو میں نے کوشش کی کہ دوربین ہی سے شاید جدہ دیکھ سکوں لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ میرے مذہبی جذبات ارضِ مقدس کے قرب کی وجہ سے متاثر تھے۔ مجھے تاسف تھا کہ اب تک کیوں اس فریضہ کی ادائیگی نہ ہو سکی۔ ساتھ ہی امیر کا وہ مشہور شعر اپنے حسب حال پا رہا تھا۔

امیر جاتے ہو بت خانے کی زیارت کو
ملے جو راہ میں کعبہ سلام کر لینا

خلیج سوئز کے قریب ایک روز اتنا خوبصورت غروب آفتاب دیکھا جو عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔ سمندر کے کنارے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن پر بادل تھا اور آفتاب بادلوں میں ہو کر غروب ہو رہا تھا۔ آفتاب کی شعاعیں کچھ بادلوں سے اوپر کی جانب اور کچھ نیچے کی جانب نکل رہی تھیں۔ یہ عجیب منظر تھا۔ اوپر کی جانب تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاندی کے اوراق میں بجلی کی چمک ملا کر پھیلا دی ہے اور نیچے کی جانب سونا اور سندور بجلی مل کر پھیلی ہے میں بہت دیر تک مبہوت اسے دیکھتا رہا۔ غروب آفتاب کے قریب شفق کی رنگینیاں اتنی دل کش اور جاذبِ نظر کبھی دیکھنے میں نہ آئی۔

ہم گیارہ اکتوبر کو نہر سویز پر پہنچے۔ بندرگاہ میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ ادھر اُدھر پہاڑیاں بے رونق درخت اور سبزے کا نام و نشان نہیں۔ مجھے اس خدیو مصر

کا خیال بار بار آیا کہ جس نے نہر سوئز کے حصص انگلستان کو فروخت کر کے مصر کی آزادی کو بیچ ڈالا۔

اس جہاز سے اٹھارہ انیس شخص قاہرہ کو روانہ ہوئے۔ ہم دو موٹروں میں روانہ ہوئے سوائے ریگستان اور ریت کے بڑے بڑے تودوں کے کچھ نہ تھا۔ سراب کا نام سنا تھا اس اسی میل کے سفر میں اسے دیکھ بھی لیا۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی بھرا ہے لیکن جتنا موٹر آگے جاتا تھا یہ فریب نظر بھی اتنا ہی دور ہو جاتا تھا۔ اس ریگستان میں کوئی جانور نظر نہیں آیا۔ سوائے چند کووں کے جو غیر معمولی بڑے تھے۔ ہم سیدھے میوزیم پہنچے۔ یہاں دو دو تین تین ہزار برس کی پرانی چیزیں، زیورات، تابوت رکھے ہوئے ہیں جو پرانی قبور سے نکالے گئے ہیں۔ ان چیزوں کی موت کے ساتھ وابستگی نے کچھ ایسا اثر ڈالا کہ مجھے ہر چیز میں افسردگی معلوم ہوتی تھی۔ ممی کو دیکھنا یا کہیں رکھنا میرے نزدیک تو مذاق سلیم کے خلاف ہے۔ جتنی دیر میں وہاں رہا افسردہ ہی رہا۔ حالانکہ سونے کے زیورات، سونے کی تصویریں، پتھر کے بت، فراعین مصر کے زمانے کی بہترین صنعت کا نمونہ تھیں۔ ہوٹل میں لنچ کھایا اور پیرامڈ اور اسفنکس کو دیکھنے گئے۔ یہ بھی عجائبات عالم میں سے ہیں۔ پیرامڈ تو چوکور پتھروں کو اوپر تلے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ یہ قدیم مصر کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ اسفنکس ایک شیرنی کا بت ہے جس کا اوپر کا حصہ عورت کا ہے عقل کام نہیں کرتی کہ جب نہ اسٹیم کی طاقت میسر تھی اور نہ بجلی کی قوت تو پھر یہ لاکھوں من پتھر کس طرح آیا ہوگا جس کا ایک ٹکڑا سینکڑوں من کا ہے۔ اس پرانے زمانے کی تہذیب کی عجیب یادگاریں ہیں کہ جس دور کی تاریخ قصص و حکایات سے زیادہ اب کچھ بھی نہیں۔ میں بے حد متحیر اور اپنے خیالات میں کچھ عجیب طرح مستغرق تھا۔ مجھے اسفنک ایک زندہ وجود معلوم ہوتا تھا جس نے ان تمام زمانوں کو دیکھا ہے۔ جو جانتی ہے کہ وہ کون عالی ہمت اور بلند حوصلہ اشخاص تھے کہ جن کے آثار کو زمانہ باوجود کوششوں کے آج تک نہ مٹا سکا۔ جو جانتی ہے کہ وہ ہزاروں مزدور کون تھے جن کی جانیں ان چٹانوں کو یہاں تک لانے اور ترتیب دینے کی نذر ہوئیں۔ واپسی پر چائے پی۔

چھ بجے کی ریل سے پورٹ سعید روانہ ہو گئے۔ راستہ میں مجھے اس یورپین لڑکی کی بات چیت سے یہ ظاہر ہوا گو صاف الفاظ میں نہیں، کہ یہ غریب اپنے حسن و دماغ کے ذریعہ سے کسی دولت مند سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اسی فکر میں سرگرداں ہے۔

۱۳/اکتوبر کو خاں صاحب لیاقت خاں میرے پاس آئے اور بڑے اہتمام سے ایک پان دیا۔ یہ آخری پان تھا کہ جو عدن میں دئے گئے تھے۔ انسان بھی کتنا عادتوں کا غلام ہو جاتا ہے۔ پان کے ختم ہونے کا ہم سب کو بہت احساس ہوا۔

دوسرے روز ہم یونان کے الجزائر کے قریب سے گزرے۔ میرے خیالات اسلام کے اس دور کی یاد میں محو ہو گئے جب یہ جزائر کی سلطنت کا ایک حصہ تھے۔ قوموں کے عروج و زوال کے فسانے جتنے دل چسپ اور سبق آموز ہیں اسی قدر دلگیر اور افسردہ بھی بناتے ہیں۔ جس طرح اشخاص ترقی و تنزلی کا شکار ہوتے ہیں اور ایک کی غلطی سے دوسرا سبق آموز نہیں ہوتا اسی طرح اقوام بھی اُبھرتی ہیں اور پھر گر جاتی ہیں۔ اس کا احساس کہ یہ انقلاب کیوں ہوا بروقت نہیں ہوتا۔ مورخین لکھتے رہتے ہیں۔ شاید قانونِ قدرت یونہی ہے۔ کچھ ہی کرو مگر پستی و بلندی کے دور یونہی ہوتے رہتے ہیں۔ سمندر کا سفر یونان سے آگے جا کر بہت دل چسپ ہو جاتا ہے۔ اکثر جزائر نظر آتے ہیں۔ جہاز ان سے اتنا قریب ہے کہ عمارتیں اچھی طرح نظر آتی ہیں۔

اٹلی

آخر ۱۶/اکتوبر کو وینس کے بندرگاہ پر ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا۔ گینڈے میں بیٹھ کر وکٹوریہ ہوٹل آئے۔ کسٹم افسروں نے ہمیں بالکل دق نہیں کیا۔ شاید حکومت برطانیہ نے اس کا انتظام کر دیا تھا کہ گول میز کانفرنس کے لوگوں سے وہی برتاؤ کیا جائے جو خارجی سفارت کے عملہ سے ہوتا ہے۔ اپنی وضع میں یکتا ہے۔ گلی کوچوں میں سیمنٹ کی سڑکوں کے بجائے سمندر۔ سواری فقط گندولا۔ نہ بڑے شہروں کا گرد وغبار نہ شور نہ موٹر کے ہورن کی آواز پریشان کرتی ہے اور نہ ٹریم کی گھنٹی سمع خراش ہوتی ہے۔ کہیں کہیں موٹر بوٹ ضرور تھے۔ میرے خیال میں یہ اس شہر کی پرسکون

فضا کو خراب کرتے تھے۔ کہانیوں میں شہر خموشاں کا ذکر سنا تھا لیکن شب کو وینس واقعی شہر خموشاں ہو جاتا ہے۔

یہاں شیشے کا سامان بے نظیر بنتا ہے۔ میں نے اتنا خوبصورت شیشہ کہیں کا نہیں دیکھا۔ ہم نے شیشہ کا سامان خریدا۔ چائے اور کافی پینے کے برتن بہت حسین تھے۔ میرے ساتھیوں کو بہت ہی جلد معلوم ہوگیا کہ یہاں کے لوگ پردیسیوں سے قیمت بہت زیادہ مانگتے ہیں۔ اصلی قیمت ٹھہرانے کے بعد طے ہوتی ہے اس خاص معاملہ میں قاہرہ کے دوکاندار سب سے آگے ہیں۔ اصلی قیمت سے دوچند سہ چند طلب کرتے ہیں۔

میں نے کارخانے بھی دیکھے۔ یہ سب گھریلو کارخانے ہیں۔ چیزیں ہاتھ سے تیار کرتے ہیں اور ہاتھ ہی سے ان پر حسین نقش ونگار بناتے ہیں۔

یہاں میں نے سینٹ مارک کا مقبرہ بھی دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین میں سے تھے۔ پرانے مصورین کی تصاویر کے بہترین شاہکار یہاں موجود ہیں لیکن تمام تصاویر مذہبی تصاویر ہیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ کی کشتی۔ کبوتر کا درخت کی شاخ لے کر آنا۔ یہاں ہم نے ڈوجیز کے محل کو بھی دیکھا۔ یہ بڑی تاریخی جگہ ہے۔ اٹلی کی تاریخ کے بہت سے اوراق ایسے ہیں کہ جنھیں اس محل سے خاص نسبت ہے۔ یہاں بہترین تصاویر کا مجموعہ ہے۔ میں نے بعض تصاویر کی نقلیں خریدیں۔ اس محل میں دو تصاویر پرانی وضع کے فوجی افسران کی ہیں۔ دور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجسمہ ہیں حالانکہ فقط قلم کی صنعت ہے۔

اس گرجے اور محل کے سامنے بہت بڑا میدان ہے۔ یہاں ہزارہا کبوتر رہتے ہیں۔ انسان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ ہاتھوں پر آکر دانہ کھاتے ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے یہ میدان غلیظ رہتا ہے۔

یہ شہر ۱۱۷ جزیروں پر بسا ہوا ہے اور ۳۶۰ پل ہیں تاکہ پیدل چلنے والوں کو دقت نہ ہو۔

گرجوں کی عمارتیں بڑی شاندار ہیں۔ سلوٹے اور جیوسسٹ کے گرجے

دیکھے۔ سنگِ مرمر کا کام بے نظیر ہے لیکن مجھے آگرہ میں تاج محل کا کام زیادہ پسند ہے۔ ان گرجوں میں حضرت مریم کا مجسمہ اور دیگر اکابر دین کے مجسمے بہت خوب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں یہ شہر اپنی وضع کا ایک ہی ہے لیکن مجھے اس کی عمارتوں پر ایک افسردگی کا احساس ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا یہ شہر اپنا کام تاریخ عالم میں ختم کر چکا ہے۔ ایک جسم تھا جس میں روح کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ شاید میں خود افسردہ خاطر تھا اس لئے مجھے ایسا احساس ہوا ہو۔ وینس سے جس روز ہم روانہ ہونے کو تھے، علی الصباح مسعود میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے کہ راؤ عبدالحمید خاں (مرحوم) سخت دردِ شکم میں مبتلا ہیں۔ میں کیا کہوں مجھ پر کیا گذری۔ اول تو مرحوم کی صحت اس زمانے میں یوں ہی کچھ اچھی نہ تھی۔ اس سفر میں انھیں دانت میں بھی سخت تکلیف رہی تھی۔ اس پر درد کا دورہ پردیس میں بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ میں نے مسعود کو فروٹ سالٹ پلانے کی رائے دی۔ خود اپنے بکس سے کاسرِ ریاح دوائیں نکالیں۔ مگر جب میں دوائیں لے کر ان کے کمرے میں پہنچا تو عبدالحمید خاں (مرحوم) کا درد جا چکا تھا۔ ہم لوگ ۱۸؍اکتوبر کو فلورینس کو روانہ ہوئے۔ کوکس کے ذریعہ سفر کا انتظام کیا تھا جو ہر طرح قابلِ اطمینان تھا۔ مجھے یورپ کے اس تھوڑے سے قیام میں اس فرق کا اندازہ جو ہندوستان اور یورپ کی تہذیب وتمدن میں ہے واضح طور پر ہو گیا تھا۔ یہاں کا رہن سہن آب وہوا نظم ونسق کھیتی باڑی غرض ہر چیز میں بین فرق محسوس ہوتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اقتصادی حالات کا فرق تھا۔ ان اقوام کی مالی حالت ہم سے بدرجہا بہتر ہے۔ جیسے سینکڑوں مفلس خانماں برباد ہمارے ہاں نظر آتے ہیں۔ یہاں شاید ہی کوئی ہوگا۔ ان کا معیار زندگی ہم سے بلند ہے۔ یورپ میں مجھے دو باتوں کا بڑی سختی سے احساس ہوتا تھا۔ یورپین اقوام اور ہندوستانیوں کی مالی حالت کا فرق۔ دوسرے ان اقوام میں عام طور پر تنظیم جس طرح ہمارے یہاں بازاروں میں ریلوے اسٹیشن پر سینما کے دروازوں پر ہڑبونگ اور نفسی نفسی ہوتی ہے۔ وہ یہاں بالکل نہ تھی۔ ان اقوام میں بحیثیت قوم اور شخصی حیثیت سے بھی ڈسپلن ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ لوگ قانون کے ہم سے زیادہ پابند ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثر لوگ قانون

کی پابندی محض سزا کے اندیشہ سے کرتے ہیں۔ لیکن جہاں موقع ایسا مل جائے کہ بغیر اندیشۂ سزا قانون شکنی ممکن ہو تو اکثر حضرات کو تامل نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت حقیقی طور پر پابند قانون ذہنیت نہیں ہے۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا یورپ میں شہروں کے کوچہ و بازار ایسے بے فکروں اور بے کار لوگوں سے قریب قریب خالی ہوتے ہیں جیسے ہمارے بازاروں میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ لوگ دن بھر اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ہاں شام کو قہوہ خانہ اور ہوٹل بھر جاتے ہیں۔

میں ایک بار لندن میں ٹیکسی پر جا رہا تھا۔ ہم ایک ایسے چوراہے پر پہنچے جہاں برقی لالٹینوں کے ذریعہ کچھ دیر ایک طرف اور کچھ دیر دوسری طرف کا راستہ جاری ہوتا تھا۔ یعنی لالٹین ہری اور سُرخ ہو جاتی تھیں۔ جب ہم پہنچے تو لالٹین کا رنگ سُرخ تھا۔ اس نے موٹر روک لیا۔ گو وہاں نہ کوئی پولیس والا تھا اور نہ کوئی سواری گزر رہی تھی۔ لیکن یہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ لالٹین کا رنگ سبز نہ ہو گیا۔ اس مثال سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ لوگ قوانین کے کتنے پابند ہیں۔ ہم فلورینس پہنچے اور برکی ایلی ہوٹل Berckilli میں ٹھیرے۔ یہاں کی Picture gallary تصاویر کا ذخیرہ بہت اچھا ہے۔ بعض پرانا مجسمہ اور تصاویر تو یونان سے روم آئے اور وہاں خاندان مجتھیا کے عروج کے زمانے میں یہاں لائے گئے۔ یہ تمام تصاویر یا تو پرانے یونانی قصوں پر مبنی ہیں یا انجیل اور توریت سے ماخوذ ہیں۔ یہاں حضرت مریم کی ایک مشہور عالم تصویر ہے۔ اس کو ''نیلی مریم'' اس وجہ سے کہتے ہیں کہ چادر کا رنگ نیلا ہے۔ اس کی ایک کاپی میں نے بھی خریدی۔

۱۹ر اکتوبر کی صبح کو پھر راؤ عبدالحمید خاں کو درد کا دورہ ہوا۔ اس بار اتنا سخت درد تھا کہ ڈاکٹر بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے آتے ہی افیون کی پچکاری لگا دی تب کہیں جا کر سکون ہوا۔ لیکن چونکہ اجابت نہیں ہوئی تھی ہم لوگ سخت پریشان تھے۔ پردیس میں ایسی علالت انتہائی پریشانی کا باعث ہو جاتی ہے۔ گھر کوسوں دور۔ وسوسوں کا ہجوم کیا کہوں وہ دن کیسے گذرا۔ شام کو مرحوم کا نشہ کم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ درد رفع ہو گیا تھا تو جان میں جان آئی۔ ہم لوگ سیر کو گئے مگر دل عبدالحمید خاں مرحوم ہی میں پڑا تھا۔

جلد ہی لوٹ آئے۔ میں جو لوٹ کر کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مرحوم کے بستر کے قریب سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ میں یہ سمجھ کر شاید سگریٹ پی رہے ہیں۔ میرے سامنے وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے واپس ہونے لگا۔ نواب صاحب البتہ اندر چلے گئے۔ نواب صاحب کی آواز پر میں پلٹا تو دیکھا نواب صاحب بڑی بے تابی سے مرحوم کے بستر کی آگ بجھا رہے ہیں۔ ہوا یہ کہ مرحوم نے سگریٹ پی۔ افیون کے انجکشن کا اثر ابھی باقی تھا۔ کچھ دیر بعد پھر غافل ہوگئے اور سگریٹ بستر میں گری اور آگ لگ گئی۔ خدا نے خیر کی، چونکہ عبدالحمید خاں مرحوم کا درد رفع ہوگیا تھا۔ ہم لوگ شہر میلانو کو روانہ ہوئے۔ گہرا ابر محیط تھا اور ترشح ہو رہا تھا۔ یہاں ہم ڈولورڈ ہوٹل میں ٹھیرے۔ صبح کو یہاں کا مشہور گرجا دیکھنے گئے۔ کیا خوب عمارت ہے! عجب نہیں یہ دنیا کا حسین ترین گرجا ہو۔ اس گرجے کے دروازے پر پیتل چڑھا ہوا تھا۔ جس پر حضرت مریم کی زندگی کے حالات تصویروں میں دکھائے گئے ہیں۔

ایک جگہ حضرت عیسیٰ کا پیدا ہونا دکھایا ہے۔ زائرین بچہ کے پاؤں کو تعظیماً چھوتے ہیں۔ اس جگہ کی پیتل گھس گئی ہے اور پاؤں کا حصہ غائب ہونے کے قریب ہے۔ میں نے بھی چھوا۔ یہ ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ سنگ مرمر سے بنائی گئی ہے۔ بہترین نقش و نگار ہیں۔ یورپ میں سنگ مرمر کا کام اتنا خوبصورت میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ اس گرجے میں حضرت مریم کا ایک مجسمہ ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ کو گود میں لئے کھڑی ہیں یہاں سینکڑوں لوگ روزانہ بیماروں کی شفا کے واسطے دعا کرنے آتے ہیں اور اس مجسمہ کے سامنے تین موم بتیاں جلا دیتے ہیں۔ پھر دعا کرتے ہیں۔ بیسیوں موم بتی روشن تھیں۔ عقیدت مند گھٹنوں پر کھڑے ہوئے مصروفِ دعا تھے۔ یہاں کا رنگ دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ عیسائیوں میں دو فرقے کیسے ہوگئے جیسے ہندو دھرم میں مورتی پوجن کے خلاف آریہ سماج نے آواز بلند کی اسی طرح عیسائیت کے اس رنگ کا نتیجہ پروٹسٹنٹ فرقہ ہوا۔ مورتی پوجن اور یہاں کی عبادت میں کچھ فرق نہیں ہے۔

یہاں امراء کا ایک قبرستان بھی ہے جسے لوگ دیکھنے جاتے ہیں۔ میں تو دروازے ہی سے نظر ڈال کر ہٹ گیا۔ مجھے کچھ ایسا احساس ہوا کہ قبروں کا تماشا بنانا یا سیر کو جانا علاوہ غیر فطری حرکت ہونے کے اہلِ قبور کی بے حرمتی ہے۔ اس کے

بعد یہاں سے ساڑھے دس بجے کی ریل سے ہم سوئزرلینڈ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں جھیل ماجری کے کنارے سے ریل گزرتی ہے۔ کیسا دل کش منظر تھا۔

سوئزرلینڈ

ریل جتنی اندرون ملک بڑھتی گئی گردوپیش کا نظارہ ہمیں مسحور کرتا گیا۔ برف پوش پہاڑ کی چوٹیاں دامنِ کوہ میں سبزہ زار، چھوٹی چھوٹی ندیاں صاف وشفاف ایسا دل فریب اور جاذب نظر سین تھا کہ ہم لوگ دیوانہ وار ادھر سے اُدھر کھڑکیوں سے آ کر دیکھتے تھے۔ مہینہ اکتوبر کا تھا اس لئے خزاں کا رنگ پتوں پر شروع ہو گیا تھا۔ بعض درختوں کے پتے زرد اور سبز تھے اور بعض کے سُرخ۔ سورج کی شعاعیں کچھ اس طرح ان درختوں پر پڑ رہی تھیں کہ یہ خیال ہوتا تھا کہ قوس قزح کے رنگوں سے پہاڑیوں کو رنگ دیا گیا ہے۔ یہ قدرتی مناظر اتنے دل کش تھے کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ ان کی تصویر ان سے حسین نہیں ہو سکتی۔ ہم سب کچھ اس درجہ متاثر تھے کہ یہ رائے قائم ہوئی کہ یہاں ایک مکان خرید اجائے ہم لوگ شام تک مونٹ روMontreeve پہنچے۔ گولف ہوٹل میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ شہر جنیوا جھیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں کی آب وہوا اور حسین مناظر کا کیا کہنا۔ یہ ہوٹل جھیل کے کنارے ہے۔ کمرے کے دریچہ سے جھیل نظر آتی تھی۔ اس جھیل میں ''سی گل'' پرند بڑی کثرت سے ہیں۔ یہ پرندا تنے مانوس ہو گئے ہیں کہ دریچہ میں اگر روٹی کے ٹکڑے لے کھڑا ہو جائے تو یہ ہاتھ سے ٹکڑے لے جاتے ہیں۔

دوسرے روز علی الصباح ایک چھوٹے جہاز سے ہم لوگ شہر جنیوا گئے۔ یہ شہر بھی اسی جھیل کے کنارے آباد ہے۔ اور اسی کے نام سے موسوم ہے مونٹرو سے جنیوا تک سترہ اٹھارہ میل کا فاصلہ ہو گا۔ صبح کا وقت تھا کڑاکے کی سردی تھی۔ شب کو گردوپیش کی چوٹیوں پر ہلکی سی برف باری ہوئی۔ ہمارے جہاز سے ڈر کر مرغابیاں اڑتی اور پھر کچھ آگے گر پڑتیں۔ اس جھیل میں ہر قسم کی مرغابیاں لاکھوں ہیں۔ سوان بھی بڑی کثرت سے اس جھیل میں رہتے ہیں۔ بارہ بجے کے قریب ہم لوگ جنیوا پہونچے اور ایک ہوٹل

میں کھانا کھایا۔ کنارے پر سوڈیڑھ سو "سوان" ایک جگہ جمع تھے۔ میں نے ان کی تصویر لے لی یہاں آکر صبح کی سردی کا اثر ہوا۔ کچھ بارش بھی ہو رہی تھی مجھے زکام ہو گیا اور میں چار بجے کی گاڑی سے اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔

دوسرے روز بڑی ہی خوبصورت صبح طلوع ہوئی۔ شب کو ہلکی برف باری ہوئی تھی۔ برف ابھی درختوں پر موجود تھا۔ آسمان صاف ہو چکا تھا۔ سامنے جھیل۔ آبی پرند کثرت سے اُڑتے پھرتے تھے۔ ہوٹل کے دریچہ سے میں دیکھ رہا تھا اور نظارہ میں ایسا گم ہو چکا تھا کہ ہوٹل کی ملازمہ ناشتہ لے کر آئی تو میں چونگ پڑا شین کا قلعہ جھیل کے کنارے ہے اسے دیکھنے گئے۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ دیکھنے کے بعد یہ عمارتیں آنکھوں میں نہیں سماتیں۔

پیرس

یہاں سے ۲۳؍ اکتوبر کو ڈیڑھ بجے دوپہر کی گاڑی سے چل کر ساڑھے دس بجے تک پیرس پہنچے Bourgoque et Montana ہوٹل میں ٹھہرے۔ راہ میں مختلف پرند دیکھے جو ریل سے نظر آئے۔ انھیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یورپ میں جنگلی جانوروں کا قریب قریب قصہ ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں غول در غول جنگلی چرند و پرند پائے جاتے ہیں۔ یورپ میں سوائے شکارگاہوں یا ان رقبات کے جو جانوروں کے واسطے محفوظ کیے گئے ہیں جنگلی چوپائے تو ہیں ہی نہیں اور پرند بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔

میں یہ خیال کرتا رہا کہ زیست کی کش مکش بہر رنگ کمزور کو مٹاتی جاتی ہے اور زبردست دنیا پر قابض ہوتا جاتا ہے۔ جب انسان کی تعداد میں اضافہ ہوا تو یونہی جنگل ختم ہو گئے اور کھیتی باڑی کی حفاظت کے سلسلہ میں جانوروں کو مجبوراً ختم کرنا پڑا۔ یہی حالت اقوام کی ہے۔ طاقتور اقوام کمزور قوموں کو مٹا رہی ہیں۔ زبان سے انصاف اور مساوات کے بڑے بڑے اصول بیان کیے جاتے ہیں۔ کمزور ان امید افزا الفاظ پر اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو انہی الفاظ کے معنی کچھ اس طرح بدلے جاتے ہیں کہ کمزور منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ پھر مجھے اپنا ملک

یاد آتا رہا اور بالکل ایک متضاد نے خیال دماغ کو گھیر لیا۔

دوسرے روز پیرس کی سیر کی۔ اس شہر کی آرائش دوکانوں کی سجاوٹ اور روشنی بے مثل ہر شب کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ تصویروں کا عجائب خانہ قابلِ دید ہے۔ اس میں اس قدر تصاویر اور مجسمے ہیں کہ ان کی سیر کو ہفتوں درکار ہیں۔

یہاں کے تھیٹر بہت عجیب وغریب ہیں۔ کھانے کے بعد ہم لوگ تھیٹر میں گئے۔ اتنا نفیس تماشا اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تمام اسٹیج بقعۂ نور بن رہا تھا۔ ایک جگہ طوفان اس خوبی سے دکھایا گیا تھا کہ میں متحیر رہ گیا۔ تیز ہوا کے جھونکے اسٹیج پر درختوں پر طوفانی کیفیت پیدا کر رہے تھے بجلی کی چمک اور کڑک بادلوں کا تیز ہوا میں اڑنا۔ دریا میں تموج بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ حقیقتاً ایک طوفان برپا ہے۔

اسی طرح سے ایک حصہ نیلا ڈیوب کے نام سے تھا۔ میلوں دریا بہتا معلوم ہوتا تھا سبزی اور نیلاہٹ میں اس طرح کی چمک تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ بس ایک دل کش خواب معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کے تماشوں میں کپڑے کے استعمال میں تخفیف اکثر مدِ نظر ہوتی ہے یہاں مشہور ہے کہ پیرس رات کے بارہ بجے بیدار ہوتا ہے۔ شب کو قہوہ خانوں میں لوگوں کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ بیان سے باہر۔ یہاں قہوہ تو شاید ہی کوئی پیتا نہ ہو۔ بقول غالب ''بادہ ہائے گوارا'' اور ''نازنین بتانِ خود آرا'' کی کارفرمائی رہتی ہے۔

یہ نظارہ جس قدر نیا اور دل چسپ تھا اتنا ہی فکر انگیز بھی تھا۔ خیال آتا تھا کہ جو قوم عیش ونشاط کی اس درجہ دلدادہ ہو چکی ہو وہ زندگی کی آزمائشوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکے گی کیا ایسے لوگون میں قربانی کا کوئی مادہ باقی رہ سکتا ہے۔ کیا وقت ضرورت یہ لوگ اپنی اس پُر کیف زندگی کو یکایک خیر باد کہہ سکیں گے۔ کیا اس قدر پُر لطف زندگی کی محبت انھیں موت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے دے گی۔

یہاں سلطان مراکو نے ایک مسجد بنوائی ہے۔ بہت خوبصورت اور قابل دید عمارت ہے۔ نپولین کا مقبرہ بھی دیکھا۔ جہاں اس کی ہڈیاں لا کر رکھی گئی ہیں۔ بڑی عالی شان عمارت ہے۔ ایفل ٹاور بھی دیکھا۔ یہ آہنی مینار دنیا کا بلند ترین مینار خیال

کیا جاتا ہے۔ اس کی بلندی نو سو فیٹ ہے ۲۶ راکتوبر کی شام کو ہز ہائی نس آغا خاں کے ہاں چائے پینے کا اتفاق ہوا۔ سیاسی موضوعات پر دوران گفتگو میں فرمانے لگے کہ وہ ہر خدمت کے لئے تیار ہیں اور مسلمانانِ ہند کی ترجمانی کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔

۲۷ راکتوبر کو پیرس سے روانہ ہو کر کیلے پر انگلش چینل کو عبور کیا۔ کسٹم پر ہم لوگوں کو کوئی دقت نہیں ہوئی۔ گورنمنٹ کے احکامات تھے کہ ہمارے اسباب نہ دیکھے جائیں۔ انگلستان پہنچ کر اس حیثیت سے بڑی تفریح ہوئی کہ ایک ایسے ملک میں آ گئے جہاں کی زبان سمجھ سکتے تھے۔ سوائے سوئزرلینڈ کے جہاں کئی زبانیں بالعموم بولی جاتی ہیں اور ہر جگہ عجیب مجبوری کا احساس ہوتا تھا۔ گو ہمارے ساتھ اسکوٹ اوکونر تھے۔ مگر ان کی فرنچ بھی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ اہل زبان مشکل سے سمجھتے تھے۔ مترجم سے کام چلانا اور بات ہے مگر کسی ملک میں پہنچ کر وہاں کی زبان نہ سمجھنا بڑی ہی بے بسی ہے۔

مجھے کسی نے اس سفر میں ایک مزاحیہ قصہ زبان نہ جاننے کے سلسلے میں سنایا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک صاحب کسی ملک میں پہنچے۔ زبان سے ناواقف تھے اور اسٹیشن پر جانا چاہتے تھے۔ موٹر والے کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اس کی سمجھ میں ان کا منشا نہ آیا۔ آخر کار سیاح نے مجبور ہو کر ایک نیا طریقہ اظہار منشا کا اختیار کیا۔ وہ فوراً چاروں ہاتھ پاؤں سے بچوں کی طرح زمین پر چلنے لگے اور اوپر کو منہ اُٹھا کر ایک چیخ لگائی اور بھک بھک منہ سے آواز نکالنے لگے۔ موٹر والے نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ وہ ان کا منشا سمجھ گیا اور یہ خوش خوش موٹر میں سوار ہو گئے۔ سیاح صاحب اس پر مسرور تھے کہ انھوں نے زبان کا کام اپنے طریقہ سے نکال لیا۔ اب موٹر ایک عالی شان عمارت کے سامنے رُکا، یہ اندر گئے وہاں کوئی شخص ایسا مل گیا جو ان کی زبان جانتا تھا اس نے بتایا کہ عمارت پر جلی حروف میں ''پاگل خانہ'' لکھا تھا۔

انگلستان

شام تک لنڈن پہنچے اور ہائیڈ پارک کے قریب الگزنڈا ہوٹل میں ٹھہرے۔ وہاں حافظ ہدایت حسین مرحوم، راجہ اور رانی بشیشر دیال سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر دت

نے، جو گول میز کانفرنس کی طرف سے مہمان نوازی پر مقرر تھے، پارلیمنٹ کے افتتاح کا ٹکٹ دیا۔ ۲۸ر اکتوبر کو میں پارلیمنٹ کا افتتاح دیکھنے گیا۔ ہم لوگوں کو پیرس گیلری میں بلایا گیا تھا۔ وہاں سے بادشاہ اور بادشاہ بیگم گذریں۔ پورا شاہی لباس زیب تن اور متوسلین جلو میں تھے۔ لیکن شاہی تقریر سننے کا موقع نہ ملا۔

شام کو درزی کے ہاں پہنچ کر کپڑے سلوائے۔ گو ہندوستان میں مجھے انگریزی لباس سے کچھ بہت ذوق نہ تھا۔ سوائے شکار یا ٹینس کے میں انگریزی کپڑے پہننے کا عادی نہ تھا۔ لیکن ولایت میں روزانہ زندگی ہندوستانی کپڑوں میں گذارنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔ ہر ملک کا لباس وہاں کی آب وہوا کے مطابق ہوتا ہے ہندوستانی لباس یہاں خاص کر موسم سرما میں بہت غیر موزوں ہے۔ تماشا دیکھنے کا شوق تو قدرتی خواہش ہے مگر تماشا بن جانا تو بہت ہی گراں ہوتا ہے۔ جس طرف جایئے لوگ غور سے دیکھتے ہیں۔ پھر ہندوستانی لباس کی بدولت خواہ مخواہ ''یور ہائنس'' بنا دیا جاتا ہے گو ''یور ہائنس'' کا خطاب انگریزی لباس کے باوجود ملتا رہتا ہے۔ مجھے اس سے خاص چڑ تھی اور ہمیشہ اس غلط فہمی کی اصلاح کرتا تھا۔ یورپ میں ہر ہندوستانی کو ہائینس سمجھا جاتا ہے اور اس وجہ سے اکثر دشواریاں ہو جاتی ہے۔

انگلستان میں اس زمانے میں مزدور گورنمنٹ تھی ارمسٹر وتیج۔ وڈ بین وزیر ہند تھے۔ کنزرویٹو لوگ وزیر ہند کو عظمت وعزت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ میں ۴ر نومبر کو ملک عمر حیات خاں ٹوانہ مرحوم سے ملا تو وہ ہر ترقی کے مخالف تھے۔ وہ کسی ایسی تبدیلی کو جو انگریزی حکومت کے اختیارات کو کم کرے پسند نہ کرتے تھے۔ اسی روز سر فرینک براؤن اور سر مائیکل اوڈائر سے لنچ پر ملنا ہوا یہ لوگ Law & Order کے منتقلی کے خلاف تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ آگے بڑھنا ضروری ہے۔ بہرحال قدامت پسند پارٹی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ Law & Order کسی طرح بھی منتقل نہ کیا جائے۔ مجھے ہر موقع پر ان حضرات سے کہنا پڑتا تھا کہ پرانی پالیسی نہ اب ہندوستان کے واسطے مفید ہے اور نہ انگلستان کے واسطے۔ ۴ر نومبر کو دس بجے وزیر ہند سے ملا۔ یہ بہت متواضع اور خلیق آدمی ہیں، دل سے چاہتے ہیں کہ کانفرنس کامیاب ہو۔ تقریباً

چالیس منٹ تک ہندوستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے ان سے کہا کہ مسلمانانِ ہند ترقی کے خلاف نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ حکومت خود اختیاری مل جائے۔ مگر اسی کے ساتھ ایسے تحفظات بھی ہوں کہ خود مختاری حکومت کے بعد اکثریت اگر تنگ نظر ہو جائے تو انھیں تکلیف نہ پہنچا سکے۔ میں نے ان سے کہا کہ اصل دشواری یہ ہے کہ اگر سیاسی اختلاف ہو تو آج قوم اگر ایک پارٹی کے ساتھ ہے تو کل دوسری جماعت کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ آج مزدور جماعت سب سے بڑی پارلیمنٹ میں ہے۔ آئندہ انتخاب میں ممکن ہے کہ مزدوروں کی کامل اکثریت ہو جائے۔ ممکن ہے کہ یہ تعداد بھی نہ رہے لیکن ہندوستانی مسلمان کی دشواری یہ ہے کہ وہ کسی بھی سیاسی پروگرام کو اختیار کرے ہمیشہ اقلیت میں ہی رہے گا اس وجہ سے اسے تحفظات کی ضرورت ہے۔

۵ر نومبر کو میں لارڈ ہلشم اور ارل ونٹرٹن سے ملا۔ یہ قدامت پسند جماعت کے حقیقی نمائندے ہیں وہ مسلمانوں کو تحفظات دینے کو تیار ہیں مگر ہندوستان کی آزادی کے خلاف ہیں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قدامت پسند حضرات کو مسلمانوں کے تحفظات کے مطالبہ سے ہمدردی اس وجہ سے بھی تھی کہ ایسا مطالبہ جمہوری حکومت کے ساتھ قانون میں رکھنا آسان نہ تھا۔ اگر تحفظات قانون میں رکھے جائیں تو اس کا ضامن کون ہو کہ ان پر عمل بھی ہوگا۔ اگر اکثریت ایسے تحفظات کو پس پشت ڈال دے تو اسے کون مجبور کر سکتا ہے۔ اگر یہ کسی باہر کی طاقت پر منحصر ہو تو اس حد تک ہندوستان کی حکومت کی خود مختاری نامکمل ہوگی۔ ان حضرات کو ایوانِ اعلیٰ کی تجویز سے بھی اتفاق تھا۔

شام کے وقت گول میز کانفرنس کی ایک بج کی میٹنگ تھی جس میں وزیر ہند موجود تھے۔ کانفرنس کا طریقۂ کار Procedure تجویز کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس میں مسٹر جناح، سر تیج بہادر سپرو، سر محمد شفیع، مسٹر شاستری اور ایک دو اور حضرات تھے۔

پہلے روز کے لئے مسٹر جناح اور شاستری مقرر تجویز کئے گئے۔

سر فنلیٹ اسٹیوارٹ سے ملا۔ یہ وزیر ہند کے مستقل سکریٹری تھے۔ بہت سمجھدار

اور ہندوستان کے حالات ومعاملات سے باخبر تھے۔علاوہ Law& Order کے ایک دوسرا مضمون جو ولایت میں بہت اہم سمجھا جاتا تھا وہ فوج کا سوال تھا۔ سائمن کمیشن فوج کو ہندوستانی اقتدار سے قطعاً باہر رکھنا چاہتی تھی اس مسئلہ پر سر فنلیٹ نے مجھ سے سوال کیا میں نے کہا کہ یہ بہت ہی دل چسپ بات ہوگی ایک طرف فوجی معاملات میں ہمیں دخل نہ ہوا اور دوسری طرف کہا جائے کہ تم اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتے وہ اسے مانتے تھے کہ فوجی معاملات میں بھی ہندوستانیوں کو اختیار دینا ہوگا۔

مجھے ایک روز مسٹر ڈاسن آنجہانی نے اپنے گھر لنچ پر بلایا۔ مارکوئیس لودھین اور آنریبل اولیور سٹینلی موجود تھے۔ یہ دونوں حضرات لبرل اور کنزرویٹو پارٹی کی طرف سے کانفرنس پر تھے۔ بہت اچھی صحبت رہی۔ یہ دونوں حضرات نہایت ذی ہوش خوش فہم اور قابل تھے۔ ذمہ دار عہدوں پر رہے آنریبل اسٹینلی تو کیبنٹ کے ممبر بھی رہے۔ گفتگو کا رنگ پولیٹکل نہ تھا۔ لیکن میں نے یہ ضرور ظاہر کردیا کہ مجھے لارڈ ارون کی پالیسی سے اتفاق ہے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں کی بہتری اس میں ہے ہندوستان کو خودمختاری حکومت کی طرف بڑھنے میں مدد دی جائے۔ سیاسی لحاظ سے اقلیتوں خاص کر مسلمانوں کی پوزیشن گول میز کانفرنس میں اسی لحاظ سے بڑی دشوار تھی کہ وہ ایک طرف تو ہندوستان کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ دوسری جانب انھیں اس کا یقین نہ تھا کہ اکثریت ان کے ساتھ کامل خودمختاری کے بعد بھی انصاف، وسعتِ نظر اور رواداری برتے گی۔ انھیں اس کی فکر تھی کہ آئندہ قانون میں ان کی حفاظت کا کافی لحاظ رکھا جائے۔ ایک بار ایک میٹنگ مسلمان ممبران کی ریٹز ہوٹل میں ہورہی تھی۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی پوزیشن کے متعلق یہ الفاظ کہے۔

Gentlemen, the position is, Hindu wants Suraj, you want safe guards.

حضرات صورتِ حال یہ ہے کہ ہندو حکومت خودمختاری چاہتے ہیں اور آپ ''تحفظات''۔ مسلمان کا نقطۂ نظر میری دانست میں یہ تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری مل جائے لیکن چونکہ تعداد میں کم ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ قانون

میں تحفظات ہوں تا کہ جدید طرزِ حکومت میں اسے بھی احساس آزادی اور خود مختاری ہو۔ نئے نظام کی بنیاد پارلیمنٹری طرزِ حکومت پر ہو سکتی تھی جس میں فیصلہ کثرت رائے پر ہوتا۔ مسلمان اس رائے شماری سے غیر مطمئن ہو کر تحفظات چاہتا تھا۔ مگر قدرتاً ایسے تمام تحفظات خود مختاری میں کسی نہ کسی حد تک کھنڈت ڈالتے ہیں۔ یہ مسلمان کا دردِ سر تھا۔

ہندوستان کے نمائندہ حضرات کے لیڈر ہز ہائی نس آغا خان ہوئے۔ ابھی تک فرقہ وارانہ ذہنیت میں اتنی رواداری تھی کہ آغا خان متفقہ طور پر لیڈر بنائے جا سکیں۔

دوسری دشواری ہندوستان کی خود مختاری کے راستہ میں والیانِ ملک کا وجود تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ملک کی حکومت جہاں اتنی زبانیں بولی جاتی ہوں اتنے مذاہب ہوں اور اس قدر مختلف خیالات کی اقوام رہتی ہوں فیڈرل نوعیت کی حکومت ہی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا یہی متفقہ طور پر طے پایا کہ طرز جدید کی بنیاد فیڈریشن پر ہو۔ اس پر والیان ملک راضی ہو گئے۔ ان لوگوں کو راضی کرنے میں سر تیج بہادر سپرو آنجہانی اور رائٹ آنریبل جیکر کا بڑا ہاتھ تھا۔

والیانِ ملک میں مہاراجہ پٹیالہ آنجہانی مہاراجہ بیکانیر آنجہانی اور ہز ہائی نس بھوپال نے اس میں خاص حصہ لیا۔ ان حضرات نے سب سے پہلے اپنی رضامندی دے کر فیڈریل اسکیم کو قابل عمل بنا دیا۔ والیانِ ملک کی رضامندی سے ایسے لوگوں کو جو ہندوستان کی ترقی کے خواہش مند تھے اطمینان ہوا۔ لیکن اس کا اثر مختلف طبقات میں یکساں نہ تھا۔ ہندوستان میں عام طور پر اسے اچھی نظر سے دیکھا گیا۔ ولایت میں لیبر حکومت اس سے مطمئن تھی۔ کنزرویٹو متحیر تھے۔ لیبرل گو برائے نام رہ گئے تھے مگر وہ بھی مطمئن تھے۔

والیانِ ملک کا یہ فیصلہ گو آخر تک قائم نہ رہا لیکن گول میز کانفرنس میں اس سے ضرور مدد ملی۔

پہلی گول میز کانفرنس کے چند ہی ماہ کے بعد پرنس نے اپنی رائے بدل دی۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ پوری طرح اس کے نتائج کو سمجھ نہ سکے تھے۔ پرنس کے ذہن میں فقط یہ خیال تھا کہ وہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی مداخلت سے کسی حد تک نجات پا جائیں گے۔

ان کے نامزد کیے نمائندے دہلی کی اسمبلی میں ہوں گے اور اس طرح پرنس خود بڑی حد تک مرکزی حکومت کو متاثر کر سکیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا خیال یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ دہلی کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ انہیں ناچ نچائے خود دہلی ان کے زیر اثر ہوگی۔ جب اس کی تفصیلات سامنے آئیں تو حالات کا صحیح اندازہ ہوا۔ سب سے پہلے کانگریس نے یہ کہا کہ ریاستوں کے نمائندے انتخاب سے ہوں۔ والیان ملک کو نامزدگی کا اختیار نہ ہو۔ یہ مسلم لیگ کا بھی خیال تھا۔ والیانِ ملک کی رعایا خود بھی اسی کی طالب تھی کہ نمائندے بذریعہ انتخاب ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ پرنس کو جلد ہی اس کا یقین ہو گیا کہ ایک جمہوری نظام حکومت کے ساتھ شخصی خودمختاری کا پیوند ناممکن ہے۔ اب ان والیانِ ملک نے جو پہلے شامل ہونے کا وعدہ کر چکے تھے کسی نہ کسی بہانے سے ہٹنا شروع کیا۔

وزراء میں سے سر اکبر حیدری مرحوم حیدر آباد کی طرف سے گئے تھے اور سر مرزا اسماعیل میسور کی طرف سے۔ سر مرزا کو تو چنداں دقت نہیں ہوئی۔ مہاراجہ میسور کامل طور پر سر مرزا پر بھروسہ کرتے تھے اور اس پر راضی ہو گئے کہ میسور فیڈریشن میں شریک ہو جائے۔ لیکن سر اکبر کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف حکومتِ ہند کو یقین دلایا تھا کہ وہ حیدر آباد کو شامل کرا دیں گے۔ دوسری جانب نظام نے صاف صاف انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے باہمی تعلقات میں بدمزگی ہوئی اور آخر کار سر اکبر کو حیدر آباد ۴۱ء میں چھوڑنا پڑا۔ اگر حکومت ہند ان کی مدد نہ کرتی تو شاید ان کو اس سے پہلے ہی علیحدہ ہونا پڑتا۔

اسی زمانے میں ایک قصہ سنا گیا۔ راوی کا نام یاد نہیں آتا لیکن اتنا یقین ضرور ہے کہ وہ ذی مرتبت اور ذمہ دار شخص تھا۔

شہنشاہ معظم فیڈریشن پر راضی تھے۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ شاہ جارج پنجم ہندوستان میں خودمختار حکومت پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا نظریہ وہی تھا جو اس زمانے میں کنسرو ٹو پارٹی کا تھا۔ یعنی ہندوستان خودمختار حکومت کا بار سنبھالنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ لہٰذا وہ فیڈریشن کی تجویز کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ایک دن رمزے میگڈانل نے جو وزیر اعظم تھے۔ ان سے کہا کہ فیڈیشن کا ایک نفع یہ بھی ہے کہ والیانِ ملک کی ریاستوں کا رقبہ قانوناً برٹش انڈیا کا حصہ نہ تھا۔ فیڈریشن کے بعد قانوناً وہ بھی برٹش انڈیا

میں شامل ہو جائے گا۔ نیز خود مختاری کا یہ بہترین توڑ ہے اس واسطے کہ فیڈ ریشن کی بنیاد معاہدوں پر ہوگی۔ پھر اس سے کوئی نکل نہ سکے گا۔ راوی کا بیان تھا کہ اس تفسیر کے بعد بادشاہ کو اس تجویز سے کوئی اختلاف نہ رہا تھا اور اکثر وزیر اعظم سے دریافت کرتے تھے کہ اس تجویز کے سرسبز ہونے کے امکانات کیا اور کتنے تھے۔

میں اکثر ممبران پارلیمنٹ کو کھانے پر بلاتا تھا اور ہندوستان کے مستقبل کے متعلق گفتگو ہوتی تھی ہاؤس آف کامنس میں ممبران بلا لیتے تھے۔ وہاں ڈنر کے بعد اسی مسئلہ پر گفتگو ہوتی تھی۔ کبھی سیاسی پارٹیوں کے لوگ لنچ یا ڈنر پر مدعو کر لیتے تھے۔ ایسے لنچ اکثر ان پارٹیوں کے کلب میں ہوتے تھے۔ ہر موقع پر زیر بحث وہی ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ یعنی ہندوستان کا مستقبل۔

میرا خیال ہے کہ مختلف سیاسی جماعتوں کے ممبروں سے بیک وقت گفتگو کرنا کچھ سودمند نہیں ہوتا اس لئے بذات خود میں مختلف جماعتوں سے الگ الگ گفتگو کرتا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان میں مسلم لیگ کا چنداں اثر نہ تھا۔ ایک دوسری جماعت مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے وجود میں آئی تھی۔ یہ جماعت ہز ہائی نس آغا خان کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اسی جماعت کے ہاتھ میں تھی۔ مسلم کانفرنس نے چودہ پوائنٹ مسلمانوں کے تحفظ میں قائم کئے تھے جنہیں مسٹر جناح نے بھی مسلم لیگ کی طرف سے منظور کر لیا تھا۔ جو عام طور پر مسٹر جناح کے چودہ پوائنٹ کے نام سے مشہور ہوئے۔

صوبجات کی کمیٹی

صوبجات کی حکومت کا نقشہ بنانے کے لئے جو کمیٹی بنی تھی اس کا ایک ممبر میں بھی تھا۔ اس کمیٹی میں یہ تو فوراً طے ہو گیا کہ صوبجات میں پوری ذمہ دارانہ حکومت دی جائے لیکن اس پر بحث تھی کہ تحفظات مسلمانوں کے واسطے کیا ہوں اور وزارتیں کیسے بنائی جائیں۔ اس پر اتفاق تھا کہ اقلیت کی نمائندگی وزارت میں ضرور ہو۔ اگر قانون میں شامل ہو سکے تو فبہا ورنہ گورنر جنرل اور گورنروں کو جو ہدایت دی جائیں اس

میں اس کی تصریح کردی جائے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ خود مختار پارلیمنٹری حکومت میں تحفظات نقیض پیدا کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال بدیہی وزارت کا تقرر ہے۔ فرض کیجئے جو پارٹی اکثریت میں ہے اس میں کوئی مسلمان نہ ہو۔ وزارت اب کیسے بنے اگر گورنر یا گورنر جنرل مجبور کرتا ہے کہ دوسری کسی پارٹی سے مسلمان لئے جائیں تو پارلیمنٹری حکومت کے خلاف ہوتا ہے۔ یعنی بجائے وزیر اعظم کے گورنر کو ممبران گورنمنٹ کے تقرر میں دخل ہوتا ہے۔ مجھے اس دشواری کا پورا احساس تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارے ملک کے حالات وہ نہ تھے جو برطانیہ اور دوسرے یورپین ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان میں مخلوط حکومتوں کا بننا مفید ہوتا۔ بشرطیکہ اکثریت بھی اس اصول کو دل سے مان لے اور دیانت سے اس پر عمل کرے اور اس کی کوشش کرے کہ یہ طرز حکومت کامیاب ہو۔ ورنہ یہ دشواری ہوسکتی ہے کہ اکثریت نے اصول کو نہ مانا اور گورنر نے اصرار کیا تو اس نے حکومت بنانے سے انکار کیا۔

واحد پارٹی حکومت

میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کافی عرصہ تک ہندوستان کے لئے کسی ایک سیاسی جماعت کی حکومت مفید نہ ہوگی۔ اگر مشترکہ حکومت ہوگی تو ہر جماعت کے بہترین اشخاص آسکیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ پارٹی کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ لیکن ملک میں جو اطمینان اور بھروسہ مشترکہ گورنمنٹ پر ہوگا وہ فقط ایک پارٹی کی حکومت پر نہیں ہوسکتا۔ مخلوط یا مشترکہ گورنمنٹ میں قدرتاً مختلف خیال کے لوگ ہوتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ پارٹی کا اصلاحی پروگرام مخلوط حکومت میں اتنی سرعت اور طاقت سے نہیں چلتا جتنا ایک پارٹی کی حکومت میں چلتا ہے۔ لیکن کیا ملک کے واسطے یہ بہترین نہیں کہ اصلاحات کی رفتار چاہے کم ہو لیکن لوگوں کو حکومت پر بھروسہ ہو اور دلوں میں اطمینان ہو۔ میرا تجربہ یہ بھی ہے کہ جب کسی حکومت میں مختلف الخیال لوگ ہوتے ہیں تو گورنمنٹ کی میٹنگ میں کبھی کبھی کافی تلخی پیدا ہوجاتی ہے۔ مباحثہ میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ بایں ہمہ فیصلہ ایسا ہوتا ہے جسے ملک کا ہر چھوٹا

بڑا پسند کرے یا نہ کرے برداشت ضرور کر لیتا ہے۔

۳۱ء کے جنرل الیکشن کے بعد انگلستان میں مخلوط حکومت بنائی گئی ہے جسے نیشنل گورنمنٹ کہا گیا کنسرویٹو کی بڑی اکثریت تھی لیکن اپنی تعداد کی زیادتی سے نفع اٹھانے کے بجائے انہوں نے مخلوط حکومت کی بنیاد رکھی اور مزے میگڈانل کو وزیر اعظم بنایا۔ انگلستان میں نیشنل حکومت تقریباً پندرہ برس جنگ کے آخر تک قائم رہی۔ اگر انگلستان کے لئے یہ مناسب تھا تو پھر ہندوستان کیلئے تو شروع شروع خود مختاری گورنمنٹ میں یہ ضروری تھا۔

اس کمیٹی نے یہی سفارش کی جہاں تک ہو سکے گورنر اس کی کوشش کرے کہ اقلیتوں کے نمائندے گورنمنٹ میں شامل کئے جائیں۔

اخباروں کی سوشہ بازی

۶ر دسمبر کو حافظ ہدایت حسین نے مجھے ٹیلیفون پر کہا کہ آپ نے ڈیلی ٹیلیگراف دیکھا۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حافظ صاحب مرحوم کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ اس میں کچھ ایسا لکھا ہے کہ موجودہ حکومت ہندوؤں کی طرفدار ہے اور لبرل اور کنسرویٹو مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ اس سے خواہ مخواہ مسلمانوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ ارل رسل شاید نائب وزیر ہند تھے۔ کیمبرج سے واپس ہوتے ہوئے ریل میں میرے ہمسفر تھے میں نے ان سے تذکرہ کیا تو کہنے لگے کہ ہمارے دشمن ایسی بے بنیاد خبریں مشہور کرتے ہیں۔ تاہم ۷ر دسمبر کے ٹائمس میں اس کی تردید شائع ہوئی۔ اخبارات اس قسم کے سوشے ہندوستان میں بھی چھوڑتے رہتے ہیں۔

۹ر دسمبر کو ساڑھے نو بجے رٹز میں مسلمانوں کی میٹنگ ہوئی۔ کہا یہ گیا تھا کہ مسٹر جناح اور چند ہندو صاحبان وزیر اعظم سے ملے اور ہندو حضرات نے ان سے یہ خواہش کی کہ وزیر اعظم بحیثیت پنچ ہندو مسلم قصہ کو طے کر دیں۔ مسلمان وزیر اعظم سے کچھ بدگمان تھے۔ اس واسطے اس ثالثی سے گھبراتے تھے لیکن صاف صاف یہ کہنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ بہت کچھ گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ دونوں طرف کے نمائندے خود صلح کریں اور اگر ہندو مسلمان کے تیرہ پوائنٹ مان لیں تو آخر کے پوائنٹ

جداگانہ انتخاب کے حق کو چھوڑ دیا جائے اور محمد علی مرحوم کا فارمولا مان لیا جائے۔
۱۰ دسمبر کے روزنامچہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں اس کے بعد ہم لوگ وزیر اعظم کے ہاں جمع ہوئے اور ہندو مسلمان قصہ پر گفتگو رہی۔ سپرو نے مسلمانوں کی اتنی طرفداری کی کہ کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔

اس روزنامچہ میں اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جسے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ سر تیج بہادر سپرو نے ڈاکٹر مونجے آنجہانی کے جواب میں کہا کہ مسلمان گوشت خور ہیں مگر مردم خور نہیں جو ہندوؤں کو کھا جائیں گے۔ میں نے سر تیج بہادر کا بہت شکریہ ادا کیا۔ مسلمانوں کی اس طرفداری کی بدولت اکثر ہندو ممبران کو ان سے شکوہ ہو گیا۔ لیکن وہ ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے اور ہر ایسی دشواری کو جو آزادی کی راہ میں حائل ہو مٹانا چاہتے تھے۔

میں نے سیموئیل ہور۔ جنرل نوکس۔ مسٹر فٹ اور دوسرے کئی پارلیمنٹ کے ممبروں فرقہ وارانہ سوال پر گفتگو کی۔ میری گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ مسلمان کوئی نئی چیز نہیں مانگتا لیکن یہ چاہتا ہے کہ اب تک قانون میں جو تحفظ رکھے گئے ہیں یا ملازمتوں میں جو تعداد اسے دی گئی ہے وہ آئندہ بھی قائم رہے۔

۱۱ دسمبر کو لطیفی صاحب آئی۔سی۔ایس کے ساتھ اتھینیم کلب میں لنچ کھا کر ہاؤس آف کامنس میں وزیر اعظم کے کمرے میں گیا۔ وہاں دیگر ممبران بھی جمع ہو گئے تھے۔ میرے روزنامچہ میں یہ عبارت درج ہے۔ ڈاکٹر مونجے نے بیٹھتے ہی یہ کہا کہ ہم مسلمانوں کو نہرو رپورٹ سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے۔ سر تیج نے کہا کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کو کبھی منظور نہیں کیا اور اب جبکہ کانگریس نے خود اسے مسترد کر دیا تو اس کا کیا ذکر پھر سر سیتل داد نے کہا کہ تیرہ پوائنٹ پر ہم میں اتفاق ہو گیا تھا۔ اول انہیں پیش کرو۔ ڈاکٹر مونجے نے اس سے اختلاف کیا کہ وہ تو سب کالعدم ہیں۔ اول بحث جداگانہ اور مشترکہ انتخاب پر ہو۔ جناح نے کہا کہ ہم میں یہ طے ہو گیا تھا کہ جب تک آپ تیرہ پوائنٹس نہ مانیں انتخاب پر بحث نہ ہو گی۔ کیا وہ تسلیم ہیں۔ اس پر ڈاکٹر مونجے اور مسٹر جیکار نے بہت گڑبڑ مچائی۔

یہ میٹنگ بھی بغیر نتیجہ ختم ہوئی۔ اب خیال آتا ہے کہ ان ذرا ذرا سی ضدوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ منجملہ ۱۴ کے ۱۳ امور پر اتفاق ہو گیا تھا فقط جداگانہ انتخاب کا قصہ باقی تھا۔ جس کے متعلق مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ محمد علی کے فارمولے کو منظور کر لیا جائے۔ اس فارمولے کا منشا یہ تھا کہ ہر منتخب ممبر کو ایک خاص فی صدی رائے ہندو اور مسلمان دونوں کی لانی ضرور تھی۔ یعنی کوئی ممبر فقط مسلمان یا ہندو رایوں سے منتخب نہ ہو۔ اس تجویز میں کچھ خامیاں ضرور تھیں۔ لیکن جو حال کہ ہندوستان کا بن گیا تھا اس کے مقابل یہ تجویز بھی غنیمت ہوتی۔

وزیر اعظم کے مکان جیکر میں میٹنگ

۱۴ دسمبر کو میں اور مولانا محمد علی مرحوم وزیر اعظم کی قیام گاہ جیکر پہنچے۔

راہ میں مجھ سے اور مولانا مرحوم سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ کانگریس سے دل برداشتہ تھے۔ اور اہل وطن کی تنگ نظری کے شاکی وہ سیکنڈ چیمبر یعنی ایوانِ اعلیٰ کے قیام کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایوانِ اعلیٰ کا قیام دولت مندوں کو طاقت پہنچائے گا اور جمہوریت کے خلاف ہے۔ جب ہم "چیکر" پہنچے تو اور لوگ آچکے تھے اور میٹنگ شروع ہو گئی تھی۔ جناح مرحوم مسلمانوں کے نقطۂ نظر پر تقریر کر رہے تھے۔

زیر بحث پنجاب تھا۔ سوال یہ تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت اتنی کم ہے کہ سکھوں کو مردم شماری سے زیادہ نشست کہاں سے دی جائے۔ میں نے یہ کہا کہ پنجاب کے بعض اضلاع جو یوپی سے ملحق ہیں۔ انہیں یوپی سے ملا دیا جائے۔ یہ اضلاع ایسے ہیں جن میں ہندو اکثریت ہے یا سرحدی صوبہ کے اضلاع پنجاب میں ملا دئے جائیں۔ ان اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی اکثریت میں اضافہ کر کے سکھوں کو زیادہ نشست دی جائیں اسے کسی نے پسند نہ کیا۔

وزیر اعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ پنجاب میں اسی فی صدی سیٹ کا انتخاب بذریعہ مخلوط انتخاب ہو لیکن ہر فرقہ کی تعداد نشست ریزرو (مخصوص) کر دی جائے اور بیس فی صد سیٹ بلا کسی نشست کو مخصوص کئے ہوئے بذریعہ مخلوط انتخاب کے ہو۔ اس

تجویز کو راجہ صاحب زیندر ناتھ آنجہانی نے نامنظور کیا آخر میں کچھ گفتگو کے بعد سرمیاں محمد شفیع مرحوم نے اسے مسلمانوں کی طرف سے نامنظور کر دیا۔ اس وقت ڈاکٹر مونجے اور مسٹر جیکر بولے کہ ہمیں منظور ہے۔ ان حضرات کا منظور کرنا محض مصلحتاً تھا۔ ورنہ راجہ زیندر ناتھ اور سرمیاں محمد شفیع (دونوں پنجاب کے نمائندے تھے) کے انکار کے بعد یہ تجویز ختم ہو گئی تھی۔ پھر وزیر اعظم نے مسلمانوں سے پوچھا کہ اگر سکھ اپنی مردم شماری سے زیادہ تعداد کا مطالبہ چھوڑ دیں تاکہ پنجاب کا یہ قصہ طے ہو جائے تو کیا مسلمان اور صوبہ میں اس پر تیار ہوں گے اس پر سرسلطان احمد نے کہا کہ ایسی شکل میں مسلمان کسی انتخاب میں حصہ نہ لیں گے۔ یہ کوشش بھی اس طرح ناکام رہی۔ ہندو مسلمان قصہ کا فیصلہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ پہلی گول میز کانفرنس اس گتھی کو نہ سلجھا سکی۔ یہاں میری ایک تقریر کا اقتباس بے موقع نہ ہوگا۔

December 20th, 1930

"It is with a feeling of humiliation that I rise to speak today. The proud and honourable position for us would have been to have come before you, Mr. Prime Minister, with a settlement of the communal problem in hand. I entirely agree with my sister delegate that the time for general appeals of nationalism has gone by and we must now face the facts as they are and endeavour to tackle them as best as we can.

Minorities are insistent on safeguards - this cannot be denied. Their fears may be imaginary or real; but whatever they may be, it is essential to create in their minds a feeling of security, if the new constitution is to succeed ....

To me it appears that safeguards are not the cause but the outcome of mistrust. Safeguards are not the creators but the creatures of misgivings. Otherwise I fail to understand why the Muslims first asked for these safeguards when the Minto-Morley reforms were being introduced. Therefore in my opinion as long as these doubts and misgivings continue and are not replaced by mutual trust and confidence, we cannot as practical men deny safeguards to these who wish to have truth.

Trust and confidence cannot created to order... they must come from within. They cannot be painted but must grow...

....

My suggestion, therefore is that we have separate electorates for the present, while putting into the constitution a clause enabling any minority wishing to surrender this right to move a resolution to that effect in the House........ ....

I have strong hopes that after a few years' of successful working of the new constitution the minorites will realise that there is no need for separate electorate. After all, separate electorate are not a goal in itself, they are a means to achieve the goal. If we embody in the constitution on the rules framed under the constitution such other safeguards of religious and cultural protection and a fair share to all communities in the Government and services then surely the minorities will soon realise that the goal is achieved and that separate electorates are no longer necessary.

سر سلطان احمد صاحب سے مجھے اچھی طرح نیاز حاصل ہے اور حیدر آباد میں ۱۹۴۷ء میں ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ موجودہ تعلیم کے ساتھ پرانے زمانہ کے اخلاق و آداب کے بہترین نمونہ ہیں۔ آپ نے صوبہ بہار میں بڑی ترقی کی۔ جنگ کے زمانہ میں حکومت ہند میں کونسلر تھے۔ سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے۔ بیرسٹر ہیں۔ قانونی قابلیت بے مثل ہے۔ تدبر اور موقع شناسی بغایت موجود ہے۔

زندگی کے لذت والم میں ہماری عادتوں کو بھی کیسا دخل ہوتا ہے۔ ایک دن لارڈ ریڈنگ نے ایٹ ہوم دیا۔ میں اور ہز ہائی نس بھول پال ایک ہی موٹر میں گئے۔ ہز ہائی نس نے مجھے ایک پان دیا۔ کیا کہوں کتنا لطف آیا بات نے بھی مزا دیا اور پان نے بھی۔

اسی روز مہاراجہ بیکانیر نے کارلٹن ہوٹل میں ایک ڈنر دیا۔ ممتاز مرحومہ بیگم شاہنواز کی صاحبزادی پاس بیٹھی تھیں۔ بڑی طباع اور باخبر خاتون تھیں۔ گفتگو میں بڑی شیرینی اور دل کشی تھی۔ ان کی بے وقت اور الم ناک موت نے ہمارے ملک کی ہونہار خواتین کی صف میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا جو آسانی سے پُر نہ ہوگا۔

چونکہ پہلی گول میز کانفرنس قریب ختم تھی۔ آجکل دعوتیں اس کثرت سے ہو رہی تھیں کہ قبول کرتے وقت یہ سوچنا پڑتا تھا کہ کس دعوت کو قبول کیا جائے اور کسے ترک۔

اٹھارہ دسمبر کو وزیر اعظم مسٹر رمزے میگڈانل کے ہاں لنچ پر گیا۔ دوران گفتگو میں وہ فرمانے لگے کہ دو تین روز میں دوسرے وایسرائے کا اعلان ہو جائے گا۔ ہم نے بہت اچھا شخص ہندوستان کو دیا ہے جسے ہندوستان کے معاملات سے واقفیت ہے۔

لارڈ ولنگڈن کا تقرر

کچھ دنوں بعد ہی لارڈ ولنگڈن کے تقرر کا اعلان بحیثیت وایسرائے ہندوستان ہوا۔ اسی زمانہ میں بعض حلقوں میں یہ خبر گرم تھی کہ شاید رمزے میگڈانل خود وایسرائے ہو کر جائیں مگر بالکل بے اصل ثابت ہوئی مجھے چند ماہ لارڈ ولنگڈن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ یوں بھی مجھ پر بہت عنایت کرتے تھے۔ یہ بہت خلیق اور بڑے دریا دل میزبان تھے۔ یا یہ کہیے کہ لیڈی ولنگڈن بڑی دریا دلی سے میزبانی کرتی تھیں۔

لارڈ ولنگڈن تفصیلات سے گھبراتے تھے۔ لیکن جو پالیسی وہ اختیار کر لیتے تھے اس پر پوری قوت اور قابلیت صرف کر دیتے تھے۔

رمضان قریب آ رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ ہندوستان پہنچوں۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں ماہِ صیام میں برابر روزے رکھتا ہوں بدنصیبی سے ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے اپنی محراب کی فکر تھی ۱۹ر دسمبر کو میں نے ہز ہائینس آغا خان سے مشورہ کیا۔ میں نے خواہش کی کہ مجھے واپس جانے دیں لیکن ہز ہائی نس کو اصرار تھا اور اس درجہ اصرار تھا کہ میرے روزنامچہ میں ان کا بایں الفاظ روکنا تحریر ہے۔ میں تمہیں مثل اپنے بیٹے کے سمجھتا ہوں، میں تم سے کہتا ہوں کہ تم مت جاؤ مجھے رُکنا ہی پڑا۔

ایک ڈنر

میں نے ۱۹ر دسمبر کو اپنے ہوٹل میں چند با اثر ممبران پارٹی کی دعوت کی۔ اس دعوت میں سر میاں محمد شفیع مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم کو بھی بلایا تھا۔ مجھے اس روز

یہ اندازہ بڑے وثوق سے ہو گیا کہ بسا اوقات ایک طویل تقریر، چاہے وہ کتنی مدلل ہو، سامعین کو مطمئن نہیں کرتی۔ لیکن باہمی گفتگو کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے اس جلسہ میں رائٹ آنریبل ایم۔ اچیسن اور سر ڈبلیو جوویٹ بھی تھے۔ مگر یہ حضرات چونکہ حکومت کے اراکین میں سے تھے اس واسطے زیادہ تر خاموش رہے۔ البتہ میجر گریہم پول اور کمانڈر کین ورتھی بڑے اخلاق سے ہندوستان کے مطالبہ آزادی کے حامی تھے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنڈرسن (جو مسٹر ہنڈرسن وزیر خارجہ حکومتِ وقت کے صاحبزادے تھے) موجود تھے۔ اقلیتوں کے تحفظات کا سوال ان کی دشواری کا باعث تھا۔ یہ سوال فقط مسلمانوں کا سوال نہ تھا بلکہ جملہ اقلیتوں کا تھا۔ جن صوبوں میں مسلمان کم ہیں۔ وہ تحفظات چاہتے تھے جہاں ہندو کم تھے وہ تحفظات چاہتے تھے سکھ اور پست اقوام کے نمائندے اپنے واسطے حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ سوال پورے ہندوستان کا سوال تھا حکومت خود اختیاری میں سوائے اس کے کہ یہ تحفظات خود آئین کا ایک حصہ ہوں کوئی اور ایسا طریقہ تھا کہ جو کسی حد تک قابل اعتماد ہو۔ انگریز کے واسطے ان چیزوں کا سمجھنا دشوار تھا۔ خاص کر مزدور پارٹی کے ممبران کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ خود مختاری حکومت کے ساتھ تحفظات کیوں ہو۔ مسٹر ہنڈرسن (جواب لارڈ ہو گئے ہیں) اور چند پارلیمنٹ کے ممبر کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہے مجھ سے اسی موضوع پر سوالات کرتے رہے۔ اب تمام اور مہمان جا چکے تھے۔ بارہ ساڑھے بارہ تک گفتگو ہوتی رہی۔

میں نے کہا کہ سیاسی جماعتوں کی تفریق کسی پروگرام یا عقائد پر ہوتی ہے۔ لہٰذا کبھی اکثریت اقلیت بن جاتی ہے کبھی ایک انتخاب کی اقلیت دوسرے انتخاب میں اکثریت ہو جاتی ہے لیکن جہاں تقسیم مذہب کے اعتبار پر ہو تو صورت مختلف ہو جاتی ہے۔ جب تک کہ ملک میں ایسی سیاسی جماعتیں نہ پیدا ہوں جو سیاسی پروگرام کی بنا پر لوگوں کی حمایت حاصل کریں۔ جب تک ملک میں اتنا سیاسی شعور نہ ہو کہ لوگ بلا خیال مذہب وملت کسی سیاسی پروگرام کی حمایت کریں اس وقت تک اقلیت کے حقوق کے تحفظ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شہر ٹورکی

میں ۲۷ دسمبر کو ٹورکی گیا۔ شام تک لیڈی شفیع اور ممتاز مرحومہ بھی آ گئیں۔
یہ شہر بہت خوبصورت ہے ہمارا ہوٹل سمندر کے کنارے ہے۔ دو روز یہاں بہت دلچسپ گزرے ''لیڈی شفیع'' سر میاں محمد شفیع کی بیوی ہیں۔ بڑی خوبیوں کی خاتون ہیں۔ ماں کی طرح محبت اور شفقت کرتی ہیں۔ پرانے مکتبِ خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔
بیگم شاہنواز سر میاں محمد شفیع کی صاحبزادی ہیں۔ ہندوستان کی قابل ترین خواتین میں سے ایک ہیں۔ میرے ساتھ بڑا اکرم فرماتی تھیں۔ تقریر بڑی سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ گول میز کانفرنس کی ممبر تھیں۔ لندن کی سوسائٹی میں بہت مقبول تھیں۔ میں نے ایسی معاملہ فہم زیرک اور موقع شناس خواتین کم دیکھی ہیں۔

ممتاز مرحومہ

کے متعلق اوپر لکھ چکا ہوں۔ خدا نے مرحومہ کو بہترین صفات سے متصف کیا تھا۔ امریکہ جا رہی تھیں ہوائی جہاز کے ایک حادثہ نے ایک جوشیلی مگر زیرک اور فہیم زندگی کا خاتمہ کر دیا۔
اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کی خواتین کی صف میں یہ اولین خواتین میں سے ہوتیں۔ یہ بڑی اچھی شاعرہ تھیں۔ انگریزی میں شعر کہتی تھیں جو لندن کی سوسائٹی میں کافی مقبول تھے۔

مولانا محمد علی کی وفات

''خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں''

۴ جنوری کو صبح ساڑھے نو بجے مولانا محمد علی کا انتقال ہو گیا۔ شب گزشتہ آدھی رات گئے تک ہندو مسلم سوال پر اپنی رائے لکھواتے رہے جو وزیر اعظم کو دی گئی۔
ہم سب لوگ ہوٹل میں حاضر ہوئے نماز جنازہ پڑھی گئی۔ مولانا کا جنازہ بیت المقدس دفن کے واسطے لے گئے۔ اس غربت کی موت کا اثر ہندوستانیوں پر بہت گہرا تھا۔ یہ سچ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین پر اسے موت آئے گی۔ مولانا کی

موت نے ہندوستان کے سیاسی قائدین میں ایک ایسی جگہ خالی کردی کہ جواب پر ہونا مشکل ہے۔ کون جانتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو ہندوستان کی تاریخ کس طرح لکھی گئی ہوتی۔

مجھے یقین ہے کہ مولانا مرحوم ہندوستان کی تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوتے اس لئے کہ ہندوستان کی تقسیم تو ان کی عمر بھر کی پالیسی کے خلاف تھی۔ ہز ہائی نس آغا خان کا باوجود موجود ہونے کے جناح کا مشورہ کے لئے نہ بلانا اور مولانا محمد علی کا انتقال یہ دونوں چیزیں ایسی ہوئیں کہ جس سے ہندوستان کی تقسیم کے خلاف کوئی محاذ نہ بن سکا۔

ولایت سے واپسی

گول میز کانفرنس کے اختتام سے کچھ قبل میں واپس ہوا۔ وزیر اعظم نے ۱۹ ر جنوری کو ایک تقریر کی جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ہندوستان کو ڈومنین اسٹیٹس مل جائے گا۔

پیرس ہوتا ہوا اٹلی پہنچا۔ خاں صاحب لیاقت علی خاں میرے ساتھ تھے اور میرے آرام و آسائش کا بڑی تندہی سے اہتمام کرتے تھے۔

موسم سرما میں یورپ خاص کر سوئزرلینڈ کا سفر اپنی خاص دلچسپیاں رکھتا ہے۔ ہندوستانی کے لئے یہ نظارہ کہ منتہائے نظر تک سوائے برف کے کچھ نظر نہ آئے کتنا عجیب اور دل چسپ ہوگا۔ ہماری ریل برف میں سے گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ شب کی دھندلی روشنی میں شجر حجر سب برف کے تودے معلوم ہوتے تھے۔

ان ممالک میں سردی ہندوستان سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی ہندوستان کی سردی جتنی جسم میں نفوذ کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا احساس مجھے یورپ میں نہیں ہوا۔ اول تو وہاں مکانات موسم سرما ہی کے لحاظ سے بنائے گئے ہیں، پھر انہیں گرم رکھنے کا بڑا اہتمام ہے۔ ایک شخص بے تکلف کمرے میں کرتہ پہنے بیٹھ سکتا ہے گو باہر برف باری ہو رہی ہو۔ دوسرے وہاں کی سردی مرطوب ہونے کی وجہ سے جسم میں اتنی چبھتی نہیں جتنی یہاں کی خشک سردی۔

واپسی میں ہم ایک شب وینس میں ٹھہرے اور دوسرے روز بادل ناخواستہ

عجیب شہر کو اور اسی کے ساتھ سرزمین یورپ کو الوداع کیا۔ گھر پہونچنے کی خوشی کے باوجود یہ خیال کہ کبھی پھر یہاں آنا ہوگا یا نہیں دل کو مغموم کر رہا تھا۔

شام کے قریب جہاز نے ساحل اٹلی کو چھوڑا۔ جب تک ہم ایڈریاٹک سمندر میں رہے سکون رہا لیکن دوسری صبح کو جونہی جہاز بحرروم میں داخل ہوا سمندر میں طغیانی کیفیت رہی۔ مجھے طوفانِ موج افزا سے یہ پہلا ہی سابقہ تھا۔ لہریں جہاز سے ٹکراتیں تو جہاز کا بند بول اٹھتا تھا۔ گہری نیلی موجیں جہاز کی طرف اس طرح بڑھتی تھیں جیسے اپنے آغوش میں لے کر تہہ میں مدفون کر دیں گی۔ پانی کی چھالیں جہاز کی ڈیک پر آنے لگتیں۔ تیز ہوا اور موجوں کے ڈیک پر آنے کی وجہ سے مسافروں کو ڈیک پر آنے کی اجازت نہ تھی۔ ہوتی بھی تو کون آسکتا تھا۔ نوے فی صدی مسافر تو اپنے کمروں میں ہی پڑے تھے اور جنھیں چکر نہیں آتے وہ بھی موجوں کے اندیشہ سے ڈیک پر نہ جاسکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی اس طرح لوگ سمندر کی نذر ہو گئے ہیں۔ لیاقت علی خاں کو چکر آتے ہیں لیکن کم مجھے بالکل نہیں آتے۔ لیکن بعض لوگوں کی حالت قابل رحم تھی۔ اس درجہ جسمانی تصفیہ اور تخلیہ ہوتا ہے کہ مدتوں کے مریض کا سا حال ہو جاتا ہے۔ پورٹ سعید کے قریب طوفان میں کمی آئی۔ لوگ آرام کرسیوں پر آ کر لیٹے اور نارنگی اور دوسری ترش چیزوں کے عرق کا دور شروع ہوا۔

بحرِ احمر باوجود موسمِ سرما کے گرم تھا۔ جنوری کی آخری تاریخوں میں بمبئی آ گئے بہت سے دوست اور اقربا ساحل پر موجود تھے۔ ان سے مل کر جس قدر تفریح و مسرت ہوئی محتاجِ بیان نہیں۔

یورپ کی سوسائٹی

یورپین ممالک میں سوسائٹی منظم ہو گئی ہے کہ انسانی زندگی کی ہر ضرورت کی کامل رعایت موجود ہے وہاں صرف کسی فن یا کسی کام سے واقفیت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مخصوص قابلیت Expert knowledge حاصل کرتے ہیں۔ اچھے سے اچھے اور برے سے برے کام کے ایکسپرٹ Expert وہاں موجود ہیں۔ مثلاً وہاں کا خدمت گار ہمارے یہاں کے خدمت گار سے وہاں کے سکریٹری ہمارے یہاں کے سکریٹری

ہے۔ وہاں کا موٹر ڈرائیور ہمارے یہاں کے ڈرائیور سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ اسے اپنے کام پر فخر ہوتا ہے۔ وہ اپنے پیشے یا فن میں مہارت کامل حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مجھے یہ خود تجربہ ہوا کہ میرے ڈرائیور کو لندن اور مضافاتِ شہر کے نقشہ پر اتنا عبور تھا کہ چلنے سے پندرہ منٹ پہلے پتہ بتا دیجئے وہ فوراً اپنا نقشہ دیکھے گا اور اس طرح آپ کو لے جائے گا کہ وہ اکثر اس مقام پر آتا جاتا رہا ہے۔

ہوٹلوں کی یہ حالت ہے کہ آپ ۲۴ گھنٹہ کا نوٹس دے کر دنیا کے بڑے سے بڑے شخص کی دعوت کر دیجئے آپ کو یا آپ کے مہمان کو شکوہ کا موقع نہ ہوگا۔

کاروباری اخلاق بہت اچھا ہے۔ وہاں کا ڈاکٹر، وکیل، انجینئر دوکاندار غرض ہر پیشہ کا آدمی اس کی کوشش کرتا ہے کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دے۔

غرض وہاں سوسائٹی بہت ہی منظم ہے اور خواہ مزدور ہو یا سرمایہ دار کسان ہو یا زمیندار اپنے فرائض کو سمجھتے ہیں۔ فقط اپنے حقوق کو ہی نہیں دہراتے رہتے۔ انہیں اپنے حقوق کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے۔ یہ تو روشن پہلو ہے لیکن بتایا جاتا ہے کہ وہاں کے جرائم پیشہ بھی اپنے فن کے ایسے ماہر ہیں جن کی مثال ہمارے ملک میں نہیں ملتی۔ نگار ونشاط کی کمی نہیں۔

علی گڑھ واپس آگیا راحت فرحت سے ملا۔ شب کو جب پلنگ پر سونے لیٹا تو راحت نے بڑی محبت سے کہا کہ آپ کو سفر میں بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔ اب گھر پر آرام ملے گا۔ میں نے کہا ہاں بیٹے گھر گھر ہی ہوتا ہے۔ تاہم وہاں ہر شعبہ زندگی اتنا منظم ہو گیا ہے کہ اتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔

چھتاری پہونچا بچے اور رفیقہ حیات موجود تھیں۔ سب نے بڑی مسرت خلوص سے خیر مقدم کیا۔ باشندگان اور ملازمین نے بڑی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ ان کے لئے تحفے لایا تھا۔ تقسیم کئے۔ خوش ہوا۔ اللہ کا شکر بجالایا اور ایک دفعہ پھر خانگی زندگی کی مسرتوں میں کھو گیا۔

مجھے ہندوستان آکر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ راجہ کشل پال سنگھ صاحب کو ہائی

کورٹ کے کسی فیصلہ کے ریمارک کی بنا پر استعفیٰ دینا پڑا چھتاری پہونچنے کے دوسرے دن یا تیسرے روز یکایک لیڈی سری واستو چھتاری تشریف لائیں۔ مفصل حالات معلوم ہوئے۔ مجھے ان کے آنے سے مسرت ہوئی۔ میرے ان کے دوستانہ تعلقات پہلے سے تھے۔ اور آئندہ بہت ہی خاص تعلقات سر جے۔ پی اور ان سے ہو گئے۔ لیکن اتنا افسوس بھی ہے کہ ان کا چھتاری آنا پہلی اور شاید آخری بار تھا۔ ممکن ہے کبھی پھر آئیں۔ بہر حال یو پی میں کشل پال سنگھ صاحب کے بجائے سر جوالا پرشاد سریواستو وزیر ہو گئے۔

سر جے۔ پی اور لیڈی سریواستو

سر جوالا پرشاد سریواستو بڑے ذہین اور دور بین شخص ہیں۔ علمی قابلیت بہت اچھی۔ لکنت کی وجہ سے تقریر چنداں اثر آفریں نہیں ہوتی لیکن تحریر بہت مدلل اور عبارت آرائی سے پاک ہوتی ہے۔

یہ سیلف میڈ (خود ساختہ) آدمی ہیں۔ شاید ۱۶ء تک محکمہ صنعت و حرفت میں ملازم تھے۔ پھر مسٹر ایلن کی مل میں کام کرنے لگے۔ اور آج اس کارخانہ کے مالک ہیں کانپور کے کاروباری حضرات میں اب چوٹی کے لوگوں میں ان کا شمار ہے۔ ایک کامیاب کاروباری شخص میں جتنی صفات ہونی چاہئیں وہ ان میں موجود ہیں۔ کان پور کے یورپین تاجروں کو ان پر بہت بھروسہ تھا اور انہیں کی وجہ سے یہ انتخاب میں اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ خفا ہو جائیں تو آسانی سے معاف نہیں کرتے۔ ان کی دوستی بہت ٹھوک بجا کر ہوتی ہے اور مفید و کارآمد لوگ اس دائرہ میں آتے ہیں۔ میز بانی فیاضی سے کرتے ہیں۔ خود میری اور دوسرے مقتدر لوگوں کی دعوتیں اتنی شان سے کرتے تھے کہ اس میں کسی مزید اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ سیاسی مصالح کی وجہ سے ہندو مہا سبھا کے بڑے حامی ہیں لیکن دراصل مذہبی تعصب ان میں نہیں ہے۔ ہاں مصلحت وقت اور اقتضائے موقع سے مجبوری الگ بات ہے۔

لیڈی سریواستو بڑی ہوشمند خاتون ہیں۔ سوسائٹی میں بڑی مقبول مہمان نوازی میں بڑی فیاض ہیں۔ سوجھ بوجھ بہت ہے۔ سر جے پی کی کامیابی میں ان کی

ذہانت اور موقع شناسی کو بڑا دخل ہے اسمبلی کی ممبر تھیں تو اکثر خود سر جے۔ پی کے خلاف تقریر کرتیں۔ سر جے۔ پی سیاست برطانیہ کی موافقت میں تھے۔ لیڈی سریواستو آزاد خیال لوگوں کی بھی ہمنوائی کرتیں۔ جو لوگ کہ سر جے۔ پی کے سیاسی میدان میں مخالف تھے انہیں بھی تواضع و مدارات کی وجہ سے ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ میں ان کی قابلیت موقع شناسی، تدبر اور دوراندیشی کا ہمیشہ معترف اور مداح رہا۔

میں نے آکر نواب سر مزمل اللہ خاں سے ہوم ممبری کا چارج لے لیا اور وہی سرکاری روزمرہ کے مشاغل شروع ہوگئے۔

اقتصادی حالات میں تبدیلی تو ایک سال قبل سے ہی رونما ہو چکی تھی۔ لیکن ۲۹ء و ۳۰ء میں اس تبدیلی کا اثر عام طور پر محسوس ہونے لگا۔ جنگ کے زمانے میں جو عارضی مرفہ الحالی پیدا ہوئی تھی۔ وہ اب ختم ہو رہی تھی۔ اس کے اثرات سے تمام دنیا متاثر ہو رہی تھی۔ امریکہ اور انگلستان میں بھی بے روزگار لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان کا چونکہ یہ پرانا دستور رہا ہے کہ اگر ایک شخص برسر روزگار ہو تو خاندان کے لوگوں کو سہارا دیتا ہے اسی وجہ سے بے روزگاری کا احساس اتنا زیادہ نہ تھا۔ لیکن ناج کی قیمت مزدور کی اجرت بڑی تیزی سے گر رہی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کاشتکار سے لگان وصول ہونا دشوار ہو گیا۔ سر جارج لیمبرٹ عاضی طور پر گورنری کر رہے تھے اور مسٹر جے۔ سی اسمتھ عارضی فنانس ممبر تھے۔ یہ دونوں حضرات اس مسئلہ کی اہمیت کا پورا اندازہ نہ کر سکے۔ یہ دونوں اس پر تو تیار تھے کہ کاشتکار کے ساتھ لگان میں کچھ رعایت کر دی جائے۔ لیکن زمیندار کے ساتھ، مال گزاری میں رعایت کرنے میں پس و پیش کرتے تھے۔

سر جارج لیمبرٹ اسمتھ

سر جارج لیمبرٹ میرے بڑے مخلص دوست تھے اور بحیثیت چیف سکریٹری بہت کامیاب رہے۔ ان کی انتظامی قابلیت بہت اچھی تھی۔ خاموش مگر بہت مضبوط شخص تھے۔ لیکن سیاسی دوراندیشی ان میں نہ تھی جو چیز ان کے سامنے ہو۔ اس کا علاج

سوچتے تھے۔ مگر کسی خاص فعل یا ترکِ فعل سے کیا نئی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ ان کا تصور اور پیش بندی کرنے کی قابلیت ان میں نہ تھی۔

مسٹر اسمتھ - اوسط درجہ کے آئی۔ سی۔ ایس تھے جو فقط سینیر ہونے کی وجہ سے فنانس ممبر تھے۔ وہ ان حالات کی نزاکت کا اندازہ بالکل نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سول نافرمانی کی شورش کو فروغ دینے کا ایک سنہری موقع کانگریس پارٹی کو مل گیا۔ دیہات میں بھی ہیجان پیدا ہوگیا۔ جس سے کانگریس نے بجا طور پر فائدہ اٹھایا۔

انقلابی حالت پیدا کرنے میں دو چیزیں بڑی مدد دیتی ہیں۔ اول ملک میں بدامنی دوم ملک کے لوگوں کی مالی اور اقتصادی حالت کا خراب ہونا۔ یہ دونوں حالات خود بھی ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔ اگر ان میں ایک صورت رونما ہوجائے اور بر وقت مداوانہ کیا جائے تو دوسری شکل کے پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں تمام ملک میں جرائم کی زیادتی۔ فرقہ وارانہ تصادم۔ زمیندار اور کاشتکار کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کان پور کا بلوہ

یوں تو بنارس اور دوسرے مقامات پر فرقہ وارانہ جھگڑے ہوئے لیکن ۲۴ر مارچ ۱۹۳۱ء کو کان پور میں بڑا سخت بلوہ ہوا۔

بجٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ سر جگدیش پرشاد چیف سکریٹری تھے۔ وہ اور میں بے حد پریشان تھے۔ تین چار دن تک یہ بلوہ نہ رُکا۔ سرکاری علم کے مطابق تین چار سو کے درمیان مقتولین کی تعداد ہوگئی۔ میں اپنے ساڑھے سات برس ہوم ممبری کے زمانے میں اس بلوہ کو سب سے زیادہ اندوہناک واقعہ خیال کرتا ہوں جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

سر جگدیش پرشاد نے میرے منشا سے الہ آباد سر مہاراج سنگھ کو فون کیا کہ فوراً کان پور پہنچیں صوبہ کے مختلف اضلاع سے مزید پولیس اور فوج کے پہنچنے کا انتظام کیا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ خود کان پور جا کر مقامی حکام کو مدد دوں۔ غیر سرکاری ذریعہ سے مجھے مسٹر سیل ڈپٹی کمشنر کان پور کی شکایت پہونچی تھی کہ وہ ضرورتِ وقت کے لحاظ

سے سست تھے میں نے سر جارج لیمبرٹ سے ذکر کیا اور یہ خواہش کی کہ چیف سکریڑی کو اپنے ہمراہ لے کر کان پور جاؤں۔ سر جارج کا خیال تھا کہ ہمیں مقامی حکام کے معاملہ میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ میں اسے مانتا ہوں کہ اکثر موقعوں پر یہ نظریہ درست ہوتا ہے۔ لیکن اس موقع پر درست نہ تھا۔

میری گفتگو کے دوسرے یا تیسرے دن کان پور کے یورپین تاجر حضرات نے سر جارج پر زور دیا کہ انہیں خود کان پور جانا چاہئے۔ سر جارج اور میں کان پور پہنچے۔ وہاں بہت سے واقعہ دیکھے۔ حالت سدھر چکی تھی مگر کہیں کہیں سے نعشیں برآمد ہو رہی تھیں۔

مجھے اس معائنہ موقع اور مختلف حضرات کی گفتگو سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ مقامی حکام الزام سے بری نہیں ہو سکتے اگر وہ سست نہ ہوتے تو تین چار روز تک بلوہ جاری نہ رہتا۔

میں نے لکھنؤ آتے ہی اپنے اس خیال کا اظہار سر جارج پر کر دیا مگر انہیں مجھ سے اتفاق نہ تھا۔ وہ انھیں بے قصور خیال کرتے تھے۔

چنانچہ کان پور کی واپسی پر ۳۱ مارچ کو سر جارج نے اسمبلی کو خطاب کیا اور مسٹر سیل اور دوسرے مقامی حکام کی تعریف کی۔ یہ ایک غلطی سر جارج سے ہوئی جس کا نتیجہ انہیں آئندہ اٹھانا پڑا۔

اس تقریر کا فوری اثر یہ ہوا کہ سختی سے پبلک سے یہ مطالبہ ہوا کہ تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے۔ سر مائیکل کین کی زیر صدارت کمیشن بیٹھا جس کے ایک ممبر نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی تھے۔ اس کمیشن کی رپورٹ مسٹر سیل کے خلاف تھی اور انہیں فوراً چھٹی پر جانا پڑا۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ حکومت مقامی حکام کے وقار کا خیال نہ رکھے تو انتظام میں بڑی ابتری پڑتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب وہ غلطیاں کریں تب بھی ان کو سراہا جائے۔ ایسے اہم واقعہ کے بعد تحقیقاتی کمیشن کا بیٹھنا لازمی تھا اس لئے گورنر کی طرف سے فوراً اظہارِ خیال نامناسب تھا کمیشن نے تحقیقات کے بعد

مقامی حکام کو مورد الزام ٹھہرایا۔

اگر ملک میں امن قائم رکھنا انتظامی دروبست کو برقرار رکھنا اور قانون وانصاف کی بالادستی منظور ہے تو منجملہ دوسرے اور امور کے اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ ملازمین سرکار کو سیاسی جماعتوں کے لیڈر مرعوب نہ کر سکیں۔ جمہوریت کی خوبیاں تو اس درجہ دنیا کے سامنے آچکی ہیں، لکھی جاتی ہیں، بیان کی جاتی ہیں کہ ان کا دہرانا تحصیل حاصل ہے لیکن جمہوریت کے اس اندیشہ کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بسا اوقات مقامی لیڈر ملازمین کے کام میں مداخلت کر کے انصاف کا خون کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان حالات میں ملازم کی حفاظت ضروری ہے مگر جب ملازم کا قصور ثابت ہو گیا اور اس کے نتائج سامنے آگئے تو پھر ملازم کو سزا ملنا لازمی ہے ورنہ رعایا کو حکومت پر اعتماد نہیں رہتا۔

یوں تو کان پور کی خونین داستان بجائے خود بڑی دردناک تھی مگر میرے ایک دوست گنیشی شنکر ودیارتی ایم، ایل، اے کی موت اس وجہ سے خاص کر قابل افسوس ہے کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کے خیر طلب تھے اور فرقہ وارانہ تعصب سے انہیں دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ ایسے نیک انسان کا خود اس حیوانیت کا شکار ہو جانا بڑا ہی الم ناک حادثہ تھا۔

اس زمانے کی انتظامی فضا تمام ہندوستان میں مکدر ہو گئی تھی۔ اقتصادی مشکلات نے ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ یوپی اس سے مستثنیٰ نہ تھا بلکہ اقتصادی اثرات اس صوبے میں کاشتکار اور زمیندار کے تعلقات پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

صلح کی کوشش

ادھر وزیر اعظم برطانیہ نے اس بات کا اعلان کیا کہ ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس دینا حکومتِ برطانیہ کا مقصد ہے۔ ادھر رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو رائٹ آنریبل سری نواس شاستری اور مسٹر جیکر نے پنڈت موتی لال نہرو کو تار دیا اور حکومت ہند اور کانگریس کے درمیان صلح کی گفتگو کی بنیاد پڑی۔

لارڈ اروِن نے کانگریس کی عاملہ جماعت سے پابندی ہٹائی جس کی وجہ سے

اس جماعت کو خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا تھا۔ والیسرائے چاہتے تھے کہ وزیر اعظم کے اعلان پر کانگریس غور کر سکے اور گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر ہندوستان کے آئین بنانے میں حصہ لے۔

پنڈت موتی لال نہرو کی رحلت

۶ رفروری کو پنڈت جی کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ اس حادثہ سے ہندوستان ایک سچے فدائی کی بیش بہا خدمات سے محروم ہو گیا۔ خاص کر جب کہ ملک کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ یوں تو دنیا کی محفل ہمیشہ سے ایسی رہی ہے کہ لاکھوں کے اُٹھ جانے پر بھی اس کی رونق میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن پنڈت جی کے انتقال نے جس جگہ کو خالی کر دیا وہ پر نہ ہو سکی۔ یہ سچ ہے کہ عوام پر مہاتما جی کے روحانی یا مذہبی اثر کی مثال ہندوستان تو کیا دنیا کے کسی حصہ میں بھی نہیں ملتی۔ لیکن پنڈت جی کی ذہنی اور دماغی قابلیت وضعداری، اخلاق، مروت، بذلہ سنجی، محفل آرائی اب کہاں۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

مجھ پر اس حادثہ کا بڑا اثر تھا میں نے اس کا اظہار اسمبلی میں کیا تھا۔ وہ تقریر محفوظ ہے۔

"................. Pandit Moti Lal Nehru was one of the foremost leaders of this country. He had many noble qualities of head and heart, but his sole passion was his love for his motherland. He gave his all for the service of his country and the way he suffered and cheerfully bore many losses was simply wonderful. His death is a great national loss. To me, it is a personal loss also, because I happened to have had the privilege of knowing him as a friend, ... he was very kind to me and I always looked upon him as the most sincere friend .... God knows India can ill afford to lose a man like Pandit Moti Lal Nehru at the present moment."

سر تیج بہادر اور ان کے رفقاء کی کوشش سے ویسرائے لارڈ اردن اور مہاتما جی

میں گفتگو شروع ہوئی۔ یہ فروری کا مہینہ تھا۔ مجھے اس کا احساس تھا کہ مقامی انگریز افسران اس کو پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن لارڈ اروِن نے اس موقع پر بڑے استقلال سے کام لیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انہوں نے اپنے ذاتی اثر سے کام نہ لیا ہوتا تو حکومت برطانیہ ان کی اس پالیسی پر آسانی سے راضی نہ ہوتی۔

اسی گفتگو کے دوران میں مجھے لارڈ اروِن سے ملنے دہلی جانا پڑا۔ میں مہاتما جی سے بھی ملنے گیا وہ دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان میں تشریف رکھتے تھے۔ جہاں تک مجھے خیال پڑتا ہے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ مہاتما جی کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مہاتما جی جہاں ہوتے میلا لگ جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی خاص بات چیت نہ ہو سکی۔ لیکن میرا دل بہت متاثر ہوا۔ مجھے ان کی بچوں جیسی بھولی مسکراہٹ بہت دل کش معلوم ہوئی۔ ان کا طرز بیان کچھ اس درجہ معصوم اور سادہ تھا کہ سامع مسحور ہو جاتا تھا۔

ویسرائے اور مہاتما جی کے درمیان آخر کار ایک متفقہ من سمجھوتہ ہو گیا۔ اور مہاتما جی اس پر راضی ہو گئے کہ وہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی طرف سے شریک ہو جائیں۔ لارڈ اروِن کا خلوص کامیاب ہوا۔ کم از کم وہ کشیدگی اور تلخ کامی جاتی رہی جو اب تک ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس صلح کا اثر سرکاری حلقوں میں یہ تھا کہ لارڈ اروِن کے اس فعل سے حکومت کے اقتدار کو صدمہ پہنچا۔ انگریز افسران تقریباً سب اسی رائے کے قائل تھے۔

اسی فروری کے واقعہ کو میں نے کہیں پہلے بھی لارڈ اروِن کی شرافت مزاج کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مہاتما جی سے من سمجھوتہ کے متعلق مجھ سے دریافت کیا تو میں نے کہا کہ اس مصلحت کی وجہ سے اپنے انگلستان کو دنیا کی نظر میں بہت بلند کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ اس تحریک کو دبانا ناممکن تھا۔ لیکن میں اس کا قائل نہیں کہ ویرانہ کا نام امن وسکون رکھا جائے۔

۱۸/ اپریل کو لارڈ اروِن کا زمانہ ختم ہو گیا اور لارڈ ولنگڈن ویسرائے ہو گئے۔ یہ ایک ایسے ویسرائے کا زمانہ ختم ہوا جو شرافت طبع کے لحاظ سے انگلستان کے

شرفاء کا بہترین نمونہ تھے کنسر وٹو پارٹی اور خاص کر مسٹر بالڈون پر ان کا بہت اثر تھا۔

ایک مختصر لنچ پارٹی پر میں نے مسٹر بالڈون کو بلایا تھا۔ دورانِ گفتگو میں لارڈ اِرون کا ذکر آیا۔ مسٹر بالڈون کے الفاظ کا منشا یہ تھا کہ انہوں نے لارڈ ارون کی ذات میں ہندوستان کو انگلستان کا بہترین شخص دیا تھا۔

نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم

بڑے ذہین اور صاحب تدبر شخص تھے۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود انگریزی میں اظہار خیال کر لیتے تھے۔ اردو کی تقریر بہت خوب ہوتی تھی۔ گھر کا انتظام بڑی محنت سے کرتے تھے۔ مالی اعتبار سے بڑی ترقی کی۔ بڑے مصلحت بیں اور زمانہ شناس تھے۔ حکومت کے بڑے سچے وفادار، جب تک انگریزی حکومت رہی اس کے وفادار رہے اور جب پہلی بار کانگریس حکومت ۳۷ء میں آئی تو اس کے ساتھ پورا تعاون کیا۔

سرسید کے رفقاء میں سے ایک یہ بھی تھے۔ یونیورسٹی کی خدمت بڑی فیاضی سے انجام دیتے تھے۔ مجھ پر کرم فرماتے تھے اور مجھے یہ اختیار دیا تھا کہ جتنا چندہ جہاں میں دُوں اتنا ہی ان کی طرف سے اعلان کر سکتا ہوں۔

مہاراجہ محمود آباد کی رحلت

اسی سال مئی کے زمانے میں جب میں نینی تال تھا مہاراجہ کے انتقال کی خبر آئی۔ چونکہ مرحوم کی علالت کی اطلاع مجھے پہلے سے نہ تھی مجھے اس خبر سے بڑا دھکا سا لگا۔ مہاراجہ کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہ خیال وگمان بھی نہ ہوتا تھا۔ اتنی جلد وہ داعی اجل لبیک کہیں گے۔ مجھے خبر سے بہت افسوس ہوا۔ مہاراجہ بڑی شخصیت کے حامل تھے جو ارادہ کر لیتے اسے کر ہی کے مانتے۔ بڑے شاہ خرچ اور فیاض تھے۔ سیاسی تحریکات میں بہت حصہ لیتے تھے اور بہت خرچ کرتے تھے۔ اگر تعلقداری کی مجبوریاں نہ ہوتیں تو وہ یقینی ہندوستان کے قائدین کی صف اول میں ہوتے۔ ہندوستان کی آزادی کے بڑے حامی تھے۔ مسٹر جناح مرحوم ومغفور کے ساتھ ان کے بہت خاص تعلقات تھے۔

اس زمانے کی کوئی قومی تحریک ایسی نہ تھی جس میں ان کی مدد شامل نہ ہو۔ مجھے ذاتی اور خاندانی وابستگی مرحوم کے ساتھ تھی۔ میرے چچا نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ان کے بہت مخلصانہ تعلقات تھے۔ میں ان کا بہت ادب کرتا تھا اس چھ ماہ میں ہندوستان کے تین ایسے اشخاص اُٹھ گئے۔ جن کی ہندوستان کو سخت ضرورت تھی۔ مولانا محمد علی، پنڈت موتی لال نہرو اور مہاراجہ محمود آباد، رہے نام اللہ کا۔

کونسل کا اجلاس

سنہ ۳۰ء کے انتخاب کے بعد یہ نئی کونسل آئی تھی۔ سوارجسٹ پارٹی انتخاب میں شریک نہیں ہوئی۔ سی وائی چنتامنی کے ساتھی آئے۔ باقی زمینداروں کی اکثریت تھی۔

سیاسی طور پر کونسل کے رنگ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں شخصی ردو بدل ضرور جہاں تہاں ہو گیا تھا۔

کونسل کا ایک مختصر اجلاس تو میری غیر موجودگی میں ہو چکا تھا۔ جس میں پھر رائے بہادر سر سیتارام اسپیکر مقرر ہو گئے تھے۔

دوسرا اجلاس فروری میں شروع ہوا۔ اس میں سب سے زیادہ جھگڑے کا مسئلہ ڈپٹی اسپیکر کے انتخاب کا تھا۔

دو نام انتخاب کے لئے پیش ہوئے۔ (۱) نواب زادہ لیاقت علی خاں (۲) کنور سرندر پرتاپ ساہی

نواب زادہ صاحب کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کنور سرندر پرتاپ ساہی میری پارٹی کے ممبر تھے۔ سلطان پور کے رہنے والے اور بڑے جوڑ توڑ کے آدمی تھے۔

اگر میں ولایت نہ گیا ہوتا تو اس کا ضرور امکان تھا کہ یہ چکر پیدا نہ ہوتا۔ لیکن میری پارٹی کے بہت سے لوگوں سے وعدے سرندر پرتاپ ساہی نے پہلے ہی لے لئے تھے۔ نواب زادہ صاحب گو پارٹی میں نہ تھے مگر مجھے مدد دیتے تھے۔ اور کبھی میری مخالفت نہیں کی۔ پھر اہلیت اور قابلیت کے لحاظ سے نواب زادہ لیاقت علی خاں سے

کنور سرندر پرتاپ کو دور کی بھی نسبت نہ تھی۔ انگریز ممبران اور اکثر دوسرے ممبر نواب زادہ صاحب کو چاہتے تھے۔ چنتامنی کی پارٹی کے لوگوں میں کچھ ادھر تھے اور کچھ ادھر غالباً ان کا منشا فقط یہ تھا کہ میری پارٹی میں تفرقہ پڑ جائے۔

میں دل سے نواب زادہ کو ترجیح دیتا تھا۔ لیکن پارٹی کے لوگ اس پر اصرار کرتے تھے کہ ہماری پارٹی کا ڈپٹی اسپیکر ہو۔ زمیندار پارٹی کے لوگ اکثر اپنے روپے اور اپنے اثر کی وجہ سے منتخب ہوئے تھے ان میں ڈسپلن رکھنا آسان نہ تھا۔ بہر حال یہ انتخاب ایک خلجان بن گیا۔ میں نے یہ طے کیا کہ اسے پارٹی کا سوال نہ بنایا جائے جو جس سے وعدہ کر چکا ہو اسے رائے دے۔ آخر کار نواب زادہ کو ۵۳ رائے ملیں اور کنور سرندر پرتاپ ساہی کو ۴۹۔

مارچ کے مہینہ میں بجٹ کا اجلاس شروع ہوا۔ جنرل مباحثہ کی تقاریر میں مسٹر چنتامنی (لیڈر اپوزیشن) نے اپنی تقریر میں "گاندھی ارون" سمجھوتہ کو سراہا۔

میں نے اپنی تقریر میں اسپیکر کو ان کے دوبارہ انتخاب پر اور "سر" کے خطاب پانے پر مبارکباد دے کر حسب ذیل الفاظ میں اس سمجھوتہ کی طرف اشارہ کیا۔

میں لیڈر آف اپوزیشن کے ساتھ اپنے کو ہمنوا پاتا ہوں۔ اس اظہار اطمینان پر جو ہم سب نے ہز اکسی لینسی وائسرائے کے اس سمجھوتہ پر محسوس کیا۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان جتنا ان کا ممنون ہے اس کا الفاظ میں اظہار مشکل ہے۔ جانے سے پہلے ان کے اس آخری فعل نے کشیدگی کے زمانے کو ختم کر دیا۔ اقتصادی پیچیدگیاں۔ جو ملک میں دشواریاں پیدا کر رہی تھیں۔ رک گئیں اور اب وہ سلسلہ بھی۔ جو ملک کے بہت سے نوجوانوں کو قید خانہ بھیج رہا تھا۔ ختم ہو گیا۔ آخر کار یہ نوجوان ہمارے ہی گوشت پوست ہیں۔ ہمارے ہی اعزاء واقربا ہیں۔ یہ باعث مسرت واطمینان ہے کہ ہیجان اور تکالیف کا زمانہ ختم ہو گیا۔

چونکہ یہ بجٹ کا اجلاس تھا۔ حسب قاعدہ بجٹ پیش ہوتے رہے۔ جب محکمہ مال گذاری پر بحث ہوئی تو غیر سرکاری ممبروں نے اس پر زور دیا۔ جس میں زمیندار ممبر پیش پیش تھے کہ زمیندار کی مالگذاری اور کاشتکار کے لگان میں رعایت کرنی

چاہیئے۔ حساب سے مال گذاری اور لگان میں ایک اور دو کی نسبت کم از کم ہوتی ہے۔ زمیندار پارٹی اس پر تیار تھی کہ ایک روپیہ کی رعایت کے بدلہ جو گورنمنٹ کی مال گذاری میں کی جائے۔ وہ کم از کم دو روپیہ کاشتکار کے حق میں چھوڑنے کو تیار ہے۔ مسٹر اسمتھ فنانس ممبر اس موقع کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی تقریر میں انہوں نے کہا کہ ہم اضلاع سے اطلاع مانگ رہے ہیں۔ ان کی تقریر کے حسب ذیل فقرے سے سر جارج لیمبرٹ اور ان کی پالیسی کا پتہ چلتا ہے۔

"as cleary explained by me to this house last month. Govt. can not possibly afford to throw away any Rupee of Revenue to which it is justly entitled and which it is able to collect."

میں نے اور سر جگدیش نے بار بار اس طرف توجہ دلائی۔ لیکن مسٹر اسمتھ کو موقع کی اہمیت کا اندازہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس غلطی کی بدولت سر جارج لیمبرٹ مستقل گورنر نہ بنائے گئے۔ اور مسٹر اسمتھ پھر فنانس ممبر نہ ہوئے۔

انتظام ملک کو کامیاب بنانے میں صرف سامنے آئی چیزوں پر غور کرنا کافی نہیں بلکہ آنے والے واقعات کی پیش بینی اور پیش بندی دونوں بہت ضروری ہیں۔

اس موقع پر فوری احکامات کی ضرورت تھی نہ کہ تحقیقات کی۔ ملک میں گاندھی ارون مصالحت کی بنا پر کچھ سکون ہو گیا تھا۔ لیکن اس غلطی نے ہیجان کو زندہ رکھا۔ سول نافرمانی کے بجائے ہیجان نے لگان کی ادائیگی دشوار کر دی۔ اس کونسل میں ایک ریزولیوشن سری۔ وائی۔ چنتامنی نے رکھا جو متفقہ طور پر پاس ہوا۔ یہ رزولیوشن گول میز کانفرنس پر تھا اور اس میں لارڈ ارون کا "گاندھی ارون پیکٹ" پر شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اور یہ خواہش کی گئی تھی کہ آئین مروجہ کے تحت جس قدر ممکن ہو ہندوستان کو اختیارات تفویض کر دئے جائیں۔

چنتامنی یوں بھی اچھے مقرر تھے۔ اس روز کی تقریر بہت خوب تھی۔ ہر طرف سے داد ملی۔ چوں کہ محرک نے بحیثیت ممبر گول میز کانفرنس، اپنی تقریر میں میرا بھی نام لیا تھا۔ میں نے بھی تقریر کی جس کا اختصار کے ساتھ ترجمہ بے موقع نہ ہوگا۔

اپنے زمانے کی دو سب سے بڑی شخصیتوں سے متعلق یعنی لارڈ ارون اور مہاتما گاندھی جس توصیف وتعریف کا اظہار محرک نے کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس سے ہمنوا پاتا ہوں۔ اس مصالحت سے ملک میں امن قائم ہو گیا۔ میں لارڈ ارون کو ہندوستان کا بڑا محسن سمجھتا ہوں۔ محرک اس سے بخوبی واقف ہیں کہ اس فضا کو پیدا کرنے میں لارڈ ارون کو انگلستان اور ہندوستان میں کتنی زبردست دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں لارڈ ارون سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحبت میں برائی کا خیال تک ہم نشیں کے دل میں نہیں آتا۔ مہاتما گاندھی کے بارے میں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ "مادر ہند کے بہترین فرزند ہیں ایسے فرزند کہ جن پر مادر ہند کو خود فخر ہے"۔

"میرے دوست محرک نے اس کی خواہش کی ہے کہ گول میز کانفرنس کی بدولت جو اہل انگلستان کے خیالات میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میں اس کی تصدیق کروں۔ جب ہم انگلستان پہنچے تو وہاں کی فضا میں ایک طرف مایوسی تھی اور دوسری طرف بے اعتمادی۔ ایک طرف شکوک تھے تو دوسری طرف توہمات۔ خود لارڈ ارون اور ان کی سیاست پر نکتہ چینی ہوتی تھی اور ہندوستانیوں کو ان کی طرفداری کرنی پڑتی تھی۔ لیکن جب ہم واپس ہوئے ہیں تو فضا بدلی ہوئی تھی۔ مایوسی کے بجائے امید کی جھلک نظر آتی تھی اور توہمات کے بجائے اس کا اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ ہندوستان ترقی کے راستہ پر چلنے کو تیار ہے"۔

اس کے بعد میں نے میگڈانل وزیر اعظم۔ مسٹر ویج ووڈ بین وزیر ہند اور مسٹر بالڈون کا شکریہ ادا کیا کہ ان کا طرز عمل ہندوستان کی طرف ہمدردانہ رہا تھا۔ میں نے ان کے ثبوت میں گول میز کانفرنس میں مفید کام ہوا یہ کہا کہ مہاتما جی اور دوسرے بڑے لیڈروں کا شرکت پر اب راضی ہونا اس کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک ایسی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں کہ جن پر ایک اچھی عمارت بن سکے۔ پھر میں نے سر تیج بہادر سپرو کے لئے کہا۔ سر تیج نے ایک آزمودہ کار جنرل کی قابلیت کے ساتھ ہندوستان کی جنگ لڑی اور جس فیاضی اور وسعت نظر کا اظہار سر تیج نے (کمیونل معاملات) کیا اس سے ظاہر

ہوتا ہے۔ اگر چند اور ایسے لیڈر ہندوستان میں ہوں تو ہندوستان کی (کمیونل) گتھی جلد سلجھ جائے'' کونسل گورنر کے حکم سے ملتوی ہوگئی۔

یوپی کی حکومت نے بعجلت تمام قیدیوں کی رہائی شروع کردی۔ آخر مارچ میں تقریباً پانچ ہزار قیدی رہا ہو چکے تھے۔

لیکن لگان میں کمی کا سوال زیر بحث تھا۔ سر جارج لیمرٹ بھی اسے محسوس کرنے لگے تھے کہ کہ مالگذاری اور لگان کم کئے بغیر کام نہ چلے گا۔ لیکن وہ دل سے مال گذاری میں کمی کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ سر مالکم ہیلی بھی ولایت سے واپس آگئے اور فوراً مال گذاری میں اکسٹھ لاکھ کی کمی کا اعلان کیا گیا۔ سر مائیکل کین کی صدارت میں ایک کمیٹی بیٹھی کہ وہ مزید غور اور تحقیقات کے بعد مال گذاری کی سفارش کرے۔ جس نسبت سے زمیندار کو مال گزاری میں کمی دی گئی اسی نسبت سے کاشتکار کے لگان میں کمی کی گئی۔

ہم لوگ نینی تال آگئے۔ سول نافرمانی بند کردی گئی تھی مگر ملک میں ہیجان کافی تھا۔ جو لوگ بم اور گولی کی مدد کے بغیر ہندوستان کی آزادی کو ناممکن خیال کرتے تھے وہ اپنے خفیہ پروگرام پر عمل کرنے لگے۔ ریلوں پر ڈاکے ڈالے گئے۔ کئی جگہ افسروں پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ بمبئی کے گورنر سر ارنلسٹ ہوٹسن پر گولی چلی گو یہ بچ گئے۔ علی پور میں ایک جج صاحب گولی سے قتل کئے گئے۔ پنجاب میں فوجی افسروں پر حملہ ہوا۔ جس میں سے ایک مارے گئے۔ ایک خان بہادر پولیس انسپکٹر ڈھاکہ میں مارے گئے اور بہت ایسے واقعات ہوئے۔

جرائم کا یہ طریقہ بنگال میں زیادہ رہا۔ یوپی میں ایسا نہیں ہوا۔ لیکن انتظامی درو بست پر اس کا سایہ پڑنے لگا تھا۔

میرا شیڈو

انہیں دنوں میں نے لکھا کہ ایک اجنبی شخص اکثر میرے پیچھے چلتا ہے۔ لیکن کچھ فاصلہ سے ایک دو روز تو میں نے خیال نہ کیا۔ لیکن پھر میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ حفاظت کے خیال سے میرے ساتھ کیا گیا ہے۔ جنہیں شیڈو کہتے

ہیں۔ ان کی جیب میں ایک تپنچہ رہتا ہے۔ جس کے چلانے میں یہ بڑے مشاق ہوتے ہیں۔ میں نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور اب دنیا کے مزید تجربے کے بعد یہ خیال کرتا ہوں کہ میری رائے کس قدر نادانی پر مبنی تھی۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کی بدیشی حکام کو ایسی حفاظت کی ضرورت ہے اور ایسی احتیاط ضرور ہونی چاہئے۔ لیکن میں تو ہندوستانی ہوں۔ اگر میرا انتظام اتنا بُرا ہے اور میرا طور طریقہ ہم وطنوں کے ساتھ اتنا نفرت انگیز ہے کہ وہ میرے قتل پر آمادہ ہیں۔ تو پھر زندگی کا کیا لطف اور یہ نہیں ہے تو وہ میرے قتل کی سازش کیوں کریں گے۔ آج مہاتما جی کے قتل اور ملک میں ہزارہا بے گناہوں کی خوں ریزی دیکھنے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ میں کس قدر ناسمجھ تھا۔ میری نظر انسانی فطرت کے فقط ایک ہی پہلو پر پڑتی تھی۔ میرے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات نہ آتی تھی کہ سفاکی اور شیطنت میں بھی انسان اپنی ہی مثال تھا۔ بہر حال رائے غلط تھی یا صحیح میں ہوم ممبر تھا۔ انسپکٹر جنرل کو میرا کہنا ماننا پڑا۔ اور شیڈو سے میرا پیچھا چھوٹا۔

دیہات پر اقتصادی اثر

دیہات پر اناج کی قیمت گر جانے کا بہت بُرا اثر تھا۔ لگان اتنا زیادہ تھا کہ کاشتکار ادا نہیں کرسکتا تھا۔ بعض زمینداروں نے بغیر گورنمنٹ کا انتظار کئے اپنے کاشتکاروں کے لگان میں کمی کردی تھی مگر خال خال ایسا ہوا تھا۔ میں نے بھی شاید ۲۵ فی صدی کمی کی تھی مگر حالات کے لحاظ سے یہ کمی ناکافی تھی۔ ہیلی صاحب نے آتے ہی مال گزاری میں کمی کردی۔ اور قانون کے تحت اسی تناسب کے لحاظ سے لگان میں کمی ہوگئی۔ یہ نسبت ایک اور تین تھی۔ زمینداروں نے ۲۰۷۱۳۷۴۲ کی کمی کاشتکار کو دی۔ حکومت نے زمینداروں کو مبلغ ۶۲۵۷۸۵۷ روپیہ کی مال گزاری میں کمی دی۔ لیکن اس سے زیادہ کمی کی ضرورت تھی اور آئندہ کی گئی۔

دیہات میں ایک طرف تو قیمتوں کے گرنے سے کاشتکار مصیبت میں تھا۔ دوسری جانب باوجود ''گاندھی ارون'' معاہدہ کے کاشتکاروں کا (جن کی تعداد ستر پچھتر فی صدی ہے) کانگریس کا ساتھ نہ دینا گویا پارٹی کے سیاسی مستقبل کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ لہٰذا گاؤں میں شورش شروع ہوگئی۔

حکومت کی دشواریاں قابلِ لحاظ تھیں۔ وہ کسی ایک ہی پارٹی کی خوش نودی کی طالب نہ تھی۔ اس کے سامنے تین پارٹیاں تھیں۔ کاشتکار، زمیندار اور عام ٹیکس ادا کرنے والا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ کاشتکار اور زمیندار کے درمیان جو متفقہ لگان تھا وہ ناقابل وصول ہو گیا تھا۔ اسی لئے ایک حد تک لگان اور مال گزاری میں کمی کر دی گئی تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ مستقبل کے واسطے کیا اصول یا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں کسی پارٹی کو معقول وجہ شکایت نہ ہو۔ مختلف زمینوں کا لگان اور مال گزاری مختلف اقسام زمین۔ مختلف حالات اور مختلف نوعیت کاشت پر منحصر تھی۔ بعض جگہ اونچی قوموں کے لگان کچھ کم ہوتے تھے۔ اس واسطے کی وہ مزدوروں سے کھیتی کراتے تھے۔ آخر کس اصول پر کمی کی جائے۔ کیا لگان کو اتنا کم کر دیا جائے جتنا اس زمانے میں تھا جب کہ اجناس کی قیمت یہی تھی یا اس ارزانی کے نقصان کا کچھ حصہ کاشتکار بھی برداشت کرے۔ پھر یہ کمی سب پر یکساں ہو یا کاشتکار اور کھاتہ کی حالت کے مطابق الگ الگ تجویز کی جائے۔

کاشتکاروں کا لگان یکساں نہ تھا۔ مثلاً صوبہ آگرہ میں موروثی اور غیر موروثی کے لگان میں بڑا فرق تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ گذشتہ تیس سال قبل اجناس کا نرخ تقریباً یہی تھا جو ۱۹۳۱ء میں ہو گیا تھا لیکن اس تیس برس میں موروثی کاشتکاروں کے لگان میں جھانسی ڈویژن میں ۴ فی صدی اضافہ سے لے کر میرٹھ ۵۰ فی صدی تک ہوا تھا۔ ہر ڈویژن کی حالت الگ الگ تھی۔ بخلاف اس کے غیر موروثی کاشتکاروں کے لگان میں اضافہ جھانسی ڈویژن میں ۵۲ فی صدی سے لے کر روہیل کھنڈ میں ۱۵۳ فی صدی تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسا اصول بنانا جو ان تمام اختلافات کے باوجود تمام کاشتکاروں اور زمینداروں کے لئے منصفانہ فیصلہ ہو آسان نہ تھا۔ یکساں کمی ان حالات میں ناممکن تھی۔

اقتصادی پس منظر کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صرف چند ماہ قبل ملک میں سول نافرمانی بڑے زور سے چل رہی تھی۔ کاشتکاروں سے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ لگان مت دو۔ ''گاندھی اِرون'' معاہدہ کے بعد وہ تحریک روکی گئی مگر فوراً ہی قیمتیں گرنے

کی وجہ سے کاشتکاروں سے کہا گیا کہ تم اتنا ہی لگان دو جتنا کہ آسانی سے دے سکتے ہو۔ دیہات میں جلسے کیے گئے جس میں ہزار ہا کاشتکار جمع ہوتے تھے۔ ان تقاریر میں زمینداروں کے خلاف بھی تقریریں ہوتی تھیں۔ اس کا اثر کاشتکار کے دل و دماغ پر کیا ہوا محتاجِ بیان نہیں۔ چند ماہ قبل سول نافرمانی کے زمانہ کی آواز ''لگان مت دو'' اب تک ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اقتصادی حالت سے وہ پریشان تھا۔ تحریروں اور تقریروں میں کہا گیا کہ زمیندار اس کا خون چوستے ہیں۔ ادھر زمیندار لگان وصول کرنا چاہتا تھا نتیجہ وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہونا چاہیئے۔ اقتصادی الجھن کے ساتھ امن و امان میں بھی خلل آ گیا۔ بعض اضلاع میں زمینداروں اور ان کے ملازمین پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ کہیں کہیں عمال حکومت کی زدوکوب کی گئی۔ ان حالات کے ماتحت میری تکالیف اور دشواریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان واقعات کی بنا پر گورنمنٹ کو کانگریس سے اور کانگریس کو گورنمنٹ سے شکایت تھی کہ معاہدہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ پھر گفت و شنید ہوئی اور آخر کار مہاتما جی اس پر راضی ہو گئے کہ کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے وہ گول میز کانفرنس میں شریک ہوں گے۔ ۲۹ راگست کو مہاتما جی بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ میں نے بھی انگلستان کے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

دوسری گول میز کانفرنس

شروع ستمبر میں پھر ولایت کو روانہ ہوا۔ اس بار میرے ہمراہ خان بہادر کیپٹن محمد رضا مرحوم تھے۔ بہت خوب انسان تھے۔ معمولی درجہ سے غیر معمولی درجہ تک ترقی کی۔ نواب عبدالسمیع خاں کے ہم جماعت تھے۔ انہی کے پاس رہتے تھے۔ بے منت غیرے خاں صاحب ہوئے۔ خان بہادر ہوئے۔ ٹیری ٹوریل فوج میں کیپٹن ہو گئے۔ میرے خیال میں ان کی ترقی کا راز ان کی ان صفات میں پوشیدہ تھا۔ جب کسی کام کو ہاتھ میں لیتے تو اس دُھن سے شروع کرتے کہ اسی کے ہو جاتے۔ اپنے محسن کے وفادار تھے۔ خدا غریق رحمت کرے۔ نواب بہادر کے ساتھ حج کو جا رہے تھے۔ جہاز

میں انتقال ہو گیا۔

ہم P.N.O سے روانہ ہوئے۔ ملوجا جہاز کا نام تھا۔ اسی جہاز سے سر علی اور لیڈی امام، سر اقبال، شفیع بھی سفر کر رہے تھے۔ یہ تین نئے ممبر تھے جو پہلی کانفرنس میں شامل نہ تھے۔ حافظ ہدایت حسین صاحب مرحوم بھی ساتھ تھے۔

یہ جہاز بہت بڑا اور آرام دہ تھا۔ میں نے کیبن ڈی لکس لیا تھا جو بہت ہی کشادہ اور آرام دہ تھا حافظ ہدایت حسین مرحوم کو میں نے اپنے ہی کیبن میں لے لیا تھا۔

یہ چند روز جو اس جہاز میں گزرے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایسی پُر لطف صحبتیں کہاں نصیب ہوئی ہیں۔ ہر روز مختلف مسائل پر نئے پہلو سے گفتگو ہوتی۔ ہر روز ذہنی اور دماغی ترقی کا احساس ہوتا تھا۔ ادبی اعتبار سے یہ صحبتیں بڑی بلند پایہ تھیں۔

سر علی امام مرحوم

سر علی ہر لحاظ سے اپنے زمانے کے قابل ترین ہندوستانیوں میں سے ایک تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے کونسلر رہے۔ "لا ممبر" کی حیثیت سے ان کا علمی مرتبہ مسلمہ تھا۔ مقرر ایسے کہ جب تقریر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ انگریزی اردو دونوں زبانوں میں بڑی اچھی تقریر ہوتی تھی۔ پرانی تہذیب اخلاق، مروت اور انکسار کا بہترین نمونہ تھے۔ آج ایسے حضرات کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ دوران گفتگو میں طرز بیان بہت دل کش اور الفاظ کا انتخاب بہت پاکیزہ ہوتا تھا۔ قصص وحکایات اور اساتذۂ قدیم کا کلام نوک زبان رہتا۔ جو گفتگو کو اور بھی دلچسپ بنا دیتا تھا۔ اس سفر میں سر علی مرحوم اور لیڈی امام دونوں مجھ پر کرم خاص فرماتے رہے۔ ولایت جانے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد سر علی امام مرحوم بہت بیمار ہو گئے۔ انہیں درد قولنج ہوا اور اسی کے ساتھ کچھ قلب کی بھی شکایت ہو گئی۔ میں دن میں ایک بار ضرور جاتا تھا۔ لیڈی علی امام کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ گو حالت بہت نازک ہو گئی تھی۔ مگر خدا نے اپنا فضل فرمایا۔ اور اتنی صحت ہو گئی کہ وہ ہندوستان واپس جا سکے۔

سر محمد اقبال

سر محمد اقبال کو کون نہیں جانتا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ جتنا بلند ہے محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے کلام پر سینکڑوں مضامین اور مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اُن کا کلام خود ان کی زبان سے ہر روز سننا جہاز کی پُر سکون فضا میں ایک ایسا پُر کیف سماں ہوتا تھا کہ جس کا اندازہ فقط وہی حضرات کر سکتے ہیں۔ جنہیں قدرت نے ذوقِ سلیم عطا کیا ہے۔ ہم سب ایک شعر بار بار سنتے اور لطف اندوز ہوتے۔ اس زمانے کا ان کا کلام زیادہ تر فارسی زبان میں تھا۔ ان کی گفتگو میں پنجابی تلفظ اور طرزِ ادا کی جھلک نظر آتی تھی۔

میرا معمول یہ تھا کی علی الصباح نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر ڈیک پر چلا جاتا تھا۔ وہاں مہاراجہ میسور کے چھوٹے بھائی یوراج بھی آجاتے۔ ہم دونوں بھاگ کر جہاز کے تین چار چکر لیتے۔ پھر کچھ ٹہلتے اس کے بعد اپنے کیبن میں آکر غسل کرتا۔ رضا مرحوم علی الصباح آجاتے تھے۔ مجھے وضو کراتے۔ نئے کپڑے نکالتے اور راحت رسانی کی ہر کوشش کرتے تھے۔ پھر آٹھ بجے میں بریک فاسٹ کے واسطے کھانے کے کمرے میں چلا جاتا۔ اب جہاز میں اور لوگ بھی بیدار ہو گئے ہوتے تو ساڑھے نو بجے تک سر علی امام، سر محمد اقبال، حافظ ہدایت حسین، شفیع داودی (خدا ان سب کو جوارِ رحمت میں جگہ دے) اور میں ڈیگ پر آرام کرسیاں لے کر بیٹھ جاتے۔ کسی علمی، سیاسی یا ادبی مضمون پر گفتگو شروع ہو جاتی۔ لنچ تک یہ جلسہ رہتا۔ پھر ہم سب ساتھ لنچ کھاتے اور کچھ دیر آرام کرتے۔ سوائے اس وقت کے جب میں ٹینس یا اور کوئی ورزش کرتا تھا۔ باقی تمام وقت انہی صحبتوں میں گذرتا تھا۔

ایک روز سر علی امام مرحوم نے ایک قصہ سنایا۔ وہ لا ممبر تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کی ذیل کی مشہور نظم کا انگریزی ترجمہ سر علی نے لارڈ ہارڈنگ کو دیا۔

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر ... مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا
قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی ... کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرمانِ دہ جے پور نے نسبت کی خواہش کی ... اگرچہ آپ بھی وہ صاحبِ ودہیم و لشکر تھا
ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشہٗ اکبر ... گئے انبیر تک جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا

ادھر راجہ کی نور دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی — اُدھر شہزادہ پر چتر عروسی سایہ گستر تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے — کہ کوسوں تک زمین پر فرش دیبائے مسحر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جولائے تھے — وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی — کی جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہند وکش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

بار دیگر جب سر علی امام مرحوم لارڈ ہارڈنگ سے ملے تو ویسرائے نے ان سے جو کہا وہ الفاظ بجنسہ تو مجھے یاد نہ رہے مگر منشا یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی۔ ہمیں ابھی ایک ہی صدی ہوئی مگر ہماری سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔

اس بار ہم لوگ مارسیلز پر جہاز سے اترے۔ وہاں سے پیرس کو گاڑی سہ پہر کو جاتی تھی سر محمد اقبال۔ شفیع داؤدی اور حافظ ہدایت حسین مرحومین کی رائے ہوئی کہ چونکہ ریل کی روانگی کے وقت میں دیر تھی۔ شہر کی سیر کی جائے۔ میں نے بڑے شد ومد سے تائید کی۔

ہم ایک گائڈ یار ہنما کو لے کر چلے۔ یہ ضرور دشواری تھی کہ ہمارا گائڈ انگریزی سے کچھ زیادہ واقف نہ تھا اور ہم لوگ فرانسیسی سے واقف نہ تھے۔ منجملہ دوسرے مقامات کے ہم ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں اسٹیج پر ایسی حیا سوز برہنگی دیکھی کہ مجھے سخت حیرت تھی کہ فرانسیسی جیسی متمدن اور مہذب قوم ایسی حرکتیں کیسے روا رکھتی ہے۔

ہم فرانس سے کیلے ہوتے ہوئے لندن پہنچے۔ اسٹیشن پر حکومت کے صیغۂ میز بانی کے افسر موجود تھے۔ اور پہلی بار جو میری پرائیوٹ سکریٹری تھی وہ یہی تھی اس بار میرا قیام قصر بکنگھم کے قریب سینٹ جیمس کورٹ میں تھا۔ یہ بہت آرام دہ عمارت تھی۔ کمرہ نہایت کشادہ اور نہایت نفیس۔

میں دو کمیٹیوں کا ممبر تھا۔ کمیٹی ۲ جس کا مقصد یہ تھا کہ صوبوں کے واسطے آئین بنایا جائے کمیٹی ۳ جس کا مقصد اقلیت قوموں کی حفاظت کے طریقے وضع کرنا تھا۔

اقلیتوں کے حقوق

۲۸ ستمبر کو اس کا جلسہ شروع ہوا۔ مسٹر رمزے میکڈانل وزیر اعظم نے اپنی شروع تقریر میں جب ذیل الفاظ میں اس کا اعتراف کیا کہ یہ سوال سال گذشتہ طے نہ ہوسکا۔ اور اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ حل نہ ہوسکا۔

''جب گذشتہ بار ہم جمع ہوئے تھے تو میں صفائی سے کہہ سکتا ہوں اور جو اس وقت موجود تھے وہ صفائی سے اس کا اقرار کریں گے کہ اقلیتوں کے مسئلہ نے ہمیں پریشان رکھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ یہ مسئلہ آپ کا خانگی مسئلہ ہے اور اسے آپ کو خود طے کرنا چاہیے۔ میں نے جب آپ سے اپیل کی تھی اور اب پھر اپیل کرتا ہوں کہ اقلیتوں کے تحفظات کے اس مسئلہ کو طے کیجیے تاکہ سب مطمئن ہوجائیں

اس جلسہ میں ہز ہائی نس آغا خان نے کہا کہ'' آج شب کو مہاتما جی کچھ مسلمانوں سے مل رہے ہیں۔ میں کسی گفت و شنید کے متعلق اس وقت اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔ مالوی جی نے بھی کہا کہ ایسی گفتگو ہندو مسلم سوال اور دوسری اقلیتوں کے متعلق ہو رہی ہے۔ اس واسطے اس میٹنگ کو ملتوی کرنا مناسب ہوگا۔ میٹنگ ملتوی ہوگئی۔

لیکن ڈاکٹر امبیڈکر اور کرنل گڈنی نے اسے صاف کر دیا کہ کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان اگر کوئی معاہدہ ہوتا ہے تو ہم اس کے پابند نہیں ہیں۔

پہلی اکتوبر کو پھر میٹنگ ہوئی۔ اس میں مہاتما جی نے ہز ہائی نس آغا خان کے مشورے سے یہ خواہش کی کہ میٹنگ کو ایک ہفتہ کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ ہز ہائی نس اور اکثر حضرات نے مہاتما جی سے یہ خواہش کی تھی کہ مختلف جماعتوں کے لوگوں کو بلا کر وہ گفتگو کریں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ایک شب قبل رٹز ہوٹل میں مہاتما جی مسلمانوں سے ملے تھے۔

بد قسمتی سے میری ڈائری اس سفر کی گم ہوگئی۔ لہٰذا سرکاری رپورٹوں سے مدد لے رہا ہوں مگر وہ چنداں دل چسپ نہیں۔ حافظہ میں خاص خاص واقعات محفوظ ہیں۔ مگر ان کی تفصیلات یاد نہیں۔

مہاتما جی سے مسلمانوں کی گفتگو

مہاتما جی اور مسلمانوں سے پہلی ملاقات ہز ہائی نس کے کمرے میں رٹنر میں ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ مہاتما جی نے خواہش کی کہ مسلمان حکومت برطانیہ سے کہیں کہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کو بھی بلایا جائے۔ سوائے سر علی امام کے نیشنلسٹ مسلمانوں کا کوئی اور نمائندہ نہ تھا۔ مہاتما جی کے الفاظ کا منشا یہ تھا کہ میرے پر نہیں ہیں تو کیسے اڑوں۔ میرے خیال میں مہاتما جی کا اصرار بجا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے کوئی فیصلہ ایسے مسلمانوں کی غیر موجودگی میں ہو جو ان کے ساتھ رہے تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت کے بُرے بنے اور انگریزوں کے ہاتھوں تکلیفیں برداشت کیں۔ مسلمان لیڈروں کا خیال تھا کہ ہم کیوں گورنمنٹ سے خواہش کریں۔ ممبروں کو دعوت نامہ ہماری رائے سے نہیں بھیجے گئے۔ پھر ہم ایسی خواہش کیوں کریں۔ مسٹر جناح مرحوم ومغفور میرے برابر بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ مہاتما جی کی اس خواہش کو مان لینے میں کیا ہرج ہے تو مسٹر جناح مرحوم نے پلٹ کر فرمایا۔

"I can forgive an enemy, but I cannot forgive a traitor".

مجھے اپنے پرانے کاغذات میں چند کاغذ ملے جن میں ان کا ذکر ہے جو مہاتما جی اور مسلمانوں میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ مہاتما جی کی پہلی تجویز یہ تھی۔ ۲۸ ستمبر۔

"That the embargo on Dr. Ansari should be lifted till then it will not be of any use to make any serious efforts for the settlement of the Hindu Muslim question."

اس تجویز پر ۲۸ ستمبر کی تاریخ ہے۔ اس کے بعد ۲۹ ستمبر کو مہاتما جی کی طرف سے یہ تجویز ہے۔

"Doctor Ansari agreeing, I shall be prepared to endorse the Muslim demands and endeavour to utmost of my ability to get it accepted by all parties with the active assistance of the Muslim friends. Dr. Ansari's assistance is vital for me as I should be able to make no progress without him."

مسلمانوں نے اس کے جواب میں ۳۰/۱ اکتوبر کو جب مہاتما جی اُن سے

ملنے آئے تو یہ formula پیش کیا۔

"I endorse the Muslim demands which are annexed hereto and shall endeavour to the utmost of my ability to get them accepted by all parties including Dr. Ansari and his party. I request the Muslims to help me by withdrawing their objections to Dr. Ansari's nomination to the Round Table Conference, as his assistance is vital for me."

مہاتما جی نے اس Formula کو پسند نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا اس تجویز میں ان پر بہت زیادہ بوجھ بے جا طور پر ڈالا جا رہا ہے۔ پھر مسلمانوں نے مہاتما جی کے سامنے حسب ذیل فارمولا پیش کیا۔

"I wish that the Musalman should withdraw their objections to Dr. Ansari's nomination to the Round Table conference and I will endeavour to the utmost of my ability to persuade him to accept the Muslim demands specified beism after P. m the event of this withholding his consent to them I shnli stand by them and do my best with the help of Muslims to persuade all other parties to accept them."

یہ تجویز مہاتما جی کو دی گئی اور سوا بارہ بجے رات مہاتما جی ہوٹل سے چلے گئے۔
اس کے بعد مسلمانوں نے ہز ہائی نس آغا خان۔ مسٹر جناح، سر میاں محمد شفیع اور مولانا شوکت علی کو منتخب کیا کہ وہ مزید گفتگو مہاتما جی سے جاری رکھیں۔
اوپر کی انگریزی کی تجاویز میں نے اس گشتی مسودہ سے نقل کی ہیں کہ جو مجھے سر شفاعت احمد مرحوم نے بحیثیت سکریٹری مسلم ڈلیگیشن بھیجی تھیں۔
گو اب پاکستان کے بننے کے بعد تصویر بالکل بدل گئی۔ یہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اگر ایسی ہی ایک اور گشتی مسودہ کی نقل شامل کر دوں جس سے معلوم ہو کہ مسلمانوں کا مطالبہ کیا تھا جسے مہاتما جی بعض ترمیمات کے ساتھ قبول کرنے کو تیار تھے۔
مہاتما جی نے Raconcile کا لفظ استعمال کیا تھا جس کے معنی میری رائے میں راضی ہونا نہیں بلکہ بادلِ ناخواستہ مان لینا ہیں۔

Terms of October 5th, 1931

I - MUSLIM PROPOSALS

1. In the Punjab and Bengal bare majority of one percent of Musalmans, but the question of whether it should be by joint electorates and reservations of 51% of the whole house, should be referred to Musalman voters before the New constitution comes into force, and their verdict should be accepted.
2. In other Provinces where the Musalman are in a minority the present weightage enjoyed by them to continue, but whether the seats should be reserved to a joint electorate, or whether they should have separate electorates, should be determined by the Musalman voters by a referrandum under the New Constitution, and their verdict should be accepted.
3. That Musalman representative in the central Legislature both houses should be 1/3 of whole house, 20% of the whole house to the elected by the Musalmans in British India and at least 7% by convention should be Musalmans out of the quo a that may be assigned to the Indian States making a total representation of the Musalmans 1/3 in each house.
4. That the residuary power should vest in the fedrating provinces of British India.
5. That the other points as follows being agreed:-
   (1) Sindh
   (2) N.W.F. Provinces
   (3) Services
   (4) Cabinet
   (5) Fundamental right and safeguards for religion and culture.
   (6) Safeguards against legislation affecting any community.

MR. GANDHI'S PROPOSAL

1. That the Franchise be on the basis of adult suffrage.
2. No special reservations to any other community save Sikhs and Hindu minorities.
3. The Congress demands:-

(a) Complete Independence
(b) Complete control over the defence immediately.
(c) Complete control over external affairs.
(d) Complete control over finance.
(e) Investigation of public debts and other obligations by an independent tribunal.
(f) As in the case of partnership, right of either party to 'terminate it.

2 - THREE AL-TERNATIVES:

1) As regards acceptance by the respective parties, and the Congress, of the four Muslim demands with referendum on the basis of adult suffrage in place of the present for separate electorate, the acceptance of the Muslims of the Congress mandate, and the resistance to the further extension of special provision for minorities including un-touchables, on the ground already explained.
2) On the acceptance by the Muslims of Sir Geoffrey Corbett's scheme so far as the Punjab is concerned.
3) On reference of the respective demands of the three parties to arbitration from among ourselves.

۸/اکتوبر کو ایک ہفتہ گذرنے پر مہاتما جی نے کمیٹی کی میٹنگ میں اظہار افسوس کیا کہ کمیونل قضیہ طے نہ ہوگا۔ لیکن سلسلۂ گفتگو اس کے بعد بھی جاری رہا۔

مہاتما جی نے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر کانگریس مسلمانوں کی خواہشات مان لے تو انہیں (۱) ہندوستان کی خودمختاری میں (جس میں مالیات،

فوج، امور خارجہ شامل ہیں) کانگریس کا ساتھ دینا چاہیے۔

(۲) ہندوستان کو یہ حق ہوگا (جیسا کہ ہر شراکت میں ہوتا ہے) کہ جب چاہے امپائر سے الگ ہو جائے اور یہی حق انگلستان کو ہوگا۔

(۳) یہ کہ سوائے سکھوں اور ہندو اقلیت کسی اقلیت کے جداگانہ انتخاب کے مسلمان بھی خلاف رہیں۔

میں نے ان چیزوں کو ذرا تفصیل سے اس واسطے لکھا کہ ہم اس ملک کو اس زمانہ میں کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ اور اس زمانہ میں وہ کہاں پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکے۔

مہاتما جی نے یہ بجا طور صاف کر دیا ہے کہ جو فیصلہ ہوگا اسے وہ فوراً کانگریس ورکنگ کمیٹی میں پیش کریں گے۔ وہ کانگریس کو پابند نہیں کر سکتے گو مسلمان نمائندہ مسلمانوں کی طرف سے فیصلہ کو تیار تھے اور چاہتے تھے کہ مہاتما جی بھی ایسا ہی کریں۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ مہاتما جی کی رائے نامناسب نہ تھی۔ وہ کانگریس کو پابند نہیں کر سکتے تھے۔ گو مجھے اس کا یقین ہے کہ اس زمانہ کی کانگریس پر مہاتما جی کا اتنا اثر تھا کہ ان کے عہد و پیمان سے کانگریس روگرداں نہ ہوتی۔

مسلمانوں کی ذہنیت یا زاویہ نظر یہ تھا:

(۱) اگر ہم نے فیصلہ کر لیا اور کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے نہ مانا تو ہمارے تاش کے پتے پہلے ہی کھل جائیں گے۔ اور اگر آخری فیصلہ حکومت برطانیہ ہی کو کرنا پڑا تو وہ اس سے متاثر ہوگی۔

(۲) مسلمان ڈومینین اسٹیٹس سے زیادہ آگے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس طرح سوچتا تھا اگر قانون میں حقوق ملے بھی تو کون اس کا ذمہ لے گا کہ جو کچھ قانوناً ملا ہے وہ عملاً بھی مل جائے۔ لہٰذا اس کے تصور میں ایسے گورنر جنرل کی ضرورت تھی جو الیکشن کا محتاج نہ ہو اور کسی سیاسی جماعت کا مرہون منت نہ ہو۔

(۳) وہ اس پر تیار نہ تھے کہ اور فریق خاص کر اچھوت اگر جداگانہ نمائندگی چاہیں تو وہ اس کی مخالفت کریں جبکہ وہ اسی چیز کو اپنے واسطے طلب کر رہے ہوں۔

آخر کار مہاتماجی نے ۸؍اکتوبر کو کمیٹی کے جلسے میں اظہار کردیا کہ ان کی کوشش ناکام رہی۔ اس پر سب طرف سے تقاریر میں اظہار افسوس کیا گیا۔

اس کمیٹی کی سفارشات کا نتیجہ یہ تھا کہ سوائے پارسی حضرات کو جو علیحدہ نمائندگی نہیں چاہتے تھے اچھوت، مسلمان، سکھ عیسائی سب کے لئے جداگانہ نمائندگی کی سفارش کی گئی۔

اس میٹنگ میں ہز ہائی نس آغا خان نے ایک تقریر کے ساتھ وزیر اعظم کو ایک کاقرارنامہ دیا۔ ہز ہائی نس کی تقریر کے شروع کے الفاظ یہ تھے۔

" Mr. Prime Minister on behalf of the Mohamadens, the depressed classes, the Anglo Indians, the Europeans and a considerable section of Indian Christian groups I present the document embodying the agreement which has been arrived at between them with regard to the intercommunal problem with which the Round Table Conference in general and the minorities committee in particular are concerned."

ایک روز رٹز ہوٹل میں مسلمانوں کی میٹنگ ہورہی تھی۔ آغا خان اور دیگر ممبران موجود تھے کہ سر محمد اقبال مرحوم نے نہایت غصہ کے ساتھ ہز ہائی نس سے کہا ۔جس کا منشا یہ تھا کہ ہماری جماعت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو وزیر ہند سے ہماری تجویز کی اطلاع کرتے ہیں۔ اور ہمارے جلسوں کا ہر راز وزیر ہند پر منکشف ہوجاتا ہے۔ یہ الزام اتنا سخت تھا کہ ممبران نے اس پر اصرار کیا کہ ایسے شخص کا نام ظاہر کیاجائے۔ اس اصرار پر سر محمد اقبال مرحوم نے ایک صاحب کی طرف (خدا انہیں غریق رحمت کرے) اشارہ کرتے ہوئے ایک نا ملائم لفظ کا استعمال کیا اور کہا کہ...... یہ جاکر کہتا ہے'' ان مرحوم پر کیا گزری وہ تو ان کا دل بتاسکتا تھا مگر تمام ممبران میں غصہ کے ساتھ شرمندگی کا بھی احساس تھا۔

انگلستان میں ۱۹۳۱ء کا انتخاب

ان دنوں کساد بازاری اور بے کاری دنیا میں ہر طرف پھیل رہی تھی۔ بے

روزگار لوگوں کے جلوس لندن میں نکلتے تھے۔ ہندوستان میں چیزوں کی قیمتیں اتنی ارزاں تھیں کہ گیہوں کا نرخ سترہ اٹھارہ سیر فی روپیہ ہو گیا تھا۔ امریکہ میں بھی دولت کی اس قدر فراوانی کے باوجود بے روزگاری کی شکایت تھی۔

انگلستان میں مزدور پارٹی کی حکومت تھی۔ پارلیمنٹ میں مزدوروں کی اکثریت نہ تھی لیکن لبرل مزدور پارٹی کی مدد کر رہے تھے۔ اور اس طرح یہ حکومت چل رہی تھی ۱۹۳۱ء میں جنرل الیکشن ہوا۔

میں لندن میں تھا۔ اس میں کنزرویٹو کی بڑی اکثریت آئی لیکن حکومت کسی ایک جماعت نے نہیں بنائی بلکہ قومی حکومت بنی جس کے وزیراعظم مسٹر رمزے میگڈانل رہے۔ مجھے یاد ہے کہ مزدور پارٹی کی تعداد بہت ہی کم آئی تھی لیکن اقتصادی دشواریاں تمام دنیا پر اس طرح چھائی ہوئی تھیں کہ مسٹر بالڈون نے اسے پسند کیا کہ بجائے خود وزیراعظم ہونے کے مسٹر رمزے میگڈانل کو وزیراعظم رکھیں اور اسی طرح قومی حکومت بنائیں۔

میرے خیال میں مسٹر بالڈون کی یہ مثال قابلِ تقلید ہے۔ میں اکثر خیال کیا کرتا ہوں کہ اگر ۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد ہندوستان کے اکثر صوبوں خاص کر یوپی میں پارٹی کی گورنمنٹ بنانے کے بجائے کانگریس نے قومی گورنمنٹ بنائی ہوتی تو آج ہماری زندگی کا کیا نقشہ ہوتا۔

عوام کا سیاسی شعور:

جس روز ولایت میں ۱۹۳۱ء کے انتخاب کے پرچے پڑ رہے تھے میرے موٹر ڈرائیور نے مجھ سے دو گھنٹہ کی چھٹی طلب کی۔ وجہ بیان کی کہ اُسے رائے دینے جانا ہے۔ مجھے دلچسپی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ کس حلقہ میں رائے دوگے۔ اس نے کہا کہ چلسیا میں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہاں سے سر سیموئل ہور کھڑے ہو رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اگر ہرج نہ ہو تو یہ بھی بتا دو کہ کس کے حق میں رائے دینے کا ارادہ ہے۔ مجھے حیرت ہوئی جب اس نے سر سیموئل ہور کا نام لیا۔ میں نے پوچھا کہ تم مزدور اور وہ کنزرویٹو۔ تمہارا ان کا کیا ناتا۔ اس نے جواب دیا "ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں مزدور ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ کنزرویٹو انتظام کرنا ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ پارلیمنٹری

حکومت بہت سے ممالک میں ہے۔ لیکن جتنی انگلستان میں (شاہی کے باوجود) کامیاب ہوئی اتنی اکثر دوسرے ممالک میں نہ ہوئی۔ اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ ایک معمولی موٹر ڈرائیور کا یہ فیصلہ کہ اس کی رائے میں اس کی ہم پیشہ مزدور پارٹی مخالف پارٹی سے حکومت کرنے کی اہلیت کم رکھتی ہے اس لئے اس کی رائے مخالف پارٹی کے لئے ہو سیاسی شعور اور آزادیٔ رائے کی بڑی قابلِ تقلید مثال ہے۔

قدرتاً میرا ذہن اپنے ملک کی طرف پلٹا۔ کیا ہندوستان میں سیاسی شعور اتنا ہے کہ یہاں کے عوام الناس جمہوریت کو چلا سکیں۔ کیا اُن میں آزادی کے ساتھ رائے قائم کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ کیا یہ سیاسی جماعتوں کے نعروں کا شکار نہ ہو جائیں گے۔ کیا بلا امتیاز مذہب وملت یہ رائے کا استعمال کریں گے۔ کچھ اس طرح کی باتیں میرے ذہن میں تھیں جن کی بنا پر میں ایوانِ اعلیٰ کا وجود ہندوستان کے لئے ضروری خیال کرتا تھا۔

صوبائی آئین:

الیکشن کا زمانہ ایسا تھا جس میں انگلستان کے باشندوں کو الیکشن کے علاوہ کوئی دھن نہ تھی ہمارے لئے بھی تعطیل رہی۔

جدید گورنمنٹ کی تشکیل کے بعد پھر کام شروع ہوا۔ دوسری کمیٹی جس کا میں ممبر تھا وہ صوبائی آئین بنانے کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ اس کے چیرمین مسٹر ہنڈرسن تھے۔

صوبائی آئین بنانے کے سلسلہ میں برٹش نمائندے اس پر زور دیتے تھے کہ ملازم سرکاری بھی وزیر بنایا جا سکے۔ (یہ سائمن کمیشن کی سفارش تھی) مجھے اس سے اختلاف تھا۔ دوسرا گورنر کے خصوصی اختیارات تھے۔ میں خاص حالات میں ان کی موافقت میں تھا۔ اصل میں وہی دشواری یہاں بھی حائل تھی جو ہر جگہ تھی۔ یعنی اقلیتوں کا تحفظ ہو۔ اس کے علاوہ اگر ملک کا امن وامان خطرے میں ہو تو گورنر کو مداخلت اختیار ہو۔ میرے نقطۂ نظر کی وضاحت میری ایک تقریر سے ہو سکتی ہے۔ جس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE

3rd Meeting of Sub-Committee No. 2,

Held on 8th December 1930

Speaker, Sir Ahmad Said Khan, Nawab Chhattari

Mr. Chairman, on the first point I can only say that I agree with those speakers who are in favour of abolishing dyarchy from the provinces. I may say with reference to what Lord Zetland has just said on the subject of transfer of law and order that although I agree with him to some extent it is not for the reasons stated by his Lord-ship. He said that if the portfolio of law and order is in charge of an Indian such a minister would not be able to administer the department as impartially as a European could. I do not agree with that, nor do I think there would be any lack of efficiency. Here I may say that in one of the major provinces which stands next only to Bengal as far as population is concerned the portfolio of law and order has remained in charge of an Indian for the last ten years. Fortunately the leader of opposition of my Council is also a member of this Sub-committees and I think he will be able to bear me out when I say that not once has any criticism been made in the house or outside it about the impartiality of the Member in charge of law and order .... of course there may be other grounds for misgivings on the part of the minority, but to meet those misgivings I am sure safeguards can be embodied in the constitution instead of perpetuating dyarohy in the Province .... In regard to the composition of the Legislative Council I think there should be no official block but I think it would be desirable if it be allowed official members to come to the House and explain the position whenever necessary. My experience has shown me that sometimes it happens that questions of such detail are

asked in the House that it is difficult for the member in charge of the department to be able to reply without the help of the officials of the Department. It would be of great help therefore, if officials were allowed to explain the matter in the House, but they should have no right of voting. As to the composition of the Ministry, in my opinion the appointment of the Chief Minister should be left to convention. I for one would not like to have that put in the constitution and made rigid. I know that in practice there must always be a Chief Minister. The Governor will have to consult the most influencial man and that man automatically will become Chief Minister. But if we were to make that rigid by stating in the Constitution that there will be a Chief Minister it is quite possible there might be difficulty in formating a ministry in India. The reason is this: it is perfectly easy to do it if there is a party system as there is in England. You have two or three parties. You take the leader of the majority party and make him the Chief Minister. But in India political parties have not crystalised as yet. In the Legislative Council, as far as experience goes, there is the group system. There is a group of ten or twenty here and a group of ten or twenty there, representing various schools of thought. There is no party system. If we insisted that there should be a Chief Minister we might, therefore, have some difficulty. I for one would much prefer to leave the matter open as is done in many other constitutions. For instance, in the English constitution I do not think there is any mention of a Prime Minister. In many constitutions there is no mention of a Prime Minister or a Chief Minister ....

.... As to the question of officials becoming members of a Ministry. I am entirely opposed to any official Minister. It is simply impracticable. It will create weakness inside the

Government. It will not be a source of strength in any way

....

....

There is one other point upon which I should like to lay stress and that is about safeguarding of minorities, by giving some seats in the Cabinet to minorities. I think there would be difficulty in putting such a provision in the constitution, but I think it could easily be put into the Instrument of Instruction, to the Governors. It may be against the nations of democratic Government, but there are special circumstances in India and we must try to create a feeling of security in the minds of minorities. Therefore, I think it would be desirable; indeed, I think, that in the Instrument of Instruction.

We should make it quite clear that the Governor would do his very best to include the members of minority in the Cabinet. This question of minorities, if I may be allowed with your permission to say so, need not be regarded as a question of Musalman minorities. It is not so. If we seek to protect the rights of minorities we do not seek in that way to favour Musalmans. In that respect I was very much impressed by the speech of Rajā Narandra Nath from the Punjab, who is a very Zeaous member of the Hindu Mahasabha. The question of minorities is simply a question of doing justice to the weaker party, whether Hindu or Muslim.

ROUND TABLE CONFERENCE

Fourth meeting of sub-committee no-2

(provincial constitution). Held on 9th December, 1930

Now coming to the special power of the Governor, I beg to submit that I do not wish to take the position taken by Dr. Ambedkar this morning; I think he indicated a certain suggestion and refuted it at one and the same time; for instance, he started by saying that he agreed that minorities should be protected but said that these powers should not be

given to the Governor that they should be put in the statute. Sir, if no man is going to exercise those powers how are those words of the statute going to protect minorities. Some body would have to exercise those powers and that should be the governor; therefore the powers are bound to be put in the hands of the Governor, there can be no other authority to exercise them. Similarly with regards to the preservation of tranquility and peace in the Province, while he disagreed with giving power to the Governor, he proposed that if there any breach of peace the governor should be allowed to have all the postings of officers in his own hands. That means that he should be allowed to usurp all the functions of the Home Minister and the Home Minister for the time being would become a nonentity in the Cabinet. I think, sir, that instead of doing this it would be much better, as was suggested by the Simon Commission and by many other gentlemen here, that these powers should be given to the Governor to intervene in these departments. I know that any reservation of powers in the hands of the Governor is contrary to the notion of self Government It is difficult to reconcile the idea of autonomous Provinces on the one hand with the special powers of the Governor on the other hand; still, situated as we are, we have got to make a constitution for a country in which there are difficulties. We wish to face those difficulties and to draw up a Constitution which may be suitable for that country. I should like, to quote the words of a Nationalist of the Type of Mr. Shastri when addressing the East Indian Association about these powers; he said this:- 'Though great powers are reserved for the Governor, the cases in which he may use them are carefully defined; they are (1) In order to preserve safety or tranquility of the province or (2) in order to prevent serious prejudice to one or more sections of the community as

compared with other sections. Exception may be taken to the second category of powers as being likely to create occasion for undue exercise; but it is necessary to introduce a sense of contentment and security in the minority communities and we must bring ourselves to acquiesce in it. When a Nationalist of Mr. Sastri's type is willing to agree to it, I do not think that any of us should have any objection to those powers being given to the Governor.

سر مالکم ہیلی سے خط و کتابت:

گو میں لندن میں تھا۔ لیکن سر مالکم ہیلی (اب لارڈ ہیلی ہیں) سے مراسلت جاری تھی۔ وہ مجھے صوبہ کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔

لارڈ ہیلی نے مجھے لکھا کہ مہاراج کنوار مہی جیت سنگھ کو اپنی مہلک علالت کی بنا پر استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے بجائے کوئی اور وزیر ہو یا صرف دو وزراء کافی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تیسرے وزیر کی ضرورت نہیں۔

انہوں نے ۳۰ ر اکتوبر کے خط میں مجھ کو اس سے بھی مطلع کیا کہ چار کڑور دس لاکھ کی تخفیف کاشتکاروں کے لئے لگان میں کردی گئی۔ لیکن زمینداروں کو اسی نسبت سے مال گزاری میں تخفیف نہ دی جاسکی۔ زمینداروں کو مال گزاری میں فقط ایک کڑور کی تخفیف دی گئی۔ حالانکہ حساب سے ایک کڑور چھیالیس لاکھ ہونی چاہئے تھی۔ میں نے جواب میں ان کی تجاویز سے اتفاق کیا۔

یو پی کی حکومت نے جس اصول پر تخفیف لگان کاشتکاروں اور تخفیف مال گزاری زمینداروں پر کی وہ انصاف پر مبنی تھا۔ حکومت نے لگان تقریباً وہی رکھا جو کاشتکاران گذشتہ سالوں میں دے رہا تھا۔ جب اناج کا وہی نرخ جو ۳۰-۱۹۳۱ء میں ہو گیا تھا۔ یہ نرخ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء میں تھا۔ لگان اتنا ہی کر دیا گیا۔ اس تخفیف لگان کے باوجود کانگریس ایجی ٹیشن کرتی رہی۔ الہ آباد کے ضلع میں اس کا خاص طور پر بہت زور رہا۔ لیکن انصافاً کسی ایجی ٹیشن کی گنجائش نہ تھی۔

لارڈ ہیلی نے ۱۲ ر نومبر کے خط میں مجھے لکھا کہ سر جارج لمبرٹ نے استعفیٰ

دیدیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ آسام میں گورنر کے تقرر کا موقع آیا تو ویسرائے نے یوپی سے سر مائیکل کین کے تقرر کی سفارش کی اور وہ مقرر ہو گئے۔ اس بنا پر سر جارج مستعفی ہو گئے۔ سر مائیکل کین ان سے جونیر تھے۔

سر جارج کے مستقل گورنر نہ ہونے کی ایک وجہ کانپور کا بلوہ تھا جس کا تذکرہ آچکا ہے۔ دوسری وجہ ارزانی نرخ کے باوجود ان کا لگان و مال گزاری کم کرنے میں پس و پیش کرنا تھا۔ نرخ کی ارزانی نے دراصل ایک ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ اس کا تدارک فوراً نہ کیا جاتا تو دیہات میں انقلابی کیفیت یقیناً پیدا ہو جاتی۔ ایسے موقع پر تاخیر یا پس و پیش کرنا انتظامی در و بست کے اعتبار سے خطرناک غلطی ہے علاج تو جلد یا بدیر کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن تاخیر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کی آپ رعایت کرنا چاہتے ہیں وہ رعایت کے بعد بھی آپ کے ممنون نہیں ہوتے بلکہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی شورش کا یہ انعام ہے۔ پھر وہ اپنا دوست حکومت کو نہیں بلکہ ان حضرات کو خیال کرنے لگتے ہیں جو شورش کا مشورہ دیتے ہیں۔

سر جاج لیمبرٹ کے چلے جانے کا اثر ختم ہوا۔ ۲۰ر نومبر کے خط میں لارڈ ہیلی نے مجھے لکھا۔

بسلسلہ خط گذشتہ جس میں میں نے سر جارج لیمبرٹ کے متعلق تمہیں مطلع کیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے کچھ اور تبدیلیوں کا ذکر بھی تم سے کرنا ہے۔

میں نے راز میں کنور جگدیش پرشاد کو بتایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں بلنٹ کے نام کی سفارش سر جارج لیمبرٹ کی جانشینی کے واسطے کروں۔ وہ جگدیش پرشاد سے دو برس سینیر ہیں اور ایسے معاملات ہیں یہ چیز بہت اثر رکھتی ہے۔ بہر حال جگدیش پرشاد کا یہ خیال ہے کہ چونکہ وہ حقیقت سکریڑی ہو گئے جبکہ بلنٹ فنانس سکریڑی تھے۔ لہٰذا اس وقت ان کا فنانس ممبر ہونا ان کی پوزیشن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہم دو برس سینیر ہونے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مجھے اس خبر سے تشویش ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں ولایت میں بیٹھ کر کیا کر سکتا تھا۔ کنور سر جگدیش پرشاد نے سولہ ماہ کی چھٹی لے لی۔ جس کے بعد وہ

پنشن پر آئی۔سی۔ایس سے سبکدوش ہو گئے۔

اسی خط میں لارڈ ہیلی نے مجھے یہ بھی لکھا کہ انہوں نے مسٹر ہیگ کو لکھا تھا۔ لیکن جب انہوں نے منظور نہ کیا۔ تو لارڈ ہیلی نے سر جوزف کلے کو چیف سکریٹری مقرر کیا۔

اس خط میں لارڈ ہیلی نے یہ بھی لکھا تھا کہ کانگریس نے ضلع الہ آباد میں لوگوں سے لگان ادا کرنے کو منع کیا۔ جب تک گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان گفتگو ختم ہو۔ یوپی گورنمنٹ نے یہ بھی مان لیا کہ جہاں تک صرف الہ آباد کے ضلع کے لگان کا تعلق تھا۔ لیڈران کانگریس اور الہ آباد کے کلکٹر اور کمشنر گفت وشنید کر لیں لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو کانگریس کا مطالبہ ہوا کہ تمام صوبہ میں بجائے چار کروڑ چھیالیس لاکھ کے آٹھ کرڑور تخفیف کی جائے۔ اور یہ کانفرنس ختم ہو گئی۔

میری یہ رائے تھی کہ کانگریس کا یہ مطالبہ سیاسی اغراض کی بنا پر تو ٹھیک تھا لیکن اقتصادی نقطۂ نظر سے صحیح نہ تھا۔ یوپی گورنمنٹ کا یہ نظریہ بالکل منصفانہ تھا کہ لگان اتنا ہی کر دیا جائے جتنا تقریباً اس زمانہ میں تھا جب کہ اجناس کا نرخ اسی کے لگ بھگ تھا۔

مہاتما جی سے ملاقات:

میں نے مسز نائیڈو کے توسط سے مہاتما جی سے ملاقات کا وقت طے کیا۔ مسز نائیڈو مجھے اپنے ہمراہ لے کر گئیں۔ مہاتما جی فرش پر بیٹھے شب کا کھانا نوش فرما رہے تھے۔ کچھ دودھ، انگور اور کھجوریں تھیں۔ ممکن ہے کچھ اور پھل ہوں مگر یاد نہیں۔

مہاتما جی نے مجھے کچھ کھجوریں دیں۔ میں نے بھی کھانی شروع کر دیں۔ میں نے خاص طور پر یوپی کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ کاشتکاروں کے لئے لگان میں مناسب کمی کر دی گئی ہے لیکن کانگریس پھر بھی ادائیگی لگان میں مزاحم ہوتی ہے۔ مہاتما جی نے جواباً جو فرمایا اس کا منشا یہ تھا کہ ذاتی طور پر انہیں یوپی کے حالات سے واقفیت نہیں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ لگان میں جتنی کمی کو یوپی کی حکومت مناسب خیال کرتی ہے کانگریس اسے کم خیال کرتی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ تو آپ کا فرمانا درست ہے کہ ایک ہی تجویز کو ایک کافی اور دوسرا ناکافی خیال کر سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کی خدمت میں یہ بات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۰۱ء و ۱۹۰۲ء میں اناج کے نرخ اور لگان

میں جو نسبت تھی تخفیف لگان کے بعد وہی پھر آ گئی ہے۔ اس کے بعد میں نے حکومت یوپی کی تجویز کی صراحت کی۔ مہاتما جی نے فرمایا کہ یہ تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

یوں اس سے قبل بھی مجھے مہاتما جی سے ملنے کا موقع ہوا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ملاقات تو دو تین ہی آدمیوں میں ہوتی ہے ورنہ ایک مجمع میں ملنا تو ملاقات نہیں فقط درشن ہوتے ہیں۔ اس دفعہ درحقیقت ملاقات ہوئی۔

یہ تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ مہاتما جی کی شخصیت ایسی تھی کہ صدیوں کے بعد کبھی ایسے اشخاص قدرت پیدا کرتی ہے اور شاعر سچ کہا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

یوں تو مہاتما جی میں پنڈت موتی لال نہرو جیسی نظر کی تیزی اور ذہن کی درا کی بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسز نائیڈو اور رائٹ آنریبل شاستری کی طرح فصیح البیان نہ تھے۔ نہ سر تیج بہادر سپرو جیسا قانونی تبحر تھا۔ لیکن ان میں کچھ ایسی ناقابل بیان قوت تسخیر یا جاذبیت تھی کہ مخلوق ان کی طرف طرف کھنچی چلی جاتی تھی۔ ان کے مسکرانے میں بچوں جیسی معصومیت اور شگفتگی جھلکتی تھی۔ ان کے سیدھے اور سہل الفاظ دل میں اترتے چلے جاتے تھے وہ اپنی رائے کے اظہار میں بہت بے باک تھے۔ یہی نہیں کہ حکومت کے مقابل اپنے خیالات بغیر اندیشہ وار درس بیان کرتے تھے۔ یہ صفت سیاسی لیڈروں میں کم ہوتی ہے۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ لوگ ان کے خلاف ہو جائیں گے۔ وہ صحیح معنوں میں رہبری کرتے تھے۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ سچائی کا اعلان کرنا بغیر کسی خطرے کی پرواہ کئے وہ اپنا فرض خیال کرتے تھے اور اس کی ادائیگی فرض میں اپنی جان تک دیدی۔

مجھے اس کے بعد کئی بار شرف نیاز حاصل ہوا۔ میں نے ایک خاص بات ان کی محفل میں محسوس کی ان کے علاوہ یہی کیفیت میں نے ایک اور شخص کی ہم نشینی میں بھی پائی۔ انسان کتنا ہی متفکر یا پریشان کیوں نہ ہو۔ مہاتما جی کی محفل میں ایک سکون کی فضا محسوس ہوتی تھی۔ میں جب کبھی گیا مجھے اس کا احساس ہوا۔

انہیں دشمنی کسی سے ہوتی نہ تھی۔ ان کے مضامین یا ان کی تقاریر میں میں نے کبھی نفرت یا دشمنی کا رنگ نہیں پایا۔ عوام الناس پر ان کا اثر حیرت انگیز تھا۔ لوگ انتخاب کے موقع پر محض ان کے نام پر رائے دیتے تھے کانگریس کی سیاسی طاقت کا راز ان کا ہر دل عزیز ہونا تھا۔

مسز نائیڈو:

جانتا تو میں پہلے سے تھا۔ لیکن اس گول میز کانفرنس کے دوران میں مسز نائیڈو سے خاصی شناسائی ہو گئی جو آئندہ دوستی کی حد تک پہنچ کر جب میں ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد گیا تھا تو یگانگت کی صورت میں بدل گئی وہ ان کی صاحبزادیاں ...... اور مس لیلامنی میرے گھر کے لوگوں اور مجھ پر خاص عنایت کرتی تھیں بالکل گھر کے سے تعلقات تھے۔

میں نے مسز نائیڈو کو جتنا زیادہ قریب سے دیکھا اتنا ہی زیادہ میں ان کا مداح اور ثنا خواں ہو گیا۔

وہ ایک زبردست مقرر بلند پایہ ادیب بے مثل شاعرہ تھیں۔ ان کی صفات سے تعلیم یافتہ ہندوستان کا ہر فرد واقف ہے۔ وہ دل کی بڑی اچھی اور سچی تھیں۔ میں نے ان کے جلسہ میں بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو کسی شخص کا ذکر برائی سے کرتے ہوتے یا کسی کی غلط کاری پر نفریں وملامت میں مشغول ہوتے۔ لیکن مسز نائیڈو ہمیشہ اس کے فعل کو اچھی تعبیر سے نباہتیں۔ یا کم از کم اس کی نیت پر شبہ نہ کرتیں۔

بڑی سچی اور مہمان نواز تھیں۔ جب گورنر یو پی ہو کر آئیں تو ان کا دسترخوان اتنا وسیع تھا جس کی دوسری مثال یو پی کے گورنمنٹ ہاؤس کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔

ان کا وطن حیدرآباد ہے حیدرآباد کے لوگوں کے ساتھ بڑی لطف ومحبت کے ساتھ پیش آتی تھیں وہ جب کبھی حضور نظام سے ملیں تو ہر بات صفائی کے ساتھ بیان کرتیں۔ وہ دل سے حیدرآباد کی ریاست اور نظام کی بخیر طلب تھیں۔

ایک بار مسز نائیڈو کی سالگرہ کے موقع پر حضور نظام کو پیام تہنیت بھیجنے کا خیال پیدا ہوا میں اس زمانے میں حیدرآباد میں تھا۔ اعلیٰ حضرت نے میری رائے دریافت فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ مناسب ہے۔ اس کے جواب میں مسز نائیڈو نے

ایک بہت ہی پُر خلوص خط حضور نظام کو لکھا اس خط میں ایک موقع پر نظام کے واسطے Master کا لفظ استعمال کیا تھا۔ جس سے حضور نظام بہت ہی خوش ہوئے۔ جب میں حاضر ہوا تو وہ خط اعلیٰ حضرت نے مجھے دکھایا میں نے اس خط کی بہت تعریف کی یہاں تک تو کوئی بات نہ تھی لیکن فوراً ہی اعلیٰ حضرت نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اپنے پیام اور مسز نائیڈو کے جواب کو اخبار میں چھپوا دیں مجھے اس میں بدرجہ غایت تامل تھا۔ اول تو میں کسی ایسی تحریر یا تقریر کو جو نجی طریقہ سے لکھی یا بیان کی گئی ہو۔ منظر عام پر لانا نامناسب خیال کرتا ہوں لکھنے والے کو لکھتے وقت اس کا علم ہونا چاہئے کہ اس کی تحریر شائع ہوگی یا اس کے شائع ہونا ممکن ہے نجی گفتگو یا تحریک ایک طرح کی امانت ہوتی ہے جس کا احترام لازمی ہے۔ غرض کچھ ردوقدح کے بعد اعلیٰ حضرت نے میری بات مان لی۔

۱۹۴۷ء میں نائیڈو یوپی کی گورنر ہوئیں۔ ہر حلقہ میں مقبول اور محبوب تھیں۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں لکھنؤ گیا ہوں اور ان کے ساتھ کھانا نہ کھایا ہو۔ مجھ سے فرماتیں تم دعوت نامہ کا انتظار کیوں کیا کرتے ہو۔ جب دل چاہا۔ اے ڈی سی کو فون کر دیا کہ فلاں وقت کا کھانا میں گورنمنٹ ہاؤس میں کھاؤں گا۔

میں نے یہ ہمیشہ دیکھا کہ جو کمزور ہوتا مسز نائیڈو اس کی طرفدار ہوتیں۔ کیسا ہی خاطی ہو۔ اگر شرمندہ خطا ہے تو مسز نائیڈو ضرور معاف کر دیتیں۔

ایک بار لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس میں لنچ پر مدعو تھا۔ مسز نائیڈو کے پاؤں میں تکلیف تھی۔ صوفہ پر پاؤں پھیلائے بیٹھی تھیں۔ انہیں دنوں حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا تھا۔ وہ حیدرآباد کی حالت پر افسوس کر رہی تھیں۔ فرما رہی تھیں کہ اگر تمہاری تجاویز مان لی ہوتیں تو حیدرآباد کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اتنے میں ایک خاتون آئیں جو مسز نائیڈو کے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ وہ ''آنٹی'' (خالہ) کہہ کر مسز نائیڈو کو مخاطب کرتی تھیں مزاج پرسی کے بعد ان خاتون نے مسز نائیڈو کو مبارکباد دی۔

مسز نائیڈو کس بات پر

وہ- حیدرآباد پر

مسز نائیڈو حیدرآباد میرا وطن ہے۔ وہاں کے لوگوں پر اگر کوئی مصیبت آئی

تو مبارک باد کا کیا موقع ہے۔ پھر دیر تک وہ یہی کہتی رہیں کہ کاش اہل حیدرآباد نے ان کی (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) بات مان لی ہوتی انہیں حکومت ہند کی پالیسی سے حرف بحرف اتفاق تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ حکومت ہند کو آخر کار پولیس ایکشن لینا پڑ گیا۔ لیکن انہیں اس کا قلق بھی تھا کہ وہاں کے لوگوں پر مصیبت ٹوٹی۔

ان کی مختلف صفات میں جو صفت قوی ترین تھیں وہ مادری صفت تھی۔ انہیں ہر دُکھی سے ایسی ہمدردی ہوتی تھی گویا مظلوم انہی کے خاندان کا ایک رکن تھا۔

ان کا وجود خواتین ہند کے واسطے ایک قابل تقلید نمونہ تھا۔ ان کے انتقال نے ایک ایسا خلا پیدا کیا ہے جو صدیوں ممکن ہے پُر نہ ہو۔

دوسری کانفرنس کا آخری جلسہ

آخر کار یہ گول میز کانفرنس بھی ختم ہوگئی۔ ۲۸ نومبر کو اس کا آخری اجلاس شروع ہوا۔ تقریباً ہر ممبر نے کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا۔ لیکن جو واقعی طور پر ہندوستان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتا تھا۔ وہ یا تو وزیر اعظم کا آخری بیان تھا یا مہاتما جی کی نظریہ تھی۔ اور حضرات کی بھی تقاریر ہوئیں جو باوجود اپنی تمام خوبیوں کے بیکار رہیں۔ ان سے نہ تو برطانیہ کی پالیسی متاثر ہوتی تھی نہ کانگریس کی۔

وزیر اعظم کی تقریر کا خورد مرکز گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء تھا۔ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں صرف چند فقرہ یہاں درج کر رہا ہوں جو اقلیت کے مسئلہ سے متعلق تھے۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE
2nd meeting 2nd Plenary Meeting
(30th November 1930)

We must all, however, realise that there stands in the way of progress, whether for the Province or the Centre that formidable obstacle, the communal dead-lock. I have never concealed from you my conviction that this is, above all others, a problem for you to settle by agreement amongst yourselves. The first of the privileges and the burden of a

self-governing people is to agree how the democratic principles are to be applied, or, in other words, who are to be represented and how it is to be done. This conference twice essayed this task; twice has it failed. I cannot believe that you will demand that we shall accept these, failures as final representation and conclusive.

But time presses. We shall soon find that our endeavours to proceed with our Plans are held up (indeed, they have been held up already), if you cannot present us with a settlement acceptable to all parties as the foundation upon which to build. In that event his Majesty's Government would be compelled to apply a provisional scheme, for they are determined that even this disability shall not be permitted to be a bar to progress. This would mean that his Majesty's Government would have to settle for you, not only your problems of representation, but also to decide as wisely and justly as possible what checks and balances the constitution is to contain to protect minorities from an unrestricted and tyrannical use of the democratic principle expressing itself solely though majority power.

مہاتما جی نے نہایت صفائی اور دلیری سے کانگریس کا نقطہ نظر پیش کیا۔ ان کی تقریر میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کانگریس کی طاقت اہلِ ملک پر اُس جماعت کا اثر اور اس کے عزم و عزیمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی صُلح کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ وہ تقریر اعلانِ جنگ بھی تھی اور دعوتِ صلح بھی۔ وہ تقریر درحقیقت بار بار بڑھنے کے لائق ہے۔ مہاتما جی نے اس موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا:

"The Congress represents the spirit of rebellion."

اسی تقریر کا ایک حصہ حسب ذیل ہے۔

Plenary session, 30th November 1931

ROUND TABLE CONFERENCE SECOND SESSION

I suggest to you, Prime Minister, it is too late today to

resist this, and it is this thing which weighs me down. This choice that lies before them, the parting of ways probably, I shall hope against hope, I shall strain every nerve to achieve an honourable settlement for my country if I can do so without having to put the millions of my countrymen and even children to this ordeal of fire. It can be a matter of no joy and comfort to lead them on again to a fight of that character, but if a further ordeal of fire has to be our lot, I shall approach that with the greatest joy and with greatest consolation that I was doing what I considered right, the county was doing what it felt to be right, and the country will have the additional satisfaction of knowing that it was not at least taking lives, it was giving lives; it was not making the British people directly suffer, it was suffering.

مجاہد کو دیکھا مصلح کو بھی دیکھئے۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE
2nd Meeting, 2nd Plenary Meeting
(30th November 1930)

I do not want to break the bond between England and India, but I do want to transform that slavery into complete freedom for my country. Call it complete independence or whatever you like, I will not quarrel about that word, and even though my countrymen may dispute with me for having taken some other word I shall be able to bear down that opposition so long as the content of the word that you suggested to me bears the same meaning.

مہاتما جی کی تقریر کے بعد اس ملک کی اکثریت کا فیصلہ ظاہر ہو گیا تھا۔

میں نے بھی اظہار خیال کیا تھا۔ مہاتما جی سے پہلے ہی میری باری نہ آچکی ہوتی تو شاید تقریر بھی نہ کرتا۔ مہاتما جی کی تقریر کے بعد کانفرنس پر اوس سی پڑ گئی۔

میں نے اپنی تقریر میں فرقہ وارانہ سوال پر یہ کہا تھا کہ جہاں تک مسلمانوں کے مطالبات کا تعلق ہے ڈاکٹر انصاری مرحوم کی فرید پور کی تقریر اور مسلم کانفرنس کی قرارداد کو اگر برابر رکھ کر دیکھا جائے تو فقط اتنا ہی فرق ہے کہ ڈاکٹر انصاری مرحوم مخلوط

انتخاب چاہتے ہیں اور مسلم کانفرنس جداگانہ انتخاب کی قایل ہے میں نے اپنی رائے حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کی تھی۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE
2nd Meeting 1st Plenary Section
(28th November 1931)
By the Nawab of Chhatari

"As to the question of separate electorates, my position is the same today as it was last verson the Ist January, when I spoke on the question in the Minorities Sub-Committee, namely, that as certain communities insist on separate electorates, it should be given to them. There should be a clause in the Constitution that they can give them up whenever they like of their own free will. After all, separate electorates in themselves are not the goal. When all other safeguards for the Muslim community have been embodied, when they have seen the working of the constitution when they realize that real safety of the minority rests upon the goodwill of the majority more than any thing else, I think they will be willing to give up separate electorates. What we want is to create a feeling of nationalism. Can we create a feeling of nationalism by enforcing upon certain communities a system of electorates against their wishes? My reply is in the emphatic negative. On the other hand, it will make the community concerned morose and angry, and it will create in the minds of the majority that they have got joint electorates not because of the willingeness of the minority, but because the minority was too weak to retain them in their hands. If my proposal is adopted, the result will be that it will give the Muslim Community the right of self determination, and when the Muslim community agrees to give up separate electorates, the result will be that their Hindu brethren will feel that the Muslims have given up separate electorates to show their implict confidence in the majority. For these reasons I still feel that it is the right way to start off

with separate electorates with such a clause in the Constitution.

"We often hear about communal differences, and there is one point that I wish to make very clear, particularly to the members of His Majesty's Government, on whom the thankless task to decide rests. If we keep the Muslim demands on one side and the resolution of the Working Committee of the Congress on the other side, we shall find that the differences are not so many as they outwardly look. If we read the very lucid note that was circulated the other day by Sir Chiman Lal Sitalvad we shall find that the differences remain only in the Punjab and Bengal. On every other point there seems agreement between the two communities. Therefore, thankless as the task may seem it is not such a tremendous task for the Government, and I hope they will be able to settle it once for all."

میں نے اپنی تقریر میں اس پر بھی زور دیا تھا کہ ایک شہری کے بنیادی حقوق میں اس کی حق ملکیت کا بھی تحفظ ہو۔ بغیر معاوضہ کسی کی ملکیت پر قبضہ نہ کیا جائے۔ میں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی تھی۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE
2nd Session, First Plenary Meeting
(28th November 1931)

"I think the solution of the Indian problem rests in All India Federation; and I hope it will be possible for you. Sir to continue this work out in India so that you my be able to complete the full construction of an All India Federation, which I am sure will enable India to take her place with other free nations in the British Commonwealth, bound with such silken ties of love that will be far stronger than any iron chains of domination. I am sure that Indian people are getting restless and that it is necessary for the Government to try to satisfy them as soon as possible. I do not mean that we should be hurried into action by any thing that is being done by

youngmen thoughtlessly; but at the same time if we really wish to remedy this morbid mentality then the real remedy is that we should be able to create a public opinion in India so much against any action of violence that no body may dare do violence; and such a public opinion can only be created if there is a responsible Government incharge of law and order."

ولایت سے واپسی

آخر کار ولایت سے واپسی کا دن آ گیا۔ وکٹوریہ اسٹیشن سے ''ڈوور'' ہوتا ہوا پیرس پہنچا۔ یہاں مہاراج کنوار ہی جیت سنگھ آنجہانی یوپی کی وزارت سے استعفیٰ دے کر بغرض علاج مقیم تھے۔ انہیں کینسر تھا اور جانبر نہ ہو سکے۔ میں ''استوریا'' ہوٹل میں ٹھہرا یہ بھی وہیں مقیم تھے۔ اُن سے ملا۔ دو شب پیرس میں ٹھہرا۔ گو مہاراج کنوار اس قدر علیل تھے لیکن ان کی زندہ دلی پر اس علالت کا کوئی اثر نہ تھا۔

میں نے کھانا شب کو ان کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد باوجود علالت مزاج کے مجھے لے کر چل دیے تین جگہ گئے۔

پیرس میں کہا جاتا ہے کہ یہ شہر رات کے بارہ بجے جاگتا ہے۔ یہ بیان لفظ بلفظ درست ہے۔ یہاں رات کے کلب میں جہاں رات سب بیدار رقص موسیقی کی سحر انگزیوں میں طلوع صبح تک گزارتے ہیں۔ کچھ رقص میں مشغول کچھ پینے پلانے میں مصروف کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا پیشہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص تنہا ہو تو اس کے شریک صحبت ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ناچیں اور مفت شراب پئیں۔ میں شب کو دو بجے اپنے کمرے میں واپس آیا۔

دوسرے روز مہاراج کنوار سے رخصت ہو کر مارسیلز کو روانہ ہو گیا۔ بحیرۂ روم اس بار بھی بہت طوفانی تھا۔ گو مجھے سمندر کے تلاطم سے چنداں تکلیف نہیں ہوتی لیکن جہاز پر بڑی اُداسی چھا جاتی ہے۔ مسافر اکثر اپنے کمروں میں بند رہتے ہیں۔ کوئی کھیل یا تماشہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ لوگ کھانے کے کمرے تک بھی نہیں آ سکتے۔ ہوا بہت سرد اور تیز تھی۔ میرا معمول یہ تھا کہ کبھی کھڑکی کے پاس شیشہ کھڑا

کر کے بیٹھ جاتا تھا اور گھنٹوں سمندر کی طغیانی کا تماشہ دیکھتا رہتا۔ بحیرۂ روم کا پانی یوں بھی ذرا نیلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب آسمان پر بادل چھا رہے ہوں تو تقریباً سیاہ نظر آنے لگتا ہے۔ سامنے سے زبردست موجیں جہاز کی طرف اس طرح بڑھتی تھیں کہ بس جہاز کو آغوش میں لے کر بیٹھ ہی جائیں گی۔ بعض اوقات منوں پانی جہاز کے اندر آجاتا ہے تند و تیز ہوائیں موجوں کے پرے کے پرے جہاز کی طرف کو بڑھتے ہوئے، پوری قوت سے ٹکراتے ہوئے عناصر کی قوت کا ایسا مظاہرہ تھا کہ میں گھنٹوں اسے دیکھتا رہتا۔

پورٹ بندر سعید تک یہی حال رہا۔ اس کے بعد کا سفر جتنا پُر سکون تھا اتنا ہی غیر دلچسپ بھی تھا۔ زیادہ ہم سفر رومن کیتھلک، پادری اور ننیں تھیں جو مشرقی ممالک میں اپنے مذہب کی خدمت کے واسطے اپنی زندگی وقف کر چکی ہیں۔

میں دسمبر کے آخر تک علی گڑھ پہنچا۔ مجھے بمبئی پہنچتے ہی اس کا احساس ہو گیا تھا کہ ''گاندھی اروِن مصالحت'' کا خاتمہ ہو گیا۔

اسی زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔ مہاتما جی بھی ہفتہ عشرہ کے بعد گرفتار کر لئے گئے۔ ظاہر ہے پھر صلح کیسی۔

میری ہوم ممبری کی توسیع کا سال ختم ہو چکا تھا۔ علی گڑھ میں مجھے سر مالکم ہیلی کا خط ملا کہ چار ماہ کی توسیع قبول کروں۔ میرے جانشین کے متعلق کچھ فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ میں نے اسے قبول کر لیا اور نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم سے چارج لے کر لکھنؤ چلا گیا۔

مجھے لکھنؤ گئے دو چار ہی روز ہوئے تھے کہ یکایک سر میاں محمد شفیع کے انتقال کی اطلاع شائع ہوئی ان کا انتقال ۷ جنوری کو ہوا۔ یہ سر میاں فضل حسین مرحوم کے بجائے عارضی ممبر کی حیثیت سے گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر تھے۔ میرے تعلقات مرحوم سے بہت خاص تھے۔ مجھے ان کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔

وائسرائے کی کونسل

دو تین ہی روز کے بعد مجھے سر مالکم ہیلی نے بلایا اور لارڈ ولنگڈن کا تار دکھایا جس میں یہ دریافت کیا گیا تھا۔ کیا میں چند ہفتوں کے لئے سر میاں محمد شفیع کی جگہ پُر کرنے کیلئے دہلی جا سکتا ہوں۔ میں نے سر مالکم ہیلی سے کہا کہ یہ تو آپ کے بھی سوچنے کی بات ہے ان کا خیال تھا کہ چند ہفتہ کے واسطے جانے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ میں نے منظور کر لیا اور دہلی روانہ ہو گیا۔ میرا قیام دہلی میں چھ سات ہفتہ رہا۔ لیکن اس قلیل مدت میں مجھے اس کا احساس ضرور ہوا کہ مرکزی حکومت میں ممبران حکومت کے احکامات میں گورنر جنرل اتنی مداخلت نہیں کرتے تھے جتنی صوبجات میں ہوتی تھی وجہ ظاہر ہے۔ گورنر جنرل سیدھے ولایت سے آتے تھے۔ اول تو ان کی سیاسی تربیت غیر ضروری مداخلت میں مانع رہتی تھی۔ بخلاف اس کے سوائے بنگال، مدراس اور بمبئی کے تمام گورنر آئی۔ سی۔ ایس افسران میں سے مقرر کئے جاتے تھے۔ برسوں ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے ایک طرف انہیں واقفیت بھی ہوتی تھی۔ دوسری طرف ان کی رائے اور پالیسی خاص سانچہ میں ڈھل جاتی تھیں۔ جس سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کرنا نہ ان کے بس میں ہوتا نہ وہ پسند کر سکتے تھے۔

جس طرح صوبوں میں یہ طریقہ تھا اسی طرح دہلی میں ہر ممبر حکومت کا ایک روز مقرر تھا۔ جب وہ گورنر جنرل کے پاس جا کر امور انتظامی میں مشاورت کرتا تھا۔ میں بھی گیا لارڈ ولنگڈن بڑی گرم جوشی سے ملے۔ میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے کرسی تک لے گئے۔ یہ کہتے ہوئے آؤ اب باتیں کریں۔ اتنے ہی میں ایک چپراسی میرے فائل لے کر داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ہز ایکسی لینسی کے چہرہ پر کچھ تکدر سا ہو گیا۔ میں نے فائلوں کے متعلق کچھ کہا تو انہوں نے یہ کہا کہ انہیں چھوڑ جاؤ میں فائل چھوڑ کر چلا آیا۔ دوسرے ہفتہ جب میں گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ جملہ فائل بجنسہ وہیں رکھے تھے۔ میں یہ کہہ کر ساتھ لے آیا کہ ان پر مناسب احکامات دیدوں گا۔

مجھے اس واقعہ سے اس کا اندازہ ہوا کہ لارڈ ولنگڈن صرف اصولی چیزوں کو طے کرنا چاہتے ہیں۔ اور تفصیلات میں دخل دینا نہیں چاہتے۔ پھر کوئی فائل میں ان

کے پاس نہیں لے گیا۔

یہاں ایک یہ بھی طریقہ تھا کہ جو مجھے پسند آیا ہر پندرہ روز کے بعد ایک کیبنٹ ڈنر ہوتا تھا۔ یہ ڈنر نمبر وار ممبران اپنے مکانوں پر کرتے تھے۔ اس میں سوائے ممبران حکومت کے کوئی اور شخص حتیٰ کہ ان کی بیویاں بھی شامل نہ ہوتی تھیں۔ اس طرح کی ملاقاتوں کے موقعہ بہت بہت کارآمد ہوتے ہیں۔ آزادی کے ساتھ تبادلۂ خیالات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب میں حیدرآباد میں صدر اعظم تھا۔ میں نے اس طرز کو وہاں جاری کرنا چاہا مگر میرے رفقائے کار نے اسے دل سے پسند نہ کیا اور کچھ روز کے بعد میں نے بند کر دیا۔

میرے سکریڑی سر فرینک نوئس اور جوائنٹ سکریڑی رام چندر آئی۔ سی۔ ایس تھے جس پر خلوص تعاون کا اظہار ان لوگوں نے کیا۔ اس کا اثر اس وقت تک میرے قلب سے محو نہیں ہوا ہے۔ یہ دونوں اپنی سروس کے ممتاز اراکین میں سے تھے۔ سر فرینک تو ویسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے اور رام چندر پنجاب میں فنانس سکریٹری اور دہلی میں بھی سکریٹری رہے۔

کشمیر میں ایجی ٹیشن

کشمیر میں کچھ عرصے سے ایجی ٹیشن ہو رہا ہے۔ مہاراج اور کشمیر کی رعایا کے درمیان اصلاحات کے سلسلہ میں کس مکش ہوئی۔ اس درجہ ہوئی کہ چار موقعہ پر مہاراج کی فوجوں کو رعایا پر گولیاں چلانی پڑیں۔

یہ تحریک وہاں عرصہ سے چل رہی تھی۔ پنجاب کی احرار پارٹی بھی اس میں ہمدردی کر رہی تھی۔ اخباروں میں حکومت کشمیر کے خلاف مضامین نکل رہے تھے۔ ایک دن ویسرائے نے یکا یک گورنمنٹ کی میٹنگ کا حکم دیا۔ ممبران حکومت جس میں کمانڈر ان چیف بھی شامل تھے۔ ویسرائے حسب معمول صدرات کر رہے تھے۔ زیر بحث مہاراجہ کا وہ مراسلہ تھا جس میں انہوں نے حکومت ہند سے فوجی امداد طلب تھی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ صورت حال اتنی خراب ہوگئی تھی کہ مہاراجہ کی فوج کے قابو سے باہر تھی۔ ویسرائے نے سب سے پہلے کمانڈر ان چیف سے پوچھا۔ اس کے بعد وہ ممبران سے ان کی سینیر ہونے کے لحاظ سے رائے دریافت کرتے مجھ تک پہونچے۔

میں سب سے جونیر تھا۔ تمام رفقائے کار کا مشورہ یہ تھا کہ ریاست کشمیر اور حکومت ہند کے درمیان جو معاہدہ ہے اس کے مطابق فوراً فوجی امداد دی جائے۔ میں نے یہ عرض کیا کہ جب کسی سلطنت یا حکومت میں نظم کی حالت خراب ہوتی ہے یا رعایا کو اطمینان اور اعتماد اپنی حکومت پر نہیں رہتا تو آخری نتیجہ وہ ہے جو آج کشمیر میں ہو رہا ہے۔ کشمیر میں یہ حالت عرصہ سے چلی آ رہی ہے۔ آج مہاراج نے یہ خواہش کی ہے کہ ہم فوجی مدد دے کر برٹش سنگینوں سے اس شورش کو دبائیں۔ کیا آپ کا یہ فرض نہیں کہ ہم مہاراجہ سے یہ شرط لگائیں کہ جب ہماری فوجیں وہاں جا کر اس شورش کو دبائیں گی تو پھر اصلاحات کے متعلق بھی، ہمارے مشورہ پر آپ کو عمل کرنا ہوگا۔ رعایا کی جائز شکایات کا دور کرنا حکومتِ ہند کا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی فوجی طاقت سے اس شورش کو مٹاتی ہے۔ میری اس تجویز کو ویسرائے نے پسند کر لیا اور گلانسی صاحب جو پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے ایک ممتاز افسر تھے وہ مقرر کئے گئے مہاراجہ کو اپنی تجاویز ایک رپورٹ کی صورت میں کریں۔

برٹش گورنمنٹ کا یہ اصول تھا کہ وہ اس طرح کے احکام ہندوستانی ریاستوں میں خود کبھی جاری نہیں کرتی تھی۔ بلکہ رئیس پر زور ڈال کر اصلاحی احکامات جاری کرائے جاتے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ کے حکم سے ایک اعلان کیا گیا جس میں سر بی جے گلینسی کو مقرر کیا گیا اور ان کی مدد کے واسطے شاید دو دو ہندو اور مسلم پبلک کے نمائندے ان کے ساتھ شریک کیے گئے۔ اس اعلان میں علاوہ اس کے کہ آئندہ لوگوں کو کس طرح شریک حکومت کیا جائے حسب ذیل عبارت بھی تھی جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض قواعد وضوابط ایسے رائج تھے کہ جو موجودہ زمانے میں تہذیب یافتہ حکومتیں انہیں نامناسب خیال کرتی ہیں۔

ANNOUNCEMENT ISSUED BY HIS HIGHNESS THE MAHARAJA OF KASHMIR

Regarding the enquiry to be held under Mr. Glancy, 1932

"The first duty of the Commission thus constituted will be to enquire into any complaints which have already been presented to the Darbar, which may be laid before them

in regard to any conditions or circumstances which may tend in any way to obstruct the free practice of any religion followed by any community in my State. This part of the enquiry will include the consideration of any claim for the restoration of any building or place now in the possession of the Government which may be regarded by any community as a building or place devoted to the practice of any religion and which has not already been dealt with by previous orders. My Government has no intention of retaining any building or place known to have been devoted to the practice of any religion and steps will be taken for the restoration without delay of those about which there is no dispute. The commission will also enquire into any secular or civil disability from which any class of my subject may represent that they are suffering in consequence of the religion they profess ...."

پشاور کا دورہ:

مہاتما جی کی گرفتاری کے بعد ایجی ٹیشن بڑے زور سے شروع ہو گیا تھا۔ دہشت پھیلانے والی جماعتیں بھی غافل نہ تھیں۔ ۶ رفروری کو گورنر بنگال پر ایک لڑکی نے گولیاں چلائیں۔ گردوپیش کے ان حالات سے صوبہ سرحد پر اثر پڑا اور سرخ پوش جماعت اور حکومت سرحد میں کش مکش ہو رہی تھی۔

میں ۲۰ رفروری کی شب کو پشاور پہنچا۔ گورنمنٹ ہاؤس میں چیف کمشنر کا مہمان تھا۔ ان دنوں شاید "گریفت" نامی ایک صاحب چیف کمشنر تھے۔ ۲۱ رفروری کی صبح کو میں نے خاص خاص سرکاری اور غیر سرکاری حضرات سے ملاقات کی۔ شام کو اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیز کی طرف سے "ایٹ ہوم" تھا۔ میں نے اسلامیہ کالج کو اپنی ذاتی حیثیت سے پانچ ہزار روپے بطور چندہ دیے۔ یہ سچ ہے کہ خاص مواقع کے تاثرات لازم نہیں کہ حقیقت کے آئینہ دار ہوں۔ پھر بھی وہاں کے لڑکوں، استادوں کا ایک اچھا اثر اپنے قلب میں لایا۔

دوسرے روز صبح کو چیف کمشنر کے ساتھ درہ خیبر دیکھنے گیا۔ جمرود کے قلعہ پر

پہنچے تو معلوم ہوا کہ دو گاؤں کے لوگوں میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور ایک دوسرے کی تواضع رائفل کی گولیوں سے ہو رہی تھی۔ چونکہ سڑک کی ایک طرف ایک گاؤں تھا اور دوسری جانب دوسرا لہٰذا دونوں سرداروں کے پاس پیام پہنچایا گیا کہ کچھ دیر کے لئے تفریح تفنگ سے باز آجائیں تو بہتر ہے۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ ان حضرات نے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہم لوگ سڑک سے گذرنا چاہتے ہیں جنگ کو ملتوی کر دیا اور ہمارا موٹر روانہ ہوا۔

یہ حصہ اس زمانے میں ''ٹرائبل ایریا'' کہا جاتا تھا۔ اس کے باشندے نہ اپنے آپ کو کابل کی رعایا خیال کرتے اور نہ برٹش حکومت کی۔ یہ آزاد لوگ تھے اور اب بھی شاید اسی حالت میں ہوں یہ اپنے روزانہ کے جھگڑے اپنی پنچایتوں میں طے کر لیتے تھے۔ اور اگر کوئی بڑا قضیہ ہو تو ''جرگا'' جمع ہو کر طے کرتا تھا۔ برٹش حکومت نے ان کے مختلف سرداروں سے مل کر یہ طے کر لیا تھا کہ درۂ خیبر کی سڑک کی حفاظت کے یہ لوگ ذمہ دار ہوں۔ اس ذمہ داری کے عوض انہیں خاصی رقومات کسی نہ کسی نام سے دی جاتی تھیں۔ مثلاً انہیں لوگوں میں ایک بے قاعدہ حفاظت شاہراہ کے واسطے بنائی تھی۔ ان کو جہاں تک مجھے یاد ہے خاصہ دار کہتے تھے۔ یہ لوگ اپنی رائفل اور کارتوس خود تیار کرتے ہیں۔ جب ہم درۂ خیبر سے گذرے تھے تو یہ لوگ جابجا حفاظت کی غرض سے سڑک پر کھڑے ہوئے تھے۔ سرراہ ایسی چوٹیوں یا موڑوں پر جہاں سے سڑک پر رائفل سے نشانہ لگایا جا سکتا ہے یہ لوگ موجود تھے۔

اس سرزمین میں زراعت برائے نام ہی تھی۔ چٹیل پہاڑ جن پر درخت یا سبزہ کا نام ونشان نہیں بارش بہت کم ہوتی ہے کسی قسم کی صنعت وتجارت نہیں۔ پھر ایسے ملک کے باشی اگر لوٹ مار نہ کریں تو کیا کھائیں۔ جب تک ان لوگوں کے واسطے کسب معاش کا انتظام نہ ہو گا اس خطۂ زمین پر صحیح معنوں میں امن قائم نہ ہو گا۔ میں نے دیکھا کہ اکثر سڑک کے قریب گاؤں آباد ہیں۔ ہر گاؤں میں چہار دیواری ہوتی ہے۔ ہر کونے پر ایک ٹاور بنا ہوتا ہے۔ جہاں سے رائفل آسانی سے چلائے جا سکتے ہیں۔ گویا ہر گاؤں ایک چھوٹا سا قلعہ ہوتا ہے۔ گاؤں سے لے کر سڑک تک

ایک خندق ہوتی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ اگر دوسرے گاؤں سے لڑائی ہو رہی ہو لیکن کسی غرض سے باہر جانا ضروری ہے تو اسی خندق کے ذریعہ سڑک پر آجائیں۔ چونکہ سڑک کی ذمہ داری انہیں لوگوں پر ہے لہٰذا سڑک پر جائے امن قائم کردی گئی تھی۔ اور اگر کوئی واقعہ سڑک پر ہو جاتا تھا تو برٹش حکومت بازپرس کرتی تھی۔ میں درّہ کے آخری حصہ میں اُترا وہاں چند خاصہ دار اپنے رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی سے مسلح کھڑے تھے۔ چونکہ چیف کمشنر مجھے بتا چکے تھے کہ اپنے کارتوس اور رائفل خود بناتے ہیں۔ میں نے ایک خاصہ دار کے سینہ کی پیٹی پر کارتوس کو چھو کر دیکھا۔ اسی کے ساتھ میری نظر چیف کمشنر کے چہرے پر پڑی تو میں نے کچھ پریشانی کے آثار پائے میں کچھ نہ سمجھا۔ لیکن واپسی پر میں نے دریافت کیا تو چیف کمشنر نے کہا کی چند سال قبل کسی انگریز افسر نے اسی طرح کسی خاصہ دار کی رائفل یا کارتوس چھو کر دیکھے۔ خاصہ دار نے چند قدم ہٹ کر افسر کو اپنے رائفل کا نشانہ بنا دیا۔ میں اُسی شب وہاں سے روانہ ہو کر کچھ دیر لاہور سر سکندر مرحوم کے پاس ٹھہرتا ہوا ۲۴؍ کو دہلی پہنچا۔

حضور نظام:

انہی دنوں حضور نظام حیدر آباد سے دہلی آئے تھے۔ ان کے ساتھ دونوں ترک شہزادیاں پرنسس دُرِ شاہوار اور پرنسس نیلوفر بھی تھیں۔ ولی عہد پرنس اعظم جاہ کی شاہزادی دُرِ شاہوار سے اور صاحبزادہ معظم جاہ کی شادی شہزادی نیلوفر سے ہوئی تھی۔ ان شہزادیوں کی حُسن و خوبی کا دہلی کی سوسائٹی میں بڑا شہرہ تھا۔ لارڈ ولنگڈن نے ایک ''ایٹ ہوم'' بڑے پیمانے پر کیا۔ ڈنر کے بعد یہ جلسہ تھا۔ مجھے اس موقع پر پہلی بار شہزادی درشہوار سے شرف تعارف حاصل ہوا۔ شہزادی صاحبہ نے مجھ سے کہا کہ وہ اس زمانہ میں ایک فرنچ ناول کا ترجمہ کر رہی تھیں۔ یا فرنچ زبان میں ترجمہ کر رہی تھیں دہلی کے حلقوں میں اس رشتۂ عروسی کو حیدر آباد کے واسطے فالِ نیک تصور کیا گیا۔ شہزادی دُرِ شہوار آخری بادشاہ ٹرکی سلطان عبدالحمید خاں کی بیٹی ہیں۔ اور دوسری شاہزادی شاید سلطان کی بھتیجی ہیں۔ حضور نظام سے بھی ملاقات ہوئی۔

یوپی کو واپسی:

اب سر فضل حسین کی واپسی کا زمانہ قریب تھا۔ میں ۲۸ر فروری کی شام کو دہلی سے چل کر لکھنؤ پہنچا۔

تنخواہ میں کمی:

انگلستان میں ایک روز میرے ذہن میں یکا یک یہ خیال پیدا ہوا کہ برطانیہ کے وزیر اعظم کی تنخواہ پانچ ہزار پونڈ سالانہ ہوتی ہے۔ میری تنخواہ بحیثیت ہوم منسٹر کے پینسٹھ ہزار روپیہ سالانہ تھی جو وزیر اعظم کی تنخواہ سے کچھ ہی کم تھی۔ کام اور ذمہ داری کا مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہے میرے کام کو وزیر اعظم برطانیہ کے کام اور ذمہ داریوں سے کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی تھی۔ یہاں واپس آیا تو دیکھا کہ تمام ملک کی اقتصادی حالت خراب تھی اور یوپی کا حال خاص طور پر ابتر تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اس موقع پر اگر میں اپنی تنخواہ میں خود کمی کر دوں تو ممکن ہے دوسرے بھی اس کی پیروی کریں۔ اور اس طرح صوبہ کی مالی حالت کو فائدہ پہنچے۔ مگر یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ میں نے اپنی تنخواہ بجائے پینسٹھ ہزار سالانہ اڑتالیس ہزار سالانہ رکھی اور محکمہ فنانس کو مطلع کر دیا۔

مجھے یاد ہے کہ اس تخفیف کرنے سے کچھ قلبی آرام محسوس ہوا اور وہ خلش جو وزیر اعظم برطانیہ کی تنخواہ اور اپنی تنخواہ کے تقابل سے پیدا ہوئی تھی جاتی رہی۔

وزراء اور دوسرے ذمہ دار ملازمین کی تنخواہوں کے متعلق اکثر حضرات اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ بعض لوگ کبھی جمہوریت کبھی آزادی، کبھی محبت ملک وقوم کے نام سے اس پر زور دیتے ہیں کم کی جائیں میرے خیال میں یہ مسائل مالی ہیں۔ اور مالی ہی نظر سے انہیں دیکھنا چاہئے۔ اقتصادی معاملات کو اقتصادی نظر سے دیکھئے۔ اور نتیجہ نکالئے پھر اس نتیجہ کو سیاسی روشنی میں پرکھئے اور چونکہ ووٹوں کو حاصل کرنا بھی ایک سیاسی جماعت کی اہم ضرورت ہے اس لئے ضرورت ہو تو اس میں مناسب ترمیم کر لیجئے۔ لیکن اقتصادی معاملات کو سیاست کا بازیچۂ اطفال بنانے کے میں سخت خلاف ہوں۔

ہر ملازم کو اس قدر تنخواہ ضرور ملنی چاہئے کہ وہ اپنا اور اپنے متعلقین کے کھانے

کپڑے تعلیم اور علاج معالجہ کے اخراجات برداشت کر سکے۔ اس عام اصول کے ساتھ اس کا بھی خیال ضروری ہے کہ جس حیثیت اور پوزیشن کی ملازمت ہے اس معیار زندگی کو وہ قائم رکھ سکے۔ ذمہ دارا ہم خدمات کے لئے ہمیں ملک کے بہترین افراد درکار ہوتے ہیں۔ اگر تنخواہ کم ہوگی تو ایک غریب لیکن ہر طرح موزوں شخص کی خدمات سے ہم مستفید نہ ہوسکیں گے۔ وہ انکار کرے گا یا پھر ایسے میدان میں قدم رکھے گا۔ جہاں بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔ وزراء کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ انہیں ایک خاص معیار زندگی رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے ان کی تنخواہوں کو مہمل حد تک گھٹانا کوئی معنی نہیں رکھتا یہ سیاسی بازی گری ہے۔ صوبوں کے وزراء کی تنخواہ تین ہزار اور مرکزی حکومت میں چار یا ڑھے چار ہزار مناسب ہے۔

میں مناسب تنخواہ کی موافقت میں ہوں۔ پھر دوسری رعایتیں نہ ہونی چاہئیں اصولاً درست نہیں۔ ان رعایتوں کو ایک طرف روا رکھنا اور دوسری طرف تنخواہ کو کم دکھانا بیتے بازی ہے۔ پر اس میں یہ خرابی ہے کہ ایسا طریقہ کار کفایت شعاری کے بجائے فضول خرچی کا محرک ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب جتنی بجلی خرچ کرتے ہیں۔ اگر اس کا ماہانہ بل وہ خود ادا کرتے ہیں تو وہ کوشش کریں گے کہ گھر میں کم از کم بجلی صرف ہو۔ لیکن جن کو مفت بجلی دی گئی ہو وہ ہر شب چراغاں کریں یا شب و روز پنکھے چلتے رہیں تو کیا مضائقہ۔

اسی طرح اگر پیٹرول مفت ہے جن صاحب کو یہ حق حاصل ہے ان کا موٹر بھانڈوں کی پالکی بن جائے گا تھوڑی تھوڑی ضرورتوں کے واسطے موٹر دوڑایا جائے گا۔ لیکن پیٹرول کے دام انہیں خود ادا کرنے پڑیں تو پھر پیٹرول کا ماہانہ بل خود کفایت شعاری سکھانے کے واسطے کافی ہے۔

اس قسم کی رعایت سوائے پریسیڈنٹ اور گورنر کے اور کسی کے لئے نہیں ہونی چاہئیں۔

۲۹ فروری کو فنانس ممبر نے کونسل میں اعلان کیا کہ میں نے تنخواہ پانچ ہزار تین سو تیس کے بجائے چار ہزار روپیہ لینا طے کیا ہے۔ فنانس ممبر نے مناسب الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا۔

دہلی سے واپس ہوتے ہوئے حضور نظام لکھنؤ تشریف لائے۔ اسپیشل ہی میں قیام رہا۔ ترکی شہزادیاں تو ہمراہ نہ تھیں باقی صاحبزاگان اور صاحبزادیاں لکھنؤ تشریف لائیں۔ نواب زین یار جنگ ہمراہ تھے۔ نواب صاحب حضور نظام کے خاص مقربین میں سے ہیں۔ یہ ایک انجینئر کی حیثیت سے ملازم ہوئے تھے۔ محلات خاص کی ڈویژن میں تبادلہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر ان کی خدمات نظام کو اتنی پسند آئیں کہ اپنے سرکاری فرائض کے ساتھ حکمران کے پرسنل اسٹاف میں کام کرنے لگے۔ یہی ان کی ترقی کا پہلا زینہ تھا۔ ان کے متعلق مفصل تو شاید آئندہ کہنے کا موقع آئے۔ یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ یہ بڑے عقیل، ذہین اور معاملہ فہم شخص ہیں اپنے حاکم کے بڑے مزاج داں ہیں۔ زمانہ شناسی ان کا خاص جوہر ہے۔

میں نے صغیر احمد عباسی صاحب کو ان کے پاس بھیجا کہ میری طرف سے نواب صاحب نظام سے ایک ایٹ ہوم کی اجازت لیں۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے ڈنر کی دعوت قبول فرمائی۔ میں نے ایٹ ہوم کی خواہش اس وجہ سے کی تھی کہ ڈنر میں ظاہر ہے، اتنے مہمان نہیں بلائے جا سکتے۔ حضور نظام کا ڈنر مہاراجہ جہانگیر آباد سر اعجاز رسول مرحوم اور راجہ سعادت علی خاں تعلقدار نان پارہ کے ہاں پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ تیسرا میرے ہاں۔ اعلیٰ حضرت نے اپنی تقریر میں میرے اوپر کرم خاص کا اظہار فرمایا ''بھائی'' کے لفظ سے میرا ذکر فرمایا۔

شکار

اسی سال سید اعجاز علی صاحب نے جو بجنور میں کلکٹر تھے سر جگدیش پرشاد کو شکار کی دعوت دی سر جگدیش پرشاد نے مجھے مدعو کیا اور دو روز کے واسطے میں بھی شریک ہوا۔

گو مجھے شکار کا شوق بچپن سے ہی ہے۔ میرا سارا خاندان شکار کا شوقین ہے۔ دادا صاحب غفران مآب باوجود پیرانہ سالی کے میری یاد میں گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کو جایا کرتے تھے۔ لیکن شیر کے شکار کا موقع اس سے قبل نہیں ملا تھا۔

شکار کے پرانے طریقے ختم ہوتے جا رہے ہیں قسم قسم کے آلات کے ایجاد معاشی زبوں حالی، معاشرہ کے نئے طور طریقے اور بعض امور اس کا باعث ہیں۔ مجھے

یاد ہے ہرن کے شکار کی غرض سے چیتے پالے جاتے تھے۔ ہماری ریاست میں تو کوئی چیتا میرے زمانے میں نہیں رہا تھا۔لیکن راجہ صاحب مرسان کے چیتے میں نے دیکھے تھے۔ان کی آنکھوں پر چمڑے کی ٹوپی ہوتی تھی۔تانگوں پر بیٹھ کر شکار کو جاتے تھے۔یہ بہت خوبصورت جانور ہوتا ہے۔نہایت سڈول جسم دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ جانور کس لیے پیدا کیا گیا۔ مجھے چیتے کے شکار دیکھنے کو موقع نہیں ہوا۔

مجھے کتوں کے شکار کا بھی شوق تھا۔میرے پاس تازی اور گرے ہاؤنڈ کتے تھے۔اُس زمانہ میں کتوں کے شکار کا شوق عام تھا خرگوش اور کتے کی رفتار کا اندازہ امتحان کے سوالات سے بھی ہوتا ہے جس سے ہر شخص کو طالب علمی میں سابقہ رہا ہے لیکن سب سے زیادہ پر لطف لومڑی کا شکار ہوتا ہے بعض دفعہ تیس تیس اور چالیس منٹ کی کوشش کے بعد بھی لومڑی ہاتھ نہ آئی اور کتے تھک کر کھڑے ہو گئے۔میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر اس دوڑ میں شرکت کی ہے۔ہوتا یہ ہے کہ لومڑی کی دم قد کے لحاظ سے طویل اور بالوں کی وجہ سے تقریباً اس کے جسم کے برابر موٹی معلوم ہوتی ہے۔ ناتجربہ کار کتا اس بالوں کے گچھے کو پکڑنا چاہتا ہے۔لومڑی اگر اپنی دُم کو داہنی جانب کو جھٹکا دیگی تو کتے کا رخ اس طرف ہو جاتا ہے اور یہ بہت تیزی سے سمت مخالف میں مڑ جاتی ہے۔اسی طرح کتے اور لومڑی کے درمیان پھر فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔یہی بار بار ہوتا رہتا ہے۔

مجھے اپنی عمر میں ایک کتے اور ایک گھوڑے سے کچھ ایسا سابقہ ہوا۔جو مجھے تمام عمر یاد رہے گا۔اس کتے کا نام موتی تھا۔اسے میرے ساتھ بہت تعلق تھا عجیب بات یہ تھی کہ اس میں رشک یا حسد کے جذبات تھے جب شکار میں میرے ساتھ اور کتے ہوتے تو موتی صرف میرے ساتھ رہتا مگر شکار نہیں کھیلتا تھا لیکن جب تنہا میرے ساتھ ہوتا تو خوب شکار کھیلتا تھا۔ بڑا طاقتور اور تیز دوڑنے والا کتا تھا۔دوبارہ برسات کے زمانے میں اس نے ہرن کے پٹھے بھی مارے۔یہ بہت اچھا محافظ تھا۔جب تک میں جاگتا رہتا یہ پلنگ کے نیچے آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔لیکن میرے سونے کے بعد پلنگ کے نزدیک میرے ملازم تک نہیں جا سکتے تھے۔

میں نے جس گھوڑے کا ذکر کیا اس کا نام ''منصور'' تھا۔ یہ عرب تھا۔ بڑا خوبصورت مجھ سے بہت مانوس تھا چھتاری میں اصطبل بالکل ہماری گڈھی کے نیچے ہے۔ جب کبھی اسے فصیل سے کھڑے ہو کر آواز دیتا تو یہ جواب میں بولتا۔ تیتر کے شکار میں اکثر یہ ہوتا کہ میں اس پر سے اتر کر بندوق لے کر چل دیتا۔ مگر یہ بغیر سائیس کے میرے ساتھ پھرتا رہتا۔ عرب گھوڑے کبھی کبھی جب زیادہ عرصہ سے ورزش نہ ہوئی ہو تو پاشتو بھاگتے ہوئے طرارہ لیتے ہیں۔ یہ بھی اکثر طرارہ لیتا تھا۔ لیکن جب کبھی مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میں گر جاؤں گا تو میں نے اس کی گردن پر ہاتھ مار کر بس کہا اور یہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ اور جب تک میں اچھی طرح سنبھل کر پھر اشارہ نہ کروں اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا۔ مجھے اس سے بڑی الفت تھی۔ میں اسے اکثر موسم گرما میں نینی تال لے جاتا تھا اور گھر پر بھی اس کے گھن کو ٹھنڈا رکھنے کا اہتمام ہوتا تھا۔

مجھے شکاری پرندوں کی مدد سے شکار کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ چھتاری میں اُس زمانے میں دو باز خانے تھے ایک باز خانے کے بازدار محمود خاں مرحوم تھے اور دوسرے کے علی احمد مرحوم۔

ان شکاری جانوروں کی یوں تو بہت اقسام ہیں لیکن دو خاص بڑی قسمیں ہیں۔ (۱) ''سیاہ چشم'' اور (۲) ''گلال چشم''

سیاہ چشم وہ ہیں جن کی تمام آنکھ سیاہ ہوتی ہے۔ ان میں بحری۔ شاہین۔ ترمتی لگڑ اور بہت سی دوسری اقسام ہیں لیکن بحری ان میں سب سے زیادہ طاقتور، بہادر اور تیز پرواز ہوتی ہے۔ علی احمد مرحوم سیاہ چشم جانوروں کے سکھانے اور تربیت کا بڑا ماہر تھا۔ اس کی بحری اور شاہین بہت اچھی ہوتی تھیں علی احمد کی بحری نے ایک بار میرے سامنے علی گڑھ میں ''چندنوکا'' مارا یہ کسی طرح کلنگ سے کم نہیں ہوتا اور اس کی چونچ تو مالوما آلہ دھار دار کے تحت آسکتی ہے۔ مجھے بحری، بحری بچہ (بحری کانز) اور شاہین کا شکار بہت پسند تھا۔ بحری کا عموماً بزہ اور کبوتر شکار ہوتا ہے۔ کبوتر بہت بچاتا ہے۔ بحری بچہ اور شاہین سے ٹیڑھی کا شکار بہت لطف ہوتا ہے۔ ٹیڑھی بہت بچاتی ہے۔ بعض اوقات میلوں بچاتی چلی جاتی ہے جب شاہین اسے پکڑنا چاہتی ہے۔ یہ ہوا

میں پتے کی طرح پلٹ جاتی ہے اور شاہین رفتار کے زور میں آٹھ دس گز ہوا میں اوپر کی جانب نکل جاتی ہے۔ پھر اوپر سے سمیٹ کر حملہ آور ہوتی ہے اور ٹیڑھی پھر اس طرح بچاتی ہے۔ ترمتی کا نیل کنٹھ کے شکار میں لطف ہوتا ہے۔ نیل کنٹھ بھی غضب کا بچاتا ہے۔ سیاہ چشم جانوروں کا شکار بغیر گھوڑے کی سواری کے بے لطف ہے۔ میلوں گھوڑا دوڑانا پڑتا ہے اور کبھی کبھی حادثے بھی ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ سوار کی نظریں تو آسمان کی طرف ہوتی ہیں اور گھوڑا دوڑتا ہوتا ہے۔

دوسرا باز خانہ محمود خاں مرحوم سے تعلق تھا۔ یہ ''گلال چشم'' شکاری جانوروں کو سکھانے کے بڑے استاد تھے۔ گلال چشم جانوروں میں باز سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ جرا اس کا نر ہوتا ہے۔ جملہ شکاری پرندوں میں مادین نر سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ 'جرا' باز سے بہت چھوٹا اور کمزور ہوتا ہے۔ گلال چشم جانوروں میں ہمارے ہاں باز تو ایک سے زیادہ یاد نہیں شاید باز خانہ کی شان کے لیے ایک باز رہتا تھا لیکن جرے تین چار ضرور ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ''باشے'' بھی بڑے شوق سے پالے جاتے تھے۔ باز کا شکار مور، خرگوش، چیل، کبوت، قاز، سرخاب، یہ سب جانور ہیں، جرے کا شکار تیتر، مرغابی، کوا، بگلا ہیں، گلال چشم جانور ہاتھ سے اترتے ہیں تیزی سے جھپٹتے ہیں لیکن اگر جانور ہاتھ نہ آیا تو بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی جھپٹ سو دو سو گز بلا کی تیزی ہوتی ہے۔ البتہ تیتر اور مور کا یہ پیچھا کرتے ہیں۔ انھیں اس کا احساس ہے کہ یہ جانور دور تک نہیں جا سکتے۔ ان کے شکار میں گھوڑا ضروری نہیں۔ ان جانوروں میں باشہ سب سے زیادہ خوبصورت۔ نازک اور تیز رفتار ہوتا ہے، تیتر بٹیر بہت لطف سے مارتا ہے۔ یہ تمام جانور پہاڑی ہیں۔ ''شکرا'' غریب ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ اس کی پرواز زیادہ تیز نہیں ہوتی اس لئے اسے مٹھی میں بھر کر قریب سے جانور کیطرف پھینکتے ہیں۔ یہ بہت چھوٹا لیکن بہت بہادر جانور ہے اپنے قد سے کہیں بڑے جانوروں کو پکڑ لیتا ہے۔

مجھے بندوق سے شکار کا بھی شوق ہے۔ کسی زمانے میں خاصی بندوق چلا لیتا تھا۔ اب تو شوق ہی شوق رہ گیا ہے۔ مجھے پرندے کے شکار کا زیادہ شوق ہے۔ میں

خیال کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں جتنے پرند ہیں ان میں مرغابی کا مارنا بشرطیکہ تنہا آرہی ہو مشکل ہے۔ اگر کارتوس گن کر فی صدی اوسط نکالا جائے تو تیتر بٹیر یہاں تک کہ اسنائپ کے مقابلہ میں بھی مرغابی کا اوسط سب سے کم ہوتا ہے تیتر کا مارنا سب سے آسان ہے بشرطیکہ بندوق جھاڑنے والوں کے ساتھ ہو اور یہ اس وقت ممکن ہے۔ جب جنگل کی جھاڑیاں یا کھیت انسانی قد سے زیادہ بلند نہ ہوں۔ لیکن اگر بندوقیں آگے لگا دی جائیں اور جھاڑنے والے تیتروں کو اڑائیں تب نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔ بٹیر کا مارنا بھی چنداں دشوار نہیں ہوتا۔ میں ساٹھ ستر فی صدی مار لیتا تھا۔ ایک بار ۳۳ء میں دہرہ دون کے کھیتوں میں بٹیر کا شکار رہا۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ دستور یہ تھا کہ جب گورنر لکھنؤ سے نینی تال کا قصد کرتے تو کم وبیش ایک ہفتہ کے واسطے دہرہ دون چلے جاتے تاکہ ملازمین کو نینی تال کے گورنمنٹ ہاؤس میں سامان لگانے اور آسائش کا انتظام کرنے کا وقت ملے۔ اسی سلسلے میں دہرہ دون قیام رہتا۔ میں نے بٹیر کا شکار اس سے بہتر بغیر "بلائے" کے کہیں نہیں دیکھا۔ راحت فرحت بھی میرے ساتھ تھے۔ گیہوں کے کھیتوں میں بٹیر تھے مارنا آسان تھا۔ جہاں بٹیر اڑ کر گیہوں کی بالوں سے نکلا بندوق چلی اور وہیں گر گیا۔ اس شکار میں پہلے سولہ فائروں میں سولہ بٹیر گرے۔ ایک بھی خالی نہیں گیا۔ یہ میری عمر میں ریکارڈ تھا۔ لیکن اسی میں راحت کی اکثر بندوقیں خالی جارہی تھیں۔ ان کی بندوق وزنی تھی۔ میں نے اپنی بندوق دیدی اور خود ان کی بندوق لے لی، میرا اوسط تین فائروں میں دو بٹیریں رہ گیا۔ دوران شکار میں بندوق نہیں بدلنی چاہئے۔ یا پھر دونوں بندوقیں جوڑ اپنائی گئی ہوں، اس شام کا ہمارا کل شکار ۹۴ بٹیر تھے۔

خاں صاحب جعفر خاں میرے واسطے "بلارے" بٹیر پالا کرتے تھے۔ بیس بٹیروں کی ایک جھڑ کہلاتی ہے۔ یہ سب نر بٹیر ہوتے ہیں۔ تنہا ایک بٹیر ایک پنجرے میں ہوتا ہے شب کے وقت انھیں کھیت میں لگایا جاتا ہے۔ انھیں طاقتور غذائیں مثل بادام وغیرہ دی جاتی ہیں۔ شب کی ٹھنڈی ہوا میں یہ بولنا شروع کرتے ہیں۔ چال کے بٹیر شب کے وقت اس طرف سے گذر رہے ہوں ان کی آواز سن کر اس کھیت میں جوق در

جوق اتر آتے ہیں صبح کو جال سے پکڑ لیا جاتا ہے یا بندوق سے شکار ہوتا ہے۔ میں اکثر دوستوں کو بلا کر شکار کھیلا کرتا تھا۔ بندوق کا شکار چار بجے شام سے شروع ہوتا اور غروب آفتاب تک سو ڈیڑھ سو بٹیر شکار ہو جاتے تھے۔ یہ شکار بہت پر لطف ہوتا ہے۔

اسنائپ (ایک قسم کا چہا) کا مارنا تیتر بٹیر سے مشکل ہے۔ اول تو اس کی پرواز ہوتی ہے۔ دوسرے یہ بہت کم سیدھا اڑتا ہے۔ نہایت تیزی سے مڑتا تڑتا ہوا اٹھتا ہے۔ اس لیے اکثر فائر خالی جاتے ہیں۔ پھر ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ شکاری خود پانی میں چلتا ہوتا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت اسنائپ اٹھا شکاری کا پاؤں کیچ کی وجہ سے پھسلا۔ لغزش پا کی وجہ سے بندوق بچ جاتی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یکا یک کسی طرف اسنائپ اٹھا۔ جس کی آواز پر شکاری نے پلٹنا چاہا مگر کیچ اور پانی سے پاؤں پھسلا یا زیر آب گھاس میں الجھا اور شکاری کا توازن جسمانی بگڑ گیا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ نہ ہو وہ کم ہے شکاری خود پٹخنی کھا جاتا ہے۔ اسنائپ کا مارنا نو آموز شکاریوں کو بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ بندوق تیزی سے چلانی پڑتی ہے۔ میرا اوسط اسنائپ کے شکار میں تقریباً پچاس فی صدی ہے۔ صرف ایک بار ''پلاکستری'' کے جھیل پر میں نے تیرہ فائر کئے اور گیارہ اسنائپ مارے۔ لیکن اس کے اسباب خاص تھے۔ فروری کا مہینہ تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ بڑی بڑی خشک گھاس میں اسنائپ سایہ کی وجہ سے بیٹھا تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے زمین خشک تھی۔ پھسلنے کا اندیشہ نہ تھا۔ دھوپ کی تیزی سے اسنائپ بالکل ہی قریب پہنچ جانے پر اٹھتا تھا۔ ان وجوہ سے یہ اوسط رہا۔

مرغابی کا شکار اس طرح تو آسان ہے کہ غول پر بندوق چلی اور تین چار اتفاق سے گر گئیں۔ لیکن تنہا مرغابی کا مارنا آسان نہیں ہے۔ مرغابی کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان سب کی رفتار یکساں نہیں۔ مثلاً ٹیل یا سیخ پر بہت تیز پرواز ہیں ''نیل سر'' ''لال سر'' کی پرواز اتنی تیز نہیں ہوتی۔ پہلی دشواری یہ ہوتی ہے کہ ہر مرغابی کی رفتار سے بندوق کو کچھ آگے چلانا پڑتا ہے۔ اس میں اکثر غلطی ہوتی ہے۔ دوسرے مرغابی طاقتور پرند ہے اگر کاری چوٹ نہیں لگی تو باوجود زخمی ہونے کے اڑی چلی جاتی ہے

تیسرے اکثر مرغابی فاصلہ سے گزرتی ہے اور جب تک چھرہ اس تک پہنچے وہ اپنی رفتار کی وجہ سے آگے نکل چکی ہوتی ہے۔ اکثر شکاریوں کی یہ رائے ہے جس سے مجھے اتفاق ہے کہ اگر مرغابی چالیس گز کے فاصلہ سے گزر رہی ہے اور اس کی رفتار چالیس میل فی گھنٹہ ہے تو ایک فٹ بندوق آگے چلانی چاہئے۔ بعض کا خیال ہے کہ مرغابی کے ساتھ بندوق بھی حرکت میں رہے تو آسانی ہوتی ہے یعنی بندوق روک کر فائر نہ کرے۔ مرغابی کے ساتھ ہاتھ گھومتا چلا جائے۔ بہر حال میرا مرغابی کا اوسط ۳۵ فی صدی کے لگ بھگ رہتا ہے۔ چکور کے شکار کا ۵۰ء میں مجھے پہلا موقع ملا۔

ہندوستانی ہونے کے باوجود میں اب تک ایشیا کے خوبصورت ترین ملک خطہ کشمیر نہیں گیا تھا۔ ایک روز اپنے مخلص کرم فرما مسٹر وشنو سہائے آئی۔سی۔ایس سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے گھر کھانے پر تھا۔ جہاں شیخ عبداللہ صاحب وزیر اعظم کشمیر بھی تھے۔ وزیر اعظم صاحب نے اپنے کرم سے دعوت دی۔ وشنو سہائے صاحب نے برادرانہ محبت سے ترغیب دی۔ یوں کشمیر جانا ہوا۔ وہاں میری خواہش پر شیخ صاحب نے چکور کے شکار کا انتظام فرمایا۔ اس طرح یہ آرزو پوری ہوئی۔

چکور کے شکار کے واسطے بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ پہاڑ کے جنگل کو جھاڑتے ہیں شکاری پہلے سے چکور کی گذر گاہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چکور کے اڑتے ہی جھاڑنے والے سیٹی زور سے بجاتے ہیں تاکہ شکاری تیار ہو جائیں۔ چنانچہ میں بیٹھا تھا کہ سیٹی کی آواز آئی اور کچھ سکنڈ کے بعد ایک چکور اتنی تیزی سے نکل گیا کہ مجھے بندوق اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ چلانے تو در کنار۔ پھر اس کے بعد اور چکور آئے لیکن کئی فائر برابر خالی گئے۔ آخر کار ایک میں نے مارا۔ اس کے بعد دوسرے پہاڑ پر پانچ مارے اور تیسرے پہاڑ کے ہانکے پر دس مارے۔ مجھے اس سے اندازہ ہوا کہ میری آنکھ اور ہاتھ چکور کی پرواز کا عادی ہوتا جاتا تھا۔

نئے شکاری کو چکور کے شکار میں پہلی دقت تو یہ ہوتی ہے کہ ہماری آنکھ اس کی عادی ہے کہ اڑتے جانور کو افق کے پس منظر میں دیکھیں۔ چونکہ پس منظر میں سوائے آسمان کے کچھ نہیں ہوتا تو جانور پرواز کی حالت میں صاف نظر آتا ہے۔ پہاڑوں میں

چکور کو ہسار ے سے ملا ہوا اڑتا ہے اور خود بڑی حد تک پتھروں کے ہم رنگ ہوتا ہے۔
لہٰذا جب تک قریب ہی نہ آجائے نظر نہیں آتا۔ دوسرے چونکہ اس کا رخ پہاڑ سے
اکثر نیچے کی طرف ہوتا ہے رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ شکار بہت لطف ہے۔

مجھے بڑے جانوروں کے شکار کا کچھ زیادہ شوق نہیں۔ رائفل نوعمری کے
زمانے میں چلانے کا شوق تھا۔ میں بھاگتے جانوروں پر نشانہ لگالیتا تھا۔ بہت سے
کارتوس ضائع کرنے کے بعد میں نے دو بار اڑتے کبوتر بھی گولی سے مارے، مگر یہ
نشانہ نہیں۔ صرف اتفاق ہے۔ ہرن کا شکار تو ایک واقعہ کی وجہ سے ترک ہی ہوگیا۔
ایک بار میں مرغابی کے شکار کی غرض سے ''پلاکستری'' کے جھیل کو جارہا تھا۔ اس زمانہ
میں موٹروں کا نہ اتنا رواج تھا اور نہ اس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں تک پختہ
سڑک تھی میں گاڑی جوڑی میں گیا اور کچے راستہ میں بیلوں کے تانگہ میں جارہا تھا۔
اس راستہ میں ایک زبردست میدان پڑتا ہے۔ تین ہرنیاں اور ایک کالا نر ہمارے
تانگہ کے سامنے سے گذرے میں نے اتر کر زمین پر بیٹھ کر گولی چلائی۔ کالا ہرن گرا،
میں رائفل ہاتھ میں لئے ہوئے اس کی طرف بھاگا، جب قریب پہنچا تو ہرن نے
گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں کیا کہوں اُن خاموش آنکھوں نے مجھ سے کیا
کہا، ان میں مجھے خوف سے زیادہ ملامت محسوس ہوئی۔ اسی کے ساتھ میرا ذہن کلام
پاک کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا (بایِّ ذنب قتلت) مجھے کس گناہ پر تم نے قتل کیا
ہے۔ میں بے حد نادم تھا۔ تلافی ناممکن تھی۔ ہرن کے چوٹ کاری لگی تھی اس کا بچنا
محال تھا۔ میں نے اپنا رخ تانگہ کی طرف کیا۔ مگر دل میں عہد واثق کرلیا کہ اب کبھی
ہرن پر بندوق نہ چلاؤں گا۔

میں نے بجنور کے جس شکار کا ذکر شروع کیا تھا وہ پہلا شکار تھا۔ شیروں کی
گذرگاہوں پر کڑے باندھے گئے تھے مگر صبح کو معلوم ہوا کہ کوئی کڑہ شیر نے نہیں مارا۔
لینچ کے بعد ہم لوگ ہاتھیوں پر سوار ہوکر جنگل میں گھومنے نکلے۔ عصر کے وقت تک
پھرتے رہے۔ کوئی جانور نظر نہ آیا۔ واپسی کے وقت برابر کے جنگل سے چیتل کے
بولنے کی آواز آئی۔ چیتل جب شیر یا گلدار کا دیکھتی ہے تو جنگل کے جانوروں کو متنبہ

کرنے کے واسطے ایک خاص آواز دیتی ہے۔اسی طرح سامبر۔کاکڑ اور بندر بھی شیر یا گلدار کو دیکھ کر آواز دیتے ہیں۔ہم نے ہاتھیوں کو اس طرف بڑھایا، وہاں دیکھا کہ ایک گلدار سور کے چند بچوں کی تاک میں گھوم رہا ہے۔لیکن سور اسے حملہ کا موقع نہیں دیتے تھے چیتل اسے دیکھ کر بول رہی تھیں ہمارے آنے پر گلدار برابر کے گھاس کے جنگل میں چلا گیا۔ہم نے اپنے ہاتھی اسی طرف بڑھا دیئے۔آفتاب غروب ہو چکا تھا۔میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھی سے کوئی اسی گز پر گلدار جا رہا ہے۔میں نے گولی چلائی وہ تیزی سے بھاگا۔میرے ہاتھی پر میرے ساتھ عالمگیر خاں صاحب بیٹھے تھے۔ان کی گولی چلی۔میرا خیال ہے کہ ان کی گولی لگی اور چند گز دوڑ کر گر گیا۔لیکن میرے میزبان سید اعجاز علی صاحب اور سر جگدیش پرشاد صاحب کی عنایت نے اسے میرے ہی نامۂ اعمال میں لکھا دیا۔

سید اعجاز علی:

سید اعجاز علی صاحب پروونشل سروس کے ایک ممتاز رکن تھے۔ان کی انتظامی قابلیت۔دیانت سوجھ بوجھ گورنمنٹ میں مسلمہ تھی۔جہاں رہے ہردلعزیز رہے۔کلکٹری سے پنشن پائی۔اس کے بعد ریاست خیر پور کے دیوان ہو کر چلے گئے۔بڑی خوبیوں کی ذات ہے۔ان میں پرانی اور نئی تہذیب کی بہترین صفات موجود ہیں۔

دوسرے روز صبح کو پھر یہی اطلاع ملی کہ شیر نے کوئی کڑا نہیں مارا۔کچھ مایوسی ہوئی لیکن گھومنے کو صبح ہی چل دیے۔راستے میں شیر کے پاؤں کے تازہ نشانات ملے جو ایک گھاس کے جنگل کی طرف چلے گئے تھے۔ہاتھیوں کا رخ اسی جانب کر دیا گیا۔کچھ ہی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھی سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر ایک شیر جا رہا ہے۔وہ رکا اور مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگا، میں نے گولی چلائی اور اس کے ایک سکینڈ کے بعد عالمگیر خاں کی گولی چلی۔مجھے یقین ہے کہ میری گولی نے خطا کی اس وجہ سے کہ شیر نے مطلق حرکت نہیں کی۔لیکن جب عالمگیر خاں کی گولی چلی تو اس کے اعصاب میں ایک کھچاوٹ سی محسوس ہوئی اور پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی۔مگر بھاگ نہ سکا۔پھر پلٹا اور ہاتھی کی طرف حملہ کی کوشش کی۔میں نے گولی چلائی یہ لگی۔

ایک غصہ کی آواز نکالی اور گر گیا۔ یہ ایک نر شیر تھا۔ اصولاً یہ عالمگیر خاں کا تھا مگر رہا میرے ہی حصہ میں۔

اس کے بعد میں بارہا ایسے شکاروں میں شریک ہوا۔ میرا سب سے بڑا شیر وہ تھا جو ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کے ساتھ میں نے بھوپال میں مارا تھا۔

ایک بار دہلی میں ''سر جرمی ریز مین'' کے گھر میں لنچ پر مدعو تھا، لیڈی ریز مین کہنے لگیں کہ انھوں نے کبھی جنگل میں شیر کو نہیں دیکھا۔ اس پر سر جرمی نے بھی کہا کہ ہم اتنے عرصے ہندوستان میں رہے لیکن اس کی حسرت ہی رہی کہ جنگل کے بادشاہ کو نیستان میں ہی گھومتے دیکھتے۔ یہ حکومت ہند کے فنانس ممبر تھے اور عنقریب پنشن پر سبکدوش ہونے والے تھے۔ میں نے کہا کہ اس دسمبر میں دو چار روز کو شکار کو آیئے اگر تقدیر میں ہے تو یہ آرزو پوری ہو جائے گی۔ اس پر ان کا نو برس کا لڑکا کہنے لگا کہ میرا دل بھی چاہتا ہے میں بھی شیر کو دیکھوں گا۔ لیڈی ریز مین بولیں کہ میں سنیما کا کیمرہ لے چلوں۔ شیر کی تصویریں لوں گی۔ میں اخلاقاً ہاں ہاں کہتا رہا۔ مگر میرے دل میں یہ خیال تھا کہ یہ لوگ سرکس کے شیر اور شیر نیستاں کا فرق نہیں جانتے اتنا سدھا ہوا شیر جنگل میں تو ملنا آسان نہیں جو پورے خاندان کو اپنی زیارت بھی کرائے اور سنیما اسٹار بھی بنے پھر اس پر گفتگو رہی کہ کس رائفل کو استعمال کریں، میں نے کہا کہ مجھے ''۳۷۵ میگنم ہالینڈ اینڈ ہالینڈ'' کا پسند ہے۔ میں نے خواہش کی کہ وہ کسی دوست سے رائفل لے کر چاند ماری کی مشق کر لیں۔

میں نے دسمبر کے مہینہ کے واسطے ''بجرانی کا'' کا بلوک لے لیا۔ اور وہاں کے بنگلہ میں ہم لوگ پہنچے ۲۴ کی شام کی گاڑی سے سر جرمی معہ لیڈی ریز مین اور ''جون'' کے پہنچے۔ دوسرے روز بریک فاسٹ پر ہمیں اطلاع ملی کہ شیر نے ایک پڈھا مار لیا۔ لنچ کے بعد ہم لوگ ہاتھیوں پر روانہ ہوئے۔ شیر پڈھے کو اٹھا کر غیر معمولی طور پر دور لے گیا تھا۔ ہمارے شکاری اس کے نشان پر جا رہے تھے، یہ تقریباً ایک میل کھینچ کر لے گیا تھا۔ ہم نے کئی جنگل کے ٹکڑے دیکھے مگر شیر کا نشان آگے کو جا رہا تھا۔ آخر کار ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چند چیتل خطرے کی آواز میں بولتی سنائی دیں، ہمیں یقین

ہوگیا کہ شیر ضرور قریب ہی ہے۔ ہم پہاڑ پر چڑھے چیتل پہاڑی کے پیچھے بڑی بڑی گھاس کے ایک جنگل کو دیکھ کر بول رہی تھیں۔ یہ جنگل بہت مختصر تھا۔ ہم نے ہاتھی جنگل میں ڈالے۔ ایک ہاتھی پر سر جرمی اور ان کی بیوی تھیں۔ اس ہاتھی کو ہم نے پہاڑ کی جانب رکھا۔ چوں کہ شیر جب بھاگتا ہے تو ہمیشہ پہاڑ کی جانب جاتا ہے پھر اس گھاس کے دوسری طرف ایک خشک دریا کی زمین تھی اور جانور کبھی میدان کی طرف بھاگتا۔ درمیان میں میرا ہاتھی تھا۔ جس پر میں اور سر جرمی کا بچہ ''جون'' سوار تھا۔ اس کے برابر نواب بہادر عبدالسمیع خاں کا ہاتھی تھا۔ شیر میرے ہاتھی کے بالکل قریب کوئی دس گز کے فاصلہ سے اٹھا۔ میں نے گولی چلانے کی خواہش کو ضبط کیا، اس نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا، ''جون'' اسے دیکھتا رہا۔ میں نے آہستہ سے سیٹی بجا کر سر جرمی کے مہاوت کو اشارہ کیا۔ ہاتھی کو آگے بڑھائے شیر گھاس سے آہستہ آہستہ نکلا۔ سر جرمی کی گولی چلی اور شیر گر گیا۔ لیڈی ریز مین نے سینما کے کیمرہ سے شیر کے نکلنے اور گرنے کی تصویر بھی لے لی۔ یہ پورا شکار بالکل اس طرح ہوا کہ گویا پہلے سے ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ شیر نر شیر تھا اور نو فٹ دس انچ ناک سے دم تک تھا۔ شب کو بڑے لطف سے بڑے دن کا ڈنر ہوا۔

مسٹر و مسز مجید اللہ:

اس شکار میں مسٹر مجید اور ان کی بیوی بھی تھیں۔ بیگم مجید اللہ خود بھی بندوق چلاتی ہیں۔ مردوں کی طرح بہادر اور جفاکش، نہایت خوش مزاج اور خلیق اسی شکار میں ایک روز شام میں مسز مجید اللہ پیدل واپس آ رہی تھیں۔ کسی وجہ سے ہاتھی جہاں ہم نے کہا تھا نہ آ سکا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ پہلا حادثہ تو یہ پیش آیا کہ ہمیں ایک پہاڑی ندی عبور کرنی تھی۔ پانی تو اس میں ڈیڑھ دو بالشت سے زیادہ نہ تھا لیکن دسمبر کا مہینہ۔ نینی تال کی تلہٹی۔ برفانی چشموں کا پانی کیسا ہوگا۔ پل کے بجائے فقط بڑے بڑے پتھر رکھ کر چرواہوں نے راستہ بنالیا تھا۔ مسز مجید اللہ راہبر تھیں۔ پتھروں پر ہو کر چلنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے صحیح انداز نہ ہوا۔ پتھر سے پاؤں پھسلا اور میں ندی میں کھڑا تھا۔ یوں تو فقط ایک ڈیڑھ فٹ پانی تھا مگر اتنا سرد کہ تمام جسم لرز گیا۔ پاؤں سن ہو گئے۔ ندی کو عبور کر کے آگے بڑھے۔ برابر جنگل نے بولنا شروع کیا جو ہم

سے دو سوڈھائی سو گز ہو گا مگر مسز مجید اللہ اسی طرح باتیں کرتی رہیں اور ذرا بھی خوف ان پر نہ تھا۔ ہم لوگ آٹھ بجے تک کیمپ پہنچے۔

مسٹر مجید اللہ پولیس میں سپرنٹنڈنٹ ہیں بڑے اچھے افسر ہیں۔ آج کی دنیا ان کی قدر کرے یا نہ کرے لیکن اس سے ان کے اچھے اور ایماندار افسر ہونے میں فرق نہیں آتا۔ شکار کا بہت شوق ہے۔ نشانہ بہت اچھا ہے۔ ان کی بندوق قضائے مبرم ہے جس کی قضا آئی ہو اسی پر چلتی ہے۔ ان کے والد خان بہادر امیر حسن خاں صاحب مرحوم میرے بڑے اچھے دوست تھے اور جتنے روز اسمبلی کے ممبر رہے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔

اسی شکار میں یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ایک شیر دوسرے مردہ شیر کا گوشت بھی کھالیتا ہے۔ تین چار روز کے بعد پھر ایک کڑا مارا گیا۔ ہم لوگ پہنچے اور جہاں کڑا شیر نے رکھا تھا اس کے قریب مچان باندھ کر نواب عبدالسمیع خاں کو بٹھا دیا۔ شیر مغرب سے کچھ پہلے ہی آ گیا۔ ان کی گولی چلی وہیں گر گیا۔ چونکہ ان کے پاس ایک ہی ہاتھی تھا یہ شیر کو وہیں چھوڑ کر چلے آئے۔ دوسرے روز صبح کو جب شیر کو اٹھا کر لائے تو پچھلی ٹانگوں پر دو جگہ ایک دوسرے شیر کے گوشت کھانے کے نشان تھے۔ اور مردہ کڑا یہ شیر اٹھا کر لے گیا تھا۔ نیز شیر کے پاؤں کے نشانات بھی تھے۔ قیاس یہ ہے کہ شب کو جو دوسرا شیر آیا تو اول بھوک میں اس شیر کا گوشت کھایا اور پھر جب اس مردہ شیر کے نصف کھائے ہوئے کڑے پر نظر پڑی تو اسے لے کر چل دیا یہ بھی نوعمر نر شیر تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک خاص واقعہ کی یاد آ گئی۔ میجر کاربیٹ کے نام سے کوئی شکار کا شوقین ناواقف نہ ہو گا اور ان کی کتاب نے کہ جس کا نام کمایوں کے مردم خور ہے۔ جم کاربیٹ کے نام کو امریکہ تک مشہور کر دیا۔ جم کاربیٹ نینی تال میں رہتے تھے۔ ان کی نہایت معقول جائداد بنگلوں کی شکل میں نینی تال میں تھی۔ میرے تعلقات ان سے اور ان کی ہمشیر سے بہت مخلصانہ تھے۔ بڑے اچھے اور نیک طینت انسان تھے۔ خاموش منکسر مزاج شکار کی بدولت اس زمانے کے گورنروں اور ویسرایوں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے مگر اس سے کبھی نفع نہ اٹھاتے تھے۔ بڑے اچھے شکاری تھے مگر جانوروں کے تحفظ کے بھی بڑے حامی تھے۔ سوائے مردم خور شیر کے یہ عام طور پر شیر کو نہیں مارتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں ۲۷/ اکتوبر کو میں نینی تال سے شکار کو روانہ ہوا۔ ہفتہ شکار میں اسی غرض سے صرف کیا جاتا تھا کہ ملازمین لکھنؤ کے گورنمنٹ ہاؤس کو درست کرلیں۔ موہن بلاک رزرو تھا۔ جم کاربیٹ نے میرے شکار کا اہتمام کیا تھا اور میرے ساتھ تھے۔ پہلے ہی روز جب ہم شکار کے بنگلہ پر پہنچے تو جم نے کہا کہ چند باتیں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ انہوں نے کہا کہ بعض اوقات جنگل میں یکا یک شیر کا سامنا بہت قریب سے ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں یاد رکھئے کہ پلٹ کر بھاگنے کی کوشش خطرناک ہے۔ انسان شیر سے ضرور ڈرتا ہے مگر شیر بھی انسان سے کچھ کم نہیں ڈرتا۔ چنانچہ قریب سے آمنا سامنا ہو جائے تو برابر اس کی طرف دیکھتے رہنا چاہئے۔ پھر شیر کو حملہ کی ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن منہ موڑ کر بھاگنے سے اسے ہمت ہوتی ہے کہ یہ ڈر گیا اور حملہ کر بیٹھتا ہے۔ ایسی حالت میں یا تو شیر غرا کر ہٹ جائے گا اور ایسا نہ ہو تو پیچھے کو ایک ایک قدم آہستہ آہستہ ہٹنا چاہئے۔ لیکن نظر شیر پر ہی رہے۔ ایک بات یہ بھی بتائی کہ اگر شیر حملہ آور ہو تو جو چیز آپ کے پاس ہو۔ اس کی جانب پھینک دینی چاہئے۔ کوٹ، ٹوپی، چادر تو شیر کا حملہ اول اس پر ہوتا ہے اور آپ کے بچنے یا گولی چلانے کا موقع مل جاتا ہے۔

آپ بیتی مردم خور شیر کی کہانیاں بہت سناتے تھے۔ ان کا ایک یہ بھی تجربہ تھا کہ مردم خور شیر اگر کسی جنگل میں ہو تو اس کا حملہ ہمیشہ اس طرف سے ہوگا۔ جس جانب کو ہوا جا رہی ہو۔ اس کی وجہ وہ بیان کرتے تھے کہ شیر جب جنگلی جانوروں پر حملہ کرتا ہے تو ہمیشہ ہوا کے رخ کا لحاظ کرتا ہے۔ ورنہ جہاں جانوروں نے شیر کی بو سونگھی اور بھاگ گئے وہ ہمیشہ جس طرف سے ہوا آ رہی ہو اس کی مخالف سمت سے حملہ کرے گا۔ شیر کو اس کا احساس نہیں ہے کہ حضرت انسان اپنی مصنوعی اور غیر فطری طرز زندگی کی بدولت سونگھنے کی اس طاقت کو کھو چکا ہے جو دوسرے جنگل جانوروں میں اب تک موجود ہے۔ اس واسطے وہ انسان پر بھی حملہ کرتے وقت ہوا کے رخ کا ضرور خیال رکھتا ہے۔

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اکثر زخمی شیر یا شیرنی مردم خور ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زخم کی وجہ سے یا بچہ دینے کی وجہ سے جب شیر یا شیرنی اتنے کمزور ہوں کہ

جانوروں کو شکار نہ کر سکیں تب بھوک سے بے تاب ہو کر آدمی پر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ جب انھیں محسوس ہو گیا کہ یہ اتنا آسان شکار ہے پھر عادی ہو جاتے ہیں میجر کاربٹ جانوروں کی آواز یا دوسرے حرکات سے بہت صحیح انداز لگاتے تھے۔

اکثر لوگ جنھوں نے ان کی کتاب ''کمایوں میں مردم خور'' پڑھی ہے مجھ سے دریافت کیا کرتے ہیں۔ کیا واقعی میجر کاربٹ نے شیر کو آواز سے بلا کر مار لیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔ اسی شکار میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ایک روز میجر کاربٹ اور میں بنگلہ سے جنگل کی ایک سڑک پر ٹہلنے نکلے سورج غروب ہی ہوا تھا۔ پہاڑ کی طرف سے ایک شیر کے بولنے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد وہی آواز کچھ اور فاصلہ سے آئی۔ جم کہنے لگ کہ یہ شیرنی اس جنگل کے شیروں کو اپنی آواز کے ساتھ پہاڑ کی طرف لئے جا رہی ہے ہمارا شکار خراب ہو جائے گا۔ لیکن میں اسے واپس بلا لوں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ مگر میں نے کہا کہ اگر ممکن ہو تو بلایئے۔ انھوں نے میرے سامنے اس طرف کو منہ پھیر کر اور دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کے گرد دائرہ بنا کر بالکل شیر کی سی آواز نکالی۔ شیرنی بجائے دور جانے کے ہم سے قریب آ کر بولی۔ جم نے پھر آواز دی۔ اس نے قریب تر آ کر آواز دی۔ اور تیسری بار ہم سے سو ڈیڑھ سو گز پر آ کر بولی۔ اس کے بعد میں نے ان سے یہ کہہ کر منع کر دیا۔ اب ختم کیجئے۔ اگر سڑک پر آ کر اس لیڈی نے دیکھا کہ ہم دونوں اس سے مذاق کر رہے ہیں تو یقیناً ناخوش ہو گی۔ اور چپراسی کے ہاتھ میں صرف مرغ مارنے کا سامان ہے''

مجھے آج تک حیرت ہے کہ ایک انسان کے گلے سے ایسی زبردست اور خوفناک آواز کیونکر نکلتی ہے۔

....

سال ہائے گذشتہ کی طرح سال ۱۹۳۲ء بھی قریب ختم ہوا۔ لیکن ملک کی عام فضا اس درجہ مکدر ہو چکی تھی کہ اس کا تصور بھی امن و عافیت کے زمانے میں مشکل ہے صرف صوبہ بنگال میں ۳۲ء کی جنوری سے جولائی تک سولہ مواقع پر پولیس کو گولیاں چلانی پڑیں جس میں تیرہ آدمی مارے گئے۔ چنانچہ گاؤں کے یورپین کلب پر حملہ کیا گیا جس میں پستول اور بم استعمال کیے گئے۔ ایک یورپین عورت قتل ہوئی اور تیرہ زخمی

ہوئے۔گوشورش عام تھی لیکن بنگال کی حالت خاص طور سے تشویشناک تھی۔

مہاتماجی نے ۱۲ر ستمبر کو برت رکھا کہ اگر کمونل ایوارڈ کے مطابق ہریجن طبقہ کے لیے جداگانہ انتخاب قایم رہا تو موصوف روزہ رکھ کر جان دے دیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہریجن کے لیڈر جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہو گئے اور مہاتما جی نے اپنا روزہ ختم کر دیا۔ سوراجسٹ ممبروں نے اسمبلی سے علیحدگی اختیار کی اور اب ان کا رخ کونسلوں کی بجائے قید خانہ کی طرف تھا۔

دسمبر کا مہینہ تھا کہ میری ہوم ممبری کا ساتواں سال ختم ہو رہا تھا اور رخت سفر باندھا جا رہا تھا کہ بڑے دن کی تعطیل کے بعد دو ایک دن کے لیے چارج حوالے کرنے آ جاؤں گا۔ حسب معمول تعطیل میں چھتاری گیا۔ پہلی جنوری کے گزٹ سے معلوم ہوا کہ مجھے K.C.S.I دیا گیا ہے۔ اس کی مجھے خوشی ہوئی۔ اسی کے ساتھ میری ہوم ممبری کی چاہ ماہ توسیع کا بھی اعلان ہوا۔

گورنر کو میرے جانشین کے مسئلہ میں ایک دشواری یہ پیدا ہو رہی تھی کہ ان کی نظر انتخاب کسی پر نہیں جمتی تھی۔ مجھ سے اس مسئلہ پر بارہا گفتگو ہوئی تھی۔ میں سر جگدیش پرشاد کا نام لیتا تو وہ یہ کہتے کہ دو آئی سی ایس کا ہونا آئین کے خلاف ہے۔ سر جگدیش ابھی چھٹی پر تھے ان کا نام سرکاری فہرست میں موجود تھا۔ اور بھی نام زیر بحث رہے لیکن کوئی نہ کوئی فی نکل آتی تھی۔ چھتاری سے واپسی پر سر مالکم ہیلی نے میری توسیع کا بھی سبب بتایا۔

۱۹۳۳ء میں میرا آخری بجٹ کونسل کے سامنے پیش ہوا۔ میں نے ۲۱ر مارچ کو اپنا آخری جیل بجٹ ۳۱۸۶۴۹۹ کا پیش کیا اور دوران سال میں جو اصلاحات کی تھیں اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ پر اپنی تقریر ختم کی۔ "جب کوئی نیا عہدہ قبول کرتا ہے تو اس کے ذہن میں بہت کچھ کرنے اور کر دکھانے کا ارمان اور حوصلہ ہوتا ہے لیکن بے کراں ذمہ داریوں کے ہجوم میں کام شروع کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ طرح طرح کی عملی، مالی اور انتظامی دشواریاں سدراہ ہو رہی ہیں۔ بالخصوص یہ کہ پرانی مشین میں نئے پرزے آسانی سے نہیں لگ سکتے۔ بہر حال میں یہ سمجھتا ہوں

کہ بہت کچھ کرنے کو باقی رہ گیا ہے۔ لیکن اس کی خوشی ہے کہ قیدیوں کی حالت بہتر کرنے کے سلسلہ میں کچھ کیا جا سکا۔

اسی سال پولیس سال کا بجٹ پیش کرتے ہوئے میں نے سری۔ وائی چنتا منی کی تقریر کے جواب میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔

''میرا عقیدہ ہے کہ ایک ہی سروس کے ممبروں کے ساتھ نسل وقوم کی بناپر ترجیحی سلوک محکمہ کے حق میں نقصان دہ ہوتا ہے اور حکومت کو بالآخر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اسی طرح کے سلوک سے پولیس سروس کے ہندوستانی ممبروں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ حکومت کو ان کی وفاداری پر بھروسہ نہیں ہے۔ میری تمام عمر کا تجربہ یہ رہا ہے کہ جس کسی نے جہاں کہیں اپنے ساتھی کام کرنے والوں میں مذہب و ملک یا رنگ و نسل کا امتیاز کیا اس کو ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔

مارچ ۳۳ء کا آخر ہفتہ تھا۔ صحیح تاریخ یاد نہیں غالباً ۲۲ رمارچ تھی۔ گورنر نے مجھے شام کو بلایا اور کہا کہ وہ چند ماہ کے واسطے وزیر ہند کے طلب کرنے پر ولایت جائیں گے اور اسی شب کو ملک معظم کے اس حکم کا اعلان دہلی سے ہوگا کہ مجھے ان کے بجائے یو پی کا گورنر کیا گیا۔ پہلی جلد میں کسی جگہ سر مالکم کے سکوت، حافظ کی غزلوں اور ڈارلنگ کے خطوط کی جانب جو اشارے کئے گئے ہیں وہ اسی واقعہ سے متعلق ہیں، انھوں نے میری پرانی سفارش کے مطابق سر جگدیش پرشاد کو ہوم ممبری کے واسطے انتخاب کیا تھا۔ انھیں مراد آباد سے بلایا گیا۔ اسی شام کو نواب محمد یوسف کے ہاں بڑا پرلطف ایٹ ہوم تھا، میرے ایٹ ہوم میں پہونچنے سے قبل دہلی سے ریڈیو پر اعلان ہو چکا تھا۔ ایٹ ہوم میں تہنیت کا غلغلہ تھا مجھے اسی روز یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب محمد یوسف میری تقریر سے کچھ کبیدہ خاطر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سر جگدیش کے ہوم ممبر ہونے کی وجہ میں تھا حالانکہ سینئر منسٹر ہونے کی وجہ سے ان کو ہوم ممبر کیا جانا چاہئے تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں سر جگدیش کی ہمہ جہت قابلیت کا قائل اور معترف رہا ہوں۔ پھر ہوم ممبری پر ہمیشہ کسی مسلمان کا تقرر بہتوں کی نگاہوں میں کس طرح دیکھا جائے گا۔ یہ بھی قابل لحاظ تھا۔ دو مسلمان ہوم ممبروں کے بعد تیسرا مسلمان ہوم ممبر نہ قرین مصلحت تھا نہ قرین انصاف۔

مجھے اس بار اپنی تقریر کی مسرت تھی۔ پہلے کی طرح اسے کسی حادثہ سے نسبت نہ تھی۔

یکم اپریل کو کونسل میں رخصتی تقاریر ہوئیں۔ کونسل سے جدا ہونے کا مجھ پر اثر تھا گذشتہ بارہ سال سے کونسل میری زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی۔ اس سلسلہ کا برہم ہونا شاق تھا۔ میں اس موقع پر الوداعی تقاریر کا اقتباس درج کررہا ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے اُس کی سیاسی زندگی کے ایک خوشگور پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ حکومت کی پارٹی جب بھی تھی اور اب بھی ہے۔ اسی طرح مخالف پارٹی کا وجود پہلے بھی تھا اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن آپس کے تعلقات باوجود سیاسی اختلاف رائے کے کیسے شگفتہ ہوتے تھے۔ ان تقاریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اختلافات کی گرد خلوص کے آئینہ کو مکدر نہ کرتی تھی، مخالفین اور معترضین اپنی تقریروں میں ایک طرح کا رکھ رکھاؤ مدنظر رکھتے تھے اور حکومت کوئی اچھی بات کرتی تو ایک حدتک اس کی داد بھی دیتے۔ اسی طرح حکومت بھی مخالف اقلیت کا احترام کرتی۔ یہ نہ تھا کہ برسر اقتدار اکثریت فہم وفراست، وطن دوستی اور صداقت شعاری کا اپنے آپ کو تنہا اجارہ دار سمجھے اور اس حلقہ سے باہر جو لوگ ہوں ان کی کوئی بھی بات لائق اعتنا نہ سمجھے!۔

اخلاق وآداب کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا کسی حال میں کسی کے لیے خواہ وہ فرد ہو یا جماعت گوارا نہیں کیا جا سکتا ترش وتلخ الفاظ ممکن ہے کہ ایک مضبوط معاملہ کو کمزور کردیں لیکن کمزور مسئلہ کو طاقتور نہیں بنا سکتے۔

PROCEEDING OF THE LEGISLATIVE COUNCIL OF THE UNITED PROVINCES

Saturday, Ist April, 1933

References about the Hon'ble Nawab Sahib of Chhatari

By C.Y. Chintamani

Sir, by your leave I desire to say a few words on behalf of myself and all those with whom I have the honour to act in this House on this, the last day, on which our honourable colleague, the Home Member, sits with us as a member of Government and as a member of this House. The Hon'ble Nawab Sahib was one of the first batch of members of the reformed Council. Those who were then here will remember

that young as he was in years he was also among the more promising of new members. Early in his career he began to take an active part in the proceedings of the Council and those who had the privilege of becoming his friends had no difficulty in concluding that here was the upcoming man. The Hon'ble Nawab was progressive in his opinions. It is not, perhaps, generally known that in that very year, in the month of July. I believe, he was member of a deputation of the United Provinces Liberal Association which waited upon Lord Reading and pleaded for early liberalization of the constitution as Indians were not satisfied with what had been granted under that Act. ... . The Hon'ble Nawab became a member of Government on the transferred side soon after. I personally shall always be beholden to him for having upheld and also carried forward the measures of temperance reform which had been inaugurated in the previous year. His interest in the subject was indeed so keen that he set up an Excise Conference, the recommendation of which were quoted more than once with approval and appreciation here. When in 1927, there was an important debate in this House the Hon'ble Nawab, although he became Home Member by that time, intervened in the debate in order to support the policy of his successor and to stress the readiness of Government to adhere to that policy. If I contrast his attitude of January 1927 with that of February 1933, when a similar debate took place here, although in different circumstances, and when I recall that the Hon'ble Nawab did no more than vote with the Government, as was his duty and did not get up as a former Excise Minister and embarrass us by a speech, I have reason to be grateful for that also. One more circumstance I may be permitted to mention here. Among the many unpleasant duties which it has fallen time from time to time as a member of the opposition in this House, none was more than the motion of adjournment that I had to make in December, 1928, as a protest against the very unpleasant and extraordinary incidents connected with the visit of the Simon Commission to this city. Those who would

read the Home Member's speech on that day would find that it was no pleasure to him to have had to defend incidents which he deplored as much as any one else, and if in politics men had to penetrate beneath the surface to get at the true meaning of every avoidance of acts, the circumstances that the Home Member allowed the motion of censure to be carried without a division cannot but be recalled with satisfaction and gratification by his personal friends and admirers. During the time the Hon'ble Nawab has been home Member, the province in common with the rest of the country has had to bear much and to suffer much, but the Hon'ble Nawab reduced to the minimum the occasions on which he came personally into conflict with any section of opinion by not becoming the spokesmen of the Government in reply to the opposition on most of those occasions.

.... Is there anyone who has known him here, or who has known him outside, who has ever been able to pick up a quarrel with him (applause), howsoever much howsoever violently one might disagree with him? Has one found it possible to think bitterly of him; has one's personal relation with him ever been affected? In fact I had once complained to him that while the acts of the Government were so unpopular and while he as a member was being so much attacked it was impossible for any body to feel any bitterness against him, because his reply to the most violent criticism would be a friendly smile. The quality of courtesy, amiability, genius for friendship and generous hospitality are combined in his case with great common sense, with a capacity which not many others possess of sensing the atmosphere of the House on every critical occasion and with the unfailing habit of conducting himself so as to make the most unpleasant tasks the least unpleasant when he performs them. The Hon'ble Nawab has sat on the Treasury Bench for now nearly ten years. I am glad to think, Sir, that he is not to go straight into the life of a private citizen. We know that within a week he will be called for the second time to a more exalted office (applause). Apart from the special pleasure which his personal

friends and admirers must feel, every Indian most rejoiced at heart that for the second time a highly esteemed Indian nobleman of this Province is occupying the highest position in the province and this is more welcome now than it was on the first occasion, because then he only occupied that position by act of God in circumstances which called for great regret, whereas now he goes there duly appointed by His Majesty to be the Governor of his native province (applause). As one who claims to be a humble friend of his, I wish that his tenure of office as Governor may be attended with every circumstances of peace and prosperity, and that there may be no occasion for his countrymen of this province to feel that although one of them is the Governor regrettable incidents are the order of the day. When his tenure of office is over and when he becomes a common man like the rest of us, we look forward to his coming back to a future Legislative Council, whether we may approve of the constitution of that council or not, and to his taking his proper place among the advocates of national unity and social efficiency, among those who by their example and their exertion will help lead forward the United Provinces as a part of India onward and upward to that highest status among the nations for which we all ardently aspire.

By Nawabzadah Mohammad Liaqat Ali Khan:-

Sir I associate myself with what has already been said by the Leader of the opposition and the leader of the Independent party. I have not had the good fortune of knowing the Nawab Sahib in his capacity either as a non-official member of the Council or as a Minister. When I came to the Council the Nawab was occupying the same office as he is doing to-day. I can say without any fear of contradiction that the Nawab of Chhatari as Home Member has been as responsive and responsible to the public opinion as the Minister in the Transferred Departments. Sir, his charm of manner and unfailing courtesy have won the hearts of all those who have come in contact with him. He has always been very helpful and very accommodating and even on occasion when he differed from non-official members of this House. When he

had to defend the policy of those on whom the Nawab Sahib had no control he was always smiling and there never was any bitterness. Sir, the Nawab of Chhatari by his ability and tact has shown that Indians are fit to occupy the highest office in the Province. His appointment as Governor of these provinces when His Excelency Sir Malcolm Hailey goes to England, is a compliment not to him self but to the people of this Province in general and to the Zamidars, in particular. Sir, on behalf of my friends and myself I offer him the best of wishes and I hope he will prove a very successful Governor. We hope we shall see him in the next reformed council, and lead the people of this province a work for which he is eminently fitted.

By Rai Bahadur Babu Vikarmajit Singh:

Speaking on my own belalf and on behalf of the members of my party I associate myself with all that has been said by the Leader of the Opposition and by my two other friends who have preceded me. It has been my proud privilege to have been one of his oldest colleagues in this house. I remember the days when the Nawab Sahib of Chhatari entered in this House and he and I at that time were, as beginners, back-benchers, but he very soon began to make his mark and I will not be disclosing a secret if I were to say that he caught the fancy of one, the then minister, at an early stage. ....sir, his rise in the Council has been phenomenal and it has given us always very great pleasure, and it has been due to the various qualities and virtues that he is possessed of. The great outstanding virtue, as has been mentioned, is his un-failing courtesy. As a non-official member, subsequently as a Minister and again as Home Member and now as Governor designate his courtesy never failed. As a matter of fact, if there has been any change, I should say that be the rise in his office his courtesy has been rising so to say, and in his case the saying:- "The greater the man the greater his courtesy" seems to be true. By his courteous treatment he has endeared himself to all the members of his house. .... He has, as a Member

of the Government, always conducted himself with great dignity and has administered his department with tast ability and statesmanship. During these troubled days we know that a number of questions have been arising from time to time and he has always given his most sympathetic consideration to any request that has ever been made by members of this House.

By Khan Bahadur Hafiz Hidayat Husssain:-

Sir, to bid goodbye to the Nawab of Chhatari is a great wrench for his friends even through he may be transferring himself to the sanctified cloisters across the road. 'The Nawab is most amiable, most courteous, possessed of transparent sincerity and honesty of purpose I can only say about him.

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

Sir, he has risen from an ordinary member of this House to the highest honour which is under the powers of the crown to confer and none of us has any doubt that he will discharge the onerous and responsible duties of that exalted office to the satisfaction of every body concerned during his tenure of office. His personality is such that men of every community have got absolute trust in him and no body can say for one minute or can ever conceive that he can think ill of any body. On the contrary his thoughts always move in the directions of doing good to others. He is noble in words, in deeds, and in look. He sir, is the first man throughout India who introduced democracy in the reserved subjects. He has opened and placed his cards before every section of the House and has taken us into complete confidence. I can only hope that the place he leaves today will not be left vacant by him and that in the next Council we will see him occupying the position of the Chief Minister. We hope he will rise further and one day will be one of the permanent Governors. With these words and with a heavy heart I bid him goodbye on behalf of myself and my party.

By the Hon'able the Finance Member:-

Sir, I would also like to associate myself with the congratulations and compliments that have been paid to my honourable friend. I am speaking not only on behalf of the officials who sit behind me, but I am also speaking on behalf of every official throughout the province in every single service. Those of us who know him, not only admire and respect him, but we love him. Even those who only know of him admire and respect him .... I am not going to tell him that he will have my cordial co-operation and support in all his under takings as Governor, that is merely my duty. Besides there is no need to say it because he knows it; being the friends that we are, he can have no doubt about it. All I am going to say is God bless the Nawab and may his time as Governor be successful and with your permission I will take advantage of my proximity, and shake his hand.

The Hon'ble Minister of Education :-

I rise to associate myself with what has been said by leaders of various parties. I have known Nawab Sahib for the last fifteen years and during all this time he has been a good friend to me .... since 1931 we have become colleagues. I can tell the House that his advice has been the greatest help t the ministers. I have never turned to him in vain for the solution of complicated problems. There is no knot which he cannot untie. He possesses rare powers of statesmanship and the various speakers who have preceded me have borne testimony to this. There is one thing to which I wish to refer here particularly, and that is that communalism is foreign to his nature. He has never made any difference between a Hindu and a Musalman as such. In that sense he is a true patriot. Sir, we all know that his administration of law and order has won for him the admiration of the public as a whole even of the Congress men, even of those who are in jail. No greater tribute could be paid to him than this.

By The Hon'ble the President:-

As one who has the privilege of being the spokesman

of this house I associate myself whole-heartedly with what has been said about the Hon'ble Captain Nawab Sir Mohammad Ahmad Said Khan. I do so also not only as president of this Council, but if he will allow me to say so, as an old friend. For the first time we met at the public meeting in Meerut during the great War when he and I had the honour of addressing a meeting under the Presidentship of Sir Harcourt Butler. That was, perhaps, in 1917. that was the first glimpse I had of the Nawab and his oratory. In 1921 he and I entered the Council together and we had the great privilege of sitting check by jowl, side by side, and we soon began to exchange familiarities. What struck me then about the Nawab Sahib was not only his inherent courtesy, his inborn Rajput chivalry, but also his great modesty and humility. He has always reminded me of what is said by Bhatrihari:- अनद्धतां, सत्पुरूश, समृद्धार्भ
(Prosperity does not breed conceit in good men)

He has risen from position to position form a Member, Legislative Council, he, became Minister, then a member of Executive Council in the United Provinces Government. Then he went to Delhi as an executive Councillor. He went to the Round Table Conference. But never have I seen him for a second when his modesty and humility and his courtesy have left him. And it is this great point which added to his winsome smile, has resulted in what the leader of the opposition remarked, he never made an enemy. Innumerable, I think, must have been the requests make to him, but even when he has had to reject or refuse, he has left no sting in the refusal absolutely. I have taken to him numerous cases of political prisoners for classification and he was always responsive and sympathetic and even when he refused he has refused with a charm all his own. We shall miss him the House will miss him, the House will miss its amiable and popular Home Member, it will miss Captain Nawab Sir Mohammad Ahmad said Khan, but I know he will also miss the house and although exalted office calls him elsewhere in which we wish him great success and prosperity, his heart will be with us, and I know that in the future constitution, if he is not called away

elsewhere in an exalted position, he will be back again to his natural place among the members of the house. Nawab Sahib, I wish you good speed from the bottom of my heart and wish you successful and prosperous career.

By the Hon'ble the Home Member:-

Sir, I am greatly moved by the kind references that were made by the Leader of the Opposition and leaders of the various parties as well as by my colleagues in the Government. My great difficulty is that I do not know how to depict how to portraty my feelings profound and deep as they are, in words. In all times, in every circumstance it has been very difficult to express in words, but I am in particularly difficult circumstance when I am to bid goodbye to friends when I am to suffer the wrench of severance of association of twelve years old, how is it possible for me to express myself adequately in words. Sir, I am not going to insult my sacred feelings toward the member of this House by using the conventional and common phraseology which is generally used on such occasions and which might have been uttered many a times by hypocrite lips. No, I won't do that, I will leave it to the genuineness of my feelings to the depths of my sentiments. If they are real, those whom I am addressing will feel it without expression on my part. They will go from heart to heart as they say in Persian:- ز دل خیزد بدل ریزد

(What comes from the heart goes to the heart).

Sir, it is over twelve years since I first came to this house, when I first met you, sir, and my friend, the Leader of Opposition, my honourable friend, the member of the United Provinces Chamber of Commerce and the Leader of the Independent Party. My honourable friend the member for the Chamber of Commerce, made a hidden reference. I will like to speak on it further. When I came here one great kindness that was done to me and which I still remember with greatfulness, was that the honourable member for Partabgarh, who was then Minister, was good enough to encourage a young and junior member of the House by offering him to be his Council

Secretary. It was very kind of him. I remember this incident with a feeling of love for him. It was most encouraging to me, although unfortunately I could not accept it because being quite new to the House I wanted to remain for some time unfettered and not to join the Government Benches, but it has made such a deep mark on my heart that I can never forget it. I shall ever remember it with a feeling of gratitude. For ten years I have been a member of the Government and during those ten years I received nothing at the hands of the members of this house except kindness and support. Criticism there was, as there should be, because if there is anything of which I am perfectly sure after my ten years, experience in the Government, it is that for good administration it is as necessary to have strong and critical opposition as a vigilant Government. There was criticism but I never had any experience of any hostile feeling from any side of the House. I remember those days when the Surajist party was in the House, I miss today Pandit Govind Vallabh Panth very much, but even with the Surajist Party I never experienced any hostile feeling. There is one other thing which I wish to say and I think I owe it to every section of the House to say it now publicly, that during the last ten years that I have been the member of this Government I was never attacked or harassed or embarrassed in any way on communal grounds by any section of the House and I am sincerely grateful for this

....

I will remember with gratefulness all the kindnesses that I received at your hands and they will be my most precious treasure. In the end sir, I would ask them for one more favour. They have done me so many favours. I hope they will do one more, namely that although my connection is going to be severed from this House very soon, as long as I am connected with this Government in some other capacity I beg of them to extend the same help and support to me as they did when I was within the four walls of this House. Now, Sir, with your permission I may say a few words to you. As you mentioned yourself, I remember very clearly the morning, it was in the month of February, perhaps the 14th, when we were sworn in and I had the pleasure of sitting by you. During these twelve years I have learnt a lot from you: your advice, your support,

your suggestions were always at my disposal and believe me, Sir, that I am taking with me feeling gratefulness and live for you now. Sir I must bid goodbye to my friends here, to friends who were always dear to me, who shall always be very dear to me, to friends whose love will always be in my heart, and I shall cherish it as one of the most precious possessions of mine:-

اب تو جاتے ہیں میکدے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

بار دیگر گورنری ۱۹۳۳ء

اس سال عید الضحیٰ میں نے لکھنؤ ہی میں کی۔ ۶ / اپریل کو عید تھی اسی روز میں نے سر مالکم ہیلی سے گورنری کا چارج لیا۔ عید کی نماز عید گاہ میں ادا کی۔ بڑا مجمع تھا۔ گو میں نے چارج اُس وقت نہیں لیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری طرف سے لوگوں میں طرب وتفاخر کا جذبہ موجزن ہے۔ میرے ساتھ سید عین الدین صاحب، صغیر اور عثمانی تھے۔ یہاں پر میں اپنی بعض دلی کیفیات کا خاص طور پر اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اسی عید کے موقع پر اور اسی گورنری کے سلسلہ میں چند لمحوں کے اندر مجھ پر کئی اثرات طاری ہوئے۔ عام طور پر لوگوں کو مسرور دیکھ کر میرا دل ان کی طرف سے فرط تشکر سے لبریز ہو گیا۔ قریب کے عزیزوں دوستوں کو شادماں دیکھ کر میں خود شادماں ہوا جیسے میں نے ان کے ساتھ اور انھوں نے میرے ساتھ کوئی بہت اچھا غیر متوقع سلوک کیا ہو لیکن تھوڑی ہی دیر میں جب میں نے نماز کی نیت باندھی تو مجھ پر ایک ہیبت سی طاری ہوئی اور وہ تمام باتیں جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا دفعتاً دل سے محو ہو گئیں۔ اپنے کو خدا کے حضور میں پا کر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے میرے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں اور میں نے اپنے آپ کو اس بڑے عہدہ کی ذمہ داری کے مقابلہ میں پسپا ہوتے ہوئے پایا۔ مجھے اپنی ہر استعداد نا قابل اعتبار معلوم ہونے لگی۔ میں نے گڑگڑا کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا اور کہا اے میرے مالک تو ہی بتا میں کدھر جاؤں اور کیا کروں۔

سیاسی شورش پورے شباب پر تھی اور لارڈ ولنگڈن اسے پوری طاقت سے دبا

رہے تھے گو اس بار مسلمان اس تہلکہ میں اتنی تعداد میں شریک نہ ہوئے تھے جس قدر اس سے پہلے تھے لیکن تمام قید خانے بھرے ہوئے تھے۔ میں بڑے تردد میں تھا۔ اُس زمانے کا گورنر آئینی گورنر نہ تھا کہ اپنی ذمہ داری ممبران حکومت پر ڈال کر سبکدوش ہو جاتا۔ وہ ایک جانب تاج کا نمائندہ اور شاہی اقتدار کا حامل ہوتا تھا۔ جہاں جاتا شاہی شان و شکوہ سے اس کا استقبال ہوتا تھا۔ دوسری طرف خود ہی اپنا وزیر اعظم ہوتا۔ انتظامی بندوبست کی تمام تر ذمہ داری اس کی تھی۔ وہ اپنی حکومت کے فیصلہ کو مسترد کر سکتا تھا۔ ضرورت ہو تو وہ احکامات نافذ کرنے میں اختیارِ مطلق کو کام میں لا سکتا تھا۔ ویسرائے سے براہ راست خط و کتابت مہینہ میں دو بار ہوتی تھی۔ حکومت ہند کی نظر میں صوبہ کے انتظامات کی اصل ذمہ داری اسی کے سر تھی۔ ممبران گورنمنٹ کو یہ حق تھا کہ اگر گورنر کو ان کی رائے سے اتفاق نہ ہو تو وہ اس کی خواہش کریں کہ ان کی رائے ویسرائے یا وزیر ہند کے علم میں لائی جائے۔ بایں ہمہ فیصلہ کرنا اور اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا گورنر کا کام تھا۔ ایک جانب شورش کا طوفان امنڈتا چلا آرہا تھا اور حکومت کے سفینہ کو پاش پاش کرنے پر تلا تھا۔ دوسری جانب حکومت ہند اقتدار حکومت کو بہرحال قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر ایک ہندوستانی گورنر کی حالت کسی طرح قابل رشک نہ تھی۔

میرے تقرر کو تین ہی ہفتہ گذرے تھے کہ مہاتما جی نے ''ہریجن'' تحریک کے سلسلہ میں پہلی مئی کو اکیس دن کے روزہ کا اعلان کیا اور آٹھ مئی کو ''سول نافرمانی'' کی تحریک کو ایک ماہ کے واسطے ملتوی کر دیا۔ ۱۷ر جون کو کانگریس کے پریسیڈنٹ نے ایک اور اعلان کیا جس میں اس تحریک کا مزید التواء چھ ہفتہ کے واسطے کیا گیا۔ ۲۱رمئی کو کانگریس کے پریسیڈنٹ مسٹر اینی نے دوسرا اعلان کیا جس میں عام سول نافرمانی کا معہ لگان نہ دینے کی تحریک سے روک دیا گیا۔ البتہ جو کوئی اپنے طور پر سول نافرمانی کرے وہ اپنی ذمہ داری پر ایسا کر سکتا تھا۔ اسی اعلان میں ڈکٹیٹر مقرر کئے گئے۔ کانگریس کو بحیثیت ایک ادارہ یا منظم جماعت کے بظاہر ختم کر دیا گیا۔

مہاتما جی نے مسٹر اینی کے اس اعلان پر ایک توضیحی بیان بایں الفاظ شائع کیا۔

"mass civil disobedience had been stopped because the

people were no longer able to bear the rigours of repression."

سول نافرمانی کے ملتوی ہو جانے سے انتظامی فضا بہتر ہوگئی۔اب قید خانے بھرنے کے بجائے آہستہ آہستہ خالی ہونے شروع ہوگئے۔

میں نے عید کے روز شام کو چارج لیا، سر مالکم ہیلی نے فرمایا کہ وہ غالباً ڈھائی ماہ بعد واپس آسکیں گے۔انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں اپنا اسٹاف خود لاؤں گا یا اس قلیل مدت کے واسطے انہی کے اسٹاف کو رکھوں گا۔ظاہر ہے اتنے مختصر زمانے کے لیے نئے اسٹاف کے لانے کا کوئی موقع نہ تھا۔

میں نے سر مالکم ہیلی کو اسٹیشن پر خدا حافظ کہا۔دوسرے روز سہ پہر کو قسم کھانے کی رسم کے واسطے مقرر کی۔میں نے یہ شب اپنے پرانے مکان ۱۲ بنک روڈ پر ہی گذاری۔قسم کھانے کی یہ رسم مختصر ہوتی ہے لیکن نہایت درجہ احترام کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔چھوٹا سا دربار ہوتا ہے جس میں سرکاری افسران اور غیر سرکاری معززین کو مدعو کیا جاتا ہے۔تمام ممبران گورنمنٹ اور گورنر پولیٹیکل یونیفارم میں ہوتے تھے۔ہائی کورٹ کا چیف جسٹس یا جو اس وقت ہائی کورٹ کے ججوں میں سب سے سینیر ہو وہ گورنر کو حلف دیتا تھا۔لکھنؤ کے گورنمنٹ ہاؤس کے دربار ہال میں یہ رسم ادا ہوئی۔اس طرح کے مراسم کی ادائیگی برطانوی عہد میں بڑے رکھ رکھاؤ سے ہوتی تھی۔یہ نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے۔جن لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا وہ پہلے سے آکر مقررہ نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔اپریل کی سات تاریخ تھی اور شام کے چھ بجے تھے۔میں اسٹاف کے ساتھ آیا اور درباری کرسی پر بیٹھ گیا۔چیف سیکریٹری نے جلسہ کے افتتاح کا اعلان کیا اور جسٹس لال گوپال نے میرے سامنے کھڑے ہو کر حسب ذیل عبارت پڑھی۔

Whereas His Most Excellent Majesty the King Emperor has appointed you. Capt. Nawab Sir Mohd. Ahmed Said Khan Knight Commander of the order of Star of India, Knight Commander of the order of India, Empire, to be Governor of united Province of Agra and Oudh. It is his Most Excellent Majesty's pleasure that your Excellency take before me as Senior Judge of the High Court of Judicature the oath of allegiance or oath of office."

اس کے بعد میں نے حلف وفاداری اور حلف عہدہ لیا جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

I, Mohd. Ahmed Said Khan do swear that I will be faithful and bear true alligience to His Majasty King George. the 5th Emperor of India. His Heirs successors according to Law, So help me God.

اس قسم کی عبارت کا آخری جملہ ''قانون کی مطابقت میں'' بہت جامع اور معنی خیز ہے۔ یعنی بادشاہ کی وفاداری بھی کسی کی خلاف قانون کوئی حرکت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ملک کے آئین کی عظمت اور اس کے اقتدار پر کسی کو ترجیح نہیں ہے۔
اس کے بعد میں نے عہدہ قبول کرنے کی قسم کھائی جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

I, Md. Ahmad Said Khan do swear that I will well and truly serve our Sovereign King George the 5th Emperor of India in the Office of Governor of the United Provinces and that I will do right to all manner of the people after the laws and usages of India, without fear or favour affection or ill will. So help me God.

اس عبارت کے بھی آخری الفاظ کی عظمت معنوی کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے بعد میں بیٹھ گیا اور رسم ختم ہو گئی۔

اس کے بعد سر جگدیش پرشاد جو میرے بجائے ہوم ممبر مقرر ہوئے تھے قسم لینے کے واسطے میرے سامنے کھڑے ہوئے۔

میں نے قسم دی۔ اُن کو بجائے دو حلف لینے کے جس طرح میں نے لئے تھے تین حلف لینے پڑے۔ یہ تیسرا حلف ''حلف رازداری'' جو ہر ممبر گورنمنٹ کو لینا پڑتا تھا۔ لیکن گورنر جنرل کو نہیں دیا جاتا تھا۔ اس حلف کی عبارت حسب ذیل تھی۔

I, Jagdish Prasad do swear that I will not directly or indirectly communicate or reveal to any person or persons any matter which shall be brought under my consideration, or shall become known to me as a member of Executive Council of the Governor of United Province except as may be required for

the due discharge of my duties as such Member or as may specially permitted by the Governor, so help me God.

اس کے بعد تقریب ختم ہوگئی۔ جو حضرات مدعو تھے وہ چائے نوشی کے واسطے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں وہ میرے مہمان تھے۔ گورنر ہونے سے قبل میں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بورڈنگ کے سنگ بنیاد رکھنے کا وعدہ کرلیا تھا۔ چنانچہ ۱۴؍ اپریل کو میں نے اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ ندوۃ العلماء کی طرف سے سپاس نامہ پیش ہوا۔ میں نے جواباً کچھ عرض کیا۔ یہ تو رسمی چیزیں تھیں، جن کا ایک ممبر گورنمنٹ عادی ہوتا ہے لیکن میں اس سے ضرور متاثر تھا کہ ارباب علم و فضل نے میرے تقرر پر اظہار اطمینان و مسرت کیا۔ مجھ پر سب سے زیادہ اثر مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کا تھا۔ مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کا حق صرف متقی کا تھا۔ اور میں اپنی نظر میں جیسا کچھ تھا وہ صرف مجھے معلوم تھا۔

میں نے اُن تمام سکریٹریوں، شعبہ جات کے افسران اور ممبران کونسل کو شکریہ کے خطوط لکھے جن کے جواب بہت ہی محبت بھرے الفاظ میں آئے، سر سی۔ وائی چنتامنی اور رائے بہادر وکرماجیت نے باوجود سیاسی اختلاف کے بڑے دوستانہ جذبات کا اظہار کیا۔

تہنیت کے تاروں اور خطوط کا ایک نامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا جن میں دو ایک خط جیل خانہ سے بھی آئے تھے۔ اس خلوص پر میرا دل بے اختیار ہوگیا۔ میں نے اُن کے جوابات بذریعہ انسپکٹر جنرل جیل بھیجے۔ اس لیے کہ براہ راست خط و کتابت ناممکن تھی۔

اسی سلسلے میں تہنیت کا ایک خط رائے بہادر کرشنا جی کا بنارس سے آیا۔ میں نے جوابات چھپوا لئے البتہ دستخط خود کرتا تھا۔ جواب میں اس کا بھی ذکر تھا کہ یہ گورنر فقط دو تین ماہ کے واسطے ہے۔ رائے بہادر جی نے مجھے لکھا کہ میں اپنی پیدائش کا زائچہ انھیں بھیجوں۔ چنانچہ میں نے چھتاری سے منگا کر بھیجدیا۔ جس کے جواب میں انھوں نے مجھے لکھا کہ جنم کنڈلی کے حساب سے تو مجھے تقریباً ۳۳ء کے آخر تک گورنر رہنا

چاہئے۔ ہوا ایسا ہی، میں نو ماہ گورنر رہا اور ۲۷ رنومبر کو میں نے چارج دیا۔

میری گورنمنٹ کے ممبر سوائے سر جگدیش پرشاد کے سب پرانے ہی ممبر تھے۔ (۱) سر ایڈورڈ بلنٹ فنانس ممبر (۲) سر جگدیش ہوم ممبر (۳) نواب یوسف، منسٹر لوکل گورنمنٹ۔ (۴) سر جوالا پرشاد سریواستو۔ منسٹر تعلیم صنعت و حرفت۔ مسٹر کلے جو بلنٹ کے بعد فنانس ممبر ہوئے اور سر جوزف کھلائے چیف سکریٹری تھے۔ میرا پرنسل اسٹاف وہی تھا جو سر مالکم ہیلی کا تھا۔ میں نے اس میں کوئی تبدیل بوجوہات ذیل نہیں کی تھی۔

(۱) تھوڑے دنوں کے لیے نئے لوگوں کو لانا بے سود تھا۔

(۲) میں نے سر مالکم کے سوال پر یہ جواب دیا تھا کہ انھیں کا اسٹاف برسر کار رہے گا۔ صرف میں نے نواب بہادر عبدالسمیع خاں کی سفارش پر ایک اعزازی اے ڈی سی اس غرض سے مقرر کر لیا تھا کہ لیڈی سعید کے احکامات کی تعمیل کا وہ ذمہ دار ہو۔ میرا اسٹاف حسب ذیل تھا۔

(۱) کیپٹن لیمب بیٹس (پرائیوٹ سکریٹری)

(۲) آنریبل کیپٹن آرتھر گرنفل (اے۔ڈی۔سی)

(۳) کیپٹن لیمبرٹ (اے۔ڈی۔سی)

(۴) خان بہادر لفٹننٹ رضا صدیقی (اعزازی اے۔ڈی۔سی)

ناشکر گذاری ہوگی اگر میں یہ نہ لکھوں کہ کیپٹن لیمبرٹ اور رضا مرحوم نے اپنے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے۔ دوسرے دو افسران کے متعلق بھی کاش میں یہ ہی کہہ سکتا۔

میں نے چارج لینے کے چار پانچ روز بعد الہ آباد کا دورہ کیا۔ حسب دستور اسٹیشن پر اہتمام تھا۔ الہ آباد کے گورنمنٹ ہاؤس کی عمارت گو چھوٹی ہے مگر خوب ہے۔ یہ ایک ترتیب سے بنائی گئی ہے۔ بخلاف اس کے لکھنؤ میں وقتاً اضافہ کیا گیا ہے۔ یہاں سوشل مصروفیات بہت رہیں۔ مجھے سر تیج آنجہانی کی یاد شکر کے احساس کے ساتھ آرہی ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے نہ صرف ایک ''ایٹ ہوم'' دے کر اپنی مسرت کا

اظہار کیا بلکہ دوران قیام الہ آباد میں وہ اکثر مل کر اپنی زریں رائے سے بھی مجھے افادہ کا موقع دیتے رہے۔ حسب دستور سپاس نامے پیش کیے جاتے تھے۔ جواب میں اس طرف میں ضرور اشارہ کرتا تھا کہ میں بحیثیت ہندوستانی کے اپنے اہل ملک سے کیا توقعات رکھتا ہوں۔

رام پور کا دورہ

ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور نے اپنے کرم سے مجھے رام پور آنے کی دعوت دی اور اس پر اصرار فرمایا کہ پہاڑ جانے سے قبل میں رام پور جاؤں۔ چنانچہ الہ آباد سے ۲۰ راپریل کو میں رام پور پہنچا۔

اس زمانے میں یو پی کا گورنر رامپور بنارس اور ٹیڑھی گڑھوال کی ریاستوں کا A.g.g بھی ہوتا تھا مگر بحیثیت گورنر اسے کوئی تعلق ریاستوں سے نہ تھا۔

ہز ہائی نس نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ پھر رام پور کی مہماں نوازی تو ہندوستان میں بے مثل ہے ہز ہائی نس اسٹیشن پر معہ ماہی مراتب تشریف لائے تھے۔ ہز ہائی نس نے فرمایا کہ اس سے پہلے موقعوں پر ماہی مراتب کو وہ کبھی اسٹیشن پر نہیں لائے تھے۔ اس واسطے کہ شاہان مغلیہ کا عطیہ تھے جس کی قدر انگریز نہیں جانتے۔

شب کی دعوت تھی جس میں تقریباً سو مہمان تھے۔ انگریزی مغلیہ اور ہندو کھانوں کی اتنی اقسام تھیں کہ اس زمانے میں ان کا تفصیل سے ذکر کرنا بھی شاید کسی قانونی دفعہ کی زد میں آجائے۔ بادشاہ کے جام صحت کے بعد ہز ہائی نس نے ایک تقریر کے ساتھ مرا جام صحت نوش فرمایا۔ تاج برطانیہ کے متعلق اظہار وفاداری فرماتے ہوئے اصلاحات کا بھی ذکر کیا۔ میں نے مناسب جوابات دیتے ہوئے اس پر زور دیا کہ باوجود شکوک کے نئے اصلاحات ہندوستان کے واسطے فائدہ مند ہوں گے۔

گو ہز ہائی نس نواب سر رضا علی خاں اس زمانہ میں بالکل نوعمر تھے لیکن بہت ذی ہوش۔ فہیم اور دور اندیش شخصیت کے حامل تھے۔ میں نے ہز ہائی نس میں ایک خوبی دیکھی۔ ہز ہائی نس معاملات میں مشاورت کرتے ہیں اور مشیر کی رائے خلاف مزاج ہو تو بھی اُسے بغیر بحث مباحث رد نہیں کرتے۔

آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں ریاستیں ختم ہو چکی ہیں۔ پرنس فقط برائے

نام پرنس ہیں۔ نئی بساط ہے اور نئے مہرے چیزوں کی قدر و قیمت زیروزبر ہو چکی ہے۔
بعض تو کچھ اس طور پر زیروزبر ہوئی ہیں۔ کہ بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آجاتا ہے۔

جنوں کا نام خرد ہو گیا، خرد کا جنوں

بہر حال اب کچھ ہی نقشہ ہے۔ رضا علی خاں نے اپنے زمانے میں رام پور کو بہت ترقی دی۔ رام پور میں انڈسٹری کا نام ونشان نہ تھا۔ اب دیکھئے تو متعدد فیکٹریاں ہیں اور کارخانے جاری ہیں رام پور میں زمانہ دراز سے گاؤں ٹھیکہ پر دیئے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز کاشتکار کی فلاح و بہبود کے بالکل منافی تھا۔ ہز ہائی نس ہی کے زمانہ میں ختم ہوا۔

جب انقلاب آیا تو ہز ہائی نس نے خود آگے بڑھ کر سردار پٹیل آنجہانی سے معاملات طے کئے اور ''زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز'' پر انتہائی فراست سے عمل کیا۔

صبح کو ہز ہائی نس نے اپنی فوج کی پریڈ بھی کرائی۔ میں نے سلامی لی۔ رام پور کے اس دستہ کی تعریف کمانڈر ان چیف نے بھی کی تھی۔

باغ خاص کا چراغاں اتنا خوبصورت تھا کہ ایسے چراغاں میں نے کم دیکھے ہیں۔ ہز ہائی نس کی یہ مہماں نوازی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

....

سہارن پور کا دورہ

میں رام پور سے سہارن پور اور وہاں سے دہرہ دون گیا۔ وہی پروگرام ہر جگہ تھا۔ سپاس نامہ گارڈن پارٹیاں، ڈنر اور ملاقاتیں۔ میں نے اس کا اہتمام کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے مل سکوں نیز غیر سرکاری حضرات میں سے اپنے ہاں لنچ یا ڈنر پر ضرور مدعو کرتا تھا۔

....

دہرہ دون

دہرہ دون ہندوستان کا بڑا خوبصورت خطہ ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے دو ہزار فیٹ سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ موسم بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ یہ وادی شوالک

پہاڑیوں اور ہمالیہ سے گھری ہوئی ہیں زمین زرخیز، پیداوار فراواں، قدرت نے میدانوں کی خوبی اور کوہستان کی خوبصورتی دونوں دہرہ دون کو عطا کی ہیں، میں اسے یو۔پی کا سری نگر کہا کرتا ہوں۔

یہاں ہندوستان کا بہترین فوجی مدرسہ ہے۔اس زمانہ میں میرا لڑکا فروخت یہیں پڑھتا تھا میں اس مدرسہ کے معائنہ کو گیا۔وہاں کے لڑکوں اور استادوں نے مجھ پر اچھا اثر ڈالا۔یہاں ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ بچوں کی جسمانی نشوونما کا بھی بہت خیال رکھا جاتا ہے۔انھیں دست کاری سے بھی آشنا کرتے ہیں۔لڑکوں کے بشرہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس کھیل یا کام میں لگے ہوئے ہیں اس میں پوری دل چسپی لیتے ہیں۔گفتگو کرنے میں ان کا طرز تکلم تکبر اور لجاجت دونوں سے بری اور جواب غیر متعلق حشو وزوائد سے پاک ہوتا ہے۔

انھیں گرمیوں میں لارڈ ولنگڈن نینی تال میرے مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے۔فرحت بھی تعطیل کی وجہ سے میرے پاس تھا یہ تینوں بھائی اکثر لارڈ ولنگڈن سے باتیں کرتے تھے۔ایک روز لارڈ ولنگڈن مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارے بچوں میں جب کبھی میں فرحت سے بات کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پبلک اسکول کے انگریز بچہ سے بات کر رہا ہوں۔یہاں کی تربیت کا اثر اتنا واضح اور کھلا ہوا ہوتا تھا۔

میں نے جس بٹیر کے شکار کا ذکر کہیں پہلے کیا ہے وہ اسی بار ہوا تھا۔بٹیر کا شکار یہاں بہترین ہوتا ہے یہاں کا سرکٹ ہاؤس دہرہ دون کورٹ بھی جائے وقوع کے لحاظ سے بہت اچھا مکان ہے۔یہاں سے گردوپیش کے پہاڑوں کا نظارہ بہت دل فریب ہے۔

....

میرٹھ

چار پانچ روز قیام کے بعد میں نے بادل ناخواستہ دہرہ دون چھوڑا۔یہاں سے میرٹھ گیا۔یہاں بھی تقریباً وہی پروگرام تھا جو ہر جگہ تھا لیکن میرٹھ میں عوام کا مجمع سب جگہ سے زیادہ تھا۔یوں تو ایک ہندوستانی کا گورنر ہونا کشش کا باعث تھا لیکن

میرٹھ میں جب ٹاؤن ہال میں میونسپل ایڈریس کی غرض سے پہونچا ہوں تو مجمع تھا جو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ہر طرف مکان کی چھتیں تک لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایڈریس کے بعد ایٹ ہوم تھا جس میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔

میرٹھ کے ضلع میں باغپت واقع ہے۔ وہ باغپت جہاں میرے بچپن کا معصوم لیکن مسرور و مطمئن زمانہ گذرا ہے۔ یوں تو عزیز گرامی نواب جمشید علی خاں کا اصرار ہی مجھے باغپت لے جانے کے لیے کافی تھا۔ پھر اُن کی والدہ محترمہ اور میری چچازاد ہمشیرہ کا وہاں ہونا ایسی کشش تھی جس پر میں قابو نہ پاسکا۔ ایک روزہ سہ پہر کو باغپت پہونچا۔ ہمشیرہ سے ملا مجھے اُن سے مل کر ویسی ہی مسرت ہوتی تھی جیسی بیٹے کو ماں سے مل کر ہوتی ہے۔

زمیندار ایسوسی ایشن مظفر نگر نے بھی ایک سپاس نامہ سے مجھے نوازا۔

یہ دورہ ختم کر کے میں نینی تال چلا گیا، اس دوران میں مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ میرے صوبہ کے لوگ اپنے ساتھی کو گورنر دیکھ کر خوش ہیں۔ اکثر سپاس ناموں میں اسی طرف اشارہ تھا اور میں بھی اپنے جواب میں اس کو فراموش نہ کرتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ میرے ہندوستانی لباس کو خاص طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

میرا قلب احساس تشکر سے لبریز تھا۔ مختلف مجمعوں میں ہزاروں ایسے مسرت بھرے چہرے نظر آئے جن کا تصور اب تک باقی ہے۔ یہ ناقابل فراموش تصور مجھے تمام عمر اپنے صوبہ کے رہنے بسنے والوں کو مرہون منت رکھے گا۔

....

نینی تال

مجھے نینی تال بہت زیادہ پسند ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت اور صحت بخش بہت سے دوسرے مقامات ہندوستان میں ہیں لیکن مجھے نینی تال اپنا گھر معلوم ہوتا ہے۔ میں دوپہر کے قریب گورنمنٹ ہاؤس پہونچا۔

گورنر کو یہ دستور تھا کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس فوجی اور آئی۔ پی۔ ایس۔ کے افسران

کو ایک ایک ہفتہ قیام کی غرض سے نینی تال گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کرتے تھے۔ مجھے یہ طریقہ بہت پسند تھا۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ سینیر افسران سے نجی طور پر تبادلہ خیالات کا گورنر کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح صوبہ کے حالات پر عبور ہو جاتا تھا۔ میں نے اس طریقہ کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ جاری رکھا۔ میں نے افسران حکومتوں کے ساتھ غیر سرکاری حضرات کو بھی مدعو کرنا شروع کیا۔ اس طرح......اور ہندوستانی سمانوں کی مسل پارٹی ہوتی تھی۔

مئی کے مہینہ میں نواب زادہ لیاقت علی خاں اور بیگم لیاقت علی خاں ایک ہفتہ کے واسطے میرے ہاں مہمان رہے۔ نواب زادہ صاحب نے اسی سال شادی کی تھی۔ میرے واسطے اس زمانے کی تفصیلات کی یاد اتنے برسوں کے بعد ناممکن تھی اگر راحت، فرحت اور ابن نے کھیل کے طور پر روزانہ کے مشاغل "Engagement" کی فہرستیں اپنے صندوقوں میں نہ رکھی ہوتیں۔ پارٹیوں کو ترتیب دینے میں اس کا لحاظ بہت ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے لوگ بہ یک وقت مدعو کیے جائیں جو ہم خیال وہم مذاق ہوں۔ یہ ذرا ذرا سی باتیں مہمان کی راحت رسانی میں بری سہولیت پیدا کرتی ہیں اور لطف صحبت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جن حضرات کو ایک ہفتہ قیام کی دعوت دی جاتی تھی۔ ان کی فہرست پر میں خود نظر ڈالتا تھا۔ مثلاً دو ایسی مہمانوں کی ''فہرست مشاغل'' سے درج کرتا ہوں۔

دوشنبہ۔ ۲۱ رمئی ۱۹۳۳ء:

کرنل اور مسز رحمان، مسٹر ہاٹن سی۔ آئی ای۔ مسٹر اومسز سولووے۔ آئی سی ایس۔ مسٹر گرانٹ آئی سی ایس رائے بہادر کنور اور کنورانی بشیشر دیال سیٹھ راجہ سید احمد علی خاں علوی۔ سی۔ بی۔ ای سلیم پور۔ راجہ سر محمد اعجاز رسول جہانگیر آباد۔ قیام کی غرض سے آئے۔

دوشنبہ۔ ۲۵ رجون ۱۹۳۳ء:

لفٹننٹ راجہ درگا نرائن سنگھ تروا، مسٹر اور مسز کرشن پرشاد، آئی۔ سی۔ ایس مسٹر اور مسز اے این سپرو۔ مسٹر اور مسز خورشید احمد۔ مسٹر بیرن۔ مسٹر ریڈیچی قیام کی غرض سے ہوئے۔

گورنمنٹ ہاؤس

نینی تال کے گورنمنٹ ہاؤس کی عمارت بڑی شاندار ہے۔ یہ پتھر کی دو منزلہ عمارت ہے۔ اس کا نقشہ پرانے انگریزی مکانوں کا سا ہے۔ میں نے اسے خوبصورت تو نہ کہوں گا مگر بہت پرشکوہ عمارت ہے۔ اس کا باغ اور اس کے اطراف کی زمین بڑی لیاقت اور نفاست سے آراستہ کی گئی ہے۔

روزانہ مشاغل

روزانہ کے مشاغل کا پروگرام حسب ذیل تھا

علی الصباح نماز اور ضروریات سے سات بجنے تک فارغ ہو کر تھوڑی دیر کے واسطے رفیق حیات (اہلیہ) کے کمروں کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہاں بچوں سے کچھ تفریح ہو جاتی۔ اس کے بعد نیچے اتر آتا تھا اور دفتر کے کمرے میں جا کر فقط اتنا دیکھ لیتا تھا کہ ایسے فائلوں کی تعداد کتنی ہے جن پر نیلا سلپ ''فوری'' کا دفتر نے لگایا ہے یا گلابی سلپ ''امروزہ'' کا لگا ہوا ہے پھر میں کھانے کے کمرے میں ناشتہ کی غرض سے چلا جاتا تھا جہاں مہمانوں کے ساتھ شریک ناشتہ ہوتا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہ تھا کہ ہر مہمان کھانے کے کمرے میں آئے۔ جو کمرے پر ناشتہ پسند کرتے تھے اُن کا ناشتہ وہیں چلا جاتا تھا۔ میرا ناشتہ زیادہ تو پھلوں اور کافی پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد دفتر آجاتا تھا اور ضروری احکامات لکھوا دیتا تھا۔

اس کے بعد سکریٹری یا ممبر حکومت جس کا مقررہ روز ہوتا تھا پیشی کو آجاتا تھا مثلاً

جمعہ:

ساڑھے دس بجے فنانس ممبر...... بارے بجے وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ۔

دوشنبہ:

دس بجے۔ چیف سکریٹری...... بارہ بجے وزیر تعلیمات۔

سہ شنبہ:

دس بجے۔ فنانس سکریٹری...... گیارہ بجے سکریٹری مال گذاری وتعمیرات بارہ بجے۔ سکریٹری لوکل سیلف گورنمنٹ وحفظان صحت۔

چہار شنبہ:

دس بجے سکریٹری جوڈیشل .... پونے گیارہ بجے ہوم ممبر ساڑھے گیارہ بجے۔ سکریٹری تعلیمات وصنعت۔

اس طرح مقررہ اوقات پر یہ حضرات پیشی کو آتے تھے۔ ہفتہ کے باقی روز غیر سرکاری حضرات کی ملاقات کی غرض سے ہوتے تھے۔ سہ پہر کو گورنمنٹ ہاؤس میں لوگوں کو ٹینس کے بلایا جاتا میں کہیں ٹینس پر مدعو ہوتا تھا۔ ہر بدھ کو میں سر جگدیش پرشاد کے ہاں ٹینس کے لیے جاتا تھا۔

ہفتہ میں تقریباً دو لنچ اور دو ڈنر اس وجہ سے ضروری تھے کہ جو لوگ اپنا نام ملاقاتیوں کی کتاب میں لکھ جاتے تھے انھیں بلایا جاسکے۔ میں اس طریقہ ضیافت کو بہت پسندیدہ اور ضروری خیال کرتا تھا۔ بحیثیت ممبر گورنمنٹ بھی میں اس کا اہتمام کرتا تھا کہ جو اصحاب کارڈ چھوڑ جائیں انھیں چائے یا کھانے پر ضرور بلایا جائے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں بڑی آسانیاں تھیں۔ پورا اسٹاف اسی کام پر مامور تھا۔

گورنمنٹ ہاؤس میں دو ڈانس ایک جون اور ایک ستمبر میں ضرور ہوتے تھے۔ میں نے بھی اسے جاری رکھا۔ میں خود اس فن لطیف سے بے بہرہ تھا اور بعض کرم فرماؤں کی کوشش کے باوجود مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی کہ اسے سیکھنے کی بھی کوشش کرسکوں۔ میں بارہ بجے تک ناچ کے کمرے میں صدر مقام پر ایک صوفہ پر بیٹھا رہتا تھا۔ اے۔ ڈی۔ سی ہر ڈانس کے شروع ہونے پر ایک خاتون کو لاکر میرے صوفہ پر بیٹھا دیتا تھا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ دوسرے ڈانس کے شروع ہونے پر ایک دوسری خاتون لائی جاتی اور پہلی خاتون رخصت ہو جاتیں۔

گورنر کے ساتھ بیٹھنے والی خواتین کا انتخاب اُن کے خاوند کے رتبہ سے ہوتا تھا۔ مثلاً سب سے پہلے فنانس ممبر کی بیوی تشریف لاتیں پھر کسی دوسرے ممبر گورنمنٹ کی بیوی آکر بیٹھتیں۔ پھر ایسٹ کمانڈ کے جنرل کی بیوی آتیں۔ اس میں سر مو فرق میں بھی بدمزگی کا موجب ہوسکتا تھا۔ سینیئر خاتون اسے توہین خیال کرتیں اگر کسی جونیر خاتون کو اُن سے پہلے لایا جاتا۔ لہذا یہ بہ ظاہر تفریح بھی ایک طرح سرکاری کام کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ ڈانس کی پارٹیوں میں شراب کا خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

چار سو پانچ سو آدمی اگر شب کے ایک دو بجے تک ناچتے رہیں تو ظاہر ہے شراب کا خرچ کتنا ہوتا ہوگا۔

اُس زمانے کے گورنر کے فرائض اہمیت اور تعداد ہر دو لحاظ سے بہت زیادہ ہوتے تھے۔ علاوہ غیر سرکاری ملاقاتیوں اور سکریٹریوں کے مقررہ ایام کے ہفتہ میں ایک بار گورنمنٹ کی میٹنگ ہوتی تھی جس میں جملہ ایسے مسائل جن کے انتظامی نتائج دوررس ہوں یا جنھیں حکومت ہند سے تعلق ہو پیش ہوتے تھے۔ یہ میٹنگ اکثر لنچ کے بعد تک جاری رہتی تھی اور ممبران گورنمنٹ وہیں لنچ تناول کرتے تھے۔ علاوہ ازیں روزانہ کے فائلوں پر حکم دینا بھی کافی وقت لیتا تھا۔ وزیر متعلقہ یا کونسلر نے اپنی رائے لکھ کر ایک فقرہ ''ہز ایکسی لنسی ملاحظہ فرمائیں'' لکھ دیا اور پوری ذمہ داری گورنر پر آ گئی۔

ممبران گورنمنٹ

سر اڈورڈ بلنٹ میرے فنانس ممبر تھے۔ یہ اُس زمانہ میں اکثر بیمار رہے۔ لیکن میرے ساتھ پورے پورے خلوص سے تعاون کرتے تھے۔ یو۔پی کے بڑے قابل افسروں میں اُن کا شمار تھا۔ چونکہ اُن کی صحت اس زمانہ میں خراب رہتی تھی۔ اکثر ان کا کام میں اپنے اور سر جگدیش پرشاد پر تقسیم کر دیتا تھا۔

سر جگدیش پرشاد میرے دست راست ثابت ہوئے۔ اُن کا تجربہ۔ اُن کی قابلیت۔ اُن کا خلوص اور ان کی پیش بینی سے مجھے بہت مدد ملی۔ سب سے بڑی مدد مجھے اس سے ملتی تھی کہ سر جگدیش پرشاد کا اور میرے نقطہ نظر انتظامی امور میں اکثر و بیشتر یک جہت ہوتا تھا۔ سر جوالا پرشاد سریواستو کے متعلق میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ نہایت ذہین۔ دور اندیش اور زمانہ شناس ہیں۔ مجھے ان سے بہت مدد ملی۔ اُن کے گھر کے لوگوں کے تعلقات میرے گھر سے بڑے خوشگوار اور مخلصانہ تھے۔ اُن کے بچے مجھے (انکل) چچا کہتے تھے۔ لیڈی سریواستو سے میری بیوی کے بہت گہرے تعلقات تھے اور اُن کی صاحبزادیاں تو بالکل اپنے بچوں کی طرح لیڈی سعید کے پاس آتی جاتی تھیں۔ اور کئی کئی روز گورنمنٹ ہاؤس میں قیام کرتی تھیں۔

راحت سلمہ اس زمانہ میں غیر معمولی موٹا تھا۔ یہ بچپن کا مٹاپا تھا جو جوان

ہونے پر کم ہوگیا۔ لیکن ان دنوں کوئی اور شیلا (سر یواستوصاحب کی صاحبزادیاں) راحت "کوبی بی الیفنٹ" کہتی تھیں اور راحت کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔

۳رجون کو بادشاہ کی سالگرہ کی تقریب میں تال کے کنارے پریڈ ہوئی۔ یوں تو یہ سال گرہ ہر سال ہوتی تھی۔ گورنر اور دوسرے حکامان جمع ہوتے تھے، گورنر سلامی لیتا تھا۔ فوج شاہی سلامی (اوکل سلوٹ) دیتی تھی۔ لیکن اس سال ہندوستانی تماشائیوں کی جو کثرت تھی اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ علاوہ میدان اطراف کے راستوں اور مسجد سے متصل پہاڑی آدمیوں سے بھری ہوئی تھی۔

بارہ جون کو ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور نینی تال تشریف لائے اور میرے یہاں قیام فرمایا۔ مجھے اُن کے تشریف لانے سے بڑی مسرت ہوئی۔ بقول حضرت ذوق ایک مخلص دوست کی ملاقات مسیحا و خضر کے ملنے سے زیادہ پر لطف ہوتی ہے۔

لارڈ ولنگڈن کی آمد

میں نے لارڈ اور لیڈی ولنگڈن کو تشریف لانے کی دعوت دی۔ ۱۷رجون کو ویسرائے نینی تال آئے۔ حسب معمول اُن کی حفاظت کا بڑا اہتمام کیا گیا۔ گو اس سال سول نافرمانی کی تحریک رُک چکی تھی۔ لیکن خفیہ سیاسی جماعتیں دہشت ناک جرائم کر رہی تھیں اور ۳۲ء سے برابر ایسے جرائم کی خبریں ملک کے اکثر گوشوں سے آ رہی تھیں۔ میں قدرتاً اس سے فکرمند تھا۔ میں نے اس کا خاص اہتمام کیا تھا کہ جہاں کہیں ویسرائے تشریف لے جائیں میں ان کے موٹر میں اُن کے ہمراہ رہوں تا کہ اُن کے ساتھ ہر خطرے میں شریک رہوں۔

مجھے اس کا افسوس ہے کہ لیڈی ولنگڈن ہمراہ نہ آسکیں وہ ولایت چلی گئیں تھیں۔ نینی تال کے راستے جابجا دروازے بنا کر آراستہ کیے گئے تھے۔ میں کاٹھ گودام سے انھیں ساتھ لے کر گورنمنٹ ہاؤس آیا۔ اُن کے آنے کے سلسلے میں ایک بڑا ڈنر اور ایک ڈانس بھی دیا گیا تھا۔ ڈانس میں بڑا مجمع تھا۔ تین سو ساڑھے تین سو آدمی تھے۔ ایسی تقریبوں میں ساغر و مینا کا دور دورہ ہوتا ہے اس لیے اخراجات بھی بے اندازہ ہوتے ہیں۔ میں عادتاً جب کبھی ڈانس دیتا تھا تو بارہ بجے تک ایک صوفہ پر

بیٹھ کر تماشہ دیکھتا رہتا تھا اور اے ڈی۔سی حسب مراتب مختلف خواتین کو میرے پاس لاکر بٹھا دیتے تھے جن سے میں باتیں کرتا رہتا۔ لیکن اس ڈانس میں مجھے اس وقت تک رہنا پڑتا جب تک کہ لارڈ ولنگڈن ڈانس کے بعد خود اپنی خواب گاہ میں نہ چلے گئے۔

حسب دستور سرکاری اور غیر سرکاری حضرات کی ملاقاتیں اور ایڈریس وغیرہ ہوئے۔

اسی زمانے کا ذکر میں نے پچھلے اوراق میں کیا ہے کہ لارڈ ولنگڈن نے مجھ سے کہا کہ جب میں تمہارے لڑکے فرحت سے بات کرتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی انگریزی پبلک اسکول کے طالب علم سے بات کر رہا ہوں۔"

باوجود معمر ہونے کے لارڈ ولنگڈن نے ایک روز شام کو ٹینس بھی کھیلے۔ لیکن اُن کے اے۔ڈی۔سی نے مجھ سے کان میں کہہ دیا کہ اس کا خیال رکھئے کہ ہز اکسی لینسی کو بھاگنا نہ پڑے۔ میں اُن کے خلاف کھیلا اور میں اور میرے ساتھی نے اس کا لحاظ رکھا کہ گیند اُن کے قریب ہی گرے۔ کچھ بھی ہو اتنی عمر میں ورزش کا شوق یقیناً قابل داد ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ زیادہ عمر ہونے پر کسی قسم کی ورزش نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت سے بہت پہلے بڑھاپا انھیں آدباتا ہے۔ تھوڑی سی مناسب ورزش جاری رہے تو عرصہ تک قوائے جسمانی میں اعتدال رہتا ہے۔ لارڈ ولنگڈن اس سے بہت مطمئن معلوم ہوتے تھے کہ سول نافرمانی روک دی گئی۔ وہ یو پی کے حالات کو بھی اطمینان بخش خیال کرتے تھے۔ انھیں ہماری اس پالیسی سے اتفاق تھا کہ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔

دو روز قیام کے بعد وہ واپس ہوئے میں "کاٹھ گودام" تک ان کے ساتھ گیا اور جس وقت بذریعہ فون مجھے یہ اطلاع ملی کہ اُن کا اسپیشل یو پی کی حدود سے گذر گیا مجھے اطمینان خاطر نصیب ہوا۔ شملہ پہونچتے ہی مجھے حسب ذیل خط لکھا۔

Viceregal Lodge
Simla
22-6-1933

My dear Nawab Sahib,

One line of my greatful thanks to your Excellency for all your kindness & generous hospitality to me & my staff.

We enjoyed our visit enormously notwithstanding the vagaries of the climate, which did not affect us (except for the lumbago, which is now nearly gone) for we came away full of the charms of your Hill station.

And let me say, it was the greatest pleasure for me to find the universal approval of your being in your important post, which makes me very happy in my recommendation.

The monsoon is upon us here, and we have found the mist which is doing just as well as it did in Nani.

All good wishes and renewed thanks.

Yours sincerely,
Willingdon

راؤ عبدالحمید خاں مرحوم و مغفور

اس وقت میرے سامنے مرحوم کی نوشتہ ایک نظم رکھی ہے جس میں مرحوم نے میری گورنری کی تاریخ نکالی تھی جب بار اول ۲۸ء میں گورنر ہوا تھا۔ مرحوم نواب جمشید علی خاں کے حقیقی بھائی اور میرے ماموں زاد بھائی تھے۔ بہت سادہ مزاج، دور اندیش اور مخلص انسان تھے۔ اس درجہ متین اور مرنجان ومرنج تھے کہ کوئی کام کتنی ہی محنت سے کیوں نہ انجان دیں کسی پر اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے۔ حکومت وقت سے راؤ بہادر کا خطاب پایا۔

شاعر تھے اور شاعری کی ایک خاص صنعت ''تاریخ گوئی'' میں بڑی اچھی مہارت تھی۔ ایک بار ایک دوست کو ''سر'' کا خطاب ملا یہ دوست اس زمانے میں جا و بے جا برٹش حکومت کی طرف داری کرتے تھے اور قوم پرست حضرات کو اُن سے یہ شکایت تھی۔ عبدالحمید خاں مرحوم نے مصرعہ تاریخ جس میں ''ق'' کا تخرجہ ہے لکھا۔ قوم کا سر کاٹ کر وہ ''سر'' ہوئے تو کیا ہوئے۔''

اُن کی صحت اچھی نہ تھی۔ اُن کی علالت مزاج میرے لئے بڑی روح فرسا تھی مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ ۴۶ء میں بتاریخ ۵ / اکتوبر اُن سے مفارقت ہوگئی۔ رہے نام اللہ کا۔ جو نظم میرے گورنری کے موقع پر مرحوم نے لکھی تھی اُسے

درج کرنے میں مجھے ذراپس وپیش ہے۔ایک بھائی اپنے بھائی کی محبت میں جو کچھ لکھے اس کا دہرانا بدمذاقی معلوم ہوتی ہے۔بایں ہمہ اس کو درج کرنے کی جسارت کرر ہا ہوں تو صرف اس واسطے کہ مرحوم بھائی کا ایک محبت بھرا تحفہ اُن کی یاد آنے پر بھلایا نہیں جاسکتا۔

مرحوم منظر تخلص کرتے تھے ۔۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار میں گورنر ہوا تو مرحوم نے خود مجھے عطا کی تھی۔

اے معدن الطاف وکرم مخزن اخلاق — دنیائے ترقی کا ہے تو مہر منور
اس دور میں ہے کون ترا مد مقابل — ہم عزت وشوکت وہم رتبہ وہم سر
یہ شان یہ عظمت یہ تیرا منصب عالی — عش عش کریں گر دیکھ لیں دارا وسکندر
ہر شخص کو ہے فیض ترے دست کرم سے — اعلیٰ ہو کہ ادنیٰ ہو گدا ہو، کہ تونگر
دولت کو ہے یہ ناصیہ سائی کی تمنا — خود آکے قدم چومتے ہیں لعل وجواہر

بے ساختہ منظر نے کہا مصرعۂ تاریخ
صدناز کہ نواب چھتاری ہے گورنر

۱۳ ھ ۴۷

جب ۱۹۴۱ء میں مجھے حیدرآباد صدراعظم کی حیثیت سے جانا ہوا تو مرحوم نے ایک نظم لکھی تھی جس کا مقطع یہ ہے۔

ہوئی تاریخ کی جب فکر منظر
کہا دل نے، خدا حافظ و ناصر

۱۹ ء ۴۱

پردیس جانے کی تاریخ "خدا حافظ وناصر" کس قدر بے ساختہ ہے۔

ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور بھی قیام کی غرض سے تشریف لائے۔ان کے اشتاف میں سید ابومحمد مرحوم بھی ساتھ تھے۔مجھ سے اس مسئلہ پر مشاورت کی کہ مستاجروں کے ٹھیکے ختم کیے جائیں مجھے اس اصلاح سے پوری ہمدردی تھی میں نے ابومحمد مرحوم کو جو اس زمانہ میں ان کے وزیر تھے اس اصلاح پر داد دی ہے۔

....

کونسل کی میٹنگ

۲۷/جون سے کونسل کی میٹنگ شروع ہوئی، فہرست مشاغل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی مشغولیت غیر معمولی تھی۔ ممبران کونسل روزانہ ملاقات کو آتے تھے۔ پھر لنچ یا چائے پر مدعو کیے جاتے تھے۔ مجھ سے اکثر ممبران کونسل نے یہ خواہش کی کہ میں کونسل کو ایڈریس کروں۔ میں نے اسے بخوشی منظور کرلیا۔ کونسل کی فضا۔ گورنری کی رسم و روایات کی محبوس زندگی سے مجھے کہیں زیادہ پسند تھی۔ سر ایڈرڈ بلنٹ تھے۔ یہ ممبران کونسل کی جانب سے مصر تھے کہ مجھے ضرور ایڈریس کرنا چاہئے۔

کونسل اس زمانے میں ''شیرووڈ'' کی عمارت میں ہوا کرتی تھی۔ یہ عمارت گورنمنٹ ہاؤس کے احاطہ میں واقع ہے۔ جس زمانے میں گورنمنٹ ہاؤس زیر تعمیر تھا تو عارضی طور پر یہاں لفٹنٹ گورنر رہا کرتے تھے۔

میں ۵/جولائی ۱۹۳۳ء کو ساڑھے گیارہ بجے کونسل کو خطاب کرنے گیا۔ یوں تو میں ہمیشہ ہی ہندوستانی کپڑے پہنا کرتا تھا سوائے ایسے مواقع کے جب سرکاری ''یونیفارم'' پہننا لازمی ہو۔ مگر اس موقع پر میں نے مخصوص اہتمام سے ہندوستانی لباس پہنا اور وہ بھی پرانے رنگ روپ کا میں نے شیروانی پر جے پوری ریشمی عمامہ باندھا تھا مجھے یہ ہندوستانی لباس بہت پسند ہے۔

اس تقریر کے بعض حصص ایسے ہیں جو موجودہ حالات میں بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔

سیاسی اور اقتصادی کش مکش کا ڈراما اب بھی جاری ہے گو ایکٹرس دوسرے ہیں۔ اسٹیج بدل گیا ہے مگر کہانی تقریباً وہی ہے میں نے اس طرح شروع کیا تھا۔

Mr. President and Members, of the legislature

After having attended practically every session of this Council for over 12 years. The present was the first occasion when while still being in this province I find it impossible to do so; and you can well understand how genuine was my regret at missing my old colleagues and friends here and how

anxious I was to get some opportunity of meeting you again. But I hesitated because it was only last March that His Excellency Sir Malcolm Hailey addressed you. It was in this dubious frame of mind when my hon'ble colleague, the leader of the house, informed me that my strong desire to meet you had found an echo in the mind of my frinds who too had expressed a wish that I should come and address them. I was, therefore, not slow to seize this opportunity of meeting you once again and it affords me a real pleasure to come here today for, as you know the legislative council has become a part of my existence.................

The economic condition in the rural areas is unfortunately still unsatisfactory, but there is prospect of better times head. Times have been bad and the financial reserves of the people have been depleted; but the power of resistance to adverse conditions has proved surprisingly strong. Signs are not wanting that the situation is improving and we have now turned the corner. The figures of the prices show a very welcome rise, except for the Gur; infact, the price of wheat is approaching the pre-war level. The price of Gur is still low, but it should improve with the increase in the number of factories. The new scheme for adjustment of the rent and revenue mentioned by Sir Malcolm Hailey is now nearly ready and will shortly be placed before the rent and revenue committee for its consideration and for such suggestions as it may wish to make. Besides this, the Government had adopted other important measurers to relieve agriculturists of the part of the load of debt which has been much increased by the recent depression. The Agriculturists' Relief Bill, the Reduction of Interest Bill and the Usurious loans (U.P Amendment) Bill are now before you. The opinion of representatives bodies of individuals, interested in the Subject of Commissioners and of District officers have been invited and received, and these will be distributed to the members of the select committee to help them in their deliberations. I have every hope that the enactment which will eventually emerge

will do much to relieve the more acute financial difficulties which are now pressing on so large a portion of the people of the province .... In short, gentlemen, for the moment the political situation is calm. It is my earnest prayer that long may it continue so. I appeal with all my heart to my country men not to take decisions which may again lead to bitter political strife and to much avoidable sufferings. Surely there has been enough of tumult and contention. Is it not time that we turn our energies to the solution of the many and complex problems that confront us? Soon India will have a new constitution with a largely increased electorate. I venture to think that the success of the impending reforms will depend to a greater extent on the proper training of the new electorate in their enlarged responsibilities. I have an imperishable faith in the destinies of my county and in the capacity of my county men for ordered self-Government. But I am not unmindful of the grave dangers of misdirected mass movements, especially when they assume an economic garb. The need of organizing the voters in the method and practice of constitutional action was never more urgent than it is to-day. The task is surely big enough to demand all our efforts.

With good will and with co-operation among races, creeds and classes we can take a big stride forward on the road to complete self-Government. Let us avoid dissenion & policies which may land us in barren confusion. There is no need to brood over the incidents of the recent past, of the opportunities missed and of the wrong turns taken. Let dead past bury its dead. Let us fix our gaze on the future and let us take a firm resolve to make the best of the reforms that are coming. If we do, then our India, in the words of poet Tennyson, will rise on the stepping stone of its dead self to higher thing". I have no doubt that you as the elected representative of the people will use your efforts to have the way for the smooth working of the new constitution and to turn the minds of the men, weary of strife towards constructive efforts.

تینوں قوانین

1. Agricultural Relief Bill
2. Tax Reduction of Interest Bill.
3. The Usurious Loan (U.P. Amendment) Bill.

اس کونسل میں پیش کئے گئے۔ ان قوانین کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے کہ کاشتکار کا لگان کم کرنے اور اناج کی اس درجہ ارزانی کے بعد اگر قرضوں کو نہ گھٹایا جاتا تو کاشتکار اور زمیندار دونوں تباہ ہو جاتے پوری رقم کی ادائیگی ان حالات میں ناممکن تھی۔ انصاف کا یہی تقاضا تھا۔ روپیہ یا کسی سکہ کی قیمت ایک مفروضہ چیز ہے۔ اس کی قیمت منحصر ہے اس کی خریدنے کی طاقت پر جب قرضے دیئے گئے تھے تو روپیہ کی خریدنے کی طاقت بہت کم تھی اور وہ بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لہذا قرضہ کی تعداد کا گھٹنا لازمی تھا تاکہ مقروض کو اس سے زیادہ خریدنے کی طاقت نہ دینی پڑے جتنی قرض لیتے وقت تھی۔ یہی بات آج بھی مخالف سیاسی جماعتوں سے حکومت وقت کہتی۔

ریڈ ٹیپ ازم

یوں تو گورنمنٹ کی ''ریڈ ٹیپ ازم'' مشہور ہے۔ یعنی جو چیز ایک بار جس طرح ہوگئی چاہے حالات زمانہ بدل گئے ہوں۔ تقاضۂ وقت اس کے خلاف ہو لیکن ایسی پرانی لکیر کی پابندی ضرور کی جائے۔ اس زمانہ کی ایک دل چسپ مثال پرانے کاغذوں میں نکل آئی۔

میں دورے کے سلسلہ میں میرٹھ گیا۔ وہاں کے میونسپل بورڈ نے حسب دستور ایک ایڈریس پیش کیا اور چونکہ گورنر ہندوستانی تھا۔ اس واسطے بجا طور پر اُن کا ایڈریس بھی اردو میں تھا جو اس خطہ کی زبان بھی ہے۔ اس میں فارسی اور اردو کے اشعار بھی تھے لیکن میرے روبرو اُس کا انگریزی ترجمہ پیش ہوا وجہ صرف یہ تھی کہ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔

ترجمہ کرنے والوں سے شکایت نہیں مگر فارسی اور اردو اشعار کا ترجمہ انگریزی میں بہت عجیب معلوم ہوا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"Come, Oh wine giver, the nightingale has started singing from the tree."

The spring has come the beloved has come, and the consolation has come.

اسے پڑھنے کے بعد مجھے کیا چارہ تھا سوائے اس کے کہ اصلی ایڈریس طلب کروں جس میں حسب ذیل شعر سے ایڈریس شروع کیا گیا تھا۔

"بیا ساقی نوائے عندلیب از شاخسار آمد
بہار آمد، نگار آمد، قرار آمد"

اس کے بعد ترجمہ کی زحمت سے نجات مل گئی اور اصل ہی میری میز پر رکھا جاتا تھا۔ یہ تو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس زمانہ کا گورنر پورے صوبہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ روزانہ کے انتظام میں نہ صرف دخیل ہوتا تھا بلکہ اصلی ذمہ داری اُسی پر عائد ہوتی تھی لیکن اس کے علاوہ سوشل معاملات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا۔ بعض غیر سرکاری تقریبوں میں بھی اُسے دل چسپی لینا ہوتی تھی۔ اگر اُسے یہ معلوم ہو کہ کسی پر ظلم ہو رہا ہے۔ گو وہ کسی قانونی زد میں نہ آتا ہو۔ اُسے توجہ کرنی ہوتی تھی۔ ایک بار مجھے یہ اطلاع ملی کہ ایک لڑکی مصیبت میں ہے۔ اس کے باپ کی ریاست کورٹ تھی۔ اس لڑکی کو اس کے چچا نے لے لیا تھا اور اب وہ بھی ناخوش ہو گئے تھے۔ میں نے مسٹر ڈریک بروک مین کو خط لکھا تھا جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گورنر کسی جزوی امور میں بھی مداخلت کر سکتا تھا۔ اکثر ایسی مداخلت انتظام میں انسانی ہمدردی کی روح پیدا کر دیتی تھی۔ مسٹر ڈریک بروک مین کورٹ آف وارڈ کے انچارج تھے۔

20, September

Mr. dear Drake-Erockman,

"As you are aware, one daughter of .... lives with her uncle ...."Last year, I am told, ... (her uncle) wanted to marry her but the .... (her father) got an injunction issued .... Now, the relations between the uncle and his wife and the girl are terribly bad. I am told the girl is kept almost locked up.

.... The father refuses to take her back and says she has been adopted by her uncle. I understand under the Hindu law a girl cannot be adopted. However, this is immaterial. The question is : what to do with the child who is now disowned by both sides I think the fair thing would be the .... (the father) to take the girl under his protection and we may be able to persuade him to do this if we tell him we are willing to increase the allowance for the girl. If he does not agree to this then the only alternative is to send the girl to some school; but this should be done with the consent of .... (father) and .... (the uncle)."

میری رائے میں اس طرح کی مداخلت انتظامی وروبست کو ہموار رکھنے میں مفید ہوتی ہے لیکن وزیر اعظم یا گورنر کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ دوسرے وزراء یا ممبران حکومت کو ناگواری نہ ہو۔ جس تجویز سے اختلاف ہو اس کے نقائص اشارتاً بتانا یا اندیشہ کا اظہار کرنا ایسے طریقے ہیں جو کارگر ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شرکاء کی رہبری کی جائے۔ انھیں ہانکنے کی کوشش نہ کی جائے۔ جمہوری اور آئینی طرز حکومت میں شخصی اثر اسی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات ایسی تجاویز سامنے آتی ہیں جن کو آپ درست خیال نہیں کرتے لیکن برملا کہہ دینا بدمزگی کا موجب ہوتا ہے دوسری طرف ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کابینہ میں ہمنوائی مفقود ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تجویز کو فی الجملہ مناسب کہتے ہوئے اس کے کسی ایک جزو پر بحث کی جائے پھر یکے بعد دیگرے دوسرے حصوں کو لیا جائے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ تجویز کی صورت ہی بدل جاتی ہے لیکن مجوز اسے اپنی ہی تجویز سمجھتا رہتا ہے۔ ایسی شکل میں ایک بات ضروری ہے یعنی ترمیم شدہ تجویز کا سہرا مجوز کے سر رہنے دیا جائے۔ اپنی کی ہوئی ترمیمات کا اظہار غلطی ہے۔ ایسا کرنے سے شریک کار کا دل کھٹا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات اس کے اخلاص میں فرق آ جاتا ہے۔

یہاں ایک قصہ یاد آ گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جو اصلاحات نافذ تھیں اُس آئین میں ایک دفعہ ایسی تھی جو گورنمنٹ کو یہ اختیار دیتی تھی کہ اگر کسی ملازم کو حکومت وقت کسی

وجہ سے نااہل تصور کرے تو اُسے قبل از وقت پنشن پر حکماً بھیجدے، یو پی کی پولیس میں ایک افسر ظفر صاحب مرحوم تھے۔ محکمہ کے افسران اُن سے اکثر ناخوش رہتے۔ انسپکٹر جنرل نے تحریک کی کہ اس اختیار کو بر سرکار لایا جائے چیف سکریٹری نے اس سے اتفاق کیا۔ سر جگدیش پرشاد ہوم ممبر تھے انھیں بھی اس سے اتفاق تھا یہ متفقہ مسئلہ آخری حکم کی غرض سے میرے پاس آیا۔ میرے رائے میں یہ تجویز درست نہ تھی۔ اگرچہ قانوناً مجھے اختیار تھا کہ میں اس تجویز کو نامنظور کردوں لیکن یہ حکم انسپکٹر جنرل چیف سکریٹری اور ہوم ممبر سب کی متفقہ سفارش کے خلاف خودمختارانہ ہوتا، یہ بات میری طبعیت کے خلاف تھی۔ میں نے بجائے فائل پر کچھ لکھنے کے انسپکٹر جنرل کو ملاقات کے لیے بلایا۔ وہ آئے تو میں نے گفتگو اس طرح شروع کی۔ آپ کی سفارش یقیناً کامل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ میں بھی اس پر غور کرتا رہا ہوں اس سلسلے میں ایک خیال میرے ذہن میں آیا میں نے چاہا کہ اس میں آپ کو بھی شریک کرلوں۔ وہ یہ کہ یہ دفعہ اب تک قانون کے صفحات میں دفن رہی ہے۔ آج پہلی بار آپ اس کو زندہ کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں اور اسے زندہ کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ لیکن یہ بات بھی پہلے سے سوچ لینے کی ہے کہ صندوق کا یہ جن ایک دفعہ برآمد ہوگیا تو ہمارے ملازمین پر کیا گذر جائے گی۔ آپ کا اس بارہ میں کیا خیال ہے۔ انسپکٹر جنرل نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر ذرا رک کر کہا ''جناب کیا میں اس تجویز کو واپس لے سکتا ہوں'' میں نے کہا ''ہاں بڑی مسرت سے'' اور بات آئی گئی ہوئی۔

اگر معترضانہ اور مخالفانہ انداز سے بات کی جائے تو بالعموم مخالف پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ بذات خود میں نے اس طریقہ کو یو پی میں گورنر کی حیثیت سے اور حیدرآباد میں وزیر اعظم کی حیثیت سے بہت کامیاب پایا۔ میرے رفقائے کار کو کبھی یہ شکوہ نہیں ہوا کہ میں خواہ مخواہ مداخلت کرتا ہوں۔ حالانکہ اُن کی تجاویز میں کافی ردوبدل ہوجاتی تھی۔ آج بھی جب گورنر کو سوائے خاص حالات کے دخل دینے کا حق نہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ روش مفید ہی ہوگی۔ اس سے گورنمنٹ کو مدد ملے گی۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ بعض اوقات ایسے شخص کی رائے جو انتخاب کی کشمکش سے علیحدہ رہا ہو بڑی صائب ہوتی ہے۔

سر ہیری ہیگ

سر ہیری ہیگ ان دنوں ویسرائے کی کونسل میں ہوم ممبر تھے۔ یہ بمبئی سے واپس ہوتے ہوئے نینی تال میرے پاس آئے۔ ان کا یہ دورہ اس غرض سے تھا کہ صوبہ کی حکومتوں سے یہ معلوم کریں کہ سیاسی قیدی رہائی پا لینے کے بعد پریشان تو نہیں کرتے۔ ہمارا جواب نفی میں تھا۔ ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اور بھی کہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی اس زمانہ کا وہ فائل جس میں میری اُن سے خط و کتابت درج تھی ضائع ہو گیا۔ لیکن لارڈ ولنگڈن اور ہیلی کی خط و کتابت سے مجھے حافظہ تازہ کرنے میں بہت مدد ملی۔

پولیس کا مستقبل خودمختار ہندوستان میں

چونکہ نئے آئین کی تشکیل ہو رہی تھی۔ پولیس کا مسئلہ زیر غور تھا۔ ایک طرف سے کہا جاتا تھا کہ پولیس کا انتظام اور قیام امن کا اہتمام وزراء کے سپرد ہی نہ کیا جائے۔ بلکہ مثل سابق کونسلر کے تحت رہے جو بجائے کونسل کے گورنر کو جوابدہ ہوں۔ دوسری جانب ہندوستانیوں کا متفقہ یہ خیال تھا کہ اگر صیغہ پولیس وزیروں کے سپرد نہ ہوا تو پھر صوبائی حکومت مختاری کے کوئی معنی نہ تھے۔ اس لئے پولیس کے انتظام کی ذمہ داری بالضرور وزیروں کے سپرد ہو۔ لیکن ملک کا ہر بہی خواہ چاہتا تھا کہ پولیس کا محکمہ سیاسی کھلونہ نہ بن جائے اور مقامی لیڈر اپنے حلقہ میں افسران پولیس کے انتظام میں مداخلت نہ کریں اور انہیں مرعوب کرنے کی کوشش نہ کی جا سکے۔

اس سلسلہ میں ویسرائے نے مجھے مئی کے مہینہ میں ایک خط بھیجا۔ اسی کے ساتھ وزیر ہند کے دو تاروں کی نقول بھی منسلک تھی۔ وزیر ہند نے اپنے مراسلوں میں اس پر زور دیا تھا کہ پولیس کے معاملات میں وزراء کو مداخلت سوائے خاص حالات کے نہ ہو۔ تاکہ سیاسی جماعتیں افسران پولیس کو متاثر نہ کر سکیں۔ ان کا پہلا مراسلہ ان الفاظ سے شروع ہوا تھا۔

"I am greatly concerned to secure freedom of police from interference by Ministers in matters which in this country

would be scrupulously left to the executive head of the service."

اُن کا خیال تھا کہ اگر انگلستان کی طرح یہاں بھی ایسے روایات قائم ہو جائیں کہ وزراء کی مداخلت سوائے اپیل یا میموریل کے نہ ہو تو انھیں اطمینان ہو جائے گا۔ لیکن ایسی روایات کا قائم ہونے کی امید نہ تھی چنانچہ اُن کی تجویز یہ تھی کہ ایک پولیس کمیشن ہندوستان آکر اپنی شفارسات پیش کرے۔ لارڈ ولنگڈن کو خود بھی اس تجویز سے چنداں اتفاق نہ تھا۔

میں نے روئل کمیشن کی تجویز سے اپنے خط مورخہ ۹ رمئی میں پرزور اختلاف کیا۔ میں نے اپنے خط میں اس اصول کو تسلیم کیا تھا کہ پولیس سیاسی کشمکش سے آزاد رہے۔ میرے الفاظ یہ تھے۔

"I fully realize the importance of keeping our police Force out of party politics in the future constitution of India andof maintaining the discipline and non-partisan spirit of its officers and men."

اسی مراسلہ میں آگے چل کر میں نے یہ کہا تھا کہ اس مقصد کا حصول روئل کمیشن کے ذریعہ مناسب نہیں۔ اہل ہند کے دل میں اس سے شکوک پیدا ہوں گے اور وہ یہ خیال کریں گے کہ..... کو وزراء کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتے۔ اور ہندوستان میں اس کی مخالفت عام ہوگی۔ میری تجویز یہ تھی کہ انسپکٹر جنرل کو وہی اختیارات رہیں جو اُسے اُسی زمانہ میں پولیس ایکٹ کے تحت حاصل تھے پولیس ایکٹ کو بدلنے کا حق مقامی قانون ساز جماعتوں کو نہ ہو اور ہندوستان کا پارلیمنٹ بھی اُسے گورنر جنرل کی رضامندی سے بدل سکے۔

مجھے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس پیش بینی سے کیا فائدہ اور ایسی مداخلت سے کیا نقصان ہوتا۔ مقامی سیاسی لیڈروں کی مداخلت افسران پولیس کے واسطے مصیبت اور غریب رعایا کے واسطے عذاب ہے۔

اس کے علاوہ وزئی ہند کے ذہن میں ایک اور دشواری بھی تھی۔ وہ یہ کہ پولیس کے انتظام کا مدار جاسوسوں کی اطلاعات پر ہے۔ اگر ان کے نام مخفی نہ رہے تو

پھر کسی کو خبر رسانی کی جرأت نہ ہوگی۔

اسی سال میں نے اپنے فنانس ممبر مسٹر بلنٹ کا نام K.C.i.E کے واسطے بھیجا تھا اور نواب صاحب رام پور کا نام K.C.S.i کے واسطے لیکن ستارہ ہند کے تحت فقط ایک جگہ خالی تھی اس لیے ہز ہائی نس کو یہ خطاب دوسرے سال ملا۔

اس زمانہ میں مجھے ایک تشویشناک اطلاع ملی کہ پنڈت جواہر لال جی کی والدہ سخت علیل ہیں۔ اس کی اطلاع فوراً حکومت کو دی گئی۔ پنڈت جی ابھی جیل میں تھے اور اُن کے آزاد ہونے کو ابھی بارہ روز اور باقی تھے۔ اُن کی والدہ کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ ایسا انتظار ناممکن تھا۔ بعض مشیروں کی یہ رائے تھی کہ اول گورنمنٹ آف انڈیا سے دریافت کیا جائے تب رہائی ہو۔ لیکن ہم نے فوراً رہا کرنا مناسب خیال کیا اور ۱۶ ستمبر کے خط میں ویسرائے کو اطلاع دے دی۔ ۲۸ ستمبر کو ویسرائے کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے وزیر ہند کی خواہش پر۔ دریافت کیا تھا کہ پولیس کے ملازمین کی تنخواہوں یا دوسری سہولتوں کے فراہم کرنے میں کیا قدم اٹھایا گیا۔ خط کا آخری فقرہ حسب ذیل ہے۔

"I should be glad to have any information which your Secretariat can collect without difficulty to show, if not the improvements that have been made, at least the steps which have been taken during these years of unprecedented financial difficulty to keep up the standard of police efficiency."

اس کے جواب میں میری گورنمنٹ نے ایک مفصل رپورٹ بھیجی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ باوجود مالی مشکلات کے ملازمین پولیس کے حقوق کا پورے طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

ملازمین اور خاص کر ملازمین انتظامی کے جائز حقوق کا تحفظ ہر حکومت کا فرض ہے جہاں ان کی لغزش اور خطا پر وہ مستحق سزا ہیں۔ وہاں انتظام کو ہموار رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کی تنخواہیں مناسب حال ہوں اور ان کے حقوق اور اُن کی عزت کی حفاظت کی جائے۔ ان کے کاموں میں سوائے اُن کے افسروں کے براہ راست کوئی دوسرا مداخلت نہ کرے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ پبلک اس روش کو پسند نہ کرے گی۔ لیکن میں وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ بے غرض پبلک کی ہمیشہ

یہ خواہش رہے گی کہ ملازمین سرکار قانون کے تحت آزادی سے کام کرسکیں۔ کوئی پبلک اس کے خلاف عمل کرنا چاہتی ہے تو مجھے اس کے صحت مند ہونے میں شبہ ہے۔ میں نے پولیس کے سات بجٹ پیش کیے۔ اُس زمانے میں اکثر ممبر کسی پارٹی سے متعلق نہ ہوتے تھے۔ بہ ایں ہمہ پولیس کے بجٹ میں کچھ زیادہ کمی نہیں کی گئی۔ آج سیاسی جماعتوں کے ممبروں کو پارٹی کے ''وِپ'' کی تعمیل کرنی پڑتی ہے چاہے ممبر کی ذاتی رائے کچھ بھی ہو۔ اُس زمانہ کے ممبر اس طرح پابند نہ تھے اور اس وجہ سے یہ بات قابل غور ہے۔ میرے زمانہ کے بجٹ اور کونسل کی مجوزہ کمی کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔ رائے دینے والے یہ ممبر اپنی ذاتی اثر اور خرچ سے منتخب ہوئے تھے۔ چنانچہ نہ پارٹی کے احکامات کے پابند تھے نہ حکومت کے ساتھ رائے دینے پر مجبور۔

فیصدی کمی	جتنی کمی کی	کونسل نے جس سے اتفاق کیا	مطالبہ بجٹ	سال
0-10%	15100	15256593	15271693	1927-28
0	NO cut	15737154	15737154	1928-29
0	111	16015617	16015728	1929-30
0	No cut	16483794	16483794	1930-31
0-49%	80503	16307277	16407720	1931-32
0-20%	30000	15187197	15217197	1932-33
0	No cut	15192247	15192247	1933-34

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ عام لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ملک کی پولیس اور عدالتیں بے لاگ کام کریں۔

تنویر سلمہا کی پیدائش

۹ر اگست کو تنویر سلمہا پیدا ہوئی۔ چونکہ سر مالکم ہیلی کی واپسی کی تاریخ متعین نہ تھی اس لئے میں نے لیڈی سعید کو ۱۱ر جولائی کو چھتاری روانہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ بھلا معلوم نہ ہوا کہ اگر سر مالکم جلد واپس آجائیں تو میں کسی سبب سے کچھ دن بھی گورنمنٹ ہاؤس میں مقیم رہوں مجھے اس بیٹی سے بہت محبت ہے ۱۴ر اگست کو اسے دیکھنے چھتاری گیا اور عقیقہ کی غرض سے ۴ر کو اس کی محبت نے مجھے دوبارہ چھتاری پہونچایا۔

اس موقع پر میرے دوستوں اور کرم فرما حضرات نے مبارکبادوں سے لاد دیا۔ جیسے کی گورنر کے گھر بچہ پیدا ہونا کوئی انوکھی سی بات تھی۔ لیڈی سعید ۱۳ر ستمبر کو معہ تنویر کے نینی تال واپس آ گئیں۔ اس موقع پر ایک واقعہ پیش آیا۔ میں دوبارہ چھتاری گیا تھا۔ میں نے یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس سفر کا بل میرے پاس بھیجا جائے۔ لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ میرے دورے کے حساب میں مجرا کر دیا گیا۔ میرے دریافت کرنے پر وجہ یہ بیان کی گئی کہ گورنر کا سفر سرکاری ہی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک سفر کی یہ تاویل معقول نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی تنخواہ سے یہ رقوم دورے کے حساب میں منتقل کر دیں۔

فلسطین کے گرانڈ مفتی اعظم سے ملاقات

۳ر اکتوبر کو "فلسطین کے گرانڈ مفتی" نینی تال آئے۔ میں نے انھیں لنچ پر مدعو کیا۔ ان کا مقصد فلسطین میں یونیورسٹی کے واسطے چندہ جمع کرنا تھا۔ انھیں ویسرائے نے بھی ایک عام خط دیا تھا۔ اسی نوعیت کا ایک خط ان کی خواہش پر میں نے بھی دیا۔ میں نے تین خطوط بھی دیئے۔ جن میں دو نواب سر مزمل اللہ خاں اور راجہ سر اعجاز رسول تھے تاکہ یونیورسٹی کے واسطے کچھ چندہ ہو سکے۔ برٹش گورنمنٹ کی پالیسی مفتی فلسطین کے متعلق "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کے مصداق تھی۔

ایک طرف تو بالفور کے اعلان کے سلسلہ میں برٹش پالیسی یہودیوں کی موافقت میں تھی اور گرانڈ مفتی صاحب اس پالیسی کے سخت مخالف تھے لہذا برٹش گورنمنٹ سے ان کی دوستی ناممکن۔ دوسری جانب چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بالفور کی پالیسی کے خلاف بڑا ہیجان تھا لہذا گرانڈ مفتی صاحب کی کھلی مخالفت بھی قرین مصلحت نہ تھی۔

مسلمانوں میں اس پالیسی کی سخت مخالفت تھی۔ اور بجا تھی، یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزارہا عرب مسلمانوں کو خانماں برباد کیا جائے اور یہی ہوا۔ اس پالیسی کی تائید میں جو دلیل پیش کی جاتی تھی وہ بجائے خود بے معنی تھی۔ کہا یہ جاتا تھا کہ چونکہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں یہودی اس ملک میں رہتے تھے لہذا

انھیں یہاں بسنے کا حق ہے۔ یہ دلیل نہ تھی دھاندلی تھی۔ اگر اس طرح اقوام عالم کو انھیں ممالک میں واپس کیا جائے جہاں سے وہ باہر جا کر آباد ہوئیں تھیں تو تمام عالم کو موجودہ نقشہ بدلنا پڑے گا۔ دنیا کی آبادیاں تہ وبالا ہو جائیں گی۔ زمانہ گذشتہ میں جب علم تاریخ تو در کنار انسان لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتا تھا۔ مختلف اقوام ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا کر بس جاتی تھیں۔ مثلاً ہندوستان میں ''ایرین'' آئے اور یہاں کے پرانے باشندوں کو فتح کر کے یہاں بس گئے کیا یہ قرین عقل ہے۔ کہ اُن سے کہا جائے کہ آپ پھر اپنے اصل وطن کو واپس جائیں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ زبردست اقوام ملکی۔ سیاسی یا جنگی مصالح کی پیش نظر ایک فیصلہ کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد اس فیصلہ کے جواز میں دلائل تصنیف کیے جاتے ہیں۔ دلائل کی روشنی میں فیصلہ نہیں کیا جاتا بلکہ فیصلہ پر دلائل کا طمع کیا جاتا ہے۔ دنیا میں زبردست کا یہ سلوک زبردست کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔

ولایت سے لیڈی ولنگڈن۔ سر مالکم ہیلی اور دوسرے دوستوں نے مبارکباد بھیجی۔ سر مالکم نے لکھا۔

Our very best congratulations to you on the birth of your daughter. It must be indeed a rare event for a Governor of the U.P. to be come a father.

انگلو انڈین اقلیت

اسی زمانہ میں ویسرائے کا ایک خط آیا جس میں انھوں نے انگلو انڈین جماعت کی تعلیم کی طرف مجھے متوجہ کیا تھا۔ مسٹر کیمبل روڈس نے انھیں خط لکھا تھا۔ میں صرف اپنے جواب کے دو تین فقرے نقل کرتا ہوں۔

"I will send a detailed reply to Your Excellency later on. Meanwhile I wish to assure your Excellency that I am strongly in favour of protecting the interests of Minorities and of doing every thing that is feasible and reasonable in order to afford such protection to Anglo-Indians in these Provinces."

اقلیت کے حقوق کے سلسلہ میں اس پالیسی پر دیانت کے ساتھ عمل ہوتا تھا۔

خان بہادر تصدق حسین مرحوم سی-آئی-ای

خان بہادر تصدق حسین مرحوم عجیب وغریب شخصیت کے حامل تھے۔ یہ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تھے۔ ایک سب انسپکٹر کی حیثیت سے پولیس میں داخل ہوئے اور ۳۳ء میں جب اچانک ان کا انتقال ہوا تو Central Inteligence Bureau کے ڈائرکٹر تھے۔ اُن کا زمانہ ہندوستان کی پولیس نہ بھولے گی۔ سازشوں کی سراغ رسانی میں اُن کی مہارت بے نظیر تھی۔ میرے اوپر خاص کرم فرماتے تھے۔ اگر زندگی کچھ اور وفا کرتی تو ممکن ہے۔ ڈائرکٹر ہو جاتے۔ اُن کے انتقال کے بعد ویسرائے نے مجھے خط لکھا جس میں اُن کے بیٹے ظہیر عالم کی سفارش کی تھی۔ اس خط کو اس وجہ سے نقل کرتا ہوں کہ

(۱) اس سے مرحوم کی قابلیت اور گورنمنٹ کے اعتماد کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت وقت اپنے کارآمد ملازمین کے پسماندگان کا کتنا خیال کرتی تھی (۳) اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گو ویسرائے ایک گورنر کو حکم دے سکتا تھا لیکن چونکہ یہ صوبہ کا معاملہ تھا۔ ویسرائے کو اس کی نزاکت کا پورا احترام تھا۔ رفقائے کار کو حکم دینے کے بجائے درست طریقہ یہ ہے کہ اشارتاً اس طرف متوجہ کیا جائے۔ بجائے اس کے شریک کار کو دھکا دے کر کسی طرف بھیجا جائے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ساتھ چلنا بہتر ہے۔

Confidential

The Viceroy's House,
New Delhi.
9th October, 1933

My dear Nawab Sahib,

The Intelligence Bureau of my Home Department recently suffered a severe loss by the death of Khan Bahadur Tassaduk Husain, the Assistant Director. I do not know whether you know the Khan Bahadur personally, but I can assure you that he did most excellent work, and I deeply deplore his loss. He has left nine children, and I am anxious to do what I can for them. I understand that his second son Zahir Alam is the candidate for the Deputy Collector in your Province, for which I am informed there are two vacancies at

the present time. While I do not wish to interfere in any way with your selection for the post, I should be most grateful if you would bear in mind the splendid record of work for Government which Tasadduk Hussain rendered when considering the application of his son for the post to which I have referred above.

Your sincerely,

Willingdon

ظہیر عالم کا تقرر بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ہو گیا اور مجھے مسرت ہے کہ یہ ایک لائق افسر ثابت ہوئے۔

لارڈ لیڈی ولنگڈن

اس دوران میں لارڈ ولنگڈن کو بہت ہی قریب سے مطالعہ کرنے کرانے کا موقع ملا۔ اس سے قبل کچھ روز میں اُن کی گورنمنٹ کا ممبر بھی رہا تھا۔ اب تقریباً نو ماہ تک ان کی پالیسی کے مختلف پہلو سامنے رہے۔ لارڈ ولنگڈن ایک طرف تو حکومت کے خلاف شورش کو پوری طاقت سے دبانا چاہتے تھے دوسری طرف اصلاحات جاری کرنا چاہتے تھے۔ وہ تفصیلات سے بہت بچتے تھے۔ اُن کے زمانہ میں سر مورس ہیلٹ سر ہوری ویلمس اور سر ہیری ہیگ تمام تر کام کے ذمہ دار تھے۔ لارڈ ولنگڈن سوائے عام پالیسی کے طے کرنے کے دخل نہیں دیتے تھے۔

ملاقاتوں میں بہت خلیق اور ملنسار تھے۔ ہمیشہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ ملاقاتی کو اس کا احساس نہ رہے کہ وہ ویسرائے او گورنر جنرل سے ہم کلام ہے۔ اس سے مساوات اور دوستی کی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ دوران گفتگو میں اس طرح کے جملے استعمال کرتے تھے Dear friend یا My Dear Man یہ صفات لوگوں کو اُن سے مانوس کرنے میں بہت مدد دیتی تھیں۔ اگر کسی بات سے انہیں اختلاف بھی ہوتا تو اس اختلاف کا اظہار بہت خوبصورت پیرایہ سے کرتے تھے۔ لیکن اُن کی پالیسی کا بنیادی پہلو اسی اصول پر تھا کہ حکمرانی بلا سیاست نہیں ہوتی اور اس واسطے اپنے پیش رو لارڈ اروِن کی پالیسی سے کچھ زیادہ متفق نہ تھے۔

لیڈی ولنگڈن بہت شخصیت کی حامل تھیں جو کرنا چاہتی تھیں اُسے کر کے رہتیں۔ انھیں ملکی اور سیاسی معاملات سے بھی کافی دل چسپی تھی اور بہت باخبر تھیں۔ تمام گورنمنٹ ہاؤس پر چھائی ہوئی تھیں۔ دہلی میں ان کے اختیار کی مشہور تھیں۔ اس زمانہ میں دہلی میں یہ فقرہ مشہور تھا Lady Willingdon ان کی مہمان نوازی قابل اور لائق تقلید تھی۔ مجھے کئی بار اُن کے مہمان ہونے کی مسرت حاصل ہوئی۔ مہمان کی راحت رسانی میں وہ کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتی تھیں خود ہر چیز ملاحظہ کرتی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایسی تفصیلات کی ذاتی نگرانی بھی کرتی تھیں۔ مثلاً آتش خانہ روشن ہے یا نہیں، غسل خانہ میں نہانے کا نمک ہے یا نہیں۔ پھر صبح کو مہمان ناشتہ کس وقت کرنے کا عادی ہے شب میں مہمان کو نیند کیسی آئی۔ لارڈ ولنگڈن خود کہا کرتے تھے کے دل میں ترقی کی خواہش اُن کی بیوی نے پیدا کی ورنہ وہ خاموش بسر کرتے۔

سر مالکم ہیلی کی خط و کتابت کے مطالعہ سے کچھ اور واقعات یاد آگئے۔

اُسی زمانہ میں ''الگن مل'' اور ''وکٹوریا مل'' میں اسٹرائک ہوا۔ محرم قریب تھا اور میں اس تردد میں کہ کہیں یہ ہڑتال محرم کے زمانے میں کچھ اور رنگ نہ لائے میں نے سر جے پی سریواستو سے خواہش کی کہ وہ کان پور جا کر اس قصہ کو طے کریں، ادھر میں نے مسٹر موڈی کو جو اس زمانہ میں کلکٹر کان پور تھے (پھر گورنر سندھ اور پاکستان میں پنجاب کے گورنر ہوئے) ہدایت کی برٹش مالکان فیکٹری سے مل کر کوشش کریں کہ یہ ہڑتال جلد ختم ہو جائے۔ مزدوروں کی یہ خواہش تھی کہ وہ میرے پاس ڈیپوٹیشن لائیں لیکن میں نے اس سے گریز مناسب سمجھا اور سر جے۔ پی سریواستو کو کان پور بھیجا۔ میرا خیال یہ تھا کہ اگر شروع ہی سے گورنر کی مداخلت ہو گی تو پھر من سمجھوتہ نہ ہو پائے گا اور صنعتی ترقی کے واسطے خاص کر ہندوستان میں جہاں ابھی ابتدائی منازل طے ہو رہے ہیں یہ بہت ضروری ہے کہ سرمایہ دار اور مزدور میں کامل تعاون ہو۔ میں نے سر جے۔ پی سری واستو پر بہت زور دیا کہ جس طرح بھی ہو اپنی مل کی ہڑتال کو ختم کرادیں اور برٹش مالکان فیکٹری پر مسٹر موڈی کے ذریعہ سے زور ڈالا گیا۔ یہ ہڑتال جلد ہی ختم ہو گئی۔

میری اب بھی یہ رائے ہے کہ ایسے معاملات میں حکومت کی مداخلت بالکل آخری چیز ہونی چاہیے ورنہ لوگوں کی امیدیں بڑھ جاتی ہیں۔ ہر فریق اپنے مطالبہ پر اڑتا ہے اور دشواریاں کچھ بڑھ ہی جاتی ہیں پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جب معاملہ حکومت کے سامنے پیش کرنا ہے تو زیادہ سے زیادہ کیوں نہ مطالبہ پیش کیا جائے۔ جب دونوں جانب سے یہ صورت ہو تو کاربراری ناممکن نہیں تو بڑی حد تک دشوار اور ناقابل اطمینان ہو جاتی ہے البتہ جب کوئی اور طریقہ کارگر نہ ہو پھر حکومت آخری فیصلہ کر سکتی ہے۔

مہاتما جی کا روزہ

مئی کے مہینہ میں مہاتما جی نے روزہ رکھا۔ افطار کب ہوگا اس کی کوئی تاریخ نہ تھی۔ گو اس روزہ کا سبب یو۔ پی کی حکومت کا کوئی فعل نہ تھا لیکن مجھے اس کی بڑی تشویش تھی کہ خدانخواستہ روزہ کا انجام بخیر نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ اس روزہ کے خاتمہ کی خبر میں نے بڑی مسرت سے سنی۔ مہاتما جی کے ہر فعل یا ترک فعل کا اثر ملک پر بڑی تیزی اور موثر انداز سے ہوتا ہے۔ ہم سب جتنے خلوص اور اعتماد سے مہاتما جی کے اصولوں کا احترام اور اس کی پیروی انگریزی ہند میں کرتے تھے اب نہیں کرتے۔ یہ بات تعجب کی اتنی نہیں ہے جتنی افسوس کی۔ مگر انسانی فطرت کا یہ خاصہ بھی ہے کہ معالج کے احکام کی پابندی جس تندہی سے بیماری میں کی جاتی ہے صحت میں نہیں کی جاتی۔ یہ مثال یہاں پورے طور پر صادق نہیں آتی لیکن انسانی فطرت کا میلان وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔

مقابلہ کے امتحان کا ایک لطیفہ

اس سال یو۔ پی سول سروس کے مقابلہ کا امتحان ہوا۔ حکومت کی طرف سے یہ اعلان حسب سابق کیا گیا کہ دو ہند اور ایک مسلمان لیا جائے گا۔ لیکن جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو حسب ذیل فہرست سامنے آئی۔

1.	Riazul Hasan:	Marks 809 (out of 1200)		
2.	Musarrat Hussain:	,,	787	,,
3.	Jagat Narain Raina:	,,	754	,,
4.	Chatur Bihari Lal Dube:	,,	748	,,

صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد یو۔ پی گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ ا۔۳۔۴ کو لیا جائے اور۔ نمبر ۲ کو قدرتاً اس سے مایوسی ہوئی۔ نمبر ۲ مسرت حسین نے ایک خط اپنے پرنسپل مسٹر ہولینڈ کو لکھا جو آگرہ کالج کے پرنسپل تھے اور اُس زمانے میں ولایت گئے ہوئے تھے۔ مسٹر ہولینڈ نے اس لڑکے کا خط معہ اپنی سفارش کے سر مالکم ہیلی کو بھیجا اور اس طرح یہ خط میرے پاس پہونچا۔ سر مالکم نے اس طرف توجہ دلائی کہ اگر ممکن ہو تو اس لڑکے کو آئندہ کے لیے نامزد کرلیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

خطابات

انسانی نظر میں چیزوں کی قدر و قیمت بدلتی رہتی ہے۔ برٹش حکومت میں خطابات کی بڑی قدر تھی اب ان کی کوئی وقعت نہیں۔

میں نے ۱۷ رجون کے خط میں سر مالکم ہیلی سے سفارش کی تھی کہ ہز ہائی نس بنارس کو ملنے سے ہز ہائی نس رام پور گلہ مند ہیں۔ چونکہ میری سفارش رام پور کے متعلق کامیاب نہیں ہوئی۔ میں نے خواہش کی کہ سر مالکم واپسی پر پھر اس کی تحریک کریں۔ اس طرح میں نے جے پی سریواستو کے متعلق لکھا کہ انھیں کے۔ ٹی نہیں ملا "لیڈر" اخبار نے ایک نوٹ بھی لکھا کہ ان کے ماتحت مسٹر کمنزی کو ملا لیکن انھیں نہیں ملا۔ جس کو جے۔ پی سریواستو محسوس کرتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں خطابات کی روایات قائم رکھنا چاہیے۔ ایمان داری اور جانفشانی سے کام کرنا ہر شخص کا فرض ہے لیکن انسانوں کی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو فرض کا پورا کر دینا ہی اپنا انعام سمجھتے ہوں اور کسی نہ کسی امتیاز کے خواہشمند نہ ہوں۔

بنارس یونیورسٹی

جن دنوں ویسرائے میرے ہاں مہمان تھے۔ منجملہ دوسری باتوں کے وہ کہنے لگے کہ اُن کے پاس اس کی شکایت پہونچی تھی کہ بنارس میں یونیورسٹی کے طلباء میں ڈسپلن نہیں ہے اور وہ بغیر کسی روک ٹوک کے شہر آ کر نامناسب صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یا تو کوئی کمیشن مقرر کیا جائے یا مقررہ سرکاری امداد پر نظرثانی کی جائے۔ میں نے کہا کہ جب کوئی بڑا اقدام اٹھایا جائے اور سنگین تدابیر اختیار کرنا

مقصود ہو تو پھر کیس کو پورے طور پر مضبوط ہونا چاہئے۔ میں کچھ ایسا خیال کرتا ہوں کہ اول تمام واقعات کی جانچ ضروری ہے۔ اس کے بعد کوئی رائے قائم کی جائے۔

....

۷۸۶

اس زمانے میں کانپور میں یہ سوال اٹھا کہ گورنمنٹ کے علاوہ جو ممانعت کی گئی ہے کہ کان پور میں کوئی ہتھیار لے کر نہ نکلے تو اس میں کرپان بھی شامل ہے یا نہیں۔ ایک طرف سکھ صاحبان کہتے تھے کہ سکھ کو ہر وقت کرپان مذہباً رکھنا چاہئے اور ہر تلوار کو چاہے وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو کرپان قرار دیتے تھے۔ دوسرے لوگوں کا بجا طور پر یہ اعتراض تھا کہ جب ایک فرقہ ہتھیار لے کر پھر سکتا ہے تو دوسرے کو منع کرنا قرین انصاف نہیں۔ آج تو ہمارے سکھ بھائی بغیر تلوار کے ہر جگہ نظر آتے ہیں مگر اس زمانے میں اس پر بہت اصرار تھا۔ میں نے پنجاب گورنمنٹ سے دریافت حال کیا اور ایک دوسرا اعلان جاری کیا کہ سکھ کرپان رکھ سکتے ہیں جس کا سائز نو انچ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس طرح یہ قصہ طے ہوا۔ میرے خیال میں تلوار اور برچھے پر لائسنس کی ضرورت ہی نہیں ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے ان ہتھیاسے لائسنس کی قید ہٹالی گئی تھی۔ البتہ بندوق اور پستول پر اس طرح کی قید ضروری ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بارود والے ہتھیاروں کی اجازت دینے میں غیر محتاط ہونا خطرے سے خالی نہیں۔

ایک دوسرے قصہ کی طرف ہندو مہا سبھا نے توجہ دلائی۔ بریلی میں پولیس کی پریڈ تھی۔ ایک تھانیدار تلک اور قشقہ لگا کر پریڈ پر آئے۔ مسٹر چیپ مین سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انھوں نے قشقہ چھڑانے پر اصرار کیا۔ اس پر تھانیدار نے استعفیٰ بھیجدیا اور ایس۔ پی نے منظور کر لیا مجھے اس کا علم ہوا تو گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ اگر تھانیدار راضی ہو تو اس کا دوبارہ تقرر کیا جا سکتا ہے۔ گورنمنٹ نے انسپکٹر جنرل سے بھی کہا کہ یہ ایس۔ پی کی غلطی تھی۔ دراصل ہر دو جانب غلطی کی گئی تھی۔ تھانیدار کو ایک نئی بات کرنا جو اس سے پہلے نہ اس نے کی تھی نہ کسی اور نے کی خود ایک چھیڑ تھی۔ وہ باوردی ایک پریڈ کے میدان میں تھا جہاں نہ کوئی برادری کا اجتماع تھا نہ کوئی قومی مذہبی تقریب پھر ایس۔ پی کا اس پر توجہ دینا اُس کی تدبیر کی کمی بلکہ فقدان کی دلیل ہے۔ بہر حال یہ

قصہ آسانی سے ختم ہو گیا۔ لیکن اس میں فتنہ پیدا ہونے کا امکان تھا۔

کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ کے تعلقات

گورنمنٹ ہاؤس میں حسب معمول کمشنروں کی کانفرنس ہوئی۔ اُس میں اکثر کمشنروں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اکثر اضلاع میں کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے باہمی تعلقات اتنے ہموار اور خوشگوار نہیں ہیں جتنے کہ ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے یہ صورت حال انتظام ضلع کے حق میں مضرت سے خالی نہ تھی کلکٹر اور ایس۔ پی دونوں ضلع کے امن چین کے ذمہ دار ہیں۔ اگر خود ان میں اتحاد عمل نہیں تو ضلع کے امن و امان پر اس کا بُرا اثر لازمی ہے۔ ان کے تعلقات میں نزاکت کی وجہ یہ بھی ہے کہ سرکاری طور پر اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں۔ ایس۔ پی کلکٹر کا ماتحت نہیں ہے جس طرح ڈپٹی کلکٹر ماتحت ہیں وہ ضلع کے امن و امان کے قیام میں کلکٹر کا شریک کار اور دست راست ہے۔ ان کے تعلقات چھوٹے اور بڑے بھائی یا جونیر اور سینیر حصہ دار جیسے ہونے چاہئیں اور یہی وجہ دشواری ہے۔ افسر و ماتحت کے تعلقات کی تفصیل و تصریح آسان ہے لیکن حصہ داری کے تعلقات کے تصریح مشکل ہے۔ بہرحال میں متفکر تھا کہ ایک واقعہ میرے سامنے آیا۔

ضلع سہارن پور میں ایک شخص کا چالان ناجائز ہتھیار رکھنے کے سلسلہ میں کیا گیا۔ جس ڈپٹی کلکٹر کی عدالت میں یہ پیش ہوا اُس نے اس مقدمہ کو ایک آنریری مجسٹریٹ کے سپرد کیا۔ آنریری مجسٹریٹ نے بہت کم سزا دی یہ مسئلہ ہوم ممبر کی حیثیت سے میرے سامنے آیا۔ سزا کا کم و بیش ہونا تو عدالت کا ایسا فعل ہے جس پر نہ حکومت جواب طلب کر سکتی تھی نہ کرنا چاہئے۔ لیکن میں نے فائل پر یہ لکھا کہ تنخواہ یاب ملازم مجسٹریٹ کی یہ غلطی تھی کہ اس نے اس مقدمہ کو ایک آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں منتقل کیا۔ کمشنر نے مجسٹریٹ سے پوچھا اور یہ بھی دریافت کیا کہ پولیس کے انسپکٹر نے جو مقدمہ کا ذمہ دار تھا اس پر احتجاج کیوں نہیں کیا کہ ایسا اہم مقدمہ ایک آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں نہ جائے۔ کلکٹر ضلع نے اس خط کی نقل ایس۔ پی کو روانہ کی۔

ایس۔پی نے ایک سخت خط لکھا کہ اگر ڈپٹی کلکٹر کی غلطی ہے تو کورٹ انسپکٹر سے کیوں جواب طلب کیا جاتا ہے کمشنر نے یہ خط و کتابت گورنمنٹ کو بھیجی۔ کیبنٹ میں ہوم ممبر اور فنانس ممبر دونوں نے اتفاق کیا کہ ایسی صورت حال بہت غلط ہے۔ گورنمنٹ نے کمشنر اور کلکٹر کی تائید کی اور انسپکٹر جنرل کو بھی مطلع کیا تا کہ وہ اپنے پولیس کپتانوں کو اس سے مطلع کر دے۔ چنانچہ مسٹر فیلڈ ایس۔پی نے اپنی غلطی کا اعتراف ایک خط میں کیا۔

ٹینس ٹورنامنٹ

میں ہمیشہ نینی تال کے ٹینس ٹورنامنٹ میں شامل ہوا کرتا تھا۔ اس سال بھی میرا دل چاہا کہ حسب عادت شریک ہوں لیکن یہ ذرا سی بات بھی فسانہ بن گئی۔ بعض لوگوں کو اس سے اختلاف تھا۔ جن میں میرے فنانس ممبر سر ایڈورڈ بلنٹ شامل تھے۔ اُن کے نزدیک گورنر کے لیے یہ مناسب نہ تھا۔ ہوم ممبر سر جگدیش پرشاد اور جنرل میکملن (انچارج ایسٹ کمانڈ) کہتے تھے کہ ضرور کھیلنا چاہئے۔ چونکہ خود میرا دل بھی یہی چاہتا تھا۔ لہذا میں کھیلا۔ میرا ساتھی راجہ صاحب پیلی بھیت کے بھائی منو تھے۔ یہ بہت اچھا کھیلتے تھے۔ فائنل میچ ہمارا احمد حسین اور اسلام احمد صاحبان کے خلاف ہوا۔ ہم لوگ ۶۔۴ اور ۶۔۴ کے اسکور سے جیتے۔

سر مالکم ہیلی کے خط سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اگست کے آخر تک واپس ہوں گے۔ میں نے گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن ۳ر اگست کا اُن کا خط آیا جس میں انھوں نے لکھا کہ بادل ناخواستہ انھوں نے وزیر ہند کی اس خواہش کو منظور کر لیا اور وہ اکتوبر تک نہ آسکیں گے۔ اس خط میں سر مالکم ہیلی نے حسب ذیل عبارت لکھی۔

"I am staying on, however, with less reluctance, because I am quite sure, (if you will allow me to say so) that the Province is quite safe in your hands and all have every confindence in your judgement."

برساتی دورہ

میں ۲۵ر جولائی کو برساتی دورہ پر نکلا۔ یہ ایک بہت ہی مختصر دورہ تھا۔ بریلی

ہوتا ہوا ایٹہ مظفر نگر اور علی گڑھ گیا۔ دورے کا پروگرام اپنی یکسانیت کے لحاظ سے بے مثل ہوتا ہے یعنی اب تک وہی یکسانیت ہے۔ لیکن ہے یہ ضروری چیز۔ مختلف حضرات سے ملنا۔ اُن کی زبان سے ان کے خیالات ضروریات اور تکالیف کا التفات اور ہمدردی سے سننا یقیناً مفید ہے۔ لوگ ملاقاتیوں میں بعض باتیں مجھ سے اتنی صفائی سے بیان کر دیتے تھے کہ اُن کا یہ اعتماد کبھی کبھی میرے واسطے خلجان کا باعث بن جاتا۔ میرا عمر بھر کا یہ اصول رہا ہے کہ اگر کوئی بات راز داری کے طور پر مجھ سے کہی جائے تو میں اس راز کو کبھی آشکار نہ کروں گا۔ ذاتی معاملات میں مجھے اس سے کچھ پریشانی نہیں ہوتی۔ ایسی اکثر مثالیں ہیں کہ لوگوں نے میرے ہاں غبن کیا اور اقرار جرم کی تحریر مجھے دیدی یا زبانی اقرار کر لیا۔ مثلاً اسی زمانہ میں ایک غبن کا مقدمہ میرے کوٹھاری مسمی بہاری کے خلاف چل رہا ہے۔ اُس نے میرے اور لالہ کامتا پرشاد کے سامنے سولہ ہزار کے غبن کا اقرار کیا۔ لیکن میں نے لالہ کامتا پرشاد کو جو اسی مقدمہ میں بحیثیت مختار عام مدعی ہیں۔ اس کی اجازت نہیں دی کہ اس اقرار سے کوئی نفع اٹھایا جائے لیکن سرکاری معاملات میں ایسا اقرار میرے ضمیر میں کش مکش پیدا کرتا تھا۔ اور ایسے مواقع میرے لیے سخت آزمائش کے ہوتے تھے۔

ایٹہ

۲۶ر جولائی کو میں ایٹہ گیا اور راجہ صاحب اواگڈ کی کوٹھی میں مقیم ہوا۔ حسب دستور ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ اور ریفیورم لیگ نے ایڈریس دئے۔ ان کے جواب دئے۔ لنچ ایٹ ہوم اور ڈنر ہوا دوسرے روز مسٹر سیلٹر کو مرغیوں اور بکریوں کا فارم دیکھا۔ بہت اچھی مرغیاں اور بکریاں تھیں یہاں خواتین کے ایک کلب کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔

مظفر نگر

۲۸ر جولائی۔ ایٹہ سے مظفر نگر پہونچا۔ وہی ایڈریس اور ملاقاتیں۔ مظفر نگر میں مختلف اداروں کو بھی دیکھا۔ مثلاً سعادت بورڈنگ ہاؤس۔ لالہ بھلا رام کا شفاخانہ۔ سناتن دھرم ہوسٹل کا افتتاح کیا زمیندار ایسوسی ایشن نے ایک ایٹ ہوم دیا۔

علی گڑھ

۲۹ رجولائی۔ یوں تو میرے دورے میں عوام کا مجمع ہر جگہ بڑی کثرت سے ہوتا ہے تھا لیکن علی گڑھ میرا گھر تھا۔ یہاں مجمع بہت ہی زیادہ تھا۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں مرحوم و مغفور نے اس پر اصرار فرمایا کہ میں مزمل منزل میں اُن کے پاس قیام کروں۔ میں نے اس وجہ سے کہ میرا گھر بھی موجود تھا معذرت چاہی۔ مگر نواب صاحب مرحوم کے بزرگانہ اصرار پر میرا قیام مزمل منزل ہی میں ہوا۔ کریس ویٹ ہال میں ڈسٹرکٹ بورڈ میونسپل بورڈ سولجرس بورڈ، زمیندار ایسوسی ایشن کے ایڈریس پیش ہوئے۔ شام کو زمیندار اور شہر کے دوسرے عمائدین کی جانب سے ایٹ ہوم ہوا۔ شب کو خان بہادر عبید الرحمٰن خاں صاحب کے گھر ڈنر تھا۔

۳۰ رجولائی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے اپنے چچا نواب بہادر عبد الصمد خاں مرحوم و مغفور کے سلام کی غرض سے طالب نگر گیا۔ میرے چچا یہیں رہتے تھے۔ یہ اُس زمانے میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ جیسا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ میرا بچپن ان کی گود میں گذرا۔ انھیں مجھ سے اور مجھے ان سے بڑا اُنس تھا۔ میں قدم بوس ہوا تو وہ آبدیدہ ہو گئے پھر اپنی چچی صاحبہ کے سلام کو حاضر ہوا۔ اب نہ وہ زندہ ہیں اور نہ طالب نگر ہی وہ طالب نگر ہے لیکن ان کی یاد اس طرح تازہ ہے جیسے گردش روزگار نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

شام کو چھتاری گیا۔ وہاں راؤ اصغر علی خاں مرحوم نے "ایٹ ہوم" دیا تھا۔ تمام چھتاری کے معززین اور ملازمین مدعو تھے۔ آج جب یہ لکھ رہا ہوں راؤ اصغر علی خاں بھی جنت کو سدھار چکے ہیں۔ مگر ناشکری ہوگی اگر اس کا اعتراف نہ کروں کہ ایسے مخلص اور باوضع لوگ شاید میرے لیے مفقود ہیں۔ میرے ساتھ جیسی پر خلوص دوستی تادم آخر مرحوم نے نبھائی اُس کی مثالیں کم پائی جاتی ہیں۔

شام کو نواب سر مزمل اللہ خاں نے ایک بڑا پر تکلف ڈنر دیا۔ جس کے بعد میں اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ۳۱ رجولائی کو نینی تال پہونچا۔

سر شاہ سلیمان مرحوم

اسی سال ستمبر کے مہینہ میں سر شاہ سر سلیمان مرحوم گورنمنٹ ہاؤس میں میرے مہمان ہوئے۔ یہ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ مجھ پر بڑا کرم فرماتے تھے۔ عجیب کردار۔ صفات اور قابلیت کا اجتماع اُن کی ذات میں پایا جاتا تھا۔ اپنے زمانے کے ہندوستان کے ممتاز ترین شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ میں نے اپنی عمر میں اس درجہ ہمہ جہت قابلیت کسی ایک شخص میں نہیں پائی۔ قانون کے میدان میں ان کی فضیلت محتاج بیان نہیں۔ بارسے اُٹھ کر چیف جسٹس ہوئے۔ اس کے بعد دہلی سپریم کورٹ کے جج ہوئے۔ ریاضی میں مرحوم نے ایک مقالہ لکھا تھا جو عرصہ تک دنیا کے ماہرین ریاضی کے زیر بحث رہا۔ کچھ عرصہ کے لیے اپنے سرکاری فرائض کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری بھی اعزازی طور پر قبول کر لی تھی۔ ہر ہفتہ دو روز کو دہلی سے اپنے خرچ سے آتے تھے۔ وکٹوریہ گیٹ کے اوپر کمرے میں ٹھہرتے اور دار العلوم کی خدمت انجام دیتے۔ دار العلوم کی خدمت کیسی انجام دی اس کے جواب میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اُن کے زمانے میں علی گڑھ کے طلباء نے مقابلہ کے امتحانوں میں جس قدر کامیابی حاصل کی اس قدر نہ اس سے پہلے حاصل کی گئی اور نہ اُن کے زمانے کے بعد حاصل ہو سکی۔

۱۵/ اکتوبر کو علی الصباح میں نینی تال سے ''موہن'' ڈاک بنگلہ کے لیے روانہ ہوا۔ میجر جم کاربٹ ساتھ تھے۔ یہ بنگلہ جنگلات کا بنگلہ تھا اور میجر کاربٹ نے میرے واسطے شکار کا انتظام یہیں کیا تھا۔ میں اس شکار کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ میجر کاربٹ نینی تال میں بڑی جائداد کے مالک تھے۔ بہت ہی نیک منکسر مزاج شخص ہیں اب ہندوستان کو چھوڑ کینیا (افریقہ) میں آباد ہیں۔ کبھی اپنے شکار کے حیرت انگیز کارنامے خود بیان نہیں کرتے اسی شکار میں میجر کاربٹ نے ایک شیرنی کو جو بولتی ہوئی پہاڑ کی طرف جارہی تھی۔ میری موجودگی میں شیر کی آواز اپنے گلے سے نکال کر اُسے واپس بلا لیا۔ میجر کاربٹ فقط مردم خور شیروں کو مارتے تھے۔ ورنہ سنیما کے فوٹو لیا کرتے تھے۔ انھیں جانوروں کی حفاظت کا بڑا شوق تھا۔ ان کی رائے سے اکثر قوانین

جانوروں کی تحفظ نسل کے واسطے بنائے گئے۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ بندوق بہت اچھی چلاتے تھے۔ اسی شکار میں انھوں نے مجھے ایک قصہ سنایا۔

کمایوں میں ایک شیر مردم خور ہو گیا۔ یہ اُس کی تلاش میں نکلے۔ لیکن باوجود کئی شیر مارے جانے کے یہ موذی بچ جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک روز وہ ان کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ایک خشک پہاڑی نالہ سے اُتر رہے تھے۔ رائفل پاس تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ چند گز کے فاصلہ پر ایک شیر داؤ کرتا ہوا آرہا ہے۔ جوں ہی انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ شیر رُک گیا۔ وہ اس کا منتظر تھا کہ اُن کی نگاہ کسی طرف کو پھرے اور وہ جست کرے میجر کاربٹ نے آہستہ آہستہ بندوق کاندھے سے ہٹا کر نشانہ لگایا۔ یہ شیر جس طرح بیٹھا تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ اُن کی خوش نصیبی تھی کہ آہٹ پا کر وہ پلٹ پڑے اور شیر کے مقابل ہو گئے۔ یہ شیر کی عادت ہے کہ وہ ایسی صورت میں رک جاتا ہے۔ انھیں گولی چلانے کا موقع مل گیا۔ اگر دو تین سیکنڈ یہ متوجہ نہ ہوتے تو شکاری خود شکار ہو جاتا۔

بارش کی وجہ سے شکار کچھ اچھا نہ ہوا، کوئی شیر نہ ملا، البتہ مور، مرغ چیتل، کالا کانکڑ کا شکار خاصہ اچھا ہوا۔

۲۴ راکتوبر کو میں رام نگر کے اسٹیشن سے سوار ہوا۔ مجھے جنگل چھوڑنے کا ہمیشہ افسوس ہوتا ہے۔ پچیس (۲۵) کو لکھنو پہونچا۔

آگرہ یونیورسٹی

آگرہ یونیورسٹی کا ۴ رنومبر کو کانووکیشن تھا اور وائس چانسلر صاحب کی یہ خواہش تھی کہ میں بحیثیت چانسلر اس کی صدارت کروں اور یونیورسٹی کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھوں۔ میں ۴ رنومبر کو آگرہ گیا۔

کانووکیشن ایڈریس وائس چانسلر صاحب نے خود دیا تھا۔ میں نے چند جملے غیر سرکاری طور پر کہے تھے۔ وہ سماں میری آنکھوں میں آج تک محفوظ ہے اور وہ جذبات میری یاد میں اب تک تازہ ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا کتنا بڑا اور کیسا جیتا جاگتا مجمع میرے سامنے تھا۔ اُن سے میری کیا توقعات تھیں اور اس موقع پر میرے

کیا تاثرات تھے۔ میری تقریر کے ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ گذشتہ بیس سال میں وہ امیدیں پوری ہوسکیں یا نہیں۔ اس کا جواب ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کی ہندوستان کی تاریخ دے گی۔ صرف اتنا کہہ دینا میرے لیے کافی ہے کہ مستقبل کے متعلق وہ پرجوش امنگیں کہ جو اس روز میرے قلب میں موجزن تھیں آج نہیں پاتا۔

Finally, I should like to say a few words to those on whom a degree has been conferred this after-noon. What I wish to impress upon you is that we of the older generation look upon you to fulfill our hopes and expectations and to achieve success where we have failed. Please do not think that today's function is the end. No, it is really the beginning of your career. You have vast opportunities before you of serving your motherland; you are destined to play a great part in future India, an India which I hope will be one day be mistress of her own destinies. Your vice-chancellor has spoken many words of advice to you in regard to your future, I do not wish to inflict any more advice on you. But I have a confession to make - a confession on behalf of the old generation, namely, that we have failed to destroy the communal poison and we look upon you to do so. will you? To those whose hearts say "Yes" to my question I would say this -you can destroy it not by what you preach but by your action. Treat every Indian as a brother Indian, irrespective of his caste, creed or religion. Select your friends on their personal merits and not because they happen to belong to particular religion. Do this, and I feel sure that you will succeed in creating a untied nation of Indian people.

میں نے اسی روز یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس تقریر میں میں نے مسٹر کینن ڈیوس اور مسٹر چلوا تجھانی کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ان حضرات نے معقول رقمیں یونیورسٹی کو دی تھیں۔

مسٹر کینن ڈیوس نے تو عمر کا بڑا حصہ آگرہ کی نذر کیا۔ یہ آگرہ کالج کے پرنسپل تھے اور جب یونیورسٹی بنی تو اس کے پہلے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ اپنی عمر بھر کے اندوختہ کا ایک حصہ یونیورسٹی کی نذر کر دیا۔ ایسے ایثار کی مثالیں بہت کم یاب ہیں۔

الہ آباد

میں آگرہ سے الہ آباد گیا اور ایک ہفتہ تک مقیم رہا۔ سر تیج بہادر سپرو نے بہت بڑے پیمانے پر "ایٹ ہوم" دیا اور دوران ملاقات میں بہت سی ایسی باتیں کہیں جس سے میری ہمت افزائی ہوئی۔ مجھے سر تیج سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ بڑی اعلیٰ سیرت اور بلند کردار کے حامل تھے۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں مگر اس صوبہ میں ان کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا وہ پُر نہ ہو سکا۔ زمیندار ایسوسی ایشن الہ آباد نے ایک ایڈریس اور "ایٹ ہوم" دیا۔ میں نے گورنمنٹ ہاؤس میں ڈنر اور لنچ دیے۔ ایک مختصر دربار بھی منعقد کیا گیا جس میں ان لوگوں کو تمغے دیے گئے تھے۔ اس کے بعد ایک "ایٹ ہوم" ہوا۔

دارالعلوم علی گڑھ کی طرف سے سرفرازی

سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے مجھے لکھا کہ دارالعلوم کے ارباب حل وعقد نے یہ طے کیا ہے کہ مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا جائے۔

میں ۱۴ر نومبر کو علی گڑھ آیا۔ مجھے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ جس دارالعلوم کے آغوش میں میری ذہنی، دماغی اور جسمانی نشوونما ہوئی۔ جس کی چہار دیواری میں میرا پر مسرت زمانہ، میرا لڑکپن گزرا، جہاں کی زمین کا ہر ہر گوشہ، درخت، در و دیوار میرے دل میں کسی نہ کسی دل چسپ واقعہ کی یاد تازہ کرتے تھے اُس دارالعلوم کی طرف سے سرفرازی میرے واسطے کس قدر باعث فخر و مسرت تھی۔

یہاں کا پروگرام بالکل وہی تھا جو ہر ایسے موقع پر ہوتا ہے۔ اسٹیشن پر استقبال جس میں دارالعلوم کے ارباب حل وعقد کے علاوہ حکام اور روساء علی گڑھ بھی شریک تھے۔ میرا قیام اس بار وائس چانسلر کے ہاں تھا اور میرا اسٹاف شاید راحت منزل میں ٹھہرا تھا۔

اسپیشل کانووکیشن کا پروگرام بھی حسب دستور تھا۔ کتب خانہ میں اجتماع پھر اسٹریچی ہال تک جلوس پھر کانووکیشن۔ میرے لئے وہ دن بڑی خوشی کا روز تھا۔ اپنے دارالعلوم سے اعزازی ڈگری "ڈاکٹر آف لاء" کا پانا بڑی سرفرازی تھی۔ لڑکوں میں غیر معمولی جوش تھا جس کا اظہار سہ پہر کے "ایٹ ہوم" میں بہت ہی واضح طور پر ہوا۔

کانووکیشن میں تو پابندی رسوم وقواعد ایک حد تک مانع تھی لیکن "ایٹ ہوم" دوسری چیز ہے۔ جوں ہی میں چائے نوشی کے بعد مہمانوں سے ملنے کے واسطے آگے بڑھا۔ طلباء نے بڑھ کر گھیر لیا۔ میرا اے۔ ڈی۔ سی اور اسٹاف مجھ سے الگ ہو گیا۔ کیسی شادمانی اور کیسی محبت طلباء کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ میں نے پندرہ ہزار روپیہ کا حقیر مگر پر خلوص پیش کش دارالعلوم کو پیش کیا۔

شب کو میرے چچازاد بھائی خاں بہادر عبدالجلیل خاں صاحب نے ایک پر تکلف اور شاندار دعوت کی۔ ڈنر کے بعد میں سلون میں سوار ہو گیا۔

میرے تاثرات

علی گڑھ دارالعلوم میں آنا کسی اور جگہ جانے سے بالکل مختلف تھا۔ اُن تاثرات کا اتنے برس بعد لکھنا مشکل ہے۔ مگر میری تقریر کے چند فقرات میرے اُن محسوسات کی تھوڑی بہت ترجمانی کر سکتے ہیں۔

Those who have known the feelings of a son being welcomed back home can best appreciate my sentiments today at the reception that has been accorded to me by my Alma Matre. Today I am allowed to live again the years gone by when I was like many of you, a boy, without the prefix "Old" ; when I was as you are now, a care-free happy son of this Institution. My memory is crowded canvas, full of pictures of pleasant associations, of staurich and loyal friendships, of happy gatherings in this very hall, and of impressive and awe-inspiring occasions like the annual examinations.

سر مالکم ہیلی کی واپسی

میں لکھنؤ آ گیا۔ خیال یہ تھا کہ سر مالکم ہیلی غالباً وسط نومبر تک آ جائیں گے لیکن راستہ میں دھولپور یا کسی اور ریاست میں کچھ روز کو ٹھہر گئے۔ ۲۷ نومبر اُن کے آنے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اُسی زمانے میں سالانہ گھوڑ دوڑ کا ہفتہ بھی آ گیا۔ میرے یہاں بہت سے مہمان مدعو تھے۔ گھوڑ دوڑ ہفتہ کی چہل پہل شروع ہو گئی۔ ایک روز مقرر تھا جب گورنر سرکاری طور پر گھوڑ دوڑ میں جاتے تھے۔ چوکڑی میں گورنر ہوتے

تھے اُن کے گرد و پیش فوجی رسالہ کے سوار ہوتے تھے۔ اس طرح گھوڑ دوڑ کے میدان میں گورنر پہونچتا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مجھے گھوڑ دوڑ سے کبھی دل چسپی نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ لوگوں سے مل کر واپس آ گیا۔

۲۷ رنومبر کو سر مالکم ہیلی آ گئے، میں نے شام کو چارج دیا۔ شب میں انھوں نے مجھے ایک ڈنر دیا جس میں تقریباً ساٹھ پینسٹھ آدمی تھے میرا جام صحت تجویز کرتے ہوئے بہت اچھے الفاظ میرے اور میرے انتظام کے متعلق استعمال کئے جن کا میں نے مناسب الفاظ میں جواب دیا۔

دوسرے روز میں ایک شب کے لیے سر جگدیش پرشاد کے گھر چلا آیا جس کی صبح کو میں چھتاری کے لیے روانہ ہو گیا۔ سر مالکم نے اسٹیشن پر خاص اہتمام کیا تھا۔ وہ معہ لیڈی مالکم ممبران گورنمنٹ۔ سکریٹریز اور نظماء (ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ) کے اسٹیشن پر موجود تھے۔ علاوہ اس کے بہت بڑی تعداد غیر سرکاری حضرات کی اسٹیشن پر موجود تھی۔ نو بجے سب سے رخصت ہو کر میں سلون میں سوار ہو گیا۔ چھتاری پہونچ کر میں نے رضا مرحوم کو غیر معمولی طور پر افسردہ پایا۔ تھوڑی دیر تک میں نے ان سے مذاق اور محبت کی گفتگو کی اور وہ بہل گئے۔

تقریباً گیارہ سالہ سرکاری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جہاں کچھ اچھے کام ہو سکے وہاں بہت سے اچھے ارادے عملی جامہ نہ پہن سکے۔ جب کوئی شخص کسی نئی وادی میں قدم رکھتا ہے تو طرح طرح کے منصوبے اُس کے ذہن میں ہوتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو خلاف امید گوشوں سے دشواریاں رونما ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی اہم ہوتی ہیں کہ اگر انھیں نظر انداز کر دیا جائے تو اصلاح سے حصول مقصد نہیں ہوتا۔ پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وقت پر اصلاحی کارروائی نہ کرنا اتنا ہی مضر ہوتا ہے جتنا قبل از وقت اصلاح شور و فتن کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کی مثالیں خود ہندوستان میں اور ملک کے باہر موجود ہیں۔ امان اللہ خاں کا تاج و تخت چھوڑنا ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ گذشتہ زمانہ میں ہندو کوڈ بل کی مخالفت اندرون ملک کی ایک مثال ہے۔ پھر اس زمانے میں برٹش

گورنمنٹ کا نقطۂ نظر بہت سی باتوں میں اہل ملک کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا اور بنیادی پالیسی برطانوی حکومت کے ہی ہاتھ میں تھی۔ تاہم بہت سی اصلاحات ہوئیں۔ مثلاً جیل میں قیدیوں میں اے۔ بی۔ سی درجوں کا قائم ہونا کاشتکاروں کا اپنی زمین پر حقوق حین حیاتی اور پانچ سال تک اُس کے بعد ملنا۔ مناسب لگان کا استقرار۔ سودیشی چیزوں کی ترویج کے لیے محکمہ قائم ہونا۔ جب اشیاء کی قیمتیں گریں تو لگان کی کمی۔ قرضوں کی تعداد رقم کی کمی۔ حفظان امن سنگین جرائم میں کمی وغیرہ وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ اس سے بنیادی یا دوررس اصلاحات کی ضرورت تھی جو بروئے کار نہ لائی جاسکیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ بدیشی حکومت ایسی اصلاحات کا بار اپنے سر نہیں لے سکتی تھی جو سماجی طبقات کے توازن کو برہم کردے یا جو لوگوں کے دیرینہ رسم ورواج یا ایسے توہمات کو جو مذہبی رنگ اختیار کرچکے ہوں مٹائے مثلاً چھوت چھات کا سوال ہے شادی اور طلاق کا مسئلہ۔ زمینداری کو ختم کرنے کا قانون وغیرہ وغیرہ۔ وجہ ظاہر ہے کہ بدیشی حکومت کو اہل ملک کی تائید کا یقین نہیں ہوتا اس لئے ایسی تجاویز خواہ ملک کے حق میں مفید ہوں یا مضر۔ اگر کسی جماعت کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں تو اُن کو نہ چھیڑنا ہی مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ بہرحال میں اسے مانتا ہوں کہ اُس زمانے کے انتظام حکومت سے متعلق نہ میری رائے غیرجانبدارانہ کہی جاسکتی ہے نہ اُن ناقدین کی جو سیاسی اختلاف سے متاثر تھے اصلی جج تو اس صوبہ کے عوام الناس ہیں۔ اس لئے کہ ہر حکومت کا پہلا فرض ان کی حفاظت اور ان کی خوش حالی ہے۔

اس موقع پر مجھے سرہارکوٹ بٹلر کا ایک فقرہ یاد آرہا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''جب ہم کسی شکارگاہ میں دوبارہ جاتے ہیں تو ہمیں وہ مقامات یاد رہتے ہیں جہاں ہم نے شیر مارا لیکن ساتھ کے شکاریوں کو وہ موقعے یاد رہتے ہیں جہاں کسی ریچھ یا تیندوے پر ہمارا نشانہ خالی گیا۔

بہرحال یہ دور ختم ہوا اور میرے دل میں اپنے وطن کے ایسے دوستوں کی یاد جنھوں نے میری مدد فرمائی اور میری دشواریوں کو ہمدردانہ نظر سے دیکھا ہمیشہ احسان

مندی کے جذبات کے ساتھ تازہ رہے گی۔

حسب دستور اس موقع پر بہت سے خطوط آئے جو میرے لئے موجب تشکر وامتنان ہوئے۔ ان میں سے بعض کے اقتباسات کا اندراج بے موقع نہ ہوگا۔

EXTRACT FROM A LETTER OF SIR B.L. MITTER, LAW MEMBER OF COUNCIL, INDIA

New Delh,
18th November, 1933

"..
The manner in which you have managed your Province has evoked admiration from all sides. You are still young, though wise in experience. I hope after a period of deserved rest, you will find adequate scope for your abilities to the service of the country. I am afraid that at the beginning, the new Constitution will bring adventurers at the source, corrupting and debasing public life. The only remedy is organized effort by the stable elements and you are qualified in a peculiar degree to undertake the task, at least in your own Province. It is time our landed aristocracy work up. ....
.............................."

With the kindest regards from my wife and myself"

Your Sincerely,
Sd. B.L. Mitter

Personal

19, Albert Road
Allahabad
November 24, 1933

My dear Nawab Sahib,

I see from the morning papers that Sir Malcolm Hailey has landed and is on his way to Luckhnow. I presume that in another two days you will be laying down the reins of your high office which you have filled with so much distinction and in the midst of such marked appreciation on the part of the community at large. It must be a source of satisfaction and

pride to you that the Hindus and Muslims alike have vied with each other in doing honour to you wherever you have gone. No doubt your own personal charm of manner accounts to a large extent for your personal popularity but I have no doubt there is simultaneously with that the feeling that you are an Indian. May I, therefore, as an old friend and admirer congratulate you upon the success you have achieved in your official career and express the hope that the closing of this chapter may soon mean the opening of a new chapter of public usefulness. You are no doubt entitled to some rest but I hope that after the short spell of rest you will renew your public activities. I can conceive nothing nobler being done by you than taking your proper share in the establishment of proper relations between the two communities without which our politics must continue to be a chain of attempts at manouvering for position, each community doing what it can to harm the other. I wish you every good luck in your new sphere of life and trust that the future in your case will be still more briliant than the past.

With kindest regards and all good wishes,

His Excellency
Nawab Sir Ahmad Said Khan Bahadur
KCSI Governor, U.P, Luchnow

Your sincerely
Sd. Tej Bahadur Sapur

سرکاری زندگی کے بعد

پھر شب وروز اسی طرح گذرنے لگے جیسے ۱۹۲۳ء سے پہلے گذرتے تھے۔ چند مہینے تو میرے بالکل وہی محسوسات تھے جو اُس نوجوان طالب علم کے ہوتے ہیں جو تعطیل میں آیا ہو۔ صبح آنکھ کھلتی تو اس خیال سے تفریح ہوتی کہ کوئی ضروری پروگرام جلد تیار ہونے پر مجبور نہیں کر رہا ہے۔ اب میں نے اپنی ریاست اور خانگی انتظامات کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلی چیز۔ جو گو میرے علم میں عرصے سے تھی تخفیف لگان ومال گزاری کا سوال تھا۔ میری ریاست میں کاشتکاروں پر تخفیف لگان اتنی کی گئی تھی کہ اس

سے زیادہ قواعد کے اندر نا ممکن تھی اور مال گذاری کی تخفیف مجھے قواعد کے خلاف کم کردی گئی تھی۔ میں چونکہ خود حکومت کا ایک رکن تھا۔ میں نے ایک ایسے قصہ کو اٹھانا جو میرے ذاتی مفاد سے متعلق ہو مناسب نہ سمجھا اور خاموش رہا۔ لیکن اب اس مسئلہ کو زیر بحث لانے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔

تخفیف مال گزاری اور ادائے مال گزاری کے بعد میرا خالص دو لاکھ پینسٹھ ہزار تھا۔ گورنمنٹ نے ایک لاکھ چھبیس ہزار کی تخفیف لگان میں کی۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ تخفیف فی صدی شاید ہی کسی زمیندار کے حصہ میں آئی ہو گورنمنٹ کے قواعد کے مطابق تخفیف فقط اُن کاشتکاروں کو مل سکتی تھی جو اصلی کاشتکار ہوں۔ سیر کے شکمی کاشتکاروں کو کوئی تخفیف نہیں دی گئی تھی۔ مگر مجھے اس کا احساس تھا کہ شکمی تناسب سے انھیں بھی چھوٹ یا تخفیف لگان منظور کیا۔ اور اس طرح نو ہزار روپے سالانہ میری آمدنی سے اور گھٹ گئے۔ لیکن لگان میں اتنی کمی کے باوجود مجھے مال گزاری میں فقط سولہ ہزار کی تخفیف دی گئی اس پر مجھے اعتراض تھا۔

میں نے ایک درخواست تیار کرا کر حکومت کی خدمت میں پیش کی۔ چھان بین شروع ہوئی۔ مسٹر موڈی (جو بعد میں سر فرینک موڈی اور سندھ اور پنجاب میں گورنر ہوئے) اس زمانے میں بلند شہر کے کلکٹر تھے۔ جب یہ تخفیف عمل میں آئی تھی۔ جب اُن سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے گورنمنٹ کو اور مجھے ایک نجی خط میں یہ لکھا کہ مال گذاری میں جتنی تخفیف چھتاری کو ملنی چاہئے تھی وہ اس وجہ سے نہیں دی جاسکی کہ اُن کے (موڈی کے) خیال میں دوسرے زمینداروں سے زیادہ ریاست چھتاری بار اٹھا سکتی تھی۔ میں اس جواب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اس لیے کہ اس جواب میں کوئی منطق نہ تھی اور صریحاً یہ کاروائی خلاف قانون تھی۔ اس کے چند ہی روز بعد میں نینی تال گیا اور لارڈ ہیلی سے ملا۔ میں نے موڈی صاحب کے خط کی نقل انھیں دکھائی۔ وہ مجھ سے متفق تھے۔ کہ میرے ساتھ بہت سختی ہوئی۔ میں نے بڑی امیدوں کے ساتھ اس پر زور دیا کہ میری مال گزاری میں مزید تخفیف دی جائے۔ لارڈ ہیلی نے مباحثہ کا طرز ہی بدل دیا کہنے لگے کہ نواب صاحب میری جگہ اگر آپ خود گورنر ہوتے تو اس معاملہ میں کیا حکم دیتے۔ میں نے اس پر احتجاج کیا کہ یہ سوال

نامناسب ہے۔ میں اس وقت گورنر نہیں ہوں گورنر تو آپ ہیں۔ کچھ دیر اس پر ردوقدح رہی مگر وہ نہ مانے اور اصرار کرتے رہے۔ میں عجیب دشواری میں تھا۔ فریق کی حیثیت سے انسان بہت کچھ کہہ سکتا ہے۔ لیکن جج کی حیثیت تو بالکل اور ہے۔ بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے کوئی مزید تخفیف مال گذاری میں نہ مل سکی۔ اس لیے کہ میں نے یہ کہا کہ اگر میں گورنر ہوتا تو ساڑھے تین برس بعد اس معاملے کو پھر زندہ کرنے کی اجازت نہ دیتا۔

اس زمانے کی کوئی ڈائری نہیں ہے۔ لہذا تاریخیں یاد نہیں۔ واقعات میں تقدیم وتاخیر کا امکان ہے۔ جو تصویر حافظہ کے پردے پر آجاتی ہے سپرد قلم کردیتا ہوں۔

....

(سر راس مسعود مرحوم کا وائس چانسلری سے استعفیٰ)

۱۹۳۴ء میں سر راس مسعود نے علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے استعفیٰ دے دیا۔ قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم اُن سے قبل وائس چانسلر تھے۔ ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر تھیں۔ اُسی زمانہ میں اور غالباً چانسلر کی تحریک پر حکومت ہند نے یونیورسٹی کے معاملات کی دیکھ بھال چھان بین کے واسطے ایک کمیٹی بٹھائی۔ سر ابراہیم رحمت اللہ اس کے صدر تھے۔ اس کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کے انتظام پر اعتراضات تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو استعفیٰ دینا پڑا اور سر راس مسعود مرحوم اُن کے بجائے وائس چانسلر ہوئے۔ مجھے آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سر راس مسعود کے استعفیٰ کی وجہ کیا تھی۔ کورٹ نے نہ صرف اُن کے ساتھ تعاون کیا بلکہ اُن کی اطاعت کی تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو سر راس مسعود نے استعفےٰ دیدیا۔ اب سوال یہ تھی کہ وائس چانسلر کون ہو۔ سر فضل حسین مرحوم نے (جو اُس زمانہ میں گورنمنٹ ہند کے ایکزیکٹو کونسل کے ممبر تھے اور یونیورسٹی انھیں کے صیغہ میں تھی) مجھے خط لکھا اور یہ دریافت کیا کہ کیا میں اسے پسند کروں گا کہ مجھے وائس چانسلر کیا جائے۔ میں نے جواب میں جو عرض کیا وہ الفاظ یہ تھے۔

"I do not think I will be doing any good to the Community or to myself if I accept it."

سر فضل حسین نے میرے ہی الفاظ دہراتے ہوئے میری رائے سے جواب خط میں اتفاق کیا۔

یہاں میں تھوڑی دیر کے لیے اصل کہانی سے ہٹ کر یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس عہدہ کو قبول کرنے پر میں کیوں نہ آمادہ ہوا۔ خدا شاہد ہے کہ مجھے اس دارالعلوم سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ دارالعلوم کی خدمت کسی طرح بھی ہو میرے لئے باعث فخر ہے۔ لیکن ان دنوں کچھ وہاں کی فضا ایسی ہو گئیں تھی کہ اطمینان واعتماد سے کام کرنا دشوار تھا۔ اس کے متعلق سر راس مسعود کے تقرر کے سلسلہ میں پہلی جلد میں میں مختصراً عرض کر چکا ہوں۔

نواب اسمٰعیل صاحب جو ٹریژرار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے عارضی وائس چانسلر ہو گئے اور مستقل وائس چانسلر کی تلاش شروع ہو گئی۔ اُس زمانہ میں ہز ہائی نس نواب سر حمیداللہ خاں والیِ ریاست بھوپال چانسلر تھے۔ جہاں تک مجھے خیال ہے وہ نواب اسمٰعیل خاں کی موافقت میں تھے اور سر فضل حسین انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر فضل حسین مرحوم کے مکان پر پہونچا مرحوم نے اصرار اور میں نے انکار کرنا شروع کیا۔ مرحوم نے دوران گفتگو میں مجھ سے یہ کہا کہ بھئی اس بوڑھے کو کیوں "Let down" کرتے ہو۔ اُن کا اشارہ لارڈ ولنگڈن کی طرف تھا۔ میں نے سنی ان سنی کر دی مرحوم نے دریافت کیا کہ ڈیسرائے سے کب ملو گے۔ میں نے کہا دو تین روز میں شاید مل سکوں۔ لیکن میں اُن کی کوٹھی سے سیدھے ویسرائے ہاؤس پہنچا اور اے۔ ڈی۔ سی سے خواہش کی کہ ویسرائے سے عرض کریں کہ میں دو منٹ کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فوراً بلا لیا۔ میں نے سر فضل حسین مرحوم سے جو گفتگو ہوئی تھی مختصراً بیان کی اور اُن سے خواہش کی کہ آپ سے سر فضل حسین کہیں گے لہذا آپ اصرار نہ کریں میں وائس چانسلری قبول کروں۔ اُن سے وعدہ لے کر میں چلا آیا۔ لیکن سر فضل حسین مرحوم بڑے دھن کے پکے تھے۔ وہ

کبھی اپنے ارادہ سے ہٹتے نہ تھے۔ وہ یہ ارادہ کر چکے تھے کہ نواب اسمٰعیل خاں مستقل وائس چانسلر نہ ہوں۔ اس کے بعد بھی مجھے رستگاری نہ ہوئی گرمیوں میں نینی تال گیا۔ سر مالکم ہیلی (موجودہ لارڈ ہیلی) گورنر تھے۔ اُن سے ایک روز ملاقات کو گیا تو سر مالکم نے کہا کہ حکومت ہند کی یہ خواہش ہے کہ آپ اس وقت وائس چانسلری قبول کریں۔ میں اُن سے بہت بے تکلف تھا۔ میں نے وہ اسباب بیان کئے جو میرے خیال میں مانع تھے۔ جن میں سب سے بڑے دو تھے۔ (۱) علی گڑھ میں پارٹی بندی جس کا لازمی نتیجہ سازشیں ہے۔ (۲) میں ابھی سیاسی میدان کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ سر مالکم ہیلی مطمئن ہوگئے اور مجھے بھی سکون ہوا۔ لیکن میرا سکون عارضی تھا۔ جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے پھر اصرار شروع کیا۔ میں نے مجبوراً دو شرطوں کے ساتھ منظور کیا۔

(۱) میرا انتخاب متفقہ ہو اور میں کسی سے رائے کے واسطے نہ کہوں گا۔

(۲) دوسرے شخص کی تلاش جاری رہے اور زیادہ سے زیادہ ایک سال کے اندر دوسرا شخص تجویز کر لیا جائے۔ سر مالکم نے میری شرائط کو مان لیا اور دہلی اطلاع بھیج دی۔

چند روز کے بعد جب سر مالکم سے ملا تو انھوں نے کہا کہ ویسرائے سے اور ہز ہائی نس بھوپال (چانسلر مسلم یونیورسٹی) سے بات چیت ہوئی۔ وہ یہ کہ ہز ہائی نس کو میرے تقرر سے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے کہا میری پہلی شرط تھی متفقہ انتخاب۔ اگر چانسلر نہیں چاہتے تو میرے وائس چانسلر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر مالکم نے مجھ سے اتفاق کیا اور یہ قصہ ختم ہوگیا۔

انسان کی فطرت اور اس کی کمزوریاں بھی عجیب ہیں ہز ہائی نس کے اختلاف نے مجھے اس کی ناگواری تھی کہ ہز ہائی نس نے کیوں اختلاف کیا۔ میں ان الفاظ کو لکھتے ہوئے یہ جانتا ہوں کہ میری کمزوری تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ چاہے ہم خود کسی چیز کو اختیار کریں یا نہ کریں لیکن اگر دوسرا یہ کہے کہ ہم میں اس کام کی اہلیت نہیں تو ہمارے نفس کو ٹھیس لگتی ہے۔

ہز ہائی نس سر حمید اللہ خاں والیِ بھوپال

ہز ہائی نس سے مجھے اُس زمانہ سے نیاز حاصل ہے جب وہ علی گڑھ میں طالب علم تھے۔ ہز ہائی نس نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ اُنھیں اس دارالعلوم اور یہاں کے طلباء سے گہرا تعلق ہے۔ یہ اپنی ذہانت، تدبر، معاملہ فہمی اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے نہ صرف والیان ملک میں بلکہ فرزندان دارالعلوم علی گڑھ کے زمرہ میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ بڑے اچھے دوست ہیں۔ فرقہ وارانہ ذہنیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آج بھی وہ جبکہ وہ حکمراں نہیں ہیں اگر سوال کیا جائے تو اہل بھوپال بغیر امتیاز ملت اس کی تصدیق کریں گے وہ کھیلوں کے بڑے شائق ہیں۔ ٹینس۔ کرکٹ۔ پولو سے بڑا شغف ہے۔ وہ اور راجہ جے پور اپنے زمانہ میں ہندوستان کے بہترین پولو کھیلنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا ہینڈی کیپ (۹) تھا۔ بندوق بہت اچھی چلاتے ہیں۔ گن اور رائفل دونوں کا نشانہ بے مثل ہے۔ ہمعصر والیان ریاست میں ہز ہائی نس ایک امتیازی مقام رکھتے تھے، علاوہ اُن کی ذاتی صلاحیت کے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہز ہائی نس کی والدہ محترمہ نے اسے پسند فرمایا کہ ان کی تعلیم عام نوعمر بچوں کے ساتھ علی گڑھ میں ہو اس وجہ سے ہز ہائی نس کا ذہنی اور دماغی نشوونما بڑے جاندار اور صحت مند ماحول میں ہوا۔ اور موصوف دربار کے اثرات سے محفوظ رہے۔ ہز ہائی نس طبعاً خوددار اور آزاد خیال ہیں۔ انگریز کے زمانے میں برٹش افسران کو یہی شکایت رہی اور آزادی کے بعد سردار پٹیل سے کبھی نہ بنی۔ اگر کام لیا جاتا تو وہ ملک کے لیے بڑے کارآمد ہوتے۔

ہز ہائی نس بھوپال کا ذکر تو درمیان میں آگیا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وائس چانسلری کا قصہ ختم ہوگیا۔

سر مالکم ہیلی چلے گئے اور ہیری ہیگ گورنر ہوئے اور لکھنؤ میں میری طلبی ہوئی۔

جب میں گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچا تو پہلے سر فضل حسین سے ملا۔ اُن کے پاس ڈاکٹر ولی محمد بیٹھے تھے۔ وجہ طلبی وہی وائس چانسلری کی تھی۔ سر فضل حسین مرحوم کچھ

گفتگو کے بعد غسل خانہ تشریف لے گئے۔ میں نے تنہائی میں ڈاکٹر ولی محمد سے پوچھا کہ اُن کا مشورہ اس معاملہ میں کیا ہے۔ انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا کہ میرے واسطے یہ ذمہ داری لینا مناسب نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد گورنر کے دفتر میں ہم لوگ بلائے گئے۔ سر شاہ سلیمان مرحوم اور چودھری نعمت اللہ صاحب بھی شریک جلسہ تھے۔

گفتگو شروع ہوئی اور سر فضل حسین مرحوم نے ان الفاظ میں تقریر ختم کی ''اگر نواب صاحب آستین چڑھا کر کمر باندھ کر کھڑے ہو جائیں تو اس درسگاہ کی بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں''۔

میں نے وہ خط جو سر فضل حسین نے مجھے شروع میں لکھا تھا اور جس میں مرحوم نے میری رائے سے اتفاق کیا تھا کہ میں وائس چانسلری کے واسطے موزوں نہ ہوں گا جیب سے نکال کر گورنر کو یہ کہتے ہوئے دیا کہ پہلے سر فضل حسین کی یہ رائے تھی۔ گورنر نے وہ خط سر فضل مرحوم کو دیا۔ آخر کار بحث اس پر شروع ہوئی کہ پھر کون ہو۔

مین نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کا نام پیش کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے میری تائید چودھری نعمت اللہ صاحب نے بھی فرمائی۔ اور یہ طے پایا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم وائس چانسلری کے واسطے کھڑے ہوں۔ یوں دوسری بار مرحوم وائس چانسلر ہوئے۔ اسی سلسلہ میں ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔

وائس چانسلری کے انتخاب سے پہلے مجھے ہز ہائی نس نے بھوپال یاد فرمایا۔ مین فوراً حاضر ہوا۔ شب کے کھانے کے بعد باہر بیٹھے تھے۔ بھائی سلام الدین اور بھائی حیات بھی بیٹھے تھے۔ ہز ہائی نس بھی تشریف فرما تھے۔ یاد نہیں مگر یا تو سلام الدین صاحب نے یا حیات صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اگر آپ وائس چانسلری کو قبول کرلیں تو ہم لوگ متفقہ تائید کریں۔ میں نے کہا کہ۔

"You choose me as lesser evil but you must now have greater evil."

....
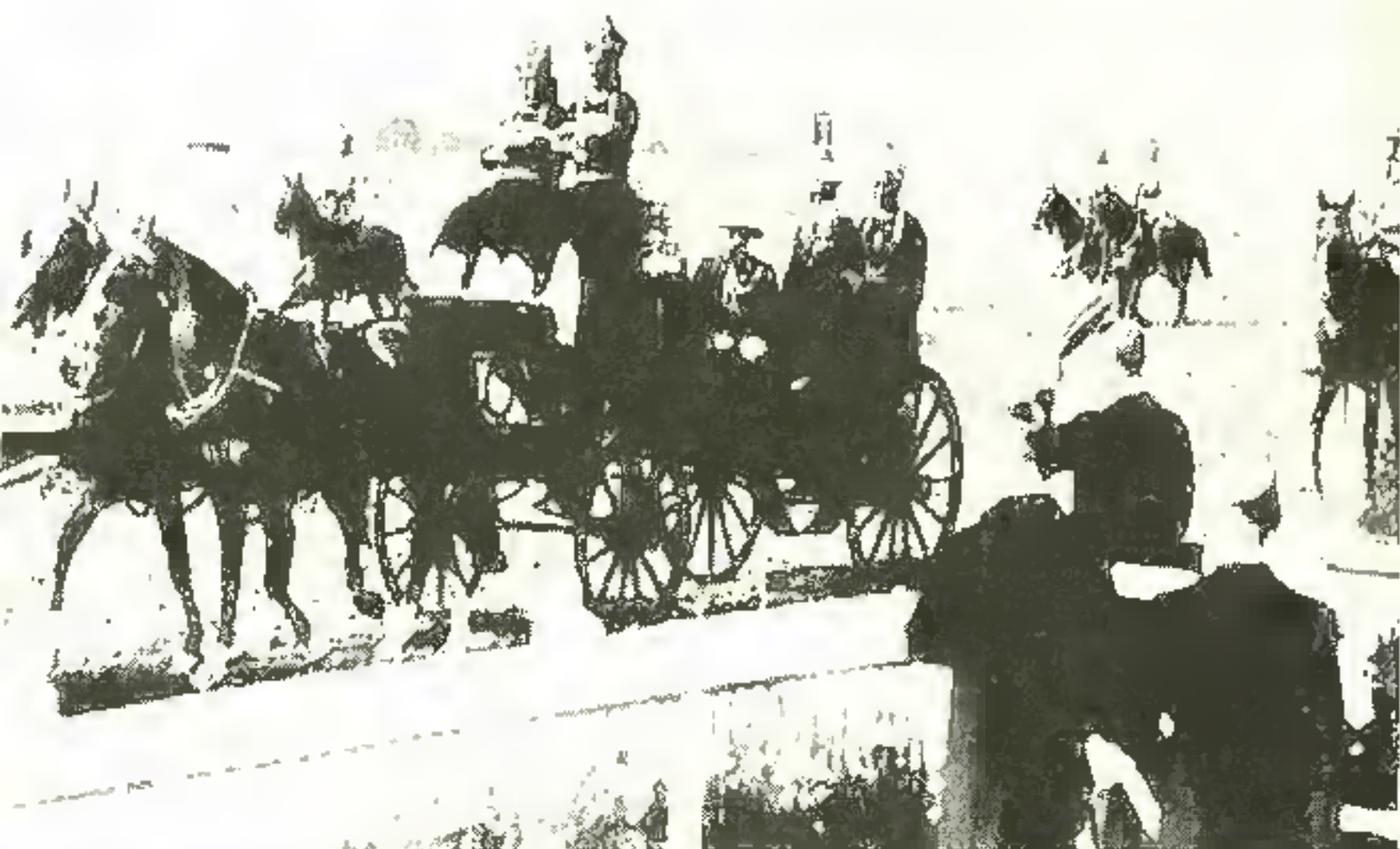
H.E. The Governor, Nawab Chhatari,
being received at Lucknow race course
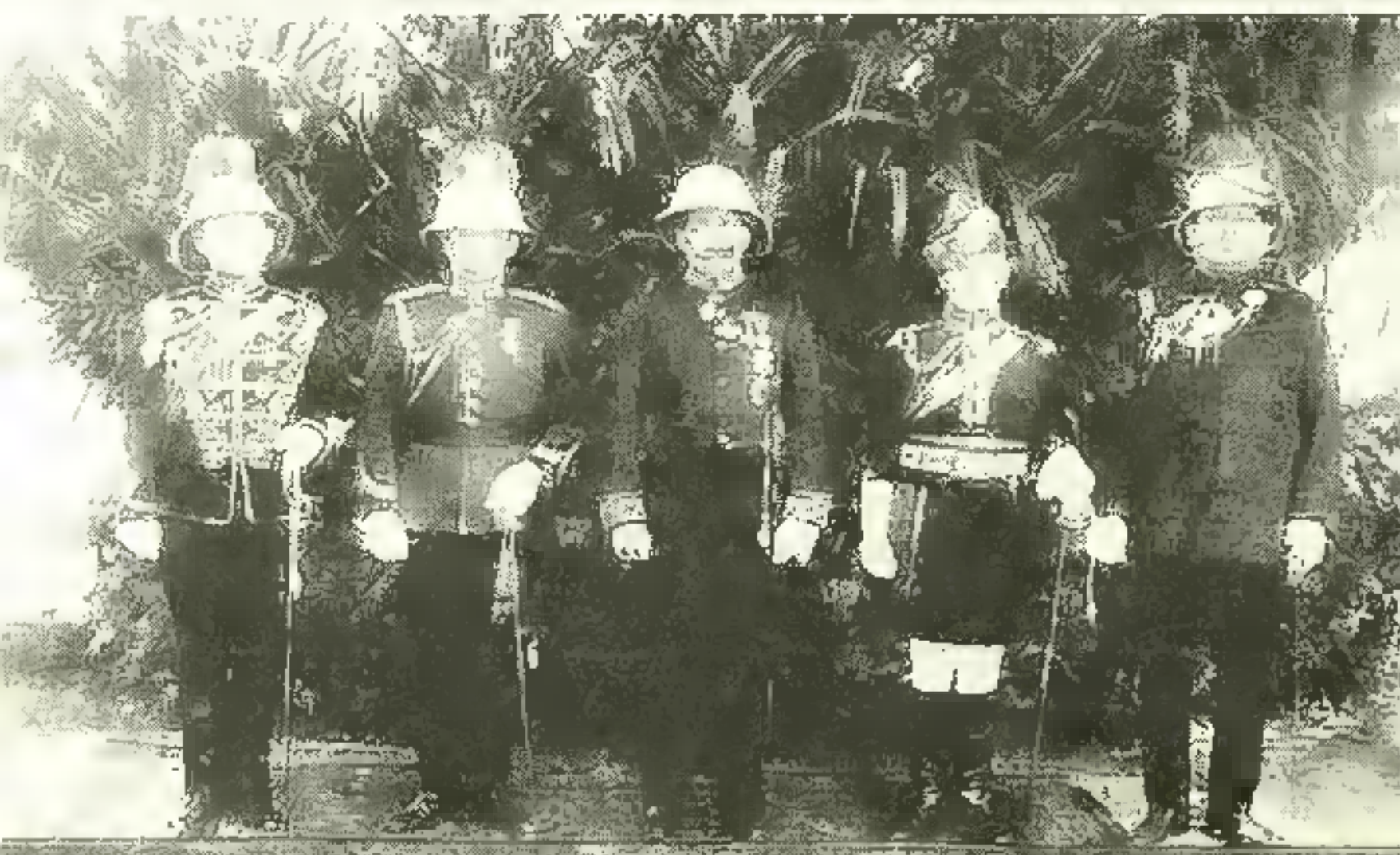
H.E. The Governor with his personal staff

Talib Nagar Estate : Nawab Bahadur, Abdus Samad Khan (uncle) Nawab Sir Jamshed Ali Khan of Baghpat (cousin) NZ Abdus Sami Khan (cousin). Nawabzada Rahat Said (Bridegroom), Nawabzada Abdus Salah (Bridegroom) - 1935

H.E. The Governor at Durbar Hall, Aligarh Exhibition

Procession of AMU Court : Vice Chancellor Sir Ross Masood, H.E. The Governor, Nawab of Chhatari proceeding to Strachey Hall to Confer the Hony Degree of D. Litt. on H.E. the Governor

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل انڈیا بوائے اسکاؤٹ

سیاسی تحریکات سے ہر طرف مجھے ۱۹۳۵ء میں ایک سوشل تحریک میں بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ لارڈ لنگڈن نے جو بحیثیت گورنر جنرل کے ہندوستان کے چیف اسکاؤٹ بھی تھے مجھے ہندوستان کا چیف کمشنر مقرر کیا۔ یہ ایک اعزازی خدمت تھی مگر بہت ہی دلچسپ تھی۔ مجھے اپنے ملک کے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان کے خیالات، ان کی امیدیں، ان کے جذبات اور ان کی دشواریوں کو سمجھنے کا موقع ملا۔

بوائے اسکاؤٹ تحریک کے بانی لارڈ بیڈن پاؤں تھے۔ یہ ایسے خوش نصیب اور با اقبال تھے کہ ان کی تحریک بوائے اسکاؤٹ ان کی زندگی ہی میں دنیا میں مقبول ہوگئی۔ مجھے کمیونسٹ ممالک کا تو علم نہیں لیکن دنیا کے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں بوائے اسکاؤٹ کی تحریک اور تنظیم ہر ملک میں شروع ہوگئی۔ لارڈ بیڈن پاول عالمی چیف اسکاؤٹر تھے۔ اسی سلسلہ میں لیکن اس کے بالکل جدا طور پر لیڈی بیڈن پاول نے ایک تنظیم لڑکیوں کے واسطے بنائی اور اس کا نام گرل گائیڈ رکھا گیا۔

یہ تحریک لڑکوں اور لڑکیوں کے واسطے بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہ تحریک بالکل غیر سیاسی ہے۔ مذہب نسل وقوم کی بنا پر کوئی تفریق نہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ نوعمری کے زمانہ میں تہذیب نفس (Deceplene) اور خود اعتمادی کو ذہن نشیں کیا جائے۔ نوجوانوں میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا کیا جائے معصوم کھیل اور تفریحات کی صورت میں ان اعلیٰ جذبات کو ان کے دلوں میں پیدا کیا جاتا ہے وہ خود اپنے اوپر قیود اور پابندیاں لگاتا ہے اور انہیں خوشدلی کے ساتھ برداشت کرتا ہے اور ایک اچھے اور کارآمد شہری میں جو صفات درکار ہیں وہ اس میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ لارڈ اور لیڈی بیڈن پاول جو ایک ایسے ملک کے باشندے تھے کہ جہاں کی سوسائٹی میں مرد و عورت ہمیشہ مل کر کام کرتے رہے۔ جنسی آزادی ایشیائی ممالک سے وہاں بہت زیادہ ہے مگر بایں ہمہ بانی تحریک نے دونوں جماعتوں کو الگ الگ رکھا۔ کوئی مخلوط تنظیم نہیں کی۔ لڑکیوں کی تنظیم لیڈی بیڈن پاول نے اپنے ہاتھ میں لی اور لڑکوں کی تنظیم لارڈ بیڈن پاول نے خود لی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نوعمر بچوں کے لئے ایسی مخلوط تنظیم کا بنانا خطرے سے خالی نہیں۔ فطری رجحات بعض اوقات ان کی تعلیم و تربیت میں حائل ہو جاتے ہیں اور جنسی کشش مستقبل کی تباہی کا سبب ہو جاتی ہے۔

مجھے اس حیثیت سے دورہ کرنا ہوتا تھا۔ گو جس قدر میں چاہتا تھا اسی قدر تو نہیں پھر بھی اجمیر، بمبئی، ٹراونکور، کوچین اور دوسرے بہت سے مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا اور اپنے ملک کے نونہالوں سے شناسائی کا موقع ملا۔

چیف کمشنر کا تقرر وائسرائے کی سفارش پر جو بحیثیت ہندوستان کے چیف اسکاؤٹ کے ہوتی تھی۔ Imperial Head Quarters, London سے ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۵ء کو میرا Warrant of appointment جاری کیا گیا جو بحیثیت اسکاؤٹ کے لارڈ بیڈن پاول کا دستخطی ہے۔

فروری ۱۹۳۷ء میں پہلی (National Jamboree) ہوئی یہ اسکاؤٹ کی غرض سے لارڈ اور لیڈی بیڈن پاول خود ہندوستان آئے ایک ایسی عالم گیر تحریک کے بانی کہ جو تحریک تمام مہذب اور ترقی پسند دنیا پر چھا گئی ہو خود موجود ہونے سے اس موقع کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ باوجود ضعیف العمر ہونے کے زندہ دل اور جوان ہمت تھے۔ مجھے انہوں نے اپنا رنگین فوٹو دستخط کر کے دیا تھا جو حیدرآباد کے مسلمانوں نے جب گھر جلایا تو وہ بھی نذرِ آتش ہو گیا مجھے اس کا بہت افسوس ہوا۔ جن چیزوں سے خوشگوار پرانی یاد تازہ ہوتی ہو ان کا تلف ہونا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے یہ پھر نصیب نہیں ہوتیں۔

اس موقع پر چار ہزار اسکاؤٹ ہندوستان کے مختلف حصوں سے جمع ہوئے

تھے اس میں دیسی ریاستوں اور برٹش انڈیا ہر جگہ کے نمائندے تھے۔

میں نے اس کا افتتاح یکم فروری ۱۹۳۷ء میں کیا تھا یہ ایک بہت ہی دلکش نظارہ تھا جس کی یاد ہمیشہ قائم رہے گی۔ ملک کے اتنے نوجوان مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف مذہب کے پیرو مگر حقیقی بھائیوں کی طرح ایک ہفتہ تک ساتھ رہے تھے کھیل اور تفریحات میں شریک ہوتے تھے اور کوئی تفریق مذہب وملت کی بنا پر نہ تھی۔

۳؍فروری کو لارڈ لنلتھگو بحیثیت اسکاؤٹ ملے لارڈ اور لیڈی بیڈن پاول آئے میں نے ان کا استقبال کیا اور چبوترے پر یہ حضرات کھڑے ہوئے اور چار ہزار اسکاؤٹ نے (مارچ پاسٹ) کے ساتھ سلامی دی۔ وائسرائے نے بادشاہ کی طرف سے ایک پیام بھی اپنی تقریر میں پڑھا۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

All India Boy Scouts Association

"My Personal connection with the Boy Scout Movement in England enables me to appreciate fully under the Leadership of the Chief Commissioner, Nawab Sir Mohammad Ahmad Said Khan (of Chhatari) in having brought the movement to its ever increasing high standing in numbers and efficiency throughout India. I would congratulate you all specially on the valuable Public services rendered by Scouts on various occasions."

اس موقع پر لارڈ لنلتھگو کی تقریر حسب ذیل تھی:

All India Boy Scouts Association

The Viceroy's House,
New Delhi.

I am glad to be with you today and as, Chief Scout for India, to see a Jamboree at which every Province and every state affiliated to the Boy Scout Movement is represented. I am particularly happy to have this opportunity to welcome, on behalf of all of you and India the Chief Scout himself. I know well what good work the Boy Scout Movement has done, and at Krokshetra and in the Quetta-earthquake - to take two outstanding examples only - you rendered to you country

services of the greatest possible value. In every province I have visited I have been glad to see representative contingents of Boy Scout, and to find them smart, well-disciplined, orderly and keen.

His Majesty the king-Emperor, in the gracious message which I have just read to you, emphasizes the importance of the Movement as Training School in all the qualities of body, mind and spirit which tend to make good citizens for India. Those of us who have been fortunate enough to see the working of the Movement and the result it has achieved in this country, realize fully how well-earned has been the praise which His Majesty has bestowed on the Movement.

Let us see that we continue to grow in numbers and in efficiency : true to our motto and faithful to our Scout promise.

(Sd.)

میری افتتاحی تقریر حسب ذیل تھی۔

"I offer you, Boy Scouts, Rover Scout and Scouters who have travelled long distances and come here to participate in this First All-India Jamboree, a most hearty welcome. Due to the very great demand on my time, it has not been possible for me to visit the different Provinces and States as I had desired, but I am glad that this Jamboree has offered me the opportunity of meeting you all and also of seeing some thing of the work you are doing. I am in the movement only for a year, or so and I perhaps claim on that account that I still retain the outlook of an outsider and am in a position to appreciate the attitude of outsiders. It is true that we are three lakhs strong in India, but we should remember that we have not yet touched the fringe of the work before us. We have still a great deal to do.

"I think that our greatest enemy is apathy and not opposition. Good causes in this world have suffered more from indifference than from down-right opposition. In order to fight this two things are required. So for as leadership is

concerned I admit that leader are born and not made. But if we have before us, the real ideals of the movement then our leadership is bound to succeed, the work of our men will be even more successful than it has been in the past years.

لارڈن پاؤل کی آخری تقریر جمہوری کا ہفتہ ختم ہونے پر حسب ذیل ہوئی۔

All India Boy Scouts Association.

"Scouts, we have had a glorious time this evening and I hope you will have had a happy tie together during your stay in Camp. To me it was a wonderful spectacle to see boys drawn from all over the country living together as brothers and sharing each others difficulties and joys. Remember that you are members of a brotherhood which extends to all the countries of the world Carry with you to your home troops the lessons, happy experiences and memories of the First Indian Jamboree.

"I ask you to work now and later when you grow up, as men, for the good, happiness and prosperity of the country. You Scouts have a great heritage and you motto should always be "Honour", honour to yourself and honour to your country.

"I am not sure that I will be able to meet you again. Most of you, I may not but I would ask you to be good scouts all your lives and to be of service to others.

"I thank you all once again for the splendid show tonight. I will carry away pleasant recollections of this great gathering and of your fine performances.

. "Now, good-bye, and God bless you all"

اسکاوٹس کے اس مجمع کا تصور مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ مادر ہند کے اتنے بچوں کا ایک جگہ ہونا، بھائیوں کی طرح ایک ہفتہ یکجا رہنا، ساتھ کھیلنا، کھانا، ہنسنا، بولنا، ایک ایسی خوبصورت تصویر ہے جسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔

برٹش حکومت کے خلاف بدگمانی بڑھ رہی تھی۔ ملک آزادی چاہتا تھا۔ جنگ آزادی کے ساتھ ہر اس چیز سے بدگمانی بڑھ رہی تھی جس کو کچھ بھی برٹش سے تعلق ہو۔ یہ میرا دردسر تھا۔ میں دورہ کرتا تھا۔ بمبئی، بنگلور، ٹراونکور، راجستھان، بنارس وغیرہ

بہت جگہ تھا۔ اسکاؤٹ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ تعداد ۲۷۲۸۵۳ سے بڑھ کر ۳۴۹۰۸۴ ہوگئی تھی مگر مجھے اس کا احساس تھا کہ یہ بدگمانی بوائے اسکاؤٹ کی ترقی میں سد راہ ہے۔ ہندوستان کے بوائے اسکاؤٹ کا تعلق اب تک لندن کے امپریل ہیڈ کوارٹر تھا۔ ہر اس تحریک کو کہ جسے کچھ بھی لندن سے تعلق ہو اور ہر وہ تنظیم کہ جس میں لندن کی طرف رُخ کیا جائے بعض حضرات کو بدگمان کرتی تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ایک دوسرے تحریک ہندوستان اسکاؤٹ کے نام سے شروع ہوئی۔ اس بدگمانی کو دور کرنے کی غرض سے یہ طے کیا گیا کہ ہندوستان کے بوائے اسکاؤٹ کا الحاق امپیریل ہنڈکواٹر لندن کی بجائے International Bureau سے ایک آزاد قومی جماعت کی حیثیت سے کرادیا جائے چنانچہ ۱۹۳۸ء میں اس کی تکمیل ہوگئی لیکن بدگمانی میں اس سے کوئی کمی نہ آئی گو یہ ظاہر تھا کہ International Bureau میں تمام آزاد ممالک کے بوائے اسکاؤٹ شریک تھے۔

اتحاد باہمی کے حصول کی غرض سے ۲۳ر اپریل ۱۹۳۸ کو الہ آباد میں ایک گول میز کانفرنس کی گئی تا کہ ہندوستان اسکاؤٹ اور بوائے اسکاؤٹ میں اتفاق اور اتحاد عمل کیا جائے۔ مادر ہند کے فرزند رشید سر تیج بہادر سپرو بھی اس کانفرنس میں شریک تھے لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہندوستان اسکاوٹ کو اس پر اصرار تھا کہ بوائے اسکاوٹ کے (Pronise) میں سے بادشاہ کے ساتھ وفاداری کو نکال دیا جائے۔ سر تیج کی رائے یہ تھی کہ جب تک ہندوستان برٹش حکومت کا ایک حصہ ہے بادشاہ وقت حکومت کا ہیڈ ہے اور بوائے اسکاؤٹ چونکہ اچھے شہری بنانا چاہتی ہے لہذا قانون کے مطابق ملک کی جو حکومت ہوگی اس سے وفاداری ہر اچھے شہری کا فرض ہے اس لئے حکومت کے ہیڈ کی حیثیت سے بادشاہ کی وفاداری (Promise) کا ایک حصہ رہنا چاہئے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

۱۷ر اپریل ۱۹۳۹ء کو مجھے (Silver Walf) کا تمغہ دیا۔ یہ بین الاقوامی بوائے اسکاؤٹ کا سب سے بڑا تمغہ مانا جاتا ہے۔ میں ۱۹۴۱ء تک بوائے اسکاؤٹ کی خدمت کرتا رہا اور جب ار اگست ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد کا صدر اعظم مقرر ہوا تو میں اس تحریک سے علیحدہ ہوگیا۔

انور سعید خان کی پیدائش

۹ر مئی ۱۹۳۷ء کو انور سعید خان پیدا ہوا۔ یہ باری تعالیٰ کا انعام ہے میں اجمیر گیا تھا وہاں سے واپس ہونے پر یہ خبر معلوم ہوئی۔

نیشنل ایگریکلچرل پارٹی

ہندوستان کو حکومت خود اختیاری مل کر رہے گی۔ اس میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی زمیندار جو اب تک برسر اقتدار تھے یہ چاہتے تھے کہ جس طرح کونسل میں ان کی ایک جماعت (نیشنل ایگریکلچرل پارٹی) کے نام سے موسوم تھی اسی طرح صوبہ میں بھی کونسل کے باہر اس پارٹی کو منظم کیا جائے تاکہ انتخابات کے وقت اس سے کام لیا جائے۔

مختلف مقامات پر جلسے کیے گئے اور پارٹی کی شاخیں اضلاع میں قائم کی گئیں۔ اس کا مقصد صوبہ میں ایک ایسی جماعت بنانا تھا جو کنزرویٹو پارٹی کے مماثل ہو اور جس طرح انگلستان میں آج تک کنزرویٹو پارٹی برسر کار ہے ہندوستان میں بھی انہیں خطوط پر ایک جماعت کی تشکیل کی جائے۔ لیکن جب کام شروع کیا گیا تو طرح طرح کی دشواریاں سامنے آئیں۔

میرے نزدیک کنزرویٹو کے معنی یہ نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں، کہ وہ اتنے قدامت پسند ہوں کہ ہر نئی تجویز اور تحریک کے مخالف ہوں۔ ایک جمہوری نظام میں ہر سیاسی جماعت کو اپنا پروگرام عوام کے رجحان اور خواہش کے مطابق تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر سیاسی جماعت کے لیے رائے عامہ کے ساتھ چلنا ناگریز ہوتا ہے۔ جو جماعت جنتا کا خیال نہ کرے گی وہ سیاسی میدان میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انگلستان کی یہ مثال موجود ہے آج کنزرویٹو حکومت وہ سب کچھ کر رہی ہے جس کا آج سے پچاس برس قبل کوئی انتہا پسند حکومت تصور بھی نہ کر سکتی۔ سبب وہی ہے کہ عوام کی خواہش کا لحاظ ہر سیاسی جماعت پر لازم ہے۔ جو پارٹی اس کا خیال نہ کرے گی انتخابات کے وقت اس کو مشکلات کا سامنا ہوگا۔ فرق کنزرویٹو اور

انتہا پسند جماعت میں صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ اول الذکر معاشی، اقتصادی تبدیلیاں بتدریج کرنا چاہتی ہے۔ موخر الذکر دفعتاً یا جلد ردو بدل کرنے کے حق میں ہوتی ہے ورنہ آنے والے تغیرات سے کوئی پارٹی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔

مثلاً مجھے اس کا بہت عرصہ سے یقین تھا کہ زمینداری قائم نہیں رہ سکتی چنانچہ ۱۹۲۶ء میں (جب کہ زمینداروں کی کونسل میں اکثریت تھی) میں نے کہا تھا کہ زمینداروں کو چاہئے کہ وہ ایسا قانون بنائیں کہ حکومت ہر سال جو زمین نیلام ہوا سے خریدے یا جو زمیندار فروخت کرے اس کو لے کر اس رقبہ کے کاشتکاروں کو مالک آراضی بنائے۔ ۱۹۳۲ء میں دوبارہ اس تجویز کو ایک نوٹ کی شکل میں سر ولکم ہیلی کو بھیجا جس میں اس پر زور دیا تھا کہ ہر سال حکومت اپنے بجٹ میں ایک رقم رکھے اور جو زمیندار اپنی زمینداری فروخت کرنے پر راضی ہوں یا نیلام ہو تو حکومت اُسے خرید کر جو کاشتکار اسے کاشت کر رہے ہوں انہیں کو زمیندار بنا دے۔ میری تجویز کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ان کا لگان فوراً بقدر مالگذاری کر دیا جائے اور اس سے زیادہ کچھ داد کریں وہ ادائیگی زمین کی قیمت میں محسوب ہو۔ مثلاً اگر کوئی کاشتکار سو روپیہ سالانہ لگان میں دیتا ہے اور اس زمین کی قیمت سولہ سو روپیہ گورنمنٹ نے ادا کی اور زمیندار سابق چالیس فیصدی مالگذاری دیتا تھا تو کاشتکار اس اسکیم کے تحت سو ہی روپیہ سالانہ ادا کرے گا لیکن چالیس روپیہ مالگذاری میں اور ساٹھ روپیہ سال اس سولہ سو کے مطالبہ میں محسوب ہوگا جو زمینداری کی قیمت میں ادا کی گئی۔

۱۹۳۷ء میں چند روزہ حکومت کی ذمہ داری مجھ پر آئی تو میں نے اس تجویز سے متعلق تفصیلات مرتب کرنے کا اہتمام کیا۔

کام شروع کیا گیا تو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا ہوا۔ سب سے پہلی دشواری یہ تھی کہ اس تحریک کو انگریز کے اقتدار کو قائم رکھنے کا وسیلہ سمجھا گیا۔

جتنے لوگ اس تحریک میں شامل تھے۔ وہ سب تدریجی اصلاح کے قائل تھے وہ طوفان شکنی یا سول نافرمانی سے متفق نہ تھے۔ ان کا مطالبہ یا احتجاج قانونی دائرے تک محدود ہوتا تھا وہ یکا یک انگریزی حکومت کے مطلقاً چلے جانے سے متفق نہ تھے۔

ان کا تصور ڈومنین Dominion کے درجہ سے آگے نہ تھا وہ اس سے خائف تھے کہ اگر تدریجی طور پر اصلاحات نافذ نہ کی گئیں تو ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔ دوسری طرف کانگریس خود مختارانہ حکومت کا مطالبہ اور آزادی کامل کے واسطے جدوجہد کر رہی تھی وہ انگریزی حکومت کا مقابلہ اور قانون شکنی کر رہی تھی۔ قدرتاً لوگ ہماری پارٹی کی طرف سے بدگمان تھے۔

دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس پارٹی کے تمام تر قائدین زمیندار یا دوسرے کھاتے پیتے لوگ تھے ہر شخص اپنی رائے کو افضل خیال کرتا تھا اور پارٹی اسپرٹ کا فقدان تھا۔ سیاسی شعور اور پیش بینی کی اس درجہ کمی تھی کہ ہر ایسی تجویز کو جس میں کچھ قربانی کرنا پڑے پارٹی بہت مشکل سے منظور کرتی تھی۔ ادھر جمہوری طرز حکومت کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ بغیر رائے عامہ کی تائید کے کیسے کام چلتا اور عوام کیوں کر ساتھ آتے جب ان کے واسطے آپ کوئی قربانی نہ کریں۔

سیاسی شعور کی کمی کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ ان میں فرقہ وارانہ ذہنیت تھوڑی ہی کوشش سے پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ ہمیشہ سے نہ تھی۔ مختصر یہ کہ یہ ایک ایسی فوج تھی جس میں سپاہیوں سے زیادہ جنرل تھے۔ بہرحال ایک پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی جس میں سر جے۔ پی۔ سریواستوا۔ نواب محمد یوسف وزراء شریک تھے اور میں اس کا پریسیڈنٹ تھا اور کچھ تنظیم کا کام بھی شروع ہو گیا۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس

انہیں دنوں آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں کچھ اختلافات شروع ہو گئے۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی بنیاد اس پر قائم تھی کہ گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں مسلمانان ہند اپنی متفقہ آواز اُٹھا سکیں۔ ہز ہائینس آغا خاں اس کے سرپرست اور مربی تھے۔ مسٹر محمد علی جناح اس کے مخالف تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ سوا مسلم لیگ کے اور کوئی جماعت مسلمانوں کی نمائندگی کا حق نہیں رکھتی۔ گول میز کانفرنس تک تو مسلم کانفرنس کا زور رہا مگر اب اس میں بھی تفرقہ شروع ہو گیا تھا۔

ہز ہائینس آغا خاں دہلی میں مقیم تھے۔ سر فضل حسین مرحوم نے مجھے دہلی

میں بلایا۔ ان کی کوٹھی پر آغا خاں بھی موجود تھے۔ ہر دو حضرات کا یہ ارشاد ہوا کہ مسلم کانفرنس کی صدارت میں قبول کرلوں۔ میری جانب سے معذرت پیش ہوئی اس لئے کہ میں غیر فرقہ وارانہ پارٹی کا پریسیڈنٹ تھا جس میں ہر مذہب وملت کے اصحاب شریک تھے۔ اس لئے ایک ایسی جماعت کی صدارت کرنا جو فقط مسلمانوں کی جماعت ہو میرے لئے نامناسب تھا۔ میں نے اس عذر کو پیش کیا اور باوجود اس احترام کے جو ہز ہائینس آغا خاں کا میری نظر میں تھا میں نے انکار کیا۔ اسی گفتگو کے دوران میں سر فضل حسین مرحوم نے یہ بھی فرمایا کہ میں سخت غلطی کر رہا ہوں۔ جداگانہ انتخاب کے ساتھ مشترکہ سیاسی جماعت نہیں چل سکتی۔ بہرحال طویل ردوقدح کے بعد ایک سال کے واسطے میں نے اسے قبول کرلیا اور بہ یک وقت مسلم کانفرنس اور نیشنل اگریکلچرل پارٹی کا صدر ہوگیا۔

اس غلطی کا اثر یہ ہوا کہ سر مالکم نے مجھ سے کہا کہ سر جے۔ پی کو اس کی شکایت ہے۔ مسلم کانفرنس کی صدارت سے تو میں نے ایک سال کے بعد علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن بعض حضرات نے اس کو خوب اچھالا اور نیشنل اگریکلچرل پارٹی میں فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا ہوگئی۔ اس ذہنیت کو خوب خوب ہوا دی گئی۔ بھائی پرمانند آنجہانی نے بھی اس صوبہ میں دورہ کیا اور پریس کے ذریعہ سے ہندو مسلم تفرقے کے احساس کو پیدا کیا گیا۔

کچھ ہی روز بعد نینی تال میں پارٹی کی میٹنگ ہوئی۔ سر جے۔ پی سری واستو نے یہ تجویز پیش کی کہ پارٹی کا نظم اس طرح سے ہو کہ میں تو پوری پارٹی کا پریسیڈنٹ رہوں لیکن اس کے دو بازو ہوں۔ ہندو بازو کے پریسیڈنٹ سر جے۔ پی اور مسلم بازو کے پریسیڈنٹ نواب محمد یوسف مرحوم ہوں اور اس طرح فرقہ وارانہ ذہنیت سے پارٹی میں کمزوری شروع ہوگئی۔

اب ۱۹۳۷ء کا انتخاب آ گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے حصہ لینے کا ارادہ کرلیا۔ مسٹر جناح، جو ایک عرصہ سے ولایت میں رہنے لگے تھے، ہندوستان واپس آئے۔ مختلف لوگوں اور پارٹیوں سے گفت وشنید شروع کردی۔ دہلی میں وہ امپیریل ہوٹل میں مقیم تھے۔ مجھے بھی بلایا اور لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ میں نے عذر کیا اور کہا کہ میں خود ایک مشترکہ پارٹی سے منسلک ہوں اسے کیسے چھوڑ دوں

مگر وہ مصر رہے۔ مجھے اس سے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر مسلم لیگ نے بساط سیاست پر مذہب کے مُہرے آگے بڑھائے تو میری پارٹی کے مسلمان بازو کو بہت نقصان ہوگا۔ اسی وجہ سے میرے اور ان کے درمیان کچھ ایسی گفتگو بھی ہوئی کہ ہماری پارٹی کے مسلمان دونوں ٹکٹ لیں۔ لیکن کوئی بات طے نہ ہوسکی اور میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ رفقائے کار سے مشورہ کرکے جواب دوں گا۔

جس روز دہلی میں مسٹر جناح سے گفتگو کر رہا تھا اُسی روز موصوف کی گفتگو جمعیۃ العلماء کے حضرات سے بھی تھی۔ تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں لیکن نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ۱۹۳۷ء کے انتخاب میں جمعیۃ العلماء مسلم لیگ اور کانگریس متفق ہوکر میدان میں آئے۔ یوپی میں مقابلہ نیشنل ایگریکلچرل پارٹی سے تھا۔

دوستوں سے مشاورت کے بعد میں نے مسٹر جناح سے معذوری کا اظہار کیا کہ میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا نہ ہوں گا۔ لیکن میری اس غلطی سے کہ میں نے فوراً انکار نہ کیا میری پارٹی کے ہندو ممبران پر بُرا اثر ہوا۔ لارڈ ہیلی نے مجھ سے کہا کہ سر جے۔ پی سریواستو نے ان سے اس کی شکایت کی اور آخرکار ہماری پارٹی کے دو حصے ہوگئے۔ ہندو حصہ کا لیڈر جے۔ پی اور مسلمان حصہ کے لیڈر نواب یوسف مگر میں پوری پارٹی کا پریسیڈنٹ۔

الیکشن کی تیاری شروع ہوگئی مگر ہماری پارٹی میں اب ہندو مسلم تفریق جو پہلے کبھی نہ تھی، پیدا ہونے لگی۔ یہ محتاج بیان نہیں کہ اس تفرقے سے کتنی کمزوری پیدا ہوگئی۔

۱۹۳۷ء الیکشن

الیکشن نے زور پکڑا لیکن ہماری پارٹی میں کوئی جوش نہ تھا۔ اس لئے کہ ہمارے ممبروں میں سیاسی شعور کی بیحد کمی تھی۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہوسکے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے الیکشن کے واسطے فنڈ جمع کرنے کا سلسلہ سامنے آیا تو اودھ کے تعلقداروں کی یہ خواہش ہوئی کہ ان کا فنڈ الگ ہو اس خواہش کا دل میں پیدا ہونا بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ زمینداروں میں سیاسی شعور کا فقدان تھا۔ ان کی نظر فقط یہاں تک پہونچی کہ چونکہ اودھ میں بڑی بڑی ریاستیں تھیں تو وہ زیادہ روپیہ جمع کرسکیں گے

لہٰذا فنڈ اودھ کے واسطے مخصوص رکھا جائے لیکن اس طرف خیال نہ کیا کہ آگرہ میں نشستیں زیادہ ہیں۔ اس لئے الیکشن میں فتح کا انحصار صوبہ آگرہ پر بمقابلہ اودھ کے زیادہ ہے۔

فنڈ کے جمع کرنے میں یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ زمیندار یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ جمہوریت کیا چیز ہے اور پارلیمنٹ طرز کی گورنمنٹ کے کیا معنی ہیں۔ وہ اب بھی کلکٹر کمشنر اور گورنر کی طرف دیکھتا تھا۔ کسی اور طرف توجہ نہیں کر سکتا تھا وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اصلی طاقت کا مرکز بدل گیا اور اب حکومت برٹش افسروں کی حکومت کے بجائے منتخب شدہ لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ چنانچہ صوبہ اودھ میں شاید پچاس ہزار روپیہ اور صوبہ آگرہ میں اونتیس (۲۹) ہزار روپیہ فنڈ میں جمع ہو سکا۔ اس اونتیس ہزار کی تفصیل یہ ہے کہ دس ہزار میرا تھا اور اسی قدر نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم مغفور کی رقم تھی اور ڈھائی ہزار راجہ صاحب ترو آنجہانی نے دیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمینداروں میں کوئی جوش نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک صاحب دولت زمیندار کو خط لکھا اور خواہش کی کہ وہ چندہ دے کر پارٹی کی مدد کریں انہوں نے صرف پچاس روپیہ کی رقم بھیجی تھی۔ یہ اس وقت یاد نہیں کہ میں نے وہ رقم واپس کی یا نہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ زمیندار کی نظر میں اس انتخاب کی کیا اہمیت تھی۔

علاوہ ازیں زمیندار پارٹی کے رہنما اور لیڈر یہ تصور نہیں کرتے تھے کہ وہ الیکشن ہار بھی سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے نواب یوسف مرحوم کا خیال تھا کہ کانگریس کو دس پندرہ فیصد سے زیادہ کامیابی الیکشن میں نہ ہوگی سر جے۔ پی سریواستو اس سے کچھ زیادہ خیال کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ چالیس فیصدی نشست کانگریس لے لے تو کوئی تعجب نہیں لیکن کانگریس کی اکثریت ہونے کا گمان کسی کو نہ تھا۔ اس خود اعتمادی نے ایک عجیب خرابی زمیندار پارٹی میں پیدا کر دی۔ بجائے اس کوشش کے کہ پارٹی کا ممبر کامیاب ہو اور جسے پارٹی نے ٹکٹ دیا اس کی مدد کی جائے لیڈر اس کی کوشش کرتے تھے کہ ٹکٹ ایسے شخص کو ملے کہ جو ان کے گروپ کا ہو اور جہاں پارٹی نے کسی ایسے شخص کو کھڑا کیا جو ان کے گروپ کا نہ تھا وہاں دوسرا اُمیدوار کھڑا کر دیا گیا اور در پردہ اس کی مدد شروع کر دی گئی۔

علی گڑھ میں زمیندار پارٹی کے اُمیدوار کے خلاف راجہ مان سنگھ رئیس لاکھنو

کے صاحبزادے رام سنگھ کھڑے ہوئے اتفاق سے راجہ صاحب آنجہانی سے میری دوستی تھی میں نے اُنہیں بلایا اور کہا کہ اگر تمہاری خواہش تھی تو تم نے کیوں نہ کہا۔ پارلیمنٹ بورڈ تم ہی کو ٹکٹ دیتا۔ تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کی خواہش نہ تھی مگر ایک وزیر کے حکم سے یہ کھڑے ہو گئے۔ میں ممنون ہوں کہ میرے کہنے سے انہوں نے نام واپس لے لیا۔

ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔ مثلاً رانی صاحبہ کردار کے مقابلہ میں ایک دوسرے تعلقدار کی بیوی کھڑی کر دی گئیں۔ اور دونوں ناکامیاب رہیں۔

انہیں دنوں میں لکھنؤ گیا تھا۔ سر ہری ہیگ گورنر تھے شام کو ان سے ملاقات ہوئی۔ گورنر نے دریافت کیا کہ میری رائے میں اسمبلی کی نامزدگی کی تاریخ اور انتخاب کی تاریخ میں زیادہ فاصلہ رکھا جائے یا کم۔ گورنر نے یہ بھی کہا کہ ان کے منسٹروں کی رائے یہ تھی کہ زیادہ زمانہ درمیان میں ہونا چاہئے اس لئے کہ ان کی پارٹی ایک نئی پارٹی ہے اس کو زیادہ وقت چاہئے تا کہ رائے دہندگان کو منظم کر سکے اور پولنگ پر پہونچا سکے میں نے اس رائے سے یکسر اختلاف کیا۔ میں نے کہا کہ زمینداروں کے اثرات تو دیرینہ اور موروثی ہیں وہ اثرات ذاتی ہیں وہ آج بھی اتنے ہی ہیں جتنے چند ہفتوں بعد ہوں گے۔ ہاں اگر نامزدگی اور انتخاب کے درمیان زیادہ وقت دیا گیا تو اس کا امکان ہے کہ ایک منظّم جماعت کو ہمارے ذاتی اور خاندانی اثرات کو مٹانے کا زیادہ موقع ملے۔ سر ہیری ہیگ مذبذب ہو گئے۔ جب میں کمرے سے باہر آیا تو اے۔ ڈی۔ سی کے کمرے میں یوپی کی پوری گورنمنٹ منتظر تھی۔ یعنی سر جے۔ پی سریواستو، نواب یوسف، سر مہاراج سنگھ اور نائنس منسٹر۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سر جوزف کلے کی میٹنگ ہونے والی تھی تاکہ انتخاب کی تاریخ کا تقرر کیا جائے۔ میں نے وزراء سے کہہ دیا کہ میرے خیال میں ان کی رائے غلط ہے اور نامزدگی اور انتخاب کے درمیان زیادہ زمانہ زمیندار پارٹی کے واسطے مفید نہ ہوگا۔ لیکن اس کو قابل قبول نہ سمجھا گیا۔ جہاں تک یاد ہے نامزدگی اور انتخاب کے درمیان چھ سات ہفتے کا وقت رکھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور صوبوں کے نتائج اخباروں نے طبع کئے ہر جگہ سے کانگریس کی کامیابی کی خبریں آئیں دوسرے صوبوں سے فارغ ہو کر وہاں کے

کارکنان بھی سب یوپی آ گئے جداگانہ انتخاب تھا مسلمانوں میں تو مسلم لیگ کو میابی نہ ہو۔ مولانا ابوالکلام نے اپنی کتاب (India wins Freedom) میں لکھا ہے کہ چھبیس نشست مسلم لیگ کی ہوئیں۔ مجھے سولہ یاد تھیں بہر حال چھیاسٹھ مسلمانوں کی نشستیں تھیں۔ ان میں اکثریت ہماری پارٹی کی رہی۔ لیکن ہندو ممبران میں آٹھ نو سے زیادہ ممبر ہماری پارٹی کے نہ آسکے اور ایک سو چھبیس یا ایک سو اٹھائیس کانگریس کے آئے۔ کانپور سے لیڈی سر یواستوا کھڑی ہوئیں مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اگر زمینداروں میں اتفاق ہوتا اور پارٹی میں یکجہتی ہوتی تو زمیندار یہ انتخاب جیت جاتے البتہ اس کا یقین ہے کہ اس بری طرح ہندو سیٹیں نہ ہارتے۔

اصل وجہ یہ ہے کہ زمیندار پارٹی کے پروگرام میں کاشتکار کے واسطے اتنا نہ تھا جتنا کانگریس کے پروگرام میں اور ہو بھی نہیں سکتا تھا اس وجہ سے کہ خود قربانی پر تیار ہونا مشکل ہے لیکن دوسرے کو قربان کر دینا آسان ہے۔

سر ہیری ہیگ

سر ہیری ہیگ، سر مالکم ہیلی کے بعد یوپی کے گورنر ہوئے۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوم سیکریٹری اور ہوم ممبر بھی رہے تھے۔ وہ سیکریٹری یا ممبر گورنمنٹ کی حیثیت سے کتنے ہی کامیاب ہوں مگر گورنر کی حیثیت سے کچھ کامیاب نہ تھے گورنر اور سیکریٹری یا ممبر کابینہ کے نوعیت کار ذرا مختلف ہیں۔ اس زمانہ میں گورنر کو انتظامی اختیارات بہت تھے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جملہ اختیارات کا سرچشمہ گورنر ہی ہوتا تھا۔ سکریٹری کا کام یہ ہے کہ وہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال دے۔ ممبر گورنمنٹ جس حد تک اسے اختیار ہے فیصلہ کرے لیکن اہم مسائل تمام گورنر کے فیصلہ کے محتاج ہوتے تھے۔ لہذا گورنر میں قوت فیصلہ اور اصابت رائے کا ہونا ضروری تھا۔ سر ہیری میں ان چیزوں کی کمی تھی۔ سر سی۔ وائی چنتامنی کہا کرتے تھے کہ

"When ever I went to see Sir Melcom Haillz I come out a wiser man, when ever I went to see Mr. Harry Haig I left him a wiser man".

راجہ سر مہاراج سنگھ

سر مہاراج سنگھ میرے بڑے پرانے دوست تھے۔ میرے چچا نواب یوسف علی خاں مرحوم اور ان کے والد راجہ ہرنام سنگھ کے بہت مخلصانہ تعلقات تھے۔ اسی وجہ سے جب سر مہاراج سنگھ آنجہانی ڈپٹی کلکٹر ہو کر علی گڑھ آئے تو میرے چچا کے پاس کوٹھی چندنیاں میں رہے یہ ان کا پہلا پوسٹنگ تھا اور یہیں پہلی بار میں ان سے ملا تھا۔ ڈپٹی کلکٹری تو بس سلسلہ ملازمت شروع کرنے کے واسطے تھی وہ سکریٹری ہوئے کمشنر ہوئے۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستان کی طرف سے ایجنٹ ہو کر گئے یوپی میں ہوم ممبر ہوئے اور آزادی کے بعد بمبئی کے گورنر ہوئے۔

ہیرو میں اسکول کی تعلیم کے بعد آکسفورڈ میں تعلیم کی تکمیل کی تھی۔ بڑے دوراندیش مدبر تھے۔ تقریر بہت اچھی کرتے تھے۔ جس جلسہ میں بیٹھ کر باتیں کرتے تمام سامعین مسحور ہو جاتے۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ راجہ سر مہاراج سنگھ میں ایک جانب یورپین تہذیب کے بہترین صفات موجود تھے اور دوسری طرف پرانی قدروں کا احترام کامل پایا جاتا تھا۔ ہندوستانی تہذیب واخلاق اور مروت ومحبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ٹینس بہت اچھا کھیلتے تھے اور اپنے زمانہ میں اس ملک کے اچھے کھلاڑیوں میں سے تھے۔ ایک عجیب فن انہیں آتا تھا، جس کا مظاہرہ کبھی کبھی لطف وصحت کے سلسلہ میں کرتے۔ وہ گڑیا سے باتیں کرتے سوال اپنی قدرتی آواز میں کرتے، جواب گڑیا دیتی اس کے لبوں کو حرکت ہوتی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ آواز گڑیا کے منہ سے آرہی ہے۔ مجھ پر خاص طور سے عنایت فرماتے تھے ان کی وفات سے ہندوستان کا ایک مایۂ ناز فرزند کم ہو گیا۔

اس زمانہ میں دو عجیب واقعات پیش آئے (اس انتخاب میں نامزدگی کے روز میں بلند شہر جانے لگا تو میری رفیقہ حیات نے کہا کہ تم منتخب ہو جاؤ گے میں نے اس یقین کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ اسی شب انہوں نے خواب میں دیکھا کہ میں ہاتھی پر سوار ہوں اور چیل پرند جھپٹتے ہیں مگر جب میرے پاس آتے ہیں تو کٹ کر گر جاتے ہیں بلند شہر میں میرے مقابلہ میں ایک پٹھان صاحب کی نامزدگی مسلم لیگ

کی طرف سے ہوئی مگر انہوں نے دوسرے روز اپنا نام واپس لے لیا۔ میں بغیر مقابلہ منتخب ہو گیا)۔

دوران انتخاب میں تحصیل کھیر کے رہنے والے ایک جیوتشی (جن کا انتقال ہو گیا) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ان کے بچار سے تو پہلا چیف منسٹر یو پی کا مجھے ہونا چاہئے انتخاب کے نتائج نکلتے ہی وہ پھر آئے۔ میں نے دیکھتے ہی کہا کہ "واہ پنڈت جی" آپ کا بچار بھی خوب ہے آپ نے کہا تھا کہ میں چیف منسٹر ہوں گا۔ ہماری پارٹی الیکشن ہار گئی۔ وہ کہنے لگے کہ میں اسی وجہ سے آیا ہوں میرے بچار سے اب بھی پہلے چیف منسٹر آپ ہی ہوں گے انتخاب کوئی جیتے۔ گو مجھے اس پر یقین نہ تھا مگر حالات نے ایسا مجبور کیا کہ ہوا ایسا ہی۔

ہمارے خاندان کے قبرستان میں ایک نابینا حافظ شیخ علی رہا کرتے تھے انتخاب کے نتائج ظاہر ہو چکے تھے حافظ جی مجھے ایک روز چھتاری میں ملے اور مبارکباد دینے لگے۔ میں نے ہنس کر کہا "حافظ جی خبر بھی ہے ہماری پارٹی انتخاب ہار گئی اور کانگریس کی اکثریت ہو گئی" انہوں نے ایک آیت پڑھی کہ خدا کے حکم سے اقلیت بھی اکثریت پر غالب آ جاتی ہے۔

کانگریس اور برٹش حکومت میں گفت وشنید

کانگریس کو گورنر کے خاص اختیارات سے کہ وہ انتہائی اہم صورت میں انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اختلاف تھا۔ گورنر خلاف قانون کوئی وعدہ نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا گفتگو گورنمنٹ آف انڈیا اور کانگریس کے درمیان شروع ہوئی اور وائسرائے نے کانگریس کو یقین دلایا کہ گورنر روزانہ انتظام میں مداخلت نہ کریں گے۔ اس کے بعد کانگریس نے حکومت ہاتھ میں لی۔ مگر اس دوران میں کافی عرصہ لگا تقریباً تین ساڑھے تین ماہ صرف ہوئے۔

یو۔پی کی پہلی وزارت کی دعوت

چھتاری میں تار ملا کہ گورنر ملنا چاہتے ہیں اس لئے کانپور پہنچوں۔ میں کانپور

گیا۔ اسٹیشن پر کلکٹر کانپور (کوئی یورپین تھا) مجھے ملا۔ موٹر تیار تھا۔ لکھنؤ کی سڑک پر روانہ ہو گیا پروگرام عجیب تھا۔ بعد ڈنر گورنر لکھنؤ سے چلیں گے اور میں اجگین کے اسٹیشن کے سامنے جہاں اسٹیشن کی سڑک ملتی ہے۔ وہاں انتظار کروں اور ان کے ساتھ کانپور آؤں۔ چنانچہ گورنر کا موٹر آیا میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ کانگریس نے گورنمنٹ بنانے سے انکار کیا اور اس واسطے سر ہیری ہیگ نے مجھے بلایا تھا میں نے جواباً غور کیا کہ بغیر اکثریت کے میں کیسے گورنمنٹ بناؤں۔ سر ہیری ہیگ اس پر زور دیتے تھے کہ گورنر کی حکومت سے یہ بہتر ہے کہ منتخب شدہ لوگوں کی حکومت ہو۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ گورنمنٹ ہند کے حکم کی تکمیل کر رہے تھے اور منشاء یہ تھا کہ اس طرح کانگریس پر زور پڑیگا کہ وہ حکومت قبول کرلے۔ میں اس صورت سے متفق نہ تھا۔ آخر یہ طے پایا کہ میں اپنی پارٹی کے لوگوں اور جو اس وقت وزراء تھے یعنی سر جے۔ پی سری واستو اور نواب یوسف سے مشورہ کر کے جواب دوں۔ واپس آکر ایک روز بعد لکھنؤ گیا۔ پارٹی کے لوگ اور وزراء سے مشاورت شروع ہوئی۔ یاد نہیں کہ پارٹی کے ممبروں نے کوئی خاص رہنمائی کی ہو۔ مگر بائیس تیئس برس بعد کچھ ایسا یاد ہے کہ پارٹی کے ممبروں کا یہ خیال تھا کہ کانگریس حکومت بنانا منظور نہیں کرے گی اور گورنر کی حکومت ہوگی اس لئے اپنی حکومت بنائی جائے وزراء سے برابر مشاورت ہوئی۔ وہ حضرات بھی کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔ میرے سامنے اصل سوال یہ تھا کہ اگر اکثریت اسمبلی میں کسی گورنمنٹ کی نہ تو پھر وہ کوئی قانون کیسے بنائے گی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا کانگریس غیر اعتماد کا ووٹ پاس کرے گی یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ غیر اعتماد کی تحریک کچھ روز لائیں لیکن جو تجویز بھی قانون ساز جماعت میں حکومت پیش کرے اسے اپنی اکثریت سے منسخ اور مہمل کر دیں۔ قیصر باغ بارہ دری میں اپنی پارٹی کے ممبروں کی ایک میٹنگ بھی ہوئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

وزراء میں نواب محمد یوسف کسی ایک جانب اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ گورنر برابر مصر تھے کہ میں حکومت بناؤں۔ اسی خلجان میں ایک روز میں سر جے۔ پی سری واستوا کے مکان پر جو بنارسی باغ کے قریب تھا گیا فقط میں اور وہ تھے اسی مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا ایسے حالات میں ہمیں حکومت

نہیں بنانا چاہئے۔ میں اس یقین کے ساتھ واپس آیا کہ انہیں میری رائے سے اتفاق ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے دوسرے روز شام تک مجھے سر ہیری ہیگ کو قطعی جواب دینا تھا۔ جس روز شام کو مجھے سر ہیری کو جواب دینا تھا چار بجے کے قریب شملہ سے ایک ٹیلیفون آیا سر جگدیش پرشاد اس طرف ٹیلیفون پر تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم کیوں پس و پیش کر رہے ہو۔ تم حکومت بننے کو روک نہیں سکتے۔ اسی روز لنچ کے بعد سر جے۔ پی اور نواب محمد یوسف نے گورنر سے کہا کہ اگر میں انکار کرتا ہوں تو وہ حکومت بنائیں گے۔ مجھے اس سے تکلیف ہوئی اور شاید اسی کا ردعمل تھا کہ میں نے شام کو اسے قبول کر لیا کہ عارضی حکومت بنائی جائے۔ میں نے گورنر سے کہہ دیا کہ میں تیار ہوں اب حکومت بنانے کی تیاری شروع ہوئی۔

دورانِ الیکشن میں ایک روز عثمانی صاحب، جو لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے بہت با اثر دوست نواز تھے، ملنے آئے تھے اور کہا تھا کہ چودھری خلیق الزماں صاحب جو میرے بھی دوست تھے مجھ سے ملنا چاہئے تھے۔ ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کامیاب ہوتی ہے تو میں کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ اور میری پارٹی مل کر حکومت بنائیں۔ گو مجھے یقین تھا کہ ان حالات میں جب کہ میری پارٹی انتخاب ہار گئی تھی چودھری خلیق الزماں صاحب حکومت میں شرکت نہ کریں گے لیکن کچھ تو اس خیال سے کہ مجھے وعدہ پورا کرنا تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ اگر وہ راضی ہو گئے تو مسلم لیگ کے ممبر بھی شریک ہو جائیں گے میں ان سے ملا۔ میرے خیال کے مطابق انہوں نے حکومت میں شرکت قبول نہ کی۔

۱۹۳۶ء کی یو۔ پی کی گورنمنٹ کے ممبر

اب میں نے خود گورنمنٹ بنانے کی کوشش کی۔ سر جے پی سری واستوا اور نواب سر محمد یوسف تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ جدید ممبران کی تلاش میں بڑی دقت یہ تھی کہ میری پارٹی میں انتخاب کے نتائج کی بدولت ہندو ممبران بہت کم تھے۔ سات آٹھ سے زیادہ ان کی تعداد نہ تھی باقی تمام مسلمان ممبر تھے۔ صوبہ میں ہندو اکثریت کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے سات آدمیوں کا کابینہ بنایا۔ میں نے راجہ سلیم پور کو جو مسلم لیگ

یو-پی کے پریسیڈنٹ تھے دعوت دی وہ شریک ہوگئے۔ممبران حکومت حسب ذیل تھے۔

احمد سعید-سر جے۔پی سریواستوا۔نواب محمد یوسف۔راجہ مہیشور دیال سیٹھ، راجہ صاحب سلیم پور، راجہ تروا، مہاراج کنوار وزیا نگرم۔

راجہ درگا نرائن تروا کے لینے میں ایک واقعہ ہوا۔جب میں حکومت بنا رہا تھا توسہ پہر کو فون آیا راجہ تروا میرے پاس بیٹھے تھے۔سر جے۔پی سریواستوا دوسری طرف باتیں کر رہے تھے۔انہوں نے پوچھا کیا میں راجہ تروا کو گورنمنٹ میں لے رہا ہوں۔میں نے کہا جی ہاں۔سر جے پی نے کہا کہ اگر آپ انہیں لیں گے تو پھر میں شریک نہ ہوسکوں گا۔میں نے کہا کہ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اور وہ دونوں شریک ہوں میں راجہ سے کہہ چکا ہوں انہیں تو لینا ہی ہے مگر پھر جے۔پی راضی ہو گئے۔مگر راجہ تروا نے یہ گفتگو چونکہ خود سنی تھی وہ بہت برہم ہوئے۔

عارضی حکومت یو-پی

یو-پی عارضی حکومت میں نے بنائی۔یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ایسی حکومت کا بنانا درست تھا یا نہیں۔اس میں اختلاف رائے ممکن ہے۔لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ ایک ایسی حکومت سے جو تمام تر ملازمین سرکار کے اختیار میں ہو خاص کر ایسی صورت میں کہ ملازمین حکومت کا فعال حصہ بدیشی ہو وہ حکومت بہتر ہے جس میں جنتا کے نمائندے برسرِ اقتدار ہوں ظاہر ہے ان کو عوام الناس یا جنتا سے وہ تعلق اور قلبی لگاؤ نہیں ہوسکتا جو یو۔پی کے اس باشندے کو ہوگا جو انتخاب کے ذریعہ سے آیا ہو۔

تین اپریل ۱۹۳۷ء کو ہم لوگوں نے وزارت اور راز داری کا حلف لیا۔میں نے حسب ذیل بیان شائع کیا۔

Statement Issued by the Nawab of Chhatari, Chief Minister, U.P

"Unforeseen and very unusual circumstances have placed me in a most difficult position. The majority party in the legislature, whose natural right according to the verdict of the people was to run administration of the province, having declined to do so, it is has fallen to the lot of those who belong

to the minority to try to run the administration. I believe in working the constitution for what it is worth and in securing the maximum benefit out of it for people who are looking forward to the betterment of their condition."

"The other alternative was the suspension of the Constitution and a complete bureaucratic Government. I know that situated as we are, we cannot do much; still I think something can be done for the masses. For this reason I took this responsibility."

" I wish however, to assure the people of these provinces that till such time as some solution is found for the present impasse my colleagues and I will try and run the administration impartially without fear or favour in the interest of all."

اس طرف ہم نے ان لوگوں کو جو کانگریس اور مسلم لیگ میں نہ تھے قیصر باغ بارہ دری میں بلا کر یونائیٹڈ پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ دوسری جانب کانگریس نے اپنی پارٹی اور غیر پارٹی کے لوگوں کو بلا کر ایک میٹنگ کی۔ شری گوبند بلبھ پنتھ نے مجھے بھی اس میں مدعو کیا۔ میں نے جواب میں پنتھ جی کو یہ لکھا کہ میں اپنے بیانات میں یہ کہہ چکا ہوں کہ حکومت بنانا آپ کا حق بھی ہے اور فرض بھی جس وقت آپ یہ فیصلہ کرلیں کہ کانگریس حکومت چلانے کو تیار ہے۔ میں استعفیٰ دیدوں گا۔

دس مئی کو پرشوتم داس ٹنڈن نے جو کانگریس کی میٹنگ کے پریسیڈنٹ تھے مجھے اس قرارداد کی نقل بھیجی جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے ممبروں نے مل کر یہ کہا تھا کہ میری وزارت پر اکثریت کو بھروسہ نہیں ہے۔ یہ پرستاویا قرارداد پنڈت گوبند بلبھ پنتھ نے پیش کی اور چودھری خلیق الزماں نے اس کی تائید کی۔ میں نے اسے وضاحت سے اس واسطے بیان کیا ہے کہ اس وقت تک مسلم لیگ اور کانگریس بالکل ایک تھے۔

ہمارا جواب ظاہر ہے کہ یہ تھا کہ ہمیں اس کا دعویٰ نہیں ہے کونسل میں اکثریت ہماری ہے کانگریس آئے اور حکومت کو ہاتھ میں لے۔

اب مجھے اور دوسرے وزراء کو یہ فکر ہوئی کہ اس سے قبل کہ نئی کونسل طلب کی جائے۔ اصلاحات کی تجاویز مرتب کرلی جائیں۔ ظاہر ہے کہ کونسل میں اکثریت نہ

ہونے کی وجہ سے بڑی اصلاحات نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایک اصلاحی پروگرام بنا سکتے تھے اور انتظامی احکامات کی رو سے چھوٹی موٹی اصلاحات کر سکتے تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ گرمیوں میں حکومت پہاڑ پر نہ جائے۔

راجہ مہیشور دیال آنجہانی نے جو وزیر مالگذاری و زراعت تھے ایک نوٹ پیش کیا جس میں کاشتکاروں کو حق موروثی اور دوسرے حقوق مثلاً مکان بنانے کا حق دینے کی تجاویز تھیں میں نے اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ گورنمنٹ کاشتکار کو اس میں مدد دے کہ بہ رضامندی وہ زمیندار سے زمین خرید کر مالک بن سکے۔ میرے نوٹ کا اقتباس حسب ذیل ہے اس سے قبل ۱۹۳۲ء میں بھی میں نے سر مالکم ہیلی کو ایک نوٹ لکھ کر دیا تھا جس میں یہی تجویز تھی۔

I may repeat what I said before, that if the conditions prevailing in the Province are to be regarded as normal, then I do not think there is any need of introducing a policy of radical change, as my proposal about land purchase is; but if we come to the conclusion that the conditions are not normal, that great and tremendous changes are taking place in the mind of the masses and in other countries when such conditions being to work up the mind of the people minor changes never satisfied them, then I think we should make up our mind for a change and should try to surmount such difficulties as may be in our way. It has often struck many of us that we should be given minor concessions to the tenantry in the form of hereditary rights, rights to build house, etc. Nobody will be happier than myself if by giving such concessions we shall be able to keep our tenants away from the revolutionary mentality which is being created. The real question, however, is: shall we be able to achieve that objective by giving these minor concessions? Those who are skeptical will express their "Yes". Those who are skeptical will express their doubts, because nobody can be certain about the future; but there is one test which will decide once for all." Are the tenants who enjoy these rights in the Province fully

satisfied.?" This makes the position quite clear. It is human nature - the more you give the more you are asked for, unless you give all. Therefore, we shall have to give full satisfaction which may create dissatisfied Zamindars but will not create satisfied tenentry.

میرے اس نوٹ پر سر ہیری ہیگ نے جو گورنر تھے حسب ذیل نوٹ لکھ کر وزراء میں گشت کرایا۔

Note by His Excellency on Land Purchase

I have read these papers with great interest. I have no wish at the present stage to express any opinion on the merits of a problem which obviously involves the most complicated considerations. But with regard to the general outlook on tenancy problems, discussed in the Hon'ble Premiers note of 2nd June, I should like to make certain observations for the consideration of Hon'ble Ministers, which should be circulated together with other papers.

2 When this proposal for land purchase was placed before Lord Hailey in 1932, supported by arguments very similar to those used by the Hon'ble Premier in his note of 2nd June, Lord Hailey noted as follows:-

"It is true, as was represented to us in the course of our interviews with the Taluqdars in the winter, that the grant of occupancy rights has not necessarily brought such contentment to tenants as to remove them from a desire for agitations against landowners. Some of the taluqdars took this point in arguing against a further extension of the occupancy rights. But I myself would ask rather whether the tenants have genuine complaints on which outsiders can seize as an excuse of promoting political agitation against the landowners? If so then probably it would be wiser to attempt to remove this cause of trouble than to allow it to subsist as a potential source of danger to the landlordws and to the peace of the Province. It is a comparison of disadvantages. If the cause of complaint is real, the danger of allowing it to exist would probably

outweigh in the long run any disadvantages derived from weakening the authority of landlords over tenants."

My own outlook on these tenancy problems is precisely the same as that of Lord Hailey. We can not expect any Legislative measures to produce universal contentment and loyalty among the agricultural population. But I suggest that it is a matter of great importance, particularly at the present time, not to allow patent and obvious grievances to continue, for I regard it as certain that if they do continue, they will before long be made the basis of a really dangerous agitation. If we could avoid serious grounds for discontent among the agricultural population, we shall have achieved a great deal.

3. There is one other point which I feel ought to be brought out. It is, I think, assumed by the Hon'ble Premier that the policy which he advocates will give full satisfaction to the tenants, and that on becoming proprietors they will become contented and loyal. I think the history of recent years shows clearly that assumption cannot be made. If I were to ask myself what is the area in which in the last ten years the most serious agrarian agitation has developed and the most extreme disloyalty has been shown, I should have no hesitation in answering that it was Bardoli, an area of peasant proprietors. The Government in such cases is dealing directly with the peasant proprietors, and some would hold that the likelihood of a serious conflict is greater under those conditions than it is under the Zamindari with which we are familiar.

سر ہیری ہیگ کے نوٹ میں جس ۱۹۳۲ء کی تجویز کی طرف اشارہ ہے وہ بھی میرا ہی نوٹ تھا۔ اس تجویز کے متعلق مسٹر بم فورڈ (سینیر ممبر بورڈ مالگذاری) اور مسٹر وا (جو سر آر تھروا ہوئے) ان کے نوٹ ہیں۔ جس میں اس تجویز کو عملی جامہ دینے کی دشواریاں بیان کی گئی ہیں۔

گورنر کے اس نوٹ کے بعد میری تجویز کی کامیابی نہایت دشوار ہوگئی۔ تاہم لوگوں نے زمینداروں کی ایک میٹنگ کی۔ یہ میٹنگ میرے گھر ہوئی۔ نواب سر مزمل

اللہ خاں مرحوم مہاراجہ جہانگیر مرحوم اور دوسرے بہت سے زمیندار اور تعلقدار جمع ہوئے۔ انہیں حق موروثی بھی دینے سے اتفاق نہ تھا۔ کاشتکار کو زمیندار بنانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

مجھے افسوس ضرور ہوا مگر تعجب ذرا بھی نہیں ہوا۔ دوسروں کو قربانی کا مشورہ دینا آسان ہے مگر خود قربانی دینا بہت مشکل ہے۔ اس واسطے زمیندار صاحبان کے طرز پر مجھے تعجب نہیں ہوا لیکن افسوس ضرور تھا۔ اس لئے کہ ان کا مستقبل خود اس پر منحصر تھا کہ کاشکار مطمئن ہے یا نہیں جمہوری طرز حکومت قدرتاً سوشلزم کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور جمہوریت تسلیم کرنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ بڑے اور چھوٹے، امیر و غریب کاشتکار اور زمیندار مزدور اور مالکان کارخانے جات کے درمیان اقتصادی فرق کو کم کیا جائے۔ کوئی سیاسی پارٹی کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگر پچھتر فیصدی دیہاتی رقبہ کے رائے دینے والے اس کے ساتھ نہ ہوں۔

برٹش افسران کو اس تجویز سے قلباً اتفاق نہ تھا۔ جس کی وجہ سے گورنر کے نوٹ کے آخری حصے سے صاف ظاہر ہے۔ اس لئے کہ پھر کاشتکار سے حکومت کا معاملہ براہِ راست ہوتا اور ایک بدیشی حکومت اس سے ہمیشہ بچنا چاہے گی۔ آج اپنی حکومت ہونے کے باوجود یہ دشواری ہمارے سامنے ہے۔ حال میں یو۔ پی میں پچیس فیصدی لگان میں اضافہ کیا گیا بعد میں کاشکاروں میں بے چینی کا خیال کر کے اسے چھوڑنا پڑا۔

بہرحال ایک کمیٹی بنائی گئی جو اس پر غور کرے کہ کاشتکار کو کیا مزید حقوق دے جائیں نیز یہ کہ قرضہ کے بارے اسے کس طرح سبکدوش کیا جائے۔

یہ ظاہر تھا کہ ایسی وزارت جس کو قانون ساز جماعت کی یعنی اسمبلی کی تائید حاصل نہ ہو ایسے دور رس اصلاحات کیسے کر سکتی تھی۔ لیکن مجھے اس تجویز پر اصرار اس وجہ سے تھا کہ یہ تجویز زمیندار کاشتکار دونوں کے واسطے (اس کے مقابلہ میں کہ جو آخر کار ہوا) کہیں زیادہ مفید تھی۔

اول کاشتکار کا لیجئے میری تجویز سے کاشکار معہ حقوق کے زمیندار ہو جاتا۔ اور جس طرح وقت تک خریداری کا روپیہ ادا نہ ہوتا وہ اتنا روپیہ گورنمنٹ کو دیتا جتنا کہ زمیندار کو دے رہا تھا لیکن مال گذاری کے حساب میں اتنی ہی رقم لی جاتی جتنی کہ گاؤں ۔

کے پرتہ سے اس کی زمین پر آتی اور باقی رقم گورنمنٹ کے قرضے میں محسوب ہوتی جو چند روز میں بیباق ہو جاتا موجودہ قانون کے تحت یہ ہوا کہ فرد کے بجائے حکومت زمیندار بن گئی زمیندار کے زمانہ میں لاکھوں روپیہ کی بقایا رہ جاتی تھی اب ایک پیسہ بقایا نہیں رہتی۔

بجائے ایک کمزور زمیندار کے ایک ایسا طاقتور زمیندار پیدا ہو گیا جس کے ہاتھ میں تمام قسم کی طاقتیں ہیں انتظامی طاقت۔ قانون سازی کی طاقت کلیتاً اس کے قبضہ میں اور عدالتیں اس کی ماتحت ہیں۔

دوسرے زمیندار کے نقطۂ نظر سے میری تجویز سے تبدیلی بتدریج ممکن ہے چار پانچ برس لگتے۔ زمیندار کو نقد قیمت ملتی اور نئے حالات سے مطابقت کرنے اور نیا ذریعہ معاش بنانے کا موقع ملتا۔

ایسی بنیادی تبدیلی کو یک لخت دفعتاً کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہات کے سماج کا انتظام تہ و بالا ہو گیا جرائم کی کثرت ہو گئی اور دیہاتی رقبہ میں ایسے عناصر پیدا ہو گئے جو سماج اور حکومت دونوں میں سے کسی کا احترام نہیں کرتے۔ یو۔ پی پولیس کمیشن کے سامنے افسران پولیس کا متفقہ خیال تھا کہ دیہاتی رقبے میں جرائم کی کثرت کی وجہ سے سب سے بڑی یہ ہے کہ زمینداری کے یکا یک ختم ہو جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا وہ بھرا نہ جا سکا۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے کاشتکار بہت مقروض تھا۔ ہم نے ۱۱؍ جولائی ۱۹۳۷ء میں غیر معمولی گزٹ کے ذریعہ ایک قانون کا مسودہ شائع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مصالحت باہمی کے واسطے افسران مقرر کیے جائیں جو سود کی شرح کو کم کرائیں اور کاشتکار کے لئے آسان قسطیں مقرر کرائیں۔

میں نے ایک دشواری اور محسوس کی۔ یہ پہلی گورنمنٹ جس میں تمام ممبر ہندوستانی تھے لیکن ہم سب یہ محسوس کرتے تھے کہ گورنر کے اختیارات ویسے ہی تھے جیسے ۱۹۳۵ء کے قانون سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ اکثر گورنر گورنمنٹ کی میٹنگ کی صدارت کرتے اور میرے شرکاءِ کار اور ممبران حکومت گورنر کی رائے کا خیال اور لحاظ اپنی طے شدہ پالیسی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کرتے تھے۔

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نئے قوانین تو وہی حکومت بنا سکتی ہے جس کی نسبت میں اکثریت ہو لیکن انتظامی اختیارات کا استعمال کر کے جو کچھ خدمت کی جا سکے کرنی چاہیے۔ چنانچہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کی کیبنٹ کی میٹنگ میں یہ مسئلہ میں نے پیش کیا کہ آب پاشی کی شرح کو کم کر دیا جائے مالگذاری کے وزیر راجہ مہیشور دیال نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اس زمانہ میں اناج کے نرخ میں ارزانی تھی اور کاشتکار کو مدد کی ضرورت تھی۔

دوسری میری تجویز یہ تھی کہ جب ایک ہندوستانی حکومت قائم ہو گئی ہے تو جتنے سیاسی قیدی تھے یعنی جن کا فعل اخلاقی اعتبار سے جرم نہیں تھا ان کو رہا کر دیا جائے۔ اگر وہ پھر قانون شکنی کے مرتکب ہوں گے تو حکومت دوبارہ گرفتار کر سکتی ہے۔ منشاء یہ تھا کہ سیاسی طبقہ کے لوگوں کو اس کا احساس ہو کہ حکومت کی پالیسی میں امید افزا تبدیلی آئی اور گورنر کو میری تجویز سے غالباً اتفاق نہ تھا۔ مجھے اس کا اندازہ مہاراج کنوار وزیا نگرم (وزیر حکومت) کے خط مورخہ ۲۸ جون سے ہوا۔ جس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ گورنر سے ان کی گفتگو ان دونوں تجاویز پر ہوئی۔ پھر اپنی رائے تحریر کی کہ ان دونوں تجاویز کے خلاف تھے۔ چنانچہ جب گورنمنٹ کی میٹنگ میں یہ تجاویز پیش ہوئیں تو سرہیری ہیگ کو تو اختلاف تھا ہی دوسرے وزراء میں راجہ اترولا اور سلیم پور کے علاوہ سب نے مخالفت کی اور یہ دونوں تجاویز ختم ہو گئیں۔

اخبار نویسی کا معیار

میں نینی تال گیا اور حسب عادت پنڈت گوبند بلبھ پنتھ آنجہانی سے بھی ملنے گیا۔ میں نے کبھی سیاسی اختلافات سے ذاتی تعلقات کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ جمہوری حکومت کو کامیاب بنانے کے لیے ایسا کرنا از بس ضروری ہے۔ ورنہ سیاسی اختلاف دشمنی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ذاتی ناگواری اور مخالفت کے گرد و غبار کی وجہ سے بجا اور بے جا کی تمیز نہیں رہتی۔ دوسرے کی اچھی بات بھی بُری معلوم ہونے لگتی ہے۔

لیڈر اخبار کے نمائندے کو یہ خبر ملی تو اس نے فوراً ایک کارٹون ۲۵ / جون

۱۹۳۷ء کے اخبار میں شائع کیا جس میں مجھے زنانے کپڑوں میں دکھایا۔ گو بند بلبھ پنتھ آنجہانی سامنے بیٹھے ہیں اور سر ہیری ہیگ گورنر پس منظر میں حیرت سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں شراب کا جام لئے ہوئے رقص کناں پنتھ جی کی طرف جا رہا ہوں۔ مگر دوسرے ہی روز سری۔ وائی چنتامنی نے حسب ذیل نوٹ لیڈر میں شائع کیا اور مجھے معافی کا خط بھی لکھا۔

We deeply regret the publication by inadvertence of the Cartoon that inserted in yesterday's Leader. It did the grossest injustice to the Nawab of Chhatari. Most courteous among men and uncommonly tolerant of political differences, the Nawab Saheb has made it a rule of life never to fail in the social obligation of courtesy; calls on friends, be they as poles apart in matters political, and he himself explained to a press interviewer there was no manner of political significance in his visit to Mr. Pant at Nainital. That after this he should have been lampooned as he was in the said cartoon, and in the columns of the leaders, fills us with sadness and shame. We apologize to the Nawab Saheb for this unfairness and discourtesy to him, never contemplated by us.

اخبار نویسی میں تنقید یا تعریف ہوتی ہی ہے لیکن اگر یہ یقین ہو جائے کہ اعتراض غلط تھا تو پھر اسے تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں ہونا چاہئے۔

سری۔ وائی چنتامنی اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اخبار نویسی اور سیاسی زندگی میں جو روایات اور جو اصول انہوں نے چھوڑے ہیں وہ یقیناً قابل تقلید ہیں وہ کبھی کسی مخالف کی کمزوری سے بیجا فائدہ نہیں اٹھاتے تھے اگر کوئی بات بہ صیغۂ راز آپ انہیں بتا دیں تو کبھی اس علم کو اپنی کسی تحریر یا تقریر میں آپ کے خلاف استعمال نہ کرتے تھے۔

اس دوران میں کانگریس اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر جون میں ایک خط میں نے گورنر کو لکھا جس میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ میرا حکومت بنانے پر راضی ہونا فقط اس وجہ سے تھا کہ کانگریس باوجود کونسل میں اکثریت کے حکومت بنانے سے انکار کر رہی تھی جس کا نتیجہ غیر ذمہ دار ملازمین

سرکار کی حکومت ہوتی۔ میں نے گورنر کو مشورہ دیا کہ اب پھر ایک بار کانگریس کو دعوت دی جائے کہ وہ حکومت بنائیں۔ یہ خط جون ۱۹۳۷ء کی ۳۰ر تاریخ کا ہے۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

Since then several statements have been issued by the Secretary of State and by the Governor's of the Provinces clarifying the constitutional position and explaining it to the majority party. On the other side, Mahatma Gandhi has also issued several statements. In his last statement, according to the papers, he as said that the Congress is "being talked at instead of being talked to". The implication of this, to my mind, was that the congress, on whose behalf he speaks, wished even then for another offer of office. Since then His Excellency the Viceroy has made a statement which, to my mind, makes the constitutional position absolutely clear, and there can be no valid ground now for the Congress to refuse office. I feel that the natural sequel to my statements about making room for the Congress is that I should now request your Excellency to give the majority party another chance to come in if they wish to do so. I hope, therefore, that your Excellency give them the opportunity now, and that in doing so your Excellency will assure them that the present Cabinet will make way for a majority party Ministry as soon as the latter is willing to function."

کچھ روز بعد وردھا میں ۵ر جولائی کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی (عاملہ) کی میٹنگ ہوئی۔ اور اس میں یہ طے پایا کہ کانگریس کو حکومت بنانی چاہئے چنانچہ ہم لوگوں نے استعفیٰ دیدئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۶ر جولائی کو ہم لوگ سبکدوش ہو گئے اور کانگریس کی حکومت بن گئی۔

اس زمانہ میں ابن سعید خاں میرا بیٹا نصیب دشمنان علیل تھا اور میں نے پنتھ جی کو لکھا کہ ایک ہفتہ میں اسی مکان میں رہنا چاہتا ہوں انہوں نے خوشی سے اجازت دی۔ میں ان کا شکریہ ادا کرنے ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ میں سن رہا ہوں کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر حکومت بنائیں گے۔ میں اس پر آپ

کومبارکباد دیتا ہوں۔ آپ کا یہ اقدام ملک کے واسطے فال نیک ہوگا۔ اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کردے گا میری پارٹی نے انتخاب میں مقابلہ کیا اور اب اسمبلی میں رہ کر میں مخالف پارٹی کے فرائض انجام دوں گا۔ چنانچہ پہلا مخالف پارٹی کا لیڈر Leader of opposition میں ہوا۔

مسلم لیگ اور کانگریس میں کیوں اختلاف ہوا اور الیکشن میں دوش بدوش رہنے کے باوجود حکومت بنانے میں کیوں یکجانہ ہو سکے۔ ان کی تفصیلات کا علم براہ راست مجھے نہیں ہے مجھے تو لیگ اور کانگریس دونوں مخالف خیال کرتے تھے اور راز و نیاز کے دائرہ سے میں اور میرے ساتھی بہت دور تھے۔ شعر

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

میں چودھری خلیق الزماں کی کتاب (Pathway to Pakistan) اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی کتاب (India wins freedom) سے مدد لے کر اپنی یاد داشت کو تازہ کر رہا ہوں۔ ان دونوں حضرات کے بیان میں واقعات کی حد تک کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ ہاں اسباب واحوال مقصد اور منشاء کے متعلق اختلاف ہے۔ اور وہ لازمی تھا۔ مولانا مرحوم کانگریس کے چوٹی کے رہنما تھے اور ہندوستان میں کتاب لکھ رہے تھے۔ چودھری صاحب مسلم لیگ کے رہبر تھے اور پاکستان میں بیٹھ کر کتاب تصنیف کر رہے تھے اور وہاں کے حالات سے متاثر تھے۔ لیکن یہ بات ہر دو حضرات کے بیان سے ثابت ہے کہ مسلم لیگ اپنے دو وزیر چاہتی تھی اور کانگریس ایک وزیر کی جگہ دینے پر راضی تھی۔ مولانا مرحوم کی کتاب (India wins freedom) کے صفحہ ۱۶۰/ اور ۱۶۱ پر جو عبارت تھی اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل اس زمانہ میں مسلم لیگ کے یو۔ پی میں لیڈر تھے جب میں گورنمنٹ بنانے لکھنؤ پہونچا تو میں نے ان دونوں سے گفتگو کی۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ نہ صرف کانگریس کے ساتھ تعاون کریں گے بلکہ کانگریس کے پروگرام کی پوری تائید بھی کریں گے۔ وہ قدرتاً یہ امید کرتے تھے کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ کا بھی کچھ حصہ ہو مقامی حالت ایسی تھی کہ ان میں سے کوئی تنہا

حکومت میں شریک نہیں ہو سکتا تھا یا دونوں ہوں یا ایک بھی نہ ہو۔ لہٰذا میں نے انہیں یہ امید دلائی کہ دونوں حکومت میں لئے جائیں گے اگر سات آدمیوں کی حکومت بنی تو دو مسلم لیگ اور باقی کانگریس کے ممبر ہوں گے اگر نو کا کابینہ بنا تو کانگریس کی اکثریت اور واضح ہو گی۔ بحث کے بعد ایک نوٹ لکھا گیا جس کا منشاء یہ تھا کہ مسلم لیگ پارٹی کانگریس کے ساتھ تعاون کرے گی اور کانگریس کا پروگرام منظور کرے گی۔ نواب اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں دونوں نے اس پر دستخط کئے"۔

اس کے بعد صفحہ ۱۶۱ پر مولانا نے لکھا ہے کہ بہار کی واپسی پر جب الہ آباد آئے تو انہیں یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ پنڈت جواہرلال نے خلیق الزماں اور اسماعیل خاں کو یہ لکھ دیا کہ فقط ایک شخص مسلم لیگ کی طرف سے حکومت کی کابینہ میں لیا جائے گا۔ اور مسلم لیگ اسے طے کرے کہ وہ کون ہو اس پر مسلم لیگ نے شرکت سے انکار کر دیا۔ خلیق الزماں صاحب نے اپنی نوشتہ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ وہ ایک تہائی جگہ مانگتے تھے یعنی "چھ میں دو" بہر حال مسلم لیگ دو نشست کابینہ میں مانگتی تھی اور کانگریس ایک دینے کو تیار تھی۔

اس کے علاوہ دوسری وجہ اختلاف یہ ہوئی کہ کانگریس نے ایک بیان مسلم لیگ کو دیا۔ اس پر مسلم لیگ والوں کے دستخط درکار تھے۔ یہ خلیق الزماں نے اپنی نوشتہ کتاب میں دیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

The Muslim League group in the United Province's legislature shall cease to function as a separate group.

The existing members of the Muslim League Party in the United Provinces Assembly shall become part of the Congress Party and will fully share with other members of the Party their privileges and obligation as members of the Congress party. They will similarly be empowered to participate in the deliberation of the party. They will likewise be subject to the control and discipline of Congress Party in equal measure with other members and decisions of the Congress Party, as regards work in Legislature and general behaviour of its members, shall be binding on them. All

matters shall be decided by a majority vote of the party, each individual member having one vote.

The policy laid down by the Congress Working Committee for their members in the Legislature along with instructions issued by the competent congress bodies pertaining to their work in such Legislatures shall be faithfully carried out by all members of the Congress Party including these members.

The Muslim League parliamentary Board in the United Provinces will be dissolved, and no candidates; dates thereafter be set up by the said Board at any bye-election. All members of the Party shall actively support any candidate that may be nominated by the Congress to fill up any vacancy occurring hereafter.

All members of the Congress Party shall abide by the rules of the Congress and offer their full and genuine co-operation with a view of promoting the interest and the prestige of the Congress.

In the event of the Congress Party deciding on resignation from the Ministry or from the Legislature the members of the above mentioned group will also be bound by that decision.

مجھے مولانا مرحوم کے اس بیان سے کامل اتفاق ہے۔ جو صفحہ ۱۶۱ پر درج ہے " کہ یہ بڑی بدقسمتی کی صورت ہوئی۔ اگر یو۔ پی میں لیگ کے تعاون کو منظور کرلیا گیا ہوتا تو مسلم لیگ پارٹی عملاً کانگریس کا ایک جزو بن گئی ہوتی "۔

مسلم لیگ کا مقصد اس زمانہ میں ڈومینین اسٹیٹس Dominian Status تھا۔ لیکن کانگریس کی ہم آہنگی کی واسطے اسے .. آزادی کامل اپنا مقصد بنایا اس سے ظاہر ہے کہ لیگ تعاون کے واسطے تیار تھی اس لئے اس نے اپنا سیاسی موقف بدلا تاکہ کانگریس پارٹی کو مسلم لیگ سے ملنے میں کوئی پس وپیش نہ ہو۔ اس کے بعد ناکامی کا اثر جو لیگ والوں پر ہوا وہ ظاہر ہے۔

ہم سے ملنا تجھے اے چرخ گوارہ نہ ہوا

لاکھ ہم تیرے ہوئے تو ہی ہمارا نہ ہوا

مجھے یقین ہے یہ کانگریس نے غلطی کی کوئی چھوٹا دریا کسی بڑے دریا میں مل جاتا ہے تو وہ اسی کا ایک حصہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لیگ کانگریس میں ضم ہو جاتی اور اس کی علیحدہ حیثیت باقی نہ رہتی اور ہندوستان سے باہمی اعتماد پیدا ہو جاتا اور شکوک و بدگمانی کے غبار سے فریقین نگاہیں محفوظ رہتیں۔

وزارت سے استعفیٰ کے بعد

میں مخالف پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے اسمبلی میں کام کرتا تھا۔ کانگریس نے اس قدر وعدے کر ڈالے تھے کہ ان کا پورا کرنا مشکل تھا میں پرانی تقریریں اور وعدے یاد دلا کر تنقید کرتا تھا مثلاً انتظامی اختیارات (Executive Function) اور عدالتی اختیارات (Judical Functions) کو الگ کرنا عنان حکومت ہاتھ میں آنے کے بعد کانگریس کو گوارہ نہ تھا کہ عدالتوں کو بالکل آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ آج تک جوڈیشنل مجسٹریٹ کلکٹر اور کمشنر ہی کے ماتحت ہیں۔ حالانکہ انگریز کے زمانہ میں یہ کانگریس کا بنیادی اصول تھا۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک ناکام کوشش کی مگر ڈاکٹر کیجو نے فقط ٹالا، نہ اقرار کیا نہ انکار۔

میرے علم میں یہ آیا کہ حکومت نے افسران کو ایک گشتی مراسلہ روانہ کیا ہے جس میں انہیں بتایا گیا ہے کہ کانگریس کے ممبران کے ساتھ ان کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے اس کی نقل حسب ذیل ہے۔ جو سات مارچ ۱۹۳۸ء میں اسمبلی میں رکھی گئی۔

Circular referred to in Anser to starred question No. 7 for 7th March 1938, asked by Nawab Br. Sir Mohammad Ahamd Said Khan.

D O. No. 712/III

United Provinces civil Secretariat,
Lucknow.
November 10, 1937.

Dear Sir,

In the course of last three months since the present

Government assumed office frequent reports have been received from Government servants in which Congress Supporters are stated to have adopted an embarrassing attitude towards the District Authorities, and a very large number of complaints have similarly reached Government from Congress workers against the behaviour specially of the lower grades of Government officials. The Government is of opinion that such complaints and counter-complaints only tend to engender and crystallize an attitude of mutual suspicion, which is in every way opposed to the public-interest. They feel therefore, that the time has come when determined efforts should be made by the officers of the Government to establish relations of mutual confidence with the District Leaders of the Congress Organization.

A letter will be addressed to you shortly on the position of the Government and the second letter on the measures contemplated by Government to check corruption in the Public services. All these letters read together will give a synoptic view of the Government policy in regard to the position of services generally. In this letter I am to emphasize the importance of the establishment of relations of mutual confidence between the two. Government officials, whether Revenue or Police are the executive of Government. They have certain statutory powers and responsibilities and various other functions to perform. They are the agents though whom the orders or the policy of the Government is given a concrete shape and there is no question of substituting any other agency for this purpose. The Congress on the other hand represented a large body of public Opinion and is the party on the support of which the present Government rests. The Congress is naturally anxious of the institutions and functionaries. It is also interested in seeking all relevant information and bringing to the notice of the authorities appropriate cases and facts of redress and relief and in seeing that malpractices and neglect of duty on the part of public servants should be enquired into and corrected. It is the duty of Government servants concerned

to deal with complaints of this nature which are brought to their notice, and to make it clear that they are giving due attention to them. Object of the Government and the Congress alike must be that the official agency functions with the maximum of efficiency and with the full confidence of the public, and this confidence and harmony are established between the district authorities and the leaders of the Congress Organization in the districts. How best to set about establishing more friendly and co-operative relations in each district is a matter primarily for the district officers themselves to consider, but I am to point out that my successful method in this direction pre-supposed, sympathy, accessibility and impartiality, and that is important that the representatives of the Congress organization in their respective areas. The congress committees are being addressed in a similar sense by the United-Provinces Congress Committee.

Yours faithfully
C.N, Gwynne
Chief Secretary

To - All District Magistrate,
United Provinces.

مجھے ایسے اقدام پر اعتراض نہ ہوتا اگر اس گشتی مراسلہ میں کانگریس کے بجائے ''پبلک یا شہری'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہوتا۔ لیکن حکومت کا اپنی سیاسی جماعت کا نام لے کر ملازمان سرکار کو تعاون کی ہدایت کرنا نامناسب تھا گو طرز تحریر میں احتیاط برتی ہے اور پبلک کی شکایات اور ملازمان سرکار کی بدعنوانی کا ذکر بھی ہے۔ لیکن اصل منشاء اس گشتی مراسلہ کا یہ تھا کہ ملازمین سرکار مقامی کانگریسی لیڈروں کے اثر سے متاثر ہوں اور ایسا ہی ہوا۔

ملازمین سرکار کو سیاست سے تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ ان کے نزدیک ہر شہری کی حیثیت یکساں ہے اور ہونی چاہئے۔ اس گشتی میں انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ ایک سیاسی پارٹی کے ممبروں کے ساتھ ترجیحی برتاؤ کریں اور افسران کی فراموشی اور غلطیوں

کا حوالہ دے کر انہیں ڈرا بھی دیا کہ اگر ان کی شکایت ہمارے کان تک آئے گی تو باز پرس کی جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع کے افسران مرعوب ہو گئے۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھے کہ اگر کانگریس کے ممبر ناخوش ہوں گے تو ان کی شکایتیں کریں گے اور انہیں جواب دہی کرنا پڑے گی۔ ان کا مرعوب ہو جانا قدرتی تھا۔

جمہوری نظام حکومت میں ملازمین سرکار کا آزادانہ غیر جانب دار رہنا نہایت ضروری ہے ورنہ انصاف نہیں ہو سکتا ملازمین سرکار کا فرض قانون کی پابندی ہے۔ انہیں اس سے بحث نہیں ہونی چاہئے کہ جو شخص قانون کی زد میں آتا ہے اس کے سیاسی عقائد کیا ہیں اس کا مذہب کیا ہے اور وہ کس سیاسی جماعت سے متعلق ہے۔

اُردو مقام اسمبلی

۱۹۳۸ء کی روئیداد میں ایک اور چیز نظر سے گذری گو کانگریس کی گورنمنٹ تھی پنتھ جی آنجہانی وزیر اعظم شری پرشوتم داس ٹنڈن اسپیکر تھے لیکن اُردو کو یو۔ پی کی ایک زبان تسلیم کرنے میں کوئی دقت نہ تھی۔

یکم اپریل ۱۹۳۸ء کی اسمبلی کو روئیداد میں حسب ذیل بیان ٹنڈن جی آنجہانی کا بحیثیت اسپیکر درج ہے۔ یہ بیان اردو اور ہندی میں دیا گیا۔

آنریبل اسپیکر:

ان ممبران صاحبان کو جنہوں نے بار بار مجھے لکھا تھا اور زبانی بھی اس ہاؤس میں جنہوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کو اسمبلی کی کارروائی کے کاغذ اردو اور ہندی میں ملا کریں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آج سے میرا ایسا انتظام ہو گیا ہے کہ آج اور قریب قریب برابر آئندہ میں کل کاغذات جن پر یہاں کام ہوتا ہے، ہندی اور اردو میں دے سکوں گا۔ چنانچہ آج کے سوالوں کا ترجمہ اور کارروائی کے دوسرے کاغذوں کا بھی ترجمہ یہاں میز پر موجود ہے۔ میرے دفتر کے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کن لوگوں کو اس ترجمہ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ذرا کھڑے ہو جائیں تو دفتر کے لوگ وہاں پر فوراً ہندی اور اردو میں یہ چیزیں پہنچا دیں''۔

اس وقت تک اُردو اور ہندی کا کوئی اختلاف نہ تھا اور حقیقتاً ہونا بھی نہیں چاہیئے دونوں اس ملک کی زبانیں ہیں۔ اور دہلی و یو۔ پی تو اردو کا گھر ہے۔ ہندو اور مسلمان تہذیب کے سنگم اور ملنے سے پیدا ہوئی۔ ہندو مسلمانوں میں برادرانہ محبت کی تصویر اردو زبان ہے جب وہ پالیسی کیوں تھی اور اب یہ کیوں ہے۔ اس کا جواب میری فہم وفراست سے باہر ہے۔ آزادی کامل کے حصول سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ توقع یہ تھی کہ ہر شخص کی زبان اور کلچر کی حفاظت حکومت خود کرے گی اور اردو تو خاص کرا س کی مستحق تھی جو ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوئی تھی پھر اس کے ساتھ یہ طرز عمل کہ اردو کوئی زبان ہی نہیں۔ بہت دل شکن ہے۔ آزادی کامل کا یہ تصور کبھی خیال میں نہ تھا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یو۔ پی کی اسمبلی میں کام ہوتا رہا۔ جو کانگریس میں نہ تھے وہ مخالف پارٹی کے فرائض انجام دیتے رہے مجھے اس کی تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں اسمبلی کی کاروائی کی رپورٹ میں وہ سب درج ہیں۔

زمینداروں کی تباہ کُن غلطی

گورنمنٹ کی طرف سے ایک بل قانون لگان کے متعلق پیش ہوا۔ جس میں کاشتکاروں کو حق موروثی دینے کے علاوہ بہت سی دوسری تجاویز ایسی تھیں جو غیر منصفانہ طریقہ سے زمیندار کے لئے نقصان رساں تھیں۔ زمینداروں کی پریشانی قدرتی تھی۔ مگر اس کا علاج کیا ہو۔ اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے یہ پہلی جمہوری حکومت تھی۔ زمینداروں کو اسمبلی میں اکثریت کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔ ان کے خیال میں دو ہی علاج تھے یا تو گورنر کے پاس ڈپوٹیشن جائے۔ یا عدالت میں مقدمہ دائر کیا جائے جمہوری طرز حکومت سے جو دشواریاں پیدا ہوں ان کا علاج جمہوری طریقہ سے کرنا نہیں آتا تھا۔ چنانچہ ایک روز ٹیلیفون آیا کہ مہاراجہ جہانگیر آباد کی کوٹھی پر میٹنگ ہے فوراً آیئے۔ حضرت گنج کی سڑک پر یہ کوٹھی ہے۔ میں فوراً حاضر ہوا۔ مہاراجہ سر اعجاز رسول مرحوم برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ تھے۔ وہ اور چند تعلقدار صاحبان موجود

تھے سرتیج بہادر سپرو آنجہانی چودھری نعمت اللہ صاحب سروزیر حسن سرسلطان احمد (پٹنہ) یہ سب تشریف فرماتھے اور قانونی چارہ جوئی پر بحث ہورہی تھی۔ قانون پیشہ حضرات کی رائے متفقہ نہ تھی۔ سر سلطان احمد اور وزیر حسن مرحومین کا یہ خیال تھا کہ کم ازکم تعلقداران اودھ کا معاملہ ایسا تھا کہ عدالت سے دادرسی کی امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن سرتیج بہادر سپرو اور چودھری نعمت اللہ مرحوم کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ سرتیج کے الفاظ آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ فرمایا تھا۔

(Gentlemen you have lost your battla political field by loosing election you can't win it through jadicial fields.)

اس کے علاوہ بعد عدالتی کاروائی کا خیال ختم ہوگیا۔ اسی جلسہ میں یہ تجویز بھی ہوئی کہ ایک ڈپوٹیشن گورنر کے پاس جائے اور میں اس کی قیادت کروں لیکن میں نے اس سے اختلاف کیا۔ میں جانتا تھا کہ گورنر کوئی مداخلت نہ کریں گے۔

زمینداروں کے سامنے سوال یہ تھا

چیست یارانِ طریقت بعدازیں تدبیر ما

سرجگدیش پرشاد آنجہانی نے جو اس زمانہ میں وائسرائے کی مجلس عاملہ (ایگزیکٹو کونسل) کے ممبر تھے ہم لوگوں کی رہبری کی۔ وہ مجھ سے اور دوسرے تعلقداروں وزمینداروں سے ملے۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ کانگریس ہائی کمان کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا جائے۔

مجھے ان کی اس رائے سے حرف بہ حرف اتفاق تھا۔ الیکشن کے نتیجہ سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ دیہاتی رقبہ کانگریس کے زیراثر تھا اور کاشتکار کانگریس کے پروپیگنڈے اور وعدوں کی وجہ سے زمینداروں کی حمایت پر تیار نہ تھا۔ پھر زمینداروں میں اتحاد عمل نہ تھا۔ وہ کسی قربانی کے لئے تیار نہ تھے۔ الیکشن کے واسطے روپیہ جتنا چاہیئے جمع نہیں کرسکتے تھے تو پھر جنگ کیسی صلح کے سوا کیا چارہ تھا۔

چنانچہ سرجگدیش پرشاد کی مدد سے کانگریس کے ہائی کمانڈ سے خط وکتابت شروع کی گئی اور ۲۱ رستمبر ۱۹۳۸ء کو زمینداراور تعلقداروں نے ایک سردار پٹیل کو لکھا۔

جس کا جواب حسب ذیل آیا۔

All India Congress Parliamentary Sub Committee

Chairman
Sardar Vallabhbhai Patel
28th September, 1938

Birla House,
New Delhi

My dear Nawab Saheb,

I have received your letter of the 22nd inst. With reference to the objections to the provisions of the U.P. Tenancy Bill raised by your deputation, viz. those relating Sir, ejectment & tree, when you saw us on the 21st inst. We are prepared to look further into the matter and consider what you may have to say in this connection, provided you are in a position to assure us that our decision will be accepted by the Landlords.

Yours sincerely
Vallabh Bhai Patel

اس کے بعد ۱۱ر اکتوبر کو میں نے اور ایک خط خواجہ عبدالمجید صاحب مرحوم نے پھر سردار پٹیل کو لکھا جس میں یہ خواہش کی کہ جب تک زمیندار اور گورنمنٹ یو پی کے درمیان اختلافی مسائل طے نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ قانون اسمبلی میں پیش نہ کیا جائے۔

کانگریس ہائی کمانڈ نے یو۔ پی کے قانون لگان کے مسئلہ کو سردار پٹیل مولانا آزاد اور بھولا ڈیسائی کے سپرد کیا تھا۔ میں نے مولانا کو بھی خط لکھا۔ جن کے جواب کی نقل حسب ذیل ہے مولانا کا خط اردو میں اُنہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

نقل خط

۳۰ر ستمبر ۱۹۳۸ء
دہلی

مکرمی والا نامہ پہونچا۔ میں منتظر تھا کہ اس معاملہ پر غور کرنے کی نوبت

آئے تو نتیجہ سے آپ کو مطلع کروں۔ امید ہے دفتر سے باقاعدہ خط آپ کو مل گیا ہوگا۔ جو طرز عمل ہم نے بہار میں اختیار کیا تھا یہاں بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ حضرات ہمارا فیصلہ منظور کر لینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ یقیناً اس سے اتفاق کریں گے کہ بغیر کسی ایسی بنیادی مفاہمت کے معاملہ کو آگے بڑھانا عملاً سود مند نہیں ہوسکتا۔ پارلیمنٹری کمیٹی اس بارے میں جو کر سکتی تھی اس کے لئے وہ آمادہ ہوگئی ہے۔ بشرطیکہ آپ کو بھی جو کچھ کرنا چاہئے اس کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

جناب نواب سر احمد سعید خاں صاحب رئیس چھتاری
راحت منزل، علی گڑھ

ان خطوط سے یہ ظاہر ہے کہ کانگریس ہائی کمانڈ مداخلت کرنے کو فقط اسی شرط سے تیار تھی کہ زمینداران یو۔ پی معہ تعلقداران اودھ اس پر راضی ہوں کہ ان کے اس فیصلہ کو وہ قبول کرلیں گے۔

چنانچہ ۱۶راکتوبر کو الہ آباد میں زمیندار ایسوسی ایشن کی میٹنگ کی گئی اور میں نے مظفر نگر کی ایسوسی ایشن کو بھی لکھا۔ دونوں جگہ سے زمینداران صوبہ آگرہ نے اپنی رضامندی کی قرارداد منظور کیں۔ یعنی کانگریس ہائی کمانڈر کا فیصلہ ہمیں قبول ہوگا۔ لیکن تعلقداران اودھ اس میں شریک نہیں ہوئے اور ان کی ایسوایشن کی طرف سے حسب ذیل تار پریسیڈنٹ نے مجھے دیا

Your letter of the 12th. Held Executive committee meeting on 14th. Unanimous opinion against arbitration but postponed final decision. Impossible for me or any other to attend Allahabad conference today. To avoid conflict of opinion please pospone decision or decide against arbitration. President, of British Indian association.

یہ زمینداروں کی بدنصیبی تھی کہ تعلقدار اودھ اپنے طبقہ کو اس وجہ سے زمینداروں سے الگ خیال کرتے تھے کہ ان کے پاس برٹش حکومت کی دی ہوئی اسناد تھیں جو انہیں واجد علی شاہ کو کلکتہ میں قید کرنے کے بعد بشرط وفاداری دی گئی تھیں۔

میں نے سردار پٹیل کو ۱۸راکتوبر کے خط میں زمینداران صوبہ آگرہ کے

فیصلہ سے مطلع کر دیا۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ تعلقداران ان کی جنرل میٹنگ ۲۷/ اکتوبر کو ہوگی۔ جس میں اس کا فیصلہ ہوگا۔ سردار نے ۲۱/ اکتوبر کو مجھے لکھا کہ چونکہ ۲۷/ اکتوبر کو تعلقداران کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ اس کا انتظار کیا جائے" ہماری کمیٹی کے فیصلہ کی روشنی میں میرے لئے یہ مناسب ہوگا کہ اس معاملہ میں قدم اٹھاؤں جب تک کہ تعلقدار بھی اس پر راضی نہ ہوں کہ ہمارا تصفیہ اُنہیں قبول ہوگا"۔

ایک جانب میں یہ کوشش کر رہا تھا۔ دوسری جانب ایک تعلقدار صاحب نے اخبارات میں اس کی مخالفت شروع کر دی۔ مجھ پر بھی الزام لگایا کہ کانگریس کی خوشنودی مدنظر ہے اور کانگریس پر بھی حملہ کئے گئے مجھے سردار پٹیل نے ایک خط لکھا جو حسب ذیل ہے۔

VALLABH BHAI PATEL

Phone: 30588
Purshotam Binding
BOMBAY -4

My dear Nawab Sahab,

Many thanks for your letter of the 21st of Oct, with the interesting enclosure.

I am sorry for the attitude of Raja Maheshwar Dayal & for those who are responsible for the propaganda in the press against your well-meaning efforts in the interest of the province. I appreciate the motives under lying your efforts. But if the Zimindars like Raja Maheswar Dayal Seth desire to taste the fruits of strife and struggle and have a war to the knife with the tenants, no one can prevent them and you cannot but leave them to reap the fruits of what they wish to sow. I have no doubt that the future will prove to them and to all that your sane attitude was the only correct one.

I am too thick skinned and thoroughly seasoned to take any notice of such unpleasant attacks in the press or on the platform.

I am sorry that your own colleagues have misunderstood you in your efforts to serve them.

Yours Sincerely,
Vallabh Bahi Patel

To,

Nawab of Chhatari,

22 Out-ram Road Lucknow

آخر کار ۲۷ر اکتوبر کو تعلقداران اودھ کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں یہ طے پایا کہ وہ فیصلہ باہمی اتفاق سے کرنے کو تیار ہیں لیکن کانگریس کے ہائی کمانڈر کو کسی فیصلہ کے نافذ کرنے کا حق دینے پر راضی نہیں ہیں۔ اس قرارداد کا وہ حصہ جسے "جانِ سخن" کہا جائے حسب ذیل ہے۔

This conference, however, feels that a permanent and satisfactory solution of such diverse and important problems upon a proper solution of which the peace and prosperity of the province depend, can only be achieved by good will and mutual agreement and that the imposition of any decision arrived at without the concurrence of those vitally affected by, it is not likely to establish that healthy atmosphere which is essential for a peaceful solution of the problem.

میں نے تعلقداران کا ریزولیشن سردار پٹیل کو بھیجا اور مجھے کسی فیصلہ کی اُمید نہ تھی مگر پھر بھی خواہش کی کہ وہ یو پی کی گورنمنٹ اور زمینداروں کے درمیان فیصلہ کریں مگر وہ راضی نہ ہوئے اور حسب ذیل جواب آیا۔

2, November 1938

My Dear Nawab Saheb

I have now received your letter for the 28th of October enclosing a copy of the resolution passed by the Land Lords of Oudh. This resolution makes it clear that the Land Lords of Oudh are not willing to accept the decision of the Parliamentary Subcommittee in the matter of the disputes between tenants and the Land-Lords arising out of the tenancy Legislation. After propagandas that was made in the pioneer by some of the Land-Lords I had no hopes of their accepting our offer. Although the tone of the resolution is conciliatory there is no mistake about the fact that our offer is courteously set aside. It would be useless to carry on negotiation unless both the parties are agreed to accept our decision. The

arbitration by the Parliamentary Sub-Committee would necessarily bind the Congress Party in the ASSEMBLY and the Congress organization in the Province in spite of what may be said or done by a few Congressmen to the contrary as the congress discipline and prestige require that the decision given by authorities of the Congress would be binding and acceptable to Congressmen and subordinate Congress organizations concerned. The Land Lord's organization is not prepared to give a similar undertaking on behalf of the Landlords. It is unfortunate that the Landlords of Oudh have been actuated by a spirit of district offer was made by us. I regret to inform you that it is not possible for us, under the circumstances, to do any thing in the matter,

Yours sincerely,
Sd/-Vallabhbahi J. Patel

Chairman
Sir Ahmad Said,
Nawab of Chhatari,
22, Outram Raod,
Lucknow.

میرے خیال میں تعلقداران نے یہ تباہ کن غلطی کی تھی زمینداری کے خاتمہ کا بنیادی پتھر اسی روز رکھا گیا جب کانگریس ہائی کمانڈ کو پنچ بنانے سے تعلقداران نے انکار کیا۔ میرا منشاء اس کوشش سے اُس قانون میں اتنا ترمیم کرانا نہ تھا جتنا یہ تھا کہ زمینداروں کے ساتھ کانگریس کو کوئی عناد اور مخالفت نہ رہے۔ لیکن جب تعلقداروں نے کانگریس ہائی کمانڈ کو پنچ بنانے سے انکار کر دیا تو باہمی بے اعتمادی میں اضافہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ آزادی ملنے کے بعد زمینداروں کو اٹھانا پڑا زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ معاوضہ اتنا کم ملا کہ اگر ودھان یعنی کونسٹی ٹیوشن میں ترمیم نہ کی ہوتی تو کوئی عدالت اس معاوضہ کو قیمت یا معاوضہ ماننے کو تیار نہ تھی۔

اقتصادی اعتبار سے زمینداری کے خاتمہ کی ضرورت نہ تھی۔ کاشتکار کا لگان و آبپاشی وہی ہے حق موروثی پہلے ہی مل گیا تھا کسان کو بجائے فائدے کے نقصان رہا۔ پہلے زمیندار ایک کمزور ایجنسی تھی کہ جو اکثر پورا لگان اور آبپاشی بھی وصول نہیں

کرسکتی تھی۔عدالت اور حکومت کی ہمدردی ہمیشہ کاشتکار کو ملتی تھی۔اب گورنمنٹ خود زمیندار ہوگئی۔ملازمین سرکار جو کچھ بھی کریں مشکل ہی سے اس کے خلاف سنوائی ہوتی ہے۔لیکن چونکہ دیہات میں زمیندار کا اثر تھا لہٰذا اس کا مٹانا سیاسی ضرورت تھی تاکہ وہ اثر کانگریس کے خلاف نہ استعمال ہو۔

اس دوران میں جرائم بہت زیادہ ہوگئے تھے۔سنگین جرائم میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ ۱۳ارمئی ۱۹۳۹ء کو سردار پٹیل نے مجھے ایک خط لکھا جس کو میں نقل کررہا ہوں۔ہندو و مسلمان،شیعہ،سنی،کاشتکار اور زمیندار کی وجہ سے بلوے ڈکیتی اور قتل اور دوسرے سنگین جرائم بڑھ گئے تھے میں سردار پٹیل کا خط اور اپنے جواب کا اقتباس شامل کررہا ہوں۔

VALLABH BHAI PATEL

Purshottam Mansion,
Opp. Opera House,
BOMBAY - 4
13th May, 1939

My dear Nawab Saheb,

I thank you for your kind letter of the 9th may appreciating my speech delivered at a big mass meeting of peasants assembled at Brindawan, I am distressed about the condition in U.P, Province which appears to be surcharged with communal bitterness. The whole atmosphere is so full of violence that there is hardly much scope for any effective good work. The Shia-Sunni tension has added fuel to the fire. The relations between the Zamindars and the Kisans were already strained; can nothing be done by responsible leaders of all groups to put their heads together and bring about a peaceful atmosphere in which honest difference of opinion can be discussed and settled in a friendly way? The unfortunate communal bitterness in U.P. filters down to the rest of the country as Provinces naturally look to them for guidance. The recent riots in U.P. is the centre of Muslim culture and other Provinces naturally look to them for guidance. The recent riots in U.P. have disgraced the fair name of both the communities and the poison is now speading in Bihar. Neither community is going to be benefited by these kinds of mad atrocities and

the poor innocent people of both communities suffer. I am sure you are equally distressed if not more about the sad state of affairs in your Province.

With kind regards,

Your sincerely,
Vallabh Bhai Patel.

The Nawab of Chhatari,
Rahat Manzil,
Aligarh, (U.P)
My dear Sardar Sahib,

Many thanks for your letter of the 13th. I most sincerely appreciate the spirit which prompted you to write to me so frankly about the general political conditions prevailing in the country at present, and particularly as thing are developing in the U.P.

You are right. I am equally distressed at the growing communal tension in these provinces. The spirit of class war between the zamindar and the tenant, the growing tendency towards violence and the general lack of respect for law is becoming most alarming. From time to time I raised my feeble voice inside the House as well as outside to check these tendencies but without any tangible effect, except, perhaps this that influential people have begum to realize where all this will lead to.

I should like to say a few words, first of all, about the maintenance of law and order as I feel that this is one of main causes of various evils you have mentioned in your letter. I have a feeling, which is shared by many in this province, that respect for law is fast going down. This is borne out very clearly by the figures supplied to me by the Government. which show a tremendous rise in the number of violent crimes such as dacoities, burgalaries, murders and riots and an alarming and steady decrease in the number of prosecutions and convictions.

In my opinion this is the accumulative effect of several

things, the most prominent among them being the activities of some irresponsible people who preach class war. They are trying to rouse class conscicusness and have created an atmosphere which has destroyed the authority of all those who used to help the Government in maintaining law and order.

As to the communal tension, it is on the increase without any shadow of doubt. It is not confined only to Hindus and Muslims, but it is between Muslims and Muslims also (Like Shias and Sunnis) and between Hindus and Hindus. Like the depressed classes and high caste Hindus.

You have asked me whether it is not possible for "responsible leaders of all groups to put their heads together and bring about a peaceful atmosphere in which honest differences can be discussed in a friendly way".

I think it is possible, because I can not believe that people can possibly go on living in this excited mood for all time to come. It is difficult to discuss all these matters within the scope of a letter. As illustration, I may remind you that if the Zamindars agreed by you by the Parliamentary Sub-committee last November, much of the bitterness in the rural area might have disappeared. It would have also shown to the people that the Congress stands not for any one class but for all. Of course, the strong must bear the burden of providing relief to the weak and since the Congress happens to be in power in these provinces it is but natural that people should look to it for justice to all, without discriminating between this class or that. Now that unfortunate tussle is still going on and the Tenancy Bill is before the Upper House.

In the end of I may say that I entirely agree with you that the conditions in the county, and particularly in these provinces, are far from satisfactory; it is the duty of every Indian to discover some remedy for the trouble before it is too late, because it will weaken the country as a whole. So far as I am concerned, I have made it clear in my utterances both in the House and outside, that I stand for unity and mutual understanding between all sections of the people in province

and nothing will give me greater pleasure than to do my humble bit in that direction.

اس زمانہ میں یکا یک سنگین واردات میں اتنا اضافہ کیوں ہوا؟ یہ ایک سوال ہے جو اس ملک کے ہر شہری کے واسطے قابل غور ہے۔ دوسرا زاویہ نظر مختلف ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں حالات کی خرابی کے بیشتر اسباب یہ تھے۔

مثلاً:

(۱) کانگریس جو اب تک انگریزی حکومت کے خلاف تھی خود برسرِ حکومت ہو گئی عام لوگوں پر اس کا اثر یہ ہوا کہ انگریزی حکومت کا اقتدار ختم ہوا اور آزادی کا غلط تصور لوگوں کو ہو گیا۔

(۲) کانگریس انگریزی حکومت کے خلاف قانون شکنی کی ترغیب دیتی تھی اب قانون کی پابندی کا وعظ ان زبان سے بے اثر ثابت ہوتا تھا۔ لیکن قانون کی عظمت اور اس کا خوف لوگوں کے دل سے جاتا رہا ملازمین سرکار کہ جو امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے وہ خود مرعوب ہو گئے۔

(۳) بہت سے غیر ذمہ دار نیتا لوگوں نے مختلف جماعتوں میں اختلاف کی آگ کو ہوا دینی شروع کر دی مثلاً کاشتکار اور زمیندار میں کش مکش شروع ہو گئی اور دیہاتی رقبہ کا امن وامان جو زمیندار کی مدد سے پولیس قائم رکھتی تھی درہم برہم ہونے لگا۔

(۴) فرقہ وارانہ ذہنیت میں یکا یک ترقی ہو گئی۔ لکھنؤ میں شیعہ سنی کے جھگڑے اونچی ذات اور اچھوت کے جھگڑے جابجا شروع ہو گئے۔

(۵) کانگریس اور مسلم لیگ نے یہ الیکشن ساتھ مل کر لڑا یا تھا لیکن حضرات کانگریس کے نمائندوں کی مدد کر رہے تھے۔ اور کانگریس کے قائدین (لیڈر) مسلم لیگ کے ممبروں کی تائید کرتے تھے۔ لڑائی فقط نیشنل اگریکلچرل پارٹی سے تھی۔ مسلم لیگ کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ آئندہ کانگریس کی حکومت میں ہمارا بھی حصہ ہوگا۔ لیکن جیسا کہ مولانا ابوالکلام مرحوم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ مسلم لیگ کی یہ امید پوری نہیں ہوئی قدرتاً اور اس اثر نہ صرف مسلم لیگ کے لوگوں پر بلکہ عام

مسلمانوں پر بہت بُرا پڑا۔ مسلمانوں کی اکثریت میری پارٹی میں تھی جو آہستہ آہستہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور بجائے میرے خلیق الزماں صاحب مخالف پارٹی کے لیڈر ہو گئے۔ دوست جب نا اُمید ہو کر مخالف ہو جاتا ہے تو پھر کشیدگی کی انتہا نہیں رہتی۔ میرے خیال میں یہ اسباب تھے جن سے یو۔پی کے امن وامان میں اختلال آیا اور پاکستان کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔

بہر نوع کانگریس کی حکومت چلتی رہی یہاں تک کہ دوسری عالمگیر جنگ نے کانگریسی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ کانگریس یہ چاہتی تھی کہ برٹش حکومت نہ صرف آزادی کامل کا وعدہ کرے بلکہ عملاً اسی وقت قومی حکومت بنائی جائے برٹش حکومت اس پر تیار نہ تھی۔

مہاتما جی اور وائسرائے کی خط و کتابت اور تقاریر سے مفصل حال کا پتہ چلتا ہے مسلم لیگ کو نہ تعاون سے انکار تھا نہ اقرار۔ مجھے مسٹر جناح کی پالیسی سے اتفاق نہ تھا میں یہ چاہتا تھا کہ جنگ کے موقع پر کھل کر مدد دینی چاہئے۔ بہر حال ہندوستان کی سیاسی تاریخ تو میں لکھنا نہیں چاہتا مورخین اس پر روشنی ڈالیں گے۔ میں لڑائی کے کاموں میں مدد دیتا رہا اور بحیثیت پریسیڈنٹ انتخابی کمیٹی دفاعی محکمہ کے افسران کی بھرتی میں کام کرتا رہا۔

تزئین فاطمہ کی پیدائش

۳ راگست ۱۹۴۰ء کو تزئین پیدا ہوئی۔ یہ لڑکی مجھے بہت پیاری ہے باری تعالیٰ نے اسے صوری و معنوی سب خوبیاں عطا فرمائیں۔ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے کیا خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔

حیدر آباد

فروری ۱۹۴۱ء میں حضور نظام کا ایک مراسلہ ملا جس میں اعلیٰ حضرت نے مجھے حیدر آباد کی صدارت عظمیٰ کی تجویز سے نوازا تھا اور دریافت کیا تھا کہ آیا میں منظور کروں گا حیدر آباد میں ''وزیر اعظم'' کو ''صدر اعظم'' یا پریسیڈنٹ آف دی کونسل کہتے تھے۔ صدر اعظم کا تقرر نظام کرتے تھے۔ مگر وائسرائے یا Crown Representative

کے مشورہ سے۔

اس واسطے صدر اعظم حیدر آباد گورنمنٹ برطانیہ کے اثر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بہت پرانا طریقہ چلا آرہا تھا لیکن لارڈ ریڈنگ کے زمانہ میں کسی ناسمجھ مشیر کے مشورہ سے حضور نظام نے ایک خط وائسرائے کو لکھدیا جس میں معاہدے جات کی بنا پر حضور نظام نے برٹش حکومت کے ساتھ مساوات اور برابری کا مرتبہ تسلیم کرنا چاہا۔ یہ بات انگریزی حکومت کو گراں گذری اور ستم یہ کیا کہ اس خط کو اخبارات کو دیدیا اس سے ناگواری ہوئی۔ لارڈ ریڈنگ نے ایک سخت خط نظام کو لکھا جس کا منشا یہ تھا کہ ان کی حیثیت بالکل اور والیان ملک کی حیثیت کے برابر ہے برٹش حکومت سے کوئی سوال مساوات کا پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد نظام کے اختیارات پر مزید قیود لگائے گئے۔ ایک انگریز آئی۔ سی۔ ایس وزیر جو حکومت ہند کا تجویز کردہ ہوتا تھا حضور نظام مقرر کرتے تھے اور ہمیشہ پولیس، مالگذاری اور جنرل ایڈمنسٹریشن کے محکمہ جات اس کے حوالہ کئے جاتے تھے۔ اس طرح برٹش حکومت کا ایک افسر حکومت حیدر آباد کے دور وبست پر اثر انداز ہوتا تھا۔ اس واقعہ سے پہلے فقط وزیر اعظم کا تقرر وائسرائے کے مشورے سے ہوتا تھا اب دوسرے وزراء کے تقرر میں بھی ریزیڈنٹ سے مشورہ لازمی ہو گیا۔

میں نے وہ معاہدے دیکھے ہیں جو زمانہ سابق میں برٹش اور حیدر آباد کے درمیان ہوئے ہیں ان کی عبارت ایسی ہی ہے جیسی دو برابر کی حکومتوں میں ہونی چاہئے لیکن (Might is Right) یا ہماری زبان میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" پہلے بھی صحیح تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

زبردست ناانصافی کے واسطے سینکڑوں بہانے بناتا ہے اور زیردست منہ تکتا رہ جاتا ہے۔

میں نے حضور نظام کی تجویز کو منظور کر لیا لیکن حیدر آباد جانے میں ذہنی خلجان تھا۔ میں نے برٹش حکومت میں کام کیا تھا۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ افسران کی قابلیت اور کارگذاری عام طور پر مسلمہ تھی۔ اور آزادی کے بعد اب تک مسلمہ ہے۔ بُرے بھلے ہر جماعت میں ہوتے ہیں مگر آئی۔ سی۔ ایس افسران کی تربیت، تعلیم اور انتظامی تجربہ قابل ذکر قدر تھا۔

علاوہ ازیں برٹش حکومت کی انتظامی مشین صحت منداور محنت کش تھی۔ درباری سازشوں اور چال بازیوں سے پاک حکومت کے ارباب حل وعقد گورنر سے لے کرادنیٰ ملازم تک ایک ایک آئین اور قانون کے تحت کام کرتے تھے۔لیکن حیدرآباد کے متعلق عجیب خبریں مشہور تھیں۔درباری سازشیں جو شخصی حکومت میں ہونالازمی ہیں، حکمراں کی مداخلت، ملازمین میں گروہ بندی وغیرہ جس کی وجہ سے انتظامی مشین کی کارگذاری اور(Discipline) پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ یہ تمام خیالات میرے واسطے پریشانی کا باعث تھے۔مگر میں قبول کر چکا تھا اوراس نئے تجربہ کے واسطے تیار ہوگیا۔

۱۹۴۱ء کی جولائی میں حضور نظام کی طرف سے میرے تقرر کا اعلان ہوگیا۔ میں حضور نظام کے سلام کی غرض سے حیدرآباد کوروانہ ہوا۔ دہلی میں وائسرائے کے سیاسی مشیر (Political Adviser)سے بھی ملا جہاں تک مجھے یاد ہے(Sir Francis Vaellie) اس عہدہ پر تھے۔ میں نے اپنے حیدرآباد جانے کے ارادہ کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں نظام سے یہ کہہ دوں گا کہ سرکاری طور پر میرا تقرر چاہے جتنے عرصہ کے واسطے ہومگر میرے اور نظام کے درمیان یہ قرار داد رہے گی کہ جب حضور نظام یہ خیال کریں کہ میری موجودگی حکومت حیدرآباد کے واسطے مفید نہیں ہے تو فرمادیں میں استعفیٰ پیش کردوں گا اور یہی حق مجھے بھی حاصل رہے گا۔حکومت ہند کے سیاسی مشیر کواس سے اختلاف تھا وہ کہنے لگے کہ اگر نظام نے چند ماہ بعد ہی یہ کہا تو کیا ہوگا۔ میں نے کہا میں چلا جاؤں گا۔ میں بارخاطر بن کر رہنا نہیں چاہتا تھا۔

۲۸ر جولائی ۱۹۴۱ء کے روزنامچے میں میرا حیدرآباد پہونچنا درج ہے۔ میں اور میرے سکریٹری صغیر احمد عباسی صاحب حیدرآباد پہونچے(Rochland) مہمان خانہ میں مقیم ہوئے۔ ساڑھے دس بجے صبح حضور نظام سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات نذری باغ کے دفتر میں ہوئی پانچ اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ پہلی ہی ملاقات میں یہ عرض کردیا کہ میں ملازمت کی وجہ سے یہاں نہیں رہوں گا۔میرے تقرر کا زمانہ کتنا ہی ہواگر کسی وجہ سے حضور تبدیلی چاہیں گے تو میں جس وقت ارشاد ہوگا استعفیٰ پیش کردوں گا وہ یہ سن کرخاموش ہوگئے۔ پھرادھرادھر کی باتوں کے بعد میں مہمان خانہ واپس آگیا۔

میری بدقسمتی سے جناح صاحب بھی یہاں ٹھہرے ہوئے تھے جب میں ان سے ملا تو انہیں اس پر اصرار تھا کہ نہ صرف (Defence Council) بلکہ صدارت عظمیٰ سے بھی مجھے استعفیٰ دینا چاہیے وائسرائے نے جنگ کے زمانہ میں ڈفنس کونسل بنائی تھی میں اس کا بھی ممبر تھا۔ میں نے کہا کہ مسلم لیگ ڈفنس کونسل کی ممبری کے خلاف ہے مگر کیا ریاست میں ملازمت کے بھی مسلم لیگ خلاف ہے۔ جس کے جواب میں ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تمہیں ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔ مسلم لیگ میں آکر قومی کام کرو۔ ظاہر ہے کہ میں ان کی اس رائے سے متفق نہ تھا۔

چونکہ چارج لینے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ میں دوسرے روز واپس ہو گیا۔ جناح صاحب نے اخبار میں ایک بیان دیا کہ اگر مجھے مبارکباد دینے کے واسطے جلسے ہوں تو مسلم لیگ کے مسلمان اس میں شریک نہ ہوں۔ لیکن حسب دستور ایٹ ہوم ہوئے اور مجھے خاص طور پر نواب اسماعیل خاں صاحب مرحوم کی یاد آرہی ہے کہ وہ باوجود مسلم لیگ کے منتظمہ کمیٹی کی ممبری کے شریک ہوئے۔ جناح صاحب کی خواہش یہ تھی کہ مولوی عبدالعزیز صاحب ساکن پٹنہ کو جو وزیر عدالت تھے۔ نظام صدراعظم بنائیں اس وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ میں اس عہدہ کو قبول نہ کروں۔

میں نے اپنے عہدے کا جائزہ پہلی ستمبر ۱۹۴۱ء کو لیا۔ اگست کے مہینہ میں روزانہ اجنبی حضرات کے خطوط حیدرآباد سے آتے تھے۔ جو متضاد پند و نصائح اور مشورہ سے پُر ہوتے۔ درباری سازشوں کے قصے گروہ بندی کی کہانیاں بڑی آب و تاب سے بیان کی جاتی تھیں۔ درباری سازشوں کا سرچشمہ نواب کاظم یار جنگ کو بتایا جاتا تھا۔ وہ معین انصاری (جو کیبنٹ کے سکریٹری تھے) کے طرفدار تھے۔ یہ بعد کو معین نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ یہ دونوں حضرات "ملکی" گروہ کے قائدین میں سے تھے۔ غیر ملکی حضرات میں بلگرامی خاندان کے لوگوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ خاندان تین پشت سے حیدرآباد میں رہتا چلا آرہا تھا۔ نواب عماد الملک مرحوم سے لے کر اس زمانہ تک جب میں گیا حیدرآباد کی قابل قدر وفادارانہ خدمات اس خاندان کے لوگوں میں نواب علی یاور جنگ کے ساتھ خاص طور پر حسد اور بدگمانی

تھی۔ بہرحال یہ خطوط آتے رہے اور بجائے اس کے کہ حیدرآباد کی تصویر کچھ صاف ہوتی اور بھی غبار آلودہ ہوگئی۔ سلجھنا درکنار۔ الجھاؤ میں کچھ اضافہ ہوگیا۔

پہلی ستمبر ۱۹۴۱ء کی صبح حیدرآباد پہونچا۔ سر اکبر حیدری مرحوم کے دونوں (A.D.C) کیپٹن صادق اور کرنل سعید بھی پلیٹ فارم پر بہت سے عمائدین اور افسران حکومت کے ساتھ موجود تھے حسب دستور میرا استقبال ہوا اسٹیشن سے سیدھا کنگ کوٹھی گیا اور اعلیٰ حضرت کی کتاب پر اپنا نام لکھا اور "شاہ منزل" آ گیا۔ جو صدر اعظم کا سرکاری قیام گاہ تھی۔ جس میں اب گورنر رہتے ہیں دوسرے روز حضور نظام نے ایک فرمان فارسی میں جاری فرمایا جو حسب ذیل تھا۔

نقل فرمان ذی شان شاہ حضور دکن خلد اللہ ملکہ

جدید صدر اعظم باب حکومت

ما ایں امر را بہ مسرت محسوس کردیم کہ دیروزہ نواب صاحب چھتاری از علی گڑھ اینجا آمد جائزہ خدمت خود بدست گرفت وامید ہست کہ انتخاب ما در نظر اہل ملک بروقت کامگار ثابت خواہد کہ صاحب موصوف علاوہ بودن حامل کردار نیک صفات حسنہ ہم میدارند۔ ما اورا خوب میدانیم وہم اطمینان درانجام دہی خدمات وفادارانہ اومی داریم۔ بہرحال دورِ جدید آغاز شد ہمراہ نتائج خوشگوار برائے سود بہبود ملک لہٰذا ایں فال خوش است۔

(صبح دکن ۹ شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ)

جائزہ یعنی چارج لینے کے بعد انتظامی مشین سے ذاتی تعلقات اور واقفیت پیدا کرنا ضروری تھا۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دوسرے وزراء میں سے ایک ایک کو لنچ یا ڈنر پر بلاتا اور تنہا باتیں کرتا۔ اسی طرح معتمدین (سکرٹریز) کو بلاتا۔ نائب معتمدین (ڈپٹی سکرٹریز) اور نظما یعنی (ہیڈ ڈپارٹمنٹ) کو چار پانچ کو ایک ساتھ چائے پر بلاتا اور ان کے صیغوں کے متعلق باتیں کرتا۔ مجھے باوجود برٹش انڈیا میں تجربہ کے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی مسافر اجنبی راستہ پر غروب آفتاب کے بعد چل رہا ہو۔ اس سلسلہ میں ایک قصہ یاد آ گیا سر تھیوڈور ٹاسکر کو جو حکومت ہند کی طرف سے ایک وزیر تھے اور

جو تیرہ چودہ برس سے مختلف عہدوں پر حیدرآباد میں رہے تھے۔ میں نے لنچ پر بلایا تھا۔ لنچ کے بعد حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

میں: سرتھیوڈور برٹش حکومت کے انتظامی امور کا مجھے کم وبیش تجربہ ہے مگر کسی ریاست اور خاص کر حیدرآباد کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ آپ کی ملازمت کا بڑا عرصہ یہاں گذرا ہے آپ کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں۔

سرتھیوڈور ٹاسکر: سر احمد آپ میرے چیف ہیں۔ آپ کی پالیسی کو وفاداری کے ساتھ کامیاب بنانا میرا فرض ہے۔ اس میں کبھی کسی قسم کی کوتاہی نہ ہوگی میری رائے اور میرا مشورہ ہمیشہ آپ کے واسطے موجود ہے حیدرآباد کی حالت میں مختصراً دو باتیں فقروں میں بیان کردوں ہم سب وزیر ہیں مگر ہماری مثال ایسی نرسوں کی ہے کہ جو ایک ایسے بچہ کی حفاظت کے واسطے مقرر کی گئی ہیں جس کا دل خودکشی کرنے کو چاہتا ہے ہمارا کام ہے کہ اُسے خودکشی نہ کرنے دیں۔

سرتھیوڈور ٹاسکر کے اس مختصر تجزیہ سے مجھے حیدرآباد میں اپنی دشواریوں کا احساس بہت بڑھ گیا گو ان کے حل میں کوئی مدد نہ لی۔

حیدرآباد کے افسران وملازمین اپنی اہلیت اور قابلیت کے لحاظ سے کسی دوسری حکومت کے افسران سے کم نہ تھے۔ بہت سے ایسے تھے کہ جو یورپ سے امتحانات پاس کرکے آئے تھے۔ آزادی کے بعد ان میں سے بہت سے افسران کو حکومت ہند میں بڑی ذمہ داری کے کاموں کے کرنے کا موقع ملا مثلاً نواب علی یاور جنگ، سید علی نقی، نرندر بہادر مگر حیدرآباد کی فضا درباری سازشوں اور گروہ بندی کی وجہ سے کچھ ایسی تھی کہ ہوشمند اور قابل افسران کی اہلیت اور صلاحیت ایک حد تک مفلوج ہوجاتی تھی۔

حیدرآباد کی ایک خصوصیت میں نے یہ دیکھی کہ حیدرآباد میں کسی حیثیت یا کسی مذہب کا شخص ہو تہذیب وتمیز، آداب مجلس اور عام کلچر ہمارے اطراف سے بہتر تھا۔ یہ فرق اتنا ظاہر ہے کہ مجھ سے بہت سے افسران حکومت نے جو دوسرے مقامات سے بدل کر وہاں گئے اس کا ذکر کیا۔ یہ اس پرانی تہذیب کا اثر ہے کہ جو صدیوں بلا تفریق مذہب وملت بلاتفریق مرتبہ اس حصہ ملک میں رہی مگر اب ختم ہوتی جاتی ہے۔

مالی اعتبار سے وہاں کے باشندوں کی حالت یقیناً بہتر تھی۔ جو عورتیں مزدور پیشہ تھیں اور انہیں ''کماٹی'' کہتے تھے وہ بھی سونے کے زیور پہنتی تھیں۔ معیار زندگی نسبتاً ہمارے یہاں سے اونچا تھا حیدر آباد کی ضیافت اور مہمان نوازی مشور تھی۔ امراء کا معیار زندگی تو اس قدر بلند تھا کہ ان کی بیگمات سادہ سونے کا زیور اگر جڑاؤ نہ ہوتو استعمال کرنا ناپسند کرتی تھیں زیادہ تر جواہرات کا زیور کافی خیال کیا جاتا تھا۔

رعایا پر زمین کا لگان نسبتاً بہت کم تھا اور انکم ٹیکس کا تو وجود ہی نہ تھا اس لئے عام لوگ مرفہ الحال تھے۔

حکومت حیدر آباد کی کابینہ میں حسب ذیل حضرات تھے۔

احمد سعید۔ پریسیڈنٹ کونسل۔

نواب سر عقیل جنگ وائس پریسیڈنٹ۔

نواب مہدی العزیز صاحب۔

راجہ دھرم کرن۔

سر تھیوڈور ٹاسکر۔

نواب خسرو جنگ۔

نواب سر عقیل جنگ مرحوم

یہ نواب عماد الملک کے صاحبزادے تھے۔ نظام کے بڑے سچے وفادار اور حیدر آباد کی ریاست کے صحیح معنوں میں خیر طلب۔ عقل عام (Common Sense) کے حامل تھے ان کا مشورہ دو بینی حیدر آباد کے خاص حالات، حضور نظام کے رجحانات اور حکومت ہند کی پالیسی ان سب امور پر خیال کرتے ہوئے ہوتا تھا۔ مجھے اُن سے بہت مدد ملی۔ مرحوم صحیح معنوں میں ''اسم بامسمیٰ'' تھے۔ ان کا کردار قابل اعتماد تھا۔

نواب مہدی یار جنگ مرحوم

یہ سر عقیل جنگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ بے مثل علمی قابلیت کے حامل تھے، مشرقی اور مغربی علوم کے ماہر۔ حضور نظام کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ راز کے کاغذات کا ترجمہ یہی کرتے تھے۔ شرافت مزاج اعلیٰ کردار ان کی خاص خصوصیت تھی مجھے ان دونوں حضرات

سے بڑی تقویت ملتی تھی۔ نواب صاحب مرحوم میں (Sense of Humour) (ظرافت) بہت لطیف اور نازک تھا مجھے دو واقعات یاد آرہے ہیں۔ ھٹی میں سونے کی ایک کان تھی مگر اس کے اجزا اتنے کم تھے کہ سونا نکالنے میں کوئی نفع نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز اُس کے بجٹ پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے ''یہ (Reverse Gold Mine) ہے اس میں سے سونا نکالنے کے بجائے سونا ڈالنا پڑتا ہے''۔ ایک دفعہ مجھ سے حضور نظام کے متعلق فرمانے لگے۔ ''ہمارے سرکار اپنی گورنمنٹ کے مستقل لیڈر آف اپوزیشن ہیں'' میں نے ہنس کر کہا کہ نواب صاحب لطف یہ ہے کہ حکومت کے اختیارات تو اتنے ہی ہیں جتنے اُنہیں دیدیئے گئے مگر لیڈر آف اپوزیشن کے اختیارات قدرتی اور کامل ہیں۔ بحیثیت حکمراں نظام کے اختیارات قدرتی اور حکومت کے اختیارات جتنے قانوناً دیدیئے گئے۔

سید عبدالعزیز صاحب مرحوم

یہ بہار کے ایک وکیل تھے قانونی قابلیت بہت اچھی تھی بہت موقع شناس اور زمانے کے ساتھ چلنے والے تھے۔

راجہ دھرم کرن:

یہ ایک بڑے جاگیردار تھے۔ پرانے امراء میں جو سیر چشمی اور وسیع الخیال اس زمانہ میں پائی جاتی تھی۔ وہ ان میں پوری طرح موجود تھی۔ نہایت شریف مزاج تھے۔

سر تھیوڈور ٹاسکر:

نہایت تجربہ کار برٹش I-C-S آفیسر تھے۔ بیحد فرض شناس تھے اور ریزیڈنٹ اور نظام کی حکومت کے درمیان رابطہ قائم رکھتے تھے۔

نواب خسرو جنگ:

نہایت شریف مزاج اور بھولے تھے۔ کبھی کوئی فعل شرافت سے گرا ہوا نہیں کرتے تھے۔

میرا روزنامہ مورخہ ۱۲/ جنوری ۱۹۴۲ء میں حسب ذیل حیدرآباد کے مطالبات

درج ہیں۔نواب کاظم یار جنگ مرحوم سرکار کی طرف سے پیام لائے کہ ان مطالبات کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۱) نظام کے اختیارات پر جو قیود عائد ہیں وہ ہٹائے جائیں۔

(۲) جو اضلاع کہ نظام سے لے لئے گئے تھے (Ceded Distt) ان میں نظام کی ملکیت تسلیم ہو اور معظم جاہ کو ان پر پرنس سمجھا جائے۔

(۳) نظام کو ہزمجسٹی کا خطاب دیا جائے۔ میں نے جواباً یہ عرض کر دیا کہ ابھی اس کا موقع نہیں ہے۔ اس وقت تو میں اس کی کوشش کر رہا ہوں کہ ریل کی لائن پر جو چھ سو میل نظام کی ریلوے ہے اس میں پولیس کے اختیارات جو اس وقت تک برٹش کے قبضہ میں تھے وہ حکومت حیدر آباد کو واپس مل جائیں۔ میرے نزدیک یہ ممکن تھا۔ لیکن جو اضلاع کہ برٹش کے قبضہ میں چلے گئے ان کی واپسی ممکن نہ تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے یاد آرہا ہے کہ جب واپسی اضلاع کے مسئلہ کو ۱۹۴۶ء میں سر والٹن مانکٹن سے مشاورت کے واسطے رکھا گیا تو انہوں نے تمام معاہدے (Treaties) کو پڑھنے کے بعد یہ کہا کہ معاہدوں کی رو سے یہ اضلاع نظام کے ہیں۔ مگر وہ کون سی عدالت ہے جس کے سامنے یہ مقدمہ پیش کیا جائے۔ اور وہ فیصلہ نافذ کرے۔ منشا یہ تھا کہ یہ امور سیاسی انقلابات کا نتیجہ ہیں جوڈیشنل نہیں ہیں۔

سر والٹن مانٹن (لارڈ مکٹن) غیر معمولی لیاقت علمی اور سیاسی تدبر رکھتے ہیں یہ مسٹر چرچل کی وزارت میں وزیر رہے۔ برٹش شاہی خاندان کے بھی مشیر قانون رہے میں نے ایسے صاف دماغ کے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ تفصیلات کے خس وخاشاک اور غیر ضروری مسائل سے بچ کر معاملے کی تہ تک فوراً پہونچتے تھے۔ یہ اس زمانہ میں حیدر آباد کے مشیر قانون تھے اور نظام کے سچے خیر طلب۔

ہزمجسٹی کے خطاب کے متعلق بھی میں نے دہلی میں بعض اکابرین سے گفتگو کی اس وقت نام یاد نہیں آتا مگر ذیل کا فقرہ دہلی میں کسی نے کہا۔ بات پتہ کی ہے۔ اور میرے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ ''ہزمجسٹی کا خطاب دیا نہیں جاتا۔ حاصل کیا جاتا ہے۔ جسے ہزمجسٹی کسی دوسرے نے بنایا وہ تو ماتحت ہی رہا''۔

نظام کے اختیارات پر قیود کے متعلق میری کوشش بارآور نہیں ہوئی۔ وہ قیود اس وقت تک قائم رہے جب تک انگریز نے ہندوستان سے چلے جانے کا پختہ ارادہ نہ کرلیا۔

نواب کاظم یار جنگ مرحوم

حیدرآباد کی اس زمانہ کی تصویر نامکمل رہے گی اگر نواب کاظم یار جنگ کا ذکر نہ ہو یوں تو یہ سکریٹری پیشی تھے اور بعد کو وزیر پیشی ہوگئے ان کے فرائض وہی تھے جو آج گورنر کے سکریٹری کے ہوتے ہیں مگر حیدرآباد میں جب گورنمنٹ کی تجاویز نظام کے حکم کے واسطے جاتی تھیں تو یہ پرائیویٹ طور پر نظام کی رائے کو متاثر کرتے تھے۔ یہ سب سے بڑی دشواری تھی۔ نظام کو ان پر اعتماد تھا۔ برٹش حکومت ان کے اثر کو بجا طور پر ناپسند کرتی تھی جس سے انتظام میں وہ عملی پیدا ہوتی تھی۔ گو یہ وزیر نہ تھے مگر صدر اعظم کو بعض اوقات اُن سے مشورہ کرنا پڑتا تھا۔ نواب کاظم یار جنگ بہت فہیم تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ حکومت ہند انہیں ناپسند کرتی ہے۔ اور اس وجہ سے سوچ سمجھ کر مداخلت کرتے تھے۔ لیکن حکمراں مزاج میں ایک ایسے شخص کو دخل ہونا کہ انتظام سلطنت کا ذمہ دار نہ ہو۔ سیاسی اور انتظامی پیچیدگیاں پیدا کردیتا ہے۔ طاقت بغیر ذمہ داری کے خطرناک ہوتی ہے۔ اور ذمہ داری بغیر طاقت کے مفلوج ہوجاتی ہے۔

حیدرآباد میں سازشیں ایک فن بن گئی تھیں۔ مثلاً ایک واقعہ روزنامچے کا درج کرتا ہوں۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۴۲ء کو ڈاکٹر سر ضیاءالدین اتحادالمسلمین کے چند لوگوں کے ساتھ میرے پاس آئے اور ان سے کہا کہ نواب صاحب سے جو کچھ کہنا ہو کہیے اور جو کام لینا ہو بتایئے ان لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ ممبران کابینہ کو توسیعات نہ دئے جائیں یہ لوگ سر عقیل جنگ مرحوم اور نواب مہدی یار جنگ کی توسیعات کے خلاف تھے۔ وہ اکبر علی خاں کے خلاف تھے اس لئے کہ وہ اتحادالمسلمین کے ممبر نہ تھے اور چاہتے تھے کہ اکبر علی خاں کی پرسش حکومت کی طرف سے نہ ہو۔ میں نے میر خاں کو کابینہ کا سکریٹری کیا تھا۔ یہ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ لیکن کاظم یار جنگ اس کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ معین انصاری (جو پھر معین یار جنگ ہوئے) کابینہ کے

سکریٹری رہیں اور کوئی تبدیلی نہ ہو۔ چنانچہ سر محمد یعقوب مرحوم کو کاظم یار جنگ نے میرے پاس بھجوایا کہ وہ مجھ پر زور ڈالیں کہ میر خاں کو سکریٹری نہ کیا جائے۔ یہ فقط اس خیال سے بھیجے گئے تھے کہ یوپی کے رہنے والے تھے اور میں بھی یوپی کا رہنے والا تھا۔

۱۶ رفروری ۱۹۴۲ء کے روزنامچے میں درج ہے کہ ہوش مرحوم جو حضور نظام کے مصاحبین میں سے ایک تھے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جب تک برٹش گورنمنٹ اور ریزیڈنٹ سے نظام پر دباؤ نہ ڈلوایا جائے۔ یہاں کام نہیں چل سکتا۔ میں نے ان سے تو جواباً یہی کہا کہ ایسا کرنے سے مجھے حقِ نمک باز رکھے گا۔ مگر میں یہ سوچتا رہا کہ جب خود اعلیٰ حضرت کے مصاحب ایسا مشورہ دیں تو اس کے دو ہی معنیٰ ہو سکتے ہیں یا ہوش خود اپنے آقا کے وفادار نہ تھے یا میری وفاداری کا امتحان مقصود تھا۔

پولٹیکل ڈپارٹمنٹ اور ریزیڈنٹ برابر متوقع رہتے تھے کہ اگر صدر اعظم کو دشواری ہو تو وہ اسے مدد دیں اور یہ طریقہ وہاں جاری تھا کہ صدر اعظم ایسی مدد لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار چارج لینے کے بعد دہلی گیا اور برٹش گورنمنٹ کے پولٹیکل ایڈوائزر سے ملا تو پہلا سوال ایک نامناسب لفظ کے ساتھ یہ تھا (How is your Ruler) میں نے ان سے کہا کہ اگر مجھے کوئی نظام سے دشواری ہوگی تو اس کا علاج کروں گا مگر آپ کے پاس شکایت لے کر نہ آؤں گا۔ اور مجھے اس کی مسرت ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ باوجود مشکلات کے۔

وہاں کے افسران کسی طرح قابلیت کے لحاظ سے کسی گورنمنٹ کے عام افسران سے کم نہ تھے۔ خاص کر معتمدین (سکریٹری) اپنے کام پر عبور رکھتے تھے۔ ان حضرات میں۔

(۱) نواب علی یاور جنگ کی بہت ممتاز شخصیت تھی۔ ان کی علمی قابلیت معاملہ فہمی، دوراندیشی اور زمانہ شناسی حیدرآباد میں بے مثل تھی۔ یہ وہاں وزیر بھی رہے اور حیدرآباد کی تباہی کے بعد حکومت ہند نے انہیں U.N.O میں ہندوستان کے نمائندے فرانس امریکہ میں ہیں مجھے ان سے بہت مدد ملی۔ اب گورنر بمبئی ہیں۔

(۲) معین نواز جنگ۔ نہایت مستور محنتی کارگذار معتمد تھے۔ انگریزی قابلیت بھی

اچھی تھی۔لیکن دور اندیش نہ تھے۔اتحاد المسلمین کے طرفدار تھے۔لائق علی صاحب سے جو آخری صدر اعظم میرے بعد ہوئے ان سے قرابت تھی۔حیدرآباد میں یہ بھی وزارت کے عہدے تک پہونچے۔جب انقلاب ہوا تو اس کی تاب نہ لا سکے۔توازن دماغ کھو بیٹھے۔اور اب پاکستان میں ہیں۔

میرے اسٹاف کے لوگوں میں اشفاق صاحب بہت اچھے افسر تھے۔محنتی فرض شناس اور وفادار مجھے ان سے بہت مدد ملی اور میرے ہی زمانہ میں یہ A.D.C. سے ترقی کرکے ڈپٹی ہوم سکریٹری اور پھر کیبنٹ سکریٹری ہوئے۔

والیانِ ملک میں حیدرآباد کو ایک خصوصیت حاصل تھی۔رقبہ اور مردم شماری کے اعتبار سے یہ ایک سلطنت تھی۔یورپ اور ایشیا کے بہت سے ملک اس سے چھوٹے ہیں۔اس کا رقبہ جہاں تک مجھے یاد ہے ۸۴۰۰۰ میل مربع تھا اور مردم شماری تقریباً ۱۳۰۰۰۰۰۰ ایک کروڑ تیس لاکھ تھی۔ریاست کا اپنا سکہ تھا۔اپنا ڈاکخانہ اور اسٹیمپ ہوتے تھے۔اپنی ریلوے تھی اور میرے ہی زمانہ میں ہوائی جہاز کی سروس بھی ہوگئی تھی۔جس کا نام دکن ایریز تھا۔اس کے جہاز مدراس، بنگلور اور دہلی سے حیدرآباد کو ملاتے تھے۔ٹاٹا کی شرکت سے یہ ہوائی سروس جاری ہوئی تھی اور غلام محمد صاحب مرحوم نے ٹاٹا سے بات چیت کرکے اسے جاری کیا۔

وہاں کی مالی حالت ہندوستان کی حکومتوں سے زیادہ مضبوط تھی جتنے نوٹ ملک میں ہوتے تھے کم از کم اس کا ایک تہائی چاندی اور سونے کی شکل میں خزانہ ریاست میں رہتا تھا۔

سر اکبر حیدری مرحوم:

وہاں کے فائننس کے اصلاح میں سر اکبر حیدری مرحوم کا بہت بڑا حصہ تھا۔ سر اکبر نے اپنے زمانہ میں بہت سی اصلاحیں کیں۔جس میں عثمانیہ یونیورسٹی ان کا شاہکار ہے اور ان کی بہترین یادگار رہے گی۔حیدرآباد بینک کا قیام بھی انہیں کے زمانہ میں ہوگیا تھا۔گو اس کی ترقی اور توسیع میرے زمانہ میں ہوئی۔سر اکبر نے بہت سے

تعمیری کام حیدر آباد میں کئے مگر اہل حیدر آباد نے کبھی قدر نہ کی اور وہ ہمیشہ ملامت کا نشانہ بنے رہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی اُردو کی یونیورسٹی بنائی گئی تھی۔ یہ پہلی یونیورسٹی تھی جو ہندوستان کی زبان میں تعلیم دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک صیغہ دار الترجمہ قائم کیا گیا جو علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار بحیثیت چانسلر کے ایک نوٹ دار الترجمہ کی ہدایت کے واسطے لکھا تھا کہ اُردو کے ترجمہ ایسی زبان میں کریں کہ جو عام فہم ہو۔ جو غلطی کہ آج ہندوستان میں ہندی کے ترجموں میں کی جارہی ہے۔ وہی غلطی حیدر آباد میں اُردو ترجموں میں کی جاتی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ اب عثمانیہ کی یہ حیثیت باقی نہیں رہی اب تعلیم انگریزی میں ہوتی ہے۔

ایک بار شری سی راج گو پال آچاریہ کو یونیورسٹی نے مدعو کیا اور انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ اپنی تقریر میں انہوں نے یہ کہا کہ اس کی کوشش کی جائے کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی یونیورسٹیاں کھلیں۔ لیکن اُردو کی یونیورسٹی کی مخالفت کرنا غلطی ہے۔ جب راجہ جی بحیثیت گورنر مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے اور یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لاء کی ڈگری دی تو مجھ سے یہ فرمانے لگے کہ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس پہلی ڈاکٹریٹ کی ہوئی جو آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے دی تھی۔ ان کا قیام علی گڑھ میں راحت منزل میں ہوا تھا۔

حیدر آباد کے انجینئر کسی طرح برٹش انڈیا کے انجینئروں سے علمی قابلیت اور علمی کارگذاری میں کم نہ تھے۔ نظام ساگر حمایت ساگر عثمان ساگر اور عثمانیہ یونیورسٹی کا آرٹ کالج ان کی قابلیت کی ناقابل تردید شہادت ہیں۔

میری مختصر رائے یہ ہے کہ حیدر آباد کی انتظامی مشین بری نہ تھی لیکن درباری سازشیں دشواریاں پیدا کرتی تھیں۔

وہاں کے انتظامی دروبست میں جمہوریت نہ تھی۔ وہاں کی رعایا بالخصوص ہندو رعایا میں اس کا احساس اچھی طرح ہو گیا تھا۔ سر اکبر حیدری مرحوم نے اپنے زمانہ میں اصلاحات کو نافذ کرنا چاہا تھا لیکن جنگ کے شروع ہو جانے کی وجہ سے انہیں

سرا کبر حیدری نے ملتوی کر دیا۔

لہٰذا یہ تجویز خیال میں آئی کہ انتخاب کے ذریعہ کونسل تو جنگ کے بعد بنے لیکن نامزدگی کے ذریعہ سے مختلف محکموں میں کمیٹیاں بنادی جائیں تاکہ حکومت عوام کے نقطۂ نظر سے بے خبر نہ رہے اور حیدر آباد کے شہری بھی یہ سمجھیں کہ انتظام ریاست میں وہ بھی شریک ہیں۔ اس کے متعلق مختلف جماعتوں سے بات چیت ہوئی۔ لیکن اس میں بھی ایک دشواری پیدا ہوگئی۔

۱۹ر جنوری ۴۲ء کے روز نامچے میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ پر گفتگو وزرا کی میٹنگ میں ہوئی۔ علی یاور جنگ کا بیان تھا کہ طے یہ ہوا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو۔ انصاری (معین نواز جنگ) کہتے تھے کہ مسلم اور غیر مسلم کی تعداد برابر نہ ہو۔ میں نے عبدالعزیز صاحب وزیر عدالت سے کہا کہ آپ اتحاد المسلمین اور ہندو حضرات سے مل کر طے کیجیے۔

مسلمانوں کا یہ مطالعہ خلاف انصاف بھی تھا اور خلاف مصلحت بھی ہندو اکثریت اس پر راضی تھی کہ مسلمان اقلیت کو برابر کا حصہ دیدیا جائے لیکن عیسائی۔ سکھ وغیرہ کے نمائندے الگ ہوں۔ مسلمان پورے ہاؤس میں برابری چاہتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانان حیدر آباد کو اس کا احساس نہ تھا کہ باہم فیصلہ سے جو کچھ طے ہوجاتا ہے اس میں اخلاقی طاقت بہت ہوتی ہے اور قانوناً بھی ایک معاہدہ کی شکل ہوجاتی ہے۔ اسی زمانے میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ میدان جنگ میں حیدر آباد کی فوج کو اتنے اچھے ہتھیار نہیں دیئے جاتے جیسے کہ دینے چاہئیں۔ میں ۲۳ر جنوری ۴۲ء کو خسرو جنگ (وزیر فوج) اور ادروس (کمانڈر فوج) کو ساتھ لے کر ریزیڈنٹ سے ملا اول تو ریزیڈنٹ بہت چراغ پا ہوئے اور کہنے لگے کہ ایسی شہرت دینے والوں پر فوراً مقدمہ چلانا چاہئے میں نے اس سے اختلاف کیا اس واسطے کہ اگر یہ ہوا تو فوج میں بھرتی بند ہوجائے گی۔ اس کا علاج یہ ہے کہ حیدر آباد کی فوج کو اچھے ہتھیار نہیں دیے جائیں تاکہ اُن سے وہ مشق کر سکیں اور لوگوں کو معلوم ہو کہ بہترین ہتھیاروں سے یہ مسلح ہیں۔

آج مجھے ریزیڈنٹ سے یہ معلوم ہوا کہ حکومت ہند نے اسے منظور کرلیا کہ

نظام کے روز پیدائش پر جیسا حیدرآباد میں ہوتا ہے۔ برابر میں بھی تعطیل ہوا کرے۔ اعلیٰ حضرت نے اس خبر پر ۲۴ رجنوری کو اظہار مسرت کیا اور میرے زمانہ کو فال نیک قرار دیا۔ نیم سرکاری خط سے مبارکباد دی۔

۲ رفروری ۴۲ء کو میں ڈفنس کونسل کی میٹنگ کی غرض سے گیا تھا۔ حضور نظام کا تار آیا کہ بڑے پرنس کو G.C.I.E اور چھوٹے کو ہز ہائنیس کا خطاب ملنا چاہئے۔ اس کے متعلق زبانی بھی کئی بار فرما چکے تھے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے ریلوے لائن پر جو برٹش حکومت کو اپنی پولیس رکھنے کا اختیار ہے وہ ختم ہو۔ کسی ایک حصہ ملک میں دو حکومتوں کی پولیس ہونا ایک طرف تو انتظامی خرابی کا باعث اور دوسری جانب ریاست کے اندرونی خودمختاری میں مداخلت تھی حیدرآباد میں چھ سو میل کی ریلوے لائن اور اسٹیشنوں پر برٹش پولیس تھی۔ گویا یہ حصے برٹش انڈیا کا ایک حصہ تھے۔ میں نے اس کے متعلق پولٹیکل سکریٹری سر کنتھ فٹنر اور وائسرائے سے بات چیت کی اور شہزادوں کے خطابات کا بھی ذکر کیا۔

حیدرآباد کی واپسی پر ۱۱ رفروری ۴۲ء کو اعلیٰ حضرت کے پاس حاضر ہوا۔ دریافت کرنے لگے کہ دہلی میں کیا گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ برٹش گورنمنٹ نے اسے مان لیا کہ پولیس کے جو اختیارات ریلوے لائن اور اسٹیشنوں پر اُنہیں حاصل ہیں وہ واپس کردیئے جائیں۔ جس پر فرمایا کہ یہ تو چھوٹی موٹی باتیں ہیں ہوتی رہیں گی۔ مجھے یہ عرض کرنا پڑا کہ یہ چیزیں زیادہ اہم ہیں۔ اس میں ہماری آزادی اور حقوق ملکیت کا سوال ہے پھر پرنس اعظم جاہ اور معظم جاہ کے خطابات کے متعلق فرماتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ پرنس اعظم جاہ کو G.C.I.E مل جائے گا۔

اعلیٰ حضرت کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنگی ضروریات کے واسطے برٹش حکومت ان کا ذاتی روپیہ نہ چھین لے۔

میں نے عرض کیا کہ اگر اس مسئلہ کو میں دہلی میں چھیڑوں تو وہ یہ دریافت کرسکتے ہیں کہ یہ ''تمہارا خیال ہے یا حضور نظام کا'' پھر میں نے عرض کیا کہ نظام کی دولت ایک فرد واحد کے واسطے بہت بڑی چیز ہے مگر ایک سلطنت کے واسطے جو بیس

کروڑ روزانہ جنگ پر خرچ کر رہی ہو یہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے فرمانے لگے کہ فرض کرو ہمارے پاس پچاس لاکھ روپیہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ سرکار کا منشا پچاس کروڑ ہے فرمانے لگے ''ہاں تو یہ لڑائی کا چار پانچ روز کا خرچ ہوگا'' میں نے کہا'' کہ فقط ڈہائی دن کا'' پھر کچھ ایسی باتیں ہوتی رہیں کہ یہ خبر گشت کر رہی ہے کہ مجھے شاید بلالیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔

ایک مسئلہ کے متعلق میں نے توجہ دلائی۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ امرائے پائیگاہ کو اپنی فوجیں رکھنے کا حق تھا۔ امرائے پائیگاہ کا مرتبہ جاگیرداروں سے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ خاندان تھے جن میں سابق حکمراں حضرات کی صاحبزادیوں کی شادیاں کی گئی تھیں۔ انہیں اپنی فوجیں اپنی پولیس اپنے قید خانہ رکھنے کا حق حاصل تھا۔ تاکہ جس وقت نظام کو ضرورت ہو تو اُن کی فوجیں بھی حاضر ہو جائیں انہیں جاگیریں دی گئی تھیں۔ جن پر کوئی مالگذاری نہ تھی نہ کوئی اور ٹیکس حکومت لیتی تھی۔ یہ طریقہ زمانہ سابقہ میں کتنا ہی درست ہو مگر اس زمانہ میں ترمیم کی ضرورت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ فوجیں ریاست کی فوجوں کے ساتھ ملادی جائیں تاکہ انہیں اچھے ہتھیار اور مناسب حال تربیت دی جائے۔ جاپان برابر بڑھتا آرہا تھا اور یہ اندیشہ بھی سرکاری طور پر بتایا گیا کہ ممکن ہے جاپانی جنگی جہاز مدراس پر فوجیں اتار دیں۔ دوسرا مسئلہ کیبنٹ سکریٹری کے تقرر کا تھا۔ میرا معروضہ میر خاں کے متعلق عرصہ سے گیا تھا مگر حکم صادر نہیں ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہوا جب اعلیٰ حضرت نے یہ فرمایا مجھے ان باتوں سے دلچسپی نہیں کاظم یار جنگ سے بات کر لیجئے۔ ۱۱ر فروری کے روزنامچہ میں اس واقعہ کو میں نے ''ریاست کی بدنصیبی'' لکھا ہے۔

۱۳ر فروری سر اکبر حیدری کے چہلم میں ''دلکشا'' مکان میں شریک ہوا مرحوم کو حیدرآباد اور اس مکان سے اس قدر محبت تھی کہ گو انتقال دہلی میں ہوا تھا مگر ان کا جنازہ حیدرآباد لایا گیا اور اس مکان میں جہاں وہ رہا کرتے تھے رکھا گیا۔ اسی روز اعلیٰ حضرت بھی یہاں آئے تھے۔ میں مرحوم کے دفن میں شریک تھا مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا کہ جب مرحوم صدر اعظم تھے تو حیدرآباد کے لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔

مگر جنازہ میں بہت کم لوگوں نے شرکت کی جس کی وجہ یہ تھی کہ نظام اُن سے ناخوش تھے۔اس میں اہل حیدرآباد کی کیا شکایت۔عروج وزوال سے لوگ متاثر ہوتے ہیں یہ انسانی سیرت کی کمزوری اور کردار کا تاریک پہلو ہے۔

۱۴ارفروری کو میں نے ریزیڈنٹ سے گفتگو کی کہ غلام محمد صاحب مرحوم کو یہاں لایا جائے۔ریزیڈنٹ نے زاہد صاحب مرحوم کا نام لیا۔میں ان سے واقف تھا اور اب یہ خیال کرتا ہوں کہ ان کا انتخاب بہتر ہوتا۔مگر میری رائے اس وقت غلام محمد صاحب مرحوم کے واسطے قائم رہی اور میں نے نظام کو یہ تجویز بذریعہ عریضہ بھیج دی۔تجربہ نے بتایا کہ شاید زاہد صاحب مرحوم کا آنا بہتر ہوتا۔

غلام محمد صاحب مرحوم

یہ بیحد ذہین اور معاملہ فہم تھے۔یہ گورنمنٹ میں ریلوے صیغہ میں فنانس کے سکریٹری تھے۔میں انہیں حیدرآباد فنانس منسٹر کی حیثیت سے لے گیا تھا۔طبیعت رسا پائی تھی۔مسئلہ کیسا ہی مشکل اور لاینحل ہو۔مرحوم کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لیتے تھے۔تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان کے فنانس منسٹر اور پھر گورنر جنرل ہوئے جس چیز کے حاصل کرنے کا خیال کر لیتے تھے اس کے حصول میں کسی کوشش سے دریغ نہیں کرتے تھے۔حصول مقصد کے لئے انتخاب ذرائع میں مناسب اور نامناسب کا خیال نہیں کرتے تھے۔مرحوم علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔تین سال حیدرآباد میں رہے۔ٹاٹا کی شرکت میں ’’دکن ایرویز‘‘ انہیں کی کوشش کا نتیجہ تھی۔جس سے حیدرآباد دہلی بنگلور اور مدراس میں ہوائی سروس شروع ہوئی۔مجھے اس دوران میں ان سے کچھ شکوہ ہو گیا تھا۔مگر وہ سب ۱۹۵۵ء کے اس واقعہ کے بعد ختم ہو گیا۔میں فنلینڈ ایک پارلیمنٹ کے ڈیپوٹیشن میں گیا تھا۔واپسی کا سفر سمندری جہاز سے کیا۔جہاز بارہ گھنٹے کے واسطے کراچی ٹھہرا۔راحت میاں سلمہٗ نے وہاں ایک لنچ کا انتظام اپنے مکان پر کیا تھا۔جس پر گورنر جنرل اسکندر مرزا، سر ناظم الدین مرحوم، شہید سہروردی مرحوم اور وزراء اور عمائدین شریک تھے۔غلام محمد صاحب مرحوم مفلوج ہو چکے تھے اور شریک نہ ہونے کی

معافی چاہی تھی۔ اور سلام کہا تھا۔ میں نے راحت میاں سے کہا کہ میں خود اُن سے ملنے جاؤں گا۔

لنچ کے بعد گیا۔ ایک علی گڑھ کے بھائی پرانے دوست اور شریک کار کو جس حال میں دیکھا۔ اس سے یوں ہی متاثر تھا۔ ایک باغ و بہار شخص کام کرنے کا ذہنی جارحانہ پالیسی کا قائل گورنر جنرل ہونے کے بعد یوں مفلوج و معذور ہو جائے۔ یہ سین بہت ہی افسردہ کرنے والا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ مرحوم نے اپنی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے لپک کر اُنہیں پکڑ لیا اور جھک کر سینے سے لگا لیا۔ پاس بیٹھ گیا۔ زبان میں لکنت ہو گئی تھی اور گفتگو مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ مجھے انہیں اس حال میں دیکھ کر بہت تکلیف اور صدمہ ہوا۔ جب ملاقات ختم ہونے کے بعد میں رخصت ہونے لگا۔ مرحوم نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی میں نے روکا۔ مگر مرحوم نے راحت سلمۂ کو ڈانٹ کر کہا ''مجھے اٹھاؤ مجھے اُٹھاؤ'' راحت میاں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اُنہیں اٹھایا۔ مرحوم نے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے کہا ''نواب صاحب اگر میرے جنازہ پر بھی آ گئے اور مجھے اس کا احساس ہوا تو میں کھڑا ہو جاؤں گا'' دل تڑپ گیا آنسو بھر آئے۔ اس فقرے کو سن کر میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی۔

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

سر تھیوڈور ٹاسکر کے ریٹائر ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ریزیڈنٹ یہ چاہتے تھے کہ انہیں کچھ روز رکھا جائے اور مسٹر گرگس کو ایک زائد ممبر بحیثیت وزیر کے کر لیا جائے اس پر نہ مجھے اتفاق تھا نہ اعلیٰ حضرت کو میں نے صاف کہہ دیا کہ وزارت میں ایک سے زیادہ انگریز نظام ہرگز منظور نہ کریں گے۔ آخر یہ ہی طے ہوا کہ ایک ہی انگریز وزیر ہوگا۔

۴؍ مارچ ۱۹۴۲ء کو میر خاں معتمد باب حکومت (کیبنٹ سکریٹری) ہو گئے پھر کچھ روز کے بعد میر نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

۷؍ مارچ ۱۹۴۲ء کو میں کنگ کوٹھی حاضر ہوا۔ اعلیٰ حضرت اس سے مطمئن تھے کہ ریزیڈنٹ نے اسے مان لیا کہ ایک ہی وزیر رہے گا۔ اور دوسرا جیسا کہ ابتک

ہو رہا تھا۔

(Director of Revenue) رہے۔اس کے بعد فرمانے لگے کہ ”جنگ کے بعد میں یہ پانچ پوائنٹ اٹھاؤں گا“۔

(۱) اور والیان ملک سے علیحدہ ہماری بادشاہت تسلیم کی جائے۔ایک خود مختار ریاست مانا جائے۔

(۲) برابر مسیلی پٹم اور دوسرے اضلاع جو انگریزوں کو معاہدے کی بنا پر دید یئے تھے واپس ہوں۔

(۳) سکندرآباد سے فوج ہٹالی جائے۔

(۴) ہم جتنی چاہیں فوج رکھ سکیں۔

(۵) ہم اپنے ہتھیار آپ بنا سکیں۔

میں اب یہ سوچا کرتا ہوں ”مادر چہ خیالیم وفلک در چہ خیال“ کیسا غلط تصور مستقبل کے متعلق تھا۔

۱۳ر مارچ ۱۹۴۲ء کو غلام محمد مرحوم حیدرآباد پہونچے۔ان سے یہ معلوم ہوا کہ سید عبدالعزیز صاحب مرحوم نے دہلی میں یہ مشہور کیا ہے کہ حیدرآباد میں میں بہت غیر ہر دلعزیز ہوں۔میں غلام محمد صاحب کو وہاں کے حالات کے متعلق بتاتا رہا اور غلام محمد صاحب کے تقرر کے لئے حضور نظام کو عرضداشت لکھ کر بھیج دی۔

۱۶ر مارچ ۱۹۴۲ء کو پھر کاظم یار جنگ آئے۔منجملہ بہت سے احکامات کے یہ بھی حکم تھا کہ حیدرآباد کے حقوق کے متعلق ایک نوٹ تیار کیا جائے اور اس وقت موقع ہے آزادی کے حصول کی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے ذریعہ سے پبلک میں ایجی ٹیشن کرایا جا سکتا ہے میں نے اس سے اختلاف کیا اور کاظم یار جنگ سے کہا کہ ایسا کرنا خلاف مصلحت ہوگا۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم

یہ ایک جاگیردار بھی تھے اور پبلک لیڈر بھی۔ان کا نام بہادر خاں تھا۔اُردو

کی تقریر بہت اچھی ہوتی تھی۔ حیدرآباد کی ریاست میں ان سے بہتر اُردو تقار نہ تھا۔ یہ اتحاد المسلمین کے صدر بلکہ اس کے بانی تھے حیدرآباد میں عام طور پر اور خاص کر مسلمانوں پر ان کا بہت اثر تھا۔ گو زمانہ حال کے معیار سے ان کی علمی قابلیت کچھ زیادہ نہ تھی۔ مگر باری تعالیٰ نے انہیں عقل عام (Common Sense) سے نوازا تھا جس کے بغیر علمی قابلیت بیکار رہتی ہے بلکہ علمی قابلیت بغیر عقل عام بعض اوقات خطرناک ہو جاتی ہے۔

ایک بار دوران گفتگو میں مجھ سے فرمایا کہ سر اکبر حیدری مرحوم کے زمانہ میں اس کی ابتداء ہوئی۔ ممکن ہے اس زمانہ میں آریہ سماج نے ایجی ٹیشن کیا تھا اور یہ اس کا ردِ عمل ہو بہادر یار جنگ نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ سر اکبر مرحوم نے اُنہیں کسی دوسرے نام سے چالیس یا پچاس ہزار روپیہ بھی اس کام کے واسطے دیا تھا۔ میرے خیال میں یہ غلطی تھی۔ حکمراں جماعت کے واسطے جداگانہ تنظیم مفید نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ سے لوگوں کی وفاداری پر اثر پڑتا ہے۔ اور ہر گورنمنٹ کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُسے ہر جماعت کا اعتماد حاصل ہو سکے۔ معترض ہونا دوسری بات ہے اعتراض کرنے کا حق سب کو ہے۔ لیکن وفاداری متاثر ہونا بالکل اور چیز ہے۔

مجھے نواب بہادر یار جنگ سے یہ معلوم ہوا کہ جاپان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی وجہ سے برٹش گورنمنٹ کو یہ اندیشہ ہے کہ برما پر تو جاپان کا قبضہ ہو گیا اور ممکن ہے کہ جنگی جہازوں کے ذریعہ مدراس کے ساحل پر جاپانی فوجیں آ جائیں۔ اس لئے برٹش گورنمنٹ کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ جب چاہے ''مارشل لا'' لگا دے۔

مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ اس روز ایک میٹنگ ریزیڈنٹ کے ہاں تھی تا کہ اگر حملہ ہو تو عوام کو بچاؤ کے واسطے کیا کرنا چاہئے اس پر غور کیا جائے وہاں دورانِ گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ مدراس کے کنارے پر ایسے لوگ مامور کئے گئے ہیں کہ جو سائیکل لئے یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی ہوائی جہاز یا سمندری جہاز دشمن کا نظر آئے تو فوراً اطلاع دیں۔ بعض لوگوں کو دس یا پندرہ میل سائیکل پر سفر کرنا ہوگا۔ تب وہ فون کر سکیں گے۔ میں نے کہا اس سے کیا فائدہ ہوگا یہ خبریں تو ''بم

باری'' کے بعد پہونچیں گی۔ طے پایا کہ انہیں ٹرانسمیٹر دیئے جائیں تا کہ فوراً خبر کرسکیں۔ پھر ریکا ریزیڈنٹ نے کہا کہ برٹش حکومت کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ جب چاہیں ریاست کے رقبہ میں مارشل لاء جاری کردیں اور اختیارات جنوبی کمانڈ کودیں میں نے کہا جب آپ کہیں گے ''مارشل لاء'' جاری کریں گے آپ یہ اختیار کیوں لینا چاہتے ہیں وہ کہنے لگے کہ حملہ ہوجانے پر صلاح مشورہ ناممکن ہے میں نے کہا کہ حملہ کے بعد تو ایک مختلف ذہنیت پیدا ہوجائے گی۔ لیکن اگر آج ایسا کیا جائے گا تو لوگوں میں پریشانی بڑھ جائے گی اور گھبرا جائیں گے۔ انہوں نے مان لیا۔ کسی فوجی جنرل میں ''مارشل لاء'' لگانے کا اختیار دینا غلطی ہے۔

گھر آکے مجھے خاص وحشت ہوگئی کہ اگر جاپانی فوجیں مدراس پر آگئیں تو پورا جنوبی ہندوستان خطرے میں آجائے گا۔

۱۸ر مارچ کو ملاقات کے موقع پر میں نے اعلیٰ حضرت سے عرض کیا کہ اس زمانہ میں کوئی شورش بہادر یار جنگ کے ذریعہ سے کرانا مناسب نہ ہوگا۔ اول تو انگریز یہ سمجھے گا کہ میری پریشانی سے بیجا نفع اٹھانا چاہتے ہیں اور چونکہ شورش فقط مسلمان کررہے ہوں گے تو سارے ملک کی تحریک نہیں سمجھی جائے گی اور ممکن ہے کہ ہندو صاحبان اس کے خلاف شورش کریں۔ مگر نظام یہ ہی کہتے رہے کہ انگریز بغیر شورش کے کچھ نہ دیں گے۔

دوسرے روز جو میں حاضر ہوا تو حضور نظام نے یہ فرمایا کہ ابوالحسن سید علی (جو اتحاد کے ایک رکن تھے) نے یہ لکھا ہے کہ مسلمان حیدرآباد کو میری گورنمنٹ پر اعتماد نہیں ہے اس لئے کہ اہم امور میں میری گورنمنٹ کچھ نہیں کرتی۔ اہم امور سے مشاہرہ ہز مجسٹی کا خطاب برابر کی پالیسی وغیرہ تھا۔ اس حالت میں وہ شورش کرنے پر آمادہ ہیں اسے جب سرکار نے بار بار فرمایا تو مجھے کہنا پڑا کہ فدوی نے تو جس روز تقرر ہوا تھا عرض کردیا تھا کہ تقرر کتنے ہی روز کے واسطے ہو لیکن حضور جس روز چاہیں گے میں چلا جاؤں گا یہ بات یہیں ختم ہوگئی۔

۲۰ر مارچ ۱۹۴۲ء کو بہادر یار جنگ میرے پاس آئے میں نے اُن سے شکوہ

کیا کہ ابوالحسن سید علی نے اتحادالمسلمین کی طرف سے اس قسم کا خط سرکار کو بھیجا ان سے معلوم ہوا کہ سرکار کا ایک فرمان ابوالحسن کے پاس آیا تھا جس میں حیدرآباد کے حقوق کے متعلق ذکر تھا۔ ہم نے جواباً یہ عرض کیا کہ سرکار ان چیزوں سے ہمیں الگ رکھیں ورنہ دشواریاں پیدا ہوں گی ہم اپنا فرض ادا کریں گے جس طرح بہتر ہوگا۔

سراسٹیوفورڈ کرپس کی آمد

ان کی آمد نے نہ صرف والیان ملک میں بلکہ کانگریس، لیگ اور مختلف سیاسی جماعتوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ میں ان سے پہلے بھی سر تیج بہادر سپرو کے گھر شاید ۲۳ء یا ۲۴ء میں ملا تھا۔ یہ ہندوستان کی آزادی کے طرفدار تھے مزدور پارٹی کے قائدین میں سے ایک تھے۔ نہایت ذہین معاملہ فہم اور مردم شناس شخصیت کے حامل تھے۔ اسی کے ساتھ بہت اچھے ڈپلومیٹ تھے۔ جتنی تجاویز لائے تھے وہ سب ایسی تھی کہ ہر فریق اس کے معنی اپنے حسب منشاء سمجھتا تھا۔ والیان ملک اور ان کے وزرا عجیب کش مکش میں تھے۔ ایک جانب تو یہ اس سے خوش تھے کہ آئندہ حکومت ہند کے ریزیڈنٹ کا دخل نہیں رہے گا۔ لیکن یہ نہ وزرا کی سمجھ میں آنا تھا اور نہ والیان ملک کی کہ جمہوری آزاد ہندوستانی گورنمنٹ کے ساتھ موروثی شخصی حکمرانی کیسے ملے گا ان کے قیام کی ذمہ دار تو برٹش گورنمنٹ تھی مگر کوئی پرنس یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ اس کے ہٹنے کے بعد کیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر برٹش حکومت معاہدوں کی وجہ سے والیانِ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری نہ لیتی تو ان میں سے بعض ریاستیں ختم ہوگئی ہوتیں لیکن دوسری جانب بعض ایسی ریاستیں بھی تھیں کہ اگر برٹش اتالیق نہ ہوتے تو وہ ذہنی طور پر مفلوج نہ ہو جاتیں اور اپنی رعایا سے بے تعلق ہو جانا والیان ملک کی اصل کمزوری تھی۔

حیدرآباد میں یہ ایک عام توہم تھا جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا کہ موجودہ نظام جو ساتویں نظام تھے، حیدرآباد کے آخری نظام ہیں۔

قصہ یوں مشہور ہے کہ آصف جاہ اول دہلی سے حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کسی بزرگ کے پاس حاضر ہوئے۔ جن کے وہ معتقد تھے اور عرض کیا

کہ موصوف دعا فرمائیں۔ ان بزرگ نے آصف جاہ کو رخصت کرتے وقت ایک زرد چادر میں سات روٹیاں لپیٹ کر دیں اور دعا دی کہ جاؤ تمہاری سات پشت حکمراں رہے گی، نظام حال چونکہ ساتویں نظام تھے اس لئے لوگوں کا عام خیال تھا کہ یہ آخری حکمراں ہیں۔ حیدرآباد کے جھنڈے کا رنگ زرد اور اس میں ایک گول نشان اُسی زرد چادر اور کلچروں کی نمائندگی کرتا تھا جو ان بزرگ نے آصف جاہ اول کو عطا کی تھیں۔

سراسٹیفر ڈکرپس کے آنے سے ہندوستان کے مستقبل کی طرف ہر ایک متوجہ ہوگیا۔ ہر فریق اپنے خیال کے مطابق آزاد ہندوستان کی تصویر اپنے ذہن میں بناتا تھا۔ اور سمجھتا کہ آئندہ ہندوستان کا نظام اسی نہج پر ہوگا۔ اس غلط فہمی میں اسٹیفر ڈکرپس کی گفتگو سے کچھ اضافہ ہوجاتا تھا۔ کانگریس، مسلم لیگ اور والیان ملک اپنے اپنے تصور کے مطابق مستقبل کی تصویر بناتے تھے۔ لیکن آزاد ہندوستان کا جو تصور والیان ریاست کے ذہن میں تھا وہ سب سے زیادہ غلط تھا۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ان کی وہی حیثیت ہوگی جو برٹش گورنمنٹ کے آنے سے پہلے تھی۔ انہیں اس کا گمان بھی نہ تھا کہ جمہوریت کا سیلاب ان کو بہالے جائے گا۔ سارے ملک میں جمہوری حکومت ہو اور ریاستوں میں شخصی حکوت باقی رہے ''اجتماع ضدین'' کیسے ممکن ہوگا یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آتی تھی۔

اعلیٰ حضرت نے حکم دیا کہ حیدرآباد کی طرف سے جو مطالبہ پیش کرنا ہے اس پر علی یاور جنگ بہادر ایک یادداشت تیار کریں جو برٹش گورنمنٹ کے سامنے پیش کی جائے گی۔

جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں یہ مطالبہ پرانے معاہدوں کی بناپر تھے۔ جن میں برار اور دوسرے اضلاع کی واپسی کا مطالبہ تھا۔

ہوش مرحوم نے اس کا ذکر مجھ سے کیا جس کی تصدیق بعد کو علی یاور جنگ نے بھی کی کہ ان کے پاس سرکار کا پیام کاظم یار جنگ کی معرفت پہونچا ہے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر تمہاری وہی پالیسی رہی جو فیڈریشن کے زمانہ میں تھی تو بہتر ہے کہ اس صیغہ کو چھوڑ دو نواب علی یاور جنگ کو قدرتاً اس پیام سے تکلیف ہوئی میں نے ان

کو اطمینان دلایا۔

اس پیام میں فیڈریشن کی طرف جو اشارہ ہے اس کی مختصر کہانی یہ ہے کہ گول میز کانفرنس کے بعد ۱۹۳۵ کا ایکٹ برٹش پارلیمنٹ نے پاس کیا اس میں یہ تجویز تھی کہ ریاستیں اپنی خوشی سے فیڈریشن میں شریک ہو کر مرکزی حکومت ہند کی تشکیل میں حصہ لیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم فیڈریشن کی موافقت میں تھے اور نظام اس کے خلاف تھے۔ نواب علی یاور جنگ سکریٹری کی حیثیت سے صدر اعظم سر اکبر حیدری کے موافق نوٹ تیار کرتے ہوں گے اس لئے سرکار کو یہ خیال ہوا۔

مجھے یاد ہے ۱۹۳۵ء کی فیڈریشن کی تجاویز کو نہ کانگریس نے پسند کیا تھا اور نہ مسلم لیگ نے۔ والیان ملک پہلی گول میز کانفرنس میں اس سے اتفاق کرنے کے بعد آہستہ آہستہ ہٹ رہے تھے لیکن آج میں یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ آخری موقع تھا جب والیان ملک کسی نہ کسی حیثیت سے بچ سکتے تھے۔ ان کے اختیارات کم ہو جاتے ذمہ دار حکومتیں بن جاتیں۔ رئیسوں کو نہ رہتے۔ مگر جب اُن کی رعایا کے نمائندے شریک حکومت ہوتے تو ان کی حکومت میں استحکام آجاتا۔ وہ لوگ جو رئیسوں کے خلاف شورش کرتے ہیں ان کے طرفدار ہو جاتے۔

نواب علی یاور جنگ نے حیدرآباد کے حقوق اور مطالبوں کا نوٹ تیار کیا جو اعلیٰ حضرت نے بھی پسند کیا۔ صرف اتنی ترمیم کی کہ نوٹ کا منشا یہ تھا کہ اگر ملک کے وہ حصے جو معاہدوں کی وجہ سے حیدرآباد سے زمانہ گذشتہ میں لئے گئے اگر واپس نہ ہو سکیں تو ان کا معاوضہ دیا جائے۔ حضور نظام نے معاوضہ کو ناپسند کیا اور ملک کے ان حصص کی واپسی پر زور دیا۔

۲۳ مارچ ۴۲ء کو میں معہ دوسرے ممبران کے دہلی روانہ ہوا۔ طے یہ تھا کہ حیدرآباد کا ڈیلیگیشن سر اسٹیفرڈ کرپس سے تنہا ملے گا۔ اور اپنے معاہدوں کی روشنی میں گفتگو کرے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ حیدرآباد کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کے معاہدے خاص کر وہ جو شروع میں ہوئے تھے بالکل مساویانہ حیثیت کے تھے اس لئے قانوناً ہماری پوزیشن مضبوط تھی اور ہمارا استدلال مسکت تھا مگر اس کا احساس نہ تھا کہ زندگی

اور زمانہ شب و روز کی کتنی کروٹیں بدل چکا تھا اور دنیا کا نظریہ کتنا بدل گیا تھا۔ پہلے شخصی حکومت کی کارفرمائی تھی اب جمہوریت کا دور ہے۔ پہلے راعی کے حکم میں رعایا کو مداخلت کا حق نہ تھا۔ اب رعایا کا تخیل بدل کر شہری ہو گیا تھا۔ جس کے مستقبل کا فیصلہ بغیر اس کی رضامندی کے ناممکن تھا۔

ہم لوگ دہلی پہونچے۔ ۲۶ر مارچ کو منسٹروں کی کمیٹی تھی۔ گو حیدرآباد، چیمبر کا ممبر نہ تھا مگر میں شریک ہوا۔

مسٹر پانیکار نے برٹش تجاویز کو بیان کیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ریاستیں بالکل آزاد ہیں۔ وہ جس طرح چاہیں اپنا مستقبل بنائیں۔ والیان ملک کو یہ تجویز پسند تھی۔ اور بہ ظاہر انگریز کا یہ کہنا خلاف انصاف بھی نہ تھا کہ جس طرح برٹش اقتدار سے پہلے ریاستیں آزاد تھیں، ہم اسی طرح آزاد چھوڑتے ہیں۔ لیکن گذشتہ صدی میں جو ذہنی اور دماغی انقلاب عوام الناس میں ہو گیا تھا اس کے بعد ریاستوں کا آزاد رہنا ناممکن تھا دوسرے روز میں سر کنتھ فنٹر سے ملا ان کی گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ والیان ملک کا اس آزادی کو پسند کرنا مستقبل کا کیسا غلط تصور تھا۔

۲۶ر مارچ کے روزنامچہ کی عبارت یہ ہے۔

میں سر کنتھ فنٹر سے ملا۔ ان کے طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر اسٹافرڈ کے آنے سے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کو کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ حیدرآباد کے ڈیلیگیشن کو تنہا ملاقات کا موقع ملنا چاہیے۔

انہوں نے وعدہ کیا کہ سر ہزی گریگ سے کہیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ معاہدہ جات جو حیدرآباد اور برٹش حکومت کے درمیان ہوئے ہیں انہوں نے جواباً کہا کہ ''اس کا منشا یہ ہے کہ ہم اپنی فوجوں سے آپ کی رعایا کے مقابلہ میں آپ کی حفاظت کیا کریں'' پھر کہنے لگے کہ میں سب کو نہیں کہتا مگر کیا بہت سی ریاستیں ایسی نہیں ہیں کہ جو اس قابل نہیں کہ قائم رہیں''۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کا جواب کس قدر معنی خیز تھا اور حالات زمانہ سے خود برٹش ذہن کس قدر متاثر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ جو ملک کے حصے آپ نے ہم سے معاہدوں کے ذریعہ لئے ہیں وہ واپس کرنے چاہئیں وہ

کہنے لگے کہ ''قانوناً تمہارا مطالبہ درست ہے مگر کیا عملاً اس کا امکان ہے۔ وہاں کی رعایا کا کیا نقطۂ نظر ہوگا وہ حیدرآباد میں شامل ہونا کب پسند کریں گے''۔ ان کی گفتگو اس بات کا قطعی ثبوت تھی کہ جنگ کے اثرات مابعد اور انقلاب زمانہ کے تقاضوں سے برٹش حکومت پوری طرح متاثر ہوگئی تھی۔

میں خود ان حالات سے بے خبر نہ تھا۔ جنگ کے ایک طرف تو برٹش حکومت کمزور ہوگئی تھی تو دوسری جانب اقوام عالم میں آزادی اور حکومت خود اختیاری کی لہر دوڑ رہی تھی۔ امریکہ برابر انگلستان پر دوستانہ دباؤ ڈال رہا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کیا جائے ان تمام عوامل سے برطانوی پالیسی متاثر ہورہی تھی۔ اس کا مجھے ذاتی علم تھا کہ امریکہ ہندوستان کی آزادی کا طرفدار تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں مسٹر ولیم فلپ مقیم تھے۔ یہ امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر روز ویلٹ کے ذاتی نمائندہ کی حیثیت سے یہاں تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے حیدرآباد آنے کا مقصد ظاہر کیا۔ میں نے خوشی سے منظور کیا وہ حیدرآباد آکر میرے ہی پاس ٹھہرے حالانکہ برٹش ریزیڈنٹ نے کوشش کی کہ وہ ریزیڈنسی میں قیام کریں۔

ہندوستان کے سیاسی حالات پر گفتگو کے دوران میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ امریکہ کے پریسیڈنٹ نے مسٹر چرچل کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ مناسب ہوگا کہ ہندوستان کو آزاد حکومت دی جائے۔

اُسی زمانہ میں ایک روز نواب بہادر یار جنگ اور ابوالحسن سید علی مرحومین مجھ سے دہلی میں ملے اور کہا کہ سرکار کے حکم سے وہ آئے ہیں تاکہ ہم لوگوں کو مدد دیں اور مسلمان لیڈروں سے مل کر انہیں حیدرآباد سے موافقت کے لئے تیار کریں۔ میں مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ مدد تو کیا کرتے البتہ پرچہ نویسی کا کام کرسکتے تھے۔ پرانے زمانہ میں شاہانِ وقت ایسے ذرائع سے خبریں حاصل کیا کرتے تھے مگر اس صدی میں ایسے حضرات کا مشورہ کہ جو اس مشورہ کے نتائج کے ذمہ دار نہ ہوں یقیناً خطرناک تھا۔

سر اسٹیفر ڈ کرپس کے آنے اور ان کی پالیسی کو حکومت ہند دل سے پسند نہ کرتی تھی۔ اس کا اظہار ایکزیکیٹو کونسلر اور پولیٹیکل صیغہ کے افسران سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔

۲۸ر مارچ ۱۹۴۲ء کو ہماری پہلی ملاقات سر اسٹیفرڈ سے ہوئی۔ اپنے تاثرات

کے اظہار کے لئے اپنے روزنامے سے کچھ اقتباسات نقل کرتا ہوں تاکہ اس زمانہ کی ذہنی کیفیات کی پوری تصویر سامنے آجائے۔

۲۸ رمارچ ۴۲ء سر اسٹیفرڈ ہم لوگوں کو سیڑھیاں تک لینے آئے نہایت اخلاق سے ہم لوگوں کو بٹھایا۔ یہ نہایت ذہین طبع اور حاضر جواب آدمی ہیں۔ دُبلے پتلے ہیں۔ کپڑے اچھے پہننے کا شوق ہے۔ سیاسی (ڈپلومیٹک) کام کے لئے مخصوص صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تجویز ہم لوگوں کو دی۔ اس تجویز کے متعلق میری رائے ہے کہ یہ چند بنیادی اصول ہیں جو جان کر اس طرح تیار کیے ہیں کہ ہر فریق ان میں سے اپنے مزاج کے موافق مطلب نکالے۔ لیکن جب ان تجاویز کو ایک اسکیم کی شکل دی جائے گی۔ اور مکمل تصویر تیار ہوگی۔ اس وقت غالباً ہر طبقہ کو بالخصوص مسلمانوں اور والیانِ ملک کو بڑی ناامیدی ہوگی۔ ہمارے وفد میں جام صاحب بیکانیر، بھوپال، پٹیالہ، سروہی، اور سرسی۔ پی راماسوامی، گوپالاسوامی وزیر کشمیر اور میں شامل تھے۔ میں نے فقط دو سوالات کئے۔

(۱) جب صوبوں کو یہ حق ہے کہ جس یونین میں چاہیں شریک ہوں تو کیا ایسا حق ریاستوں کو بھی ہوگا۔ "سر اسٹیفرڈ نے کہا" "ہاں"۔

میں نے کہا کہ اگر کچھ ریاستیں خود مل کر یونین بنائیں تو کیا انہیں اس کا حق ہوگا۔ سر اسٹیفرڈ نے کہا "نہیں"

اس پر جام صاحب نے کہا کہ "کیا ہمیں اتنا بھی حق نہ دیا جائے گا کہ جتنا صوبجاتی حکومتوں کو دیا جارہا ہے"۔ سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ کوئی وجہ نہیں اگر بہت سی ریاستیں مل کر ایک یونین بنائیں تو کیوں نہ اُسے مان لیا جائے۔ لیکن جب والیان ملک نے بذریعہ تحریر اُنہیں پابند کرنا چاہا تو سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ ریاستوں کو کوئی حق دوسری یونین کا سا حاصل نہ ہوگا۔

میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ جو ریاستیں ہر یونین سے الگ رہیں گی کیا ان کے ساتھ تاج برطانیہ کا وہی تعلق رہے گا جواب تک ہے "سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ "ہاں"

میں۔ اُن کے حقوق کی حفاظت کون اور کس طرح کرے گا۔

وہ-ہم ایک وائسرائے مقرر کریں گے۔اس کے پاس فوج بھی ہوگی۔

میں-کیا آپ کے خیال میں اس کا امکان ہے کہ آپ وائسرائے اور آپ کا گورنر جنرل ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی کریں جب کہ کسی ریاست اور برطانوی صوبہ میں جھگڑا ہو''۔

وہ-ہاں انتہائی حالت میں اس کا بھی امکان ہے''۔

میں نے اس ملاقات کا ذکر تفصیل سے بیان کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ سر اسٹیفرڈ ہر ایک سے اس کے مزاج کے موافق بات چیت کرتے تھے۔ورنہ ظاہر ہے کہ ان کا بیان درست نہ تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ یہ بالکل مہمل بات تھی کہ برٹش وائسرائے برٹش گورنر جنرل کے خلاف فوج کشی کرے۔

اُسی روز پھر تین بجے شام حیدرآباد کے وفد سے ملاقات ہوئی جس میں میرے ساتھ نواب مہدی یار جنگ مرحوم اور سید عبدالعزیز بھی تھے۔نواب علی یاور جنگ بحیثیت سکریٹری وفد میں شامل تھے۔

سر اسٹیفرڈ کے جوابات کا لب لباب یہ تھا کہ جو ریاستیں کہ کسی یونین میں شریک ہوں گی اُن سے تاج برطانیہ کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔مگر جو تاج برطانیہ کی زیر حفاظت رہنا چاہیں گی ان کو اس کی اجازت ہوگی اور ایک وائسرائے اُن کی حفاظت کرے گا۔

میں نے کہا کہ اگر کوئی ریاست کسی یونین میں شریک بھی نہ ہو اور برٹش گورنمنٹ کی (Paramountey) کو بھی پسند نہ کرے تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ان کا جواب یہ تھا۔

(We will not ask a State to do a thing which it does not like or not to do that which it likes)

۳۱ مارچ ۴۲ء کو پرنس چیمبر کی میٹنگ تھی جس میں سروی.ٹی کرشنا چاری نے سرسی۔پی راما سوامی ائر کی تائید سے یہ ریزولیشن پیش کیا کہ والیان ملک ایک یونین بنانے کی تجویز کو پسند کرتے ہیں۔مگر اس کی کچھ زیادہ تائید نہیں ہوئی اور چانسلر کا پیش کردہ ریزولیشن پاس ہوا۔جس کا منشاء یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی خدمت کے لئے تیار ہیں بہ شرط ان کے اختیارات اقتدار کو بحیثیت حکمراں کوئی نقصان نہ

پہونچے۔ اورانہیں بھی ریاستوں کی جانب سے یونین بنانے کا اختیار ہو۔

۲/اپریل کو سر اسٹیفرڈ سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں انہوں نے اسے صاف کردیا کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستان کی حکومت سے دست بردار ہونے کو تیار ہے۔ انہوں نے کہا کہ نئی یونین دوسرے ممالک سے براہ راست تعلق رکھ سکے گی۔ جو ریاستیں کسی یونین میں شامل ہوں گی اُن پر Paramountcy نہیں رہے گی یعنی برٹش حکومت سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جو ریاست کسی یونین میں شریک نہ ہوگی اُسے خودمختار کردیا جائے گا۔ اگر خود چاہے گی تو Paramountcy قائم رہے گی ورنہ خود مختار ہوجائے گی۔ میرے سوال کے جواب میں انہوں نے ان الفاظ میں ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو بیان کیا۔ We want to get out of India unless Indian wants to keep us in India) کریں اس صورت نے والیان ریاست میں حیرت اور انتشار پیدا کردیا۔ سر اسٹیفرڈ سے ملاقات کے بعد جب میں جے پور ہاؤس آیا تو وہاں میں نے والیان ملک کو بہت پریشان پایا۔ یہ انقلاب ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ممکن ہے کہ بعض اس سے مستثنیٰ بھی ہوں مگر والیان ملک کو اپنی رعایا سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی رعایا پر بھروسہ نہیں کرسکتے تھے۔ جمہوریت کے سیلاب سے بچنا ناممکن تھا عوام میں ایک ایسی حکومت کی خواہش پیدا ہوگئی تھی جس میں ان کا بھی حصہ ہو۔ ایسے میں شخصی حکومت کا قیام ممکن نہ تھا۔ یہ ان کی پریشانی کے واسطے کافی تھا۔ مجھے مقبول محمود مرحوم نے ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ والیان ملک نے وائسرائے سے جب یہ بیان کیا کہ سر اسٹیفرڈ نے یہ کہا کہ

(we want to get out of India)

تو وائسرائے نے کہا کہ ہمیں لکھ کردیجئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وائسرائے اور سر اسٹیفرڈ کرپس ہم خیال نہ تھے۔

۱۶/اپریل ۱۹۴۲ء کو دہلی کی واپسی پر حضور نظام سے ملا۔ وہ سر اسٹیفرڈ کرپس کی گفتگو کے نوٹ سے بہت مایوس ہوئے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ اس میں لکھا تھا کہ جو ریاستیں کسی یونین میں شریک نہ ہوں گی ان پر گورنمنٹ آف انڈیا کا تسلط یعنی (Paramountcy) قائم رہے گی۔

دوسرے روز Sir Cland Gidney ریزیڈنٹ سے ملا۔ دہلی کی گفتگو کے نوٹس انہیں دکھائے۔ وہ اس سے بہت ناخوش تھے اور کہنے لگے کہ نوٹ بڑا ہی Pathetic document ہے گو زبان سے صاف نہیں کہا لیکن اس پر خوش تھے کہ مشن ناکامیاب رہا۔

شام کو نواب بہادر یار جنگ آئے ان سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ ان کا بیان ہے کہ ''دس تاریخ کو جناح مسلم لیگ کا ریزولیشن لے کر سر اسٹیفر ڈ کرپس کے پاس گئے اور کہا کہ ہم لوگوں نے آپ کی تجویز کو مسترد کر دیا ہے لیکن سر اسٹیفر ڈ نے کہا کہ آپ اسے واپس لے جایئے اور کل جب کانگریس مسترد کر دے گی تو آپ سے خود آ کر لے جاؤں گا''۔

جناح نے یہ بھی کہا کہ وہ کانگریس سے بہت ناخوش تھے۔ جب کانگریس کا ریزولیشن مل گیا تو جناح کے مکان سے خود آ کر مسلم لیگ کا ریزولیشن لے گئے۔

میں حضور نظام کی خدمت میں دہلی کی رپوٹ پیش کر کے ریاست کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

حیدر آباد میں کئی انگریز ملازم تھے۔ وہ بعض اوقات اپنے انگریز ہونے کا بے حد فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ حکومت ہند کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بارود سازی کا ایک کارخانہ کلکتہ سے ہٹا کر حیدر آباد میں لایا جائے جب یہ مسئلہ کونسل میں پیش ہوا تو کونسل نے اختلاف کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں ایسے کارخانے ہیں وہاں ہوائی جہاز بم باری بھی کرتے ہیں کرنل سلاٹر نے جو اس تجویز کے حامی تھے ایک خط لکھ کر بھیجا کہ اس پر نظر ثانی کیا جائے ورنہ حکومت ہند کا اعتبار ہم پر کم ہو جائے گا۔ کرنل سلاٹر ہمارے ملازم تھے اور مجھے اس فقرہ پر سخت ناگواری ہوئی میں نے کہا کہ (Lit it be sharen) لیکن کسی شخص کو ہمیں یہ بتانے کا حق نہیں ہے کہ حکومت ہند کی نظر میں کیا چیز ہمارے اعتبار کو قائم رکھے گی اور کیا نہیں رکھے گی۔ کونسل نے متفقہ طور پر انکار کر دیا اس میں شک نہیں کہ انگریز ملازم نہایت مستعد اور فرض شناس ہوتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی حکمراں قوم کے ایک فرد ہونے کی جھلک اس کے اقوال و اطوار میں واضح ہوتی تھی۔

پچاس برس پرانا عطر

ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ جس سے حیدرآباد کے امراء کے کردار پر روشنی پڑتی ہے امراء کو بُرا کہنا تو ایک فیشن ہوگیا ہے مگر ان پرانے خاندان کے امراء میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔

میرے پاس ایک خط عبدالرشید خاں مرحوم کا جو اندور کی ریاست میں ہوم منسٹر تھے، آیا۔ جس میں یہ خواہش تھی کہ مہاراجہ اندور سابق کی یہ خواہش ہے کہ ''اگر'' کا عطر پچاس برس سے زیادہ پڑنا اگر مل جائے تو اُن کے واسطے بھیجا جائے مجھے اس خواہش پر حیرت ہوئی۔ روزنامچہ کی تحریر کی نقل یہ ہے جو پیشین گوئی بن گئی ''یہ لوگ پچاس برس پُرانا'' اگر'' کا عطر تلاش کرتے ہیں حالانکہ زمانہ بتا رہا ہے کہ عطر تو عطر۔ تھوڑے روز میں پچاس برس پرانے مہاراج نہ ملیں گے۔

میں نے اپنے A.D.C کو نواب کمال یار جنگ مرحوم کے خاندان سے دیرینہ تعلق تھا۔ شام کو سبیل تذکرہ جو بھی ذکر آیا۔ جب وہ نواب صاحب مرحوم کے گھر حاضر ہوئے دوسرے روز صبح ہی کمال یار جنگ مرحوم موٹر میں تشریف لائے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا ایسا خط آیا ہے۔ میں نے کہا ''جی ہاں'' کس قدر بے معنی فرمائش ہے۔ ایسا پرانا عطر کون تلاش کرے نواب صاحب مرحوم نے کہا ''نہیں صاحب یہ تو عطر ''اگر'' پچاس برس سے بھی زیادہ پرانا میرے ہاں موجود ہے۔ اسے روانہ کردیجئے۔ یہ تو ہم لوگوں کے واسطے بڑی شرمناک بات ہوگی کہ ہمارے صدر اعظم سے ایک والی ملک کوئی فرمائش کرے اور وہ پوری نہ ہوسکے۔

صدر اعظم اور حیدرآباد کی عزت کا یہ احساس قابل قدر تھا۔

حیدرآباد میں گو ریلوے ریاست کی تھی مگر پولیس کا انتظام لالہ گوڑہ اور ریلوے کے رقبہ میں برٹش کا تھا۔ میں اس کے لئے کوشاں تھا کہ یہ رقبہ ریاست کے زیر انتظام آجائے۔

مئی ۴۲ء میں برٹش گورنمنٹ نے اسے منظور کرلیا اور پوری ریلوے لائن میں ریاست کی پولیس کا انتظام ہوگیا۔ مئی ۱۹۴۲ء میں غلام محمد صاحب مرحوم نے فنانس

اور انڈسٹری کے وزیر کی حیثیت سے چارج لے لیا۔ میں انہیں خاص طور پر حکومت ہند سے مانگ کر لایا تھا۔

۲۱ر مئی کو چینی مسلمانوں کے ایک نمائندے مجھ سے ملے ان کا نام مسٹر ادھین وہ تھا۔ میں نے انہیں سرکاری مہمان بنایا۔ چائے اور ایک دن کھانے پر اپنے پاس بلایا۔ یہ ممالک اسلامی کا دورہ کر رہے ہیں۔ ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ چین کے مسلمانوں کی اقتصادی اور عام حالت سقیم ہے۔ جب چین کے مسلمانوں کا حال سقیم تھا تو کمیونسٹ زمانہ میں اور زیادہ ہو گیا ہوگا۔ اخباروں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

جنگ کے اثرات اور مابعد کی تصویر انگریز کے سامنے آنے لگی ہے۔ میں ریزیڈنٹ سے ۲۵ یا ۲۶ مئی ۴۲ء کو ملا۔ اب وہ انتظامی حالات میں مداخلت کرنا نہیں چاہتے اور کہتے تھے کہ مجھے اور دوسرے ممبران کونسل کو مضبوطی سے کام لینا چاہئے۔

خلیق اور نواب اسماعیل خاں مرحوم آئے ہوئے ہیں۔ میں نے کھانے پر بلایا۔ خلیق یہ چاہتے تھے کہ جو پرانی مشین چھاپنے کی حیدرآباد میں ہے وہ انہیں دیدی جاوے تاکہ ایک مسلم اخبار نکل سکے مگر جناح کو خبر نہ ہو۔ اس سے فریقین کے صفائی قلوب کا پتہ چلتا ہے۔

چونکہ حیدرآباد میں کوئی جمہوری نظام نہ تھا۔ میری یہ خواہش تھی کہ اگر انتخاب نہ ہو تو نامزد شدہ حضرات کی ایک مشاورتی کمیٹی بن جائے (ایڈوائزری کمیٹی) گورنمنٹ حیدرآباد اس کی موافقت میں تھی۔ ۲۷ر مئی کو سید عبدالعزیز صاحب جو ایک وزیر تھے۔ اور بہادر جنگ اور ابوالحسن سید علی مرحومین میرے پاس آئے اور اس پر زور دے رہے تھے کہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی تعداد مساوی ہو۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جب یہ مسئلہ وزراء کی کونسل کے سامنے زیر بحث تھا تو بحیثیت ایک ممبر کے سید عبدالعزیز نے یہ کہا تھا کہ اس کے متعلق بہادر یار جنگ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں چونکہ یہ نتیجہ جماعت نہیں ہوگی بلکہ حکومت کی نامزد شدہ کمیٹی ہوگی۔ اس لئے فرقہ وارانہ توازن کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن آج وہ اس پر زور دے رہے تھے کہ توازن ہونا چاہئے اور جو قواعد (رولز) بنائے جائیں اس میں اس کی صراحت موجود ہو۔

حیدرآباد کے ہندو اس پر راضی تھے کہ ان کی اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو

لیکن اس پر بجا طور پر ان کو اعتراض تھا کہ کسی کمیٹی یا جماعت میں نصف مسلمان ہوں اور نصف غیر مسلم جس میں ہندو، عیسائی، انگلو انڈین سب شامل ہوں۔ میرے روزنامچہ میں یہ عبارت ہے "مجھے یقین ہے کہ یہاں کے مسلمان ان اصلاحات کو نافذ نہ ہونے دیں گے اور بعد از جنگ اس سے دوگنی اور سہ گنی مراعات وحقوق دلوائیں گے لیکن جو کچھ ہوا وہ میرے بھی خواب وخیال میں نہ تھا۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔

غیر منصفانہ ضد اکثر خود ضد کرنے والے کے واسطے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

حضور نظام برٹش حکومت سے بہت ہی بدگمان تھے اور ماضی کے تجربوں کے بعد وہ بدگمانی غلط بھی نہ تھی۔ ۳۰ رمئی کو ملاقات میں مجھ سے فرمایا کہ دوران جنگ میں ہوائی اڈوں کے واسطے جگہ حکومت ہند مانگتی ہے۔ اس چیز کو ابھی صاف کر لینا چاہئے کہ واپسی کے وقت ہزاروں شرائط کھل آتی ہیں۔ دیکھو سکندر آباد کی واپسی ابھی تک نہیں ہوئی۔ میں نے اطمینان دلایا کہ جو عرضداشت پیش کی گئی ہے اس میں ان سب چیزوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ پھر انگریز افسروں کا ذکر آیا جو ۲۶ء کے بعد سے حیدر آباد پر مسلط تھے۔ فرمانے لگے کہ ریزیڈنٹ سے اس کے متعلق کہنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے ذکر کیا تھا مگر مجھے معلوم ہوا کہ حضور اسے طے فرما چکے ہیں کہ تا اختتام جنگ یہ لوگ رہیں اس کے بعد اس پر نظر ثانی ہو۔

میں نے غلام محمد مرحوم کا ذکر کیا کہ انہوں نے چارج لے لیا اور کام کر رہے ہیں فرمایا میں تو اُنہیں جانتا بھی نہیں آپ کی سفارش پر رکھ لیا ہے۔ کل اُن سے ملوں گا۔

۳۱ رمئی کو غلام محمد صاحب نظام سے ملے۔ ان کے ساتھ سید عبد العزیز چھتاری آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ غلام محمد صاحب نے مجھے یہ بھی مشورہ دیا کہ انگریزوں کے اختیارات کچھ کیوں نہ کم کر دیئے جائیں میں نے کہا جلدی کیا ہے آپ خود نتیجہ نکال لیں گے۔ دوسرے روز یعنی یکم جون کو میں سید عبد العزیز کی عیادت کو گیا وہ بیمار رہنے لگے تھے مگر کام کرتے تھے۔ سید صاحب کا بیان تھا کہ غلام محمد صاحب نے نظام سے کہا کہ اُنہیں تنہائی میں جلد جلد ملنے کا موقع دیا جائے۔ جس پر اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ جو کچھ مشورہ ہو آپ نواب صاحب چھتاری سے کیا کریں۔ لیکن جب میں نے مرحوم سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ سب ممبران

کونسل کو تنہا نظام سے ملنے کا موقع ہوا کرے۔

لیکن حیدرآباد کا طریقہ یہ تھا کہ ہر وزیر صدر اعظم سے بغیر مشورہ نظام سے راست مشورہ نہ کرے ایک طرح یہ طریقۂ کار حیدرآباد کے واسطے مناسب تھا ورنہ درباری سازشوں کا اور بھی دروازہ کھل جاتا۔

۶ رجون کو ریزیڈنٹ کے سکریٹری مسٹر کوک ویلس میرے پاس آئے اور بادشاہ کے بھائی ڈیوک آف گلوسٹر Duke of Glowester کا پروگرام جو ۲۰ رتاریخ کو آرہے تھے مجھے دیا جس کا منشاء یہ تھا کہ جب ڈیوک آئیں تو ہوائی جہاز کے اڈے پر حضور نظام شہزادگان اور میں بھی موجود ہوں۔ وہاں سے وہ فلک نما نظام کے ساتھ جائیں۔ وہیں لنچ ہو اور شب کو نظام کی طرف سے ڈنر ہو اور اسی طرح رخصت ہوتے وقت نظام ہوائی اڈے تک پہونچانے جائیں۔ میں نے علی یاور جنگ اور انصاری معتمد باب حکومت یعنی کیبنٹ سکریٹری کو بلا کر بذریعہ نیم سرکاری دفتر پیشی کو مطلع کر دیا۔

آج ہی سرکار کو ان کے شاعری کے استاد جلیل نے ملک الشعراء کا خطاب دیا اور باغ عامہ میں جلسہ اور ایٹ ہوم ہوا۔ ایڈریس کے جواب میں سرکار نے اس خطاب کو قبول کیا۔ مجھ سے فرمایا کہ صبح تم علی یاور جنگ کو بھی ساتھ لانا۔ علی یاور جنگ نے مجھ سے یہ کہا کہ اگر سرکار ڈیوک کو رخصت کرتے وقت ہوائی جہاز تک پہونچانے سے انکار کریں تو میں اس پر زور نہ دوں ورنہ انہیں غلط فہمی ہو جائے گی۔ میں صرف یہ کہوں کہ چونکہ مسئلہ اہم ہے اس لئے کونسل کے مشورے کے بعد طے کیا جائے نواب علی یاور جنگ کو غالباً ڈیوک آف ونڈسر کا واقعہ یاد آیا۔ جب وہ پرنس آف ویلز کی حیثیت سے حیدرآباد آئے تو نظام نے رخصت کے وقت اسٹیشن جانے سے انکار کیا۔ جس سے حکومت ہند اور انگلستان کے شاہی خاندان کو ناگواری ہوئی۔

آج ہی غلام محمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ اُن سے اور سر تھیوڈر ٹاسکر سے گفتگو ہوئی اور سر تھیوڈر ٹاسکر نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ "تم خود ہی یہ اندازہ کرو کہ اگر اعلیٰ حضرت کو اختیارات کامل دیدیے جائیں تو جوان کی موجودہ کیفیت مزاج ہے اس میں وہ اس ریاست کا کیا حشر کریں گے" جو کچھ ٹاسکر نے کہا یہ نہ صرف

حکومت ہند کا خیال تھا بلکہ اس سے بہت سے حیدر آباد کے لوگ بھی متفق تھے۔

دوسرے روز میں اور علی یاور جنگ کنگ کوٹھی حاضر ہوئے۔ سرکار نے فوراً علی یاور جنگ کو نوٹ لکھانا شروع کر دیا۔ جس کا منشاء یہ تھا کہ چونکہ بم باری کے خطرے سے فلک نما محل کا سامان ہٹا لیا گیا۔ لہٰذا ڈیوک ریزیڈنسی میں قیام فرمائیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے سرکار کے اس فیصلہ پر کس قدر حیرت اور افسوس ہوا۔ شہنشاہ ہندوستان کا بھائی اور نظام حیدر آباد کا مہمان مگر اس کا قیام بجائے فلک نما محل کے ریزیڈنسی میں ہو۔ لیکن اگر میں اصرار کرتا تو ضد بڑھتی میں خاموش رہا۔ خیر مقدم اور الوداع کے موقع پر جانے کیلئے راضی تھے مگر الوداع کے متعلق یہ کہا کہ اگر "ضروری ہو تو میں اس پر بھی تیار ہوں"۔

میں اس نوٹ کے ساتھ گیارہ بجے ریزیڈنٹ سے ملا اور جہاں تک مجھ سے ہو سکا ایک ناشگوار بات کو خوشگوار طریقہ سے کہہ کر اُنہیں یقین دلایا کہ ڈیوک کا قیام ریزیڈنسی ہی میں مناسب ہوگا۔ خیر مقدم اور الوداع کے سلسلے میں ریزیڈنٹ نے کہا کہ دونوں مواقع پر سرکار کا تشریف لے جانا مناسب ہوگا۔

میں نے دوسرے روز ۸؍جون کو سرکار سے وہ سب عرض کر دیا جو طے کر آیا تھا جسے سرکار نے پسند فرمایا۔ مگر میرے لئے ایک اور نزاکت پیدا ہوگئی۔ اُسی روز شام کو سر تھیوڈر ٹاسکر کے رخصتی ڈنر میں ریزیڈنسی گیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ریزیڈنٹ نے کہا کہ سرکار نے اُنہیں خط بھیجا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر ڈیوک فلک نما محل میں قیام کریں تو مناسب ہوگا۔ مجھ سے دریافت کیا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔

میں نے کہا کہ سرکار کی جب خواہش ہے تو منظور کر لیجئے مناسب ہے لیکن بار بار یہ خیال آتا رہا کہ کل ہی جو دلائل و براہین میں نے ریزیڈنٹ سے اس تجویز کے خلاف پیش کیے تھے اُسے وہ بھول نہیں سکتا۔ کیا اسے یہ خیال نہ ہوگا کہ نظام تو چاہتے ہیں کہ ڈیوک فلک نما میں قیام کریں مگر صدر اعظم اپنی کسی مصلحت سے یہ نہیں چاہتے۔ حیدر آباد میں ایسے مواقع آ جاتے تھے اور صدر اعظم کی حیثیت سے میرے لئے بڑے خلجان کا باعث ہوتے تھے اگر اپنی پوزیشن کو صاف کیا جائے تو آئین وفا شعاری کے

خلاف اور خاموشی کی صورت میں غلط فہمی کا اندیشہ۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اس ریاست کی بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ سرکار کے مزاج میں کاظم یار جنگ چیف سکریٹری کو اس قدر دخل ہو گیا تھا کہ وہ انتظام ریاست اور حکومت کے واسطے مضر تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ غلام محمد صاحب کی یہ خواہش تھی کہ ''دلکشا'' کوٹھی جس میں اکبر مرحوم رہتے تھے انہیں رہنے کو دیا جائے۔ میں نے نیم سرکاری دفتر پیشی کو روانہ کرنے کا حکم دیا۔ وہاں سے جواب نفی میں آیا۔ میں نے دوسرے روز کاظم یار جنگ سے کہا کہ یہ جواب غلام محمد فنانس منسٹر کی دل شکنی کا باعث ہوگا۔ میں نے دوبارہ نیم سرکاری روانہ کی دوسرے روز اجازت آ گئی۔

حکمراں کو مشورہ دینے کا حق اُسی شخص کو ہونا چاہئے کہ جو اپنی تجویز کے رد عمل اور اثرات کا بھی ذمہ دار ہو۔ ورنہ غیر ذمہ دار لوگوں کے مشورے حکومت اور حکمراں دونوں کے واسطے نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔

مجھے یہ خیال آیا کہ اس موقع پر اگر سرکار ڈیوک کو ایک خط کے ساتھ دس لاکھ روپیہ دیدیں تاکہ واپسی پر بادشاہ کے سامنے نظام کی طرف سے مجروحین جنگ کی امداد کے واسطے پیش کریں تو بہتر ہوگا۔ میں نے غلام محمد صاحب اور سید عبدالعزیز سے مشورہ کیا یہ سب متفق تھے۔ میں نے یہ تجویز بذریعہ نیم سرکاری سرکار کی منظوری کے واسطے بھیجی۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی طبیعت ناساز ہو گئی اور کئی روز تک باریابی کا موقع نہ ملا۔

مجھے بڑی حیرت تھی کہ حضور نظام کی علالت کو بہت ہی راز میں رکھا جاتا تھا۔ ممکن ہے یہ پرانی روایات مغلیہ سلطنت کے زمانہ کی ہوں۔ جب یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر بادشاہ کی بیماری کی شہرت ہوگی تو تاج وتخت کے حصول کی غرض سے سازشیں شروع ہو جائیں گی۔ چار پانچ روز بعد باریابی کا موقع ملا۔ غلام محمد صاحب اور سید عبدالعزیز کو بھی بلایا سرکار اس علالت کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے۔ میری تجویز کے پیش ہونے سے پہلے ہی سرکار نے اس کی مخالف میں تقریر شروع کر دی اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ ڈیوک کی پوزیشن لوگوں کی نظر میں خراب ہو جائے گی کہ ریاستوں سے روپیہ لیتے پھرتے ہیں۔ اس کے بعد سید عبدالعزیز کی طرف دیکھا گو وہ پہلے میری

تجویز سے متفق تھے۔ مگر نظام کی رائے معلوم ہونے کے بعد وہ بھی اختلاف کرنے لگے۔
غلام محمد صاحب نے موافقت کی مگر سرکار خود مخالف تھے تو میں بھی خاموش ہو گیا۔ لیکن
جب ڈیوک جے پور گئے تو سر مرزا اسماعیل مرحوم نے ڈھائی لاکھ روپیہ ڈیوک کو دیا کہ
مجروحین جنگ کی آسائش کے واسطے مہاراج جے پور کی طرف سے ڈیوک ہز مجسٹی کے
سامنے پیش کریں میں نے اس اخبار کا تراشہ سرکار کو بھیج دیا۔

اس ملاقات میں سرکار نے ریزیڈنٹ سے اپنی گفتگو کا ذکر فرمایا۔ سرکار نے
ریزیڈنٹ سے یہ کہہ دیا کہ ہوائی جہاز کے اسٹیشن پر ڈیوک کا استقبال کرنے کے بعد وہ
واپس چلے جائیں اور اعلیٰ حضرت کی بجائے ریزیڈنٹ ڈیوک کے موٹر میں فلک نما
جائیں۔ مجھ سے ارشاد ہوا کہ تم کوشش کرو کہ بجائے ریزیڈنٹ کے پرنس آف
برار ڈیوک کے موٹر میں فلک نما جائیں اگر اعلیٰ حضرت نے کچھ نہ کہا ہوتا تو میں یہ کہہ
سکتا تھا کہ چونکہ نظام کو گذشتہ علالت کے بعد ضعف اور نقاہت ہے۔ لہٰذا ولیعہد اُن کے
بجائے موٹر میں ڈیوک کے ساتھ جائیں۔ لیکن جب اعلیٰ حضرت نے خود بغیر ریزیڈنٹ
کی خواہش کے یہ فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ سرکلا ڈ گڈتی ریزیڈنٹ کے واسطے یہ بڑی عزت
تھی۔ میرے لئے اس عزت سے اُنہیں محروم کرنے کی خواہش کرنا بہت دشوار تھا۔

کنگ کوٹھی سے واپس آکر سیدھا ہوائی اڈے گیا تاکہ ریہرسل میں شریک
ہو جاؤں۔ ریزیڈنٹ موجود تھے۔ میں اور وہ ایک ہی کار میں فلک نما تک گئے راستہ
میں وہ سر علی امام مرحوم کے زمانہ کا ذکر سناتے رہے۔ یہ خود اس زمانہ میں بطور انڈر
سکریٹری حیدرآباد میں تھے۔ پرنس آف ویلز کے حیدرآباد آنے کا اور اعلیٰ حضرت کا
اُنہیں اسٹیشن پر رخصت کرنے کے لئے نہ جانے کا ذکر سناتے رہے۔ ان کا یہ بیان
تھا کہ جب بوسٹن جو اس زمانہ میں ریزیڈنٹ حیدرآباد تھا۔ لندن میں کنگ جارج سے
ملا اور بتایا کہ وہ حیدرآباد کا ریزیڈنٹ تھا تو کنگ نے کہا۔

Yes he is the same prince who was read to my son.

یہ واقعہ میں نے لیٹ ہز ہائینس آغا خاں سے بھی سنا تھا۔ میں نے ہنس کر
دریافت کیا کہ اب حکومت ہند اور ریاست کے تعلقات کیسے ہیں کہنے لگے کہ بہت

اچھے میں نے کہا کہ چھوٹی چیزوں میں آپ خیال کر کے ان کا دل خوش کر سکتے ہیں۔ مثلاً نظام نے آپ سے کہا ہے کہ آپ ڈیوک کے ساتھ موٹر میں جائیں مگر آپ خود یہ کہیں کہ ولیعہد جائیں تو مناسب ہو۔ اس نے مان لیا مگر کہا کہ دہلی کو اطلاع دے چکا ہوں تار دے کر دریافت کروں گا۔ چنانچہ تار دیا گیا مگر دہلی سے جواب نفی میں آیا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ پانچ برس بعد انگریز کو ہندوستان چھوڑنا پڑا مگر اس وقت اس پر راضی نہ ہوئے کہ بجائے H.E.H کے پرنس آف برار ڈیوک کے ساتھ موٹر میں بیٹھیں ڈیوک آئے H.E.H نے ایک براڈ نردیا جس میں دو سو سے زیادہ مہمان تھے میرالڑکا ابن ابھی معہ دستار......شریک تھا۔ دوسرے روز ڈیوک ہوائی جہاز سے چلے گئے۔ H. E.H ریزیڈنٹ دونوں پرنس بسالت جاہ اور میں ریوڈرم پر رخصت کرنے گئے۔ H.E.H نے فرمایا۔ Thank God it is All over

ریزیڈنٹ کے چہرے پر کچھ عجیب سا اثر ہوا۔ میں نے H.E.H کے سوار ہو جانے کے بعد ریزیڈنٹ سے کہا۔

Thanks God every thing went off smothly during the Duke's visit.

ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے مجھے لکھا کہ پرنس آف برار کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ریکٹر کر دیا جائے۔ ۲۵ رجون کو ملاقات میں H.E.H سے میں نے عرض کیا مگر سرکار نے اس کی منظوری نہیں دی اور ڈاکٹر ضیاء الدین پر برس پڑے کہ یہ انگریزوں کا خوشامدی ہے۔ مجھے اس نے لکھا ہے کہ لارڈ لنلتھگو Lord Linlithgow کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیدی جائے۔ آپ اُسے لکھ دیں کہ ''مجھے ڈگری دینے پر اعتراض نہیں مگر میں اس زمانہ میں علی گڑھ نہ آؤں گا''۔

حضور نظام کو انگریزوں سے نفرت تھی۔ وہ یہ خیال فرماتے تھے کہ ان کے اختیارات پر بے جا پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ ان کی آزادی کو ایک حکمراں کی حیثیت سے سلب کر رکھا ہے۔ معلوم نہیں آج H.E.H اور دوسرے والیان ملک کی کیا رائے ہے۔

میں نے H.E.H سے یہ بھی عرض کر دیا کہ آئندہ زمانہ سرمایہ داری کے

خلاف ہے مگر سرکار نے اس فقرہ پر توجہ نہیں فرمائی۔ سرکار کا بھی اور دوسرے والیان ملک کا خیال یہ تھا کہ اس جنگ میں انگریز جیت نہیں سکتا گو امریکہ کی مدد سے لڑائی میں تو انگریزوں کو فتح ہوئی لیکن بقول شاعر۔

لڑنے والوں کو پس از صلح یہ ہوگا معلوم
کس قدر جیت لیا جنگ میں ہارے کیا کیا

انگریز جنگ تو جیتے مگر امپائر ہار گئے۔ اس جنگ نے اقوام عالم میں آزادی کی روح پھونک دی۔ جتنی یورپین اقوام کلونیل پالیسی کی قائل تھیں اور ایشیا و افریقہ کے غریب اور غیر تعلیم یافتہ اقوام کو غلام بنائے ہوئے تھیں۔ انہیں سب کو ان ممالک سے دست کش ہونا پڑا اور قومی حکومتیں بن گئیں۔

۲۸/جون ۴۲ء کو میں نے ریزیڈنٹ سے کہا کہ عنقریب دہلی جا کر میں حکومت ہند پر زور دوں گا کہ مطالبات پورے کئے جائیں اور H.E.H کی خواہش کے مطابق پرنس آف برار کو G.C.I.E دیا جائے۔ انہیں اتفاق تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہماری فوج کو بندوقیں چاہئیں۔ اُس نے کہا کہ معلوم کرنا دہلی میں بندوقیں ہیں یا نہیں۔

شام کو سید عبدالعزیز صاحب کی عیادت کو گیا۔ اُنہیں آرتھرائٹس ہے شب کو گر پڑے اور ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بہت دل گرفتہ اور پریشان تھے۔ اپنی زندگی سے مایوس ہو رہے تھے۔ میں ان کی دل دہی کرتا رہا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ سے اتفاق کرنے کے بعد جو انہوں نے ڈیوک کو مجروحین کے لئے کوئی رقم دینے سے نظام کے سامنے اختلاف کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ H.E.H نے کاظم یار جنگ کے ذریعہ اُن سے کہلا دیا تھا کہ وہ اختلاف کریں۔ یہ حیدرآباد کے واسطے کوئی عجیب بات نہ تھی اسی لئے کوئی شخص حیدرآباد اور نظام کی خدمت کما حقہ نہیں کر پاتا تھا۔

یکم جولائی ۴۲ء کو سر تھیوڈر ٹاسکر حیدرآباد سے رخصت ہوئے مجھے بھی بمبئی جانا تھا۔ میں بھی اسی گاڑی سے جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر بہت لوگ انہیں پہونچانے آئے تھے۔ ریزیڈنٹ بھی تھا۔ یہ بہت غمگین تھے پندرہ سال کے بعد ملازمت اور پھر حیدرآباد کی ملازمت چھوڑنا مغموم کرنے کی کافی وجہ تھی۔

۲ر جولائی ۴۲ء دوسرے روز سرکار کے حکم کے مطابق میں جناح سے ملا۔ جو فارمولہ کہ ہم نے ریاستوں اور حیدرآباد کے مستقبل کے متعلق بنایا تھا تاکہ وائسرائے کو بھیجا جائے وہ انہیں دکھایا۔ ہماری تجویز کو مسٹر جناح نے ناپسند کیا لیکن جب وہ اپنی تجویز بنانے لگے تو ممکن ہے کہ کچھ الفاظ کا فرق ہو۔ مگر وہ بالکل وہی تھی جو ہم لوگ حیدرآباد سے لے گئے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مسٹر جناح کے سامنے اگر آپ مرض کا درماں پیش کریں تو وہ اس پر اعتراض کریں گے۔ اور اگر آپ اپنی مشکلات انہیں بتائیں اور درماں ان پر چھوڑ دیں تو گمان غالب یہ ہے کہ ان کی تجویز اور آپ کی تجویز یکساں ہوگی۔

۳ر جولائی کو ریاست کے وزراء کی میٹنگ تھی جس میں تمام ممبران موجودہ نے اس تجویز کو منظور کیا جو حیدرآباد سے آئی تھی۔ ان تجاویز کا منشاء یہ تھا کہ چونکہ مستقبل کی کوئی صاف تصویر سامنے نہیں ہے۔ لہٰذا ریاستوں کو آزاد رہنا چاہئے۔ وہ چاہیں تو یونین میں شریک ہوں یا چاہیں تو اپنی یونین الگ بنائیں یا الگ رہ کر اپنے تعلقات براہ راست تاج برطانیہ سے رکھیں۔

میں ۷ر جولائی کو ڈفنس کونسل کی میٹنگ میں شریک ہوا۔ اور دوسرے روز Sir Henery Craike سے جو وائسرائے کے پولٹیکل ممبر یا مشیر ہیں ملا۔ وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ ڈیوک حیدرآباد سے بہت خوش آئے۔ پھر ریاستوں کے مستقبل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ملازم انگریز عجیب شش و پنج میں تھے۔ ایک دلی خیالات کو پوری طرح چھپا نہ سکتے تھے۔ دوسری طرف ملازمت کے قیود صاف بات بھی نہیں کہنے دیتے تھے۔ چنانچہ وہ صاف صاف تو کسی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ مگر اتنا ضرور کہا کہ نئے حالات میں برٹش حکومت ریاستوں کی ویسی حفاظت نہیں کر سکے گی جیسی اس وقت کرتی تھی۔ یہی وہ بات تھی جو بحیثیت ایک بہی خواہ اور ذمہ دار ملازم کے مجھے پریشان رکھتی تھی اکثر ناسمجھ اس اعلان سے خوش تھے کہ ریاستوں کو آزاد چھوڑا جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ برٹش حکومت ان کی حفاظت کرتی تھی ورنہ اس ڈیڑھ سو برس کے دوران میں کتنے ہی پرنس خود اپنی رعایا کے ہاتھوں ختم ہوگئے ہوتے۔

پھر میں نے پرنس کے C.C.I.E پر زور دیا اور برابر وغیرہ کا ذکر کیا۔ ہمارے دلائل

کی طاقت اور صداقت تو سب کو تسلیم تھی۔ مگر اب ان حصص کا پھر ریاست میں جانا قابل عمل تھا اور H.E.H معاوضہ پر تیار نہ تھے۔ یہ ایک بڑی غلطی تھی۔ برار یا دوسرے ایسے اضلاع کے باشندے ہرگز اس پر راضی نہ ہوتے کہ انہیں حیدرآباد میں شامل کر دیا جائے۔

میں چھتاری کا چکر لگاتا ہوا ۱۶ر جولائی کو پھر حیدرآباد آ گیا۔ سرکار کے حکم کے مطابق سیدھا اسٹیشن سے باغ عامہ پہونچا۔ وہاں سالگرہ کے سلسلے میں کافی وغیرہ پی۔ پھر میں گھر آیا۔ شب کو ڈنر تھا۔ تقریباً ایک ہزار آدمی شریک ہوئے۔ راحت سلمہٗ، جمشید علی خاں اور عبدالحمید خاں مرحومین بھی شریک تھے۔ ڈنر کے بعد سب سے پہلے میں نے پانچ اشرفیاں بطور نظر پیش کیں۔ بعدہٗ اور حضرات نے نذر دیں۔

سر ہنری کریک جو وائسرائے کے پولٹیکل مشیر تھے حیدرآباد آئے میں ان سے ۱۷ر جولائی کو ملا۔ دوران گفتگو میں ان سے نظام کے اختیارات کے متعلق میں نے ذکر کیا۔ سر ہنری کہنے لگے کہ نظام سے یہ طے ہے کہ دوران جنگ میں ان مسائل کو نہ چھیڑا جائے۔ میں نے یہ کہا کہ انگریز افسران کا جہاں تک تعلق ہے یا جو لوگ برٹش انڈیا کے وزیر بنائے جائیں اسی قاعدے کے تحت حکومت ہند سے دریافت کیا جائے۔ لیکن باشندگان حیدرآباد سے اگر کسی کو وزیر بنائیں تو نظام کو آزادی ہو۔ سر ہنری کریک تو نیم راضی تھے۔ مگر سر کلاڈ گڈنی ریزیڈنٹ نے اس کی مخالف کی اور کہا کہ سر اکبر حیدری کا یہ خیال تھا کہ ایسی آزادی نظام کو دینا نامناسب ہوگی اور انتظام میں خرابی پیدا کر دے گی۔

مولا علی کا پہاڑ

یہاں ایک مقام مولا علی کا پہاڑ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ خاصی خوبصورت جگہ ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر کچھ عمارت بنی ہوئی ہے۔ ایک کمرہ مخصوص بنایا گیا ہے مشہور یہ ہے کہ کسی صاحب نے یہ خواب میں دیکھا کہ حضرت مولا علی کی روح مقدس اس جگہ کہ جہاں کمرہ بنا ہوا ہے تشریف لائی۔ نظام ہر سال یہاں ایک تاریخ کو جاتے تھے اور دونوں شاہزادگان اور دیگر صاحبزادگان اور صدر اعظم کو بھی بلایا جاتا تھا۔ مجھے

اکثر حاضری کا موقع ملا دامن کوہ تک تو موٹر جاتے ہیں۔ یہاں بہت سی عمارات بنی ہوئی ہیں۔ نظام محبوب علی خاں مرحوم جب آتے تھے تو ان مکانوں کو کام میں لایا جاتا تھا۔ وہ معہ اپنے امراء اور بیگمات کے یہاں آتے تھے اور دو چار روز قیام کرتے تھے۔ موٹر سے اتر کر نظام اور تمام حاضرین برہنہ پا ہو جاتے اور اسی طرح سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیتے۔ جس عمارت پر حاضری مخصوص ہے وہاں تک برابر سیڑھیاں ہیں اندازاً پہاڑ کی چوٹی تک چھ سات سو سیڑھیاں ہوں گی۔ نظام بڑی شہزادی کے کاندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے اور ہر چوکھٹ پر آستانہ بوسی کرتے ہولے چلے گئے۔ باوجود پیرانہ سالی اور نقاہت جسمانی کے ان کا اس طرح چڑھنا حیرت انگیز تھا۔ البتہ شہزادگان پر یہ ورزش جسمانی شاق تھی ان کا طرز تکلم اور حالت تنفس اس پر شاہد تھی۔

ہم ایک عمارت پر پہونچے۔ اس کے آخر میں ایک کمرہ ہے اس کے در و دیوار پر شیشہ کا کام ہے کمرہ کے اندر ایک جگہ بہت سے پھولوں کے ہار وغیرہ رکھے تھے۔ سرکار اور جملہ شہزادگان نے پھولوں کے سامنے سجدے کیے۔ میری جبین عبودیت تو ایک ہی آستانہ کی سجدہ گزار ہے۔ میں معذور رہا۔ کچھ فضائل حضرت کرم اللہ وجہہ کے بیان کیے گئے اور واپسی پر اس درگاہ سے نظام کو ایک جلد کلام پاک اور ایک تلوار دی گئی۔ جس ملازم کے دونوں ہاتھوں میں قرآن شریف تھا۔ وہ حضور نظام سے آگے چلتا تھا اور نظام اس کے پیچھے۔ مجھے یہ طرز آداب کلام پاک بہت پسند آیا۔ واپسی کے وقت ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ حیدرآباد میں نظام جس جلسہ میں ہوں کہ کوئی شخص چھتری نہیں لگا سکتا تھا۔ یہ دیرینہ طریقہ تھا مقصد یہ تھا کہ صاحب چتر و علم تو فقط حکمراں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سوائے اس شخص کے کہ جس کے ہاتھ میں کلام پاک تھا یا نظام کے دیگر سب بغیر چھتریوں کے روانہ ہو گئے۔ یہ غنیمت ہوا کہ بارش تیز نہ تھی۔ راستہ میں تھوڑی سی ہموار جگہ ہے جہاں شامیانہ لگا کر کمال یار جنگ سرکار اور جو ہمراہی ہوں انہیں چائے یا کافی پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ہم سب شریک چائے نوشی ہوئے۔ جس شخص کے ہاتھ میں قرآن شریف تھا وہ سرکار کی برابر کی کرسی پر بیٹھا تھا۔

غلام محمد صاحب مرحوم کی یہ بڑی خواہش تھی کہ نظام ان سے تنہا ملا کریں مجھ

سے کہا تو میں نے کہا کہ دشوار ہوگا۔ حیدرآباد کی روایات یہ ہیں کہ صدراعظم کی وساطت سے ہر بات حضور کے سامنے پیش ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ کابینہ میں اتفاق قائم رکھنے کے واسطے اچھا تھا ورنہ پارٹی بندی ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ مگر غلام محمد مرحوم نہ مانے اور ہوش بلگرامی کے ذریعہ اسے گوش گذار کرایا۔ ہوش سرکار کے اسٹاف کے لوگوں میں سے تھے۔ ۲۲ر جولائی کو میرے پاس کاظم یار جنگ یہ پیام لائے کہ میں غلام محمد صاحب سے کہہ دوں کہ انہیں جو کچھ عرض کرنا ہو صدراعظم کے ذریعہ سے اور اگر صدراعظم نہ ہوں اور ضروری بات ہو تو پھر چیف سکریٹری یعنی کاظم یار جنگ کو لکھیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ غلام محمد صاحب مرحوم نے اسے مناسب سمجھا ورنہ میں نے منع کیا تھا یہ طریقہ حیدرآباد کے انتظام مملکت کو ختم کردیتی۔ حضور نظام اس وجہ سے بھی اس تجویز کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اگر سوائے صدراعظم کے دوسرے وزراء کو بھی باریابی کا براہِ راست موقع دیا جائے تو پھر انگریز وزیر کو بھی یہی اختیار ہوگا کہ براہ راست حکمراں سے معاملات طے کرے۔ اسے نظام نہ پسند کرتے تھے اور نہ مناسب تھا۔

یکم اگست ۴۲ء کو سرکار نے فرمایا کہ بہادر یار جنگ اور ابوالحسن سید علی ان سے ملنے حاضر ہوئے تھے اور اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کررہے تھے مطلب یہ تھا کہ حیدرآباد کے حقوق کے متعلق جو نوٹ تیار کیا جارہا ہے اس میں ان حضرات کا بھی مشورہ ہو۔ حضور نظام نے یہ بھی فرمایا کہ سوائے انگریز ممبر کے اور ممبروں کی رائے سے ہمیں مطلع کیا جائے۔ اس مسئلہ کو جب ۱۵ر اگست ۴۲ء کی کونسل میں پیش کیا تو متفقہ رائے یہ تھی کہ کونسل اس کے واسطے تیار نہیں ہے کہ ایسے اہم مسائل میں باہر کے حضرات کو شریک راز بنایا جائے۔ اگر نظام پسند فرمائیں تو ہم عہدوں سے کنارہ کش ہوجائیں چنانچہ یہی عرضداشت بھیجی گئی۔

حضور نظام کو جب گورنمنٹ کی طرف سے کوئی مراسلہ جاتا تھا تو عرضداشت کی صورت میں پیش ہوتا تھا۔

"بہ پیشتیگاہ اعلیٰ حضرت بندگان وعالی ومتعالی مدظلہ العالی"

"بعد آستانہ بوسی مودبانہ عرض ہے"۔

اور ختم اس طرح کی جاتی تھی۔
''الٰہی آفتاب عمر و دولت و اقبال تاباں و درخشاں باد''

عرضی
فدوی جاں نثار
(دستخط صدر اعظم)

۵ راگست کے روزنامچہ میں میں نے لکھا ہے کہ بہادر یار جنگ ملنے آئے دوران گفتگو میں مجھے یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ یکم اگست کو یہ اور سید ابوالحسن سرکار کے طلبیدہ حاضر ضرور ہوئے تھے مگر گفتگو صرف برابر کے طرز حکومت کے متعلق تھی۔ اور انہوں نے میری گورنمنٹ کے کام کے غیر مطمئن ہونے کا اظہار نہیں کیا۔ اور کہنے لگے ''یوں سرکار مالک ہیں جو فرماتے ہیں بجا اور درست کہنے کے سوا کیا چارہ ہے''۔

۱۹۴۲ء سارے ہندوستان میں سیاسی طوفان خیز مظاہروں کا سال تھا۔ اس کا اثر ریاستوں پر بھی پڑا۔ چنانچہ حیدرآباد میں بھی طلبا نے مظاہرے اور شورش شروع کر دی۔ ناظم (ڈائرکٹر) تعلیمات اور وزیر تعلیمات کو بلا کر مشورہ کیا اور طے پایا جیسا کہ ایک بار علی گڑھ یونیورسٹی میں کیا گیا تھا۔ طلباء کے والدین اور سرپرستوں کو بلایا جائے اور اپنے بچوں کو نرم و گرم طریقوں سے فہمائش کریں۔ یہ تدبیر ایک بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور شورش کے مظاہرے بند ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ نوعمر طلباء سے معاملہ کرنے میں بجائے استبدادی کارروائی کرنے کے یہ طرز زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ ارکان حکومت کے مقابلہ میں غصہ اور ضد بڑھتی ہے۔ لیکن اپنے بزرگوں کے سامنے نوعمر ٹھنڈے دل سے بات سننے کو تیار ہو جاتا ہے اور مان لیتا ہے۔ پھر جتنی شورش کرنے والوں کی تعداد ہوتی ہے اتنی ہی سمجھانے والوں کی ہوتی ہے۔ نوعمر کو غرور نفس جسے وہ خودداری سے تعبیر کرتا ہے اپنی ضد پر جمار ہتا ہے۔ پھر عمال حکومت کا تیز اور ترش طرز عمل نوعمر کو بہت شاق گذرتا ہے۔ اور وہ مناسب بات کو تسلیم کرنے کو اپنی شکست سمجھتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ اساتذہ کی طلبا کے دلوں میں عزت نہیں دوسری طرف اساتذہ میں شفقت نہیں۔ پرانا نظریہ

''جور استاد بہ ز مہر پدر''

بالکل مفقود ہو گیا ہے۔ گھر کے بزرگ بڑی حد تک طلبا کو شورش سے روکنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

۲۹ راگست ۴۲ء کو حضور نظام سے بہت خانگی معاملات پر گفتگو رہی۔ وہ میری ذاتی آمدنی بچوں کی تعداد شادی شدہ کتنے اور بغیر شادی شدہ کتنے ہیں۔ میں محراب میں قرآن اب بھی سناتا ہوں یا نہیں۔ دریافت فرماتے رہے پھر سیاسی حالات پر گفتگو رہی۔ میں نے عرض کیا کہ خدا کا کرم ہے کہ جیسی شورش برٹش انڈیا میں ہے۔ حیدرآباد اس سے محفوظ ہے۔ اگر یہاں ہوتی تو برٹش انڈیا سے حالت نازک تر ہوتی۔ فرمایا "کیوں" میں نے عرض کیا کہ یہاں رعایا کے پاس ہتھیار ہیں۔ وہاں نہیں ہیں کہنے لگے "یہ تو بڑا فرق ہے" میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ ہندو جماعت کو بھی ساتھ ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ سرکار نے جو فرمایا اس کا منشا یہ تھا کہ شورش کرنے والوں کو سزا دینی چاہئے۔ میں نے کہا کہ شوریدہ سر لوگوں کا علاج سختی ہے۔ مگر عام دلوں کو بھی ہاتھ میں لینا ضروری ہے۔

پرنس کی تعلیم

اس زمانہ میں پرنس مکرم جاہ بہادر کی عمر نو سال تھی۔ اور ہز ہائینس پرنس آف برار بالخصوص پرنس آف برار کو ان کی تعلیم کے متعلق فکر تھی۔ میری رائے دریافت کی۔ میں نے کہا کہ پرنس کی تعلیم کسی مدرسہ میں داخل کرا کر ہونی چاہئے تاکہ پرنس مستقبل کے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کا ذکر کاظم یار جنگ سے کیا گیا۔ ان کی رائے میں یہ تجویز کہ پرنس کو کسی پبلک اسکول یا مدرسہ میں داخل کیا جائے حیدرآباد کی روایات کے خلاف تھی۔ پرنس آف برار اور پرنس دُرشہوار کو میری رائے سے اتفاق تھا۔ کاظم یار جنگ نے اس مسئلہ کو حضور نظام سے عرض کیا۔ جواب میں سرکار نے کاظم یار جنگ کے ذریعہ یہ کہلا دیا کہ ابھی بچہ کی عمر ہی کیا ہے اور اس جنگ کے پر آشوب زمانہ میں تعلیم کا کیا انتظام ہو سکتا ہے اور سمند ناز پر تازیانہ یہ تھا کہ کاظم یار جنگ نے پرنس آف برار سے کہا کہ ریزیڈنٹ کی بھی یہی رائے ہے جو خلاف واقعہ تھا۔ جب میں نے پرنس آف برار سے یہ قصہ سنا تو کہا کہ اگر لڑائی ختم نہیں ہوتی تو کیا پرنس مکرم جاہ کی تعلیم

بھی نہ ہوگی۔ اس قصہ میں بڑی کش مکش رہی۔ جب سرکار نیم راضی ہوئے تو بورڈنگ میں رہنے کے خلاف تھے۔ لیکن مکرم جاہ اور اُن کے بھائی مفخم جاہ کی تعلیم کی تکمیل کا سہرا اُن کی محترمہ والدہ ہز ہائینس شہزادی دُرشہوار کے سر تھا وہ برابر مصر رہیں کہ ان کی تعلیم پبلک اسکول میں ہو۔ آخر کار دہرہ دون کے پبلک اسکول میں انہیں داخل کیا گیا۔ وائسرائے کو خود بھی اشارتاً اس تجویز کی تائید کرنی پڑی تب کہیں نظام راضی ہوئے۔

پرنس دُرشہوار ایک نہایت ہوشمند، دوربین اور قابل خاتون ہیں اور زبردست شخصیت کی حامل ہیں۔ یہ جس جلسہ میں ہوں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ شہزادی کون ہیں یہ ترکیہ شہزادی ہیں اور آخری سلطان کی لڑکی ہیں۔ انگلش فرنچ جرمن زبانوں پر پورا عبور ہے۔ ترکی اُن کی مادری زبان ہے اور اب اردو میں بھی بے تکلف بات کرلیتی ہیں باری تعالیٰ نے انہیں صوری اور معنوی تمام خوبیوں سے سرفراز فرمایا پر ترکی انقلاب کے بعد سلطان مع اپنے خاندان کے فرانس آگئے۔ پہلی گول میز کانفرنس کے زمانہ میں مولانا شوکت علی و محمد علی مرحومین نے شہزادی درشہوار اور شہزادی نیلوفر کی شادی کے متعلق سلطان مرحوم سے طے کیا اور پھر اعلیٰ حضرت سے گفتگو کر کے ہز ہائینس پرنس اعظم جاہ ولی عہد کی شہزادی درشہوار سے اور شہزادی نیلوفر کی شادی معظم جاہ سے ہوئی۔

حیدرآباد کی یہ روایت کہ نظام کے بچوں کو عام مدارس میں تعلیم دینا اُن کی شان کے خلاف ہے بہت ہی غلط اور نقصان دہ تھی کتابی تعلیم اپنی جگہ ہے اور بغیر اس کے علوم و فنون کا علم ناممکن ہے۔ مگر انسانیت کی تکمیل بغیر تربیت نہیں ہوتی اور صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے کہ نوعمر کے دل میں دوسروں کے احساسات کا احترام پیدا کیا جائے۔ اگر حکمراں اپنے بچوں کو گھر پر تعلیم دیں گے تو ان میں امارت اور علیحدگی کا جذبہ ہوگا۔ اور جمہوریت کے ساتھ یہ چیزیں نہیں چل سکتیں۔ وہ زندگی کے حوادث کی تاب نہ لاسکیں گے۔ مساوات اور موانست ان پر گراں گذرے گی اور یہ بہت بڑی محرومی ہے۔ جس کا تمام عمر سابقہ رہے گا۔ تعلیم کا مقصد نوعمر کو کش مکش حیات کے لیے تیار کرنا ہے جس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ لازم آئیگا۔

۱۱ر اکتوبر ۴۲ء کو اعلیٰ حضرت سے طویل اور کارآمد گفتگو رہی اس کا سلسلہ یوں شروع ہوا کہ غلام محمد صاحب مرحوم نے جو پہلا بجٹ بنایا تو عمداً اُسے خسارہ کا

بجٹ بنایا جس میں خرچ کو آمدنی کے مقابلہ میں چوراسی لاکھ زیادہ دکھایا۔ میں نے مرحوم کو بتادیا تھا کہ بجٹ میں آمدنی کم نہیں ہے مگر کوشش کر کے ایسا کیا گیا تھا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ حکومت ہند چاہتی تھی کہ ریاستیں بھی انکم ٹیکس لگائیں۔ انکم ٹیکس نہ ہونے کی وجہ سے کاروباری حضرات برٹش انڈیا پر ریاستوں کو ترجیح دیتے تھے اور حکومت ہند کے انکم ٹیکس کا نقصان ہوتا تھا۔ غلام محمد صاحب کے اصرار پر میں نے اپنی عرضداشت کے ساتھ یہ بجٹ سرکار کو بھیج دیا۔ اعلیٰ حضرت نے میری عرضداشت کے متعلق فرمایا کہ انکم ٹیکس لگانا یہاں کی روایات کے خلاف ہے اور ہم نے کبھی یہاں انکم ٹیکس نہیں لگایا۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ جمہوری گورنمنٹ ایسا کرے تو دوسری بات مگر خود مختار حکمراں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر موازنہ (بجٹ) میں کمی پڑی گی تو صرف خاص سے پوری کر دی جائیگی۔ میں نے اس پر سرکار کی بہت تعریف کی اور کہا کہ گورنمنٹ نے بجٹ ایسا بنایا کہ جیسا کسی گورنمنٹ کو بنانا چاہئے مگر یہ حکمراں کو اختیار ہے کہ وہ اگر ضرورت ہو تو اپنے پاس سے روپیہ دے مگر رعایا کو ٹیکس سے بچائے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ یہ اہل حیدرآباد کی خوش نصیبی ہے۔ پھر وہاں کے امراء کے متعلق فرماتے رہے۔ اُن کی وفاداری سے مشکوک تھے۔ اس کے بعد مخلوط اور جداگانہ انتخاب پر گفتگو شروع ہوئی۔ سرکار کو یہ غالباً اتحادالمسلمین کے حضرات سے معلوم ہو چکا تھا کہ میں حیدرآباد میں جداگانہ انتخاب کے خلاف ہوں اور وہاں کے مسلمان اتحادالمسلمین کے زیر اثر جداگانہ انتخاب کے طرف دار تھے۔

نظام بجا طور پر یہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمانان ہند کے عام رائے کے خلاف یہاں میری رائے مخلوط انتخاب (نشستوں کو ریزرو کرتے ہوئے) کی موافقت میں کیوں ہے۔ میں نے سرکار کو تفصیل کے ساتھ بتایا۔ کہ حیدرآباد کے خاص حالات میں جداگانہ انتخاب کیوں مضر ہوگا۔ مختصراً میری تقریر کا منشا یہ تھا کہ برٹش انڈیا اور حیدرآباد کے حالات یکساں نہ تھے۔ برٹش انڈیا میں تین پارٹیاں تھیں اکثریت کی پارٹی، اقلیت کا گروہ اور برٹش حکومت، حکم شدہ کا اختیار کامل صرف آخرالذکر پارٹی کے ہاتھ میں تھا۔ باقی دونوں فریقین اپنے دلائل پیش کر سکتے تھے مگر فیصلہ برٹش حکومت کی رائے پر منحصر تھا۔ مثلاً مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اکثریت اور اقلیت کام کرتی تھیں اور قاضی یا جج کی حیثیت برٹش حکومت کی تھی لہٰذا ضرورت اس کی تھی کہ کمزور پارٹی کے

نمائندے یا وکیل اپنے دلائل پوری دیانت کے ساتھ برٹش حکومت کے ساتھ پیش کر کے دادخواہ ہوں اور انصاف چاہیں۔ حیدرآباد میں کوئی تیسری پارٹی یا بدیشی حکومت نہ تھی اگر جداگانہ انتخاب ہوگا تو فرقہ وارانہ جذبات کو ترقی ہوگی اور محبت اور اتفاق باہمی کی فضا جو ہمیشہ حیدرآباد کا طغرا امتیاز رہی ہے ختم ہو جائے گی میں نے یہ بھی عرض کیا کہ حکومت اور رعایا کے درمیان محبت کے تعلقات ہونے چاہئیں اس کے بعد کوئی شرارت کرے تو بلا خوف سزا دینی چاہیے حضور نظام بہت غور سے سنتے رہے۔ اور جب ملاقات ختم ہوئی تو فرمایا کہ آج بہت کار آمد بات چیت ہوئی۔

۱۴ /اکتوبر ۴۲ء جو نئے ریزیڈنٹ سر آرتھر لودہین نے آ کر چارج لیا میں ان سے پہلے سے واقف تھا۔ یہ نہایت فہیم اور تجربہ کار افسر تھے۔ ریاستوں میں ریزیڈنٹوں کے ذریعہ معلومات اتنے وسیع تھے کہ ہر چیز کی اطلاع انہیں ہوتی تھی۔ میرا یہ خیال ہے کہ محلات میں خود ایسے لوگ موجود تھے کہ جو ریزیڈنٹ کو باخبر رکھتے تھے۔ میں اُن سے ۱۵ /اکتوبر کو ملا مجھ سے دریافت کیا کہ اب کوئی گورنمنٹ کے خلاف محاذ (Front) تو نہیں ہے۔ میں نے انکار کیا پھر ایک ایک ممبران کا حال دریافت کرتے رہے۔ میں نے دیکھا انہیں پوری طرح ان حضرات کی خوبیاں اور کمزوریاں معلوم تھیں۔ میں نے سر عقیل جنگ اور مہدی یار جنگ مرحومین کی بہت تعریف کی۔ پھر کاظم یار جنگ کے متعلق کہا کہ احکامات جاری ہونے میں اس قدر تعویق اور دیر کیوں ہوتی ہے۔ اُن کا منشا یہ تھا کہ دفتر پیشی نظام سے احکامات جاری نہیں ہوتے جب تک کاظم یار جنگ کو خوش نہ کیا جائے۔ کاظم یار جنگ کے حالات حیدرآباد میں راز نہ تھے۔ مجھے کہنا پڑا کہ بعض اوقات اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر پیشی سے احکام جاری کرتے میں تاخیر کر دیتے ہیں۔ پھر شہزادگان کا ذکر کرتے رہے۔ برٹش حکومت کو اب بھی بعض باتوں پر اعتراض تھا جس کی میں نے صفائی کی۔ آخر میں کہا کہ گذشتہ عالمی جنگ کے موقع پر سرکار کے دلی رجحانات برٹش حکومت کے خلاف تھے۔ اب کیا حال ہے میں نے کہا کہ جنگی کاموں میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی اور نظام کا پورا تعاون مجھے حاصل رہا میں نے عمداً سرکار کے دلی رجحانات کا ذکر نہیں کیا۔

یکم نومبر ۴۲ء کو میں سرکار کے پاس حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ گذشتہ پندرہ روز ملاقات میں ریزیڈنٹ نے نظام سے کہا کہ ال۔ادروس کہ جو حیدرآباد کی فوج کے کمانڈر تھے C.B.E کا خطاب دیا جائے۔میں نے عرض کیا کہ کیا حرج ہے۔فرمایا کہ نہیں پہلے پرنس آف برار کو جو حیدرآباد کی فوج کے کمانڈر ہیں خطاب ملنا چاہیے۔میں نے اتفاق کیا اور کہا کہ ریزیڈنٹ کی تجویز کو حضور میرے پاس بھیج دیں۔میں حکومت حیدرآباد کی طرف تحریک کروں گا کہ اول پرنس کو G.C.I.E دیا جائے چنانچہ میں نے ریزیڈنٹ سے گفتگو کر کے یہ طے کرایا کہ وہ پرزور سفارش پرنس کو خطاب G.C.I.E کی کریں اور میں نے سرکار کا مطلع کر دیا کہ یہ طے پایا ہے لیکن میں متحیر رہ گیا جب ۶ رنومبر کو حضور نظام نے مجھے اس خط کی نقل دکھائی جو ایک روز قبل وہ وائسرائے کو روانہ کر چکے تھے۔اس میں سرکار نے اپنے دونوں شہزادوں کی شکایت کی تھی۔اور بہت تفصیل کے ساتھ فضول خرچ اور مقروض ہونے کا ذکر بھی تھا۔جب میں نے نقل خط پڑھ چکا تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ آپ کی کیا رائے ہے میں نے کہا کہ اچھا ہوتا اگر یہ خط کچھ مہینہ بعد گیا ہوتا۔ایک طرف ولی عہد کے واسطے G.C.I.E کی سفارش اور دوسری طرف یہ خط طرح طرح کی شکایت سے لبریز۔وائسرائے پر اس کا اثر ظاہر ہے کیسا ہوا ہوگا۔اس پر اعلیٰ حضرت برہم ہو گئے اور فرمایا کہ اور کیا میں یہ کہتا کہ میرے لڑکوں میں یہ خوبیاں ہیں۔ایسے لائق اور قابل ہیں۔کیا میں ان باتوں کو وائسرائے سے چھپاتا۔میں صاف کہتا ہوں صاف کردار کی یہی صفت ہے۔اس کے بعد دونوں شہزادوں پر برس پڑے اور بہت کچھ اُن کے خلاف کہتے رہے۔میں خاموش سنتا رہا۔بار بار مجھ سے فرماتے تھے کہ آپ کچھ نہیں کہتے۔میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتا تھا کہ یہ شہزادوں کی بدنصیبی ہے کہ جو ایک شفیق باپ کو ناخوش کیا۔آخر کار میں نے مجبور ہو کر کہا کہ حضور اُن کے والد ہیں جو کچھ بھی ارشاد فرمائیں حضور کو حق ہے مگر میرے تو آقا زادے ہیں۔میں کوئی نا ملائم لفظ اُن کے متعلق کیسے کہوں۔یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

حیدرآباد میں چند لوگ نظام کے اسٹاف کے لوگ کہلاتے تھے۔غالباً ایسے لوگ سب ہی ریاستوں میں ہونگے۔اُن کا کام تھا کہ جو کچھ حکمراں کی زبان سے نکلے وہ اُسے بڑی آب وتاب کے ساتھ سراہیں اور اپنی طرف سے بڑھا کر تائید کریں۔

ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ شہزادہ معظم جاہ نے ایک بار مجھ سے ہوش یار جنگ کی شکایت کی کہ ہوش نے نظام کے حضور میں تمام اسٹاف کے سامنے اُن کی بیوی شہزادی نیلوفر کے متعلق ناشائستہ اور توہین آمیز الفاظ استعمال کیے اور معظم جاہ کو بجا طور پر اس سے تکلیف پہونچی۔ میں نے ہوش یار جنگ کو بلایا۔ یہ نظام کے اسٹاف میں تھے۔ اردو اچھی لکھتے تھے شاعر اور بہت چرب زبان تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ پرنس معظم جاہ کو شکایت ہے کہ تم نے سرکار کے سامنے پرنسس نیلوفر کے متعلق ناشائستہ اور توہین آمیز الفاظ استعمال کیے، ہوش نے اقرار کیا اور اپنی صفائی میں ایک قصہ سنایا۔ جو بہت مشہور ہے۔

ایک رئیس اپنے باغ میں بیٹھے تھے۔ مصاحبین گرد و پیش ہالہ بنائے ہوئے تھے۔ سامنے ایک کیاری میں بیگن لگے ہوئے تھے۔ رئیس صاحب نے کہا کہ کس قدر خوبصورت معلوم ہوتے ہیں سبز درخت اور اس میں اودے رنگ کے پھل۔ بس پھر کیا تھا۔ درباریوں نے بیگن کی تعریف میں قصیدہ خوانی شروع کر دی اور اُسے جنتی میووں کے قریب پہونچا دیا۔ یکا یک رئیس نے کہا کہ حکماء اس کو اچھی ترکاری خیال نہیں کرتے۔ طباً مفید نہیں ہے۔ درباریوں نے بھی رخ بدلا اور بیگن کی مذمت اور رسوائی میں مبالغہ شروع ہو گیا۔ ترکاری بدذائقہ ہوتی ہے۔ خون غیر صالح پیدا کرتا ہے درخت میں لگے ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردہ چوہے لٹک رہے ہیں نہ صورت خوشنما نہ سیرت اچھی۔ رئیس نے کہا کہ ابھی تو آپ لوگ اتنی تعریف کر رہے تھے۔ اس پر ایک درباری نے کہا کہ حضور ہم آپ کے نوکر ہیں بیگن کے نہیں۔ اس کے بعد ہوش نے کہا کہ میں نظام کا نوکر ہوں جسے وہ برا کہتے ہیں اُن سے زیادہ بُرا کہتا۔ جس کی سرکار تعریف کریں میں بھی قصیدہ خوانی شروع کر دیتا ہوں۔

۱۵ر نومبر ۱۹۴۲ء کو لارڈ لنلتھگو وائسرائے سے ملاوہ آل انڈیا بوائے اسکاوٹ کے متعلق گفتگو کرتے رہے اور Mr.Hoog کے بجائے ڈپٹی چیف کمشنر کون ہو۔ میری رائے دریافت کی۔ میں نے مسٹر جسٹس فلیوین بوس کا نام لیا جو مدھ پردیش ہائی کورٹ کے جج تھے۔ میں نے کہا کہ اُن کے ریٹائر ہونے کا نظام کو بہت افسوس ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ انکا جانشین کون ہوگا۔ کہنے لگے نظام نے مجھے خط لکھا

ہے۔ اس کا جواب دونگا اور جانشین کے متعلق ابھی طے نہیں ہوا ہے۔ پھر پوچھا کہ شہزادوں کا کیا حال ہے۔ میں نے فوراً کہہ دیا کہ وہ خط میں نے دیکھا ہے جو نظام نے انہیں لکھا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ اچھا ہو کہ آپ نظام کی خواہش کے مطابق اُنہیں خط لکھ دیں۔ اور نظام شہزادوں کو تنبیہ کر دیں۔ پھر علی گڑھ اور عثمانیہ یونیورسٹیوں کی تعریف کرتے رہے کہ یہاں کے لڑکے کسی شورش میں شریک نہیں ہوئے۔ پرنس مکرم جاہ کی تعلیم کے متعلق گفتگو کرتے رہے جس کا پچھلے اوراق میں ذکر آچکا ہے۔

میں ۲۶ رنومبر کو حیدر آباد پہونچا۔ جاتے ہی میر خاں نے مجھ سے کہا کہ گذشتہ شب سر محمد یعقوب مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ یہ مراد آباد کے رہنے والے تھے مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹی تھے۔ دہلی میں قانون ساز جماعت کے ممبر تھے۔ میں نے ہی انہیں اس غرض سے رکھا تھا کہ حیدر آباد میں جمہوری رنگ میں کچھ اصلاحات جاری کیے جائیں اور وہ اسکیم تیار کر رہے تھے میں اُن کے دفن میں شرکت کے بعد گھر گیا۔

یہاں انتظامی اعتبار سے یہ بڑی خرابی ہے کہ کوئی چیز راز میں نہیں رہ سکتی یوں تو دفاتر سے بھی راز افشا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن دفتر پیشی سرکار میں جا کر ہر راز طشت از بام ہو جاتا ہے۔ نظام کا وائسرائے کو اپنے بیٹوں کی شکایت کا خط لکھنا مسٹر گرگ سن کو معلوم تھا۔ حکیم مقصود جنگ مرحوم جو نظام کے اسٹاف میں ہوش مرحوم کی طرح تھے میرے پاس آئے اور کہا کہ آج کل چھوٹے شہزادے پر روزانہ نہایت سخت الفاظ میں برہمی کا اظہار ہوتا رہتا ہے اسی طرح سرکار جو کچھ کہتے وہ اُس شخص کو معلوم ہو جاتا جس سے متعلق وہ بات ہوتی۔ ریزیڈنٹ کے یہاں سر فیروز خاں کا لنچ تھا۔ سر فیروز میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ پرنس معظم جاہ اور شہزادی نیلوفر بھی تھیں مجھ سے شہزادی نیلوفر نے کہا کہ آج اعلیٰ حضرت میرے خاوند سے بہت خفا ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں قرض وغیرہ کی وجہ سے ایسا ہے۔ کہنے لگیں کہ قرض ہی کی بات ہوتی تو خیر۔ مگر جو کچھ اور کہا جاتا ہے غلط ہے مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے میں اُن کی بیوی ہوں۔ میں نے یہ کہہ کر قصہ مختصر کر دیا کہ ایسے نشیب و فراز زندگی میں آتے رہتے ہیں آپ متفکر نہ ہوں۔

سر فیروز خاں وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر تھے میرے خاص کرم فرما

تھے۔ بڑے سچے اور قابل اعتماد دوست پنجاب میں وزیر رہے۔ وائسرائے کی مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وزارت میں رہے اور کچھ دنوں وزیراعظم پاکستان بھی رہے۔ میرے یہاں سرفیروز کا سرکاری ڈنر تھا۔ جس میں ریزیڈنٹ ولی عہد اور عمائدین حیدرآباد شامل تھے۔ ولی عہد ڈنر کے بعد ایک طرف مجھے لے کر بیٹھ گئے تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ مجھے صمد یار جنگ مرحوم نے جو ولی عہد کے کنٹرولر تھے کہہ دیا تھا کہ پرنس آپ کا شکریہ ادا کریں گے۔ پرنس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں اُن کے واسطے G.C.I.E. کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی اس کا ذکر آپ سے نہیں کیا۔ اس لیے کہ جب تک کام نہ ہو جائے۔ تذکرہ بے سود ہے۔ شعر

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھئے قطرے پہ کیا گذرے گہر ہونے تک

قطر کو گہر تک کتنے سانحات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے جو حکومت برطانیہ نے کسی کو G.C.I.E کا خطاب حکمراں ہونے سے پہلے دیا ہو۔ مجھے امید ہے کہ پہلی جنوری تک مل جایگا۔ ہنس کر فرمانے لگے۔ کیا میں پہلی جنوری تک حکمراں بھی ہو جاؤں گا میں نے کہا کہ میرا منشاء خطاب سے ہے اور وقت آئے گا تو یہ بھی ہو جایگا۔ میں یہ کیا جانتا تھا کہ پرنس کبھی حکمراں نہ ہوں گے (صمد یار جنگ) یہ پہلے فوج کے معتمد (سکریٹری) تھے۔ اب رٹیائر ہونے کے بعد ولی عہد کے کنٹرولر مقرر ہوئے تھے۔ علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ فارسی، انگریزی اور فرنچ زبانوں پر عبور تھا۔ صاحب کردار اور قابل اعتماد شخص تھے۔ حیدرآباد کا یہ عجیب دستور تھا کہ شہزادوں کے ساتھ باوجود اُن کے صاحب اہل وعیال ہونے کے۔ ایک کنٹرولر ضرور ہو میں ہمیشہ کنٹرولر کو (کنٹرولڈ) کہا کرتا تھا۔ جب شہزادوں پر خفگی ہوتی تھی تو اعلیٰ حضرت انہیں بلا کر اظہار ناخوشی فرماتے تھے۔ بس یہی اُن کا کام تھا کہ عتاب کی موجوں کے تھپیڑے برداشت کیا کریں۔

سرفیروز خاں نون اعلیٰ حضرت سے ملے۔ نظام نے اُن کے متعلق جو رائے

قائم کی وہ پرنس اعظم جاہ اور معظم جاہ دونوں کے علم میں تھی جو تفصیل کے ساتھ ان حضرات نے مجھ سے بیان کی کہ سرکار فیروز خاں نون سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے اور سر سلطان اور سر مرزا اسماعیل کی تعریف کرتے تھے۔ حیدر آباد میں دیگر ریاستوں سے زیادہ برٹش گورنمنٹ دخل دیتی تھی۔ اور صدر اعظم (وزیر اعظم) کو بسا اوقات جام و سندان باختین پر بھی عمل کرنا پڑتا تھا۔ ایک طرف حضور نظام کے محسوسات اور خواہشات کا احترام دوسری جانب حکومت ہند کی پالیسی کا خیال۔ وزیروں کا انتخاب بغیر مشورہ حکومت ہند نہیں ہوتا تھا۔ ہر مہینہ میں دو بار ریزیڈنٹ نظام سے خود ملتا اور انتظامی معاملات میں گفتگو کرتا۔ اس کا ایک نوٹ تیار ہوتا تھا جس کی ایک نقل دفتر پیشی اور دوسری ریزیڈنٹ کے پاس رہتی تھی۔

Self Denial Policy:

ایک روز اعلیٰ حضرت نے دریافت فرمایا کہ (Self Denial Policy) سے کیا مطلب ہے میں نے عرض کیا کہ کس موقع پر فقرہ استعمال ہوا ہے۔ سرکار نے کاظم یار جنگ کو حکم دیا کہ ریزیڈنٹ سے ملاقات کا نوٹ دکھاؤ۔ میں نے اُسے پڑھ کر کہا کہ اس کا منشاء یہ ہے کہ اگر دشمن کسی ملک میں آجائے تو ایسی چیزوں کو جن کی مدد سے دشمن لڑائی کو زیادہ مدت تک جاری رکھ سکے اس سے بچایا جائے۔ وہ دشمن کے ہاتھ نہ آئیں سرکار نے فرمایا کہ کیا وہ ہمارے محلات وغیرہ جیسے فلک نما، انہیں ڈبا دیں گے۔ میں نے کہا نہیں۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ جیسے بجلی کا پاور ہاؤس یا ریل یا کانیں کوئلہ وغیرہ کی۔ انہیں بیکار کر دیا جائے سرکار نے کہا "میں ریزیڈنٹ کو لکھ دوں گا کہ یہ مسئلہ گورنمنٹ کے طے کرنے کا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا وہ میری سرسری رائے تھی"۔

۲۱ دسمبر ۴۲ء کو کاظم یار جنگ آئے۔ اُنہیں یہ معلوم تھا کہ حکومت ہند میں اُن کے خلاف شکایتیں ہوئی ہیں مجھ سے کہنے لگے کہ وہ رشوت نہیں لیتے ہیں اور برٹش حکومت کے خلاف ہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی آمدنی اور خرچ کا کئی سال کا حساب مجھے دیا اور یہ خواہش کی کہ میں اُسے گرگسن کو جو میری گورنمنٹ میں ممبر تھا اور ریزیڈنٹ کو دکھا کر ان کی پوزیشن صاف کر دوں۔ میں نے دوسرے روز ریزیڈنٹ کو وہ کاغذات

دکھا دیئے۔ جب دوبارہ کاظم یار جنگ میرے پاس آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ تمہارے کاغذات میں ریزیڈنٹ کو دکھا دیئے تا کہ پوزیشن صاف ہو جائے۔ اظہار تشکر میں اس زمانہ کا حیدر آبادی طرز شامل تھا کہنے لگے ''جس چیز میں آپ کو خاص دلچسپی ہوا کرے مجھ سے فرمادیا کیجئے'' تا کہ فوراً نظام کا حکم آجائے۔ میں نے کہا مجھے کوئی دلچسپی اس معنی میں کہ میرا ذاتی نفع ہو کسی معاملے سے کبھی نہیں ہوگی۔ میری جو دلچسپی ہوتی ہے وہ محض اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ حکومت کا نفع اور نقصان کس چیز میں ہے۔

یکم جنوری ۴۳ء کو ولی عہد پرنس آف برار کو C.B.E کا خطاب مل گیا۔ حضور نظام کو مبارک باد کا عریضہ بھیجا۔ جمعہ کی نماز جو مسجد میں (موجودہ باغ عام) سرکار پڑھتے تھے۔ اور میں حاضر ہوتا تھا۔ سرکار آئے بہت خوش تھے۔ پوچھا یہ کیا خطاب ہے میں نے عرض کیا کہ جو سرکار کے پاس بھی ہے وہی یہ ہے۔

شام کو پرنس نے چائے پر بلایا۔ وہ شکر گذار تھے اور بہت مسرور تھے۔

۳ رجنوری ۱۹۴۳ء کو سرکار کا مطلوبہ حاضر ہوا۔ G.B.E کے متعلق کچھ اس طرح فرمایا کہ یہ کوئی چیز نہیں میں نے عرض کیا کہ جیسا حضور نے حکم دیا کہ یہ خطاب پرنس کو ملنا چاہیئے اس کی تعمیل ہوئی۔ اور بہت سے والیان ملک تو اس پر رشک کرتے ہوں گے۔ اس کے دو ہی ایک روز بعد بہادر یار جنگ کی طرف سے رہبر دکن میں ایک مضمون شائع ہوا۔ کہ ہمارے پرنس کے واسطے یہ خطاب وجہ ناز نہیں۔ یہ تو محکومی کی دلیل ہے۔ گو نظام نے اسے قبول کیا مگر ہم لوگ پسند نہیں کرتے۔ سرکار نے اس مضمون کی طرف وزراء کی کونسل کو نیم سرکاری خط کے ذریعہ سے متوجہ کیا۔ اور ہر گرسن نے خود اس معاملہ کو اٹھایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ بہادر یار جنگ پر مقدمہ چلایا جائے میں نے اس کی مخالفت کی کہ یہ غلط علاج ہوگا۔ اور جو بہادر یار جنگ نے کہا وہ اُن کی پارٹی کے ممبران بھی دہرائیں گے۔ اس طرح ستیہ گرہ شروع ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی دفعہ کے تحت مقدمہ چلے گا۔ یہ کہنا کہ میری رائے میں یہ خطاب شہزادے کے واسطے کوئی عزت نہیں کسی جرم کی تعریف میں نہیں آتا۔ کونسل نے یہ طے کیا کہ اعلیٰ حضرت ایک فرمان کونسل کو بھیجیں جس میں اس خطاب پر طمانیت کا اظہار

فرمائیں۔ میں نے کابینہ کی اس رائے کو پسند کیا۔ اس لیے کہ اعلیٰ حضرت ایسے خطاب کے ملنے کے متعلق کئی بار فرما چکے تھے۔ اور انہیں کے حکم کی تعمیل میں اس خطاب کی تحریک میں نے کی تھی۔

۹ر جنوری ۴۳ء کو میں دفتر پیشی میں حاضر ہوا۔ اور کونسل کی اس قرار داد کو سرکار میں پیش کیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اعلیٰ حضرت ایسا فرمان لکھنے سے گریز فرماتے ہیں۔ اور مجھ سے فرمایا کہ ریزیڈنٹ سے مل لو اور یہ کہو کہ اس وقت اعلیٰ حضرت کا اس بیان کی تردید کرنے سے غلط فہمی پیدا ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ کونسل کا فیصلہ میں پیش کر چکا ہوں کونسل ایسی تردید کی موافقت میں ہے اور کونسل کی قرارداد کوئی راز نہیں جو ریزیڈنٹ کے علم میں نہ ہو۔ فرمایا اچھا تم ریزیڈنٹ سے کہنا کہ سرکار کی یہ رائے ہے۔ میں نے عرض کیا کہ تعمیل ہوگی۔

دوسرے روز میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ وہ بہادر یار جنگ کی تقریر کا ترجمہ لیے ہوئے نہایت برہم بیٹھے تھے میں نے انہیں کونسل کا ریزولیوشن دکھایا وہ اسے ناکافی خیال کرتے تھے۔ میں نے اس تمام گفتگو کو نوٹ تیار کرالیا جس کا منشاء یہ تھا کہ نہ صرف کونسل کی رائے کے مطابق سرکار فرمان جاری کریں بلکہ سرکار کو حکم دینا چاہیے کہ بہادر یار جنگ معافی مانگیں۔ میں نے دوسرے روز اپنی ملاقات کا نوٹ پیش کیا۔ سرکار نے حکم دیا کہ کونسل کی رائے کے مطابق جریدے میں فرمان شائع ہو۔ میں نے سرکار سے عرض کردیا کہ وہ بہادر یار جنگ کو حکم دیں کہ اب کوئی مضمون نہ لکھیں۔ چنانچہ بہادر یار جنگ کے ذریعہ ایسا حکم چلایا گیا۔

پرنس کا خطاب G.B.E. میرے واسطے ایک دردسر بن گیا جس کا قصہ عرصہ تک چلتا رہا ریزیڈنٹ نے اس معاملہ کو دہلی بھیجا تاکہ وہاں کی ہدایات حاصل کرے۔

۱۱ر جنوری کو میں بھوپال پہونچا اور ۱۲ر کو وہاں سے چل کر لکھنؤ آیا۔ سرمورس ہیلٹ گورنر تھے اُن سے ملا۔ اس زمانہ میں جنگ کی وجہ سے برٹش گورنمنٹ نے منسٹروں کی بجائے ایڈوائزرس مقرر کر رکھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ اگر منسٹروں کو مقرر کیے جائیں تو کیسا ہو میں نے کہا کہ اگر آپ منسٹر مقرر کریں تو وہ اسمبلی کو

جواب دہ ہوں تب تو ٹھیک ہوگا۔ لیکن جب تک اسمبلی برسرِ کار نہیں اس وقت تک منسٹروں کا ہونا بے معنی ہوگا۔

انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ خلیق الزماں صاحب حیدرآباد میں ملازمت چاہتے ہیں گورنر کے سکریٹری نے کہا کہ چودھری خلیق الزماں نے یہ خواہش کی ہے کہ گورنر حیدرآباد نے یہ کہا کہ وہ مجھ سے ذکر کردیں گے۔ خلیق الزماں بھی ملے اور کہا کہ گورنر نے مجھ سے ذکر کیا ہوگا۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ ملازمت میں حیدرآباد جانا نہ ہو۔ لکھنؤ میں ہی کچھ ہو جائے۔ جو ممکن نہ تھا۔

۲۳ر جنوری ۱۹۴۳ء کو سرہنری کریگ سیاسی مشیر حکومت ہند سے ملا یہ بھی بہادر یار جنگ کے مضمون پر بہت برہم تھے۔ گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ اعلیٰ حضرت خود بہادر یار جنگ کو بلا کر فہمائش فرمائیں اور سزا کے طور پر چھ ماہ کے واسطے وہ نظام کے پاس حاضر نہ ہوسکیں (جسے حیدرآباد کی زبان میں ڈیوڑھی بند ہونا کہتے ہیں) اور کسی جلسہ مین چھ ماہ تک کوئی تقریر نہ کریں مجھ سے بہادر یار جنگ نے خود کہا کہ میرا آقا مجھ سے ناخوش نہیں ہے۔ یہ صورت حیدرآباد کے واسطے بہت دشواریاں پیدا کرتی تھی اور حکومت کی دشواریوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

سر آرتھر لودین ریزیڈنٹ چاہتے تھے کہ شیر کے شکار کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ورنگل کے جنگلات میں شکار کا انتظام ہوا۔ ہماری پارٹی میں سر آرتھر لودین۔ لیڈی لودین اور مس لودین یہ چاہتی تھیں کہ انھیں بھی شیر ملے۔ میں نے محکمہ شکار کو تاکید کردی تھی کہ شکار کامیاب ہو ایک مچان پر تو میں اور لیڈی لودین بیٹھے۔ دوسرے پر ریزیڈنٹ اور تیسرے پر اُن کی بیٹی مس لودین تھیں۔ میرا اور لیڈی لودین کا ارادہ تو خود شکار کھیلنے کا نہ تھا۔ اس لیے گو شیر ہمارے قریب سے نکلا مگر میں نے بندوق نہیں چلائی۔ ریزیڈنٹ نے اُسے مار لیا۔

میں نے اس کا انتظام کیا تھا کہ مس لودین کے مچان کے برابر بہت اچھے شکاری بیٹھیں تا کہ اُن سے بچ بھی جائے تب بھی شیر جانے نہ پائے دو شیر نکلے ایک تو ریزیڈنٹ نے مارا اور دوسرا مس لودین نے۔ بندوق شکاری کی بھی چلی۔ بہرحال شیر

مس لودین کا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں شیروں کو ایک مہینہ سے دو کٹھرے
ہر تیسرے روز مار دیے جاتے تھے اور جب وہ حسب عادت تھوڑا کھا کر چھوڑ جاتا تھا تو
اس میں تھوڑی افیون ملا دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شیر اس جنگل سے باہر نہیں
جاتے تھے اور شکار کے روز جھاڑنے پر بے تکلف مچان کے سامنے آ گئے۔

۷ / مارچ ۴۳ء کو ہز ہائینس جام صاحب نوانگر حیدر آباد آئے۔ میرے
یہاں ڈنر تھا۔ تقریر میں میرے لیے بڑے اچھے کلمات فرمائے۔ نج کے طور پر جو گفتگو
ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ والیان ملک اپنے وزراء سے مطمئن نہ تھے۔

میں نے ۹ / مارچ کو ایک مسودہ بہادر یار جنگ کو معافی نامہ کے سلسلہ میں
بھیجا۔ انھیں فقط ایک فقرے پر اختلاف تھا۔ میں نے صغیر صاحب کو بھیج کر کہلوایا کہ وہ
مسودہ پر دستخط کر دیں جسے انہوں نے مان لیا۔ مگر یہ بھی صغیر صاحب سے کہا کہ اعلیٰ
حضرت نے اُن سے یہ کہلا دیا ہے کہ جو اعلان نکلے گا اُنہیں دکھا لیا جائے گا۔ اس طرح
کی دشواریاں حیدر آباد میں ہوتی ہیں۔ جو انتظامی در و بست میں مخل اور حکومت کے
وقار کو نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ بہر حال بہادر یار جنگ نے جو بیان لکھ کر بھیجا اس
سے ریزیڈنٹ اور گرگسن بھی مطمئن نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ سختی کی جائے۔

سرکار نے جام صاحب کو جو لنچ دیا تھا اُس موقع پر گرگسن سے کچھ ایسی گفتگو
کی کہ وہ یہ سمجھا کہ سرکار بہادر یار جنگ پر سختی کے موافق ہیں۔ گرگسن نے مجھ سے کہا
کہ اعلیٰ حضرت سختی کے موافق ہیں سختی کرنی چاہئے۔ میں خاموش ہو گیا۔ لیکن جب
غلام محمد سے گرگسن نے کہا تو غلام محمد نے کہا کہ ''تم ناسمجھ ہو ریاست کی چالوں کو
پہچانتے نہیں ہو''۔ میں عجیب کش مکش میں تھا۔ سرکار قلباً زیادہ سختی کے خلاف تھے لیکن
گرگسن سے یہ خیال ظاہر نہیں کیا میں اصلی حالت کہنا وفاداری کے خلاف سمجھتا تھا۔

۱۲ / مارچ کو میں، گرگسن، علی یاور جنگ اور اینڈرسن (انسپکٹر جنرل پولس)
سب ریزیڈنٹ سے ملے۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی سختی ممکن ہو بہادر یار جنگ پر کی جائے۔
میں نے کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں ریزیڈنٹ نے کہا کہ

۱۔ بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی چھ ماہ کے واسطے بند کر دی جائے یعنی وہ نظام کے

پاس حاضر نہ ہو سکیں۔

۲- وہ چھ ماہ تک کوئی تقریر نہ کریں اور نہ کوئی مضمون لکھیں۔

۳- انھیں اُن کی جاگیر میں محبوس کر دیا جائے۔

میں نے کہا کہ جاگیر میں محبوس کرنے پر شورش کا اندیشہ ہے۔ وہ بولے کہ میں تو اپنی ہدایت کے مطابق کہونگا۔ اب آپ کو اختیار ہے۔

شام کو سرکار نے طلب فرمایا میں نے ریزیڈنٹ کی گفتگو کا ذکر کیا۔ نظام اس پر تیار ہیں کہ چھ ماہ کے واسطے بہادر یار جنگ کو حکم دیں کہ وہ کوئی تقریر نہ کریں لیکن یہ چاہتے ہیں کہ گو وہ خود بہادر یار جنگ کو نہیں بلائیں گے مگر کونسل ایسی سفارش نہ کرے۔

۱۴ر مارچ ۴۳ء آج مسٹر ولیم فلپ (جو کہ پریسیڈنٹ روز ویلٹ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان آئے ہیں) حیدرآباد تشریف لائے اور میرے پاس شاہ منزل میں ٹھہرے اسٹیشن پر میں اور ریزیڈنٹ دونوں موجود تھے۔ میں نے ان کی ملاقات نظام سے طے کر لی۔ سرکار دریافت کرنے لگے کہ مسٹر فلپ سے کیا گفتگو کریں۔ میں نے عرض کیا احتیاط برتیں اور برٹش گورنمنٹ کی برائی نہ کریں۔ میرے یہاں ایک بڑا ڈنر تھا جس میں ریزیڈنٹ اور بہت لوگ تھے۔ ریزیڈنٹ ڈنر کے بعد مسٹر فلپ کو لے کر الگ باتیں کرتے رہے۔

۱۵ر مارچ ۴۳ء کو مسٹر فلپس کا لنچ ولی عہد کے یہاں تھا میں بھی شریک تھا۔ شب کو میں نے ایک بہت بڑا ڈنر مسٹر فلپس کو دیا۔ مجھ سے دوران گفتگو میں مسٹر فلپ کہنے لگے کہ اس کی کیا وجہ کہ انڈسٹریز یہاں ترقی نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ حیدرآباد ہی نہیں یہ تو سارے ملک کا حال ہے وہ کہنے لگے کہ میرا بھی یہی مطلب ہے اور وجہ ظاہر ہے۔ انگریز یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان (Raw Material) تیار کیا کرے اور انگریز مصنوعات (Finished Goods) بھیجا کریں۔ پھر کہا کہ اسی کو (Exploitation) کہتے ہیں۔

ان کی یہ رائے ہے کہ صوبوں کو اختیارات کامل ہوں مگر صوبجات خود مرکزی حکومت کو طاقتور بنائیں تا کہ ہندوستان کی وحدانیت قائم رہے اور یکجائی قوت خراب

نہ ہو یعنی فیڈریشن ہو۔

شام کو انہیں گولکنڈہ کا قلعہ دکھانے لے گئے اور گنبدوں میں جہاں شاہان سلف کے مزار ہیں چائے کا انتظام کیا تھا۔ میں نے غلام محمد مرحوم کو بھی چائے پر بلا کر اُن سے ملایا۔ دوران گفتگو اُن کے بیان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ہندوستان کے مستقبل میں امریکن حکومت کو تجارت اور اقتصادیات میں بہت دخل ہوگا۔ تجارت سب اقوام کے واسطے یکساں کھلی ہوگی اور اس طرح (Raw Material) یعنی کچا مال کے خرید اور برآمد کا سب کو اختیار ہوگا۔ وہ مجھ سے یہ دریافت کرتے تھے کہ آیا مسلمان ہمیشہ علیحدہ رہیں گے۔ میں نے کہا کہ میرے خیال میں علیحدگی کا اختیار ملنے کے بعد دونوں مجبور ہوں گے کہ مل کر رہیں میری یہ رائے غلط ثابت ہوئی۔ مجھے ۱۹۴۳ء میں اس کا ہی یقین نہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم ہوگی ہندوستان کے کروڑوں مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ نہ برٹش اس پر راضی ہوں گے اور نہ ہندو اسے تسلیم کریں گے۔ یہ مطالبہ تو فقط حقوق لینے کے واسطے تھا۔ بقول صابری کے۔

سمجھتے تھے رہے گی جنگ محدود گل و بلبل
مگر تقسیم نظم گلستاں تک بات جا پہونچی

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں مجھ سے مسٹر فلپ نے یہ بھی کہا تھا کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے مسٹر چرچل کو لکھا کہ ہندوستان کو آزادی دینا چاہیے۔

۱۶ر مارچ ۴۳ء زمانہ جس طرح بدل رہا تھا اُس کے آثار و نشانیاں ظاہر ہو رہی تھیں ریزیڈنٹ حالانکہ لنچ پر اور ڈنر پر اُن سے مل چکے تھے مگر اُن کی خواہش پر میں نے انہیں پھر لنچ پر بلا لیا۔ چلتے وقت انہوں نے فلپس سے یہ خواہش کی کہ وہ شام کی چائے ریزیڈنٹ کے یہاں نوش فرمائیں مگر فلپس نے معذرت کر لی کہ اُسے فرصت نہیں ہے۔ یہ صاف علامت تھی جو انقلاب کی نشاندہی کر رہی تھی کبھی برٹش امپائر میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اب وہ خود آفتاب لب بام ہو گئی تھی۔

شام کو میں مسٹر فلپس کو راجہ دھرم کرن اور کمال یار جنگ کے گھر لے گیا۔ وہ امراء کے ان پرانے مکانوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے انہوں نے کچھ ساڑیاں وغیرہ

خریدی تھیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ انہیں میری طرف سے بطور تحفہ قبول فرمائیں۔ بہت اصرار کے بعد مانے۔

۱۷ مارچ ۴۴ء کو کچھ فوجی کرتب دیکھنے پریڈ کے میدان میں گیا ریزیڈنٹ بھی آئے تھے۔ ایک شخص دو گھوڑوں پر بہ یک وقت سواری کر رہا تھا۔ ریزیڈنٹ کہنے لگے۔

"Resident, The President, should also learn to ride on two horses"

میں نے ہنس کر کہا۔

He Does not ride on two Horses But Has .... Two Masters.

Resident no he Bridge the gulf Betwen the two if Any"

اس خلیج پر پل بنانا صدر اعظم حیدر آباد کا سب سے مشکل اور ناخوش گوار فرض تھا۔

۲۲ مارچ ۴۳ء کی شام کو سرکار کا ایک فرمان منسٹر پیشی کے خط کے ساتھ آیا۔ یہ بہادر یار جنگ کے متعلق تھا۔ میں اسے الفاظ میں نقل کرتا ہوں۔ تاکہ اُس زمانہ کی طرز تحریر اور عبارت کا اندازہ ہو سکے۔ یہ اعلیٰ حضرت کے الفاظ تھے منسٹر کو دخل نہ تھا۔

''بخدمت فرمان مبارک کی نقل بھیج کر آپ کو تحریر کرنے کو سرکار کا جو حکم ہوا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے''

کونسل کی عرضداشت مورخہ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ کو میں نے غور سے دیکھا اور آج بالمشافہ نواب صاحب چھتاری سے بھی گفتگو تفصیل سے کی چونکہ میری پوزیشن بحیثیت حکمراں ہونے کے۔ اپنی حد تک بڑی ذمہ داری رکھتی ہے۔ لہذا جو کچھ میرا فرمان اس بارہ میں ہو (جو کہ طبع ہوگا) وہ میری پوزیشن اور Dignity کے مطابق ہو نہ کہ ایسا جس پر ممکن ہے کہ چوطرف سے نکتہ چینی شروع ہو جائے (اندرون و بیرون ملک) لہذا اس کو بچانا ضروری ہے۔ بس میں نے سب امور کو پیش نظر رکھتے

ہوئے ایک جامع مسودہ تیار کیا ہے وہ سب امور پر حاوی ہے (جس کا تذکرہ عرضداشت میں ہے) بس اگر کونسل کو یہ منظور ہے کہ میں اپنے (Prerogative) کو استعمال کرتے ہوئے فرمان جاری کروں تو میں بخوشی اس مسودہ کے مطابق فرمان جاری کرنے کو تیار ہوں......

نقل فرمان

ممالک محروسہ سرکار عالی میں جتنی سیاسی انجمنیں ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ کسی قوم اور ملت کی ہیں۔ اُن کو حکم دیا جاتا ہے کہ دوران جنگ میں کسی قسم کی شر انگیز تقاریر نہ کریں۔ نہ مضامین لوکل اخبارات میں شائع ہوں تا کہ کسی قسم کا نقض امن یا ملک میں بے چینی پیدا نہ ہو۔ ورنہ اس کے خلاف عمل ہوگا تو گورنمنٹ خاطیوں کے ساتھ سخت تدارک کرنے پر آمادہ ہو جائیگی۔

ہاں- وہ بات اور ہے اگر کسی فریق کو اپنی جائز شکایت یا مطالبات کے متعلق لب کشائی کی نوبت آئے تو اس کو درست طریقہ پر اور آئینی طریقہ پر کرسکتا ہے۔ جب کہ یہ ہمہ قسم کی گرفت سے خالی ہو۔ اور اس صورت میں اس پر گورنمنٹ غور کرسکتی ہے۔ نظر براں دنیا کے اس مقولہ پر نظر رہے کہ صلح و آشتی سے بیگانے اپنے ہو جاتے ہیں۔ اور جنگ و جدال سے دوست دشمن بن جاتے ہیں۔

بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ بہادر یار جنگ جب تقریر کرنے اسٹیج پر کھڑے ہوتے ہیں تو اُن کی زبان قابو میں نہیں رہتی یعنی حدود معینہ سے باہر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو موجودہ سیاسی فضا کو مکدر بناتی ہیں۔ لہٰذا اُن کو بھی چاہیے کہ حزم و احتیاط سے کام کریں۔ ورنہ

کسی وقت ہل چل پیدا ہو جائے تو اس کی ذمہ داری مقرر پر
ہوگی۔ اور میرا بحیثیت حکمراں ہونے کے یہ فرض ہوگا کہ جو کوئی
اس حکم کی خلاف ورزی کرے اس کا سد باب کروں نظر براں
میری دانست میں یہی مناسب ہے کہ ایک سال تک بہادر یار
جنگ کسی قسم کی تقریر نہ کریں یا کسی قسم کا بیان اخبار میں شائع نہ
کریں تا کہ گورنمنٹ کو ان امور کی وجہ سے دردسری نہ اٹھانی
پڑے جیسا کہ شیخ سعدی نے کہا ہے۔

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

"میرا یہ حکم پبلک کی اطلاع کی غرض سے جریدۂ معمولی میں شائع کیا جائے۔"

اسی زمانہ میں غلام محمد صاحب مرحوم کا وہ بجٹ میری عرضداشت کے ساتھ
پیش ہوا جس میں انہوں نے انکم ٹیکس لگانے کی خواہش کی تھی جس کا پہلے ذکر کر چکا
ہوں۔ اور نظام نے منظور نہیں کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک اور فرمان صادر ہوا۔
جس کی نقل حسب ذیل ہے۔ بصیغہ راز

بسلسلہ فرمان دیروز متعلق انکم ٹیکس اس قدر اور کہہ دینا
ضروری خیال کرتا ہوں کہ حال میں سالار جنگ نے دوران
انٹرویو مجھ سے کہا کہ طبقۂ امراء سمبستان وغیرہ غور کر رہے ہیں
کہ اگر بغیر اس ریاست کے خاص حالات پر نظر کئے (جس کی
تمثیل برٹش انڈیا ہو یا کوئی اور انڈین اسٹیٹ)۔ ہو نہیں سکتی
اور وہ بھی ایسے حالات میں اور دوسری طرف دوران جنگ
ہے۔ ایسے موقع پر اگر جراً قہراً یہ نافذ کیا جائے گا تو سخت ایجی
ٹیشن اس کے خلاف میں پیدا ہوگا۔ اور متفقہ طور پر یہ مختلف
گروہ رئیس کے یہاں درخواست دیں گے کہ رئیس اپنے
(Prerogative) کر کے ایسے امور کا سد باب کرے کہ رئیس
اپنی حد تک بڑی ذمہ داری رکھتا ہے۔ اپنے ملک میں امن وامان

قائم رکھنے کی۔

اس پر میں نے اُن کو جواب دیا کہ کوئی کام میری گورنمنٹ ایسا نہ کریگی جو فتنہ کا موجب ہوگا۔ لہذا اس طرف میں کونسل کو متوجہ کرنے والا ہوں۔

اس کے بعد کہا کہ فنانس ممبر اگو اپنے (Profession) کو اچھا جانتے ہوں تاہم وہ یہاں کے حالات اور روایات سے واقف نہیں ہیں لہذا جب سے وہ یہاں کے حالات اور روایات سے واقف نہیں طبقوں میں ہر دلعزیز نہیں رہے۔ بلکہ ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جا رہا ہے۔ بعض طبقوں کا خیال ہے کہ معلوم نہیں ان کی دوران ملازمت میں کیا فتنے کھڑے ہوں گے اور اگر ایسا ہوا تو ممکن ہے کہ ان کی حد تک مخالفت یہاں بڑھ جائے گی۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ ایسے امور میرے کان تک بھی میرے ذرائع سے آئے۔ آخر میں کہا کہ بجز چند مستثنیات انقلاب عالم کی وجہ سے تمام بہی خواہان سلطنت کی وفاداری مشتبہ ہوگئی ہے۔ ایسی حالت میں تدبر کا اقتضا یہی ہے کہ ان کو ایسے اندھا دھند امور سے اور نہ خراب کیا جائے بلکہ علیٰ حالہ قایم رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہی طبقے ریاست کی (Back Bone) ہیں۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ "اُن کا کہنا ضرور قابل غور ہے"۔

اس فرمان سے قدرتاً غلام محمد صاحب مرحوم کو پریشانی ہوئی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ آپ ایسی تجاویز پر کیوں اصرار کرتے ہیں کہ جن سے نہ رئیس ہی خوش ہو اور نہ عوام پسند کریں۔

انہیں دنوں مسز میر خاں جو امریکن لیڈی تھیں میرے پاس آئیں اور میر خاں کی جو کیبنٹ سکریٹری تھے، شکایت کی۔ اس خانگی معاملہ میں صدر اعظم کیا کرسکتا تھا۔ لیکن۔ میں نے انہیں بھی سمجھایا اور میر خاں کو بھی سمجھایا۔ اس وقت تو معاملہ روبہ اصلاح ہوگیا تھا مگر سننے میں آیا کہ تین چار سال بعد علیحدگی ہوگئی۔ بین الاقوامی شادیوں کے نتائج اکثر ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ حسن ظاہر کی عارضی فریفتگی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ جو عمر بھر رہتی ہے اور ہر اختلاف کو دبا دیتی ہے وہ خاندانی روایات، ملکی اور قومی روایات اور یکساں خیالات اور نقطۂ نظر مختلف ہوں خیالات میں

تصادم ہو۔تو پھر زندگی بدمزہ ہو جاتی ہے اور عمر بھر نباہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں حضور نظام کچھ علیل ہو گئے۔ اور میں بجائے دفتر پیشی کے نذری باغ میں حاضر ہوا۔ مجھے یہ بھی اجازت دیدی گئی تھی کہ بغیر دستار بلکوس حاضر ہوں۔حیدرآباد کے آداب کا یہ حصہ تھا کہ نظام کے سامنے جو کوئی جائے وہ دستار بکلوس لگائے۔مہمان اس سے مستثنیٰ تھے۔اور بغیر دستار بکلوس حاضر ہونے کی اجازت ایک طرح کا اعزاز خیال کیا جاتا تھا میرا موٹر مہتابی تک گیا۔میرے ۱۶ر جون ۴۳ء کے روزنامچہ میں درج ہے۔

سرکار نے علالت مزاج کی وجہ سے نذری باغ میں یاد فرمایا۔میں نے موٹر سے اترتے ہی دیکھا کہ تمام کمرے برآمدے اور مہتابیاں مختلف قسم کے سامان سے بھری پڑی ہیں۔بکس صندوق۔ بستے۔ پوٹلے جملہ اقسام کی چیزیں انہی کے ساتھ بوتلیں اور مرتبان رکھے ہوئے ہیں۔ان پر گرد چڑھی ہوئی ہے۔مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے ہیں کبوتر کی بیٹ پڑی ہوئی ہے۔خدا جانے کتنے عرصہ سے یہ چیزیں اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہیں آگے بڑھا تو ایک بہت بڑا بکرا کھڑا ہوا پتے کھا رہا تھا۔اس موقع پر اس کے شان نزول کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی (بعد کو معلوم ہوا کہ اس بکرے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس وجہ سے وہ بطور پنشن خوار یہاں رہتا ہے) یہ پہلا موقع تھا جو بغیر دستار بکلوس کے حاضر ہوا۔چھوٹے برآمدے میں سرکار ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور سامنے ایک کرسی گول سیٹ کی رکھی ہوئی تھی جس پر سلام کرکے میں بیٹھ گیا۔میں نے آداب کے بعد امام ضامن پیش کیا۔سرکار بہت کمزور نظر آتے تھے۔فرمانے لگے کہ مجھے دست بھی آتے ہیں اور سو بخار بھی ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس برآمدے میں بہت سے مقفل سربمہر صندوق اور سربمہر زرد رنگ کی تھیلیاں رکھی ہیں۔مجھے خیال آیا کہ جس طرح یہ سامان رکھا ہوا تھا۔ اس میں وقتاً فوقتاً چوری ہونے کا ضرور امکان تھا۔

۱۹ر جون ۴۳ء میں نے نواب بہادر یار جنگ کو بلایا۔علی یار جنگ اور غلام محمد مرحوم بھی تھے۔سر اکبر حیدری کے زمانے میں ایک ایسا تحریری معاہدہ انہیں دیدیا

گیا تھا کہ قانون ساز جماعت میں اکیاون فیصدی مسلمان نشست ہونگی۔ چونکہ ہندو صاحبان بجا طور پر اس تجویز کے خلاف تھے۔ کوئی مقنّنہ یا قانون ساز جماعت کی تشکیل نہیں ہوسکتی تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اس معاہدہ کو واپس دیدیں اور کوئی دوسری تجویز مسلمانوں کے تحفظ کے لیے قبول کرلیں۔ غلام محمد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ جو تجاویز اس معاہدہ کی بجائے ہم نے بتائی تھیں۔ اُن کے متعلق جو گفتگو میرے بعد غلام محمد اور بہادر یار جنگ سے ہوئی اس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ کسی نئی تجویز کو اس معاہدے کی بجائے پسند نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا اصرار درست نہ تھا گو اس انقلاب کے بعد اس پر بحث لا حاصل ہے۔ مسلمانوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اس سے سیاسی اعتبار سے کیا فائدہ ہوتا۔ مگر اکثریت اور اقلیت کے آپس کے تعلقات ضرور بہتر ہو جاتے۔

۲۴ر جون ۴۳ء آج صاحبزادے ذوالفقار جاہ کی پیدائش کے سلسلہ میں سرکار نے ایک لنچ بارہ بجے دیا جس میں شرکت ہوئی۔ میں نے بچے کے واسطے کچھ چاندی کے برتن۔ کھلونے اور کپڑے بھیجے۔ جن کی مجموعی قیمت سترہ سو روپیہ تھی۔ اعلیٰ حضرت نے ایک بہت اچھا خط اپنی اور بیگم صاحبہ کی طرف سے شکریہ کا بھیجا۔

شام کو پھر حاضری کا موقع ملا۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ یہ وائسرائے جارہے ہیں ریاستوں کے مستقبل کے متعلق کوئی اعلان کرینگے۔ میں نے عرض کیا کہ تین چار روز ہوئے میں نے یاددہانی کا خط انہیں لکھا ہے۔ فرمانے لگے:

Did you have the courageto remind the viceroy

میں نے کہا کہ اس میں ہمت کا کوئی سوال نہیں ہے شام کو میں چھتاری کے واسطے روانہ ہوگیا۔ اُسی زمانہ میں حیدرآباد کے ایک اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ بعض جاگیردار دہلی میں ریاست حیدرآباد کے خلاف کچھ سازش کررہے ہیں اور ایک جاگیردار کا نام K سے شروع ہوتا ہے اعلیٰ حضرت نے بتایا کہ وہ جاگیردار جن کی طرف اخبار میں اشارہ ہے کمال یار جنگ مرحوم تھے۔ سرکار نے فرمایا کہ دہلی میں اس کے متعلق معلوم کروں اور ضرورت ہو تو اس کا مداوا کروں۔

میں یکم سے ۳ر جولائی دہلی رہا اور Sir Keigth Fitz سے ملا جو سکریٹری

پولیٹکل ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ میں نے اُن سے ذکر کیا کہ حیدرآباد کے ایک اخبار میں خبر شائع ہوئی ہے کہ بعض جاگیرداروں نے آپ سے ریاست کی شکایت کی ہے کہ چونکہ یہ جاگیریں مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں انہیں ملی ہیں۔ ان کا تعلق بجائے نظام کے حکومت ہند سے ہو۔ اس کے جواب میں انہوں نے صاف صاف تو کچھ نہ کہا مگر ان کے طرز بیان سے میں نے نتیجہ نکالا کہ خبر بے اصل نہ تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ جاگیرداروں کا بیان غلط ہے۔ تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں آصف جاہ اول نے حیدرآباد کو اپنا دارلسلطنت بنایا۔ مغلیہ سلطنت اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ بادشاہ کی حکمرانی دہلی ہی تک محدود تھی۔ لہذا حیدرآباد میں اُن کا جاگیر دینے کا کیا سوال ہے۔ بعض اوقات اظہار وفاداری کے طور پر دہلی سے بھی حکم منگالیا ہوگا۔ لیکن حقیقت میں حکومت آصف جاہ کی تھی سر کنتھ فٹز نے کہا کہ انہیں جاگیرداروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سوائے چند ایسے جاگیرداروں کے کہ جن کی ضمانت برٹش گورنمنٹ نے لی ہے۔ گوالیار میں بعض ایسے جاگیردار تھے کہ جن کی جاگیر کی ضامن برٹش حکومت تھی۔

۵/جولائی ۱۹۴۳ء کو صبح حیدرآباد پہونچا۔ اور باغ عامہ میں اُسی وقت حاضر ہوا۔ وہاں عروب جو بے قاعدہ فوج کا ایک حصہ تھے حاضر ہوکر نظام کو سلامی دیتے تھے اور عربی زبان میں دعا دیتے تھے شب کو سرکار کی طرف سے بہت بڑا ڈنر ہوتا تھا۔ جس میں کھانے کے بعد نذریں دیجاتی تھیں پہلی نذر پانچ گنی کی میں نے پیش کی۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ نذریں پیش ہوئیں۔ عام طور پر ایک اشرفی اور سات روپیہ ہوتی تھی۔ اس روز صدر اعظم باب حکومت ایک عرضداشت بھی پیش کرتا تھا۔ اتفاق سے اس تاریخ کی عرض داشت کی نقل "صبح دکن" اخبار کے پرچہ میں تھی جسے بہ لفظہ نقل کرتا ہوں۔ تاکہ اُس زمانہ کے آداب اور طرز تحریر کا اندازہ ہو جواب ایک افسانہ ہے جو عنقریب نذر طاق نسیاں ہوجائیگا۔

بہ پیشگاہ بندگان اعلیٰ حضرت پیر و مرشد جہاں پناہ ظل سبحانی سلطان دکن مدظلہ العالی خلد اللہ ملکہٗ

بعد آستانہ بوسی - مودبانہ عرض ہے کہ

عالم پناہ:

یوں تو بادشاہوں کی سالگرہ منانے کا رواج ہر قوم اور ہر ملک میں زمانہ دراز سے چلا آرہا ہے۔ جس کو رعایا برایا رسماً مناتی ہی رہتی ہے۔ مگر ایسا بادشاہ جس کے قلب صافی میں رعایا کی ہمدردی بھری ہو جس کے دل میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہو جو انسان تو انسان حیوان کی مصیبت سے بھی متاثر ہوتا ہو جس پر اہل ملک جتنی بھی خوشیاں منائیں کم ہے لہٰذا آج اہل ملک خلوص قلب سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدائے ارض وسما ایسے مالک مجازی کو صدوسی سال سلامت باکرامت رکھے جس کے فیوض وبرکات اہل ملک خصوصاً اور مسلمانان ہند عموماً مستفید ہوتے ہیں اور جس کی رہبری ان کے لیے ایک نعمت ہے۔

فدوی جاں نثار اس مبارک موقع پر اپنی کونسل اور اہل ملک کی جانب سے بصد ادب ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا حضرت پیر ومرشد اور شاہزادگان والاشان اور شہزادیان فرخندہ فال کو دیرگاہ سلامت رکھے اور وابستگان دولت کو اس طرح سالگرہ مبارک منانے کا موقع مدتوں ملتا رہے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔ زیادہ حد ادب

معروضہ ادب یکم رجب المرجب ۱۳۶۲ھ

عرضی

فدوی جاں نثار

احمد سعید

۷/جولائی ۴۳ء کو میں پرنس والاشان ہز ہائنس پرنس آف برار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے الگ لے جا کر فرمایا کہ اُن کے سول لسٹ میں اضافہ کردیا جائے جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی سول لسٹ پچیس ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے وزراء کی ایک سب کمیٹی اسی مسئلہ پر غور کرنے کے واسطے مقرر کی ہے وہ مجھے رپورٹ دیگی۔ لیکن خود پرنس کو بھی بعض چیزوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے مجھے دہلی میں ہز ہائنس جام صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کی طرف سے بہت معمولی لوگ اس کام پر متعین ہیں کہ آپ کے واسطے قرضہ لائیں۔ اس سے بدنامی ہورہی ہے۔

انہوں نے کہا کہ یہ میرے ایجنٹ نہیں ہیں۔ بلکہ چھوٹے پرنس کے ہیں اور وہ اپنے آپ کو پرنس آف حیدرآباد کہتے ہیں۔ پھر کچھ اور خانگی مسائل پر گفتگو کر کے چلا آیا۔

اسی روز بہادر یار جنگ مرحوم مجھ سے ملے جو نمائندہ جماعت بنانے کے سلسلہ میں اُن سے کہا تھا کہ سر اکبر حیدری کے زمانہ کا دیا ہوا معاہدہ واپس کر دیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ علی یار جنگ کی تجویز کو تو مسلمان ماننے کو تیار نہیں ہے مگر ایک اور میٹنگ کرونگا اور بجائے اس معاہدہ کے دوسری تجویز پیش کرونگا کہ اس پر غور دوبارہ کیا جائے۔ وہ تجویز یہ تھی کہ مسلمان (اکیاون) فیصدی کے معاہدہ کو واپس کر دیں مگر رئیسوں میں اُنہیں مساوات دیدی جائے اور پھر مخلوط انتخاب ہو۔

پھر کہنے لگے کہ ''اب تیسری بار مجھے پھر وزارت کا Offer کیا گیا ہے کیا آپ سے اور سرکار سے ایسا ذکر آیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کا نام لے کر تو میں نے ذکر نہیں کیا۔ لیکن یہ اکثر عرض کیا ہے کہ حیدرآباد کی گورنمنٹ اگر (Responsible) نہ ہو تو (Responsive) تو ہو اور پبلک کے نمائندوں کو موقع ملنا چاہئے کہ وہ حکومت میں حصہ لے سکیں۔ بہادر یار جنگ مرحوم نے مجھے نام نہیں بتایا کہ انہیں وزارت کی دعوت کس نے دی۔ مگر جیسا کہ میں نے اُس زمانہ میں سنا تھا غالباً غلام محمد صاحب مرحوم نے اُن سے ایسی بات چیت کی۔ اس لیے کہ نظام تو ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ بغیر میرے مشورہ کے کسی کو وزارت کی دعوت دیں۔ چونکہ حکومت ہند سے بھی دریافت کرنا ہوتا ہے اس واسطے صدر اعظم کا اتفاق کرنا ضروری تھا۔

میں چاہتا تھا عوام کے قائدین اور لیڈر بھی شریک وزارت ہوں گو مستقبل کا چہرہ ہنوز بہت غبار آلودہ تھا مگر آنے والے تغیرات کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ مگر جو کچھ ہوا وہ میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ ہوا۔ مجھے ایسے انقلاب عظیم کا وہم و گمان بھی نہ تھا ہاں یہ یقین تھا کہ جب حیدرآباد کے چہار طرف خود مختار جمہوری حکومتیں ہوں گی تو حیدرآباد کے لوگ بھی صبر نہ کر سکیں گے۔

۸/ جولائی ۱۹۴۳ء کو سرکار میں حاضر ہوا۔ سال تو میں برٹش خطابات کے متعلق گفتگو رہی اینڈرسن (پولیس کا ہیڈ) کے C.I.A سے سرکار کو اتفاق تھا۔ مہدی یار

جنگ وزیر تعلیمات سے اتفاق تھا۔ مگر یزدانی مرحوم (ناظم آثار قدیمہ) کے Kt سے اتفاق نہ تھا۔ اور فرمایا کہ بڑے جاگیر داروں کو یہ خطاب نہ ملے اور ناظم آثار قدیمہ کو ملے یہ ٹھیک نہ ہوگا۔ پھر میں نے اس خط کی کاپی جو میں نے لارڈ لنلتھگو کو لکھا تھا اور ان کا جواب پیش کیا اُن کے جواب سے تو خوش تھے مگر مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ وائسرائے کو مائی ڈیر لکھتے ہو۔ میں کہا نے جی ہاں۔ تو فرمایا کہ یہ حق تو ریاست کے پرنس کو دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اسی طرح لکھتا ہوں۔

۱۱رجولائی ۴۳ء کو سرکار میں حاضری ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ چند جاگیردار کیوں نہ سرکار میں ایک معروضہ داخل کریں کہ وہ حضور والا اور حضور کے بزرگوں کو اپنا محسن اور مربی تصور کرتے ہیں اور اخبارات میں بعض جاگیرداروں کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ اُسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سرکار نے اسے پسند کیا اور فرمایا کہ راجہ دھرم کرن کے ذریعہ سے یہ کام مناسب ہوگا۔

راجہ دھرم کرن میری کابینہ کے ایک ممبر تھے۔ نظام کے بڑے وفادار تھے یہ اُن چند خاندانوں میں سے ایک خاندان تھا کہ جو دہلی سے آصف جاہ اول کے ساتھ آئے اور یہ اپنے آپ کو ''آصف جاہی'' کہتے تھے۔

پھر جگدیش پرشاد اور سریواستو کا ذکر آیا۔ ڈاکٹر ضیاالدین پر بھی گفتگو آئی اعلیٰ حضرت انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ انہیں انگریزی حکومت کی مداخلت کی وجہ سے حکومت ہند سے دل میں ناخوش رہتے تھے۔ انہیں یہ خیال تک نہیں تھا کہ انگریزی حکومت ہی بحیثیت والیان ملک ان کی قیام وبقا کی ضامن تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اعلیٰ حضرت ڈاکٹر ضیاالدین مرحوم کا کوئی منصب مقرر کردیں۔ جو بطور جاگیر نسلاً بعد نسلاً ملا کرے مگر نظام نے منظور نہیں کیا۔

۱۵رجولائی ۴۳ء کونسل کے بعد میں گرگسن سے جو پولیس اور جنرل ایڈمنسٹریشن کے صیغہ کا وزیر تھا۔ باتیں کرتا رہا۔ میرے روزنامچہ میں درج ہے اشفاق کے واسطے یہ طے ہوگیا کہ انہیں ڈپٹی سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ کردیا جائے۔ گو مجھے کام میں دقت ہوگی مگر اشفاق کو بہت اچھی جگہ مل جائے گی۔

اشفاق پولیس میں ڈی۔ایس۔پی۔ تھے یہ نواب فخر یار جنگ مرحوم کے بیٹے تھے جو میرے زمانہ سے پہلے وزیر مال حکومت حیدرآباد میں تھے میں نے انہیں بطور A.D.C اپنے اسٹاف میں لیا تھا۔یہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔نہایت ذی ہوش محنت کش اور وفا شعار شخصیت کے حامل تھے۔ مجھے ان سے حیدرآباد کے قیام میں بڑی مدد ملی ان کی یاد محبت اور تشکر کے ساتھ میرے دل میں ہمیشہ قایم رہے گی۔

پھر کچھ بہادر یار جنگ مرحوم کا ذکر آیا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مرحوم اردو میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ روزنامچہ کی عبارت یہ ہے ''میں نے گرگسن سے کہا کہ اگر اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ چاہا کہ انہیں پشاور جانے کی اجازت دی جائے تو کیا پوزیشن ہوگی۔انہیں (بہادر یار جنگ) کو یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ اپنی ضرورت کے واسطے تو مجھ سے تقریر کراتے ہیں اور ویسے پابندی لاحق کرتے ہیں۔ گرگسن نے کہا کہ اس میں جناح کی بھی تو اس کی ضرورت ہے کہ لیگ (الیکشن) جیتے۔ تو میں نے کہا کہ وائسرائے کو بھی تو اس کی ضرورت ہے کہ اورنگ زیب خاں کی منسٹری جیتے اور آج آپ کو جناح کا اتنا خیال ہوگیا اور جب انہوں نے لیگ میں تقریر کرنے کو کہا'' تو آپ خلاف تھے۔میں متحیر رہ گیا جب آج نیم سرکاری سے مجھے معلوم ہوا کہ نظام نے خود بہادر یار جنگ سے وزارت کے متعلق کہا۔مگر انہوں نے انکار کیا۔

میرے زمانہ قیام میں جہاں تک یاد ہے۔تین بار اس کا موقع ملا جب کبھی محل میں کوئی صاحبزادی یا صاحبزادہ پیدا ہوتا۔میں ایک عرضداشت اور چند تحائف پیش کرتا اور نظام ایک ذاتی گرامی نامے سے مجھے سرفراز کرتے۔

۱۵ر جولائی ۴۳ء سرکار میں حاضر ہوا منجملہ اور باتوں کے میں نے اسکا بھی ذکر کیا کہ ریزیڈنٹ یہ دریافت کر رہا تھا کہ مہاراجہ کشن پرشاد کی جاگیر کا قصہ طے ہوا یا نہیں۔مناسب ہوگا کہ اس پر جلد حکم صادر فرمایا جائے۔چنانچہ خواجہ پرشاد کو وارث تسلیم کرنے کے متعلق دفتر پیشی نے مجھے اطلاع دی کہ رمضان یا شوال کے مہینہ میں فرمان جاری ہوجائیگا۔

مہاراجہ کشن پرشاد ایک اعلیٰ ترین شخصیت کے حامل تھے حیدرآباد میں ایسی

شخصیت دوسری نہ تھی۔ یہ ایک بڑے جاگیردار تھے۔ دوبار جہاں تک مجھے یاد ہے صدر اعظم بھی رہے۔ ان کی فیاضی اور سخاوت مشہور تھی صوفی مزاج تھے۔ درویشوں کے بڑے معتقد تھے۔ اجمیر شریف اکثر حاضر ہوتے تھے۔ خلق اور انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ ہر مذہب کا یکساں احترام کرتے تھے۔ اُن کی ہندو بیوی بھی تھیں۔ اور ایک مسلمان بھی تھیں۔ جن کا نام غوثیہ بیگم تھا۔ اُن کے بچے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان کے گھر میں دونوں مذہب کے تہوار ہوتے تھے۔ ہولی، دیپاولی، جنم آشٹمی جس اہتمام سے منائی جاتی تھیں اُسی اہتمام سے عید بقرعید اور شب برات منائی جاتی تھی۔ آج کی زبان میں یہ صحیح معنوں میں سیکولر تھے۔

ان کی وراثت میں دشواری یہ تھی کہ ان کے بڑے بیٹے سب مسلمان تھے اور خواجہ پرشاد سب سے چھوٹے بیٹے ہندو تھے۔ لیکن یہ جاگیر ایک ہندو خاندان کی تھی۔ لہذا خواجہ پرشاد کو وراثت جاگیر مایا گیا اور دوسرے بیٹوں کے حسب رواج جاگیر تنخواہیں مقرر ہوگئیں۔ ان بیٹوں میں ایک بیٹے اعلیٰ حضرت کے داماد بھی تھے۔

یکم اگست ۴۳ء کو ریزیڈنٹ فون کرکے خود میرے یہاں آگئے اول تو مجھے مدعو کیا کہ میں اُس ڈنر میں شریک ہوں جو وہ شہزادی درشہوار کے لیے دینگے جس میں وہ انہیں قیصر ہند میڈل حکومت کے طرف سے دینگے یہ تمغہ سماجی خدمات کے واسطے دیا جاتا تھا۔

ان کی خواہش تھی کہ میں آراموداً ننگر۔ زین اور علی یاور جنگ کو وزارت میں لوں زین کے متعلق تو میں خود سرکار سے کہہ چکا تھا کہ سید عبدالعزیز کے بجائے انہیں لیا جائے۔ لیکن دوسرے حضرات کے متعلق میں نے کہا کہ غور کرونگا۔

۱۵/اگست ۴۳ء کو میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ ایک بات مجھے بہت سبق آموز اور دلچسپ معلوم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ شہزادی نیلوفر (پرنس معظم جاہ کی ترکی بیگم) اپنے کسی عزیز کو تیس پونڈ ماہوار حکومت ہند کے ذریعہ سے مصر بھجواتی تھیں۔ جن کا نام پرنس ھامی تھا۔ یہ غریب اپنا پیٹ کا ٹکڑا کسی اپنے مفلوک الحال غریب الدیار عزیز کو مصر سے ان تیس پونڈ میں سے پانچ پونڈ فرانس روانہ کردیتی ہیں۔ لہذا آئندہ حیدرآباد

سے پچیس پونڈ ماہوار جایا کریں۔ میرے روزنامچہ میں یہ عبارت لکھی ہے۔

یہ دو مثال اس ذہنیت کی تصور پیش کرتی ہیں جو ایک ترک جیسی شریف قوم کی ذہنیت ہے اور جو ہماری گورنمنٹ کی ذہنیت ہے۔ ایک وہ شہزادی ہے کہ جو اپنی روٹی میں سے ٹکڑا توڑ کر اپنے کسی غریب عزیز کو بھیجتی ہے۔ اور ایک وہ حکومت ہے جو سزاً اتنا ٹکڑا کم کر دیتی ہے۔ گویا مردود ہٹلر کی لڑائی کا مدار انہیں پانچ پونڈ پر ہے۔''

۱۹ ستمبر ۴۳ء کو ریزیڈنسی میں ڈنر تھا۔ جس میں انہیں قیصر ہند سنہری تمغہ دیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ روزنامچہ دو مہینہ نہیں لکھا جا سکا۔

اسی زمانہ میں مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی قابل اعتماد افسر خفیہ پولیس میں ایسا ہو کہ جو کسی پارٹی سے متعلق نہ ہو اور صحیح حالات حکومت کے سامنے پیش کرے۔ میں نے محمد مظہر صاحب رٹائر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو اس ملازمت پر لیا۔ یہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے راست باز متدین اور صاحب کردار شخص تھے۔ حیدر آباد آنے کے کچھ روز بعد ہی بیمار ہو گئے۔ مگر جتنے روز برسر کار رہے مجھے مدد ملی اور مرحوم کی یاد تشکر کے ساتھ میرے دل میں موجود ہے۔

۷ نومبر ۴۳ء کو سرکار میں حاضر ہوا۔ گفتگو زیادہ تو پرنس مکرم جاہ کی تعلیم کے متعلق ہوتی رہی۔ سرکار نے کہا ''ریزیڈنٹ سے اور مجھ سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ ایک عمدہ انگریزی گارجین اور ایک عمدہ گارجین ہندوستانی رہے۔ اور مکرم جاہ کو اُن کے ماں باپ سے علیحدہ ایک مکان میں حیدر آباد ہی میں بالفعل رکھا جائے۔ تو ریزیڈنٹ نے کہا کہ مجھے جملہ حالات پر غور کرنے کے بعد اس سے اتفاق ہے''۔ پھر اعلیٰ حضرت نے یہ بھی ریزیڈنٹ سے کہا کہ آپ مجھے معاف فرمائیں میں بحیثیت دوست کے آپ سے کہتا ہوں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی ایک نہ ہو سکیں گے اسے سرکار بار بار فرماتے تھے۔ ملاقات ختم ہونے کے بعد جب میں سوار ہونے کو تھا تو کاظم یار جنگ نے مجھ سے کہا کہ سرکار نے ریزیڈنٹ کی گفتگو جو بیان کی ہے۔ اس میں ''کچھ سچ ہے اور کچھ'' میں اُن کا لفظ دہرانا نہیں چاہتا۔ جس کا

منشا تھا کہ کچھ حاشیہ تھا۔ بہر حال یہ ایک حیدر آباد کی بد قسمتی تھی۔

اسی زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے لڑکوں سے ریل میں جھگڑا ہوا اور ریلوے پولیس جو برٹش حکومت کی تھی ایک فریق ہوگئی۔ جو لڑکا خاص طور پر خطاوار تھا۔ اُسے لڑکوں نے گرفتار نہ ہونے دیا اور وہ مفرور ہوگیا۔ ریزیڈنٹ کو اس پر اصرار کہ خاطی لڑکا حاضر کیا جائے۔

۱۹ رنومبر ۴۳ء کے روزنامہ میں اس کا ذکر ہے۔ میں نے شاہ منزل میں میٹنگ کی۔ علی یاور جنگ سے لڑکوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مفرور لڑکے کو حاضر کردیں گے۔ مگر یہ وعدہ مرہون وفا نہ ہوا میں نے اس میٹنگ میں D.P.I (ناظم تعلیمات) کو بھی بلایا تھا اس واسطے کہ اس شورش میں یونیورسٹی کے علاوہ بھی لڑکے شریک تھے۔ اس میٹنگ میں یہ طے کیا کہ یونیورسٹی کونسل کے اتفاق کے بعد یہ حکم جاری ہو اور پانچ بجے یونیورسٹی کونسل کا جلسہ کیا جائے۔ میرا یہ خیال تھا کہ ہم یونیورسٹی سے سزا دلوائیں اور مفرور کو گرفتار کرکے ریزیڈنسی کی عدالت کے سپرد نہ کریں۔ غلام محمد مرحوم اور نواب علی یاور جنگ کو میری رائے سے اختلاف تھا۔ مگر غلام محمد مرحوم نے کہا کہ میں اول ریزیڈنٹ سے مشورہ کرلوں۔ چنانچہ میں نے اُن سے مل کر اس پر راضی کرلیا کہ اگر ہم خود سزا دیدیں گے تو وہ مقدمہ واپس لے لیں گے۔ ریزیڈنسی سے واپس آکر یونیورسٹی کونسل کی میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ مفرور لڑکے سے اپیل کی جائے کہ وہ خود حاضر ہوجائے۔ ورنہ یونیورسٹی اُسے سزا دیگی۔ اور اس واقعہ پر اظہار افسوس کیا۔ پی۔ وی۔ سی نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر لڑکے واپس ہوں تو انہیں اس وقت تک نہ لیا جائے جب تک وہ فرداً معافی نہ مانگیں اور D.P.I بھی اسے پسند کررہے تھے۔ سوائے بیگم زین یار جنگ مرحوم کے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ یہ قابل عمل نہیں۔ مجھے اتفاق نہ تھا۔ D.P.I کا یہ خیال تھا کہ جتنے لڑکے ان کے اسکولوں سے متعلق اس شورش میں شریک ہیں انہیں رسٹی کیٹ کردیا جائے۔ میں نے پوچھا کہ اُن کی کیا تعداد ہوگی۔ کہنے لگے آٹھ سو میں نے اس تجویز کو بھی مسترد کردیا۔

۲۴ رنومبر ۴۳ء کی شب کو بہادر یار جنگ مرحوم میرے پاس آئے مسٹر

گرگسن بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے یہ کہا کہ اگر میں خود لڑکوں کو خطاب کروں تو وہ مفرور لڑکے کو حاضر کردیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ کو یقین ہے کہ وہ میرے کہنے پر ملزم لڑکے کو حاضر کردیں گے تو میں انہیں خطاب کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ دوسرے روز ۲۵ ؍ تاریخ کو میں نے لڑکوں کے سامنے تقریر کی اور ملزم لڑکے کو حاضر کردیا گیا۔ میرے روزنامچہ میں عبارت درج ہے "خدا کا شکر ہے اس وقت تو یہ معاملہ ختم ہوگیا"۔ لیکن میں نے اس کا احساس کیا کہ طلباء میں ڈسپلن کا فقدان تھا۔ ان نوعمر طلباء میں تہذیب نفس اور احساس فرق مراتب کی کمی تھی جو حیدرآباد کے مستقبل کے واسطے مضر ثابت ہوگی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اساتذہ کا بجائے محبت طلباء سے نفرت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ انہیں سزا دے اور سخت سے سخت سزا دے۔

۴ ؍ دسمبر ۴۳ء کو میں پھر ریزیڈنٹ سے ملا نواب علی یاور جنگ بھی ساتھ تھے۔ اور باتوں کے بعد یونیورسٹی کے لڑکے کا ذکر آیا۔ انہوں نے اس پر رضامندی دیدی کہ سکندرآباد کی عدالت میں اس لڑکے کو نیک چلنی کی ضمانت لے کر چھوڑ دے اور ہم ایک سال کے واسطے اسے یونیورسٹی سے نکالدیں پھر وہ بہادر یار جنگ مرحوم کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں اُن کی صفائی کے متعلق کہتا رہا ریزیڈنٹ نے کہا کہ وہ بہادر یار جنگ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک روز میں انہیں اور بہادر یار جنگ کو چائے پر بلالوں گا۔

۵ ؍ دسمبر ۴۳ء کو میں پھر ریزیڈنٹ سے ملا اور یہ طے کرلیا کہ یونیورسٹی کے اس لڑکے سے جو ملزم تھا نیک چلنی کے مچلکہ بھی نہ لیے جائیں اور اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ ریزیڈنٹ نے مجھ سے کاظم یار جنگ کی شکایت کی کہ وہ برٹش حکومت کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ میں اُن کی صفائی میں کہتا رہا۔ اُن سے معلوم ہوا کہ نواب ذوالقدر جنگ نے اُن سے کہا۔

آج شب کو بیگم شاہ نواز کا ڈنر تھا۔ یہ میری مہمان تھیں میں نے ریزیڈنٹ کو بھی مدعو کیا تھا۔ ڈنر کے بعد کہنے لگے کہ کسی لیڈی کے سامنے یہ کہنا مشکل ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ جنہیں خواتین مثل مردوں کے نہیں کرسکتیں پھر کہنے لگے کہ بیگم شاہ

نواز اُن سے یہ کہہ رہی تھیں کہ ڈپلومیٹک کام عورتیں مردوں سے بہتر کر سکتی ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے میں نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے بشرطیکہ دوسری حکومت اپنی ڈپلومیٹک ملازمت میں فقط مردوں ہی کو رکھے اور اگر دونوں طرف سے عورتیں ہی ہوئیں تو زلف پیچاں کی تمام پیچیدگیاں بین الاقوامی تعلقات میں اس طرح پیدا ہوں گی کہ سلجھانا مشکل ہو جائے گا اس پر بہت دیر تک ہنستے رہے بیگم شاہ نواز نہایت ذی ہوش خاتون ہیں۔ سر میاں محمد شفیع مرحوم کی صاحبزادی ہیں گول میز کانفرنس کی ممبر تھیں انگریزی اور اُردو میں بہت اچھی تقریر کرتی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد ملنا نہیں ہوا مجھ پر بہت کرم فرماتی تھیں۔ خدا انھیں ہمیشہ خوش رکھے۔

۱۲ر دسمبر ۴۳ء کو میں نے ریزیڈنٹ کو چائے پر بلایا اور بہادر یار جنگ مرحوم کو بھی مجھے نہیں معلوم کہ اُن میں کیا گفتگو ہوئی میں ٹینس کھیلتا رہا مگر بہادر یار جنگ بہت ممنون تھے اور کہنے لگے کہ جتنا رابطہ مقامی حضرات سے میں نے پیدا کیا اس سے قبل کبھی نہیں ہوا۔

بہادر یار جنگ مسلمانان حیدر آباد کے حقیقتاً لیڈر تھے اُردو کی تقریر بہت پر اثر ہوتی تھی بہت معاملہ فہم اور دور اندیش تھے اگر اُن کی یکا یک موت نے حیدر آباد کو اُن کی خدمت سے محروم نہ کیا ہوتا تو اتحادالمسلمین کو وہ ایسی غلط پالیسی اختیار نہ کرنے دیتے کہ جس کا انجام پولیس ایکشن ہوا۔

۲۱ر دسمبر ۴۳ء کو مجھ سے ریزیڈنٹ نے کہا۔ کیا یہ سچ ہے کہ علی یاور جنگ کو وزیر بنانے کے لیے سر عقیل سے بیس ہزار روپے اور نواب اظہر یار جنگ سے پچاس ہزار مانگے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا میرے خیال میں یہ خبریں بے بنیاد ہیں۔

اُسی روز اتفاق سے میں نے نواب ذوالقدر جنگ کو کھانے پر بلایا تھا۔ دوران گفتگو اُن سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ریزیڈنٹ سے کہا تھا کہ بیس ہزار علی یاور جنگ کی وزارت کے واسطے اور پچاس ہزار نواب ظہیر یار جنگ کی وزارت کے واسطے مطلوب ہیں۔ انہوں نے یہ بھی ریزیڈنٹ سے کہا کہ سرکار ریزیڈنٹ کو پسند نہیں کرتے۔ خدا رحم فرمائے ان لوگوں کی عجیب حالت ہے۔ سرکار کو متنبہ کرنا بھی دشوار

جو عرض کیا جائے وہ اسٹاف پر ظاہر ہو جاتا ہے اور فوراً مشتہر ہو جاتا ہے۔

۲۲/دسمبر ۱۹۴۳ء کو مہاراجہ کپورتھلہ آئے۔ میں انہیں اسٹیشن پر لینے گیا۔ شاہ منزل میں میرے ہی پاس مقیم ہوئے شب کو میرے ساتھ ڈنر میں شریک ہوئے۔

۲۳/دسمبر کو اعلیٰ حضرت نے کنگ کوٹھی میں لنچ دیا جس کے بعد فوٹو لیا گیا۔ لنچ کے بعد میں نے یہ عرض کیا کہ گرانی کی وجہ سے سرکار نے شاہزادگان کی سول لسٹ میں ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار اضافہ پرنس اعظم جاہ معظم جاہ کے واسطے منظور فرمالیا تو اس موقع پر گرانی کا کچھ الاونس بسالت جاہ کے لیے بھی منظور فرمایا جائے یہ اعلیٰ حضرت کے سوتیلے بھائی ہیں مگر سرکار نے منظور نہیں کیا۔ سرکار کے فرمانے کا منشا یہ تھا کہ بسالت جاہ کی ماہواری سول لسٹ کے سلسلہ میں حکومت ہند سے یہ طے ہو گیا ہے کہ رقم مقررہ سے زیادہ کے وہ مستحق نہیں ہیں جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں پانچ ہزار روپیہ ماہوار ملتے تھے یہ غالباً نظام مرحوم میر محبوب علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں حکومت ہند سے طے ہوا ہوگا۔ مجھے افسوس ہوا۔ سوال حق کا نہ تھا یہ تو فراخدلی اور صلہ رحمی کا سوال تھا۔

مہاراجہ کپورتھلہ بڑی زبردست شخصیت کے حامل تھے وہ اُردو اور انگریزی دونوں میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے اور فرنچ تو بالکل اہل زبان کی طرح بولتے تھے۔ میں ایک بار کپورتھلہ میں اُن کے پاس مقیم تھا۔ اپنے محل کی مجھے خود سیر کرا رہے تھے۔ اُن کی ایک بیوی اندلیسی تھیں جن کی تصویر مجھے دکھائی تصویر پر مہاراج کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ شعر تھا۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

میرے اوپر بہت کرم فرماتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے مہاراج کنور مہی جیت سنگھ کو جب میں یوپی میں ہوم ممبر تھا حکومت کی کابینہ میں بحیثیت وزیر لینے میں مدد دی تھی مہاراج وسیع النظر تھے کپورتھلہ میں اُن کی بنائی ہوئی سنگ مرمر کی مسجد، گردوارہ اور مندر آج تک اس کے شاہد ہیں کہ وہ فرقہ وارانہ تنگ نظری سے متاثر نہ

تھے۔ مہاراجہ شام کو مرغابی کے شکار کے واسطے گئے ایک تھی جو بہت کم چوڑی تھی مگر لمبی ایک میل سے زیادہ ہوگی۔ کنارے پر پیڑ تھا اس میں Blue Headed Mallard (نیل سر) مرغابیاں رہتی تھیں۔ میں اور مہاراج دو کشتیوں میں سوار تھے سامنے پیڑ سے مرغابیاں اٹھتی تھیں اور فائر ہوتے تھے۔ بہت آسان اور پر لطف شکار تھا۔

شب کو محل میں ڈنر ہوا جس میں مہاراج کا پورا خاندان شامل ہوا۔ میں اور مہاراج نے ملایا جب میں مہاراج جب داخل ہوئے تو سب ایک حلقہ میں کھڑے ہو گئے فرداً فرداً مہاراج نے ملایا جب میں مہاراج کنوار کرم جیت کے پاس پہونچا تو اُن کی بیوی میرے پاؤں چھونے کو جھکیں میں نے اُن کے سر پر ہاتھ رکھا۔ مہاراج کا تعجب رفع کرنے کے لیے میں نے بتایا کہ کمارانی میرے ہی خاندان کی ہیں اور رشتہ کے اعتبار سے میں ان کا نانا ہوں۔

صاحبزادے بسالت جاہ حضور نظام کے سوتیلے بھائی ہیں حیدرآباد مرحوم کی مہمان نوازی۔ اخلاق اور سیر چشمی کے بہترین نمونہ ہیں۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد سے ترک سکونت کر کے بنگلور رہنے لگے ہیں۔

۲۳ر دسمبر ۴۳ء کو شام کی گاڑی سے چل کر ۲۵ دسمبر کو چھتاری آیا اور ۲۶ر دسمبر کو نور نظر ابن سعید سلمہٗ کی بارات لیکر علی گڑھ گیا نظیر محمد خاں مرحوم کی لڑکی صدیقہ سلمہا سے بخیر وخوبی شادی ہوئی۔ یہ لڑکی میری پھوپھی کی بیٹی کی بیٹی ہے۔ خدا کا شکر ہے ابن سعید سلمہٗ کے تین بچے ہیں۔ جاوید سعید، ہمایوں اور نجم۔ باری تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے۔

میں عیسوی سال اور تاریخیں اپنے روزنامچہ سے لکھ رہا ہوں ورنہ حیدرآباد میں تو جنتری کا وہ حساب اور مہینوں کے وہ نام سرکاری احکام اور کاغذات میں لکھے جاتے تھے کہ جو کبھی ایران میں اسلام کا ستارہ چمکنے سے پہلے رائج تھے۔ مہینوں کے نام بہمن۔ دے۔ اسفندیار جنگ وغیرہ تھے میں نے چاہا تھا کہ عیسوی سن اور رومن مہینوں کو رائج کروں مگر نظام نے پسند نہیں فرمایا لیکن اتنی اصلاح ہوگئی کہ ان مہینوں کی تاریخیں اور انگریزی مہینوں کی تاریخیں ایک کر دی گئیں۔ یعنی پہلی جنوری کو ایرانی مہینے کی بھی تاریخ ہو۔

یہ لکھ چکا ہوں کہ مہاراجہ کشن پرشاد کا جانشین اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے خواجہ پرشاد کو نظام نے بنایا کیونکہ یہ جاگیر ایک ہندو خاندان کی تھی اور مہاراجہ کے سب سے بڑے بیٹے مسلمان تھے خواجہ پرشاد میرے پاس آئے بہت شکر گذار تھے میں نے کہا جایئے اور واپس آکر اپنی جاگیر کا انتظام کیجئے۔ بمبئی کے اخبار میں کچھ ہی روز بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ خواجہ پرشاد تاج ہوٹل میں مقیم تھے شب میں شاید اپنے کمرے کے دریچہ سے گرنے اور انتقال ہو گیا۔ حیدرآباد سے فوراً آدمی بمبئی گئے مگر وہاں کی پولیس کو کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کیسے گرے۔ شبہ یہ کیا گیا کہ شاید نشہ کی حالت میں ایسا ہوا۔

۱۴ر جنوری ۱۹۴۴ء کو دہلی میں سر فرانس وائلی سے ملا۔ خواجہ پرشاد کے بعد جاگیر کا کیا ہو اس پر گفتگو ہوئی۔ اس میں دشواری یہ تھی کہ مہاراج کشن پرشاد کا کوئی ہندو لڑکا نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آخرکار یہ جاگیر مہاراجہ کی بیٹی کے بیٹے کو دی گئی۔ میں وہی پرانی کہانی دہراتا رہا جو نظام کی بڑی خواہش تھی کہ انگریز افسران کو ہٹایا جائے اور حیدرآباد کی خدمت کے سلسلہ میں انہیں کیا صلہ دیا جائے۔ مجھے سر فرانس کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ تسلی آمیز باتیں بہت مگر خیز کم اس کا شکوہ کیا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

۲۱ر جنوری ۴۴ء کو ریزیڈنٹ سے خواجہ پرشاد کے انتقال اور ان کے جانشین کے متعلق بات چیت ہوئی۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ کسی ہندو کو ہونا چاہیے مجھے بھی اس سے اتفاق تھا کیونکہ یہ ہندو خاندان کی جاگیر تھی مگر ہو کون مہاراجہ کی بیٹی کا بیٹا تھا اس پر نظر پڑتی تھی۔

۲ر فروری ۴۴ء کو ریزیڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ بہادر یار جنگ اُن سے ملے اور دفتر پیشی کی بہت شکایت کی۔ کاظم یار جنگ کی شکایت حیدرآباد میں عام تھی مگر نظام کو اتنا بھروسہ اُن پر تھا کہ اُنہیں علیحدہ کرنے کو تیار نہ تھے مجھے کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ کسی تجویز کے خلاف تھے اور حکومت اُسے ضروری خیال کرتی تھی۔ میں نے کاظم یار جنگ کو بلا کر کہا تو دو چار روز میں سرکار کا فرمان آ گیا۔

ریزیڈنٹ بجا طور پر اس طرف توجہ دلاتے تھے کہ پبلک کے نمائندوں کو بھی

گورنمنٹ میں جگہ دی جائے مگر سرکار اسے دل سے ناپسند کرتے تھے۔ والیانِ ملک عام طور پر اسے ناپسند کرتے تھے لیکن آج یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر تمام والیانِ ملک نے فیڈریشن میں شرکت کرلی ہوتی اور رائے عامہ کے نمائندوں کو شریک حکومت کرلیا ہوتا تو ممکن ہے کہ ان کی رعایا اس انقلاب میں اُن کی محافظ بن جاتی۔

ریزیڈنٹ آرامودآئینگر کو چاہتے ہیں کہ میں گورنمنٹ میں لوں مجھے اتفاق ہے۔ یہ ایک تجربہ کار وکیل ہیں بہت ذی ہوش اور معتدل پالیسی کے خامی سرکار کو راضی کرنا ہوگا۔ میں نے ریزیڈنٹ سے کہا کہ مسلمانوں میں بہادر یار جنگ اس قابل ہیں کہ اُن کی گورنمنٹ میں جگہ دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں جلدی نہ کی جائے وہ دہلی سے مشورہ کریں گے۔

۲ر فروری ۴۴ء کو سنڈا کے ہاں (جو نظام ریلوے کے جنرل مینیجر تھے) ڈنر تھا میں اور ذریعہ سے بھی سن رہا تھا مگر آج گرگسن نے مجھ سے کہا غلام محمد نے بہادر یار جنگ سے کہا کہ وہ اُن کے واسطے وزارت کی تقرری کی کوشش کریں گے۔ گرگسن اس پر بہت برہم تھا کہ برٹش گورنمنٹ کے ملازم کو جسے عارضی طور پر ریاست کو دیا گیا ایسی مداخلت اور ایسے وعدے کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۳ر فروری ۴۴ء کو سرکار میں حاضر ہوا۔ پبلک کے نمائندے حکومت میں لینے کے متعلق گفتگو رہی۔ نظام فرمانے لگے کہ اس سے پہلے ریزیڈنٹ کے زمانے میں یہ طے ہوچکا ہے کہ ایسی تبدیلی جنگ کے بعد کی جائے پھر فرمایا کہ بہادر خاں کو ریزیڈنٹ نے کیوں بلایا مجھ سے تو کہا تھا کہ میں انہیں انٹرویو نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا کہ بہادر خاں کی خواہش پر بلایا ہوگا۔ اُسی روز دوپہر کو بہادر خاں (بہادر یار جنگ) مجھ سے ملنے آئے ریزیڈنٹ سے جو بات چیت ہوئی تھی اُس کا ذکر کرتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ سرکار نے مقصود علی خاں (سرکاری طبیب) کو اُن کے پاس بھیجا تھا وہ یہ پیام لائے تھے کہ ریزیڈنٹ بہادر یار جنگ سے ملنے کو تیار نہ تھے۔ بہادر یار جنگ نے جو خط انٹرویو ریڈنسی سے آیا تھا۔ وہ مقصود علی خاں کو دکھایا۔ اور اس پر افسوس کرتے رہے کہ سرکار ایسی غلط بیانی سے کام لیتے ہیں "ممکن ہے کہ اُن کی بدگمانی صحیح نہ ہو"۔ ریزیڈنٹ نے خود

بلانے سے انکار کیا ہوگا۔ مگر بہادر یار جنگ کی خواہش پر ملاقات کی۔ باتوں میں اُن سے اس کی تصدیق ہوگئی کہ غلام محمد نے ان سے نہ صرف یہ کہا کہ وہ ذرات قبول کریں بلکہ یہ بھی کہا کہ فلاں فلاں صیغے انہیں دیے جائیں مجھے بہت افسوس ہوا۔ یہ بحیثیت صدر اعظم میرا حق تھا کہ میں اپنی کابینہ میں جسے مناسب سمجھوں لوں۔ غلام محمد صاحب میرے لائے ہوئے تھے مجھے اُن سے یہ توقع نہ تھی کہ بغیر میرے علم و اطلاع کے وہ یہاں کے کسی لیڈر سے ساز باز کرینگے بہر حال یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ آج اور خاص کر اُس آخری ملاقات کے بعد جو اُن کی علالت کے زمانہ میں پاکستان میں ہوئی۔ میرا دل علی گڑھ کے ایک بھائی کی محبت کی یاد سے پر ہے اور اس کی جدائی کا صدمہ ہے۔

۵ر فروری ۴۴ء کو گرسن آئے سب سے پہلے تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ غلام کی اس میں کیا مصلحت ہے کہ وہ بہادر خاں کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ میں خاموش ہوگیا۔ پھر انہوں نے (ممکن ہے ریزیڈنٹ کے اشارہ پر) مجھ سے پوچھا کہ ستمبر میں میرے تین سال ختم ہونے ہیں اس کے بعد میں حیدرآباد رہوں گا یا نہیں۔ میں نے کہا میں خود اس کا خواہشمند نہیں ہوں لیکن اگر حکومت ہند چاہے گی تو مجھے انکار نہیں اور اگر وہ کسی دوسرے کا بھیجنا مناسب خیال کریں تو مجھے اصرار نہیں۔ حیدرآباد کے حضرات اور ریزیڈنٹ دونوں یہ چاہتے تھے کہ سر عقیل اور سر مہدی یار جنگ مرحومین کو رٹیائر کر دیا جائے۔ چنانچہ ریزیڈنٹ اور بہادر یار جنگ نے مجھ سے بھی کہا اور ریزیڈنٹ نے نظام سے بھی کہا یہ خواہش اس وجہ سے نہ تھی کہ دونوں حضرات کے کردار پر شبہ تھا فقط پیرانہ سالی کی وجہ سے یہ خیال ذہنوں میں تھا اور میں خود اس تجویز کا دل سے طرفدار تھا سرکار اس تجویز سے اس لیے گھبراتے تھے کہ سر عقیل مرحوم سب سے پرانے وزیر تھے۔ اسی لیے میری غیر موجودگی میں وہ بحیثیت وائس پریسیڈنٹ کام کرتے تھے۔ اگر وہ رٹائر ہوں تو سینیئر ممبر انگریز ہوتا تھا اور میری عدم موجودگی میں وہ پریسیڈنٹ ہوتا۔ میں نے یہ رائے دی کہ سرکار سر عقیل جنگ مرحوم کو مستقل وائس پریسیڈنٹ کر دیں اور وہ فقط پائیگاہوں کے انچارج ہوں گورنمنٹ کا کوئی کام اُن کے پاس نہ ہو جب میں چاہوں انہیں وزراء کی کونسل میں بلالوں اور میری غیر موجودگی میں صدارت کریں

سرکار نے اسے پسند کیا۔

۲۳ رفروری ۴۴ء کو اول تو ریزیڈنٹ سے خطابات پر گفتگو ہوئی وہ گرگسن کو C.I.E اور ایںڈرسن (انسپکٹر جنرل) کو C.I.E دینا چاہتے تھے میں نے اشفاق اور سی. بی تاراپور والا کے نام خان بہادری کے لیے دیے۔ نظام کے اختیارات سے قیود ہٹانے کا سوال زیر بحث رہا۔ سر آرتھر لودین کا یہ خیال تھا کہ حکومت ہند اس پر راضی ہو جائے گی کہ سوائے انگریز ممبر کے تقرر کے ہندوستانی وزراء کے تقرر میں برٹش گورنمنٹ دخل نہ دے۔ اور وزراء کا تقرر قطعاً صدر اعظم کے ہاتھ میں ہو اور پیشی کے سکریٹری کا بھی انتخاب صدر اعظم ہی کے ہاتھ میں ہو۔

یہ تجویز اصولاً غلط نہ تھی ہر گورنمنٹ میں ممبران کابینہ چیف منسٹر یا پرائم منسٹر مقرر کرتا ہے گورنر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا اسی طرح بادشاہ یا پریسیڈنٹ کو وزراء کے تقرر میں مداخلت نہیں ہوتی لیکن میری دشواری یہ تھی کہ ایسی شکل میں قدرتاً نظام کو یہ یقین ہو جاتا کہ میں نے بجائے اُن کے اختیارات پر سے قیود ہٹانے کے اس کی کوشش کی کہ جملہ اختیارات میرے ہاتھ میں آجائیں اور جو کچھ اس سلسلے میں کہتا رہا وہ دھوکا کا تھا اسے میرے ضمیر نے گوارہ نہ کیا اور میں نے یہ کہہ کر ٹالا کہ اس وقت تو یہ بتائیے کہ جنگی خدمات کے صلہ میں نظام کو کیا خطاب دیا جائے۔ اس موقع پر ان قیود کو ہٹا لینا ہی مناسب ہوگا مجھ سے کہنے لگے کہ آپ بتائیں کہ انہیں کیا خطاب دیا جائے۔ میں نے کہا کہ نظام ہز مجسٹی کا خطاب چاہتے ہیں ریزیڈنٹ نے کہا کہ یہ ناممکن ہے اس میں بادشاہ سے برابری ہوگی میں نے کہا کہ ہندوستان کے تو وہ شہنشاہ ہیں اور شہنشاہ کے ماتحت بادشاہ ہونے ضروری ہیں۔ مگر اُن خیال تھا کہ اس میں کامیابی کی اُمید نہیں میں نے کہا کہ اُنہیں شاہ دکن یا حیدر آباد کہا جائے انہوں نے کہا کہ یہ ممکن ہے مگر ہز مجسٹی نہیں ہوگا کوئی اور مثلاً His Syrian Highness وغیرہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ جنگ کے ختم ہونے پر سرکار کو Chain of Victoria Cross دی گئی۔ انگلستان میں یہ بھی بڑا اعزاز ہے کہ اکثر خود مختار بادشاہوں کو دیا جاتا ہے مگر حضور نظام کو اس کی مسرت نہیں ہوئی اور مجھے بھی اس سے خاص خوشی نہیں ہوئی۔

۷/ مارچ ۴۴ء سر کلاڈ اکن لیسک جو کمانڈر ان چیف تھے۔ میرے مہمان تھے۔ میں نے سرکار سے عرض کیا کہ انہیں چائے پر بلالیں۔ بہت پس وپیش کے بعد مان لیا لیکن سرکار اتنے مشکوک المزاج تھے کہ فرمانے لگے کہ مجھ سے کیوں ملنے آرہا ہے۔ میں کیا کہتا کہ برٹش حکومت کا کمانڈر ان چیف حیدرآباد آئے تو اسے نظام سے ضرور ملنا چاہیے اور سرکار کو بھی کھانے یا چائے پر مدعو کرنا چاہیے۔

پھر رشید نواز جنگ کا ذکر کیا۔ اُن کا قصہ یہ تھا کہ رشید نواز جنگ سرکار کے داماد تھے سلطان الملک امیر پائیگاہ کا انتقال ہوگیا۔ رشید نواز جنگ اُن کے پوتے تھے۔ تعلیم تربیت کے لحاظ سے اپنے خاندان میں ممتاز تھے۔ سرکار چاہتے تھے کہ امیر پائیگاہ انہیں بنایا جائے۔ سلطان الملک مرحوم کے بڑے بیٹے ابوالفتح خاں زندہ تھے وہ کہتے تھے کہ اسلامی قانون کے مطابق بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتا محروم ہے۔ جاگیروں کی وراثت میں اسلامی قانون کی پابندی نہ تھی بلکہ رواج یہ تھا کہ نظام اُسی خاندان میں سے جسے چاہیں امیر پائیگاہ تسلیم تصور یہ تھا کہ نظام نے دوبارہ عطیہ دیا۔ ابوالفتح خاں کا وکیل اسلامی قانون پر استدلال کر رہا تھا۔ میں نے کہا قانون شریعت اگر نافذ کیا جائے تو پورا نافذ کیا جائے یعنی امیر پائیگاہ مرحوم کے جتنے بیٹے و بیٹیاں اور بیویاں ہیں سب کو وراثت قانون شریعت کے مطابق ملی گی۔ تنہا ابوالفتح خاں کو کیسے ملے گی چنانچہ رشید نواز جنگ کے متعلق سفارش کی گئی جس سے سرکار مطمئن ہوگئے۔ پھر سرکار نے فرمایا کہ سالگرہ کے موقع پر بہادر جنگ کی جاگیریں واپس کردی جائیں ریزیڈنٹ سے کہنا کہ میری بھی یہی رائے ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اسے صدر اعظم کے مشورہ کے بعد کیا۔ سرکار مطمئن ہوگئے۔

۱۶/ مارچ ۴۴ء کو میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ رشید نواز جنگ کا امیر پائیگاہ بنانا اور بہادر جنگ کی واپسی جاگیر کے متعلق گفتگو کی بعدۂ کمانڈر ان چیف کے حیدرآباد آنے کا ذکر آیا۔ ریزیڈنٹ نے کہا کہ میں بصیغہ راز تم سے کہتا ہوں کہ C.inC اور پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں یہ جھگڑا ہے کہ C.inC جس ریاست میں چاہتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں قیام کرتے ہیں پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے مشورہ نہیں کرتے آخر میں

کہنے لگے۔ دہلی تو چاہتی ہے کہ تم یہاں رہو اور اگر تم اس پر تیار نہیں ہو تو وہ وہاں (Employ) کریں۔ تمہاری کیا رائے ہے میں نے وہی جواب دیا جو گرگسن سے ایک دو روز قبل کہہ چکا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں جہاں میری خدمات مناسب ہوں حکومت ہند خود تجویز کرے۔ چونکہ میرا تقرر تین سال کے لیے ہوا تھا اور اگست میں تین سال ختم ہوتے تھے تو دہلی اس پر غور کر رہی تھی کہ آئندہ صدر اعظم حیدرآباد میں کون ہو۔ حیدرآباد میں صالح مرحوم کا نام لیا جا رہا تھا۔ اخبارات میں مختلف خبریں آ رہی تھیں۔

۲۴ر مارچ ۴۴ء کے اخبار نظام گزٹ میں نظام کا ایک فرمان شائع ہوا جس میں میری خدمت صدارت کو "پسندیدہ اور قابل قدر" الفاظ سے تعبیر کر کے یہ کہا گیا تھا کہ میرا تقرر تین سال کے واسطے نہیں بلکہ پانچ سال کے واسطے ہوا تھا جس میں ڈھائی سال باقی ہیں اور عوام کو متنبہ کیا تھا کہ جب تک نذری باغ (دفتر پیشی) یا باب حکومت سے کوئی خبر مصدقہ نہ ہو یقین نہ کریں۔ یہ فرمان یکا یک آیا۔ بہر حال میں نے عرض داشت کے ذریعہ اظہار تشکر کیا اور سرکار کے حکم سے میری عرض داشت معہ سرکار کے فارسی نوٹ کے ۲۲ر مارچ ۴۴ء کے "صبح دکن" اخبار میں شائع کر دی گئی جو حسب ذیل ہے۔

بہ پیشگاہ بندگان اعلیٰ حضرت پیر مرشد جہاں پناہ ظل سبحانی سلطان دکن مدظلہ العالی خلد اللہ ملکہ۔

بعد آستانی بوسی مؤدبانہ عرض ہے

شاہا

فدوی جاں نثار کی نظر سے آج کا نظام گزٹ گذرا۔ اس میں جس غلط افواہ کی صحت فرمائی گئی ہے اور جاں نثار کی ناچیز خدمات کے متعلق "پسندیدہ اور قابل قدر" کے جو الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں وہ اس جاں نثار کے لیے ہمیشہ فخر و مباہات کا باعث رہیں گے۔ خدا اس جانثار کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے مالک مجازی کا اعتماد آئندہ اس سے زیادہ حاصل کر سکے اور ملک کی ایسی خدمت انجام دے سکے جس سے اہل ملک کو طمانیت حاصل ہو اور جاں نثار کا بھی ضمیر مطمئن ہو سکے۔

ایسی غلط افواہیں صحافت کی کامیابی کا راز ہوا کرتی ہیں وہ اس قسم کے شوشہ چھوڑ کر اس کا اندازہ کرتے ہیں کہ اس واقعہ کی کہاں تک حقیقت ہے یہ ہی غالباً اس افواہ کا منشاء تھا جس کو حضرت حکیم السیاست کی دوررس نظر نے فوراً تاڑ لیا اور صرف اس کی تردید ہی نہیں فرمائی بلکہ دنیا پر یہ ثابت فرما دیا کہ ذات ہمایونی اپنے خادموں کی خدمت کی تنہا قدر رہی نہیں بلکہ دنیا پر اس کی شخصیت کو اور اجاگر کر دیتی ہے۔ سوائے اس کے یہ فدوی جاں نثار اور کیا عرض کرے کہ:

تا زندہ ام۔ بندہ ام

الٰہی آفتاب عمر و دولت و اقبال تاباں درخشاں باد

معروضہ ۲۵ ربیع الاول شریف ۱۳۲۶ھ

عرضی فدوی جاں نثار

احمد سعید

سرکار کا نوٹ

اس تحریر را کہ قلم یک صاحب کردار وذی عزت آمدہ وہم در زمانہ گذشتہ در برٹش انڈیا بر خدمت جلیلہ فائز بود بہ نظر استحسان بینم۔

۲۶ مارچ ۴۴ء آج سہ پہر کو اعلیٰ حضرت اور پرنس آف برار نے شاہ منزل تشریف لاکر میر عزت افزائی فرمائی۔ ابن سعید خاں کی شادی کی مبارک باد کے سلسلہ میں تشریف آوری ہوئی۔ ہوش یار جنگ، زین یار جنگ اور شہید یار جنگ بھی حاضر تھے۔ میں نے اور ابن سعید خاں نے نذریں پیش کیں۔ چائے نوشی۔ گلپوشی اور پان وعطر حیدر آباد کے رواج کے مطابق پیش کئے گیے۔

۱۲ اپریل ۴۴ء کو چھتاری ہوتا ہوا حیدر آباد سے دہلی پہونچا۔ ۱۹ اپریل کو سر فرانس واہلی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن سے ریزیڈنٹ کی بیوی لیڈی لوتھین کے متعلق کہا کہ انہیں قیصر ہند میڈل جنگی خدمات کے سلسلہ میں ملنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ جون کے مہینہ میں بادشاہ کی سالگرہ پر اُمید ہے کہ مل جائے گا۔ پھر خلاف مزاج بہت کھل کر باتیں کرنے لگے۔ کہنے لگے کہ سر آرتھر اپنی بیوی کو بہت ڈانٹتے

ہیں۔ پھر کہا میں تم سے کوئی راز نہیں رکھتا لیکن باوجود ان کی (سر آرتھر لودین) قابلیت کے میں اُنہیں پسند نہیں کرتا۔ پھر انکم ٹیکس جو برٹش انڈیا میں رائج تھا۔ اُس سے ملازمین حکومت کو جو دشواریاں تھیں اُس کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ کچھ نامناسب نہ ہوگا آپ کو بحیثیت Ex.Governor کے یہ حق ہے کہ آپ گورنمنٹ کی پالیسی پر تنقید کریں۔ پھر پرنس مکرم جاہ کے ڈون اسکول میں بحیثیت بورڈر جانے کی بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا کہ سرکار کو وائسرائے لکھیں۔ پھر برار کی واپسی وغیرہ کی گفتگو رہی۔

۲۰ راپریل ۴۴ءمیں آج وائسرائے سے ملا۔ دہلی میں یہ عام خیال تھا کہ لارڈ ویل کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے وہ بالکل اپنے مشیروں کے ہاتھ میں ہیں۔ آج کی ملاقات میں مجھے یقین ہوگیا کہ یہ سچ ہے سوائے اس کے کہ پرنس مکرم جاہ کے متعلق تو انہوں نے کہا کہ اچھا ہو کہ وہ بورڈنگ میں رہیں باقی تمام باتوں پر مثلاً انکم ٹیکس اور انفلیشن (کثرت زر) کا اثر ملازمان سرکار پر۔ ریاستوں کا مستقبل اور معاہدوں کے تحت مستقبل میں حفاظت۔ ایسی چیزوں پر وہ نوٹ لکھتے رہے مگر زبان سے کچھ نہ کہا مجھے اُن سے بار بار ملنے کا موقع ہوا۔ میرے خیال میں وہ ایک زبردست جنرل تھے وہ سیدھی اور صاف باتیں پسند کرتے تھے سیاسی جوڑتوڑ اور پیچیدہ باتیں۔ کجا مے نمائی۔ کجا می زمی انہیں پسند نہ تھی۔ مجھے یاد ہے اور اس زمانہ کے تذکرہ نویسوں نے اسے لکھا ہے کہ وہ مہاتما گاندھی جی۔ مسٹر جناح اور دوسرے سیاسی لیڈروں سے یہ کہتے تھے کہ وہ ایک سپاہی تھے اور سیاسی پیچ وخم اُن کی سمجھ میں نہیں آتے۔

اُسی زمانہ میں کاظم یار جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ سرکار نے ایک خط ریزیڈنٹ کو لکھا ہے کہ عبداللہ خاں کسمنڈی جن کا گزشتہ زمانہ میں حیدرآباد سے اخراج کیا گیا تھا۔ انہیں اور ظفر علی خاں کو پھر آنے کی اجازت ہو۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ اسے روکا جائے میرے پاس ریزیڈنسی سے سرکار کے خط کی نقل اور جو ریزیڈنٹ نے جواب دیا وہ پہلے ہی آچکا تھا۔ میں خاموش ہوگیا۔ عبداللہ خاں کسمنڈی نے مجھے بھی ایک خط لکھا تھا جس کی نقل سرکار کو بھی بھیجی تھی۔ میں نے اس کا ایک مختصر جواب دیدیا۔

۱۲ رجون ۴۴ءکو میں اوٹی پہاڑ پر گیا۔ ریزیڈنٹ کے پاس مقیم تھا۔ مجھے یہ

پہاڑ بہت پسند آیا۔ موٹر آسانی سے ہر جگہ جاسکتی ہے۔ ریزیڈنٹ سے حسب ذیل گفتگو رہی۔ اس زمانہ میں ریلوے پر جنگ کی وجہ سے اتنا کام تھا کہ گورنمنٹ نے ہیلون چلانا بند کر دیا تھا میں نے کہا کہ پرنس آف برار معظم جاہ۔ بسالت جاہ۔ اور مجھے اس حکم سے مستثنیٰ کیا جائے برٹش گورنمنٹ نے منظور کر لیا۔ پھر عبداللہ خاں کسمنڈی کا ذکر آیا۔ انہوں نے مجھے اُن کا فائل دکھایا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ سرکار نے اُن کے متعلق ریزیڈنٹ کو خط لکھنے میں غلطی کی۔

پھر Railway Jurisdiction اور سکندرآباد کی واپسی کا ذکر آیا۔ میں اسے بعجلت چاہتا تھا۔ پھر انگریز افسران کے بجائے ہندوستانیوں کو مقرر کرنے پر میں نے اصرار کیا۔ اور اس پر بہت طویل گفتگو رہی ریزیڈنٹ نے کہا نواب صاحب میرے علم میں ہے کہ ایک مرتبہ نواب ولی الدولہ اور سر اکبر آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور اس پر زور دیا کہ یہاں کام بغیر انگریز افسروں کے نہیں چلے گا۔ بہر نوع مجھے امید ہے کہ Director of Revenue آئندہ کوئی ہندوستانی ہو سکے گا۔

۲۹ رجون ۴۴ء ۲۵ رجون کو میرے یہاں مسٹر رامامورتی کا ڈنر تھا یہ مدراس کے گورنر کے مشیر تھے۔ دریائے تنگبھدرا میں بند لگا کر نہر نکالنے کا مسئلہ اور مدراس و حیدرآباد کے درمیان پانی کی تقسیم کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ جس کا تصفیہ بخیر و خوبی ہو گیا۔ حیدرآباد کے نمائندے نواب علی نواز جنگ تھے جو انجینئر ہونے کے اعتبار سے بڑے بلند پایہ ماہر فن تھے۔

ڈنر کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ بہادر یار جنگ۔ ہاشم علی خاں کے یہاں کھانے پر گئے تھے۔ کھانے کے بعد حقہ آیا جوں ہی اُس کا کش لیا دل کی حرکت بند ہو گئی۔ مجھے ان کے انتقال کا افسوس ہوا یہ اچھے معاملہ فہم تھے۔ حیدرآباد میں عموماً اور وہاں کے مسلمانوں پر خصوصاً ان کا بہت اثر تھا۔ میں صبح کو اُن کے مکان پر تعزیت کے واسطے گیا۔ اُسی وقت سرکار بھی تشریف لائے۔ تجہیز و تکفین میں شریک ہوا بہت بڑا مجمع تھا۔

پھر اعلیٰ حضرت کے پاس حاضر ہوا۔ مجھے زین یار جنگ سے سرکار کے خیالات معلوم ہو چکے تھے۔ سرکار نے فرمایا کہ بتایئے تمہاری رائے اُن کی موت کے متعلق کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ان کے انتقال سے سرکار کا ایک بڑا خادم اٹھ گیا۔ لیکن خدا کا کام

حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ فرمایا ان کے عروج سے ضرور فتنہ کا اندیشہ تھا بعدہٗ اور کچھ مرحوم کے متعلق فرماتے رہے ۳۰ رجون کو جب میں ریزیڈنٹ سے ملا تو ریزیڈنٹ نے بھی بہادر یار جنگ کے انتقال کے متعلق وہی خیالات ظاہر کئے کہ جو نظام کے تھے انہوں نے کہا ذاتی طور سے مجھے افسوس ہے لیکن یہاں کے انٹرلسٹ کے پیش نظر یہ برا نہ ہوا۔

۲ رجولائی ۴۴ء آج حکیم مقصود علی خاں جو سرکار کے طبیب خاص تھے ایک نجی خط بیوہ بہادر یار جنگ کا لائے جس میں مرحوم کی موت کی وجہ پر اشتباہ کیا تھا۔ اور یہ خواہش کی تھی کہ مرحوم کی جاگیر تاحیات اُن کے نام کر دیجائے۔ گو یہ پرائیوٹ خط تھا مگر چونکہ زہر خورانی کا شبہ کیا تھا۔ میں نے پولیس ممبر گرگسن اور اینڈرسن ناظم پولس کو بتایا کہ وہ اس نظر سے بھی دیکھیں۔ اُسی روز علی یاور جنگ میرے یہاں لنچ پر آئے اور کہا کہ جس زمانہ میں ہم لوگ حیدرآباد سے باہر تھے یہاں کسی بڑی سازش کی گرم خبر پھیلی تھی اور انہوں نے ناظم پولیس سے اس کا ذکر کیا تھا میں نے جب ناظم پولیس کو اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ہوش نے بھی مجھ سے کہا کہ بہادر یار جنگ کے ذریعہ سے کوئی گہری سازش ہونے والی تھی ان حضرات کا منشاء یہ تھا کہ غلام محمد اور بہادر یار جنگ مل کر کوئی سازش میرے خلاف کرنے والے تھے۔ واللہ اعلم۔

نواب علی نواز جنگ کی شخصیت بھی ایسی تھی کہ حیدرآباد کی کہانی نامکمل رہے اگر ان کا ذکر نہ ہو۔ یہ ایک وظیفہ یاب انجینئر تھے مزاج بہت تیز تھا۔ لیکن اپنے فن کے اعتبار سے انہیں بڑے پایہ کا انجینئر خیال کیا جاتا تھا۔ ان کی قابلیت کا یقین مجھے اس سے ہوا کہ میرے ایک دوست سر ولیم اسٹیمپ جو یو پی سے چیف انجینئر سے ریٹائر ہوئے تھے اور اس زمانہ میں حکوت ہند نے انہیں مشیر کی حیثیت سے پھر بلایا تھا۔ حیدرآباد آئے جہاں تک مجھے یاد ہے اسی تنگبھدرا کے پانی قضیہ میں آئے تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ یہاں علی نواز جنگ کے بلند پایہ انجینئر ہونے کی بڑی شہرت ہے آپ کا کیا خیال ہے سر ولیم نے کہا کہ:

"Nawab sahaib,what all Nawaz jung does not know in engineering is not worth knowing"

اس سے اندازہ ہوا کہ اُن کا فنی اعتبار سے کیا مرتبہ تھا۔

۵ر اگست ۴۴ء دہلی سے واپسی پر سرکار میں حاضر ہوا۔ وہاں کی کہانی دہرائی جس میں خاص بات یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ سکندرآباد کے لوگوں پر انکم ٹیکس لگانا چاہتی تھی دوسرے یہ کہ ہمارے کارخانوں سے جو برٹش انڈیا میں چیزیں خریدی جائیں اُن کی قیمت برٹش انڈیا میں ادا ہو مطلب یہ تھا کہ آمدنی کسی شخص کو اگر برٹش انڈیا میں ہوگی تو وہاں کا ٹیکس لگانے کا حق بھی برٹش گورنمنٹ کا ہوگا۔ حیدرآباد کی حکومت برٹش کو نہیں دی گئی ہے۔ فقط فوج رکھنے کا حق دیا ہے۔ ورنہ ہم وزیر ہند کو اپیل کریں گے۔

۱۳ر اگست ۴۴ء کبھی کبھی حیدرآباد میں صدر اعظم کو ایسے کام بھی سپرد کر دئے جاتے تھے جن کا تعلق اس کے فرائض منصبی سے دور کا بھی نہ ہوتا۔ آج سرکار نے کہا کہ اُن کے ایک صاحبزادے نے اپنی بیوی کی شکایت سرکار میں کی ان کی بیگم صاحبہ نے اپنے بیٹے کو کسی بات پر سرزنش کیا۔ اسی پر میاں بیوی میں کچھ تیز گفتگو ہوگئی اور ''دیوانہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ مجھے ارشاد ہوا کہ میں بسہولت اس قصہ کو ختم کرادوں۔ اول تو ایک خانگی قصہ کو سرکار کے علم میں لانا ہی نامناسب تھا اور اگر ایسی غلطی کی بھی گئی تو اعلیٰ حضرت خود بحیثیت باپ اور بزرگ خاندان مناسب پیرائے میں مداخلت فرماتے۔ صدر اعظم غریب ان خانگی امور میں کہاں آتا ہے مگر۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

۱۶ر ستمبر ۴۴ء کو ریزیڈنٹ سے بڑی طویل گفتگو رہی۔ وہ خود ہی ملنے آگئے۔ چونکہ وائسرائے آنے والے تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ نظام اُن سے کیا بات چیت کریں گے۔ تاکہ وائسرائے جوابات کے لیے تیار ہو جائیں۔ بعدۂ حیدرآباد کے واسطے بندرگاہ برار حیدرآباد میں شامل ہوا تو پوری ریاست کے لیے مصیبت ہو جائے گا۔ وہاں کے لوگوں کا سیاسی نقطہ نظر بالکل مختلف ہے۔ پھر گوا کی بندرگاہ کا ذکر آیا میں نے کہا ہم خریدنے کو تیار ہیں اگر پرتگال سے معاملہ ہو جائے۔

جب میں سرکار میں حاضر ہوا تو میں نے یہ ذکر کیا اور یہ مشورہ دیا کہ سرکار کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ جب میں دہلی سے واپس آؤں گا تب یہ بتایا جائے گا۔

ظہیر یار جنگ کو سرکار نے وزیر بنانا منظور کرلیا۔ ریزیڈنٹ سے میں پہلے ہی

طے کر چکا تھا سرکار سے جو گفتگو ہوئی تھی اُسے اسی پیرایہ میں ریزیڈنٹ کو لکھ کر بھیج دیا جس سے اُسے یہ غلط فہمی کو دور کیا۔ میں نے سرکار سے بار ہا کہا کہ وہ ریزیڈنٹ سے خود خط و کتابت نہ فرمائیں مگر سرکار قبول نہیں کرتے جس سے دشوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۲۲ر ستمبر ۴۴ء میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ وائسرائے کے پروگرام پر گفتگو رہی بعدہٗ سرکار کے مطالبات کا ذکر آیا وہ اس کی سفارش کرنے کو تیار ہیں کہ چھوٹا سا حصہ برٹش انڈیا کا جو حیدرآباد اور بستر کے درمیان ہے حیدرآباد کو دیدیا جائے۔ جس کا طول نقشہ میں ساٹھ میل کے قریب اور چوڑائی تقریباً بیس میل معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس پر بھی تیار تھے کہ ایک بندرگاہ بھی حیدرآباد کو دیا جائے۔ میں نے کہا کوشش کیجئے گو دل میں سوچتا رہا کہ خدا جانے نظام مانیں گے یا نہیں مگر میں جانتا تھا کہ برار کی واپسی سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہوگا یہ تجاویز زیادہ مفید ہیں۔

ریاست بستر میں گرگسن جو پولیس اور مالگذاری کا وزیر تھا۔ ایک زمانہ میں جب راجہ نابالغ تھا بحیثیت گارجین یا ایجنٹ رہ چکا تھا۔ گرگسن نے جہاں تک مجھے یاد ہے راجہ سے بھی بات چیت کی تھی۔ ہماری تجاویز یہ تھیں کہ حیدرآباد۔ راجہ صاحب کی راجدھانی تک ریل بنالے اور اس میں تقریباً پچیس لاکھ روپیہ کے حصے انہیں مفت دے اور لوہے کی کان پر کام شروع ہو تو اُنہیں حق مالکانہ دیا جائے مگر اب تو یہ مصرعہ دہرانے کو دل چاہتا ہے۔

ما در چہ خیالم و فلک در چہ خیال

حیدرآباد میں گزٹ کو جریدہ کہا جاتا تھا۔ ایک پرانا گزٹ یا جریدہ پیش نظر ہے جس میں اعلیٰ حضرت نے مجھے ''سعید الملک'' کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اس جریدہ کے صفحہ کے ایک طرف معتمد باب حکومت یعنی کیبنٹ سکریٹری کی طرف سے اعلان اور دوسری طرف فرمان ہے۔

جریدہ غیر معمولی

جلد ۷۶، حیدرآباد دکن، ۲۸ تیر ۱۳۵۴ ف م۔ ۲۰ر جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ

یوم شنبہ۔ نمبر ۴

بارگاہ جہاں پناہی سے بتقریب سالگرہ ہمایونی۔ عالی جناب کرنل نواب سر احمد سعید خاں بہادر صدر اعظم باب حکومت کو خطاب مرحمت ہونے کے متعلق جو فرمان عطوفت نشان مزینہ ۲۰ رجمادی الثانی ۱۳۶۴ھ شرف صدور لایا ہے وہ بغرض اطلاع عام شائع کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے۔

اشفاق احمد
معتمد صدر اعظم بہادر و کونسل

فرمان

میری سالگرہ کے موقع پر (یکم رجب) میں نے نواب احمد سعید خاں صاحب نواب چھتاری کو اُن کی وفادارانہ خدمات کے مدنظر سعید الملک کا خطاب دیا ہے۔

جریدہ غیر معمولی میں طبع کیا جائے

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ

اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہم العالی

(شرح دستخط مبارک)

پرنس درشہوار دہلی میں مجھ سے ملیں اُن سے یہ معلوم ہوا کہ بہت افسوس ہوا کہ اُن کے والد کا فرانس میں انتقال ہو گیا۔ یہ ٹرکی کے آخری سلطان اور خلیفہ تھے۔ مصطفیٰ کمال کے بعد انہیں معہ اُن کے خاندان کے ملک سے نکال دیا گیا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ گو اب یہ غریب الدیار پیرس میں رہتے تھے جمہوری ترک حکومت نے ان کا کوئی مقررہ تک نہ کیا جہاں تک مجھے یاد ہے۔ حیدرآباد سے ایک ماہوار رقم انہیں ملتی تھی۔ شاید پانچ ہزار روپیہ ماہوار۔ لیکن آل عثمان کا ماضی میرے سامنے آ گیا اور بے ساختہ یہ مصرعہ یاد آیا:

"یادگار رونق تھی پروانہ کی خاک"

شہزادی کی یہ خواہش تھی کہ برٹش گورنمنٹ انہیں کسی طرح پیرس پہونچا دے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۴۴ء آج میں پرنس اعظم جاہ سے ملا اور میں نے اُن سے کہا کہ آپ شہزادی صاحبہ سے یہ کہیے کہ میں بھی تمہارے ساتھ فرانس چلنے کو تیار ہوں اس

سے زن وشوہر کے تعلقات بہتر ہونگے۔ مجھے ریزیڈنٹ سے معلوم ہوا کہ پولیٹکل ڈپارٹمنٹ نے لکھا ہے کہ پیرس کی حالت اس قابل نہیں کہ وہ شہزادی درشہوار کو بھیجنے کی ذمہ داری لے سکیں۔ لہذا خان بہادر اشفاق صاحب کو ولایت بھیجا گیا یہ حیدرآباد کے بہترین افسروں میں تھے علاوہ علمی قابلیت کے وفا شعاری اور صداقت اُن کا طغرائے امتیاز تھا۔ مجھے ان سے بہت مدد ملی۔

۴ر نومبر ۴۴ء کو میں سرکار کے پاس حاضر ہوا۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے وہ وصیت نامہ دکھایا جو خلیفہ مرحوم نے اپنی بیٹی شاہزادی درشہوار کو دیا تھا۔ اس میں مرحوم نے یہ خواہش کی تھی کہ انہیں شام میں دفن نہ کیا جائے جہاں سلطان عبدالوحید خاں مرحوم دفن ہیں اس لیے کہ اُن کی ہی پالیسی سے تمام مصیبت آل عثمان پر آئی۔ ہندوستان میں یا بیروت میں دفن کیا جائے۔ مرحوم نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے متعلق مفصل گفتگو اپنے داماد ہز ہائنس پرنس جاہ سے کی ہے۔

مجھ سے اعلیٰ حضرت نے بھی فرمایا کی ہز ہائنس پرنس اعظم جاہ نے یہ کہا کہ جس گفتگو کا ذکر شہزادہ اعظم جاہ سے خلیفہ مرحوم نے اپنے وصیت نامہ میں کیا ہے اس کا منشاء یہ تھا کہ خلیفہ مرحوم کے بعد شہزادے اعظم جاہ کو خلیفۃ المسلمین ہونا چاہئے۔ اعلیٰ حضرت نے میری رائے دریافت کی میرے ذہن میں یکایک یہ شعر آیا۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھرتی ہے جا کر نظر کہاں

خلافت کوئی جاگیر تو تھی نہیں کہ خلیفہ کا بیٹا نہ ہو تو داماد کو وراثت میں ملے امیر المومنین تو وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے سامنے مسلمانان عالم کا سر محبت اور عقیدت کے جذبات سے جھکے جس کی عظمت و شوکت قوت و ہیبت کا سکہ شاہان اسلام کے دلوں پر بیٹھا ہو۔ جو نہ صرف رموز حکمرانی اور جہاں پناہی کا ماہر ہو بلکہ بہ وقت ضرورت ملک گیری سے بھی عاری نہ ہو اور جس کی شمشیر حفاظت اسلام کے لیے بے نیام رہے۔ میں نے عرض کیا کہ خلافت اگر کوئی مفید چیز ہوتی تو خود ترک اُسے کیوں چھوڑتے اور حیدرآباد کی چند در چند دشواریاں ہیں ہم کوئی اقدام بغیر برٹش حکومت کے مشورہ کے

نہیں کر سکتے ہمیں اس سے الگ ہی رہنا مناسب ہے۔

تاریخ صحیح یاد نہیں مگر جنوری ۴۵ء میں وائسرائے دورے پر تشریف لائے سر فرانسس وائلی بھی (سیاسی مشیر) اُن کے ساتھ تھے۔ حسب دستور سرکار نے کچھ تحائف جن کی قیمت تقریباً پانچ ہزار تھی وائسرائے کو بھیجے اور وائسرائے نے تحائف سرکار کو دیئے۔ حسب معمول سرکار نے ڈنر دیا۔ میں نے ایٹ ہوم دیا اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہوئی۔

اُسی زمانہ میں نواب ذوالقدر جنگ مرحوم میرے پاس آئے۔ نظام میر محبوب علی خاں مرحوم کے بہت سے خط اپنے والد کے نام کے مجھے دکھائے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظام مرحوم کو ان کے والد سرور جنگ مرحوم سے بہت تعلق تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خط میں نظام مرحوم نے سرور جنگ کو لکھا تھا ''لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں آپ سے نہ ملا کروں لیکن میں نے نہ کبھی ایسا کیا نہ کرتا ہوں اور نہ کروں گا۔

ان خطوط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقار الامراء جو مدار المہام یا وزیر اعظم تھے ان پر نظام مرحوم کو اعتماد نہ تھا۔ اور سرور جنگ ایسی ترکیب کرتے رہتے تھے جن سے نظام اور وزیر اعظم کے تعلقات خراب رہیں۔ مگر یہ قصہ پارینہ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں اس طرح کی سازشیں ایک مرض مزمنہ ہو گئی تھیں۔

لیاقت علی خاں مرحوم مدراس کے دورے کو جا رہے تھے انہوں نے مجھے لکھا کہ وہ حیدرآباد آنا چاہتے ہیں۔ میں نے لکھا کہ بہ خوشی آیئے لیکن وہ چونکہ سیاسی ضرورت سے دورہ کر رہے تھے۔ میں نے انہیں حکومت کا مہمان نہیں بنایا اپنے مہمان کی حیثیت سے انہیں رکھا۔ لیاقت علی خاں اعلیٰ حضرت سے بھی ملے۔

۲۲ر فروری ۴۵ء میں سرکار میں حاضر ہوا تو سرکار نے کہا کہ مجھے لیاقت علی خاں کی صورت دیکھ کر یہ خیال آیا کہ اگر یہی حال پاکستان کا ہوگا کہ جس صورت میں یہ ہیں تو ''خدا حافظ'' پھر سرکار نے کہا کہ گاندھی جی کے مرنے کے بعد کانگریس اور جناح کے مرنے کے بعد مسلم لیگ میں یہ مضبوطی باقی نہیں رہے گی۔

تاریخ درج نہیں لیکن جون ۴۵ء کو میں اوٹی پہاڑ گیا اور ریزیڈنٹ ریاست

ہی کے مکان میں مقیم تھے وہیں میں ٹھہرا۔ میں نے ایک خط کی صورت میں اپنی تجاویز سرکار کو کوئی خطاب اور دوسرے مطالبات کے متعلق دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ نظام نے اس سے اتفاق کرلیا تھا کہ راجہ دھرم کرن کے بجائے آرمودا آئینگر وزیر ہوں مجھے تو پہلے سے اتفاق تھا مگر اعلیٰ حضرت برابر پس وپیش کررہے تھے۔ ریزیڈنٹ اس پر بہت خوش ہوئے۔

آرامودا آئینگر ایک بہت تجربہ کار وکیل تھے بہت اچھی قانونی قابلیت کے علاوہ بہت دور اندیش اور معاملہ فہم ہیں مزاج میں اعتدال اور مصلحت بینی دونوں کا امتزاج ہے۔

میں نے اس ملاقات میں ریزیڈنٹ سے صاف صاف پوچھا کہ آخر اس کی کیا وجوہات ہیں کہ باوجود حیدرآباد کی اتنی زبردست جنگی خدمات کے برٹش گورنمنٹ کا طرز اگر مخاصمانہ نہیں تو مخالفانہ ضرور تھا انہوں نے کہا کہ منجملہ اور باتوں کے اس کی ایک وجہ خود اعلیٰ حضرت کا مزاج تھا۔ کسی گذشتہ زمانہ میں اعلیٰ حضرت نے یہ کوشش کی تھی کہ انگریز ملازمان کو ایک ساتھ نکال دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اب ہندوستان کی آزادی یقینی ہے تو پھر ان باتوں کا کیا موقع ہے اس بار ریزیڈنٹ بہت دل برداشتہ تھے جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ سرفرانس وائلی کے بجائے اُن سے جونیر کو جن کا نام کور فیلڈ تھا۔ مشیر سیاسی مقرر کیا گیا۔ جیسا کہ کچھ عرصہ سے سن رہا تھا اور پرنس آف برار نے بھی کہا مجھے اس سے تصدیق ہوئی کہ نظام میری میعاد ختم ہونے پر سر مرزا اسماعیل کو میرا جانشین کرنا چاہتے ہیں مگر گورنمنٹ ابھی مذبذب ہے۔

میں نے شروع سے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ کسی معاملہ میں اعلیٰ حضرت پر حکومت ہند سے دباؤ دلوانے کی کوشش نہیں کرونگا۔ گو اس سے مجھے دشواریاں ہوئیں اور پرانا طرز کار برار کے لیے آسان تھا مگر مجھے یہ پسند نہ تھا کہ نظام کے کسی فعل کا شکوہ مشیر سیاسی یا وائسرائے سے کروں اور اس طرح اعلیٰ حضرت پر دباؤ ڈلوایا جائے۔ میں نے شروع ملازمت میں یہ ادارہ کرلیا تھا جس پر خدا نے اپنے کرم سے مجھے قائم رکھا۔

چنانچہ سرفرانس وائلی جب مشیر سیاسی کے عہدہ سے سبکدوش ہوکر رخصت پر ولایت جانے لگے تو میں نے اپنے دوستانہ تعلقات کی بنا پر انہیں لکھا کہ میں اُن سے خدا

حافظ کہنے دہلی آؤں اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ میرے زمانہ میں انہیں کوئی تشویش یا تردود حیدرآباد کے متعلق نہیں ہوا۔ (نقل خط سر فرانس وائلی اگلے صفحہ پر ہے)۔

۱۳ر جولائی ۱۹۴۵ء میں اور غلام محمد مرحوم ریزیڈنٹ سے ملے سب سے پہلے تو اس پر گفتگو ہوئی کہ حکومت ہند کو سکندرآباد میں انکم ٹیکس لگانے کا حق نہیں۔ سکندرآباد برٹش انڈیا کا کوئی حصہ نہ تھا بلکہ فوج رکھنے کی غرض سے اُسے دیا گیا تھا۔ ریزیڈنٹ اسے مانتے تھے اس کے بعد اصل کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں سر اکبر مرحوم کے زمانہ میں ایک تحریر مسلمانان حیدرآباد کو دیدی گئی اور جہاں تک مجھے یاد ہے اعلیٰ حضرت کی طرف سے انہیں اطمینان دلایا گیا کہ آئندہ اسمبلی (مقننہ) میں اُن کی نشست اکیاون فیصدی ہوگی۔ مسلمان اس تحریر کو واپس دینے کو تیار نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ وعدہ خلاف انصاف اور نا قابل عمل تھا۔ ستاسی فیصدی کو انچاس اور تیرہ فیصدی کو اکیاون نشست کیسے دیجاسکتی تھیں۔ ہندو اس پر تیار تھے کہ ہندو اور مسلمان ممبروں کی تعداد برابر ہو اور دوسرے اقوام وملل کے نمائندے اس کے علاوہ۔ لیکن پوری اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت وہ ماننے کو بجا طور پر تیار نہ تھے نتیجہ یہ کہ اصلاحات کو جاری کرنا بغیر سخت خلل وخلش کے

Copy of Sir Francis Wyllie's Letter

New Delhi,
2-7-45

Dear Nawab Sahib,

I thank you of your letter of the 22nd of June. I am much touched by your offer to come here to say goodby before I go to England. This is in keeping of the high standard of courtesy which you show in all your actions. It is true that I would like to have a talk with you before I go but you must on no account attempt to make the journey. I am leaving Delhi on the 9th by Air & there would in fact hardly be enough time for you to get here before then any-way.

Will you please therefore take this letter as goodbye? It is really only Aurevior for I shall look forward to seeing you in

Oudh.

I would like you to know how much I have admired your handling of Hyderabad Affairs during these last difficult years. As a result of your being there Hyderabad has never given me a moments anxiety during the two years I have been political Adviser; about the dignity which you have imported into the whole business I will say nothing to you personally for fear you might get conceited!

I shall look forward to seeing you very soon after I come back to India. In the mean time I send you very kind good wishes.

Yours sincerely
Wyllie

ناممکن ہوگیا۔غلام محمد مرحوم نے یہ تجویز رکھی کہ اسمبلی بجائے انتخاب کے نامزدگی کے ذریعہ بروئے کار آئے تاکہ اکیاون فیصدی کے قصبہ سے نجات ملے۔اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کا یہ فعل کس قدر فراست اور مالی اندیشی کے خلاف تھا۔جہاں تک مجھے یاد ہے نامزدگی کے ذریعہ سے مقننہ بنائی گئی۔میرے پرانے کاغذات میں جو نقشہ ملا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو بیس اور مسلمان بیس اور پائیگاہ و صرف خاص کے ممبر اس کے علاوہ۔

۲۲ر جولائی ۴۵ء آج ریزیڈنٹ شام کو آئے۔بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے کہتے تھے کہ نظام سر مرزا اسماعیل کو صدر اعظم کی حیثیت سے لانے پر بہت مصر ہیں اور گورنمنٹ آف انڈیا کو تذبذب ہے۔ان کا یہ خیال ہے کہ میں ہی یہاں رہوں۔میری رائے دریافت کی۔میں نے کہاں کہ اگر نظام کسی اور شخص کو چاہتے ہیں تو ایسی شکل میں میرا یہاں رہنا مناسب نہ ہوگا میری مدت پانچ سال ختم ہو رہی ہے حکمراں کی خواہش کے خلاف رہنے میں کوئی لطف نہیں رہتا یوں تو صدر اعظم وئسرائے کی منشاء سے مقرر ہوتا تھا مگر نظام کی منشاء کے خلاف مسلط ہونا مجھے پسند نہ تھا۔

اس زمانہ میں غلام محمد مرحوم کچھ بیمار ہوگئے تھے اور رخصت پر تھے لیاقت جنگ جو فنانس کے سکریٹری تھے، وہ بحیثیت منسٹر کام کررہے تھے۔اور چونکہ غلام

محمد مرحوم کی مدت تقرر بھی ختم کے قریب تھی میں نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ زاہد حسین مرحوم کو دہلی سے فنانس منسٹر کی حیثیت سے لاؤں۔

۴راگست ۴۵ء کو ریزیڈنٹ سے ملا اُن سے معلوم ہوا کہ سرکار نے انہیں لکھا ہے کہ اگر جنگ ختم نہیں ہوتی تو وہ مجھے چھ ماہ یا ایک سال کی توسیع دینا چاہتے ہیں ورنہ مرزا اسماعیل کو بلانے کی خواہشمند ہیں۔ ریزیڈنٹ نے کہا کہ دہلی کی خواہش ہے کہ میں توسیع قبول کروں۔ ریزیڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ سرکار نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہونے کے بعد بحیثیت چیف مشیر (چیف ایڈوائزر) پرنس آف برار سے منسلک ہو جاؤں۔ ریزیڈنٹ نے مجھ سے پوچھا کہ اس دوسری تجویز کے متعلق میری کیا رائے تھی۔ میں نے کہا کہ چیف ایڈوائزر کی تجویز بالکل نامناسب ہے وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہونے کے بعد میرا حیدرآباد کا قیام میرے جانشین کے واسطے خلجان کا باعث ہو سکتا ہے۔ چونکہ حیدرآباد کے مسلمان سر مرزا کو ناپسند کرتے ہیں ایسی صورت میں میرا نام لے کر سازشیں شروع ہو جائیں گی۔ میں نے کہا کہ اگر نظام نے مجھ سے دریافت کیا تو میں یہ ہی کہوں گا۔ ریزیڈنٹ کو میری رائے سے اتفاق تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ نظام سے ضرور کہنا۔

۱۸راکتوبر ۴۵ء کو سرکار نے ایک خط کا مسودہ مجھے دکھایا جسے وہ ریزیڈنٹ کو بھیجنا چاہتے تھے۔ اس میں انہوں نے C.P. کی گورنری کے متعلق میری سفارش اور صالح حیدری مرحوم کی مخالف کی تھی۔ میں نے سرکار کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ میرے متعلق جو تحریر ہے اُسے حذف کر دیا جائے اس واسطے کہ یہ خیال کیا جائے گا کہ میں نے اپنے ذاتی نفع کی وجہ سے نظام کو حیدری کے خلاف آمادہ کیا اور اگر سرکار کسی تجویز کو نامنظور کیا گیا تو مجھے افسوس ہوگا نظام نے مان لیا۔

اول تو نظام کو ایسی مداخلت کا حق نہ تھا اور ہوتا بھی تو میرے مراسم صالح حیدری مرحوم اور اُن کے والد سر اکبر حیدری مرحوم سے ہمیشہ دوستانہ رہے ہیں اس تجویز سے کیسے اتفاق کر سکتا تھا۔

سکندر آباد کی واپسی

یکم دسمبر ۴۵ء آخر کار ایک عرصہ کی گفت و شنید کے بعد (جس میں ملٹری ڈپارٹمنٹ نے مخالف پہلو اختیار کیا) سکندر آباد کی واپسی ہوگئی۔

برٹش حکومت ہر کام سلیقہ سے کرتی تھی۔ باضابطہ ایک معاہدہ لکھا گیا جس میں سکندر آباد کے تمام اداروں کے جملہ حقوق کی حفاظت تھی جس کی ایک نقل میرے پاس ہے۔ یکم دسمبر کو حیدر آباد ریزیڈنسی گیا۔ پولیٹکل یونیفارم میں نے بھی اور ریزیڈنٹ نے بھی پہنا۔ میرے ساتھ معین نواز جنگ اور میرے A.P.C سلمان مرحوم تھے۔ ریزیڈنٹ اور اُن کے سکرٹری موٹر تک مجھے لینے آئے۔

گارڈ آف آنر نے سلامی دی۔ کمرے میں جا کر میں نے اور ریزیڈنٹ نے معاہدے پر دستخط کئے۔ جس کا فوٹو لیا گیا۔ جو میرے نشست کے کمرے میں اس روز کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

سکندر آباد دراصل حیدر آباد ہی کا ایک حصہ ہے ممکن ہے ڈیڑھ سو دو سو برس پہلے یہ دو شہر ہوں مگر اب یہ حیدر آباد ہی کا حصہ ہے یہاں انگریزی فوج، پولیس، عدالتیں، جیل، سب برٹش حکومت کے تھے۔ قوانین بھی وہیں کے نافذ ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ برٹش انڈیا کا ایک ٹکڑا حیدر آباد میں تھا ظاہر ہے کہ اپنی ریاستگاہ یا دارالسلطنت میں ایک حصہ شہر کا اگر دوسری زبردست طاقت کے قبضہ میں ہو تو دو عملی پیدا ہوتی تھی اور کمزور طاقت کے اقتدار کو نقصان ہوتا تھا۔ مجھے بھی اس سے مسرت ہوئی اور نظام بھی خوش ہوئے کہ حیدر آباد کے پہلو میں جو کانٹا تھا نکل گیا۔

جنوری ۱۹۴۶ء میں آریہ سماج کے لوگوں نے ایک میٹنگ کی خواہش کی جنہیں قیود و شرائط کے ساتھ اجازت دی گئی۔ سر اکبر حیدری مرحوم کے زمانہ میں آریہ سماج نے ایک بڑی شورش کی تھی جس کے سلسلہ میں ایسے احکامات جاری ہوئے تھے کہ دوران جنگ کوئی میٹنگ حیدر آباد میں نہ ہو۔ اب جبکہ جرمنی آخری سانس لے رہا تھا اور یورپ کی جنگ تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ حکومت حیدر آباد نے قیود و شرائط کے ساتھ

اجازت دی۔ علاوہ ازیں پورے ہندوستان میں آزادی کی لہریں اٹھ رہی تھیں عوام کے طبائع انقلابی مدوجزر سے متاثر ہو رہے تھے۔ اس لیے زبان بندی کے احکامات کا نافذ رہنا خلاف مصلحت تھا۔

اسی زمانہ میں خاکساروں کا بھی ایک جلسہ ہوا اور آریہ سماج خاکسار دونوں ہی جلسوں میں قابل اعتراض تقریریں ہوئیں جن پر قانون کے تحت کارروائی کی گئی اور سرکار میں پوری اطلاع بذریعہ عرضداشت دیدی گئی آریہ سماج کے جلسے میں تقریریں فرقہ وارانہ تھیں۔ گو اجازت ایک مذہبی جلسہ کی مانگی گئی تھی چنانچہ پورن چند جو پنجاب سے ایک لیڈر آئے تھے جن کی تقریر قابل اعتراض تھی انہیں ریاست بدر کردیا گیا اور نرائن سکسینہ جو حیدرآباد کے تھے اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔

خاکسار عبدالجبار المسلم کو اپنی تقریر تسلیم تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ افسران ریاکار ہیں جو اپنے کو تفضیلیہ کہتے ہیں۔ اس میں اشارہ ذات ہمایونی کی طرف تھا انہیں فوراً حیدرآباد ڈفنس قواعد کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔

پہلی صفر ۱۳۶۴ھ کو ایک یادداشت کے ذریعہ تمام واقعات نظام کے حضور میں پیش کردئے گئے۔ حکومت نے اپنا نقطۂ نظر بھی سرکار کے حضور میں پیش کردیا جو کم وبیش یہ تھا۔

ان دونوں شورشوں میں ایک یہ چیز مشترک ہے۔ آریہ سماج اور خاکسار دونوں کی تنظیم پورے ہندوستان میں تھی دوسرے یہ کہ یہ واقعات ایسے تھے کہ مقامی اخبارات بھی اپنے اپنے فرقہ کی تائید میں شریک ہوجاتے۔ جہاں تک خاکساروں کا تعلق کونسل کے یہ بھی پیش نظر رہا کہ اس تقریر میں ذات ہمایونی کے معتقدات کی طرف اشارہ تھا اس زیادہ سخت احکامات ممکن تھے لیکن بغیر ان نتائج پر غور کئے ہوئے کہ کوئی فعل یا حکم ایسا نہ ہو جو پورے ہندوستان میں شورش کی وجہ بن سکے جس میں حکمراں کے عقائد کو زیر بحث لانے کی کوشش کی جائے۔ کوئی حکم نافذ کرنا یا اعلیٰ حضرت کو ایسا مشورہ دینا خلاف عقیدت اور وفاداری ہوتا۔

۱۹ر فروری ۱۹۴۵ء میرے دہلی سے واپسی پر شام کو سر عقیل جنگ آئے اور وہ نیم سرکاری جو بصیغہ راز آیا تھا مجھے دکھایا جس سے مجھے تکلیف ہوئی جس کی نقل بجنسہ

حسب ذیل ہے۔

یکم صفر المظفر ۱۳۶۴ھ

خدمت شریف جناب معتمد صاحب باب حکومت

آپ کو تحریر کرنے کے لیے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

آریہ سماج کو اُن کی میٹنگ کرنے اور بلا قیود شرائط۔ گورنمنٹ نے جو اجازت دیدی ہے اور جس کی وجہ سے حال میں جو جلسے ہوئے اس میں مذہب اسلام پر جو جملے ناشائستہ دریدہ دہنی سے کہے گئے ہیں یا مذہبی کتاب دین کی جو توہین ہوئی اس پر تمام طبقہ اسلام میں ہل چل ہے جس کا حال یہاں کے لوکل اخبارات کے مضامین سے جو کہ شائع ہوئے مثل روز روشن ظاہر ہے ایسی حالت میں اندیشہ اس کا ہے کہ اگر گورنمنٹ استقلال اور جرأت سے کام نہ کرے گی اور کوئی فتنہ یہاں پیدا ہو جائے گا تو پھر مجھ کو کونسل کا Disolve کر کے دوسری کونسل کو مجبوراً تشکیل دینی ہوگی کس لیے کہ بحیثیت حکمراں مجھ پر بھی اپنی حدتک ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں بھی اپنے فرائض رکھتا ہوں۔ یعنی کہا یہ جائے گا کہ کونسل نے کمزوری بتائی تھی اور ایسے نکات سمجھنے سے قاصر تھی تو پھر حکمراں بیٹھ کر کیا کر رہا تھا کیوں اپنی پاور سے جو کہ اس میں Invest تھا از روئے کونسٹی ٹیوشن بحیثیت رئیس کام نہیں لیا۔ نظر برآں بعد واپسی پریسیڈنٹ کونسل اس مسئلہ پر کونسل میں غور ہو کر کیا طے پاتا ہے اس سے مجھ کو ہفتہ عشرہ میں اطلاع دی جائے کہ قریب میں ریزیڈنٹ صاحب سے گفتگو کرنے والا ہوں۔

صدر المہام پیشی

کونسل نے حسب ذیل عرضداشت سے انگریزی میں پیش کی۔ مجھے اس سے مسرت ہوئی کہ میری کابینہ کے تمام ممبران نے بلا استثنیٰ مذہب اور قوم اس پر دستخط کر دیے۔

Secret **Hyderabad - Deccan**

22nd January, 1944

Your Exalted Highness,

Council have read with pain the Peshi D.O. letter dated the 1st Safar 1364 Hijri regarding the recent

objectionable speeches delivered at the Arya Samaj Annual Conference and the Khaksar agitation over the arrest of Abdul Jabbar Khan Almuslim. The correct facts about these cases have already been submitted through Arzdasht dated the 18th Isfandar 1354 Fasli and Council have no doubt that, in the light of these facts, your Exalted Highness has now realized that the strictures passed on the Council in these letters were completely unmerited.

2. Council moreover feel constrained most respectfully to submit that these strictures have deeply wounded the feelings of your loyal servants, the Members of the Council, and they respectfully submit that in these critical days their policy has been determined by the parmount consideration of avoiding those sharp conflicts with political and religious group which have hampered the war effort in some other and gave the way for development and progress. The successful execution of such a policy involves firmness tempered with moderation and foresight-not always an easy course to follow. If judgement is passed on the policies and action of the Council without first ascertaining the observations and remarks of the Council, the results are bound to affect the interest of administration.

In the end Council respectfully beg to submit that if, in face of the facts stated in the Arzdasht referred to above, your Exalted Highness still adheres to the views expressed in the Peshi D.O. of the 1st Safar, Council would greatly prefer dissolution to continuing in office in such a situation as has now developed. They would add that the contents of such letters often leak out some how or other and are circulated as public gossip in a greatly exaggerated and distorted form. Your exalted Highness will appreciate how impossible the work of Government can become in these circumstances.

Council regret having to make representation of this character but their one motive in doing so is to serve the

highest interest of your Exalted Highness and of the State which they have the honour to serve.

With Deep respects,

We beg to remain,

Your Exalted Highness

Most loyal and devoted servants,

1. Sd/-Ahmad Said
2. Sd/-Akeel Jung
3. Sd/- Mehdi Yar Jung
4. Sd/- Dharam Karan
5. Sd/- Ghulam Mohammad
6. Sd/- W.V. Grigson
7. Sd/- Alam Yar Jung
8. Sd/- Zahir Yar Jung

کابینہ کے جلسوں کی روئیداد کا حال ریزیڈنٹ کو معلوم ہوہی جاتا تھا وائسرائے کا مقرر کیا ہوا انگریز اسی لیے تھا جب ریزیڈنٹ کے علم میں اس عرض داشت کا مضمون آیا تا ۲۵ر جنوری کی ملاقات میں اُن سے بات چیت ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ چونکہ پریسیڈنٹ کا تقرر وائسرائے کی منشاء سے ہوتا ہے آپ استعفیٰ بغیر Crown Representative کے مشورہ کے نہیں دے سکتے اور آپ کو عرضداشت میں لکھنا چاہیے تھا۔ Subject to the Approval of Crown Representative میں نے کہا کہ یہ میں کیسے لکھ سکتا تھا یہ تو نظام اور حکومت ہند کے درمیان ایک نجی معاہدہ ہے۔ حیدرآباد کے یا برٹش حکومت کے کسی آئین میں اس کا ذکر نہیں۔ گو یہ واقعہ تھا۔ مگر آئینی اعتبار سے میں نظام کا نامزد کیا ہوا تھا وہ سن کر خاموش ہوگئے۔ اسی سلسلے میں ایک روز گرگسن میرے پاس آئے اور ایک تار جو دہلی سے آیا تھا دکھایا جس کا ماحصل یہ تھا کہ چونکہ گرگسن وائسرائے کے مقرر کردہ ہیں اُنہیں استعفیٰ نہیں دینا چاہیے۔ حالانکہ جب مسودہ عرضداشت کابینہ میں زیر بحث تھا تو وہ اس پر زور دیتے تھے کہ سخت الفاظ میں اظہار مقصد کیا جائے۔ میں نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ میرے نزدیک کسی حالت میں بھی تہذیب، فرق مراتب اور آداب کے حدود سے باہر قدم رکھنا جائز نہیں۔ آج گرگسن اس

سے اتفاق کررہے تھے کہ میں نے اُن کی رائے نہ مانی اور اظہار مقصد مناسب الفاظ میں کیا۔

برٹش حکومت کے افسران کی یہ پالیسی ہر معاملے میں ہوتی تھی کہ اگر ذمہ داری کسی دوسرے پر ہے تو سخت سے سخت تجاویز یا احکامات ہوں اگر ذمہ داری اپنے اوپر آئے تو پھر بہت پس وپیش کے بعد قدم اٹھایا جائے۔ اسی دوران میں سرکار میں حاضری ہوئی۔ اعلیٰ حضرت قدرتاً برہم تھے میں نے عرض کیا کہ اعلیٰ حضرت کی اطلاعات صحیح نہیں تھیں روزنامچہ کے الفاظ یہ ہیں ''گفتگو خاصی گرم رہی یہاں تک نوبت پہونچی کہ ''نواب صاحب میں نہیں چاہتا کہ جب آپ ڈیڑھ سال کے بعد جائیں تو میرے اور آپ کے تعلقات دوستانہ ویسے باقی نہ رہیں جو یہاں آنے سے پہلے تھے۔ میں نے بہ ادب عرض کیا کہ میری خواہش بھی یہی ہے۔ پھر دوسرے انتظامی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔

عرضداشت کے جواب میں حسب ذیل نیم سرکاری آئی۔

۷ر صفر المظفر ۱۳۶۴ھ

راز

خدمت شریف عالی جناب نواب سر محمد احمد سعید خاں بہادر صدر اعظم آپ کو تحریر کرنے کے لیے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

کونسل کی انگریزی عرضداشت مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۴۹ء کو میں نے بغور دیکھا اور جس طرز میں لکھی گئی ہے اُس کا جواب میرے ہاں صرف یہ ہی ہے کہ ایسے امور سے خائف ہو کر اپنے قطعی خیالات کو بدل نہیں سکتا اور یہ مسئلہ وفاداری ملک و مالک کا نہیں ہے بلکہ صرف طرز کارروائی کونسل سے متعلق ہے اور اب سے نہیں بلکہ چند سال قبل سے یہ ہی ہے (جس کے ساتھ برٹش ریزیڈنٹ کو بھی اتفاق ہے) کہ حالات زمانہ بدل جانے سے کونسل کو از سر نو تشکیل دینا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر جنگ نہ چھڑ جاتی یا جلد ختم نہ ہو جاتی تو تشکیل کونسل کو التوا میں نہ رکھا جاتا تاہم اب بھی میرے زیر غور یہ ہی مسئلہ ہے کہ کونسل میں ایسے اشخاص شریک ہوں علاوہ رئیس پبلک یا رعایا

برایاء کو بھی اطمینان ہو سکے اور یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ تقرر ممبران کونسل کا مسئلہ بالکلیہ رئیس کے صوابدید پر نہیں ہے بلکہ اس میں دوسرے فریق کی بھی شرکت ہے اور یہ پوائنٹ بھی ایک حد تک درست ہے۔ اور میں نے جو کچھ دفتر پیشی کے مراسلوں میں لکھا ہے تو وہ من گھڑت قصوں کو نہیں بیان کیا تھا بلکہ ان میں صداقت بھی موجود تھی۔ بہر حال میرا فرض بحیثیت حکمراں یہ ہے کہ حالات زمانہ کو دیکھ کر وقتاً فوقتاً ایسے امور میں رد و بدل کرتا رہوں اور یہ میرا (Prerogative) ایسا ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آخر میں اس قدر اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ کونسل کی وفاداری پر مجھے شبہ نہیں ہے مگر ہے تو دوسرے امور پر جس کا ذکر مراسلوں میں موجود ہے یعنی اس کے بعد یہ قصہ ختم ہو گیا۔

۵/اپریل ۴۶ء۔ اسی دوران میں ڈچپلی مسجد کا واقعہ پیش آیا جس کی انتہا اس پر ہوئی کہ حیدر آباد کے تین ہزار مسلمانوں نے آ کر میرے رہائشی مکان میں آگ لگا دی یہ کیوں ہوا اور اس کی تہہ میں کس کا ہاتھ کارفرما تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن حیرت ضرور ہوئی اور اب تک ہے میرے تعلقات مسلمانوں سے بُرے نہ تھے بلکہ سر مرزا اسماعیل کے آنے کو وہاں کے مسلمان ناپسند کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ میں ہی رہوں۔ مسٹر جناح نے خود آ کر سر مرزا کے تقرر کی مخالفت کی تھی جیسا کہ سر مرزا نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے۔ حیدر آباد سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر جذام کے مریضوں کا ایک شفاخانہ ہے اس گاؤں کا نام ڈچپلی ہے۔ یہ شفاخانہ امریکن مشن کا ہے جنہیں کسی نظام سابق نے زمین دی تھی۔ میں نے بھی ایک بار اسے دیکھا یہ مریضوں کی بہت خدمت کرتے تھے اور بے تکلف مریضوں کے ساتھ رہتے تھے۔ یہاں نماز کے واسطے ایک چبوترے کی اجازت بھی مشن والوں نے دیدی میں نے اس چبوترے کو دیکھا تھا مسلمانوں نے وہاں مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور مشن کے لوگوں نے مزاحمت کی مریضوں نے حیدر آباد کے مسلمانوں کو مشتعل کرنا شروع کیا۔ ایک نیم سرکاری کے ذریعہ سے نظام نے بھی اس طرف حکومت کو برہمی کے ساتھ متوجہ کیا۔ میں نے شفاخانہ کے منتظمین اور اتحاد المسلمین کے لوگوں سے مشورہ کر کے یہ طے کر دیا کہ مسجد کی تعمیر حکومت کرائے گی۔ صرف جگہ کا تعین باقی تھا۔ حکومت کے اس فیصلہ کے

بعد میرے خیال میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اُسی زمانہ میں ہزہائنس آغا خاں مرحوم ہندوستان آئے تھے اور اُن کی سالگرہ اُن کے معتقدین نے اس طرح منائی تھی کہ انہیں ہیروں میں تولا جائے۔ چنانچہ منظر عام پر چھوٹے چھوٹے سربہ مہر کے بکسوں سے انہیں تولا گیا میں بھی اس تقریب میں شرکت کے واسطے بمبئی گیا۔ مجھے ۱۳ر کو واپس آنا تھا مگر ۱۴ر مارچ کو واپس ہوا۔ آکر معلوم کہ حیدرآباد میں شورش بہت زیادہ ہوگئی اور ۱۳ر تاریخ کو مظاہرہ کرنے لوگ اسٹیشن پر آئے تھے مگر میں بمبئی سے نہ آسکا تھا۔

معین نواز جنگ میرے پاس آئے مجھ سے کہا کہ کل مسلمانوں کا جلسہ ہونے والا ہے اور عبدالرحمٰن ایڈیٹر اخبار وقت جو کہ مجلس عاملہ کے صدر ہیں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ معین نواز جنگ خود بھی اتحادالمسلمین کے حامی تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ صبح کو عبدالرحمٰن مجھ سے مل لیں اب تو شام ہوگئی ہے۔ اور اُن سے کہدیں کہ جلسہ کرنے کی ضرورت نہیں گورنمنٹ نے معاملہ طے کردیا ہے اور کل کے نمائندے۔ ڈچپلی کے شفاخانہ کے مہتمم اور عیسائیوں کے نمائندے بشپ منڈل میرے پاس آئے ہیں۔ اب جلسے کی ضرورت نہیں ہے کل اعلان ہوجائے گا۔ معین نواز جنگ نے یہ یاد نہیں کہ خود آکر کہا یا پیام بھیجا کہ چونکہ جلسہ کا اعلان ہوچکا ہے اس واسطے ملتوی کرنا تو ممکن نہیں البتہ اس کا انتظام کردیا ہے کہ جلسہ محض رسمی ہوگا جسے حکومت کے فیصلہ کی طرف اشارہ کرکے ختم کردیا جائے گا۔

صبح کو مسٹر گرگسن اور دیگر ممبران کمیٹی گفتگو کررہے تھے۔ معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن معہ ایک بڑے مجمع کے شاہ منزل آرہے ہیں۔ چونکہ میں مطمئن تھا کہ مجمع کو بتایا گیا ہے کہ تصفیہ حکومت نے مسجد کی تعمیر کے متعلق کردیا ہے پولیس سے کہدیا گیا کہ روکنے کی ضرورت نہیں اور یہ ہی ہدایت شاہ منزل کی پولیس اور فوج کے پہرہ داروں کو کردی گئی۔ عبدالرحمٰن آئے اور گفتگو میں شریک ہوگئے اور فیصلہ سے مطمئن ہوگئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے چار ساتھی بھی تھے امام بیگ رونق نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ وہ مجمع کو جاکر خوشخبری سنادیں اول تو عبدالرحمٰن نے یہ کہا کہ تصفیہ جب تک تحریر نہ ہوجائے اعلان بیکار ہے لیکن کچھ ہی دیر کے بعد وہ مجمع کو اطلاع دینے گئے جوں ہی وہ مجمع کے سامنے پہونچے

توڑ پھوڑ آگ لگانا شروع ہوگیا۔ لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں خود اس تصفیہ سے انہیں مطلع کروں۔ میں نے تقریر کی مگر کوئی اثر نہ ہوا اور میرے رہائشی مکان کے ساتھ بھی توڑ پھوڑ اور آتش زنی شروع ہوگئی گویا عبدالرحمٰن کا مجمع کے سامنے جانا اس بات کا اشارہ تھا کہ آتش زنی اور توڑ پھوڑ کی جائے۔ گو مجمع میں لاٹھی۔ بلّم اور تلوار بھی بعض لوگوں کے پاس تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جانی یا جسمانی ایذا پہونچانا مقصود نہ تھا۔ مجھ پر یا میرے متعلقین پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ گویا پروگرام میں آتش زنی اور دوسری قیمتی اشیاء کو برباد کرنا تھا۔ میں معہ متعلقین مکان سے نکل کر کاظم یار جنگ کے یہاں موٹر سے چلا گیا۔ جب کاظم یار جنگ سے یہ واقعہ کہا تو بے ساختہ ان کی زبان سے یہ نکلا "ایں مظاہرہ تو گرگسن کے ہاں ہونے کی خبر تھی" گرگسن کے ہاں پہونچا۔ کاظم یار جنگ کے اس فقرہ سے ظاہر ہوگیا کہ انہیں اس مظاہرہ کی خبر تھی اور حکومت کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔

میں شام کو برابر کے مکان میں جو میرا مہمان خانہ تھا آ گیا اور کابینہ کا جلسہ ہوا اس واقعہ پر غور کیا گیا۔ اس مسجد کے متعلق جو مجلس عاملہ بنی ہوئی تھی اُسے خلاف قانون قرار دیا گیا اور جو لوگ آتش زنی کے مجمع میں شریک تھے اُن کے قائدین کے خلاف عدالتی کاروائی کا حکم دیا گیا۔

دوسرے روز صبح کو ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) حضور نظام کا پیام لائے جس میں اعلیٰ حضرت نے اس واقعہ پر اظہار افسوس کیا تھا اور خاطیوں کے خلاف اظہار ناخوشی کیا تھا۔ ہوش نے راز کے طور پر یہ بھی کہا کہ "اس پردہ زنگاری میں خود بدولت کا ہاتھ تھا۔ دوسرے یا تیسرے روز عثمان ساگر کے بنگلہ پر ایک ڈنر شاید علی یاور جنگ نے دیا تھا۔ جس میں ریزیڈنٹ سر آرتھر لودین بھی تھے۔ اُن کے ریزیڈنسی پولیس کی اطلاعات بھی ایسی تھیں جس سے کہ یہی پتہ چلتا تھا۔

۱۶؍ مارچ کو کاظم یار جنگ آئے وہ کہتے تھے کہ اگر گرگسن کو اعلیٰ حضرت کی خواہش کے مطابق علیحدہ کر دیا ہوتا تو نہ مسلمانوں میں شورش ہوتی اور نہ سرکار برہم ہوتے۔

بہر حال اب جبکہ نظام مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں کسی بات کو اُن کے

خلاف یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا اور ابھی حال میں میرے ایک معتمد علیہ جن کی صداقت اور وفاداری پر مجھے اعتماد رہا ہے۔ اشفاق احمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ پولیس ایکشن کے بعد جبکہ نظام مرحوم حکمراں نہیں رہے تھے توانہیں گھنٹوں حاضری کا موقع ملتا تھا نظام مرحوم نے اُن سے خود یہ کہا کہ یہ شہرت غلط تھی کہ شاہ منزل کا یہ واقعہ اُن کے ایما سے ہوا۔

میں نے اپنا استعفیٰ پیش کیا مگر جواب خلاف توقع نفی میں آیا وجہ یہ بیان کی گئی کہ چونکہ کیبنٹ ڈیلیگیشن آنے والا ہے مجھے سبکدوش نہیں کیا جا سکتا۔

اس آتش زنی کے واقعہ سے جو مالی نقصان ہوا وہ تو ہوا ہی ایسے نقصانات ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن بعض ایسی چیزیں ضائع ہوئیں کہ جن کا بدل نہیں ہو سکتا اُن میں دو چیزیں تھیں جن کا مجھے افسوس رہا۔ ایک تو لارڈ بیڈن پاول کی رنگین تصویر تھی جو انہوں نے مجھے خود دی تھی جبکہ وہ ہندوستان آل انڈیا جمہوری کی شرکت کے واسطے آئے تھے یہ ایک ایسے شخص کی یادگار تھی جس کی تحریک بوائے اسکاؤٹ آج دنیا کے تمام مہذب ممالک میں پھیلی ہوئی ہے اور (لارڈ بیڈن پاول کا احترام) دنیا کے نوعمر کرتے ہیں۔ دوسرے میری گورنری اور ہوم ممبری کے تقرر کے احکامات یعنی (Warrant of Appointment) تھے جن کو بادشاہ کے دستخط سے جاری کیا جاتا تھا۔ ایسی چیزوں کی قیمت جن سے پرانی یادیں منسلک ہوں مادّی اشیاء کی صورت میں نہیں ہو سکتی اُن کی قدر و قیمت جذبات پر منحصر ہوتی ہے اور جذبات وجدانی کیفیت ہے مادّی اشیاء سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ملک و مال یا زر و جواہر سے جذبات کی اُجڑی دنیا نہیں بسائی جا سکتی۔ بقول سعدی

گر صد ہزار لعل و گوہری دہی چہ سود
دل را شکستی نہ کہ گو ہر شکستی

کیبنٹ ڈیلیگیشن ہفتہ عشرہ کے بعد ہی آ گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور دوسرے شرکاء کار کے ساتھ اُن سے ملاقات ہوئی اور حیدر آباد کی خواہشات کے متعلق برار وغیرہ اور سیاسی مستقبل آزاد ہندستان میں زیر بحث رہا جس پر ایک نوٹ بھی دیا گیا۔

میں نے ایک عرضداشت مورخہ ۲۶ رجمادی الثانی ۱۳۶۵ھ پیش کی تا کہ مجھے سبکدوشی جلد از جلد مل جائے۔ بعض کاغذات صغیر صاحب مرحوم کے آتشزدگی سے بچ گئے اس عرضداشت کی نقل مل گئی۔ جو حسب ذیل ہے۔

عالیجاہا

فرمان عطوفت نشان (راز) مزینہ ۲۴ رربیع الثانی ۱۳۶۵ھ کے جواب میں فدوی جاں نثار نے حضرت ظل سبحانی کی بارگاہ عالی میں ۲۶ رربیع الثانی سن دوران کو دہلی سے جو معروضہ ادب پیش کرنے کی عزت حاصل کی تھی اس میں منجملہ دوسرے امور کے منشاء خسروی کی تعمیل میں اس وقت رخصت مستحقہ سے استفادہ کا ارادہ ترک کرنے کی جانب بھی اشارہ کیا گیا تھا کیبنٹ ڈیلیگیشن کے فیصلہ کے اعلان کے بعد حالات بدل گئے ہیں اور ان تبدیل شدہ حالات کی موجودگی میں فدوی کے نزدیک یہ بڑی فرض ناشناسی ہوگی اگر یہ عرض نہ کرے کہ اس کے رخصت پر جانے کے پروگرام میں تبدیلی ضروری ہے۔

کیبنٹ ڈیلیگیشن اپنا مفروضہ کا ایک باب ختم کر چکا اب مستقبل کی تعمیر کا کام وئسرائے اور مجلس دستور ساز یعنی کانسٹی ٹیوشن اسمبلی کے ہاتھ میں ہے۔

اس دولت ابدمدت کے مطالبات کا جہاں تک تعلق ہے وہ بحمد اللہ حضرت پیر و مرشد کی رہنمائی میں صاف و واضح اور غیر مبہم پیرایہ میں وائسرائے اور ڈیلیگیشن کے روبرو باضابطہ طریقہ سے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ فدوی کو اس باب میں تفصیلات عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ دہلی اور شملہ کے قیام کے زمانہ میں جو کچھ ہوا وہ حضرت جہاں پناہی کے ضمیر منیر پر خوب روشن ہے۔ اس ضمن میں آئندہ جو کچھ ہوگا وہ طویل گفت وشنید یعنی (Negotation) کے ذریعہ سے طے پائیگا اور عجیب نہیں کہ اس فرض کے لیے ڈیڑھ دو ماہ بعد تبادلہ خیالات اور گفت وشنید کا سلسلہ از سر نو شروع ہو۔

گفت وشنید کے اس نئے دور کی اہمیت کے متعلق جس پر ہمارے مطالبات کا مدار ہے جاں نثار کو کسی قسم کا اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس حقیقت کو ذات

ہمایونی سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اب جبکہ نئے پریسیڈنٹ کونسل کے آنے میں صرف تین ماہ باقی رہ گئے ہیں تو فدوی جاں نثار بصد ادب یہ عرض کرنے کی اجازت چاہے گا کہ مفاد ریاست کے مدنظر اسے یکم جولائی سے رخصت مستحقہ سے استفادہ کرنے اور اس کے بعد پریسیڈنٹ کونسل کی صدارت سے سبکدوش ہونے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔

رسم است کہ مالکان تحریر۔ آزاد کنند بندۂ پیر

پانچ سال تک حلقہ بگوش کی نعمت سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد اب کچھ دن آرام کی شدید ضرورت کے احساس کے باوجود اگر ان پچھلے دو ماہ میں حالات میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ ہوتی تو فدوی کے لیے آخیر اگست ۱۹۶۴ء تک پورا زمانہ ملازمت حیدرآباد میں بسر کرنا عین باعث عزت ہوتا لیکن گفت وشنید کے آنے والے نئے دور میں نئے حالات، کا پوری طرح مقابلہ کرنے اور تاج آصفی کی خدمت انجام دینے کی غرض سے اپنے آپ کو تیار کرنے کے لیے فدوی جاں نثار کی رائے ناقص میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ نئے پرائم منسٹر گفت وشنید کا دوسرا سلسلہ شروع ہونے سے اتنے پہلے اپنی خدمت کا جائزہ لے لیں کہ وہ دوران میں ریاست کے داخلی معاملات اور خارجی مسائل دونوں کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد ان پر پوری طرح عبور حاصل کرلیں اور اس طرح اپنے آپ کو ان نئے حالات میں اپنی اہم ذمہ داریوں کو پوری طرح عہدہ برآ ہونے کے قابل بنا سکیں تا کہ گفت وشنید کے نئے دور میں پالیسی کا تسلسل اور یکسانیت قایم رہ سکے۔

بہ وجوہ بالا فدوی جاں نثار کی ناقص رائے میں اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ کامل غور کے بعد بارگاہ جہاں پناہی میں یہ معروضہ پیش کرنے کی عزت حاصل کرے۔ جاں نثار کو امید ہے کہ اس ریاست ابد مدت کے مفاد کے پیش نظر اس کے معروضات کو شرف پذیرائی اور درخواست کو عزت قبول عطا فرمائی جائیگی۔

الٰہی آفتاب دولت واقبال ہمایونی تا دور شمس وقمر تاباں و درخشاں باد۔

زیادہ حد ادب فدوی جاں نثار، سعید الملک

۲۶ر جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ

اس درخواست کو نظام مرحوم نے قبول فرمالیا اور حسب ذیل مراسلہ (راز)

مورخہ ۱۷ ررجب موصول ہوا۔

سعید الملک المخاطب نواب صاحب چھتاری۔

جیسا کہ میں نے ۱۴ ررجب دوران انٹرویو میں کہا تھا کہ سر مرزا اسماعیل بعض مجبوریوں کی وجہ سے یکم جولائی کو یہاں آ کر خدمت کا حاصل نہیں کر سکتے لہٰذا وہ یکم اگست کو آسکتے ہیں (یہ کہ یکم دسمبر کو جیسا کہ خیال کیا گیا تھا درمیانی حالات بدل جانے سے قبل) ایسی حالت میں اگر آپ اواخر (یعنی چوتھے ہفتہ جولائی) تک یہاں ٹھہر سکتے ہیں تو آپ کو ماہ جولائی کے اوائل یا اواخر سے جیسا کہ مناسب سمجھا جائے میں سبکدوش از خدمت ہونے کی اجازت دیتا ہوں۔ البتہ جائزہ کا قطعی تصفیہ ریزیڈنٹ صاحب اوٹی سے اواخر جون میں آنے کے بعد ہوگا۔ گو سر مرزا اسماعیل کا تقرر قطعی طور پر قرار پا چکا ہے اور اعلان ماہ جولائی میں ہوگا۔

دیگر۔ آپ سبکدوش از خدمت ہونے کے بعد بھی اگر کوئی اہم مسائل ریاست حیدرآباد کے سود و بہبود سے متعلق پیش آئے تو میں ضرورت محسوس کرنے پر آپ کو طلب کر کے گفتگو کروں گا کہ آپ نے پانچ سال تک یہاں اہم خدمت انجام دی ہے۔ جسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اس کے سوا ہر سال یکم رجب کے سالانہ ڈنر میں شرکت کے لیے مدعو کروں گا بہ ہر حال جو حالات کہ اس وقت قائم ہیں میرے اور آپ کے درمیان دوستانہ طریقہ پر اس میں فرق نہ آئے گا بلکہ بدستور قایم رہیں گے۔

ف۔ جس صورت میں اگر برابر واپس مل جائے تو گورنری کی خدمت پر سب سے اول اس کا آفر آپ کو دونگا تا کہ دوسری شکل سے آپ سلطنت آصف جاہی کی خدمت انجام دیں اور اس کام کے لیے آپ سے بہتر کوئی شخص مجھ کو نہیں ملے گا۔

آصف سابع

حضور نظام نے یہ بھی پیام بھیجا کہ مکان کی آتشزدگی کے سلسلہ میں میرا جو نقصان ہوا ہے اسے بتایا جائے تا کہ ریاست اس کی ادائیگی کر دے۔

میں نے کوئی مطالبہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے خود ڈیڑھ لاکھ روپیہ مجھے اور پچھتر ہزار گرسن کو دیا۔

صحیح تاریخ یاد نہیں لیکن ۱۴ / یا ۱۵ / کو میں حیدر آباد سے روانہ ہوا چلنے سے پہلے ان تمام مقدمات کو جو میرے مکان کی آتشزنی کے سلسلہ میں چلائے گئے تھے اُن کی واپسی کا حکم دیدیا تا کہ ملزمان رہا کر دئے جائیں۔

....

حیدر آباد کی تہذیب اور کلچر

حیدر آباد کی تہذیب، آداب مجلس، آداب دربار اور فرق مراتب مغلیہ سلطنت کی تہذیب و تمدن کی ایک دھندلی سی تصویر تھی۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں مرحوم تو دربارداری کے شائق نہ تھے لیکن ان کے والد مرحوم نظام میر محبوب علی خاں کے واقعات اور کہانیاں لوگ حیدر آباد میں مزے لے لے کر بہت محبت سے بیان کرتے تھے طبعاً بڑے سخی اور بلند نظر حکمراں تھے لوگ بغیر امتیاز مذہب و ملت انہیں بڑے ادب اور محبت سے یاد کرتے تھے۔ اُن کے زمانہ کے واقعات ''الف لیلیٰ'' کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ گھوڑے پر سوار ہوئے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی اور شاید ڈھیلی تھی جب نظام نے باگیں ہاتھ میں لیں تو انگوٹھی انگلی سے نکل کر زمین پر گر پڑی سائیس نے بصد ادب اٹھا کر پیش کی تو نظام نے کہا ''زمین پر گری چیز پیش کرتا ہے'' اور ہاتھ کا اشارہ کیا جس کے معنی یہ تھے کہ سائیس کو عطا کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ حیدر آباد میں نمائش تھی۔ نظام مرحوم کے جانے کی خبر تھی اور برابر انتظار ہو رہا تھا۔ ایک روز یکا یک کسی چھوٹے دروازہ سے فلک نما محل سے برآمد ہو کر تنہا سڑک پر آ گئے اور تانگہ والے سے جو سڑک پر ملا کہا کہ نمائش لے چل جب نمائش گاہ کے قریب آ گئے تو پولیس نے تانگہ روکا۔ چونکہ حضور نظام کے آنے کی خبر تھی۔ نظام نے متعینہ افسر کو حکم دیا کہ تانگے کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور خزانہ سے نظام کی ہموزن چاندی تانگے والے کو دلوادو۔

فلک نما محل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وقار الامرا صدر اعظم وقت نے بنایا تھا اور نظام محبوب علی خاں مرحوم سے یہ التجا کی وہ معہ بیگمات مہمان ہو کر سرفراز فرمائیں

کچھ روز کے بعد نظام آئے ایک ہفتہ قیام فرمایا اور وقار الامرا سے چلتے وقت کہا کہ یہ بہت اچھا محل ہے ہمیں پسند آیا۔ وقار الامرا نے فوراً نذر پیش کی جس کے معنی یہ تھے کہ یہ محل نذر کرتا ہوں۔ اس زمانہ کے دربار کے امرا اتنے بلند حوصلہ تھے۔ مجھے یقین ہے کہ نظام مرحوم نے اس کی قیمت ادا کر دی ہوگی مگر وقار الامرا کی حوصلہ مندی اور اپنے آقا کے ساتھ عقیدت قابل داد ہے۔ میں نے اس محل کو بارہا دیکھا ہے۔ وائسرائے یا کوئی شہزادہ آتا ہے تو اسی محل میں قیام ہوتا۔ محل وقوع ایک پہاڑی پر ہے جہاں سے پورے حیدر آباد کا نظارہ پیش نظر رہتا ہے۔ اس کی آرائش پرانی تصاویر اور قیمتی اشیاء سے کی گئی ہے۔ میں نے اس میں ایک چھوٹا سا طوطا دیکھا جو ایک شیشہ کے بکس میں رکھا تھا وہ زمرد کے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا وہ چونچ و آنکھیں یاقوت کی تھیں۔ زین یار جنگ مرحوم نے وہ کمرہ بھی دکھایا جہاں نظام مرحوم پر فالج کا حملہ ہوا اور باعث انتقال ہوا۔ اُن کی سخاوت اور داد و دہش کے قصے حیدر آباد میں بہت مشہور تھے۔ مجھ سے خود نظام میر عثمان علی خاں مرحوم نے کہا کہ جب اُن کے والد کا انتقال ہوا ہے تو صرف خاص پر ریاست کا پینتالیس لاکھ قرضہ تھا۔

عموماً اہل دربار حکمراں کی ہر بات پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں لیکن اُن کے درباریوں میں ایسے کردار اور سیرت کے لوگ بھی تھے جیسے عماد الملک۔ ایک بار نظام محبوب علی خاں مرحوم ٹہل رہے تھے اور درباری دست بستہ کھڑے تھے (نظام کے سامنے کوئی بغیر دستار بکلوس نہیں جاتا تھا اور جب تک اجازت نہ دیں کھڑا رہتا تھا البتہ مہمان اس آداب سے مستثنیٰ تھے) نظام مرحوم نے فرمایا کہ ہماری رعایا ہمارے متعلق کیا خیال کرتی ہے درباریوں نے تعریف شروع کر دی عماد الملک چپ کھڑے رہے نظام نے آخر اُن کی طرف توجہ کی اور کہا کہ آپ کچھ نہیں کہتے انہوں نے کہا کہ حضور کی رعایا یہ کہتی ہے کہ ہمارا مالک بالکل بے خبر ہے اور انتظام ریاست کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا نظام برہم ہو گئے اور سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا یہ سلام کر کے چلے آئے اور گھر آ کر اسباب باندھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک خادم آیا اور دوسرے روز اُن کی حاضری کا حکم سنایا۔ یہ حاضر ہوئے نظام انہیں مولوی صاحب کہا کرتے تھے نظام

نے کہا کہ وہ اُن کی صاف گوئی کی قدر کرتے ہیں مگر ایسی بات مجمع میں نہیں کہنی چاہیے عمادالملک نے کہا کہ سرکار ایسا سوال بھی مجمع میں نہ فرمائیں۔

اُس زمانے میں اس کردار کے لوگ بھی دربار میں تھے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں مرحوم جن کے زمانہ میں مجھے حیدرآباد کی خدمت کا موقع ملا۔ بہت سادہ مزاج اور کفایت شعار تھے لیکن اُن کی کفایت شعاری اور سادہ مزاجی فقط اُن کے ذاتی بودو باش اور رہن سہن سے متعلق تھی۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ سر راس مسعود مرحوم کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کو دس لاکھ دیئے۔ میرے زمانہ میں جب ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور پروفیسر ہادی حسن مرحومین حیدرآباد میڈیکل کالج کے سلسلے میں آئے تو میری عرضداشت پر دس لاکھ کا عطیہ منظور فرمایا بنارس یونیورسٹی کو پانچ لاکھ کا عطیہ منظور کیا گیا۔ اگر کسی ملازم کا انتقال ادائے فرض کے سلسلے میں کسی وجہ سے ہوجاتا تو میری عرضداشت میں قانون مجریہ کے مطابق نصف پنشن کی سفارش مرحوم ملازم کی بیوہ کے متعلق ہوتی مگر سرکار ہمیشہ پوری مستحقہ پنشن جو اس ملازم کی ہوتی منظور فرماتے معترضین اُن کی زندگی کے ایک ہی پہلو کو دیکھتے تھے۔

میرے خیال میں اہل دول اگر ذاتی عیش و آرام اور شان و شوکت پر کم خرچ کریں اور مخلوق کی خدمت پر زیادہ۔ تو یہ ایک اچھی صفت ہے انقلاب زمانہ نے یہ ثابت کردیا کہ اگر نظام مرحوم ذاتی خزانہ میں روپیہ نہ ہوتا اور مختلف ٹرسٹوں کو قایم نہ کیا ہوتا تو آج چھ کروڑ کا خیراتی ٹرسٹ کیسے بنتا جس سے سینکڑوں ادارے اور اشخاص مستفید ہوتے ہیں اور آصفی خاندان کس طرح زندگی بسر کرتا جن کے الگ الگ ٹرسٹ ہیں۔

امراء کا معیار زندگی بہت بلند تھا۔ برٹش انڈیا کے مقابلے میں وہاں کا معیار زندگی عام طور پر بھی اونچا تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ انکم ٹیکس نہ تھا۔ زمین پر لگان برٹش انڈیا سے نسبتاً کم تھا۔ امراء پائیگاہ پر کوئی مالگذاری نہ تھی۔ اُن کی جاگیریں ٹیکس یا مالگذاری سے مستثنیٰ تھیں جہاں تک مجھے یاد ہے نواب ظہیر یار جنگ مرحوم جو آخری امیر آسمان جاہی پائیگاہ کے تھے اُن کی آمدنی بائیس لاکھ کے قریب تھی۔

امراء کے مکانوں پر ملازمان اور متعلقین وہی آداب برتتے تھے جو نظام کے

ہاں ملحوظ رکھے جاتے دستار اور بکلوس لگا کر جاگیردار کے سامنے آتے تھے۔ ان گھرانوں میں پرانے زمانے کی چیزیں اور شاہان سلف کے عطیات قابل دید تھے۔ سالار جنگ مرحوم کو خاص طور پر ایسی چیزوں کا شوق تھا اور اب حیدرآباد میں سالار جنگ میوزیم میں ان چیزوں میں سے بیشتر موجود ہیں۔ ایک روز سالار جنگ مرحوم نے خود مجھے ان چیزوں کو دکھایا تھا بعض اشیاء ان میں نہیں پائے مثلاً اُن کے پاس اچکن کے سات بٹن تھے اور ہر بٹن ایک ایک الماس کا تھا نور جہاں کا خنجر تھا اور دوسری بہت سی چیزیں قابل دید تھیں مجھے ایک سنگ مرمر کا قد آدم اسٹیچو بہت پسند تھا یہ ایک خاتون نقاب پوش کا اسٹیچو ہے اور کمال یہ ہے کہ نقاب میں سے صورت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہاں فرق مراتب یعنی (Protocal) کا بڑا احساس تھا۔

جب پہلی بار حیدرآباد سے واپسی کی کہانی ختم ہوگئی تو میرا خیال یہ تھا کہ اب آئندہ شاید نہ لکھ سکوں گا۔ لیکن حیات مستعار کے کاٹنے کے لیے کوئی شغل ہونا چاہیے۔ فکر معاش اور یاد رفتگاں یہی مشاغل باقی رہ گئے ہیں۔ ذکر بتاں سے تو کوئی دلچسپی رہی نہیں بیتے ہوئے دنوں کی یاد کو پھر تازہ کر رہا ہوں۔

حیدرآباد کی کہانی افسوسناک ہے اور پر حسرت بھی۔ حسرت اس پر ہے کہ جو کچھ اور جتنا حیدرآباد کو بچا لینا ممکن تھا وہ بھی نہ ہو سکا میرا خیال یہ ہرگز نہیں کہ حیدرآباد اسی حیثیت سے قائم رہ سکتا تھا۔

جمہوریت کا سیلاب جب پورے ہندوستان میں آ گیا تو حیدرآباد میں شخصی حکومت اور اقلیت کی حکمرانی کیسے ممکن تھی۔ لیکن جو ذلت، خونریزی اور تباہی ہوئی وہ نہ ہوتی۔ وعدے تو بہت سے کیے جا رہے تھے مگر جب دوسرے والیان ملک کی کہانی پر نظر ڈالتا ہوں تو یقین ہو جاتا ہے کہ "وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا" جو وعدے مجھ سے کیے جا رہے تھے وہ بھی زیادہ روز قائم نہ رہتے تاہم جو کچھ ہوتا بتدریج ہوتا اور حیدرآباد کی دنیا پولیس ایکشن کے قیامت خیز دھماکے سے نہ بدلتی۔ ممکن ہے کہ کشمیر کی طرح چند روز کے واسطے حیدرآباد کی بھی مخصوص صورت قائم رہتی لیکن اب تو والیان ملک کے ساتھ وہ عہد و پیماں کہ جو (Crstotvition) آئین میں درج کرائے گئے تھے۔ ان

کے قیام کی بھی کوئی امید نہیں تو پھر کسی سیاسی وعدے پر کیا اعتبار کیا جائے۔ حیدرآباد کی واپسی پر کسی سیاسی کش مکش میں تو میں نے حصہ نہیں لیا لیکن کنارے سے کھڑے ہو کر سیاسی مد و جزر کا تماشہ دیکھتا رہا۔

اس زمانے میں ایک سخت بحرانی کیفیت ہندوستان کے باشندوں پر طاری تھی۔ آنے والے واقعات سایہ فگن تھے اور لوگ پرچھائیوں کو دیکھتے تھے اور گھبراتے تھے ایک عجیب ہیجان تھا بلا تفرق مذہب و ملت ہر شخص آنے والے انقلاب کے نتائج کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ برٹش حکومت کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان کو آزادی دینی ناگزیر ہے۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ جس چیز نے انگریز کو مجبور کر دیا وہ ملازمین سرکار اور خاص کر فوج، ہوائی فوج اور دریائی بیڑے کا طرز عمل تھا۔ فوج کے متعلق تو I.N.A کا طرز عمل اس کا ثبوت تھا کہ فوج کی وفاداری پر انگریز بھروسہ نہیں کر سکتا۔ پھر لال قلعہ میں جو مقدمہ چلایا گیا وہ ایک اہم سیاسی غلطی ثابت ہوئی لوگوں کی عام ہمدردیاں انہی فوجی افسران کے ساتھ ساتھ تھیں جو اس مقدمہ میں ماخوذ تھے جنرل شاہ نواز اور ان کے ساتھی قومی ہیرو بن گئے تھے اور ان کی ہمدردی میں سخت ایجی ٹیشن ہوا۔ اور گورنمنٹ کو معاف کرنا پڑا دوسری طرف اسی زمانہ میں ہوائی فوج اور دریائی بیڑے کے افسران نے اسٹرائیک کیا مجھے ۱۷ راگست ۴۶ء کی ملاقات میں گورنر یوپی نے کہا کہ گورنروں کی کانفرنس میں انھوں نے کہا کہ انھیں اپنی پولیس پر بھروسہ ہے لیکن آئندہ کب تک پولیس کی حالت قابل اعتماد رہے گی یہ نہیں کہا جا سکتا ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آسام اور بہار کی حکومتوں کو اپنی پولیس پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔

دوسری طرف ولایت میں پارلیمنٹ کے انتخاب کا نتیجہ بالکل خلاف توقع ہوا۔ مسٹر چرچل کی پارٹی کو شکست ہوئی باوجود اس کے کہ جنگ میں کامیابی کا سہرا انہیں کے سر پر تھا مگر برٹش قوم اب شہنشاہی کی پولس سے متنفر ہو گئی تھی۔ اب وہ امپیریلزم کے خلاف تھے۔ میرے خیال میں یہ اسباب تھے کہ جو انگریز ہندوستان آزاد کرنے پر مجبور ہوا۔

ہندوستان کے لوگوں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بڑا انقلاب آرہا ہے۔ ہر جماعت

ان غیر متیقین حالات سے پریشان تھی۔ اور قدرتاً یہ جاننا چاہتی تھی کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد میرا مقام کیا ہوگا۔ دہلی میں جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ لیگ اور کانگریس کی ملی جلی حکومت ہوگی۔ ہندوستان کی تقسیم سامنے نہ تھی اور مسلمان زیادہ تر لیگ کے زیر سایہ اثر تھے اور ظاہر ہے کہ مسلمان یہ سمجھتا تھا ہر گورنمنٹ میں مسلم لیگ اور کانگریس شریک ہونگے اور جداگانہ انتخاب کے ہوتے ہوئے اس کے سوا مسلمان کو چارہ بھی نہ تھا کہ وہ لیگ کے ساتھ جائے۔ کوئی دوسری سیاسی جماعت میدان میں ایسی منتظم نہ تھی۔

اس زمانہ میں مسٹر جناح نے اس پر اصرار کیا کہ کانگریس اپنے حصے کے ممبروں میں کسی مسلمان کو نہ لے ظاہر ہے کہ جناح کا یہ مطالبہ منصفانہ نہ تھا۔ ہر پارٹی کو اختیار ہے کہ بلا قید مذہب و ملت جس شخص کو چاہیں اپنی حکومت میں لے لیں۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کی شرکت کے بغیر کانگریس نے حکومت بنائی بنگال، بمبئی اور دوسرے مقامات پر جو خونریز بلوے شروع ہو گئے مجھے اس پر اصرار تھا کہ دونوں پارٹیاں جب تک راضی نہ ہوں پر امن تبدیلی حکومت میں نہ ہو سکے گی۔ دونوں کو ملا کر حکومت بنے تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی مطمئن رہیں۔ مگر لارڈ ولول نے ایک پارٹی کی حکومت بنائی اور مسلم لیگ نے پاس کیا جس کا نتیجہ تمام ملک میں خوں ریزی ہوئی، کلکتہ، بمبئی، مشرقی بنگال، گڈھ مکتیشر ہر جگہ بہیمانہ قتل و غارت شروع ہو گیا جس سے عورت اور بچے بھی نہ بچ سکے۔ اس سے مجھے قلبی تکلیف ہوئی اور میں نے انگریزی خطابات واپس کیے۔ ہمارے ملک کے بعض بھائی آج کل مسلمانوں پر یہ الزام دیتے ہیں کہ ملک کی تقسیم کے وہ ہی تنہا طرفدار ہیں۔ مگر واقعات پر غور کیا جائے کہ حالات کیوں اور کس طرح بدلتے چلے گئے تو یہ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمان اور مسلم لیگ کا یہ مطالبہ صرف بھاؤ تاؤ کرنے کے لیے تھا ورنہ انگریزی حکومت اور ملک کی اکثریت دونوں کی مخالفت کے بعد اس کا یقین کہ ملک تقسیم ہو جائے گا کیسے ممکن تھا۔ گو میں حیدرآباد سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست میں دخیل نہ تھا اور ۱۹۴۱ء کے بعد میری دلچسپی فقط حیدرآباد کے مستقبل تک محدود تھی لیکن جب واقعات پر نظر ڈالی جائے اور سچائی کی تلاش مقصود ہو تو

حقیقت صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اگر لیگ اور مسٹر جناح کو یہ یقین ہوتا کہ پاکستان بننے کا یقین ہوتا تو عارضی حکومت میں 2-5-5 کا فارمولا لیگ منظور نہ کرتی اور کچھ روز کے بعد جواہر لال جی کی حکومت میں شریک نہ ہوتی لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجویز مان لی تھی جس کا مقصد (Zone) الگ الگ بننے کا تھا۔ اور یہ علاقائی حکومتیں مرکزی حکومت میں شریک ہوتیں کہ جس میں ڈیفنس خارجہ پالیسی اور رسل ورسائل کے شعبہ شامل ہوتے مسلم لیگ کیبنٹ مشن کی تجویز کو ۶ جون ۱۹۴۶ء کو مان لیا اور کانگریس نے ۶ جولائی کو بظاہر مان لیا لیکن الفاظ کے معانی اس طرح بیان کئے کہ تجویز بالکل مسخ ہو گئی مولانا ابوالکلام مرحوم نے اپنی کتاب (India wins Freedom) میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اور (H.V.Hodson) نے اپنی کتاب (the geat deride) میں بھی اسکا تذکرہ کیا ہے اس کتاب کے صفحہ 162 اور 163 کا کچھ حصہ بجنسہ نقل کر رہا ہوں۔ جو بمبئی میں پنڈت جی نے کہا تھا۔

"At the final session of the All India Committee and afterwords at a press Conference, Pandit Nehru declared that the Congress had not accepted any plan-long or short; it had committed itself to participation in the proposed Constituent Assembly, but to no more.........

The miss on proviso about arrangement for Minorities was a domestic Indian problem "we accept no outsider's interference with it, certainly not the British Government's" asked at the press Conference whether he meant that the cabinet Mission plan could be modified. Nehru replied that the Congress regarded itself as free to change or modify the plan in the Constituent Assembly as it though fit."

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر جناح نے اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ کیبنٹ مشن کی تجاویز کو پنڈت جواہر لال نے مسترد کر دیا اور 27 جولائی کو لیگ کی کونسل کی میٹنگ میں یہ تجویز کیا کہ کانگریس اپنی اکثریت کے ذریعہ مشن کی تجاویز کو بدلنا چاہتی ہے اور (Constituent Assembly) میں اپنی اکثریت سے ایسا کرنا چاہتی ہے لہٰذا مسلم لیگ نے جو منظوری مشن کی تجاویز کو دی تھی اسے واپس لیتی ہے اور اس طرح

ہندوستان کی اکائی قائم رکھنے کا ایک سنہرا موقع نکل گیا۔ وائسرائے لارڈ ویول اور وزیر ہند دونوں ان حالات سے پریشان ہوئے اور تجویز یہ پائی کہ لندن بلا کر مسئلہ کو صاف کیا جائے چنانچہ پنڈت جی، سردار بلدیو سنگھ، جناح اور لیاقت علی خاں لندن گئے اور اس کے بعد وزیر ہند نے ۶ دسمبر کو ایک بیان دیا H.V.Hodson نے اپنی کتاب میں وزیر ہند کے اسی بیان کو ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"That the Cabinet Mission's view, which had been confirmed by legal advice, had always been, in effect, that of the Muslim League as to the power of sections to decide by majority vote. This interpretation "must therefore" be considered as an essential part of the Scheme of May 16. it should therefore be accepted by all parties to the Constituent Assembly".

آگے چلکر اتنا اور فقرہ بڑھا دیا کہ اگر باوجود اسکے کہ جو بتایا ہے اگر (Constituan Assembly) چاہے تو اس بنیادی پائنٹ کا منشا فیڈرل کورٹ کے پاس بھیج کر ان سے معلوم کرے۔

لیکن پنڈت جی نے 5 جنوری ۱۹۴۷ء کو A.I.C.C کی میٹنگ میں یہ کہا کہ

Such a reference has become purposeless and undesirable owing to the recent announcement made by the British Government.

بہر حال مسلم لیگ اور کانگریس کے ان جھگڑوں کا انجام ملک کی تقسیم اور لاکھوں خاندانوں کی بربادی ہو گیا۔

آنکھیں کہیں ہیں دل ہی نے ہم کو کیا خراب
اور دل کہے ہے آنکھیں نے مجھ کو ڈبو دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے درد عشق
دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

کانگریس اور مسلم لیگ نے کچھ بھی کیا ہو آج ہندوستان کے مسلمان سے یہ کہنا کہ 93 فی صد مسلمان نے تقسیم کی موافقت میں رائے دی نہ صرف غلط ہے بلکہ ناممکن ہے۔ آج جو نوعمر مسلمان اکیس ۲۱ یا بائیس ۲۲ برس کے ہیں وہ تو ۴۶ء میں پیدا

نہیں ہوئے تھے یا اپنی ماؤں کی گودی میں دودھ پیتے تھے۔ آج ان کی تعداد مسلمان مردم شماری کے اعتبار سے بائیس یا اکیس فی صد ہوگی ان کا کیا قصور اور ان پر کیوں الزام دیا جائے۔ جن مسلمانوں کی عمر 42 سال سے اس وقت کم ہے۔ اس زمانہ میں انھیں رائے دینے کا حق ہی نہ تھا۔ ان کی عمر اکیس سال سے کم تھی۔ ان کی تعداد بھی اکیس بائیس فیصدی مسلمانان ہند میں ہوگی۔

اب رہے کانگریسی مسلمان ان کی تعداد بھی ملک میں خاصی تھی کم از کم دس پندرہ فیصدی ان کی تعداد بھی ہوسکتی ہے۔ اس طرح تقریباً 55 فیصدی مسلمان تو ایسے ہیں کہ وہ مسلم لیگ کو رائے دے ہی نہیں سکتے تھے۔

علاوہ بریں ۱۹۴۶ء میں ہر بالغ کو رائے دینے کا حق ہی نہ تھا۔ دس روپیہ کا زمین کا لگان دیتا ہو یا جہاں تک مجھے یاد ہے پچاس روپیہ انکم ٹیکس دیتا ہو۔ یا شاید میٹرک یا میڈل پاس ہو لہذا باقی ماندہ 45 فیصدی میں رائے دینے والوں کی تعداد تو تین چار فیصدی ہوگی۔ اس لیے کہ مسلمان تعلیمی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ اور جو اس خیال کے لوگ تھے ان میں سے یقیناً بہت بڑا حصہ پاکستان چلا گیا۔ اس تفصیل کے بعد ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں کو تقسیم ملک کا ذمہ دار ٹھہرانا ناانصافی کی انتہا ہے۔

میں اپنی کہانی کہتے کہتے سیاسی حالات بیان کرنے لگا۔ مگر سیاسی معاملات سے کنارہ کشی بھی ممکن نہیں زندگی کے ہر پہلو پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ اور اس زمانے کے سیاسی بحران کا نتیجہ تو سارے ملک پر اثر انداز تھا۔ میری رائے میں جنگ کے بعد انگریز قوم کچھ اس قدر تھک گئی تھی کہ وہ یہ چاہتی تھی کہ جس طرح بھی ہو ہندوستان کے نظم و نسق کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔ دوسری طرف امریکہ کا دوستانہ دباؤ ہندوستان کی آزادی کے واسطے مجبور کر رہا تھا۔ برٹش حکومت کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہندوستان سے ہٹ جانے کے بعد نہر سویز کے اس طرف اس کا کہیں بھی پاؤں نہ جم سکے گا۔ طاقت جہاں ہاتھ سے نکلتی ہے تو پھر نکلتی ہی چلی جاتی ہے۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو میرے ساتھ ایک جانکاہ واقعہ ہوا۔ میرے ماموں زاد بھائی راؤ عبدالحمید

خاں مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ مجھے مرحوم سے بہت محبت تھی خدا مغفرت کرے۔

یو پی کی حکومت نے زمینداری کا ختم کرنے کا قانون بنانا شروع کیا۔ مجھے اس سے تو اتفاق تھا کہ زمینداری زیادہ روز قائم نہیں رہ سکتی مگر یو۔ پی کی حکومت نے جس طرح ختم کیا مجھے اس سے اختلاف تھا۔ چونکہ زمیندار پارٹی نے الیکشن میں سولہ سترہ سال کانگریس یا سوراج پارٹی کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔ کانگریس کی اس تجویز میں انتقامی جزبہ تھا۔ میری یہ تجویز تھی کہ ایک مناسب قیمت تجویز کردی جائے اور جو کاشت کار قیمت ادا کردے اپنی زمین کا مالک ہوجائے۔ میں نے پنڈت گوبند بلبھ پنتھ سے جو یو پی کے چیف منسٹر تھے یہ کہا مگر انھوں نے نہ مانا اور جواب میں یہ کہا کہ اس کا ڈرامیٹک اثر نہیں ہوگا۔

جس کا اثر یہ ہوا کہ دیہاتی زندگی کے نظم میں ایک خلا پیدا ہوگیا زمیندار کی جگہ کوئی دوسری طاقت پیدا نہ ہوسکی اور جرائم کی زیادتی ہوگئی اور اب ہر پولیس آفیسر یہ کہتا ہے کہ زمیندار کے...... ہٹنے سے دیہاتی رقبہ میں قتل اور ڈکیتی کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا۔

میں جولائی ۴۶ء کے پندرہ سولہ تک تو حیدآباد میں ہی تھا پھر چند ماہ کے واسطے علی گڑھ آگیا اور ۴۷ء جون میں پھر حیدرآباد چلا گیا۔ میرا علم ہندوستانی سیاست کے متعلق ذاتی نہیں ہے بلکہ ان کتابوں اور اخباروں سے ہے کہ جو اس زمانہ کے حالات سے بھرے ہوئے ہیں۔ خاص کر مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب (India Wairs Freedom) اور (H.V.Hoda son) کی کتاب (The great divide) آخرالذکر کتاب سے بہت مدد ملی۔ میں ایک روزنامچہ بھی لکھتا تھا اس سے بھی بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں۔ 23 اکتوبر ۴۶ء کو میری بیٹی تسنیم کو خدا نے بیٹی عطا فرمائی۔ باری تعالیٰ خوش رکھے۔

کانگریس نے تنہا گورنمنٹ بنائی تھی مسلم لیگ نے شرکت سے انکار کیا تھا۔ مگر وائسرائے سے مزید خط و کتابت کے بعد آخرکار مسلم لیگ نے حکومت میں شرکت منظور کرلی اور پندرہ اکتوبر ۴۶ء کو یہ اعلان ہوا کہ مسٹر سرات چندر بوس۔ سر شفاعت احمد اور سید علی ظہیر کہ جو کانگریس کی وزارت میں شریک تھے۔ انھوں نے استعفیٰ دیا اور

مسلم لیگ کی طرف سے حسب ذیل حضرات شریک حکومت ہو گئے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر غضنفر علی خاں، چندری گر، اور جگندر ناتھ منڈل۔

آخر الذکر ایک شڈول کاسٹ کا ممبر تھا کہ جسے لیگ نے اس واسطے شریک کیا کہ کانگریس نے مولانا ابوالکلام کو گورنمنٹ میں لیا تھا۔

سر ناظم الدین اور نواب اسمٰعیل خاں کو بہت ناامیدی ہوئی اور مجھے بھی تعجب ہوا۔ میں اس نتیجہ پر آیا کہ مسٹر جناح نے ایسی ٹیم بنائی ہے کہ جو اپنی رائے سے کچھ نہ کرے۔ اور جناح صاحب کے حکم کی تعمیل کرے۔

آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

۱۰/ جنوری ۱۹۴۷ء کو دہلی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے ڈنر پر گیا۔ وہ ولایت میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ وہ بادشاہ اور چرچل سے بھی ملے تھے۔ اس پر مطمئن تھے کہ برٹش گورنمنٹ نے یہ مان لیا (Cabinet mission) کی تجاویز کا مطلب یہی ہے کہ جو مسلم لیگ کہتی ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گورنمنٹ میں کوئی اتحاد عمل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ڈنر اور پارٹیاں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے کانگریس اور لیگ کے نمائندوں میں نجی ملاقات بھی نہیں ہوتیں۔ بجائے شرکت عمل کے دو مختلف گروہ آمنے سامنے رہتے ہیں مجھے حیرت ہوئی کہ یہ حکومت کب تک اور کیسے چلے گی۔

مسٹر جناح مرحوم کی شخصیت ایک اہم شخصیت تھی کہ جس نے ہندوستان کی تاریخ بدل دی۔ ایک نیا ملک پاکستان پیدا کر دیا۔ ان کی قانونی قابلیت، ارادہ کی پختگی، کردار کی مضبوطی ایسی تھی کہ جسے ان کے موافق اور مخالف سب ہی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ ایک ایسے جنرل تھے کہ جس وقت تک لڑائی رہے اپنی فوج کو ہمت دلانے آگے بڑھانے اور جنگ جاری رکھنے کا جوش اور ولولہ ان کے دلوں میں پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد صلح کرنے اور ڈپلومیٹک انداز بیان سے حریف کا دل ہاتھ میں لینے کی قابلیت کی کمی تھی وہ بہت خوددار تھے مگر ان کی خودداری خودی کی حد تک پہونچتی تھی ان کے تعلقات (Lord Mountbatten) سے شگفتہ نہیں رہے۔

اور اسی واسطے مصالحت نہ ہو سکی۔ اگر مسٹر جناح اور لارڈ یا قنٹن بیٹن کے مراسم اچھے ہوتے تو میرے خیال میں بہت سی وشواس پیدا نہ ہوتیں ۲۰ رفروری ۴۷ء کو لارڈ ویول وائسرائے کی لڑکی کی شادی تھی اور سوئے اتفاق کہ اسی تاریخ کو اس کا اعلان کیا گیا کہ انہیں واپس بلا لیا جائے گا اور ہندوستان ۱۹۴۸ تک آزاد ہو جائے گا۔

لارڈ ویول کو کیوں یکا یک ان کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے بلا لیا گیا اس کا کوئی ذاتی علم مجھے نہیں ہے۔ مگر (H.V.Hodson) نے اپنی کتاب (Great divide) میں جو کچھ وجہ لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی اس تجویز سے کہ برٹش عورتیں اور بچوں کو ہندوستان سے جلد لے جانے کا انتظام کیا جائے۔ برٹش گورنمنٹ کا اختلاف تھا اور مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی راستہ جو دونوں کا متفقہ ہو۔ وہ نہیں نکال سکے۔

مجھے لارڈ یو ویول سے کافی ملنے کا موقع ملا۔ وہ ایک شریف مزاج مخلص اور صاف باطن جنرل تھے۔ وہ سیاست کے ماہر نہ تھے۔ وہ ذو معنی الفاظ کا استعمال نہ کرتے تھے اور نہ اسے پسند کرتے تھے۔ وہ خود ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے یہ کہہ دیتے تھے کہ وہ پولیٹیشین نہیں ہے۔ صاف بات کہیے۔ اور ہمارے ملک میں ہر فقرے کے معقول ہر فریق کی رائے کے مطابق نکالتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

وہ اس قدر صاف باطن تھے کہ جب میں ۱۹/ مارچ کو ان سے الوداع کہنے گیا تو میں نے ان سے یہ دریافت کیا کہ اگر مسلم لیگ اور کانگریس میں اتفاق نہ ہوا ۴۸ء میں ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے بعد حکومت کس طرح چلے گی تو انھوں نے کہا ۲۲/ مارچ کو (Lord Mountbatten) (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) دہلی آئے اور ۲۴ مارچ کو لارڈ ویول گئے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے چارج لیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہت ہی غیر معمولی قابلیت کے حامل تھے بہت ہی ذکی، ذہین اور فہیم تھے۔ وہ ایک اڈمرل بھی تھے اور ڈپلومیٹ بھی تھے وہ اپنے ارادے کے پکے اور مضبوط بھی تھے۔ اور اختلاف اس طرح کرتے تھے کہ جس سے مخالف فریق کے دل میں خراش نہ ہو، اسے ناگواری نہ ہو وہ ناخوشگوار بات کو بھی خوشگوار طریقہ سے کہتے تھے بقول غالب ۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھاکے بے مزہ نہ ہوا

انھوں نے کانگریس لیڈروں کو بالکل اپنے ہاتھ میں لے لیا اور صورت حال اس طرح پیش کیا کہ کانگریس ملک کی تقسیم پر راضی ہوگئی پنڈت جواہر لعل نہرو سے ان کے تعلقات بہت ہی شگفتہ تھے بخلاف اس کے مسٹر جناح سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ رہے اس کی وجہ مسٹر جناح کی مزاجی کیفیت تھی۔

اس کا احساس تو مجھے اس زمانے میں بھی تھا۔ مگر مسٹر ایچ وی ہوڈنس کی کتاب (Grate drvide) پڑھنے کے بعد یقین ہوگیا کہ مسٹر جناح سے قلباً وہ خوش نہ تھے۔ اس کتاب میں وائسرائے کے روزنامچہ کے اقتباس درج ہیں جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔

۲۰ر مارچ ۴۷ء کو میں جنرل آکسکن لک (کمانڈر ان چیف) سے ملا۔ وہ پنجاب کے حالات سے بہت پریشان تھے۔ ان کا بجا طور پر یہ خیال تھا کہ فوجی سپاہی جب رخصت لیکر گھر جائے گا اور فرقہ وارانہ تصادم کا حال دیکھے گا تو ناممکن ہے کہ وہ متاثر نہ ہوں۔ اور فوج کا ناطرفدار رہنا ممکن نہ ہوگا۔

۲۹ر مارچ ۴۷ء میں لکھنؤ گیا اور گورنمنٹ ہاؤس میں مقیم ہوا۔

سات بجے شام کو گورنر سے مفصل گفتگو ہوئی۔ اس زمانے میں کسی کو مستقبل کی خبر نہ تھی۔ سیاسی مطلع اس درجہ غبار آلودہ ہوگیا تھا کہ کوئی بھی صاف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گورنر وائسرائے لارڈ ویول کے شاکی تھے وہ گورنروں سے مشورہ نہیں کرتے۔ گورنر اپنے وزراء کے بھی شاکی تھے وہ اپنے وزراء میں سمپورنانند کو پسند کرتے تھے مگر پنتھ جی اور رفیع مرحوم کو پسند نہیں کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ مرکز کی طرح لیگ اور کانگریس کی مشترک حکومتیں صوبوں میں بھی ہونی چاہئیں۔ مجھے اس سے اتفاق تھا۔

وہ یہ کہتے تھے کہ خلیق الزماں کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان کو تقسیم کردیا جائے اور فوج کو بھی مذہبی اعتبار سے تقسیم کردیا جائے۔

۵ر اپریل ۴۷ء کو نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ملا۔ وہ اس پر تیار ہیں کہ

پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بعد پاکستان قبول کر لینا ہوگا۔ خاص کر اس قتل و غارتگری کے بعد تو پاکستان کا بننا لازمی تھا۔

اسی زمانے میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کا ایک افتخار نامہ آیا جس کا منشا یہ تھا۔ کہ میں ایک تحفہ بطور یادگار ملازمت پنج سالہ سالگرہ مبارک پر پیش کروں۔ میں نے ایک بڑا سگار رکھنے کا چاندی کا بکس ہملٹن سے جو ایک مشہور انگلش جوہری کی فرم تھا بنوایا۔ اس کے اوپر سونے کے پتر پر حیدر آباد کا نقشہ اور نقشہ کے وسط میں حیدر آباد کا تاج جس میں پلیٹنیم میں ہیرے جڑے تھے چسپاں کر دیا۔ سالگرہ پر مجھے طلب فرمایا تھا لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ حیدر آباد میں سر مرزا کی مخالفت زور پر تھی اور حضور نظام خود بھی حسب عادت اب خوش نہیں رہے تھے۔ لہذا ایسی حالت میں میرا جانا سر مرزا اسماعیل کو غلط فہمی پیدا کرتا۔ لوگ مجھ سے ملنے آتے اور چہ میگوئیاں شروع ہوتیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ سر مرزا یہ خیال کرتے کہ ان کی مخالفت کا اگر مرکز نہیں ہوں تو کم از کم مجھے اس سے اتفاق رائے ہے۔ میں نے اپنے بیٹے ابن سعید کو مع تحفہ اور عریضہ کے بھیجا۔ سوئے مزاجی کی وجہ سے حاضری سے معذرت چاہی۔ ابن سعید نے نذر پیش کی اور تحفہ گذرانا۔ حضور نظام نے اسے بہت پسند فرمایا۔

۲۷ مئی ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ گیا تھا۔ میرے ایک بہت ہی عزیز دوست مہاراجہ اعجاز رسول جہانگیر آباد کا انتقال 20 اور 21 مئی کے درمیانی شب میں ہو گیا تھا تعزیت کے سلسلے میں جہانگیر آباد جانا تھا۔ میں راجہ صاحب سلیم پور کے پاس ٹھہرا ہوا تھا ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال کا تار ملا فون پر علی گڑھ سے کہا گیا کہ ہز ہائنس مجھے ۳۰ مئی سے پہلے ملنے کے واسطے بلاتے ہیں۔ تار ۲۹ کو ملا میرا جانا ممکن نہ تھا۔ میں جہانگیر آباد چلا گیا بڑی مہارانی کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا کہ ریاست کو کورٹ ہونے سے بچا لے مگر جب چھوٹی مہارانی کے پاس پہنچا تو پردے کے ادھر باوجود ان کی کوشش کے ان کی رونے اور ہچکیوں کی آواز آرہی تھی۔ ان کے بڑے لڑکے جمی جن کی عمر ساڑھے چار برس ہوگی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہا اندر آؤ امی کا کیا حال ہے، میرا دل تڑپ گیا۔ عجیب حالت ہوئی میں سوائے دعا کے کیا کر سکتا تھا۔ خدا ان یتیم بچوں پر رحم فرما۔

۲۹ مئی ۱۹۴۷ء کو میں نے ہزہائینس بھوپال کو تار کردیا کہ حاضر نہ ہوسکوں گا اور دہلی آ کر ملوں گا۔

۳۰ مئی کو حضور نظام کا افتخار نامہ مورخہ ۲۷ مئی ملا جس میں اعلیٰ حضرت نے مجھے حیدرآباد ایک سال کے واسطے طلب فرمایا تھا۔ جس کی نقل درج ہے۔

STRICTLY CONFIDENTIAL

M.O.A.K
NIZAM VII

Hyderabad (Deccan)
27th May, 1947

My dear Nawab Sahib of Chhatari,

Probably you are aware of what adverse circumstances are prevailing inside and outside the country against Sir Mirza's regime. Infact due to this he has asked me to relieve him of his duties as President of the Council without further delay. In view of this I have discussed the whole question of his successor with the British Resident, I mean Mr. Herbert who specially came down from Oudh recently for this purpose.

However what was decided between him and myself was as follows:

Namely time is too short, so it is difficult to select a capable and trustworthy man from outside the state since no one is fit for such a high post in Hyderabad.

Secondly if a man is selected, he being an outsider will require knowledge of local conditions and also he will require some time to get the insight of the administration for a year or so before he begins to work; but on the other hand this delay can not be allowed since important matters are on the anvil or under consideration now which require careful handling. Therefore the Resident's suggestion (provided I agree with him) is that you should be allowed to revert to your former position as a President of Council for a year since you are well acquainted with the affairs of the State after rendering loyal services for a period of 5 years during the critical period of war.

As to the term of appointment it was decided that you should be given the same term which you enjoyed before. Plus

your Rs. 2000/- as pension. I told Resident that I entirely agree with his wise suggestion and hence this letter of mine on the subject.

(2) Will you please let me know whether you accept my offer as mentioned above. After hearing from you and in case you accept it, I shall let you know when to come to take charge from Sir Mehdi Yar Jung and probably you will have to come here sometime in June or failing that early in July, as the case may be. Because the situation being critical I must handle important affairs of the State with tact and sagacity and I am sure your re-appointment will be looked upon with favour (though it may be of short duration) on all hands.

(3) I may add that both the Residents i.e., Sir Arther Lothian and Mr. Herbert spoke to me in high terms about you as regard your family position and also your personal character to say nothing of the high posts you held in the times gone by.

(4) Sir Walter Monckton is here and with him you will work who is the constitution adviser to the Hyderabad Govt. in whom I repose my confidence just in the same way as I do in you. Please treat the contents of this letter as very confidential till I announce my decision in the matter in the Gazette extraordinary in near future otherwise if it leaks out, the fear is that dangerous persons may spoil the situation in order to get their own ends.

Yours Sincerely
M.O.A.K

اخباروں میں یہ خبر تو عرصے سے گشت کر رہی تھی کہ موجودہ صدر اعظم اور نظام کے تعلقات میں کشیدگی ہوگئی ہے۔ مگر اتنی جلدی صدر اعظم کی تبدیلی انتظامی نقطہ نظر سے درست نہ تھی۔ حیدرآباد کی بہت سی دشواریوں کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضور نظام تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اپنے صدر اعظم سے غیر مطمئن ہو جاتے تھے اور بقول نواب مہدی یار جنگ مرحوم اپنی گورنمنٹ کے خود (Leader of opposition) (مخالف پارٹی کے لیڈر) کے فرائض انجام دینے لگتے تھے۔ ۳۱ رمئی کو میں دہلی گیا۔ سر نارڈ کوفیلڈ سے

ملا۔ یہ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ میں وائسرائے کے مشیر تھے پھر ان کے سکریٹری مسٹر گرفن سے ملا۔ ان دونوں کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ عنقریب (Para Moranty) ختم ہوجائے گی اور نظام آزاد ہیں جسے چاہیں رکھیں۔ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کوئی مدد دے سکے گا ''پیراماؤنسی'' ایک ایسے اختیارات حکومت ہند نے اپنے ہاتھ میں رکھ لیے تھے کہ جس سے وہ والیان ملک کے داخلی اور خارجی ہر معاملہ میں دخل دے سکتے تھے۔ والیان ملک اسے بہت ناپسند کرتے تھے مگر اسی مداخلت کے ساتھ والیان ملک کے تحفظ کی بھی حکومت ہند ذمہ دار تھی اور ''پیراماؤنسی'' کے ساتھ ساتھ ریاستیں بھی ختم ہوگئیں۔ خدا جانے آج والیان ملک کی کیا رائے ہے جبکہ ریاست لیتے وقت جو عہد و پیمان ان کے دوسرے حقوق (Priry pure) صرف خاص کی رقم کے واسطے کیے گئے تھے۔ وہ بھی خطرے میں ہیں۔ ۳۱/مئی کی شام کو سر والٹر مانکٹن جو بعد کو لارڈ مانکپن ہوگئے تھے۔ مجھ سے ملنے آئے میں دہلی میں میڈن ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔

سر والٹر مونکٹن بہت بلند پایہ بیرسٹر تھے۔ یہ انگلستان کے شاہی خاندان کے مشیر قانونی تھے اور اس زمانہ میں حیدرآباد کے مشیر بھی تھے۔ حیدرآباد سے انھیں ایک ہزار یومیہ فیس دی جاتی تھی اور ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۶ء میں مہینوں وہ حیدرآباد کی قانونی خدمت کرتے رہے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ہز ہائینس بھوپال نے جو مجھے تار دیا تھا اس کی وجہ یہ بھی کہ سر والٹر کے ذریعہ سے H.E.H نے نواب صاحب بھوپال کو خط لکھا تھا کہ وہ بھی مجھ پر زور دیں اور میں دوبارہ حیدرآباد چلا جاؤں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا جب H.E.H نے سرفراز اسماعیل کا تقرر کیا تو کسی خط میں نواب صاحب بھوپال کو اس کی اطلاع دی تو ہز ہائینس بھوپال نے اپنے جواب میں یہ فقرہ بھی لکھدیا:

I hope he will Prove loyal to your Exalled Highness

نظام نے وہ خط سرفراز کو دکھایا اور سر مرزا کو نواب صاحب بھوپال سے ناگواری ہوگئی۔

سر والٹر نے مجھ سے کہا کہ مجھے حیدرآباد واپس چلنا چاہیے انھوں نے دوستانہ کرم سے یہ بھی کہا۔

"I will be a pleased to work with you "

میں ان سے اپنی دشواریاں بیان کرتا رہا۔ چونکہ پہلے بھی میرا اسٹیفرز د کرپس کی مشن کے زمانہ میں مشیر قانونی کی خدمت انجام دے چکے تھے۔ میرے مشکلات کو جانتے تھے۔ حیدرآباد کی مشکلات میں سب سے بڑی وجہ تو خود نظام کی مزاجی کیفیت تھی۔ غیر متوقع تغیرات ان کے مزاج میں ایسے لوگوں کو در خور تھا کہ جو اس زمانہ کے عظیم انقلاب کے تقاضوں اور مصالح کو نہ سمجھ سکتے تھے اور نہ اس کی اہلیت رکھتے تھے۔ سر والٹر کو اصرار تھا کہ میں فوراً جواب دوں۔ میں نے وعدہ کیا کہ ۳ جون کو بتا سکوں گا میں دو تین روز سوچنا چاہتا تھا۔

سر والٹر مانکٹن نے یہ بھی کہا کہ علی یار جنگ اب مرزا کے مخالف تھے مجھے اس پر تعجب ہوا اور میں نے کہا:

"At one time he was talking Forward to iningas coming"

پھر علی یاور جنگ آئے۔ بڑی محبت سے معانقہ کیا۔ کچھ ایسے واقعات بیان کرتے رہے کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے تعلقات سر مرزا سے کچھ شگفتہ نہیں رہے۔ پھر مقبول آگئے وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں اس تجویز کو مان لوں۔ ا رجون ۱۹۴۷ء کو ہز ہائنیس بھوپال ہوائی جہاز سے دہلی آگئے۔ میں ملنے آگیا شعیب مرحوم اور خلیق الزماں سے باتیں رہیں۔ پھر ہز ہائینس سے ملاوہ بھی اسی پر زور دیتے رہے کہ میں حیدرآباد چلا جاؤں۔ جب میں نے حیدرآباد کی دشواریاں بیان کیں تو کہنے لگے کہ میں خود حیدرآباد آؤں گا اور کوئی دشواری نہیں رہے گی۔

اسی روز میں باغپت چلا گیا۔ وہاں اختر پسر نواب جمشید علی خاں اور عبدالحمید مرحوم کی لڑکی کی شادی تھی۔ میں نے وہیں سے H.E.A کے والا نامہ کی رسید تار سے دیدی۔

۳ رجون ۴۷ء کو باغپت سے دہلی آیا اور لارڈ ازمے کے مکان پر سر والٹر مانکن سے کہہ دیا کہ میں منظور کرتا ہوں حیدرآباد چلوں گا۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں (Dominion Stats) پر راضی ہیں۔ ان کی رائے تھی کہ حیدرآباد کو کسی یونین میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ اس طرز کا بیان

حیدرآباد کی طرف سے ہوسکتا ہے۔ انھوں نے جیب سے نکال کر جو مسودہ دکھایا وہ اسی روش پر تھا سر والٹر ہنس کر کہنے لگے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا لکھایا مسودہ ہے۔

پھر ہز ہائینس بھوپال سے ملا وہاں معلوم ہوا کہ مسٹر جناح سے ڈھائی بجے میری ملاقات کا وقت طے ہوگیا ہے۔ میں نے ان سے کہدیا کہ میں حیدرآباد جانے کے واسطے راضی ہوں ہز ہائینس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو والیان ملک کے مشیر قانونی کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں۔

ڈھائی بجے مسٹر جناح سے ملا۔ وہ اس پر مصر تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو جا کر چارج لے لوں۔ میں نے کہا کہ جب تک چارج لینے کی تاریخ نظام مقرر نہ کریں۔ میں چارج کیسے لے لوں۔ انھیں جلدی اس وجہ سے تھی کہ حیدرآباد سے یہ اعلان ہوجائے کہ وہ آئین ساز جماعت میں شریک نہ ہوگا، یعنی آزاد رہے گا۔

یہ بھی خدا کی شان ہے کہ جب ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد پہلی بار گیا اور مسٹر جناح حیدرآباد کے اسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں میں مقیم ہوا تو میرا تقرر کی مخالفت کی تھی اور اخبار میں یہ اعلان کیا کہ اگر مجھے صدر اعظم ہونے کے سلسلہ میں جلسے ہوں تو مسلم لیگ کے لوگ شریک نہ ہوں اور میرا زمانہ پنج سالہ ختم ہونے پر یہ کہا:

"He was a square peg in a round hole"

اور اب میرے حیدرآباد جانے پر مصر تھے۔ شام کے سات بجے لارڈ ازمے سے ملا۔ وہاں سر والٹر مانکٹن اور سر ایرک میوں بھی تھے۔ میں نے وائسرائے کو ان کی کامیابی پر مبارکبادی۔

شام کو صغیر صاحب مرحوم سے سکندرآباد میں ملا۔ ان سے معلوم ہوا کہ فرقہ وارانہ قتل و غارتگری پھر شروع ہوگئی۔ رات گئے تک علی گڑھ آ گیا۔

۱۴رجون ۱۹۴۷ء کو میں نے H.E.H کے خط کا جواب پیش کیا جس میں میں نے لکھا کہ میں حاضر ہونے کو تیار ہوں گو میرا خیال کسی ملازمت کا تھا نہ آئندہ سیاست میں حصہ لینے کا تھا۔ لیکن آپ کا حکم دعوت فرض ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔ حضور نظام نے جو والا نامہ میں شرائط لکھے تھے۔ میں نے یہ عرض کیا کہ تنخواہ یا وقت ملازمت

کے تعین کی ضرورت نہیں تنخواہ کا سوال تو حضور کے اور میرے درمیان آتا ہی نہیں رہا وقت تو جب آپ چاہیں فرما سکتے ہیں۔ میں واپس چلا جاؤں گا یا جب مجھے یہ ظاہر ہوا کہ سرکار کی خدمت بوجہ احسن نہیں کر سکتا تو میں عرض کر دونگا۔

۵/جون H.E.H کا تار ملا جس میں حکم تھا کہ ۹/جون تک آ کر چارج لے لوں ۶/جون ۴۷ء کو دہلی گیا اور مسز نائیڈو کے ساتھ مہاتما جی سے ملا۔

میں نے کہا کہ مہاتما جی جب پہلی بار چھ برس ہوئے میں حیدرآباد گیا تھا تو آپ نے مجھے مبارک باد کا خط لکھا تھا۔ اب میں پھر حیدرآباد جا رہا ہوں۔ آپ کی آشیر باد چاہتا ہوں مہاتما جی نے کہا کہ انکی آشیر باد اس شرط کے ساتھ ہے کہ حیدرآباد کے لوگوں کو خوش رکھوں۔ میں نے کہا کہ مسز نائیڈو حیدرآباد کی ہیں ان سے پوچھئے اور یوپی کے متعلق پنتھ جی سے پوچھئے کہ میں نے کبھی فرقہ وارانہ نظر سے کوئی کام کیا۔ یا کوئی شخص روپیہ کی صورت میں میری قیمت لگا سکا۔ مہاتما جی نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص یہ باتیں رکھتا ہو تو بڑی بات ہے۔ مسز نائیڈو بہت ہی نیک مزاج خاتون تھیں انھوں نے بہت اچھے الفاظ میرے متعلق فرمائے۔

رخصت ہوتے وقت مہاتما جی نے کہا ''خوش رہو اور خوش رکھو'' مہاتما جی نے ایسا جامع اور پر معانی فقرہ کہا کہ جسے میں کبھی نہ بھول سکا۔ میں سر شنکر لال کے ہاں ٹھہرا تھا۔ علی گڑھ واپس آ گیا۔ ۸/جون کو علی گڑھ سے چل کر سر شنکر لال کے ہاں پہونچا۔ صغیر مرحوم بھی ساتھ آئے نواب سر جمشید علی خاں بھی آ گئے اور ۹/جون ۴۷ء کو ہوائی جہاز سے روانہ ہوا۔ صغیر صاحب بھی باوجود میرے منع کرنے کے ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے ۴۵-۱۲ پر خیر و عافیت سے حیدرآباد پہونچے۔ ہوائی اسٹیشن پر سر والٹر مانکٹن اور نواب مہدی یار جنگ جو سر مرزا کے بعد عارضی صدر اعظم کے فرائض انجام دے رہے تھے موجود تھے اور دوسرے بہت سے حضرات تشریف لائے تھے۔ چار بجے شام کے اعلیٰ حضرت نظام نے نظری باغ میں طلب فرمایا مجھے دیکھ کر فرمایا آپ آ گئے آپ آ گئے میں نے نذر پیش کی۔ بہت مسرور اور مطمئن معلوم ہوتے تھے۔

اسی روز شام کو کونسل کی میٹنگ ہوئی (کیبنٹ کو کونسل کہتے ہیں) جس میں

اس اعلان کے مسودہ کو طے کرنا تھا کہ نظام کی طرف سے کہا جائے عبدالرحیم جو وزراء میں اسمبلی کے نمائندے تھے اس پر زور دے رہے تھے کہ اعلان خودمختاری بھی ابھی کیا جائے۔ سر والٹر مشیر قانونی نے اس سے اختلاف کیا ان کے مشورے کا منشا قانونی صورت بیان کرنا تھا کہ برٹش حکومت کے جانے کے بعد حیدرآباد قانوناً خودمختار ہونے کی مستحق ہے۔ اس کے معنی اعلان خودمختاری نہ تھے۔ ۱۰ جون کو میں اور سر والٹر سرکار میں حاضر ہوئے اور اس اعلان پر گفتگو ہوئی۔ اسی روز شام کو قاسم رضوی مجھ سے آکر ملے ان کے نام سے کون واقف نہیں یہ اتحاد المسلمین کے صدر اور رضاکاروں کے لیڈر تھے اور حیدرآباد کی مصائب کی ذمہ داری ان کی اور ان کی پارٹی کی ہے وہ صاف گو اور انتہا پسند معلوم ہوتے تھے۔ جوش کی بہت زیادتی مگر ہوش اور مصلحت بینی کی کمی صاف ظاہر ہوتی تھی۔ انہوں نے سرکار کو ایک عریضہ بھیجا جس میں یہ خواہش کی کہ اعلان خودمختاری ابھی کیا جائے۔ وہ مزاجاً بہت جلد بدگمان ہو جاتے تھے۔

چنانچہ اس عریضہ میں یہ بھی تھا کہ چونکہ میں ایک کانگریس کی حکومت کی رعایا ہوں لہذا کانگریس کا اثر ہونا مجھ پر لازمی ہے لہذا میرے ساتھ دو وزراء حیدرآباد کے باشندے بھی ہونے چاہئیں جب حکومت ہند سے گفت و شنید ہو۔

انہیں اس انقلاب عظیم کا اندازہ ہی نہ تھا کہ جب برٹش حکومت اس امپائر کا چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ جس امپائر پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ برٹن کی حکومت سمندر کی لہروں پر بھی ہے تو تنہا حیدرآباد برٹش کے چلے جانے کے بعد ہندوستان کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا۔ حیدرآباد میں مسلمانوں کی آبادی فقط تیرہ فیصدی چاروں طرف سے کانگریس حکومتوں سے گھرا ہوا۔ خود ہتھیار بنانا تو درکنار کارتوس تک نہیں بناتے تھے کوئی تعلق دنیا کے کسی حصہ سے نہ سمندر کے اور نہ خشکی کے ذریعہ، لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

ایسی نازک صورت میں گفت و شنید کرنا آسان نہ تھا اور خودمختاری کا اعلان کس قدر ناقابل عمل تھا۔ اسی روز شام کو کاظم یار جنگ (منسٹر پیشی) کے ذریعہ سے سرکار کا پیام آیا کہ اعلان میں کچھ ترمیم ہے سر والٹر سے مشورہ کیا جائے وہ ترمیم بالکل

وہ ہی تھی جو قاسم رضوی نے مجھے سنائی تھی جب ایسے راز یوں طشت از بام ہوں تو کیسے کام کیا جائے یہی وہ دشواریاں تھیں کہ جن کی وجہ سے مجھے حیدرآباد واپس آنے میں تذبذب تھا۔ حکمراں کو رائے دینے کا حق تو انہی کو ہونا چاہئے کہ جو اس کے نتائج اور عواقب کے ذمہ دار بھی ہوں۔ ایسے ہی لوگوں کے مشورے تھے کہ جو لائق علی صاحب کی وزارت کے زمانے میں پولیس ایکشن کی مصیبت اہل حیدرآباد پر اور ذلت حکومت وقت پر لائے۔ طاقت بغیر ذمہ داری بے حد خطرناک ہے اور ذمہ داری بغیر طاقت مفلوج ہو جاتی ہے۔ ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء میں اور سر والٹر سرکار میں حاضر ہوئے اور جس ترمیم کا اوپر ذکر کر چکا ہوں اسے قبول کرنے سے سر والٹر مانکٹن نے بحیثیت مشیر قانونی انکار کیا اور نظام کی طرف سے بھی کوئی اصرار نہیں ہوا۔ مسٹر مینسل جو ریزیڈنٹ حیدرآباد کے سکریٹری تھے لنچ پر آئے اور یہ پیام لائے کہ ابھی اعلان جو کونسل نے پاس کیا تھا، نہ کیا جائے میں نے کہا کہ وزراء کی کونسل اسے پاس کر چکی نظام سے بھی منظوری ہو گئی اب کیسے روکا جا سکتا ہے۔ باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے تھا کہ انہیں قلباً اختلاف نہ تھا مگر ادائیگی فرض ضروری تھا۔ میں ایک روز کے واسطے علی گڑھ چلا گیا اور وہاں سے ۱۶ر جون کو دہلی گیا۔

مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی ان کا طرز گفتگو بالکل یک طرفہ تھا وہ اس پر زور دیتے تھے کہ سر سی. پی. راماسوامی آئر (جو ریاست ٹراونکور کے دیوان یعنی چیف منسٹر تھے) کی طرح حکومت ہند سے مجھے بھی لڑنا چاہئے۔

میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں پنڈت نہرو سے بھی ملوں گا۔ بس اس پر بگڑ گئے اور کہا "تم اس مغرور سے مل کر کیوں اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو۔ طے ہو جائے گا"، بہر حال جناح لڑائی کے موڈ میں تھے۔

شام کے ساڑھے چار بجے پنڈت جی سے ملا۔ وہ بہت خلق سے ملے۔ مگر کچھ چپ چپ اور گھٹے گھٹے سے تھے۔ میں نے حیدرآباد کی پوزیشن کے متعلق کہا کہ نظام کا موجودہ طرز کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جب برٹش حکومت نے ریاستوں کا فیڈریشن چاہا تھا تب بھی نظام نے مخالفت کی تھی مگر حیدرآباد ایسے جملہ معاملات میں

معاہدے کریگا اور دوستانہ تعلقات رکھے گا وہ چپ سنتے رہے کہا کچھ نہیں۔

۱۷رجون ۱۹۴۸ء صبح سردار پٹیل سے ملا۔ مجھے ایک صفت انکی بہت پسند آئی۔ وہ مختلف نظریوں کے غلام نہ تھے وہ قابل عمل نظریہ اور اصول میں نا قابل عمل نظریہ میں فرق کرتے تھے۔ وہ خیالی دنیا سے الگ عملی دنیا کے ماہر اور قابل عمل پروگرام کے قائل تھے۔

میں نے ان سے کہا کہ (Law and Order) خراب ہو رہا ہے انھیں اتفاق تھا۔ میں نے کہا۔ کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کی پارٹی کے مقامی لیڈر ملازمین سرکار کو برا بھلا کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ پہلے ان کا کام فقط شورش پھیلانا تھا اور اب انتظام کرنا۔ اور۔ ہر شورش کو روکنا ان کا فرض ہے، انہیں، اس سے اتفاق تھا۔

پھر کمیونسٹ اور سوشلسٹ کا ذکر آیا انھیں اس سے بھی اتفاق تھا کہ دونوں میں نتیجہ کے اعتبار سے چنداں فرق نہیں ہے اور اس کا انسداد ضروری ہے ورنہ چین کا سا حال ہو جائے گا۔ پھر حیدر آباد کا ذکر آیا۔ اور جو اعلان حیدر آباد نے کیا تھا اس پر بحث ہوئی۔ سردار پٹیل نے کہا کہ اگر تمام ریاستیں خود مختار ہوں تو کام کیسے چلے گا۔ میں نے کہا جہاں تک حیدر آباد کا تعلق ہے۔ اس مقصد کو معاہدوں کے ذریعہ سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ چلتے وقت وہ کہنے لگے کہ امید ہے کہ حیدر آباد میں فرقہ وارانہ رنگ کو انتظام میں دخل نہ ہوگا میں نے کہا مستقبل کے واسطے وعدے کر لینا آسان ہے مگر میرا تو ماضی کا طرز میری ضمانت ہے۔ وہ کہنے لگے جبھی تو میں نے آپ سے کہا۔ میں جانتا ہوں آپ فرقہ وارانہ طرز عمل پسند نہیں کرتے۔

اسی تاریخ کو ڈاکٹر راجندر پرشاد سے بھی ملاقات ہوئی میں نے ان سے کہا کہ جس طرح کانگریس زمینداری ختم کر رہی ہے اس طرح تو کمیونسٹ پیدا ہونگے۔ یہ زمینداری خریدی جائے اور کاشتکاروں کو مالک آراضی بنا دیا جائے تو پھر کمیونزم کے واسطے گنجائش نہ رہے گی۔ اگر گورنمنٹ خود زمیندار بنی تو کاشتکار آئندہ گورنمنٹ سے بھی متنفر ہو جائے گا۔ پھر انتظامی خرابیوں اور (Law and order) کی طرف میں نے توجہ دلائی اُن کا خیال تھا کہ مسلمان ملازمین گورنمنٹ کے ساتھ تعاون نہیں کرتے میں۔ نے کہا کہ ملازمین میں فرقہ وارانہ جذبات تو کبھی نہ تھے۔ ہاں اس وقت ہندو

ہوں یا مسلمان ملازمین سرکار پریشان بہت ہیں۔ ان کا اطمینان قلب کام میں سہولت کا باعث ہوگا۔

اسی روز سردار بلدیو سنگھ سے ملا یہ کانگریس کی وزارت میں وزیر دفاع تھے ان سے ملک کی تقسیم کے متعلق جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سکھ پاکستان کے خلاف نہیں ہیں مگر انہیں یہ بتایا جائے کہ پاکستان میں اُن کی کیا پوزیشن ہوگی۔ وہ کہتے تھے کہ انھوں نے یہ مسٹر جناح سے کہا جب یہ ولایت میں تھے۔ لیکن مسٹر جناح نے کہا کہ ''یہ مجھ پر چھوڑ دو''۔ ظاہر ہے کہ سکھوں کی اس سے کیا اطمینان ہوتا۔ میں نے ان سے کہا آپ بتائیں کہ سکھ کیا چاہتے ہیں۔ بقول اُن کے سکھوں کا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان کے اندر ایک آزاد سکھ ریاست ہو اور ملازمتوں میں تحفظات دیے جائیں۔

سر والٹر مونکٹن اور لارڈ ماؤنٹ بٹن نئے وائسرائے اور گورنر جنرل سے ملے میں نے اسی روز کی ڈائری کے اقتباسات سے لکھ دیا ہے۔ سر والٹر اور مین وائسرائے سے ملے۔ اُن کی بے حد خلیق دلچسپ شخصیت ہے۔ (Lord Wavell) کے برعکس بہت باتیں کرتے ہیں۔ میں نے جاتے ہی انھیں مبارک باد دی کہ آپ نے ایک ایسے معاملہ کو جو اب تک مرہون کامیاب نہ ہوا تھا کامیاب بنایا اور آپ نے دونوں حصوں سے (Dominion Status) ڈومینین اسٹیٹس تسلیم کرالیا اور ہندوستان اور پاکستان کامن ویلتھ Comman wealth سے باہر نہ گئے اور میں نے بھی کہا کہ آئیدہ یہ دونوں کامن ویلتھ سے باہر نہ جائیں گے پھر وہ کہنے لگے کہ میں تم سے کہتا ہوں تمہارے اور والٹر کے سامنے مجھے بات کھل کر کہنے میں پس و پیش نہیں ہے''۔ پھر والیان ملک کے مستقبل کے متعلق گفتگو رہی۔ اس کی تفصیل اب بیکار ہے۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اب نہ والیان ملک رہے نہ ریاستیں یہاں تک کہ اُن کے مقرر کیے (Priry Purse) بھی باقی نہیں تو اُن کے متعلق پرانی باتیں داستان پارینہ بیکار ہیں۔

وائسرائے مجھ پر زور دیتے رہے کہ سر سی۔ پی کی طرح بار بار بیانات دیکر کانگریس کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ خواہ مخواہ آپ لوگوں پر حملہ کرنے پر مجبور ہوں''۔

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کانگریس گورنمنٹ خود اتنی پریشان اور مصروف ہے کہ انھیں کسی پر حملہ کرنے کی فرصت نہیں لیکن جب انہیں بار بار چیلنج کیا جائے گا تو وہ ریاست کی رعایا کو بھڑکائیں گے اور ریاستوں کی دشواریاں بڑھائیں گے اور اس طرح آپ کی دشواریاں بڑھیں گی۔ وائسرائے نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے سرسی. پی راماسوامی آئر دیوان ٹراونکور سے یہ صاف کہدیا کہ ایسی حالت میں اُن کی وزارت اور مہاراجہ کی گدی کا رعایا کے ہاتھوں خطرہ میں آنیکا اندیشہ ہے''۔ سرسی. پی یہ چاہتے تھے کہ ٹراونکور کو آزاد ہونا چاہئے اور مہاراجہ نے (Accession) منظور کیا یعنی ہندوستان کے ساتھ شرکت قبول کی۔

وائسرائے نے اس طرف بھی توجہ دلائی کی حیدرآباد کے لوگوں کو سیاسی حقوق دیئے جائیں۔ دوران تقریر میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ پانچسو ۵۰۰ ریاستیں ہیں ان میں تفریق کیسے ہو میں نے کہا کہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو معاہدے (Treaties) کئے گئے ہیں ان کے اعتبار سے والیان ریاست میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نظام نے کوئی تار بادشاہ کو دیا تھا جو گورنمنٹ برطانیہ کے سامنے رکھا گیا مگر H.M.G نے یہ فیصلہ کیا کہ دو ڈومنین سے زیادہ ڈومنین بنانا ممکن نہ ہوگا یہ تار اس زمانہ میں دیا گیا ہوگا۔ جب میں کچھ زمانہ کے واسطے حیدرآباد سے چلا گیا تھا پھر وائسرائے نے کہا'' خودمختار ریاستوں کے تعلقات H.M.G سے براہِ راست ہوسکتے ہیں۔ لیکن ایسا فوجی امداد بہ وقت ضرورت نہ دے سکیں گے۔ ہزایکسی لینی نے دوران تقریر میں یہ بھی کہا کہ اس پر اصرار نہ کیجئے کہ H.M.G اور ریاستوں کو تعلقات کو زیادہ صاف ہونگی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان باتوں کو اظہار ہو اور سیاسی جماعتیں بدگمان ہوں۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ نئی (Dominion) سے تعلقات قائم کرنے ہونگے۔

میں نے کہا کہ ہم اس پر تیار ہیں۔ میں نے زبانی بھی کہا ہے اور حیدرآباد سے پنڈت جواہرلال نہرو کو خط بھی لکھوں گا کہ ہم گفت وشنید کے واسطے تیار ہیں۔ وائسرائے جولائی میں حیدرآباد میں آنے کو تیار تھے مگر نظام نے بجائے جولائی کے اگست کے واسطے لکھا۔ وائسرائے نے اسی ملاقات میں کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ نظام

نے بجائے جولائی کے اگست کیوں لکھا ہے۔ مگر اگست میں اتنا کام ہوگا کہ انھیں دم مارنے کی فرصت نہ ہوگی۔ لیکن اگر پندرہ اگست کے بعد وہ ہندوستان میں رہے اور اگر ریاست حیدرآباد اور گورنمنٹ میں تعلقات دوستانہ رہے تو وہ آسکیں گے۔

اس وقت انھیں حیدرآباد آنے سے روکنا ایک غلطی تھی۔ وائسرائے اگر کچھ مدد کرسکتے تھے تو ۱۰ اراگست سے پہلے ہی کرسکتے تھے۔ اس کے بعد وہ وائسرائے نہ تھے فقط گورنر جنرل تھے۔ اور اپنی حکومت کی رائے پر عمل کرنا ان کا آئینی فرض تھا۔

اس وقت تک حالات ایسے تھے کہ مستقبل کا صحیح اندازہ جہاں تک والیان ملک کا تعلق تھا نہ وائسرائے کو تھا اور نہ گورنمنٹ ہندوستان کو تھا۔ وائسرائے نے یہ بھی کہا تھا کہ نئی گورنمنٹ کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کہ والیان ملک شاہ انگلستان سے براہ راست تعلق رکھیں اور انھیں خطابات دئے جائیں یہ ایک ایسی تجویز تھی کہ جو مہمل کہے جانے کے قابل ہے یہ ہندوستان کی گورنمنٹ اور والیان ملک کے درمیان اور بھی شکوک اور مغائرت پیدا کردیتی۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ بادشاہ خود بھی پرنس سے تعلق کے انقطاع کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ (Paramounty) تو نہیں رہے گی لیکن (Indian Dominion) کا بڑا بھائی ریاست کے چھوٹے بھائی کو ضرور متاثر کرے گا۔

اس گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آئندہ ہونے والے حالات کی صحیح تصویر ان کے دماغ میں نہ تھی۔ ۱۷رجون کے روزنامچہ میں یہ بھی ہے کہ میں نے لیاقت علی خاں مرحوم کے ساتھ لنچ کیا اس ملاقات میں مرحوم نے مجھ سے کہا ''جب جناح صاحب نے مسلم لیگ کے ممبر گورنمنٹ کے واسطے انتخاب کئے تو ان سے کہا کہ میں نے ایسی ٹیم دی ہے جو تمہارے کہنے پر کام کریگی اب کوشش یہ ہو کہ گورنمنٹ ناکام رہے''۔ لیاقت علی خاں مرحوم نے یہ بھی کہا کہ اگر یوپی سے کوئی اور شخص ہوتا تو ٹیم میں اتحاد عمل ہوتا۔ مرحوم کا اشارہ اس فقرے سے خلیق الزماں صاحب اور نواب اسماعیل خاں مرحوم کی طرف تھا مجھے اس فقرے سے لطف یوں آیا کہ جب اخبارات میں لیگ کے ممبران حکومت کے نام شائع ہوئے تو میں نے کہا تھا کہ ''یہ ٹیم تو لڑنے

کے لیے ہے۔ کام کرنے کے واسطے نہیں ہے۔'' نتیجہ وہ ہی ہوا کہ جو لازمی طور پر ہونا تھا۔ اتحاد عمل کے بجائے اختلاف آرا نے دشواریاں اتنی پیدا کیں کہ حکومت چلانا عذاب ہو گیا۔

شب کے کھانے پر میں نے لارڈ از نے اور سرایرک میول کو کھانے پر مدعو کیا۔ ڈنر کے بعد انہوں نے کہا کہ وائسرائے کا یہ منشا ہے کہ برار کے متعلق ہم لوگ پنڈت جواہر لال نہرو سے گفتگو کریں۔ میں نے کہا کہ وہ تو اس میں کوئی فریق نہیں ہے۔

ہم نے برار برٹش کو دیا اور فریقین برٹش حکومت اور ہم ہیں وہ ہماری اخلاقی اور قانونی پوزیشن مانتے تھے مگر کہتے تھے یہی دشواریاں ہیں قانوناً حیدرآباد کا دعوی درست ہے لیکن حالات زمانہ کے لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔ برٹش حیدرآباد کے دعوے کی صداقت کے تو قائل تھے مگر حالات ایسے تھے کہ مان نہیں سکتے تھے۔ اگر نظام معاوضہ پر راضی ہوتے تو ممکن تھا کہ حکومت ہند بیس پچیس لاکھ روپیہ سالانہ کچھ اور دیتی رہتی۔ بہرحال سر والٹر مانکٹن اور میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ لارڈ از ے اور سرایرک میول نے چلتے وقت کہا کہ ہمیں آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ مجھے اس وقت یکا یک فراق گورکھپوری کا ایک شعر یاد آ گیا۔

پیدا کر دے دلوں میں   ایمانوں کو دے ٹکرائے

بات وہ کہہ اے عشق کہ دل میں سب قائل ہوں کوئی نہ مانے صورت حال یہ تھی کہ کانگریسی حکومت بجا طور پر یہ کہہ سکتی تھی کہ حیدرآباد کا معاہدہ برٹش گورنمنٹ سے تھا۔ ہندوستان کی قومی گورنمنٹ اس میں فریق نہیں اور اگر آپ چاہیں تو وہاں کے لوگوں کی رائے لے لی جائے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

۱۸ر جون کو میں اور سر والٹر جناح سے ملے مسٹر جناح نے ایک بیان اخباروں میں دیا تھا جس میں ریاستوں کی حمایت کی۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ برار کے متعلق مسٹر جناح کی اور میری ایک رائے تھی۔ وہ برار کو حیدرآباد کے واسطے کینہ خیال کرتے تھے وہ معاوضہ لینے کی موافقت میں تھے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

You have got a whip in hand ,take advantage of it to get some good compensation.

میری رائے بھی یہی تھی مگر نظام اس کے مخالف تھے۔ وہ اس انقلاب کی بنیادی حیثیت کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔

شب کو میں نے ڈنر پر پنڈت جی ان کی صاحب زادی مسز گاندھی (جواب بفضلہ وزیر اعظم ہیں) ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ سردار بلدیو سنگھ اور سر شنکر لعل کو بلایا۔ بہت دوستانہ فضا میں باتیں ہوتی رہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو یہ بتاتے رہے کہ انقلاب روس اور اسی زمانے کے روس کی پالیسی میں متعلق ملکیت مذہب۔ طلاق اور نکاح کا فرق ہوا۔ میں نے پنڈت جی سے کہا کہ Negotiation کے واسطے کب حاضر ہوں خندہ پیشانی کے ساتھ فرمایا کہ جب دل چاہے۔ کاش پنڈت جی سے گفت وشنید ہوتی تو ممکن ہے کہ جو کچھ ہوا اور سے بہتر نتیجہ نکلتا۔ لیکن حیدرآباد میں فضا تھی کہ جن کے ہاتھ زمام سلطنت آ گئی تھی ان سے بات کرنا نظام کے ساتھ غداری تصور کیا جاتا تھا اور جو ہتھیار ڈال کر ہندوستان سے رخصت ہو رہے تھے ان سے اپنے درد کے مداوے کی توقع تھی۔

۱۹ رجون کو علی گڑھ ہو کر ۲۱ رکو دہلی آیا اور حیدرآباد کو روانہ ہو گیا ۲۳ رجون سرکار میں حاضر ہوا نظام اس سے بہت خوش تھے کہ سر والٹر مانکٹن اور میں نے بڑی جرأت اور ہمت سے دہلی میں گفت وشنید کی۔

اعلیٰ حضرت ''جرأت وہمت'' کے الفاظ ایسے موقع پر جب حکومت ہند سے بات چیت ہو ہمیشہ استعمال فرماتے تھے۔ لیکن اس زمانے کے حالات میں جب کہ تمام تاش کے ترپ کے پتے حکومت ہندوستان کے ہاتھ میں تھے۔ ان الفاظ کا استعمال نتیجہ خیز نہ تھا۔ طاقت کے ساتھ بہادری اور جرأت شجاعت ہے لیکن جب طاقت نہ ہو تو پھر تہور ہے جو خودکشی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

اس ملاقات میں میں نے نظام سے اس زمانے کے حالات پر بھی گفتگو کی انقلابی تبدیلیوں کے اثرات اور حال وماضی کے فرق کو عرض کیا۔ میں نے کہا کہ انگریز کا وجود بہت معنی میں تکلیف دہ اور خلش آفریں تھا۔ لیکن بہت سی صورتوں میں باعث پناہ بھی تھا۔ مثلاً اس زمانے میں جب کسی شخص یا طبقہ کو ہم سے شکایت ہو تو وہ Resident

سے ہماری شکایت کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ دہلی کی مداخلت باعث تکلیف ہوتی تھی لیکن اسی کے ساتھ ہر بد اندیش یہ بھی جانتا تھا اگر حیدر آباد کے تخت و تاج پر کوئی حملہ کیا گیا تو انگریز اپنے معاہدات کی بناء پر اس کی حفاظت کرے گا''۔ آج اگر ہم سے کوئی شکایت ہو تو شاکی وہی جا کر کانگریس کے ہائی کمانڈ سے مشورہ کرے گا...... اُن کا مشورہ یہ ہوگا کہ حیدر آباد میں شورش پیدا کی جائے اور مستقل طور پر ہماری مشکلات کو بڑھایا جائے اس تمہید کے بعد میں نے عرض کیا کہ اس کی ضرورت کہ اس جمہوری دور کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے واسطے وزراء میں ایسے لوگ مقرر کیے جائے کہ جن کو حیدر آبادی اپنا نمائندہ خیال کریں اور جس پر انھیں اعتماد ہو۔

نظام اسے مانتے تھے اور اسی ملاقات میں یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ کسی ہندو کو صدر اعظم مقرر کیا جائے۔ میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے یہ کہا کہ مہاراجہ کشن پرشاد کامیاب صدر اعظم تھے۔ پھر فرمایا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ سر سی. پی راما سوامی آئیر کو ٹراونکور سے بلائیں۔ میں نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنے آنے پر تیار نہ ہوں میرا منشاء یہ تھا کہ کوئی حیدر آباد کے ہندو حضرات میں سے صدر اعظم ہو۔ سر سی. پی پھر بھی حیدر آباد کی زبان میں ''غیر ملکی'' تھے اور ضرورت اس کی تھی کہ وہاں کے لوگ صدر اعظم کو اپنا نمائندہ سمجھیں اور ''غیر ملکی'' اس ضرورت کو کیسے پورا کر سکتا ہے۔ یہ بہت ہیجانی زمانہ تھا۔ ہر شخص کے دل و دماغ پر بحرانی کیفیت طاری تھی۔ برٹش ایمپائر کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اور جمہوری ہندوستان کا سورج طلوع ہونے والا تھا اسی حالت میں جمہوری طرز حکومت سے لوگوں کو محروم رکھنا ناممکن تھا۔

حضور نظام نے قاسم رضوی کی تقریر کے ایک جملہ کو دوہرایا جو میں اخباروں میں دیکھ چکا تھا اس میں قاسم رضوی نے سر اکبر مرحوم اور سر مرزا اسماعیل مرحوم کے زمانوں کو مسلم کش زمانے سے موسوم کیا تھا اور میرے زمانہ کو دور مجہول سے تعبیر کیا تھا مجھے قاسم رضوی کے الفاظ کی تو پرواہ نہ تھی جو لوگ اہم ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں انہیں تنقید اور تعریف دونوں سے بے نیاز ہو کر ادائیگی فرض کرنا چاہئے۔ مگر حضور نظام کے دہرانے سے مجھے تکلیف ہوئی اور میں نے اپنی عادت کے خلاف یہ عرض کیا ''اگر

حقائق پر غور کیا جائے تو یہ بالکل غلط ہے۔ یہ تو میری عادت کبھی نہیں رہی کہ میں اپنا پروپیگنڈہ کروں۔ نہ اپنے ساتھ پریس کے دو تین نمائندے رکھتا ہوں کہ جو میرے ہر ہر لفظ کو اخباروں میں اچھال کر بتائیں کہ میں نے کیا کہا۔ لیکن سکندر آباد کی واپسی برٹش حکومت سے میرے ہی زمانے میں ہوئی۔

نظام ریلوے پر جو برٹش پولیس کا تسلط تھا اس کا انقطاع میرے ہی زمانہ میں ہوا۔ حیدرآباد کی دکن ہوائی جہاز کی سروس دہلی بنگلور اور مدراس میرے زمانہ میں ہوئی۔ ہماری کوئلے کی کانیں جو ایک انگریز کمپنی کے ہاتھ میں تھیں ان کی واپسی میرے ہی زمانہ میں ہوئی تنگ بھدرا کے پانی کا جھگڑا مدراس سے میری ہی زمانہ میں طے ہوا۔ گوداوری کی صنعتی اسکیم میرے ہی زمانہ میں بنی اگر اس پر بھی میرے زمانہ کو دور مجہول کہا جائے تو خلاف واقعہ ہے"۔ میں نے یہ بھی کہا "ایک چیز اور عرض کردوں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ میں انگریز کو ساتھ لے کر چلتا ہوں لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ اگر میں ایسا کرتا تھا تو کیا غلط تھا۔ خود جب آقا (نظام) پر قیود عائد تھے وہ خود انگریزوں کے ہاتھ بے بس تھے پھر میں انگریز کو ساتھ نہ لے کر چلتا تو نتیجہ کیا نکلتا لیکن اسی کے ساتھ پیر و مرشد یاد کرلیں کہ میرے زمانہ سے پہلے سرکار اور ریزیڈنٹ کے درمیان ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد کوئی نہ کوئی جھگڑا ضروری ہو جاتا تھا۔ لیکن میرے پانچ گزشتہ سالوں میں کبھی ایسا ہوا" نظام نے اسے مانا۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ملاقات ختم ہوئی۔

۴۷-۶-۲۴ میں برٹش حکومت کے آخری ریزیڈنٹ سے ملا اور ان سے کہا کہ وہ برٹش فوج کو ہماری چھاؤنیوں سے ہٹائیں اور جہاں کہیں بھی ریلوے میں برٹش پولیس ہے اسے فوراً ہٹایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ میں انھیں لکھوں تاکہ دہلی پر وہ زور دے سکیں۔

میں نے ان سے اور باتوں کے بعد کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ برٹش حکومت نے ہندوستان کو آزاد حکومت دینے کا فیصلہ کرلیا تھا تو پھر نظام کی عمر بھر کی خواہش کہ انھیں ہز میجسٹی کا خطاب دیا جائے کیوں نہ مان لی۔ گو میں جانتا تھا کہ ہز میجسٹی تو خود بنتا ہے۔ بنایا ہوا تو پھر شاہِ شطرنج رہتا انھیں اتفاق تھا کہ اگر یہ خطاب دے دیا جاتا تو کیا

نقصان تھا نظام مرحوم کی یہ بڑی خواہش تھی کہ انھیں ہزمجسٹی کا خطاب مل جائے۔ میں نے بار بار اس کے متعلق کوشش کی مگر بارآور نہ ہوئی۔ انگریز حکومت کی طرف سے ہمیشہ یہ کہا تھا کہ اس میں بادشاہ کا مقابلہ ہو جائے گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ وہ Emperror میں مقابلہ کا سوال نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ ضروری ہے شہنشاہ کے ماتحت بادشاہ ہوں۔ مگر اس پر انگریز حکومت راضی نہیں ہوئی۔

۴۷-۶-۲۵ کو تقی الدین اور قاسم رضوی میرے پاس آئے۔ میں نے قاسم رضوی سے کہا کہ آپ نے میرے زمانے کو دور مجہول کس اعتبار سے کہا حالانکہ کوئلہ کی کانوں کی انگریز کمپنی سے خریداری، دکن ہوائی سروس اسٹیج کا قیام تنگ بھدرا کے پانی کی تقسیم مدراس سے سکندرآباد کی واپسی لال گوڑھ کے رقبہ میں پولیس کے اختیارات کی واپسی۔ یہ سب کچھ میرے ہی زمانہ میں ہوا۔ برٹش ہاتھی کے منہ سے گنا نکالنا بہت آسان نہ تھا۔ وہ شرمندہ تھے اور کہنے لگے کہ اس زمانے میں کچھ بھی ہو آج حیدرآباد کے مسلمانوں کا رواں رواں آپ کے ساتھ ہے وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ زمانہ کروٹ بدل چکا ہے جو کتاب ان کے پیش نظر تھی نہ صرف اس کا ورق الٹ گیا بلکہ وہ کتاب ہی درس سے خارج کردی گئی۔ اب نیا کورس ہے اور نئے اساتذہ ہیں۔ جو شخص اپنی تقریر میں یہ کہہ دے کہ دہلی کے لال قلعہ پر اپنا جھنڈا لگائیں گے اُسے حقیقت آشنا کیسے کہا جا سکتا تھا۔

میں ۲۶/جون سے یکم جولائی تک روزانہ روزنامچہ لکھ سکا لیکن اسی دوران میں ایک واقعہ قابل ذکر پیش آیا۔

مسٹر کرشنا مینن (جو ڈیفنس کے منسٹر ہوئے اور چین کی جنگ کے نتائج کے سلسلے میں استعفیٰ دیا) مدراس سے حیدرآباد آئے نواب علی یاور جنگ نے مجھ سے کہا کہ انھیں سرکاری مہمان کرلیا جائے میں نے کہا کہ وہ حکومت ہند کے کوئی افسر نہیں ہیں۔ علی یاور جنگ اپنے گھر ٹھہرالیں۔ انہوں نے معذرت چاہی۔ وہ چونکہ نظام کے مزاج سے واقف تھے کہ اگر معلوم ہوا تو عتاب ہوگا۔ غالباً اسی وجہ سے وہ کرشنا مینن کو اپنے گھر ٹھہرانے پر راضی نہیں ہوئے۔ میں نے اجازت دے دی کہ انھیں سرکاری

مہمان بنادیا جائے۔

دوسرے روز شاید ۲۸ رجون کو میں نے مسٹر کرشنا مینن اور علی یاور جنگ دونوں کو کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد علی یاور جنگ نے ان سے اس گفتگو کا ذکر کیا جو ان حضرات نے پہلے آپس میں کی تھی اور جس کا تعلق حیدرآباد کے مستقبل سے تھا۔ مسٹر مینن نے جو گفتگو کی وہ اس تاریخ کے روزنامچہ میں اس طرح درج ہے:

''اس (مسٹر مینن) نے شروع ہی میں یہ صاف کر دیا تھا کہ میں کانگریس کی طرف سے کوئی ذمہ دارانہ بات نہیں کر سکتا لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اگر حیدرآباد کوشش کرے تو کانگریس اسے منظور کرے گی کہ حیدرآباد ایک Autonomous گورنمنٹ کی حیثیت سے Union میں رہے لیکن حیدرآباد کو یہ ماننا پڑے گا کہ معاملات خارجہ میں Union حیدرآباد کی نمائندگی کرے گی اور پولیس ایک ہی رہے گی۔ اس طرح Defencc کے مسئلہ میں حیدرآباد Union کے ساتھ شامل ہوگا۔ الفاظ ایسے پائے جا سکتے ہیں کہ جن سے حیدرآباد کی خودمختاری کو بھی ٹھیس نہ لگے اور یہ سب کچھ ہو جائے''۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ حیدرآباد کے شہری یونین کے شہری مانے جائیں گے اور پاکستان سے حیدرآباد کا کوئی تعلق نہ ہوگا''۔

میں زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ میں جانتا تھا کہ نظام اس پر تیار نہ تھے تو پھر میرا کچھ کہنا بے سود تھا۔ وہ اسی دوستانہ گفتگو میں خفیف دھمکیاں بھی دیتے تھے مثلاً ان کا یہ کہنا کہ ہم آپ کو پاکستان سے کبھی ملنے نہ دیں گے''۔ بہرحال پاکستان سے ملنے کا خواب تو حیدرآباد میں کسی صاحب فہم کے دماغ میں نہ تھا۔

دوسرے روز صبح کو میں نے نظام سے اسی گفتگو کا ذکر پوری تفصیل سے کر دیا۔ اعلیٰ حضرت کو بدگمانی ہوگئی اور مجھے نواب علی یاور جنگ سے معلوم ہوا کاظم یار جنگ کے ذریعہ یہ حکم آیا کہ مسٹر مینن سے ملاقات کا حال بذریعہ تحریر پیش کریں اور

نظام کی ناخوشی کا بھی ان پر اظہار کیا گیا۔ اور یہ بھی کہ مجھے اس کی یہ اطلاع نہ ہو۔ نظام مرحوم بہت جلد بدگمان ہو جاتے تھے مجھے اس پر تعجب بھی نہیں ہے۔

۱۔ ان کی ذہنی نشونما اور تعلیم و تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں آخری مغلیہ دور کی روایات درباری چالیں اور سازشیں ایک حقیقت بن گئی تھیں اور ان کا طرز فکر اس سے متاثر تھا۔

۲۔ برٹش حکومت کی مداخلت ان کے اختیارات میں بیحد ناگوار تھی اور یہ خیال رہتا تھا کہ دہلی کی حکومت ان کے اختیارات میں اور کم کرنا تو نہیں چاہ رہی تھی۔ اور انگریز کے جانے کے بعد یہ خیال موجود قومی حکومت کے متعلق اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔

نواب علی یاور جنگ ایک مسودہ نظام کو نوٹ بھیجنے کا لائے جس میں یہ بھی تھا کہ وہ اور میں کرشنا مینن سے پہلے سے واقف تھے۔ میں نے کہا کہ میں نے ان کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔ میری واقفیت کیسی؟ اس پر علی یاور جنگ نے اپنی اور میری دونوں کی واقفیت کا ذکر کاٹ دیا اور نوٹ بھیجا گیا۔

۹ر جولائی ۱۹۴۷ء کو میں اور سر والٹر مانکٹن، وی. پی مینن سے جو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے سکریٹری تھے ملے۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر حیدرآباد امور خارجہ (External Affairs) دفاع (Defence) رسل و رسائل کی حد تک ہندوستان کے ساتھ شامل ہوتے تو جملہ دیگر معاملات میں کانگریس حیدرآباد کی طرفداری کریگی۔ مثلاً برار کا سوال۔ حیدرآباد کے واسطے بندرگاہ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اس کی بھی کوشش کریں گے کہ ریاست میں کوئی شورش نہ ہو۔ وی۔ پی مینن بہت اعتماد سے باتیں کر رہے تھے۔ جیسے وہ جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی کانگریس حکومت کا منشا ہے مینن بہت ذی ہوش اور دور اندیش افسر تھے ایک کلرک سے ترقی کر کے سکریٹری حکومت ہوئے تھے۔

بخلاف مسٹر مینن کے انگریز افسران کو خود اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا تھا۔ اسی روز میں اور سر والٹر Sir Conard Courfieed مسٹر Griffin سے ملے۔ یہ دونوں وائسرائے کے سیاسی مشیر اور سکریٹری علی الترتیب تھے۔ ان کے متعلق میری ڈائری

میں یہ فقرے ہیں:

''ان لوگوں کی حالت قابل رحم ہے۔ کانگریس انھیں پوچھتی نہیں۔ چند ہفتوں میں پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ ختم ہوجائے گا''۔

کورفیلڈ کو بہت ہمدردی تھی اور اس نے یہ یقین دلایا کہ فوج اور پولیس جو حکومت ہند کے ماتحت تھی جلد ہٹائی جائے گی۔ ان کی ہمدردی بعد از وقت تھی۔ جب طاقت ہاتھ سے نکل گئی تو پھر لفظی ہمدردی کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ اسی ملاقات میں انھوں نے یہ سوال کیا کہ اگر گورنمنٹ فوج کو ہٹانے پر تیار نہ ہو تو آپ کیا کریں گے۔ میں نے جو حقیقت تھی بیان کی کہ ہم میں کیا طاقت تھی جو ہم کچھ کر سکتے تو پھر انھوں نے جھلا کر کہا تو پھر آپ خودمختاری کا اعلان کیوں کرتے ہیں۔ ان کا یہ اعتراض بالکل بجا اور درست تھا جس سے مجھے اتفاق تھا۔ ''ہماری حالت یہ تھی کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں'' لیکن نظام ایسی صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھے میں نے جواب کے طور پر کہا کہ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ نے ہمیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ ہم کچھ کر سکیں تو سر کونارڈ بولے۔ ''اگر پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ نہ ہوتا تو پرنس بھی غائب ہوگئے ہوتے''۔ مجھے اس سے اتفاق ہے میں نے کہا کہ ہاں بہت سے غائب ہوگئے ہوتے مگر جو رہ جاتے وہ طاقتور بادشاہ ہوتے۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ والیان ملک میں سے بہت سے برٹش حکومت ہی کی وجہ سے قائم رہے۔ لیکن برٹش حکومت ہی کی وجہ سے وہ اپنی رعایا سے بے نیاز ہوگے اور کوئی تعلق راعی اور رعایا میں باقی نہ رہا۔ بعض پرنس یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنی ریاست میں جمہوری طرز حکومت جاری کریں۔ مثلاً سابق مہاراجہ بڑودہ۔ مگر ریذیڈنٹ کا مشورہ جہاں تک میں نے سنا، یہ تھا کہ اگر وہ ایسے کریں گے تو دوسرے والیان ملک کی پوزیشن ان کی رعایا کی نظر میں خراب ہوگی۔

اسی روز شب کے ۹ بجے میں اور سر والٹر مسٹر جناح سے ملے۔ اسی روز کی ڈائری سے نقل کر رہا ہوں:

''مسٹر جناح نے بہت زور کے ساتھ ہمیں متنبہ کیا کہ وائسرائے

کے دباؤ میں نہ آئیں''۔

I warn you Nawab Saheb it is your responsibility not to be influenced by the Viceroy. I tell you please keep it secret until it is announced that he is Governor General of Hindustan and I am of Pakistan.

مسٹر جناح نے یہ بھی کہا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یہ خواہش تھی کہ وہ دونوں جگہ کے گورنر جنرل ہوں لیکن مسٹر جناح نے ان سے یہ کہا کہ صرف دو آدمیوں کو اس قابل سمجھتے ہیں ''یا تو مسٹر چرچل گورنر جنرل پاکستان ہوں اور اگر وہ نہیں آسکتے تو پھر میں''۔

یہ سچ ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یہ خواہش تھی اور یہ ظاہر ہے کہ ان کی بڑی نیک نامی تھی کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں کتنا بھی اختلاف ہو مگر جہاں تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذات ہے دونوں کو اُن پر اعتماد ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات کو میری رائے سے اختلاف ہو مگر میرا یہ خیال ہے کہ مسٹر جناح نے بڑی غلطی کی کہ جس کا ثمرہ تمام ملک کو اٹھانا پڑا۔ اگر ایک ہی شخص عبوری دور کے تین چار ماہ کے واسطے وائسرائے اور گورنر جنرل ہوتا تو اتنا کشت وخون پورے ملک میں نہ ہوتا۔ کشمیر کا قصہ بھی بہ آشتی طے ہو جاتا کہ جس سے دونوں کو شکایت نہ ہو۔ کشمیر پر قبائل کا حملہ نہ ہوتا۔ آپس میں اگر اتحاد بھی نہ ہو تو اتفاق سے دونوں ملک کے شروع کرنے اور ہندوستان اور پاکستان میں جو ۶۵ء میں چھ سات روز کی لڑائی ہوئی جس کی اصل وجہ کشمیر ہی کا معاملہ تھا نہ ہوتی یہ وہ پہلی اینٹ تھی جو ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی عمارت کی بنیاد میں ٹیڑھی رکھدی گئی اور پھر دیوار میں کجی ہونا لازمی ہو گیا۔ دونوں گورنر جنرل اپنے اپنے ملک کے طرفدار ہو گئے۔ ایک دوسرے کو حریف سمجھنے لگے۔ موانست تو درکنار مصالحت بھی باقی نہ رہی۔

نظام کی طرف سے ایک خط وائسرائے کو لکھنا طے پایا۔ اور سر والٹر مانکٹن نے اس کا مسودہ تیار کیا۔ نظام نے منظوری کے بعد یہ حکم دیا کہ مسٹر جناح کو دکھانے کے بعد دیا جائے۔ سر والٹر مانکٹن اور علی یار جنگ دہلی میں تھے۔

۲۳؍جولائی کو میں بھی ریل سے دہلی گیا چونکہ گاڑی لیٹ تھی اور مسٹر جناح

سے ملاقات کا وقت ڈھائی بجے تھا۔ میں اسٹیشن سے سیدھا مسٹر جناح کے یہاں گیا۔ یہاں علی یاور اور والٹر موجود تھے۔ مسٹر جناح اس سے اختلاف کر رہے تھے کہ کوئی خط ایسا وائسرائے کو لکھا جائے جیسا مسودہ سر والٹر نے لکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ خط ایک دوسرا طریقہ تھا۔ ہندوستان کی یونین میں شرکت کرنے کا۔ انھوں نے اپنے بکس سے نکال کر اعلیٰ حضرت نظام کا خط بھی دکھایا نظام نے اسی زمانے میں انھیں خطوط بھیجے۔ مسٹر جناح نے کہا کہ یہ خط میرے اوپر بڑی ذمہ داری ڈالتی ہیں"۔ میں یہ اجازت نہیں دیتا کہ یہ خط بھیجا جائے لیکن مسٹر جناح اس پر تیار تھے کہ اگر حیدرآباد اور ہندوستان میں Offercive of Defanene Alliance ہو جائے تو کرلی جائے۔ وہ اس کے بھی خلاف تھے کہ حیدرآباد جیسا کہ اس مسودہ میں تھا پاکستان کے معاملہ میں غیر جانب دار رہے۔ مسٹر جناح کا خیال تھا کہ جب پاکستان بن جائے تو ایسی Alliance حیدرآباد پاکستان سے بھی کرے۔

جس وقت مسٹر جناح نظام کا خط نکال رہے تھے تو نواب علی یاور جنگ کی نگاہ کچھ کاغذات پر پڑی اور ملاقات کے بعد جب باہر آئے تو انھوں نے کہا کہ ہمارے خط کا مسودہ عبدالرحیم کے ذریعہ سے (جو اتحاد المسلمین کے ممبر تھے اور وزراء میں شامل کرلئے گئے تھے) مسٹر جناح کے پاس پہونچا۔ سر والٹر مانکٹن، علی اور مجھ کو اس سے بہت تکلیف پہونچی کہ نظام نے بغیر ہمارے علم اور اطلاع کے ایسا خط مسٹر جناح کو لکھا مسٹر جناح کا خیال تھا کہ ہمارے خط کا ایک دوسرا طریقہ ہندوستان کی یونین میں شرکت کا تھا۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری دشواریاں کتنی بڑھ گئیں۔ کانگریس گورنمنٹ اور خاص کر سردار پٹیل کو اس پر راضی کرنا حیدرآباد کے ساتھ اور ریاستوں سے معاہدہ کیا جائے، دشوار تھا اور والیان ملک Accede کریں اور حیدرآباد انھیں تین صیغوں پر Treaty یا معاہدہ کرے۔ اس پر حکومت ہند کو راضی کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن نظام اگر ہر معاملہ میں مسٹر جناح سے مشورہ لیتے ہیں پھر کوئی فیصلہ ہونا محال ہوگا۔ ہمارے اور مسٹر جناح کے نقطہ نظر میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کا نظریہ پاکستان کی مصالح اور پالیسی کے لحاظ سے تھا کہ جو ایک الگ ملک بن گیا تھا۔ ہمارا

نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان کی گورنمنٹ سے کن شرائط پر فیصلہ کریں۔ ماؤنٹبٹن نے مجھ سے کہا کہ حیدرآباد کو اس سے بہتر شرائط نہیں مل سکتے جس سے مجھے اتفاق تھا۔ ماؤنٹبٹن بہت پریشان اور ناخوش تھے۔ اول تو ذاتی طور پر انھیں یہ ناگزیر تھا کہ ان کے مسودہ پر کوئی اور نظر ثانی کرے۔ وہ ایک بہت ممتاز بیرسٹر تھے جو شاہی خاندان کے مشیر قانونی تھے اور انگلستان کی حکومت کے کابینہ کے ممبر دوبار رہے۔ انھیں بجا طور پر یہ ناگوار تھا۔ پھر ہماری اور مسٹر جناح کی پالیسی میں بنیادی اختلاف تھا۔ وہ پاکستان کے نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھتے تھے۔ جہاں ان کے ہم مذہب لوگوں کی اکثریت تھی۔ حیدرآباد ہندوستان کے وسط میں تھا جہاں اقلیت یعنی ۱۳ رفی صد مسلمان اکثریت پر حکمراں تھے۔ غرض میرے اور ان کے واسطے بہت پریشانی کا باعث ہوگی۔

نظام کے اس خط میں جس سے مسٹر جناح کو اختلاف تھا نظام نے وائسرائے کو یہ لکھا تھا کہ اگر ہندوستان کی تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو مجھے شرکت میں آسانی ہوتی مگر جب تقسیم ہوگئی تو جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کیسے رہتے ہیں شرکت نہیں کرسکتا۔ میرے خیال میں مسٹر جناح کو جس خط کے حصہ سے اختلاف تھا وہ حسب ذیل ہے۔

I am fully prepared to enter into a treaty with them whereby a suitable arrangement is made in respect of land communications, so that all-Indian Standards are recognised, and Hyderabad contributes to the defence of the Dominion by a system analogous to that now in force under the Indian States Forces Scheme. Moreover, I should be willing to agree to this treaty to conduct the External affairs of my State in conformity with the foreign policy of the Dominion of India. But it would be necessary for me to provide against possibility, which I earnestly hope will never arise in fact, that the two new Dominions might persue a mutually hostile policy. In that case, it would be unthinkable for my troops to be used against the Dominion of Pakistan and it would have to be,provided that Hyderabad in such an event would be neutral.

مسٹر جناح نے اسی روز مجھے پھر ٹیلی فون کیا ۹ بجے شب کو ان سے ملوں۔

میں گیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ جیسا نواب علی یاور جنگ نے کہا تھا صحیح تھا اور مسٹر جناح کے پاس تمام کاغذات کی نقل عبدالرحیم کے ذریعہ سے پہنچی۔ مسٹر جناح نے مجھ سے یہ بھی کہا:

"I do not care what Abdur Rahem says but. I do think that the letter should not be issued tearit off"

مسٹر جناح کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبدالرحیم نے اس خط کے مسودہ پر Protest کیا۔

میں نے اس ملاقات میں مسٹر جناح سے یہ بھی کہا کہ جب وہ ہمارے اس خط کے مسودہ سے متفق نہیں ہیں تو کیا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کا جواب یہ تھا Stand still معاہدہ کرلیا جائے اور اس کے بعد حکومت ہند اپنی تجویز دیں مسٹر جناح سے مشورہ کیا جائے۔

حضور نظام کا بغیر ہم لوگوں کے علم واطلاع مسٹر جناح کو خط لکھنا اور مسٹر جناح کا ہماری تجاویز مسترد کرنا اتحاد پارٹی کے ذریعہ سے ہماری تجاویز کا علم مسٹر جناح کو ہونا یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ جو میرے لیے اور سوائے عبدالرحیم میرے شرکائے کار کے لیے ناقابل برداشت تھیں اور حیدرآباد کے معاملہ کو سلجھانا نہ صرف مشکل بلکہ محال بنادیتی تھیں۔

۲۷-۷ میں نے آج وائسرائے کو خط لکھا کہ ہم سے یہ کہا گیا تھا۔ کہ حیدرآباد کے متعلق میٹنگ ہمارے وفد سے ہوگی ہم لوگ آگئے مگر ہنوز ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس پر وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری نے یہ کہا کہ دوسرے روز جو والیان ملک کی میٹنگ تھی اس میں ہم شریک ہوں میں نے کہا ہماری گفتگو علیحدہ ہوگی۔ اس پر پرائیوٹ سکریٹری نے یہ کہا کہ وہ میٹنگ اسی غرض سے ہوگی کہ آپ شریک ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔ مگر اور اغراض کے واسطے نہیں۔

ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ میں تو شریک نہ ہوں مگر علی یاور جنگ عبدالرحیم اور بنگل ونکٹا ریڈی شریک ہوں چنانچہ یہ لوگ شریک ہوئے۔

وائسرائے نے اپنی تقریر میں بہت زور ڈالا کہ وہ سب ہندوستان کی یونین میں شریک ہوجائیں۔

مجھے تحقیقی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ ولایت میں وائسرائے کی اس تقریر کو پسند نہیں کیا گیا اور وزیر ہند نے انھیں لکھا کہ وہ حدود سے آگے بڑھ گئے میری رائے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر اس غلطی کا اثر پڑا کہ جو مسٹر جناح نے ان کے دونوں جگہ کے گورنر جنرل ہونے میں اختلاف کیا تھا۔

مجھے دو ایک روز کے واسطے حیدرآباد جانا تھا تاکہ نظام کو بتاؤں کہ مسٹر جناح اس کے خلاف ہیں کہ ہم کوئی معاہدہ ہندوستان سے امور خارجہ دفاع اور رسل ورسائل پر کریں۔ میں نے سر والٹر سے مشورہ کیا کہ جب حضور نظام ہر تجویز پر مسٹر جناح کا مشورہ ضروری خیال کرتے ہیں تو ان کے مشورہ کے نتائج کی ذمہ داری بھی ان کی ہونی چاہئے۔ میں جانتا تھا کہ مسٹر جناح ایسی ذمہ داری نہیں لے سکتے تھے۔ مگر اول تو جو مشورہ دیے یہ اس کا فرض ہے کہ اس کے نیک و بد نتائج کی ذمہ داری لے۔ اور دوم یہ کہ حضور نظام کو یقین ہوجائے کہ اگر ان کے مشورہ سے ہندوستان کی حکومت اور حیدرآباد کے تعلقات خراب ہوگئے تو مسٹر جناح اس کی تلافی نہ کرسکیں گے اور ان کی رائے پر عمل کرنا مفید نہ ہوگا۔ سر والٹر نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ چنانچہ اسی دوران میں دو ایک روز کے واسطے میں حیدرآباد گیا اور حضور نظام سے میں نے کہا کہ جب وہ ہر معاملہ میں مسٹر جناح کا مشورہ ضروری خیال کرتے ہیں تو پھر مسٹر جناح سے یہ بھی پوچھا جائے کہ اگر ان کے مشورہ پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہو کہ حیدرآباد اور ہندوستان کے تعلقات خراب ہوں۔ تو پاکستان ہماری کیا مدد کرسکتا ہے۔ سرکار نے اس تجویز کو منظور کیا اور مسٹر جناح کے نام خط ۲۹ ؍ جولائی کو لکھا گیا۔

حیدرآباد میں عبدالرحیم صاحب نے ہمارے کاغذات قاسم رضوی کو دکھائے اور غالباً جو دہلی میں گفتگو ہوئی اسے بیان کیا۔ قاسم رضوی نے ایک بیان اخباروں میں دیا کہ جس میں مجھ پر، علی یاور جنگ اور سر والٹر پر غیر اعتمادی کا اظہار کیا گیا۔ جس سے ہم سب کو تکلیف اور ناگواری ہوئی۔ سر والٹر نے اس کمیٹی ہی سے استعفیٰ دے دیا کہ جو

گفت وشنید کے واسطے مقرر ہوئی تھی۔

۴-۸-۴۷ آج مسٹر جناح سے پھر ملاقات ہوئی۔ علی یاور جنگ اور عبدالرحیم صاحب بھی ساتھ تھے۔ میں نے H-E-H کا خط معہ نوٹ مسٹر جناح کو دیا جس میں جان سخن وہی حصہ تھا کہ جو اس سے متعلق تھا کہ اگر مسٹر جناح کے مشورہ پر عمل کرنے کا انجام یہ ہو کہ حیدرآباد اور ہندوستان کے تعلقات خراب ہو جائیں تو مسٹر جناح کیا مدد دے سکیں گے؟

If a settlement could be reached now, His Exalted Highness would be likely to get good terms in relation Berar, a customs agreement, the use of a Port and full recognition of his internal autonomy in all respects. Otherwise, His Elated Highness feels sure that Congress will make every effort by means, that are indirect and not manifestly provocative, to make the economic and political position of Hyderabad intolerable and, as Mr. Jinnah knows, with a large Hindu population there would be limits to the State's power of resistance to such a pressure.

In these circumstances, before making up his mind what attitude to adopt at this vital juncture, His Exalted Highness must know in black and white what steps Mr. Jinnah could take to assist and rescue Hyderabad. If this pressure were adopted, could Mr. Jinnah guarantee to get supplies of food, salt and kerosene oil and other goods in which Hyderabad could be made a deficit area, introduced into the state? To what extent could Mr. Jinnah provide the State with arms and equipment and, if necessary, with troops? If economic pressure can be shown to be used against Hyderabad, what effective steps could be taken by Pakistan in time to rescue the State from its predicament? If Congress supporters inside the State revolted and were indirectly assisted by Congress forces in the Dominion of India, what assistance could His Exalted Highness expect from Pakistan .how could Hyderabad hope to get an outlet to the sea without the co-operation of the Dominion of India?

مسٹر جناح نے بہت لمبی تقریر کی آخیر میں میں نے کہا کہ وہ نظام کے خط کا تحریری جواب دیں انھوں نے کثرت مشاغل اور مصروفیت کی بناء پر معذرت چاہی۔ آخر میں یہ طے پایا کہ نواب علی یاور جنگ اس ملاقات کا ایک نوٹ لکھ کر مسٹر جناح کے سامنے پیش کردیں اور وہ اس پر دستخط کردیں۔ چنانچہ علی یاور جنگ نے نوٹ لکھا اور مسٹر جناح نے جزوی ترمیم کے بعد شب کے دس بجے اس نوٹ پر دستخط کردیے۔ جس کی نقل یہ ہے۔

Ashok House
New Delhi,
4th Aug. 1947

NOTE OF INTERVIEW WITH MR. M.A. JINNAH

The Prime Minister, the Constitutional Affairs Member and the Local Government Member interviewed Mr. Jinnah on the afternoon of 4th August, the subject of interview being the note sent by His Exalted Highness to Mr. Jinnah on 29th July. In the course of a separate interview which Sir Walter Monckton had the same day with Mr. Jinnah, Mr. Jinnah was apprised of the discussion the previous night with the Viceroy.

Mr. Jinnah said that the Viceroy and the Congress were following a policy totally contrary to the declared policy of H.M.G. H.M.G. had definitely offered the two alternatives of accession or political relations, and had also said that time would be given and that the choice would be free and voluntary. If H.M.G had a shred of conscience, they would put a stop to the threats which were now being given both by the Viceroy and the Congress. It was highly probable that at least the Conservative party would rebel.

What had been said by the Viceroy about Berar was tantamount to daylight dacoity. It amounted to holding a Pistol at a person and making him sign the Instrument of Accession. H.M.G. had admitted the Legal and Constitutional claim of The Nizam over Berar; the Nizam had all the right on his side and what was being now threatened was the exercise of might.

If, even the little that was necessary to continue the Nizam's legal title to Berar was not done it would not be much of a loss but the world would know the standard of morality which governed the conscience and acts of the Congress party. Mr. Jinnah said that he could not believe that this would be supported by sense of honour and the conscience of the British people.

Mr. Jinnah said that he thought if H.E.H. and his advisers had really made up their minds against accession they should stick to it, firmly and loyally. He did not believe that threats of economic sanction would be carried out but even if they were, His Exalted Highness' line should be as follows:-

"You may do what you like and you may threaten me as you like but I shall never agree to sign any instrument of Accession or join the Union unless my conscience says that I should do so. You have no right to coerce me and I have the right to make a free choice."

He said that after all there was some such thing as standing for one's own right, despite every threat or provocation. If it comes to the worst, one should die fighting rather than yield on a point of fundamental principle. Mr. Jinnah gave the illustrations of what he called the greatest martyrdom in history, the example of Imam Husain standing for what was right and giving his life for it. All the sanctions in the world then existing were applied against him and his followers but they withstood them and suffered wholesale butchery. It was a moral triumph and they gave their lives for it. That should be the attitude which the Nizam and his advisers and the people should adopt. If it came to the worst, rather than to yield to coercion or to surrender what was right, he should be prepared to abdicate and go in last resort and show to the world that he had fought uncompromisingly for right as against might. Mr. Jinnah said that, in our own times, England had done the same against the heaviest odds. Her people had fought till the end and had reversed the position, by perseverance and conviction, from defeat to victory.

This immoral aspect of threats and coercion on the part of the Viceroy and the Congress, despite the declared policy of H.M.G. to the contrary, should be broadcast to world and be supported by propaganda so as convince the man in the street of the wrongness of their position and the rectitude of Hyderabad's stand for her rights. But any such declaration or announcements should contain a firm indication of absolute willingness to enter into standstill arrangements which are necessary for the advantage of both and to avoid a breakdown of the administrative machinery or the prevalence of chaos. It must be stated that Hyderabad desires to help India and herself in producing the conditions necessary for stability if, by the time of such announcement, the Congress persists in refusing to negotiate stand-still agreement, the entire responsibility of the consequence will rest with them. The above declaration may mention the fact that while accession of was never understood to be a condition for the conclusion of Stand-still agreements and had in fact nothing to do with them, even such agreements had been refused because the State had declined to accede and had chosen the other alternative offered to the state both by His Majesty's Government and by the political parties through their acceptance of Plan of June3.

As regards His Exalted Highness' question as to how far Pakistan would be able to assist Hyderabad economically or politically or with troops or arms and equipment and the like, Mr. Jinnah said that it was not possible for him at present to give any specific undertaking but that, generally speaking, he was confident that he and Pakistan would come to the help of Hyderabad in every way possible. There should be no doubt on that point. He said that even Countries with long established Government could not give specific undertakings of the nature desired except by reference to the situation as it developed. The United States could not give any such undertaking when it was first approached by the United Kingdom for help during the last war, but the United States gradually began helping on different fronts until they

ultimately came into the War itself. England was very nearly beaten when, to her good fortune Hitler diverted himself from England and attacked Russia, thus bringing the latter into a natural alliance with England and saving England from the concentrated attack which might otherwise have centered upon her. Then, America which had till then kept out of the War except by the way of moral and material help, entered the struggle as a result of the Japanese attack on her. These were providential developments without which all the odds were against England. They brought about Allied Victory. If Hyderabad was short of petrol or kerosene, it would not matter if, on the other hand Hyderabad had abundance of firmness, preserverence and courage. The Russians were threatened by a blockade against them but they won the war. If Hyderabad was similarly threatened there were no guns, and not necessarily with mechanized transport if there was no petrol.

The Prime Minsiter thanked Mr. Jinnah for the interview and for the education of his views on the different points raised by His Exalted Highness; he also said that H.E.H. would expect a written reply as he had made that request in his letter to Mr. Jinnah. Mr. Jinnah said that with all the volume of work thrust upon him and the short time left between now and establishment of Pakistan, if would be most difficult for him to write a detailed letter answering each of the points raised by His Exalted Highness. He said, however, that that best way would be to have a record prepared of the interview. The record could then be shown to Mr. Jinnah the same night at 9.30 and, if he had any modifications to make he would make them after which he could sign the record and give it back for submission to His Exalted Highness. The Prime Minister agreed with this suggestion and the Constitutional Affairs Member was requested to prepare a record of the interview.

The above notes are correct of the interview and represent my views and I hope that H.E.H will be firm and

accept them and act accordingly and I most fervently pray to God that he would help us all as our cause is righteous.

Sd/- M.A. Jinnah
4th August, 1947,
New, Delhi.

۵-۸-۱۹۴۷ ہوائی جہاز سے روانہ ہوکر ہم سب حیدرآباد گئے میں H-E-H کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسٹر جناح کی ملاقات کا نوٹ پیش کیا۔ نظام نے اسے پڑھا اور فرمایا کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

منشا یہ تھا کہ نظام کے سوال کا کوئی صاف جواب نہ تھا میں نے عرض کیا کہ بجا ارشاد ہوا اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے اور دست بستہ اتنا عرض کردوں کہ سرکار نظام حیدرآباد ہیں۔ امام حسین علیہ السلام نہیں ہیں اور یہ حیدرآباد ہے۔ میدان کربلا نہیں ہے۔

اس دوران میں حیدرآباد کی فضا اور بھی زیادہ مکدر ہوگئی تھی۔ میں استعفیٰ تو ایک بار پہلے ہی دے چکا تھا۔ لیکن اب ان حالات میں یکسوئی اور سکون خاطر سے کام کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے استعفیٰ کے خیال کا اعادہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ ۷/اگست کو میں نے بربنائے صحت سبکدوشی کی درخواست پیش کی۔ شام کو جواب آیا جس کا پیرایہ ہمدردانہ تھا لیکن یہ فرمایا کہ فوراً سبکدوشی ناممکن تھی۔ چھ ماہ بعد سبکدوش کرنے کا امکان تھا۔ نقل خط مذکور ہے۔

اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی
H-E-H The Nizam's Paishi office
King Kothi
Hyderabad Deccen
۱۸/رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

راز

خدمت شریف عالی جناب سعید الملک بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی آپ کا معروضہ ۱۸/رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ ملاحظہ فرما کر آپ کو تحریر کرنے کے

لیے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

آپ کی درخواست بابت سبکدوشی از خدمت (بوجہ عوارض جسمانی) کو میں نے غور سے دیکھا اور آپ کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوں کہ حالات مبینہ کے مدنظر واقعی آپ کو اب آرام لینے اور معالجہ کرانے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف حالات حاضرہ کس نوعیت کے ہیں وہ بھی ظاہر ہے۔ اس کے سوا کوئی شخص کا سردست ملنا آپ کے جیسے اہم خدمت کے لیے بھی دشوار ہے۔ ایسی حالت میں بعوض ایک سال کے (جو کہ معاہدہ تھا جس کو آپ نے قبول کرلیا تھا) آپ کو چھ ماہ کے بعد سبکدوش کرنیکی کوشش کرونگا یعنی ماہ جنوری ۱۹۴۸ء تک) مگر اس درمیان میں آپ اپنی صحت کا خیال رکھتے ہوئے کام کریں۔

اُس کمیٹی کے ساتھ جو کہ اس وقت کام کر رہی ہے اور مجھے امید ہے کہ زمانہ قریب میں ریاست حیدرآباد کے امور کی یکسوئی خاطر خواہ ہوجائیگی جس کے بعد آپ کے جانشیں کا تقرر ہونے میں آسانی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ میری تجویز سے آپ کو اتفاق ہوگا۔ صدرالمہام پیشی

چونکہ مسٹر جناح کو ہمارے مسودہ سے اختلاف تھا لہٰذا اس میں کچھ اور ترمیم کی گئی۔ مسٹر جناح چونکہ کراچی چلے گئے تھے۔ H-E-H کے حکم کے مطابق عبدالرحیم اور نواب علی یاور جنگ کراچی چلے گئے تاکہ اس ترمیم شدہ مسودہ کو بھی مسٹر جناح دیکھ لیں اور وہ خط وائسرائے کو ۱۰/اگست کو دے دیا گیا۔

وائسرائے نے اپنے جواب میں بہت دوستانہ خط لکھا اور دو مہینے کی مہلت گفت وشنید کے واسطے دیدی لیکن Accession کا سوال ہنوز باقی رہا۔

۱۲/تا ۱۹/اگست:

میں نے سردار پٹیل کو خط لکھا کہ ہم لوگ دہلی مزید گفتگو کی غرض سے کب آئیں اور سردار پٹیل نے ۲۶/اگست تجویز کی۔ خیال یہ تھا کہ ایک روز پہلے سر والٹر اور دوسرے ممبر چلے جائیں گے اور میں ۲۶/اگست کو پہنچوں گا۔

لیکن حیدرآباد کی تقدیر کی تحریر کون مٹا سکتا تھا۔ روز ایک نئی دشواری آجاتی

تھی۔ ۱۹؍اگست کو سروالٹر مانکٹن علی یاور جنگ اور میں اعلیٰ حضرت کے پاس حاضر ہوئے اور اعلان آزادی اور اصطلاحات کا مسودہ پیش کیا اصلاحات کے مسودہ پر نظام یکا یک برہم ہو گئے۔ چونکہ مسودہ علی یاور جنگ کا لکھا تھا۔ خفگی کا زیادہ نشانہ وہ ہوئے گو بحیثیت صدر اعظم میں بھی نہ بچا۔ سروالٹر مانکٹن نے بہت کہا کہ وہ مسودہ ان کے مشورہ سے لکھا گیا تھا۔ مگر نظام کی برہمی میں کمی نہ ہوئی۔ علی یاور جنگ سے دوران گفتگو میں یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کو ان پر اعتماد نہ تھا۔ علی یاور جنگ نے استعفیٰ دے دیا۔

۴۷-۸-۲۰ Negotiation Committee کی میٹنگ تھی۔ ۲۶؍تاریخ کو جن مسائل پر گفتگو کرنی تھی ان پر بحث کے دوران میں عبدالرحیم اور سروالٹر میں کچھ تیز و ترش گفتگو ہو گئی۔ سروالٹر اٹھ کر چلے آئے گفت و شنید کی کمیٹی سے تو پہلے ہی استعفیٰ دے چکے تھے۔ اب مشیر دستوری کے فرائض سے بھی علیحدگی اختیار کر لی اور استعفیٰ دے دیا۔ دراصل اتحاد کے لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان سے مصالحت ہو۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ حیدرآباد کو کس تباہی میں ڈال رہے تھے۔ میں نے سروالٹر کا استعفیٰ حضور نظام کے پاس بھیج دیا۔ دوسرے روز میری طلبی ہوئی اعلیٰ حضرت پریشان تھے۔ میں نے یہ عرض کیا کہ سروالٹر کو نظام خود بلا کر گفتگو کریں۔ میں ابھی مفاہمت کی بات چیت ہی کر رہا تھا کہ ۲۱؍اگست کے روزنامچہ ''پیام'' میں اتحاد کی مجلس عاملہ کا وہ ریزولیوشن شائع ہوا کہ جس میں انھوں نے سروالٹر علی یاور جنگ اور میرے اوپر بے اعتمادی کا اظہار کیا تھا اور یہ کہ اگر قاسم رضوی اور عبدالرحیم نہ ہوتے تو ہم لوگوں نے حیدرآباد کو ڈبو دیا ہوتا'' گو عبدالرحیم کو اس سے انکار تھا مگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ جلسہ مجلس عاملہ کا انہی کے گھر پر ہوا اور انھوں نے مجھ سے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

۴۷-۸-۲۳ مجھے H-E-H نے طلب فرمایا اور دست خاص سے لکھا ہوا ایک طویل نوٹ دیا اور حکم دیا کہ عبدالرحیم کو یہ نوٹ دیا جائے اور وہ اس کے مطالب سے قاسم رضوی کو آگاہ کریں۔ اس کی نقل عبدالرحیم لے سکتے ہیں۔ مگر اصل نوٹ واپس کر دیا جائے۔ میں نے شاہ منزل آ کر عبدالرحیم کو بلایا اور تعمیل حکم کی اور کہہ دیا کہ ۲۴؍تک جواب پیش کریں۔

”نقل نوٹ“

۵رشوال

نواب صاحب چھتاری

آپ عبدالرحیم ممبر آف کونسل کو طلب کر کے کہو کہ باوجود میرے فرمان شائع ہونے کے اتحاد المسلمین بے سوچے سمجھے کام کر رہی ہے کہ علانیہ پبلک میٹنگ میں رزولیوشن پاس کر رہی ہے وگرنہ اگر کچھ لکھنا تھا تو میرے ہاں لکھ کر پیش ہوتا تو میں اس پر غور کر کے جو کچھ جواب دینا ہوتا دیتا مگر ایسا نہیں ہو رہا۔

دوسری طرف ہنوز جس طور سے آمادہ فساد ہیں وہ ظاہر ہے۔اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلم طبقہ کی طرف سے اعلیٰ عہدہ داران کی توہین ہوتی رہے گی تو میں بحیثیت حکمراں اس کو جائز نہیں رکھ سکتا۔لہذا اس کا سد باب مجھ کو کرنا ہوگا۔اس کے سوا حیدرآباد نے جواب تک طریقہ کار اختیار کیا ہے اس سے مسٹر جناح کو اتفاق ہے۔ایسی حالت میں سردست گفت وشنید دہلی میں نہیں ہوگی۔لہذا کمیٹی نیگوشئشن کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔نظر برآں اس درمیانی وقت میں ایک خط میں وائسرائے کے نام بھجوا رہا ہوں جو کہ پریذیڈنٹ کونسل اور مشیر دستوری لے جا رہے ہیں۔(بہ حیثیت قاصد) اور جو کچھ جواب وائسرائے دیں گے وہ لا کر مجھ کو پہونچائیں گے جس پر میں غور کرتے وقت کونسل کی رائے خط کے جواب کے متعلق حاصل کرونگا قبل اس کے کہ کوئی قطعی کارروائی اختیار کروں۔

الحاصل عبدالرحیم کو حکم دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے یہ قاسم رضوی سے کہدیں تاکہ وہ اس سے لاعلم نہ رہیں۔عبدالرحیم چاہیں تو اس نوٹ کی نقل لے سکتے ہیں بہرحال زمانہ پرآشوب ہے اس لیے میرے خط کا جواب وائسرائے کے دینے تک کسی قسم کی چیز یہاں منجانب اتحاد المسلمین وقوع میں نہ آئے ورنہ اس کی ذمہ داری اس پر عائد ہوگی۔

مکرر:

باجود میری صراحت کے اگر اتحاد المسلمین اسی طرح سے کام کرتی رہے گی (مخالفانہ) تو میں مجبور ہوں کہ سب واقعات سے مسٹر جناح کو بتوسط تحریر آگاہ کروں۔

ضمیمہ

رحیم سے گفتگو کرنے کے بعد آپ آ کر کل مجھ کو نتیجہ سے اطلاع دینا اور اس نوٹ کی نقل اپنی مثل کے لیے رکھ کر یہ واپس لا کر مجھ کو دینا تا کہ میری مثل میں رہے۔

مجھے حیرت ہے کہ عبدالرحیم باجود سب امور کا علم رکھتے ہوئے بہ حیثیت ممبر آف کونسل و ممبر نیگوشیشن کمیٹی انھوں نے رضوی سے سب امور کی وضاحت نہیں کی۔ معلوم نہیں کہ اس کی کیا وجہ تھی۔ حالانکہ میں ان کو ہر چیز سے باخبر سمجھتا تھا۔

مکرر:

کچھ عرصہ قبل میں نے رضوی کو بالمشافہ طلب کر کے گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ وہ پبلک ادارے کے پریزیڈنٹ تھے۔ دوسرے فریق کے ساتھ بھی ایسا کرنا ضروری تھا مگر اب حالات میں کسی قدر تغیر ہوا ہے لہذا میرا ارادہ ہے کہ قریب میں کسی دن ان کو نذری باغ طلب کر کے رحیم کے ساتھ گفتگو کروں گا۔

مکرر:

اس امر کو بھی پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ حالیہ اتحاد المسلمین کے رزولیوشن کی وجہ سے پریزیڈنٹ کونسل مشیر دستوری علی یاور جنگ نے میرے ہاں استعفیٰ پیش کر دیا ہے مگر میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ جب تک میں خود مناسب نہ سمجھوں گا استعفیٰ کو منظور نہیں کر سکتا۔ لہذا وہ کام کرتے رہیں کیونکہ حکمراں ہی ایک ایسا شخص ہے جو ہر چیز کے مالہ وماعلیہ کو سمجھ کر تصفیہ کرتا ہے جیسا کہ میں نے اپنے حالیہ فرمان میں بیان کر دیا تھا۔

اس ملاقات میں بھی عبدالرحیم صفائی قلب اور خلوص سے بات نہیں کر رہے تھے۔ زبان سے سب کچھ موافقت میں کہتے تھے مگر دل سے نہیں۔

۲۳-۸-۴۷ میں نے حسب الارشاد اعلیٰ حضرت کا دستی نوٹ واپس کیا اور عبدالرحیم کا جواب پڑھ کر سنایا۔ (میرے پرانے کاغذوں میں یہ اصل محفوظ ہے) نوٹ کے جواب میں عبدالرحیم کا خط ''علی نور'' تھا۔ اس کی نقل حسب ذیل ہے۔

عالی جناب صدر اعظم بہادر۔

''میں نے حسب الحکم سرکاری مولوی قاسم رضوی کو واقعات (مندرجہ) فرمان مبارک بتلانے کی سعادت حاصل کی''

۱- ''رضوی صاحب نے کوئی جواب دینے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ اس سے پہلے پیر و مرشد نے خود کسی عرض اور معروضہ سے منع فرمادیا ہے۔

۲- میں نے ان سے دریافت کیا کہ کسی بات کو پبلک کرنے سے پہلے آپ سرکار سے عرض کیوں نہیں کرتے۔ تو رضوی صاحب نے جواب دیا کہ سرکار کو معروضوں کے ذریعہ عرض کئے بغیر کوئی بات میں نے پبلک نہیں کی۔''

میں نے جب باریابی ہوئی تو یہ خط عبدالرحیم صاحب کا اعلیٰ حضرت کو پیش کیا۔ روزنامچہ میں یہ الفاظ ہیں۔

''میں نے اس خط کو بار بار پڑھ کر سنانے کی کوشش کی مگر سرکار توجہ کرنے سے گریز فرماتے تھے۔ بالآخر فرمایا تو یہ کہا اس کا تو مجھے کوئی علم نہیں تھا' یہ صورت حال میرے واسطے بحیثیت صدر اعظم تکلیف دہ تھی۔

اب سر والٹر کی بددلی رفع کرنے کا سوال تھا۔ میں نے لائق علی صاحب کو بلا کر مشورہ کیا۔ ان کی رائے تھی کہ قاسم رضوی اور سر والٹر مل کر گفتگو کرلیں اور لائق علی دونوں کو ناشتہ پر بلائیں۔ میں نے اتفاق کیا۔ دوسری طرف سرکار نے وائسرائے کو خط لکھ کر سر والٹر پر زور دیں کہ وہ ولایت واپس نہ جائیں۔

۴۷-۸-۲۵ میرے خیال میں یہ آیا کہ پھر استعفیٰ پیش کروں مگر صغیر صاحب مرحوم کا یہ خیال تھا کہ زبانی نظام سے گفتگو کر کے اسے طے کروں۔ کسی مناسب موقع پر عرض کروں گا۔ حضور نظام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اعلیٰ حضرت نے دریافت کیا کہ وہ قاسم رضوی کو بلا کر بات چیت کرنا چاہتے ہیں وہ کھل کر قاسم رضوی سے بات کریں۔ میں نے عرض کیا ''جو شخص مالک کے رازوں کا احترام نہ کرے وہ اس قابل نہیں کہ اس سے کھل کر بات چیت کی جائے''۔ میرا اشارہ عبدالرحیم کے اس خط کی طرف تھا کہ جس

کی نقل اوپر لکھ چکا ہوں۔ جس میں قاسم رضوی نے یہ کہا تھا کہ "سرکار کو معروضوں کے ذریعہ عرض کئے بغیر میں نے کوئی بات پبلک نہیں کی" اس پر اعلیٰ حضرت نے "بہت ٹھیک"، "بہت ٹھیک" دوبار فرمایا۔ پھر لائق علی کے متعلق دریافت کیا کہ ان سے نظام کھل کر بات چیت کریں یا نہیں۔ میں نے کہا کہ لائق علی بہت معقول اور ذی ہوش شخص ہیں۔ سرکار ان سے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ لیکن مسٹر جناح کے اُن سے تعلقات ہیں اس کا خیال رہے۔

آج لائق علی آئے اور میں نے سرکار نظام کا حکم کہ وہ اپنی موجودگی میں سر والٹر اور قاسم رضوی سے مفاہمت کرادیں۔ پہونچا دیا۔ پھر لائق علی بہت دیر تک رہے کہ انھیں نہ گفت و شنید کی کمیٹی کی رکنیت چاہئے اور نہ وزارت۔ یہ چیزیں ان کے دائرۂ عمل سے باہر تھیں اور بقول ان کے انھوں نے اس خیال کا اظہار اتحاد پارٹی پر بھی کردیا ہے۔ میں یہ سوچتا رہا کہ اس تقریر کا کیا موقع تھا۔ پر مجھے خیال آیا کہ چار پانچ روز پہلے صدارت عظمیٰ کے سلسلے میں زین یار جنگ مرحوم نے کہا تھا کہ اتحاد پارٹی کی طرف سے ایک عرض داشت نظام کو دی گئی ہے جس میں لائق علی صاحب اور جنرل الادروس کا نام پیش کیا ہے ممکن ہے یہ وجہ ہو جو انھوں نے یہ تقریر کی۔ کاش انہیں یہ معلوم ہوتا کہ میں اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا اگر کوئی اور شخص صدر اعظم ہو جائے تو مجھے رہائی نصیب ہو اور میں اس کا شکریہ ادا کروں۔

۲۴ راگست کو سرکار نے وائسرائے کو تار دیا کہ وہ سر والٹر مانکٹن کو سمجھائیں کہ وہ استعفا واپس لیں اور ولایت نہ جائیں۔ ۲۶ رکو جواب آیا وائسرائے نے مانکٹن کو دہلی بلایا اور وہ چلے گئے۔

۲۸ راگست سرکار نے مجھے وہ تار دکھایا جو گورنر جنرل (۱۵ راگست کے بعد وائسرائے نہیں رہے تھے) نے سرکار کو دیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر حیدرآباد اسی طرح پس و پیش کرتا رہا تو حیدرآباد کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو اور ریاستوں کے ساتھ کیا گیا تھا اور کوئی امتیازی شکل نہ ہو سکے گی۔ اس تار میں اس کا بھی اشارہ تھا کہ حیدرآباد میں رائے عامہ کے ذریعہ سے معلوم کیا جائے کہ وہاں کے لوگ کی

اکثریت کی کیا خواہش ہے۔

اس تار سے نظام بھی پریشان ہوئے اور جب میں نے یہ تار معین نواز جنگ، لائق علی صاحب اور عبدالرحیم کو دکھایا تو ان کی صف میں بھی انتشار پیدا ہوا لیکن یہ کیفیت تجربہ سے معلوم ہوا کہ عارضی تھی۔

حیدرآباد جب بھی تھا اور اب بھی ہے۔ جغرافیہ کے اعتبار سے ملکوں میں تبدیل نہیں ہوتی۔ حکومتیں بدلتی ہیں۔ افراد کی تقدیریں بدلتی ہیں۔ ترقی وتنزل کے چکر اسی طرح کارفرما ہوتے ہیں کہ ؏

زمیں زیرپا کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

مجھے فکر تھی کہ آصفیہ خاندان کو جتنا ممکن ہو انقلاب کے اثر سے بچالیا جائے اور وہ حکومت ہند سے مصالحت سے ممکن تھا ورنہ نہیں۔ جو مستقبل کی تصویر میرے ذہن میں تھی اس کا یقین حیدرآباد کے لوگوں کو نہ تھا۔

وہ بدگمان تھے اور حضور نظام کو میرے ہم خیال لوگوں سے بدگمان کرتے تھے۔ میرے متعلق کہا جاتا تھا اور اخبار میں پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا کہ میری زمینداری اور ریاست کانگریسی حکومت کے قبضہ قدرت میں ہے۔ میں کانگریس کے خلاف کیسے کرسکتا تھا۔ سروالٹر مانکٹن کو کہا جاتا تھا کہ وہ گورنر جنرل کے دوست ہیں اور ان کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ سروالٹر اس پر مصر تھے کہ قاسم رضوی نے جو بیانات ان کے خلاف اخباروں میں دیئے ہیں جب تک ان کی تردید نہ ہو وہ اپنا استعفیٰ واپس نہ لیں گے۔

۲۸-۸-۴۷ وزراء کی کونسل میں وہ خط پیش کیا گیا جو قاسم رضوی نے سروالٹر کو مطمئن کرنے کے لیے مجھے لکھا تھا۔ جس کی نقل یہ ہے۔

Darus Salam,
Hyderabad,
28-08-1947

My dear Nawab Saheb,

I am writing this in continuation of my conversation yesterday. I am glad the misunderstanding is now removed. So long as the basis of negotiations and future relations with the

new Government of India remains a treaty and not accession in any form I am sure that the Muslim Community of Hyderabad will give Your Excellency and Sir Walter Moncton, the Constitutional adviser of the Negotiating Committee which I expect will be formed including people commanding public confidence, every moral support and the Majlis Ittihadul-Muslimin shall duly give public expression to their feelings.

I have convened a meeting of the Majlis Amela this evening and will place the matter before them and shall communicate their resolution in this regard to you and release it to the Press.

I remain.

Yours sincerely
Sd/- Q. Rizvi
President
Ittihadul Muslimin

Nawab Ahmad Said Khan of Chhatari,
H.E. The Prime Minister,
Hyderabad.

اس خط کا انداز تحریر محتاج بیان نہیں۔ اس کا فیصلہ کہ معاہدہ ہو یا Accession نہ نظام پر منحصر تھا نہ حکومت حیدرآباد پر بلکہ قاسم رضوی پر تھا۔ دو ایک لفظی ترمیم کے ساتھ میں نے اسے قبول کرلیا اور سر والٹر مانکٹن کو بھی راضی کرلیا تاکہ وہ اپنی مساعی کو جاری رکھیں اور آصفیہ خاندان کی حفاظت کرسکیں۔ اس خط کے آخر میں جس رزولیوشن کے پاس کرنے کا ذکر کیا ہے وہ کبھی پاس نہیں کیا اور کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اسے ٹالا گیا۔

اسی دوان میں لائق علی صاحب نے ایک سفر پاکستان کا کیا اور واپس آکر مجھ سے کہا کہ مسٹر جناح کو بڑی ہمدردی ہے۔ پھر کہا کہ مسٹر جناح انھیں U.N.O میں بھیجنا چاہتے ہیں لیکن اگر حضور نظام کو ان کی خدمت کی ضرورت ہو تو مسٹر جناح کو

لکھ دیں کہ وہ لائق علی صاحب کو امریکہ نہ بھیجیں۔ پھر یہ بھی خواہش کی کہ اگر نظام انھیں ایک تعارفی خط شاہ انگلستان اور وزیر اعظم کے نام دیدیں تو وہ ولایت جا کر کوشش کریں گو میں جانتا تھا کہ ایک آئینی حکومت میں بادشاہ، کچھ دخل نہیں دے سکتا۔ مگر سنتا رہا۔

۴۷-۹-۷ سر والٹر دہلی میں تھے۔ انھوں نے مطلع کیا کہ ۸ر ستمبر کو حکومت ہند کے نمائندوں اور گورنر جنرل کی خواہش سے حیدر آباد کے مستقبل پر گفتگو ہوگی۔

میں سر والٹر مانکٹن کی خواہش کے مطابق ہوائی جہاز سے روانہ ہوا۔ ہوائی جہاز ناگپور پر رکا۔ وہاں لوگوں سے معلوم ہوا کہ دہلی میں انتظامی حالت بہت بگڑی ہوئی ہے۔ قتل وغارتگری کا بازار گرم ہے۔ مگر دہلی جا کر جو کچھ دیکھا اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔

ولنگڈن ہوائی اڈے پر پہونچ کر سب سے پہلے جو غیر معمولی چیز معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جو موٹر مجھے لینے آیا تھا وہ بجائے باہر کھڑے ہونے کے جہاں ہوائی جہاز رکا تھا۔ اس کے پاس آکر کھڑا ہوا اور حیدر آباد کی فوج کے دو سپاہی معہ رائفل نکل کر کھڑے ہوگئے اور جلد ہی مجھے موٹر میں سوار کرا کر میرے ساتھ بیٹھ کر چل دیئے۔ راستہ میں دیکھا کہ ایک شخص فوجی وردی پہنے ہوئے ایک انسانی نعش کو ٹانگ پکڑے ہوئے اس طرح گھسیٹ کر لے جا رہا تھا کہ جیسے صفائی کے محکمہ کے لوگ مردہ کتے کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ قتل وغارتگری اور ہلاکت سامانی کا بازار گرم تھا۔ دہلی ایک ہو کا مقام تھا۔ میں نے سنا کہ سکھ اور پنجابی فوجی ہتھیاروں سے مسلح قتل وغارتگری میں مصروف تھے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت معطل ہوگئی تھی۔ حیدر آباد مہمان خانہ میں جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ملازمین جو اکثر مسلمان تھے مکان میں مقید تھے۔ میں نے خورشید مرحوم آئی سی۔ ایس کو جو دہلی میں چیف کمشنر تھے ٹیلی فون کیا۔ مرحوم نے کہا کہ انتظام کریں گے۔ مگر کوئی انتظام نہ ہوسکا۔ آخر اپنے ہی ایک آدمی کو موٹر میں دو مسلح سپاہیوں کے ساتھ بھیجا وہ کہیں سے کچھ کھانے کا سامان لائے کہا جاتا تھا کہ اس قتل وغارتگری میں پٹیالہ کی فوج کا بڑا حصہ تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ کہاں تک سچ

تھا۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں یہ نہ لکھوں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے مردانہ وار مسلمانوں کو بچانیکی کوشش کی۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ پر حملہ ہونے والا ہے تو خود موٹر میں وہاں پہنچے ار جامعہ کو بچایا۔ اس زمانے میں مسز سبھد را جوشی اور مسز اندرا گاندھی نے بھی مسلمانوں کے محلّہ میں جا کر انھیں بچانے کی بہت کوشش کی اور جو مسلمان خطرے میں تھے انھیں وہاں سے نکالا۔

صبح کو گورنمنٹ ہاؤس گیا مگر گفتگو کیا ہوتی۔ وائسرائے اور ساری حکومت اس رست وخیز سے پریشان تھی۔ حکومت کی کشتی کو سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں لارڈ ازمیے کے کمرہ میں بیٹھا تھا اور سر والٹر اور ہم باتیں کر رہے تھے کہ فون آیا کہ مسلح سکھ اور ہندو لیڈی ہارڈنگ ہسپتال پر حملہ کر رہے ہیں۔ فوراً انگریزی باڈی گارڈ کا دستہ بھیجا گیا اور بلوائی لوگوں پر فیر کر کے انہیں منتشر کیا۔ انسانی سفاکی کی کتنی شرمناک مثال ہے کہ زنانہ ہسپتال میں جا کر مریضوں کو تہ تیغ کیا جائے۔

بہرحال میں نے اور سر والٹر مانکٹن نے نظام کا نقطہ نظر بیان کر دیا کہ وہ معاہدہ کرنے کو تیار ہیں مگر Acceed کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

۱۱ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو میں حیدر آباد آ گیا میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب مجھے ان خطوط کی نقل ملیں جو اعلیٰ حضرت نے بادشاہ اور وزیر اعظم انگلستان کے نام لائق علی صاحب کو دیئے تھے نہ سر والٹر مانکٹن مشیر قانونی سے مشورہ کیا اور نہ مجھ سے کوئی مشورہ ہوا۔ اس پر کیا تنقید کروں۔

بہرحال حضور نظام اپنی مصالح مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ زمانہ یوں تو سارے ہندوستان کے واسطے پر تشویش تھا۔ مگر حیدر آباد میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ قاسم رضوی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی سازشیں اب علانیہ بغاوت کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ میں نے اس صورت کے نتائج پر غور کر کے پھر سبکدوش ہونے کی خواہش ظاہر کی مگر منظور نہ ہوئی۔ میں پریشان تھا اور اسی طرح سر والٹر مانکٹن بھی ولایت واپس جانا چاہتے تھے۔ نظام نے سر سلطان احمد مرحوم کو جو پٹنہ کے باشندے تھے بلا لیا تھا۔ تاکہ اگر سر والٹر نہ مانیں اور ولایت چلے جائیں تو وہ انکی جگہ مشیر قانونی کا کام کریں۔ وہ

میری اور سر والٹر کی رائے سے متفق تھے کہ کسی طرح ہندوستان سے فیصلہ کرلیا جائے۔ آزادی کامل کا ملنا ناممکن ہے میرے شرکاء میں زین یار جنگ مرحوم نواب مہدی یار جنگ اور محمود یار جنگ مرحوم تو دل سے میرے ہم خیال تھے مگر باقی حضرات قاسم رضوی کو خبریں پہنچاتے تھے۔

میرے مشورے سے سر والٹر نے ایک طویل نوٹ لکھا جس کا منشاء یہ تھا کہ نظام کو یہ صاف صاف بتایا جائے کہ اگر آپ صلح نہیں کریں گے اور شریک نہیں ہوں گے تو آپ کی ہندو رعایا ایجی ٹیشن کریگی۔ باہر کی جماعتیں ساتھ دیں گی بغاوت ہوگی۔ نقض امن ہوگا اور حیدرآباد کا وجود خطرہ میں آجائے گا۔

یہ نوٹ ۱۵ر ستمبر کی وزراء کی کونسل میں پیش کردیا گیا۔ میں چاہتا تھا کہ حضور نظام کے سامنے پوری مستقبل کی تصویر آجائے...... یہ نوٹ بہت طویل تھا جس میں سر والٹر مانکٹن نے یہ بتایا تھا کہ انھوں نے بحیثیت حیدرآباد کے ایک نمایندہ کے کیا کیا کوششیں کیں۔ جس میں ہم نے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا تھا کہ جو حیدرآباد کو پیش آنے کا امکان تھا تا کہ نظام کے سامنے پوری تصویر آجائے۔

اس نوٹ کا اقتباس یہ ہے:-

Note by Sir Walter Moncton for Council

15th September, 1947

I wanted an opportunity before my departure to England to explain my policy and give a final opinion on the situation.

1. My object has been to advise a course calculated to obtain for Hyderabad the maximum degree of real, practical independence, compatiable with its prosperity and security.
2. In working for the object we have to recognize and take into account the facts as they are and remember that they may not all be permanent.
3. The overmastering immediate facts include the facts.

(a) that Hyderabad is land locked in the belly of Hindustan.

(b) that Pakistan established state to be able to give effective help; not yet in a sufficiently.

(c) that therefore, if Hyderabad is to remain independent she must stand on her own feet. What I think Hyderabad must be prepared to meet is:-

(a) a violent propaganda campaign against the State inside India and in England and the U.S.

(b) a recrudescence of trouble from the State Congress who are likely to get financial help from the Congress Party (not of course from the Dominion Government as such);

(c) a great deal of covert economic, financial and business pressure and obstacles.

There is moreover the fear that at a later stage, if it becomes necessary to deal severely with hostile Hindu elements in the State, the Dominion Government might find an excuse to say that they cannot stand by and see the Hindus oppressed and ill treated in the State, which is wholly within their border: they might then ultimately intervene by force; or again if there were interruptions in Railway, telegraphic or telephonic communications in the State, the Dominion Government might make an opportunity to intervene on the ground that these are communications vital to the security of the Dominion.

۲۱ ستمبر کو ہم لوگ پھر دہلی پہونچے۔ اس دفعہ سر سلطان احمد مرحوم بھی ساتھ تھے۔ سر والٹر مانکٹن پہلے جا چکے تھے۔ انھوں نے اپنی ملاقات کا نوٹ تیار کیا جو ہم لوگوں کو دکھایا جس سے یہ معلوم ہوا نظام مجھ سے چھپا کر جو کچھ بالا بالا کر رہے تھے اس

سے حکومت ہند پوری طرح واقف تھی کہ نظام مجھ پر اور سر والٹر مانکٹن پر جس اعتماد کا اظہار کرتے تھے اور گورنر جنرل کو جو یقین دلاتے تھے وہ حقیقت حال کے خلاف تھا۔ مانکٹن نے اس نوٹ میں یہ بھی کہا کہ اگر حیدر آباد کا یہی طرز عمل رہا تو حکومت ہند۔ گفت وشنید بند کردے گی۔

۲۲ر ستمبر: دوسرے روز گورنر جنرل سے ملاقات ہوئی۔اس ملاقات میں V.P Menon بھی شریک تھے گورنر جنرل نے اس ملاقات میں ہمیں یقین دلایا کہ Accession کی صورت میں بندرگاہ کے متعلق ہمیں ہر قسم کی سہولت دی جائے گی اور برار کا قصہ بھی اطمینان بخش طور پر طے ہو جائے گا اور دوسرے فوائد بھی حاصل ہوں گے۔انھوں نے کہا کہ وہ اپنی حکومت کو اپنا ہم خیال بنائیں گے اور لوگ نظام کو راضی کریں۔گورنر جنرل نے یہ بھی کہا کہ وہ خود شاہ پسند ہیں جو کچھ کہا ہے وہ حیدر آباد کی ہمدردی میں کہا ہے۔اگر کوئی مفاہمت نہ ہوسکی تو گورنمنٹ کو تو دشواریاں ہوں گی لیکن حیدر آباد ایک ریاست کی حیثیت سے تباہ ہو جائے گا۔انھوں نے اس کا بھی یقین دلایا کہ حیدر آباد کی حکومت کے اندرونی معاملات میں حکومت ہند دخل نہیں دے گی۔گورنر جنرل نے یہ بھی کہا کہ حیدر آباد کے لوگوں کی رائے لے لی جائے۔

۲۳ر ستمبر: حیدر آباد وہ ہی پرانی داستانیں شروع ہوگئیں۔کاؤنسل کے جلسے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضری حکومت کے خلاف سازشیں۔

۹ر اکتوبر کو ہم لوگ پھر دہلی گئے۔گفتگو کا وہی رنگ رہا اور نتیجہ کچھ نہ نکلا جام صاحب نوانگر نے اس خیال کا اظہار دہلی میں کیا تھا کہ حیدر آباد ممکن ہے پاکستان کے واسطے Spiring Board بنے اور جنوب سے ہندوستان پر حملہ ہو جائے میں اس کے خلاف حیدر آباد میں ریڈیو پر بیان دے چکا تھا اور دہلی میں اس کی تردید کی۔

مسٹر مینن ۹ر اکتوبر کو حیدر آباد آکر وہاں کے قصے خود ختم کرنا چاہتے تھے۔ مجھے اس سے اتفاق تھا۔مسٹر مینن ایک غیر معمولی قابلیت کے انسان تھے وہ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے ترقی کر کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری ہوئے اور سردار

پٹیل کے خاص معتمد تھے۔لیکن اتحاد المسلمین کے لوگ اس کے خلاف تھے۔نظام کو اطلاع دی گئی کہ اگر مسٹرمینن آئیں گے تو ہندوان کا استقبال کریں گے اور اتحاد کے لوگ مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔نظام کو حکم ہوا کہ ان کا آنا روکا جائے۔مجھے تعمیل کرنی پڑی اور ناخوش گوار طریقے سے لکھنا پڑا جواب میں جوان کا تار آیا اس کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اثر قدرتاً خراب ہوا۔

نقل تار درج ذیل ہے:

I deeply regret that the law and order situation in Hyderabad should have so gone beyond the Government's control as to compel you to ask me at the last moment to abundantly visit which was arranged at the instance of your representative and in consultation with your Government. If you still think that continuance of negotiations in such circumstances would yield any useful results, we have no objection to your delegation coming here on Thursday.

یہ محتاج بیان نہیں کہ اس غلطی کا اثر ہماری دہلی سے گفت وشنید پر کیا پڑا۔

۱۱ر اکتوبر ۴۷ء کو میں نے ایک خط لیاقت علی خاں مرحوم کو جو پاکستان کے وزیراعظم ہو گئے تھے لکھا مسٹر کھرو جو سندھ کے چیف منسٹر تھے نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ پاکستان اسلامی حکومت ہوگی۔میں نے لیاقت علی خاں کو اس طرف توجہ دلائی کہ مذہب کے اعتبار سے وہ لوگوں میں فرق نہ کریں۔میں نے Theocratic گورنمنٹ کے خلاف انھیں لکھا اور اس خط کی ایک نقل غلام محمد صاحب مرحوم کو اپنے خط کے ساتھ بھیجی۔لیاقت علی خاں مرحوم نے کوئی جواب نہیں دیا مگر غلام محمد مرحوم نے جواب دیا جس کا منشاء یہ تھا کہ مسٹر جناح کی بھی یہی پالیسی ہے جو میں نے خط میں چاہی تھی۔ان خطوط کی نقول حسب ذیل ہیں۔اس زمانے کے حالات ایسے تھے کہ مجھے ان خطوط کا بھیجنا ناگزیر تھا۔

New Delhi,
11th October, 1947

My dear Liakat,

As some of my messages were lept unreplied I would not have taken the liberty to encroach upon your time as I know how terribly busy and worried you are at present. But I do think that in the interest of Muslims of the minority provinces I must write to you, the recent statement by the Chief Minister, Mr. Khuro in which he said that Sind is the Islamic Government, has caused certain amount of difficulties for the Muslims in the minority Provinces. If they are going to form theocratic Government in Pakistan, there will be every justification to Hindus to form a Hindu Raj in rest of India and, therefore, I would request you to make a definite declaration on this question or advice His Excellency the Qaide Azam to make some announcement including the following points:

(1) That the formation of Government in Pakistan will be on secular basis and not on religious basis:

(2) That a declaration about the protection and rights of minorities in Pakistan; and

(3) That an expression of disappointment and regret at what happened in Western and Eastern Punjab with an assurance of protection and fair treatment to those who had left their homes and property if they come back to western Punjab.

So that on the basis of reciprocity Muslims in minority Provinces may hope to receive the same protection.

With kindest regards,

Yours very sincerely
Sd/-Ahamd Said Khan

The Hon'ble Nawabzada Liakat Ali Khan,
Prime Minister, Karachi.

Camp New Delhi,
11th October, 1947

My Dar G.M.

I herewith attach a copy of the letter written to Nawabzada Liaqat Ali Khan. As Liaqat could not reply to my letters since he left Delhi. I am sending a copy to you also to make a sincere effort in the interest of the minority Provinces to get such declaration, as I have suggested in my letter to the Prime Minister from Pakistan in most unequivocal terms. You can show this copy of my letter to the Prime Minister and to Qaide Azam, if necessary. What I wrote to Liaqat is not against the policy of Pakistan, but it should be made clear. For instance, the Chief Minister, Mr. Khuro in one of his speeches said something about Islamic State. They should be advised not to speak in these terms.

With kindest regards.

Yours very sincerely
Sd/- Ahmad Said

The Hon'ble Mr. Ghulam Mohammad,
Finance Minister,
Karachi.

Reply to my letter from Ghulam Mohammad Sahib the then Finance Minster, Pakistan.

D.No. 196

Government of Pakistan
Ministry of Finance
KARACHI.
15-10-1947

My dear Nawab Sahib,

I have to thank you for your letter of the 11th October with which you have sent me a copy of your letter of the same

date addressed to Mr. Liaqat Ali Khan.

I am sure you have been studying the papers and have read the speeches of Qaida Azam and other members of the Pakistan Cabinet which have definitely and categorically dealt with the points raised by you. I deal with these seriatim.

1. Definite declarations have been made by the Qaide Azam and other members of the Cabinet that Pakistan will be a secular State.

2. Definite declarations have been made by the Qaide Azam and other members of the Cabinet about the protection of rights of minorities in Pakistan which shall be the same as any other citizen.

3. Both Qaide Azam and other members of Cabinet have condemned in no uncertain terms and deplored what has happened in the Punjab. There is no bar and Pakistan is prepared to let any one who went of his own accord out of Pakistan to come back. You will agree the question of mass retransfer of population, however would raise a definite practical and other difficulties and would need consideration.

With kind regards,

Yours sincerely
Sd/- Ghulam Mohammad

Nawab Ahmad Said Khan Sahib,
Prime Minister,
Hyderabad

یہ زمانہ صرف حیدرآباد ہی کی پریشانی کا نہ تھا بلکہ ہندوستان بھر میں اس قدر انتشار اور مستقبل کے متعلق تذبذب تھا کہ کسی کو آنے والے زمانے کی تصویر صاف نظر نہیں آتی تھی۔ حیدرآباد میں ہر کوشش اس انقلاب کے طوفان سے بچنے کی ناکامی ہوجاتی تھی۔ نظام کے دفتر سے ہماری ہر تجویز کی نقل اتحاد المسلمین کو دی جاتی تھی اور جوان لوگوں کی رائے ہوتی تھی۔ اس سے حضور نظام متاثر ہوتے تھے اس زمانہ میں اپنا

روزنامچہ صغیر صاحب مرحوم اپنے پرائیوٹ سکریٹری کو نہیں لکھا سکا۔ آئندہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ اپنی یاد اور مسٹر وی. پی مینن کی کتاب Integratian of the Indian States کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔

حیدرآباد کی کہانی سے الگ لیاقت علی خاں اور غلام محمد کے خطوط کا تذکرہ جملہ معترضہ ہو گیا۔

اب پھر حیدرآباد کی کہانی شروع کرتا ہوں مسٹر مینن کے تار کے بعد یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ اب گفت وشنید کی فضا بہت ناموافق ہو گئی تھی۔ بہر حال ہمارا ڈیلیگیشن دہلی گیا جو سر والٹر، سر سلطان اور راقم پر مشتمل تھا۔ ۱۰/ اکتوبر کو وائسرائے گورنر جنرل Lord Mauntbotton سے ملاقات ہوئی۔ سب سے پہلے مسٹر مینن کے حیدرآباد نہ آنے کا مسئلہ درپیش ہوا میرے لیے اس غلطی کی صفائی میں بڑی دشواری تھی بہر حال کسی نہ کسی طرح یہ قضیہ ختم ہوا۔

سر سلطان احمد نے مسٹر مینن سے دریافت کیا کہ حیدرآباد کو کیا فائدہ ہندوستان میں شرکت سے ہوگا۔ انھوں نے وہی کہا جو گورنر جنرل ایک بار کہہ چکے تھے یعنی برار۔ کسی بندرگاہ سے حیدرآباد کے مال کی درآمد برآمد وغیرہ بہت سی گفت وشنید کے بعد سر والٹر مانکٹن نے یہ سوال کیا کہ اگر حیدرآباد کو کامل Acce ssion منظور نہ ہو تو کوئی اور صورت بھی ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان ہو سکتی ہے جس سے وہ ہی مقصد پورا ہو جائے گورنر جنرل کا جواب نفی میں تھا۔ مسٹر مینن نے سردار پٹیل کے مشورے کے بعد سر والٹر اور گورنر جنرل سے کہا کہ اگر Accession کا مطلب کسی Stand Still معاہدے سے پورا ہو جائے تو عارضی طور پر کیا جا سکتا ہے۔

۱۱/ اکتوبر ۴۷ء کو ہمارا ڈیلیگیشن پھر حیدرآباد آ گیا بڑی بحث کے بعد وزرا نے ایک مسودہ Stand Still کا منظور کیا جسے لے کر ہم لوگ پھر ۱۶/ تاریخ کو دہلی آئے۔ اس کے ساتھ نظام کی طرف سے ایک خط بھی تھا حکومت ہند نے نہ اس مسودہ سے اتفاق کیا اور نہ نظام کے خط کو کوئی خیال کیا۔ مسٹر مینن نے سردار پٹیل سے مشورہ کے بعد کہا کہ اگر ڈیفنس اور صیغہ خارجہ External Department پر حیدرآباد

گورنمنٹ کی تجویز سے اتفاق نہیں کرتا تو گفت وشنید بیکار ہے۔ ختم کردی جائے۔
جب گورنر جنرل کو مینن نے اس صورت حال کی اطلاع دی تو انھوں نے اظہار افسوس کیا اور دوسرے روز گورنر جنرل سے مینن اور سر والٹر سے ملاقات ہوئی اور مسٹر مینن سے کہا گیا کہ تم ایک مسودہ عارضی معاہدہ Stand Still اور اس کے ساتھ نظام کی طرف سے جو خط ہے Coll Ateral letter تیار کرو۔ چنانچہ مسٹر مینن نے مسودہ لکھا۔ اور اس کے ساتھ گورنر جنرل جو نظام کو ان کے خط کا جواب دیں گے۔ لے کر ۲۲/ اکتوبر کو ہم لوگ حیدرآباد واپس آ گئے۔ ہم نے وہ کاغذات جاتے ہی نظام کے حضور میں پیش کئے اور اعلیٰ حضرت نے وزراء کی کونسل کی رائے طلب کی۔ ۲۳/۲۴/۲۵/ اکتوبر کو کونسل کے اجلاس ہوتے رہے آخر کار وزراء میں چھ (۶) کی رائے موافقت اور تین کی خلاف رہیں میں نے اکثریت کی رائے پیش کر کے نظام سے عرض کیا کہ وہ منظور فرما کر خط پر دستخط کر دیں حضور نظام نے منظور کر لیا لیکن دستخط کرنے کو دوسرے دن پر ملتوی کیا۔ جب ۲۸/ اکتوبر کی شام کو ڈیلی گیشن نے دستخط کرنے کے واسطے عرض کیا تو ارشاد ہوا کہ کل صبح دستخط کریں گے یہ روز ہمارے دہلی واپس جانے کا تھا۔

تین چار بجے صبح سے بیس پچیس ہزار اتحاد کے لوگوں نے میرا، سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد کے مکان کو گھیر لیا تا کہ ہم لوگ Stand Still کا معاہدہ دہلی نہ لے جاسکیں۔ مجھے صغیر صاحب مرحوم میرے پرائیوٹ سکریٹری نے سونے کے کمرے میں آ کر مطلع کیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر سر والٹر اور لیڈی مانکٹن کی ہوئی۔ میں نے انھیں حیدرآباد کی فوج کے ایک برٹش افسر کے یہاں پہنچوا دیا۔ صبح آٹھ بجے نظام کا حکم آیا کہ ڈیلی گیشن دہلی نہ جائے اور وائسرائے کو تار دیا کہ ڈیلی گیشن ۳۰/ یا ۳۱/ کو آئے گا۔ بعض غیر متوقع اسباب سے ۲۷/ تاریخ کو نہ آسکے گا۔

دوسری روز شام کو نظام نے سر سلطان، سر والٹر اور مجھے دفتر پیشی میں طلب فرمایا۔ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو قاسم رضوی بھی وہاں موجود تھے۔ نظام کے استفسار پر قاسم رضوی نے کہا کہ اگر ملکی لوگوں کا ڈیلی گیشن جائے اور حکومت ہند پر زور ڈالے تو وہ ضرور اس سے بہتر شرائط لائے گا۔ اس لیے کہ حکومت ہند دوسری طرف کشمیر میں

اتنی الجھ رہی ہے کہ وہ ہمارے شرائط منظور کرلے گی۔ کشمیر میں کچھ پشاوری قبائل کے لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ رضوی کا اشارہ اسی جانب تھا۔

ہم تینوں نے نظام سے عرض کیا کہ قاسم رضوی کا خیال غلط ہے اور محض خوش فہمی پر ہے لیکن نظام کا رجحان خاطر اسی طرف تھا۔ میں نے عرض کیا کہ انہیں موقع دیا جائے اگر حضور کا خیال ہے کہ حیدرآباد کی خدمت یہ کامیابی کے ساتھ کر سکیں گے تو ہم لوگوں نے ڈیلی گیشن سے استعفیٰ دے دیا۔

مجھے بہت افسوس تھا اور حیدرآباد کے مستقبل کی تصویر میرے ذہن میں آرہی تھی۔ مگر تقدیر الٰہی کو کون بدل سکتا تھا۔

میں نے دوسرے روز پھر وزارت سے سبکدوش ہونے کی خواہش پر زور دیا۔ میں جانتا تھا کہ ایجی ٹیشن ہوگا۔ خونریزی ہوگی اور آصفیہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ لازمی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے زمانے میں یہ ہو۔ حضور نظام نے میری درخواست منظور فرمالی اور جہاں تک مجھے یاد ہے میں ۲ر نومبر کو وزارت سے سبکدوش ہوکر حیدرآباد سے گھر کو روانہ ہوگیا۔ میں نے وزارت کا چارج نواب سرمہدی یار جنگ کو دیا۔ میری کہانی تو یہاں ختم ہوگئی اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ حیدرآباد کی کہانی ہے مسٹر مینن کی کتاب Integration of Indian stats کے صفحہ ۳۴۴ پر حسب ذیل عبارت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیا وفد جو حیدرآباد نے بھیجا تھا وہ کتنا کامیاب ہوا۔

The Delegation returned to Hyderabad without any material change in the Agreement of the collateral letter the two documents were signed by the Nizam on 29th. Nov. 1947

کاش پہلے ہی مان لیتے تو بدمزگی پیدا نہ ہوتی۔

حیدرآباد کے ڈرامے پر میرے واپس ہونے کے بعد آخری پردہ Dropseen پڑا۔ ۸ ماہ کی مدت کے بعد حکومت ہند کی فوجیں حیدرآباد میں داخل ہوئیں ایک ہفتہ میں حیدرآباد بحیثیت ایک ریاست کے ختم ہوگیا۔ مجھے حسرت و افسوس کے ساتھ عبرت بھی ہوئی کہ مغلیہ سلطنت کے زمانے کے آداب وتہذیب،

اخلاق و مروت کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا۔ رہے نام اللہ کا۔ دنیا اور اس کی دولت و ثروت، شان و شوکت ہر چیز فانی ہے۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

میں نے حسب ذیل تار اعلیٰ حضرت نظام کو بھیجا:

His Exalted Highness the Nizam,
Hyderabad (Deccan).

My anxiety was greatly relieved when I heard on the Radio last Night the report of your Exalted Highness's wise decision about Hyderabad affairs. I am certain in my mind about the correctness of this step and hope and pray that this welcome move will be greatly appreciated by all concerned and will help in bringing about all round peace, happiness and prosperity to Hyderabad.

Nawab Chhatari,

18-9-48

حضور نظام نے پولیس ایکشن کے بعد جو تقریر کہ ریڈیو سے نشر فرمائی وہ یہ تھی:

The following is the text of message which the Nizam wishes passed to his Agent General Delhi for broadest in English, Persian, Arabic and Urdu.

Begins:

Leaders and Friends in Islamic Countries;

Several delegations calling themselves Hyderabad delegation sent by the Laik Ali Ministry have been carrying on a campaign against India's so called misdeeds which in fact has merely restored my freedom to deal with Hyderabad's enemies in a manner consistent with the traditions of the Asifia dynasty and the best interest of Hyderabad. I am, therefore, placing before the World the true facts of the

situation. In November last a small group which has organized into military organization hostile to Hyderabad's best traditions surrounded the house of my Prime Minister, Nawab of Chhatari in whose wisdom I had complete confidence and Sir Walter Monckton, my Constitutional adviser and thus by duress compelled the Nawab of Chhatari and my other trusted Ministers to resign and force the Laik Ali Ministry on me. This group with Qasim Rizvi at its head who had no stake in the Country nor any record of service behind him, by methods reminiscent of Hitlerite Germany, took possession of State, spread terror in all elements of the society Muslims and non Muslims that refused to bend their knees to them committing arson and loot on a large scale particularly on Hindus and rendered me completely helpless. For some time I was anxious to come to an honourable settlement with India which India was willing to come to. But this group in its ambition to found an Islamic State in which the Muslims alone of Hyderabad should have citizenship rights, got me to reject the offer made by the Government of India from time to time. I am a Muslim and am proud to be a Muslim. But I know that Hyderabad cannot remain apart from India. My ancestors never made any difference between the 86% Hindus and 13% Muslims in the State. The relations between the two communities political, social and religious were the most cordial ever found anywhere in India. This was attained as a result of the policy which my ancestors and I pursued in the past. During the eight months this group was in power aided by Razakars had brought about the most intense communal hatred which unfortunately in the position that I was placed I could not prevent. When the crises which they created came this group

while professing their determination to fight to the last man and last round vanished when the Indian Army was about 40 miles from Hyderabad. The Ministry resigned leaving me to save the situation as best as I could. I have around me my old and trusted Muslim Officers who whatever regime have always contributed their best to build up the State. I have no fear from the Indian Union. I know and always have known that the Indian Union is a Secular State in the very nature of things Hyderabad whose 86% of the people are Hindus cannot possibly be come an Islamic Statee. In the meantime thousands of fanatic outsiders brought from abroad lured by money and prospects of loot who were let loose in the State are still out of hands. The city of Hyderabad was saved from their havoc because of your discipline and the exemplary behaviour of the Indian Army. The administration is now in the hands of Military Governor to whom I have asked you to give fullest support. He is Major General J.N. Chaudhri of the Indian Army. I have issued orders dissolving all delegations sent out by the Laik Ali Ministry and I warn the Muslims all over the World not to be victims of interested propaganda.

میں ۲۴ر ستمبر ۴۸ء کو لکھنؤ گیا تھا وہاں مسز نائیڈو سے ملنے گیا۔ یہ بڑی ہوشمند اور شریف مزاج خاتون تھیں۔ ان سے حیدرآباد کے المیہ (Tragedy) کا بھی ذکر آیا انھیں بہت افسوس تھا کہ حیدرآباد کے لوگوں نے آشتی کا راستہ اختیار نہ کیا اور مجھ سے کہنے لگیں کہ بڑی غلطی یہ تھی کہ سر والٹر مانکٹن اور تمہاری رائے نہ مانی وہ اس پر خوش تھیں کہ نظام نے جو بیان ریڈیو پر دیا اس میں تعریف کی اور مجھ پر اظہار اعتماد کیا۔

۲۶ر ستمبر کو صغیر احمد صاحب میرے سکریٹری کا فون علی گڑھ سے آیا جس میں انھوں نے نظام کا حسب ذیل تار پڑھ کر سنایا۔

Nawab of Chhatari,
Aligarh.

Believe you are will aware of the state of affairs prevailing in Hyderabad. Since you served for Hyderabad for long time I consider you to by my well wisher and trust you will do some service now to the extent it lies in your power which I shall appreciate.

Nizam Hyderabad
25-9-48

مجھے اس تار سے بہت قلبی تکلیف بھی ہوئی اور عبرت بھی۔ فوج کشی کرنے کے بعد صورت بالکل بدل گئی۔ اب فریقین میں گفت وشنید کا وقت ختم ہوگیا اب تو فاتح اور مفتوح کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ ہندوستان کی فوجیں پانچ روز میں حیدرآباد پر قابض ہوگئیں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کوئی خدمت کس طرح انجام دوں۔

میں نے یہ خیال کیا کہ مسز نائیڈو جو یوپی کی گورنر تھیں ان سے مشورہ کروں اور A-D-C کو فون کیا میں اسی روز شام کے ۵ بجے مسز نائیڈو سے ملا اور نظام کا تار دکھایا۔

میں نے یہ بھی کہا کہ اگر حکومت ہند آپ کو کچھ روز کے واسطے حیدرآباد بھیج دے اور State Department کے کچھ افسران آپ کے ساتھ ہوں تو نظام ہر تجویز کو مان لیں گے۔ اور دنیا کی نظروں میں بھی اچھا معلوم ہوگا اور اہل حیدرآباد کو اس کا احساس ہوگا کہ حیدرآباد کی ایک ہندو بیٹی نے مصیبت کے وقت حیدرآباد اور نظام کو بچایا۔ انھوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور اجازت دی کہ میں دہلی میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ میں نے گورنمنٹ ہاؤس سے سردار پٹیل کو فون کرایا تا کہ ملاقات کا وقت طے ہو جائے گا۔

شام کو مجھے A-D-C نے کہا کہ سردار پٹیل نے فون پر کہا ہے کہ پرسوں میں ان سے مل سکتا ہوں۔ لیکن میں سر مرزا اسمٰعیل اگر حیدرآباد جانا چاہتے ہیں تو اپنی ذمہ داری پر جائیں۔ ہم ان کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہوسکتے اس فون کے بعد مجھے

سردار پٹیل کے مزاج کا پورا احساس ہو گیا تھا مگر اب چوں کہ وقت مقرر ہو گیا تھا میں نے اپنا ارادہ قائم رکھا۔ مسز نائیڈو نے غالباً اس کے جواب کے بعد مجھ سے کہلوا دیا کہ جو میری تجویز ان کے حیدر آباد جانے کے متعلق تھی وہ مناسب نہیں ہے۔

۲۹ ستمبر ۴۸ء کو میں ساڑھے آٹھ بجے سردار پٹیل سے ملا۔ نظام کا تار دکھایا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا انشاء حیدر آباد جانے کا نہیں ہے۔ مجھے اس تار کے متعلق مشورہ کرنا ہے وہ کہنے لگے کہ اس تار کا جواب بتانا میرے واسطے مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ میں یہ کہہ دوں کہ ''میں حیدر آباد کی ہر خدمت کو تیار ہوں'' اتنا ہی کہا تھا کہ سردار پٹیل نے کہا کہ اس میں یہ بھی بڑھا دوں کہ آخری فیصلہ وہاں کے لوگوں پر منحصر ہوگا۔ انھیں بھی ہاتھ میں لینے کی کوشش کیجیے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو مجھ سے اور نواب اسمٰعیل خاں سے پہلے ہی کہہ چکے تھے نظام پاکستان سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر نظام یہ چاہتے تھے کہ جناح کا کوئی دستخطی خط ان کے پاس آجائے جو مسٹر جناح کی بیماری کی وجہ سے نہ ہو سکا۔

میں نے ان کے سکریٹری کو تار لکھا دیا۔ جو میں نے بھیجا تار حسب ذیل تھا۔

Express Telegram

His Exalted Highness the Nizam,
Hyderabad (Deccan).

Honoured by your Exalted Highness's telegram. It will always be my desire to serve the best interest of Hyderabad, In my humble opinion every effort should be made to carry the people of Hyderabad with you. Thin views will have greater influence.

Nawab of Chhatari

مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ حیدر آباد کو نادان دوستوں کی بدولت یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔

Centre : H.E.H. The Nizam (Supreme Commander, Hyderabad Forces)
R : General El-Idrus (C in C) Col. Nawab of Chhatari, Nawab Khusru Jung
L : Prince Azamjah Bahadur

Nawab Saidul Mulk
Hafiz Sir Ahmad Said Khan of Chhatari
as Prime Minister of
The Nizam of Hyderabad